اندھیروں کے قافلے
خان آصف

اندھیروں کے قافلے

خان آصف

القریش پبلی کیشنز
سرکلر روڈ چوک اردو بازار لاہور
فون: 042-37652546, 37668958

بہترین کتابیں ۔۔۔۔۔۔۔

جدید انداز اور معیار کے ساتھ

باہتمام محمد علی قریشی

بار اوّل .... جنوری 2014ء

مطبع .... نیئر اسد پریس لاہور

کمپوزنگ .... القریش گرافکس

قیمت .... -/600 روپے

پیش لفظ

''اندھیروں کے قافلے'' ایک ایسے بہادر، غیرت مند اور جذباتی نوجوان کی داستانِ محبت ہے جس نے ایک لڑکی کی خاطر اپنی زندگی سے کیا ہوا عہدِ وفا توڑ دیا۔ شب و روز بدل ڈالے۔ اپنا سب لٹا کر امر ہو گیا۔ جو جابرانِ وقت کے جور و ستم کے آگے نہیں جھکا اور شہنشاہِ وقت کے بے رحم انصاف کی بھینٹ چڑھ گیا۔ یہ ایک ایسے سوختہ جاں کی دردناک کہانی ہے جس نے ایک سفاک لڑکی کے دل کی سنگلاخ زمین پر وفا کے پھول کھلانا چاہے مگر حرص و ہوس اور نفرتوں نے اُس کی شمعِ محبت کو بجھا دیا۔

والدِ محترم نے یہ خوبصورت کہانی 1988ء میں اخبارِ جہاں میں قسط وار لکھی تھی۔ اُس وقت اس کہانی کو بے حد پذیرائی حاصل ہوئی۔ اس کی بنیادی وجہ اس کہانی کا مرکزی خیال اور دل کش منظر کشی تھی۔ جس نے پڑھنے والوں کے انہماک کو ٹوٹنے نہیں دیا تھا۔ اور اب بھی کتابی صورت میں قارئین کو یہ ناول اختتام تک اپنے سحر سے آزاد نہیں ہونے دے گا۔ میں ذاتی طور پر محمد علی قریشی صاحب کی شکر گزار ہوں کہ ان کی بذاتِ خود دلچسپی اور نظرِ کرم کی بدولت والدِ گرامی کے کئی ناول جیسے شمشیر کا قرض، بت شکن، شعلوں کا کفن، خاموش وفا اور ٹیپو سلطان چھپ چکے ہیں۔ اور اب تاریخ کا یہ گمشدہ محبت نامہ آپ کی نذر کر رہی ہوں۔ اُمید کرتی ہوں کہ یہ بھی قارئین کی توقعات پر پورا اُترے گا۔

اسماء خان آصف

غیاث الدین بلبن کی داستان حیات کا ایک ایک ورق انقلاب کی خوں رنگ اور سنہری عبارتوں سے آراستہ تھا' جو آسمان پر تحریر کر دیا گیا تھا وہ زمین پر نازل ہو کر رہا۔ پہلے عروج' پھر زوال ......اور پھر عروج۔

بلبن کا تعلق ترکوں کے "البری" قبیلے سے تھا۔ اس کے باپ کو اپنی قوم کی سرداری حاصل تھی' مگر جب منگول زمین کے سینے سے قتل و غارت کے طوفان اٹھاتے ہوئے ترکستان پہنچے تو دوسرے ہم وطنوں کی طرح بلبن کو بھی ایک مغل نے گرفتار کر لیا۔ پھر اس خوبصورت اور نو عمر لڑکے کو ایک سوداگر کے ہاتھوں فروخت کر دیا گیا۔ انسانوں کا کاروبار کرنے والا وہ تاجر بلبن کو لے کر بغداد آیا۔ ایک ترک زادہ دوسری بار نیلام ہوا۔ اب کی بار اس کے خریدار ایک معزز شخص خواجہ جمال الدین بصری تھے۔ ابھی بلبن نے بغداد کی فضاؤں میں چند ہی سانسیں لی تھیں کہ خواجہ جمال الدین اسے لے کر ہندوستان پہنچے۔ خواجہ جمال پر یہ راز ظاہر ہو چکا تھا کہ ہندوستان کا درویش صفت حکمراں سلطان شمس الدین التمش بھی بلبن کی نسل سے تعلق رکھتا تھا۔ اسی نسلی رشتے کے پس پردہ خواجہ جمال کو بہت بڑا فائدہ نظر آ رہا تھا اور پھر ایسا ہی ہوا۔ سلطان شمس الدین التمش نے بلبن کو منہ مانگی قیمت پر خرید لیا۔

زنجیریں آہستہ آہستہ کٹتی جا رہی تھیں اور ایک غلام کی پیشانی پر اقتدار کی لکیر نمایاں ہونے لگی تھی۔ سلطان شمس الدین التمش غیاث الدین بلبن سے اس قدر متاثر ہوا کہ فرمانروائے ہند نے اپنی ایک بیٹی اس کے نکاح میں دے دی اور دامادی کے اعزاز سے شرف یاب کیا۔

پھر گردش روز و شب کے ساتھ بلبن نے وقت کے عجیب عجیب تیور دیکھے۔ کبھی وہ ابھر کر ڈوبا اور کبھی ڈوب کر ابھرا۔ ایک بار زندان کے حوالے بھی کیا گیا' مگر لوح محفوظ کا فیصلہ اس کی زندگی کے سفینے کو کھینچتا ہوا ساحل مراد کی طرف لئے جا رہا تھا۔ اگرچہ حالات کی موجیں بہت تند و ترش تھیں لیکن غیاث الدین بلبن نے بڑی جوانمردی کے ساتھ انقلاب کے دھاروں کا مقابلہ کیا۔ پھر جب ہلاکت خیز ہوائیں رکیں اور فتنہ انگیز موجیں سرنگوں ہوئیں تو دیکھنے والوں نے دیکھا کہ بلبن کی کشتی سیاست میں صدہا سوراخ تھے' مگر وہ کنارے پر پہنچ چکی تھی۔ بلبن نے زمین پر قدم رکھا۔ کچھ دور تک آگے بڑھا' پھر ٹھہرا اور مڑ کر آرزوؤں کے اس دریا پر نظر ڈالی جو انسانی خون سے سرخ تھا۔ چہرے پر کئی رنگ آئے اور گزر گئے۔

بلبن کے ڈوب جانے کی پیش گوئی کرنے والے شرمسار تھے اور بار ندامت سے ان کی گردنیں جھکی ہوئی تھیں۔ وہ مخالفین کی قطاروں کے سامنے رکا۔ ان کے پیروں میں زنجیر غلامی دیکھ کر ہنسا اور بے نیازانہ رفتار کے ساتھ "قصر سفید" کی طرف چلا گیا۔ بظاہر ابھی بلبن نے تاج زرنگار نہیں پہنا تھا' لیکن در پردہ وہی ہندوستان پر حکمرانی کر رہا تھا۔ سلطان شمس الدین التمش [illegible] اس کی گرفت اتنی مضبوط ہو چکی تھی

کہ شہنشاہ ہند ایک گوشے میں سمٹ گیا تھا اور بساط حکومت پر گردش کرنے والے تمام مہرے بلبن کی نگاہ کرم کے محتاج ہو کر رہ گئے تھے۔

پھر جب سلطان ناصر الدین محمود بستر علالت پر پہنچ گیا تو غیاث الدین بلبن کے فیصلوں کو جھٹلانے والا کوئی دوسرا شخص موجود نہیں تھا۔ اس نے یکا یک شطرنج کی بساط کھینچ لی اور متحرک رہنے والے مہرے فرش پر بکھر گئے۔ ہر مہرہ یہ سوچ کر پریشان و مضطرب تھا کہ اب اس کا کیا حشر ہو گا۔ بساط پر اس کی ضرورت محسوس ہو گی یا وہ سیاست کی آگ کا ایندھن بن جائے گا۔

کچھ مہروں نے اپنے سر ہتھیلی پر رکھ کر سلطان ناصر الدین محمود کی بارگاہ میں صورت حال بیان کرنے کی کوشش کی' مگر خلوت شاہی سے ان مہروں کو ایک ہی جواب ملا۔

''بلبن جو بازی کھیل رہا ہے' اسے کھیلنے دو کہ اب وہی شاطر ہے اور اب وہی بساط حکومت کا نگراں ہے۔''

آخری وقت میں کچھ وفادار مہروں نے سلطان سے سرگوشی کی۔ ''اس بازی میں نسل التمش کیلئے شکست فاش کے امکانات زیادہ روشن ہیں۔''

''شاہ کیا کرے؟'' سلطان ناصر الدین محمود نے افسردہ لہجے میں کہا۔ ''شاہ خود ہی زچ ہو چکا ہے۔ جب بساط زیست ہی الٹنے والی ہے تو وہ بساط سیاست کو کیا دیکھے؟ اگر حکومت کے شاطر غلط چالیں چل رہے ہیں تو انہیں ایسا کرنے دو کہ احتساب کا وقت گزر چکا۔ تمہارے سلطان کو موت کے شاطر نے شہہ دے دی ہے' جس کا بظاہر کوئی توڑ نہیں۔ بساط مکمل طور پر درہم برہم ہو چکی ہے۔ تم لوگ واپس جاؤ اور اس حقیقت پر یقین کر لو کہ تمہارے شاہ کا وجود مٹ چکا ہے۔ اگر بلبن نے وہ بازی اپنے ہاتھ میں لی ہے تو اسے کھیلنے دو۔ وہ ایک زمانہ آشنا شاطر ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ کم سے کم مہروں کی قربانی دے کر بازی جیتنے کی کوشش کرے گا۔ میں اپنی ذات کا کھلاڑی نہیں۔ میں نے تمام بازیاں یہ سوچ کر کھیلی ہیں کہ میری رعایا پرسکون رہے اور ہندوستان کے ایک ایک سربلند قلعے پر روز حشر تک اسلام کا پرچم لہراتا رہے۔ خدا بلبن کو توفیق دے کہ وہ اپنے نفس کی خاطر کوئی بساط نہ بچھائے۔ وہ ان غیور اور وفادار مہروں کو اس لئے تہہ تیغ نہ کرائے کہ ان کے سر کسی انسان کو سجدہ کرنے کے عادی نہیں ہیں۔''

بلبن کے جاسوسوں نے جب سلطان ناصر الدین محمود کے آخری الفاظ اسے منتقل کئے تو وہ اپنے شاہ کے جذبات سے بہت متاثر ہوا' مگر ان لوگوں کو معاف نہیں کیا جنہوں نے سلطان سے بستر مرگ پر سرگوشیاں کی تھیں۔ اس کے خیال میں سیاست کا یہ اصول ناپسندیدہ تھا کہ اختلاف رکھنے والوں سے چشم پوشی کی جائے۔

پھر جب 664ھ میں جمادی الاول کا مہینہ طلوع ہوا تو سلطان ناصر الدین محمود کی حالت زیادہ بگڑ گئی۔ شاہی طبیبوں نے اعتراف کر لیا کہ انسانی مسیحائی کا وقت ختم ہو چکا۔ اب وہی مسیحا سلطان کو صحت دے سکتا ہے جس کی خدائی میں کائنات کا ایک ایک ذرہ مجبور محض ہے۔ اس قدر نازک ساعتوں سے دوچار ہوتے ہوئے بھی ناصر الدین محمود نے غیاث الدین بلبن کو تنہائی میں طلب کیا اور اس وقت وصیت کی جب ہونٹوں کو جنبش دینا بھی ایک کار دشوار تھا۔

سلطان کی یہ وصیت چند الفاظ پر مشتمل تھی۔

''اگر تم صرف اپنی ذات کیلئے زندہ رہنے کی کوشش کرو گے تو میرا انجام نظر میں رکھنا کہ میں کس طرح ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر رہا ہوں اور اگر تم نے اپنے نفس کی خواہشات سے بالاتر ہو کر مخلوق خدا کے سکون و عافیت کیلئے اقتدار کی قوتوں کا استعمال کیا تو مرتے وقت حسرت و ناامیدی کا شکار نہیں ہو گے۔ خدا اپنے بندوں کو کبھی بدترین غربت و افلاس

دے کر آزماتا ہے اور کبھی بہترین نعمتوں سے سرفراز کر کے امتحان لیتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم عنقریب بڑی آزمائش میں مبتلا کئے جاؤ گے۔ میں نے ہر موسم میں تم پر اعتبار کیا اور تمہیں ایک غلام کے بجائے اپنے حقیقی بھائی کی طرح سمجھا۔ جب میں دنیا سے گزر جاؤں تو میرے اس اعتبار کی آبرو رکھنا۔ کوئی ایسی روش اختیار نہ کرنا کہ دنیا سے رسم اعتبار ہی اٹھ جائے۔ تم اس بات کو فراموش کر دو کہ لوگ میرے کانوں میں کیا کیا کہتے ہیں۔ صرف اس حقیقت کو پیش نظر رکھو کہ میں تمہیں کیا سمجھتا ہوں۔ میں تمہیں آج بھی اپنا حرف اعتبار سمجھتا ہوں الغ خان۔" یہ کہہ کر سلطان ناصر الدین محمود کچھ دیر کیلئے خاموش ہو گیا۔ نقاہت اور کمزوری نے اس پر غلبہ پا لیا تھا۔ ہندوستان کا یہ نیک دل حکمراں نیم بے ہوشی کی کیفیت سے دوچار تھا۔

غیاث الدین بلبن کی آنکھوں کے سامنے ماضی کا وہ منظر ابھر آیا جب ناصر الدین محمود نے تخت نشینی کے بعد اسے "خان اعظم الغ خان" کا خطاب دے کر اپنا وزیر مقرر کیا تھا اور تنہائی میں لے جا کر کہا تھا۔

"میں نے تمہیں اپنا نائب مقرر کیا ہے الغ خان! اور خدا کی مخلوق پر حکمراں بنایا ہے۔ تم کبھی کوئی ایسا کام نہ کرنا کہ مجھے خدا کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے۔"

بلبن کو ان الفاظ کی بازگشت سنائی دی جو بائیس سال پہلے سلطان ناصر الدین کی زبان سے ادا ہوئے تھے۔

اس دوران سلطان کو دوبارہ ہوش آ گیا اور وہ لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں کہنے لگا۔ "الغ خان! میرے پاس وقت کم ہے۔" سلطان ناصر الدین محمود نے غیاث الدین بلبن کو اسی خطاب کے ساتھ مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "امن محبت اور اعتبار کا راستہ اختیار کرنا کہ اس راستے میں ہلاکت نہیں ہے۔" یہ کہہ کر سلطان ناصر الدین محمود خاموش ہو گیا۔ اس نے اپنی گویائی کی تمام قوتیں سمیٹ کر بلبن سے گفتگو کی تھی۔ کچھ دیر بعد ہی ضعف و ناتوانی کے سبب یہ قوتیں منتشر ہو گئیں اور سلطان کی سانسیں اکھڑنے لگیں۔ بلبن بارگاہ سلطانی سے اس طرح اٹھا کہ اس کے چہرے پر غیر معمولی سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔

پھر اسی ماہ کی گیارہ تاریخ کو سلطان ناصر الدین محمود کے اقتدار کا سورج غروب ہو گیا...... اور زندگی کا وہ چراغ بھی بجھ گیا جو ایک طویل عرصے سے تیز ہواؤں کے رخ پر رکھا ہوا تھا۔

سلطان کے انتقال کی خبر عام ہوتے ہی دہلی کے گلی کوچوں میں ایک کہرام سا برپا ہو گیا اور گھر گھر ماتم کدہ نظر آنے لگا۔ درویش باپ کا درویش بیٹا دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔ بائیس سال تک اس نے ہندوستان کی سرزمین کو جنت ارضی بنائے رکھا۔ ناصر الدین محمود کے دور حکومت میں لوگوں کی جان و مال محفوظ تھے اور عزت و ناموس بھی۔ انہیں دربار شاہی سے انصاف بھی فراہم کیا گیا اور معاشی آسودگی بھی۔ رعایا کی یہ خوش حالی اس لئے نہیں تھی کہ ہندوستان کی زمین سونا اگل رہی تھی، بلکہ خود ناصر الدین نے اپنی ذات پر دنیا کا ہر عیش حرام کر لیا تھا۔ وہ خود راتوں کو جاگ کر مخلوق خدا کے حقوق کی نگہبانی کرتا تھا۔ اس لئے اس کی حدود سلطنت میں رہنے والے چین کی نیند سویا کرتے تھے۔

سلطان ناصر الدین محمود ہر سال اپنے ہاتھ سے قرآن کریم کے دو نسخے کتابت کیا کرتا تھا۔ ان کا جو ہدیہ ملتا تھا اس سے وہ اپنے کھانے پینے کا سامان خریدا کرتا تھا۔ ایک بار ایک امیر نے بادشاہ کے لکھے ہوئے قرآن شریف کو معمول سے زیادہ ہدیہ دے کر حاصل کر لیا۔ ناصر الدین محمود کو یہ بات پسند نہ آئی اور اس نے حکم دیا کہ آئندہ سے اس کے لکھے ہوئے قرآن کو انتہائی راز داری کے ساتھ عام قیمت پر ہدیہ کیا جائے۔

ناصر الدین محمود کے گھر میں اس کی بیوی کے علاوہ کوئی خادمہ یا کنیز موجود نہیں تھی جو گھر کا کام کاج کر سکتی۔

مجبوراً ملکہ ہند کو خود ہی کھانا وغیرہ پکانا پڑتا۔ ایک روز ملکہ نے سلطان سے کہا کہ روٹی پکاتے پکاتے میرے ہاتھوں میں سوزش ہوگئی ہے۔ اگر اس کام کیلئے کوئی لونڈی فراہم کر دی جائے تو کوئی ہرج نہیں۔

جواب میں ناصر الدین محمود نے کہا۔ "سرکاری خزانے پر صرف رعایا کا حق ہے۔ مجھے اس بات کا اختیار حاصل نہیں کہ میں اپنے ذاتی آرام و آسائش کیلئے اس میں سے کچھ رقم لے کر ایک لونڈی خرید لوں۔ بیگم! تمہیں دنیاوی تکالیف و مصائب پر صبر کرنا چاہئے کہ خدا آخرت میں بہترین اجر دینے والا ہے۔"

سلطان ناصر الدین محمود اس قدر شریف النفس حکمران تھا کہ اس نے زندگی بھر کسی حقیر انسان کی بھی دل آزاری نہیں کی۔ ایک روز ایک بدحال اور ضرورت مند شخص سلطان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت ناصر الدین قرآن حکیم کی تلاوت کر رہا تھا۔ اس فقیر کی نظر ایک ایسے صفحے پر پڑی جہاں ایک لفظ دوبار لکھا ہوا تھا۔

اس شخص نے بادشاہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"کاتب کی غلطی سے یہاں ایک لفظ دوبار لکھ دیا گیا ہے۔" ناصر الدین محمود نے حیرت سے اس شخص کی طرف دیکھا اور قریب ہی کھڑے ہوئے اپنے ایک غلام سے قلم دوات منگوا کر اس لفظ کے گرد دائرہ کھینچ دیا۔ پھر فقیر کی ضرورت پوری کرنے کے بعد اسے رخصت کر دیا۔ جب وہ شخص چلا گیا تو ناصر الدین محمود نے قلم تراش لے کر اس دائرہ کو مٹا دیا جو کچھ دیر پہلے بنایا تھا۔

غلام سارا واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے باادب ہو کر سلطان کے حضور عرض کیا۔......"ایک بار دائرہ کھینچنے اور دوسری بار مٹا دینے میں آخر کیا مصلحت تھی؟"

جواباً سلطان نے کہا۔ "وہ شخص جس نے لفظ کی تکرار پر اعتراض کیا تھا' دراصل ایک ضرورت مند انسان تھا۔ اگر میں اس کے اعتراض کی تردید کرتا تو وہ نادم ہو جاتا اور اپنی ضرورت کا اظہار کئے بغیر چلا جاتا۔ اس لئے میں نے اس کی موجودگی میں دائرہ کھینچ دیا اور جب وہ چلا گیا تو دائرہ مٹا دیا۔ دنیا میں دل کا غبار دور کرنا بہت مشکل ہے' لیکن کاغذ کا نقش مٹانا آسان ہے۔"

سلطان ناصر الدین محمود کے ایک مصاحب کا نام "محمد" تھا۔ بادشاہ اسے ہمیشہ اسی نام سے پکارا کرتا تھا۔

ایک روز ناصر الدین نے اس مصاحب کو "تاج الدین" کہہ کر آواز دی۔ مصاحب نے اس وقت تو سلطان کے حکم کی تعمیل کی لیکن بعد میں اپنے گھر چلا گیا اور تین دن تک مسلسل بادشاہ کی خدمت میں حاضر نہیں ہوا۔ ناصر الدین نے اس مصاحب کو بلایا اور غیر حاضری کا سبب دریافت کیا۔

مصاحب نے لرزتے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "آپ مجھے ہمیشہ "محمد" کے نام سے پکارا کرتے تھے' مگر اس روز آپ نے خلاف معمول تاج الدین کہہ کر آواز دی۔ میں نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ شاید آپ کے دل میں میری طرف سے بدگمانی پیدا ہوگئی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ میں آپ کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکا اور یہ سارا وقت انتہائی پریشانی کے عالم میں گزارا۔"

سلطان ناصر الدین محمود نے قسم کھا کر کہا۔ "میں ہرگز ہرگز تم سے بدگمان نہیں ہوں' لیکن میں نے تمہیں تاج الدین کے نام سے پکارا تھا۔ اس وقت میں باوضو نہیں تھا۔ مجھے یہ بات انتہائی نامناسب معلوم ہوئی کہ میں وضو کے بغیر "محمد" کا مقدس نام اپنی زبان پر لاؤں۔"

آج وہی ناصر الدین محمود کفن اوڑھے ہوئے خاموش لیٹا تھا اور دہلی کی گلیاں انسانی چیخوں سے گونج رہی تھیں۔ بیوہ عورتیں' کمر خمیدہ بوڑھے' یتیم بچے' [illegible] تھے۔ آج وہ شخص دنیا سے اٹھ

گیا تھا جو ان کے غموں میں اس طرح شریک ہوتا تھا' جیسے ذہ محتاج اور بے سہارا لوگ خود اس کے اپنے رشتے دار ہوں۔ مرنے والا ہزاروں حاجت مندوں کی ضرورتیں اس طرح پوری کیا کرتا تھا کہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کو بھی خبر نہیں ہوتی تھی۔ وہ ستم رسیدہ لوگوں کے المناک فسانے سنتا تھا اور پھر ان کے درمیان اس طرح اپنی مسکراہٹیں تقسیم کر دیتا تھا کہ بہتے ہوئے آنسو تھم جاتے اور بجھتے ہوئے چہروں پر دوبارہ زندگی کے چراغ جل اٹھتے تھے۔

کئی دن تک دہلی کی گلیوں میں ماتم برپا رہا' مگر جانے والا تمام چیخوں' آہوں اور آنسوؤں سے بے نیاز ہو کر چلا گیا۔

جب سلطان ناصر الدین محمود کا جسم قبر میں اتارا جا رہا تھا تو کچھ لوگوں نے چیخ کر کہا۔

''اے سرزمین ہند! تو ویران ہو گئی۔ آج کے بعد شاید ہی ایسا کوئی دوسرا حکمراں تیرے سینے پر قدم رکھے۔''

بے شمار ہندو اسے بھگوان کا اوتار سمجھتے تھے اور عام مسلمانوں کے خیال کے مطابق ناصر الدین محمود انسان کے لباس میں فرشتہ تھا بلکہ فرشتوں سے بھی بلند تر کہ وہ خواہشات نفسانی سے پاک ہوتے ہیں......اور ناصر الدین محمود نے تمام زندگی اپنے نفس سے جنگ کی تھی۔ وہ یہ جنگ جیت گیا تھا' مگر موت و زیست کے معرکے میں زندگی ہار گئی تھی اور موت غالب آ گئی تھی۔ داستان آدم کا آخری باب بھی ہے۔ موت اور صرف موت۔

ناصر الدین محمود کے دفن کے وقت ہر آنکھ اشکبار تھی مگر غیاث الدین بلبن کی پلکوں پر نمی کا عکس تک نہیں تھا۔ لوگوں نے بلبن کے اس انداز کو بڑی حیرت سے دیکھا۔ تمام امراء اور وزراء کا خیال تھا کہ اس سنگین موقع پر کچھ دیر کیلئے بلبن کی حالت غیر ہو جائے گی کہ وہ سلطان شمس الدین التمش کا غلام بھی تھا اور داماد بھی۔ ناصر الدین محمود کی بہن کا شوہر بھی تھا اور نائب سلطنت بھی۔ اتنے رشتوں کے باوجود بلبن نے ناصر الدین کی موت کا سوگ نہیں منایا۔ بس وہ قبر کے نزدیک خاموش کھڑا رہا۔ بہت زیادہ خاموش اور سنجیدہ۔

بلبن ناصر الدین محمود کی زندگی ہی میں تمام امور سلطنت پر حاوی آ چکا تھا۔ اس لئے سلطان کی آنکھ بند ہوتے ہی اس نے اپنے سر پر تاج شاہی سجا لیا۔ اب وہ ایک مطلق العنان حکمران تھا۔ ''غلامی سے سلطانی'' تک بڑے اذیت ناک مرحلے تھے جنہیں بلبن نے نہایت صبر و ضبط اور حوصلے کے ساتھ طے کیا تھا۔ بالآخر پتھریلے اور خاردار راستے اس کے قدموں پر بے شمار زخموں کے نشانات چھوڑ کر پامال ہو گئے اور کامرانی کی منزل نے اسے فتح کی نوید سنائی۔

جب رسم تاجپوشی ادا کی جا رہی تھی تو غیاث الدین بلبن کو اپنے ماضی کا ایک عجیب واقعہ یاد آ رہا تھا۔ اس وقت بلبن ''خان اعظم الغ خان'' کے نام سے مشہور تھا۔ 1245ء میں سلطان ناصر الدین محمود اوچ جاتے ہوئے اجودھن (پاک پتن) میں حضرت بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ کے نیاز حاصل کرنا چاہتا تھا مگر بلبن نے سلطان کو اس ارادے سے باز رکھا اور خود ایک لشکر لے کر حاضر خدمت ہوا۔

سلسلہ چشتیہ کے عظیم بزرگ حضرت بابا فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ سلاطین زمانہ اور امرائے وقت سے کوئی سروکار نہیں رکھتے تھے۔ وہ خود معرفت کے شہنشاہ تھے۔ اس لئے بلبن جیسے وزیر کی وہاں کوئی حیثیت نہیں تھی' مگر جب بلبن نے عاجزانہ گزارش کی تو حضرت بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ اس پر رضامند ہو گئے کہ تمام فوجی آپ کا دیدار کرتے ہوئے خاموشی سے گزر جائیں۔ بلبن نے ایک اور التجا کی تمام سپاہیوں کو دست بوسی کی اجازت دی جائے۔ فوج کی کثیر تعداد دیکھ کر حضرت بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ نے یہی مناسب سمجھا کہ حجرے کی کھڑکی سے پیرہن کی آستین گلی میں لٹکا دی جائے اور سپاہی اسے بوسہ دیتے ہوئے گزر جائیں۔

پھر جب قبا کی آستین پارہ پارہ ہو گئی اور حضرت بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ کو تھکن کا احساس ہونے لگا تو آپ مسجد میں تشریف لے آئے اور مریدوں سے فرمایا کہ میرے گرد حلقہ باندھ لیا جائے اور تمام فوجی دور سے سلام کرتے ہوئے گزر جائیں۔ اس موقع پر حضرت بابا کے ایک پرانے خادم نے عرض کیا۔

''اللہ کی نعمت کا بہتر طریقے سے شکر ادا کرنا چاہئے۔''

حضرت بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ نے اس شخص کی بات مان لی اور دست بوسی کی بھی اجازت دے دی۔

جب تمام فوجی اس سعادت سے شرفیاب ہو کر چلے گئے تو غیاث الدین بلبن لرزتے قدموں کے ساتھ آگے بڑھا اور حضرت بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں جاگیر کا پروانہ پیش کرتے ہوئے عرض کرنے لگا۔ ''یہ حقیری نذر حضور کے لئے ہے۔''

بابا فرید خاموش رہے۔ بلبن نے اشرفیوں سے بھری ہوئی تھیلیاں پیش کیں۔ ''یہ دوسرے درویشوں کے لئے ہیں۔''

بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ایک خادم کو حکم دیتے ہوئے فرمایا۔ ''یہ ساری دولت اسی وقت ضرورت مندوں میں تقسیم کر دو۔''

پھر جاگیر کے پروانے کی طرف دیکھا اور بلبن کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''اسے واپس لے جا کہ اس کی خواہش رکھنے والے دہلی کے دربار میں بہت لوگ موجود ہیں۔''

اسی وقت بلبن کے دل میں خیال گزرا کہ اگر حضرت شیخ میرے اقتدار کے لئے دعا کریں تو کتنا اچھا ہو۔ بلبن کے دل میں بہت دنوں سے یہ آرزو پرورش پا رہی تھی کہ سلطان ناصر الدین محمود کے بعد وہ خود ہندوستان کا حکمران بن جائے۔ آج جب اسے ایک عظیم بزرگ کی محبت میسر آئی تو اقتدار کی تمنا بہت شدت سے ابھرنے لگی مگر وہ اپنی زبان سے اس کا اظہار نہیں کر سکتا تھا۔ دل ہی دل میں کہہ رہا تھا کہ کاش! حضرت بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ اس کے خوابوں کی تعبیر کے لئے دعا فرما دیں۔

ابھی بلبن اپنے ہی خیالات میں الجھا ہوا تھا کہ حضرت بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ نے فارسی زبان کے یہ دو اشعار باآواز بلند پڑھے (ترجمہ)

''شہنشاہ فریدوں کوئی فرشتہ نہیں تھا وہ بھی ایک انسان تھا جو اپنی سخاوت کے سبب اس مقام تک پہنچا۔ تو بھی لوگوں کے ساتھ لطف و کرم سے پیش آ' سخاوت کی روش اختیار کر اور فریدوں (شہنشاہ) بن جا۔''

فریدوں شاہان عجم میں ایک ممتاز مقام رکھتا تھا۔ اس نے ضحاک کو قتل کر کے حکومت حاصل کی۔ ضحاک نے جبر و تشدد سے جن چیزوں پر قبضہ کر لیا تھا' فریدوں نے وہ سب کی سب واپس کر دیں۔ عدل و انصاف قائم کیا اور اپنی رعایا پر انعام و اکرام کی بارش کی۔ گمراہ لوگوں کو خدائے واحد کی پرستش کی دعوت دی' کفر سے روکا' آتش کدوں اور بت خانوں کو مسمار کرا دیا۔ فریدوں کی مدت حکومت پانچ سو سال تھی۔

حضرت بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ نے شہنشاہ فریدوں کی مثال دے کر بلبن کو سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ اگر وہ سخاوت و کرم سے کام لے تو اسے بھی اقتدار اعلیٰ حاصل ہو سکتا ہے۔

بلبن اس انکشاف پر حیران رہ گیا۔ حضرت بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے کشف کی قوتوں سے اس کی دلی خواہشات کا اندازہ کر لیا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ اپنے ہونٹوں کو جنبش دیتا' اشاروں ہی اشاروں میں اس کے سوال کا جواب بھی دے دیا تھا۔

بلبن نے گھبرا کر حضرت بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ کے قدموں پر اپنا سر رکھ دیا۔ پھر دست مبارک کو بوسہ دیا اور ایک مرد کامل کی دعاؤں کے سائے میں دہلی لوٹ آیا۔

آج تاج شاہی پہنتے ہوئے اسے اجودھن (پاک پتن) میں گزارے ہوئے وہ لمحات یاد آ رہے تھے۔ جب ایک بوریا نشین درویش نے اس کے اقتدار کی پیش گوئی کی تھی۔

متعصب ہندو تاریخ نویسوں نے بلبن پر یہ الزام تراشی بھی کی ہے کہ سلطان ناصر الدین محمود اپنی طبعی موت نہیں مرا تھا۔ جب التمش کے بیٹے کا اقتدار طول کھینچتا جا رہا تھا تو بلبن کو اپنے انجام کی فکر پریشان کرنے لگی تھی اور وہ تنہائیوں میں یہ سوچنے لگا تھا کہ کہیں عمر اس سے بے وفائی نہ کرے اور اس کا سر تاج شہنشاہی کا بار اٹھانے سے قبل ہی سفید کفن سے ڈھانپ دیا جائے۔ جب ان وسوسوں اور اندیشوں نے شدت اختیار کی تو غیاث الدین بلبن اقتدار تک پہنچنے کے لئے قریب ترین راستے پر چل پڑا اور یہ قریب ترین راستہ اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ سلطان ناصر الدین محمود کے جسم سے اس کی سانسوں کا رشتہ منقطع کر دیا جائے۔ بلبن کے حصول اقتدار پر شک کرنے والے کہتے ہیں کہ شاہی طبیب اس کے ہاتھوں فروخت ہو گئے تھے اور پھر دواؤں کے ساتھ ایک ایسا زہر بھی ناصر الدین محمود کے جسم میں اتارا جانے لگا تھا جو اپنی تاثیر میں سست رفتار تھا اور آہستہ آہستہ سلطان کے دل کی قوتوں کو تباہ کر رہا تھا۔ پھر جب شاہ کے دل کی دھڑکنیں رک گئیں تو غلام نے تاج زرنگار اٹھا کر اپنے ہی ہاتھوں سے سر پر سجا لیا۔ معتبر مؤرخین نے بلبن کی اس ضمیر فروشی کا کہیں ذکر نہیں کیا ہے۔ بے شک! بلبن نے اپنے مخالفین کو گن گن کر قتل کیا (قتل ہونے والوں میں سلطان شمس الدین التمش کے اہل خاندان بھی شامل تھے) راستے کی رکاوٹیں دور کرنے کے لئے اس نے تشدد کے حربے بھی استعمال کئے، مگر اس کے اس فعل پر کوئی معتبر انسان گواہی نہیں دیتا کہ بلبن نے حکمرانی کے خواب کو شرمندہ تعبیر کرنے کے لئے اپنے آقا زادے کو زہر دیا تھا۔

بہرحال کچھ تہمتوں اور حقیقتوں کے شور میں سلطان ناصر الدین محمود کے مردہ جسم کو خاک کے نیچے رکھ دیا گیا کہ انسانی جسم خاک ہی کی امانت ہے۔ پھر رسمی نوحہ خوانی اور مصنوعی رنج و الم کی نمائش کے بعد غیاث الدین بلبن تخت نشین ہو گیا۔ بغداد کے بازار سے دہلی کی نیلام گاہ تک کا سفر بڑا تحیر خیز تھا۔ بلبن ماضی کے تلخ زمانے کو یاد کر کے اشکبار ہوا اور پھر فوراً ہی اس کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ ابھر آئی کہ حال کی رنگینیاں ماضی کی تلخیوں سے اعداد و شمار میں کہیں زیادہ تھیں۔ تخت نشینی کے بعد بلبن نے خدا کا شکر ادا کیا اور دہلی کے ''قصر سفید'' میں بیٹھ کر اپنے خیالات کا رخ ترکستان کی طرف موڑ دیا جہاں اس کا باپ دس ہزار گھرانوں کی سرداری کا اعزاز اپنے سینے پر سجائے زیر زمین سو رہا تھا۔ اقتدار کی جو لے ٹوٹ گئی تھی۔ بلبن نے اسے اس طرح جوڑ دیا تھا کہ وہ ''فخر خاندان'' ٹھہرا تھا۔ سرداری اور سلطانی میں وہی فرق ہے جو ''زمین اور آسمان'' کے درمیان قائم ہے۔ سردار باپ کا غلام بیٹا برسوں اس آرزو میں تڑپا تھا کہ اس کی سماعت سلطان معظم عالی جاہ اور شہنشاہ والا حشم جیسے الفاظ کا شور سن سکے اور آج وہ دن آ گیا تھا جب پہلی بار ایک مغرور وزیر نے اسے سلطان معظم کہہ کر پکارا تو وہ چونک اٹھا اور خیالات کی دنیا سے نکل آیا۔ یہ خوابوں کا جزیرہ نہیں حقیقتوں کا ایک شہر تھا، جہاں بیٹھ کر وہ کروڑوں انسانوں کی قسمت کے فیصلے کا اختیار رکھتا تھا۔

سلطان غیاث الدین بلبن اپنے آغاز جوانی میں شراب نوشی کا عادی تھا، مگر جیسے جیسے حکومت کے حلقوں میں اس کے اثرات بڑھتے رہے ویسے ویسے وہ لذت و کیف و نشاط کے دائرے سے دور ہوتا چلا گیا۔ بلبن کے خیال میں شراب نوشی اور ہوس پرستی ایک حکمران کے وقار کو مجروح کرتی ہے۔ اسے بزدل بناتی ہے اور پھر بے خبری کی ان راہوں پر لے جاتی ہے جہاں سے انسان کا شرمناک زوال شروع ہو جاتا ہے۔ پھر جب بلبن نے شراب نوشی اور نفس

پرستی کے فلسفے کی گہرائیوں کو سمجھ لیا تو وہ گناہوں کے کوچے سے مکمل طور پر باہر نکل آیا۔ ہندوستان کا شاہ بنتے ہی اس کی ہر ادا بھی شاہانہ ہو گئی تھی۔

غیاث الدین بلبن کے عہد وزارت میں ایک امیر وکبیر شخص فخرو بائی تھا اس نے ایک زمانے تک بلبن کی خدمت کی تھی پھر ایک دن فخرو بائی کی کسی ناشائستہ حرکت سے بلبن ناراض ہو گیا اور اس نے فخرو بائی سے بات چیت ترک کر دی۔ وقت گزرتا رہا پھر جب بلبن وزارت سے گزر کر شہنشاہیت کے منصب تک پہنچا تو فخرو بائی ان درباریوں سے ملا جنہیں بلبن کی بارگاہ میں رسائی حاصل تھی۔ فخرو بائی نے ان درباریوں سے کہا۔

''اگر سلطان مجھ سے ایک بار گفتگو کر لیں تو میں آپ حضرات کو اس کام کا نقد معاوضہ دوں گا اور سلطان کی خدمت میں گراں قدر تحائف پیش کروں گا۔''

بلبن کے درباری اس بڑی رشوت کے لالچ میں آ گئے۔ انہیں سلطان کے دربار میں قربت خاص حاصل تھی اور اسی نسبت کا خیال کر کے ان لوگوں نے فخرو بائی سے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ سلطان غیاث الدین بلبن کو اس سے گفتگو کرنے پر آمادہ کر لیں گے، مگر جب وہ تمام رشوت زدہ درباری بلبن کے حضور پہنچے اور اپنی خواہش کا اظہار کیا تو سلطان کے ماتھے پر نفرت وحقارت کے اتنے بل پڑ گئے کہ ایک نظر میں انہیں شمار کرنا دشوار تھا۔

بلبن نے اپنے معزز درباریوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہاری ذاتی محبت کی قدر کرتا ہوں اور اس بات کا بھی اعتراف کرتا ہوں کہ فخرو بائی ایک دولت مند شخص ہے لیکن تمہیں اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ وہ اول و آخر ایک بازاری انسان ہے اور بازاری لوگوں پر ہی اس کی سرداری زیب دیتی ہے۔ ایسے شخص سے کسی حکمراں کا گفتگو کرنا وقار شاہی کے خلاف ہے۔ اس حرکت سے رعایا کے دل میں میرا احترام باقی نہیں رہے گا۔ فخرو بائی اپنی دولت کے ایک معمولی حصے کی بات کرتا ہے۔ اگر وہ ساری دنیا کے خزانے میرے قدموں میں ڈال دے تب بھی میں اس سے چند حرفی گفتگو کا متحمل نہیں ہو سکتا اور گفتگو تو کجا میں اس کا چہرہ دیکھنے کا بھی روادار نہیں ہوں۔''

بلبن کے اس انداز فکر نے رعب وجلال شاہی میں یہاں تک اضافہ کیا تھا کہ عوام وخواص اپنے دلوں پر اس کی ہیبت کا عکس محسوس کرتے تھے۔ بلبن اپنے اقتدار کی توسیع کے ساتھ رعایا کے سکون اور خوش حالی کو بھی پیش نظر رکھتا تھا۔

سلطان شمس الدین التمش کے انتقال کے بعد جب اس کے بیٹے رکن الدین فیروز شاہ اور بیٹی رضیہ سلطانہ میں اقتدار کی جنگ چھڑی تو ملک کے بعض علاقوں میں شدید انتشار پھیل گیا اور ان پر قانون کی گرفت کمزور ہوتی چلی گئی۔ ان ہی شورش زدہ علاقوں میں دہلی کا مضافاتی علاقہ بھی شامل تھا۔ حکمرانوں کی ذاتی کشمکش سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میواتی لٹیروں نے قتل و غارت کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ یہ قزاق دہلی کے قرب و جوار کے گھنے جنگلات میں روپوش رہتے تھے۔ جب ہر طرف رات کا اندھیرا پھیل جاتا تو یہ لٹیرے اپنی کمین گاہوں سے باہر آتے اور پرامن شہریوں کے گھروں میں داخل ہو کر ان کا مال و اسباب لوٹ لیتے۔ پانی بھرنے والی لونڈیوں (کنیزوں) پر چھاپے مار کر انہیں ذلیل کرتے۔ تجارتی قافلے بھی میواتی لٹیروں کے جور وستم سے محفوظ نہیں تھے۔ تخت نشینی کے بعد جب بلبن پر یہ اذیت ناک حقیقت ظاہر ہوئی تو وہ بہت زیادہ بے چین نظر آنے لگا۔ اس نے حکومت کے تمام ضروری کاموں کو التوا میں ڈالا اور منتخب سپاہیوں کا ایک بڑا لشکر لے کر دہلی سے روانہ ہوا۔ روانگی سے پہلے غیاث الدین بلبن سخت عالم غضب میں تھا اور اس کی زبان پر یہ الفاظ تھے۔

''انسانیت کے بزدل قاتلو! تمہارے دن شمار کیے جا چکے۔ میرے وہاں پہنچنے تک ظلم وتشدد اور حرص و ہوس کا

آخری پانسہ پھینک لو۔ تمہیں اس جوئے میں سب کچھ ہار جانا ہے۔ بس آخری بار حرام کی دولت کے ذخیروں کو دیکھ لو کہ اس کے بعد نہ سیم وزر کے انبار ہوں گے' نہ انہیں دیکھنے والی آنکھیں ......اور نہ انہیں چھونے والے ہاتھ۔"

وزیروں نے غیاث الدین بلبن کے چہرے پر اس جابر حکمران کے قہرناک جذبوں کا رنگ دیکھا تھا جو اپنے دشمنوں اور فساد برپا کرنے والوں کی آئندہ نسلوں کا بھی وجود برداشت نہیں کرتا۔

اور پھر ایسا ہی ہوا۔ بلبن کی فوج نے لٹیروں کا اس طرح محاصرہ کیا کہ کسی ایک قزاق کے لئے بھی راہ فرار باقی نہیں رہی تھی۔ سلطان نے اپنے لشکر پر ایک نظر ڈالی اور شمشیر اجل کو نیام سے باہر کھینچا۔ یہ ایک مخصوص فوجی اشارہ تھا جس کا مفہوم تھا کہ لٹیروں کی پناہ گاہوں پر یلغار کی جائے۔ سپاہیوں نے احتراماً اپنے سر جھکا لئے اور بے نیام شمشیروں کا رخ زمین کی طرف کر دیا۔

یکایک بلبن کی بارعب آواز گونجی۔ "تمہیں حکم ہے کہ مفسدوں کے خون سے جنگل کے ایک ایک درخت کو سیراب کر دو۔ پھر جب یہ درخت انسانی خون کا ذائقہ چکھ چکیں تو ان میں آگ لگا دو۔"

فرمان شاہی کے آخری الفاظ ختم ہوئے اور بلبن کے سپاہیوں نے میواتی لٹیروں کے ٹھکانوں پر اس طرح حملہ کیا کہ جیسے ان کے سامنے تمام دنیا کے لشکر جمع ہو گئے ہوں اور یہ معرکہ ان کی زندگی کا آخری معرکہ ہو۔

سلطانی فوجوں نے پیش قدمی کی اور لٹیروں کی ایک ایک کمین گاہ کو جبر و تشدد کا نشانہ بنا ڈالا۔ گھنے جنگلات میں ان لٹیروں نے بڑے محفوظ مکانات بنا رکھے تھے مگر کوئی پناہ گاہ فرشتہ اجل کی پہنچ سے دور نہیں ہوتی۔ جنگل میں ایک حشر سا برپا تھا۔ بلبن کے سپاہی بھی قتل ہو رہے تھے مگر ان کی تعداد برائے نام تھی۔ اس کے برعکس قزاقوں کا جانی نقصان بہت زیادہ ہو رہا تھا۔ اگر کھلے میدان میں یہ مقابلہ ہوتا تو بلبنی لشکر چند گھنٹوں میں لٹیروں کو ان کے عبرتناک انجام تک پہنچا دیتا' لیکن درختوں کی رکاوٹیں اور انجانے محاذ کی دشواریوں نے شاہی فوجوں کے مختصر کام کو طویل بنا دیا تھا۔ پھر بھی سورج غروب ہونے سے پہلے ہی بلبن کے سپاہیوں نے اس فتنے کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا جو کئی سال سے آزادی کی فضا میں پرورش پا رہا تھا۔

اس خونیں کارروائی سے فراغت پاتے ہی سلطانی لشکر کا سپہ سالار تاریک جنگل سے نمودار ہوا اور اس نے بلبن کے سامنے حاضر ہو کر نصرت و کامرانی کی خبر سنائی۔

"شہنشاہ عالم پناہ! آپ کی سلطنت کے فتنہ پردازوں کے لئے اب اس زمین پر کوئی پناہ نہیں۔ آسمان نے بھی ان کے سروں سے اپنا سائبان کھینچ لیا ہے۔ جنگل میں کسی لٹیرے کا وجود باقی نہیں رہا اور سلطانی شمشیروں نے قزاقوں کے خون کا ایک ایک قطرہ چاٹ لیا۔"

بلبن کے پتھریلے چہرے پر ایک لمحے کے لئے نرمی کی علامت آشکار ہوئی' مگر فوراً ہی غائب ہو گئی۔ ابھی وہ اپنے سپہ سالار کے دعوے سے مطمئن نہیں تھا۔ "قزاقوں کی زندگی کے امکان تک مٹا دو۔" یہ اسی حکم کی تجدید تھی جو سلطان غیاث الدین بلبن۔ نے حملے سے پہلے اپنے سپاہیوں کو دیا تھا۔

نیا فرمان جاری ہوتے ہی پورے جنگل کو آگ لگا دی گئی۔ اس خونریز معرکہ میں تقریباً ایک لاکھ لٹیرے قتل کئے گئے ......اور وہ طویل و عریض زمین جو قاتلوں کا مسکن بنی ہوئی تھی' اسے بلبن نے زراعت پیشہ لوگوں میں تقسیم کر دیا۔

اس واقعہ کے بعد بلبن کے ہیبت و جلال میں مزید اضافہ ہوا اور اہل ہند کو یہ اندازہ ہو گیا کہ ان کا حکمراں ایک دن کے لئے بھی اپنی مملکت میں فتنہ و فساد کو برداشت نہیں کر سکتا۔

بلبن کی سخت گیر فطرت کا یہ حال تھا کہ کبھی کبھی اس کے عمل سے سفاکی جھلکنے لگتی تھی۔ وہ بغاوت و سرکشی کو ناپسند

کرتا تھا اور اسے نافرمانی سے شدید نفرت تھی۔ باغی خواہ مسلم ہو یا غیر مسلم' بلبن اس کی سرزنش میں کسی رعایت کا قائل نہیں تھا۔ بلبن کا نظریہ حکمرانی یہ تھا کہ ملک میں امن و امان برقرار رکھنے کے لئے مفسدین کو سخت سے سخت سزا دی جائے اور وہ اپنے اس نظریے پر ہمیشہ کاربند رہتا تھا۔ کسی ایک موقع پر بھی اس کے طرز عمل میں لچک نمایاں نہیں ہوئی۔ جب وہ مجرموں کو سزا دیتا تو قطعاً اس کا لحاظ نہ رکھتا کہ دی جانے والی سزا شرع کے مطابق ہے یا خلاف۔ کسی دوسرے کا تو ذکر ہی کیا' بلبن نے اپنے آقا سلطان التمش کے خاندان کو بھی معاف نہیں کیا۔ وہ انہیں اپنا دشمن سمجھتا تھا اور ان کے قتل کے لئے مختلف بہانے تراشتا رہتا تھا۔ یہاں تک کہ سلطان التمش کے خاندان کا وہ فرد بہت خوش نصیب ہو گا جو بلبن کی شمشیر اختیار سے محفوظ رہ گیا ہو۔ غالباً بلبن کی ان ہی جفا کاریوں کو بنیاد بنا کر بعض مورخین نے یہ شک ظاہر کیا ہے کہ سلطان ناصر الدین محمود کو موت بلبن کے زہر دینے سے واقع ہوئی تھی۔

بلبن سزائیں دینے کے سلسلے میں پتھر سے بھی زیادہ بے حس انسان تھا۔ اس نے کئی بار تشدد کی اس روایت کو دہرایا کہ کسی ایک شخص کی بغاوت کو کچلنے کے لئے اس نے پورا شہر تباہ کر ڈالا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی مملکت کے لوگ سہمے ہوئے رہتے تھے اور سوتے جاگتے بلبن کی اطاعت کا دم بھرتے رہتے تھے۔

اس سخت گیری کے مظاہروں کے باوجود غیاث الدین بلبن حق و انصاف سے بھی کام لیتا تھا۔ امیر جامدار کا بیٹا ملک نعیق جو بدایوں کا صوبے دار تھا اس نے ایک فراش کو اس قدر مارا کہ وہ زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے مر گیا۔ ایک معمولی سی خطا پر انسانی جان کا لے لینا بہت بڑا واقعہ تھا مگر ملک نعیق کے سامنے کس کی جرأت تھی جو اس حیوانی عمل پر لب کشائی کرتا۔ غریب فراش کے اہل خاندان اپنے اپنے بند گھروں کے گوشوں میں ماتم کر کے خاموش ہو گئے۔ پھر جب کچھ عرصے بعد غیاث الدین بلبن بدایوں پہنچا تو اس مرحوم فراش کی بیوہ بلبن کے حضور فریاد لے کر آئی۔

بلبن نے تمام واقعہ سنا اور فراش کی بیوہ سے کہا۔ ''کیا تو اپنے اوپر کئے جانے والے ظلم کے خلاف کوئی گواہی فراہم کر سکتی ہے؟''

''سلطان میری بیوگی کی طرف دیکھئے۔ یہی اس ظلم پر سب سے بڑی گواہی ہے۔'' فراش کی بیوہ نے گریہ و زاری کرتے ہوئے کہا کیا میرے ویران چہرے' میرے بہتے ہوئے آنسوؤں اور میرے سفید لباس کی شہادت کافی نہیں؟ حاکم بدایوں نے صرف اپنی شاہانہ ضد اور انا کو برقرار رکھنے کے لئے مجھے بیوہ بنا دیا۔ شہنشاہ اگر میری گواہی کو قبول نہیں فرمائیں گے تو پھر پورے بدایوں میں ملک نعیق کے خلاف کوئی زبان کھولنے والا نہیں۔ سب لوگ اپنی عورتوں کی بیوگی اور بچوں کی یتیمی کے خوف سے گونگے بن گئے ہیں۔ مجھے اہل شہر سے کوئی شکایت نہیں کہ وہ بے دست و پا ہیں اور شاہی قانون سے بھی کوئی گلہ نہیں کہ شہادت کے بغیر قانون بھی مجبور ہے۔ خدا شہنشاہ کو ان مجبوریوں سے محفوظ رکھے۔ ایک بیوہ کی مجبوریاں اتنی اہم نہیں کہ قانون اپنا مزاج بدل ڈالے۔ یہ کہہ کر فراش کی بیوہ جانے کے لئے مڑی مگر دوسرے ہی لمحے بلبن کی بارعب آواز نے اس کے پیروں میں زنجیر ڈال دی۔

ہندوستان کا حکمران غضب ناک لہجے میں کہہ رہا تھا۔ ''بلبن کا قانون اتنا عاجز نہیں کہ بستی میں شہادت نہ ملنے کے سبب ایک بیوہ کے ساتھ انصاف نہ کر سکے۔ ہماری جاگتی آنکھوں نے کئی خوف زدہ چہروں پر لکھی ہوئی شہادت تلاش کر لی ہے۔ اب ہم گواہوں کی جنبش لب کے بغیر ہی تیرے ساتھ مکمل انصاف کریں گے۔''

اس کے بعد غیاث الدین بلبن نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا۔ ''ملک نعیق کے اتنے درے لگائے جائیں کہ وہ فراش کی طرح اپنے انجام کو پہنچ جائے۔''

پھر فوراً ہی حکم شاہی کی تعمیل کی گئی۔ ملک نعیق کا خوشبوؤں سے بسا ہوا جسم تازیانوں کا ہدف بن گیا تھا اور ہر طرف اس کی دلخراش چیخیں گونج رہی تھیں۔ ریشمی پیرہن تار تار ہو کر خون کی آمیزش سے بدن پر چپکنے لگا۔
حاکم بدایوں نے بلبن سے کئی بار زندگی کی بھیک مانگی مگر فرماں روائے ہند نے کہا کہ وہ ایسے مجرموں کو صرف موت کی خیرات دیتا ہے۔ بلبن کے رحم سے مایوس ہو کر ملک نعیق نے آسمان کی طرف دیکھا۔ بلبن کو مجرم کی یہ حرکت بہت ناگوار گزری۔ اُس نے دوسرے درباریوں کو سنانے کی غرض سے کہا۔
''آسمان سے بھی اسی عمل کا جواب آتا ہے جو زمین پر کیا جا چکا ہے۔ اب تیرے لیے موت کے سوا کوئی دوسرا دروازہ نہیں کھلے گا۔''
ابھی غیاث الدین بلبن کے الفاظ کی بازگشت ختم نہیں ہوئی تھی کہ ملک نعیق لہرا کر فرش پر گر پڑا۔ جلاد کے خونی ہاتھ دو چار مرتبہ فضا میں بلند ہوئے اور ملک نعیق کا جسم ساکت ہو گیا۔
فراش کی بیوہ کے چہرے کی وحشتیں ختم ہو گئیں۔ لیکن دیگر تماشائی اپنا سکون کھو بیٹھے اور اُن میں سے ہر ایک کو یوں محسوس ہونے لگا جیسے آج وہ کل ہماری باری ہے۔ حاضرین دربار اور دوسرے لوگوں کا خیال تھا کہ حاکم بدایوں ملک نعیق کے جرم کی سزا پوری ہو چکی ہے۔ مگر بلبن کے انصاف کے مطابق ابھی یہ سزا تکمیل تک نہیں پہنچی تھی۔
جب ملک نعیق کی روح پرواز کر گئی تو سلطان نے دوسرا حکم جاری کر دیا۔ ''اس کی لاش شہر کے دروازے پر لٹکا دو کہ دیکھنے والے عبرت حاصل کر سکیں اور لوگوں پر یہ حقیقت ظاہر ہو جائے کہ جس مظلوم کے پاس کوئی شہادت نہیں ہوتی ہم اُس کے مقدمے میں اس طرح انصاف کرتے ہیں۔''
غیاث الدین کے دورِ حکومت میں اسی انداز کا ایک اور واقعہ بھی پیش آیا تھا جسے دیکھ کر اہل دربار لرز اٹھے تھے۔
ایک بار بلبن کے ایک محبوب غلام ہیبت خان نے سرمستی کے عالم میں ایک شخص کو ہلاک کر ڈالا۔ مقتول کی بیوی بلبن کے حضور فریاد لے کر آئی۔ سلطان نے کسی تامل کے بغیر ہیبت خان کو پانچ سو درے لگائے جانے کا حکم دیا۔

❁❁❁

ہیبت خان نہایت سخت جان تھا۔ وہ پانچ سو درے برداشت کر گیا۔ نیم مردہ ہو جانے کے باوجود اس کی زندگی کو کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا۔ جب بلبن کو یقین ہو گیا کہ ہیبت خان کو موت نہیں آئے گی تو اس نے بیوہ عورت سے مخاطب ہو کر کہا۔

''ہیبت خان سزا سے پہلے میرا غلام تھا' لیکن اب یہ تیرا غلام ہے۔ میں اس کی زندگی پر تجھے مکمل اختیار دیتا ہوں۔ تو چاہے اسے قتل کر دے یا بخش دے۔ تیرے فیصلے پر کوئی اثر انداز نہیں ہوگا۔''

سلطان غیاث الدین بلبن کے اسی عدل و انصاف کے شور سے ہندوستان کا گوشہ گوشہ گونج رہا تھا۔ مگر جب ایک نوجوان شجاع الدین کامران کا مقدمہ بلبن کی عدالت میں پیش ہوا تو وہ انصاف سے کام نہ لے سکا اور اس سے بڑی خوفناک غلطی ہو گئی۔

شجاع الدین کامران نسلاً راجپوتوں کے ایک جنگجو گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے آباؤ اجداد صدیوں سے دہلی میں آباد تھے اور اس کے بزرگوں کی خون آشام تلواروں نے برہمنوں کے مذہب کو تحفظ فراہم کر رکھا تھا۔ مگر جب ترائن کی جنگ میں شہاب الدین غوری نے پرتھوی راج چوہان کے سر سے تاج زرنگاہ چھین کر اسے زنجیر غلامی پہنا دی اور پھر غزنی لے جا کر قتل کر ڈالا تو دہلی کے راجپوتوں میں صف ماتم بچھ گئی۔ برہمنی اقتدار پارہ پارہ ہو گیا اور شہاب الدین غوری کے غلام قطب الدین ایبک نے یلغار کر کے دہلی سے بھی اس کی آزادیاں چھین لیں۔ راجپوتوں کو مکمل شکست ہو گئی اور سربلند قوم کو اپنی جن شمشیروں پر ناز تھا وہ یا تو مسلمانوں کے آہنی ارادوں سے ٹکرا کر ٹوٹ گئیں یا پھر انہیں ذلت و بربادی کے زنگ نے چاٹ لیا۔

راجپوتوں کو اپنی اس شکست پر ملال بھی تھا اور حیرت بھی۔ ان کے تصورات میں بار بار وہ منظر ابھر رہا تھا جب پرتھوی راج چوہان نے شہاب الدین غوری کو 587ھ میں میدان جنگ سے فرار ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ دہلی اور اجمیر کے راجپوت سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ یہ زخمی شیر دوبارہ اس طرح پلٹے گا اور اپنی ہی طرح بہادر دوسرے شیر دل کی ایک پوری فوج کو نگل جائے گا۔ دہلی کے راجپوتوں کے خیال میں یہ ایک انہونی تھی' مگر ہو کر رہی۔

پھر یہ خبر بھی دہلی میں عام ہو گئی کہ راجپوتوں کی اس شکست کے پیچھے ایک مسلمان درویش حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کا ہاتھ ہے۔ پرتھوی راج ان ہی درویش کے ساتھ بے ادبی سے پیش آیا تھا اور پھر اسی گستاخی کے جواب میں حضرت خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا۔

''ہم نے بحکم خدا پرتھوی راج کو زندہ گرفتار کر کے شہاب الدین غوری کے حوالے کر دیا۔''

اجمیر کے راجپوتوں نے مسلمان درویش کے ان کلمات کا بہت مذاق اڑایا تھا۔ مگر جب آسمانی فیصلہ زمین پر نازل کیا گیا تو حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ کی پیش گوئی کا ایک ایک حرف درست ثابت ہوا۔ اس واقعے کے بعد اجمیر کے

راجپوتوں کی سوچ میں بڑا انقلاب رونما ہوا اور وہ بے شمار دیوتاؤں کی پرستش چھوڑ کر قطار در قطار حلقۂ اسلام میں داخل ہونے لگے۔

دہلی کے راجپوتوں کے ذہن بھی اس روحانی انقلاب سے محفوظ نہ رہ سکے۔ راجپوتوں کی ایک جماعت تو اسی وقت ایمان لے آئی تھی جب قطب الدین ایبک کے حملے نے ان کی صفوں کو درہم برہم کر دیا تھا۔ باقی راجپوت اپنے باپ دادا کے مذہب پر قائم تھے اور انہیں مندروں میں اپنے دیوتاؤں کی پوجا کی پوری آزادی حاصل تھی۔ راجپوتوں کو مسلمانوں کے اس کردار نے بھی متاثر کیا تھا کہ جن ہندوؤں کی شمشیریں بے نیام تھیں۔ مسلمان صرف ان ہی سے برسر پیکار تھے اور جن بت پرستوں نے اپنی تلواریں زمین پر پھینک کر قطب الدین ایبک سے امان طلب کی تھی انہیں اس طرح معاف کر دیا گیا تھا کہ ان کی جانیں بھی محفوظ تھیں اور عزت و آبرو بھی۔ نہ ان کی عبادت گاہوں کو کوئی خطرہ تھا اور نہ ان کے مذہبی عقائد کو...... راجپوتوں نے صرف اپنا اقتدار کھویا تھا۔ باقی زندگی کے تمام معمولات میں انہیں وہی آزادی حاصل تھی جس کا مطالبہ انہوں نے پرتھوی راج چوہان کے دور حکومت میں کیا تھا۔

شجاع الدین کامران کا دادا بھیم سنگھ چوہان بھی بہت غور سے اس عظیم انقلاب کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ اس کی بیوی کلاوتی نے اس سے کہا تھا۔

"ہمارے بیشتر ہم قوم ایک ایک کر کے اپنے بزرگوں کا مذہب چھوڑتے جا رہے ہیں۔ مسلمانوں کے حسن سلوک اور رواداری نے ہمیں بھی متاثر کیا ہے۔ پھر ہم کس چیز کا انتظار کر رہے ہیں؟"

راجپوت بھیم سنگھ کچھ دیر تک حیرت سے اپنی بیوی کا چہرہ دیکھتا رہا اور پھر انتہائی درشت لہجے میں کہنے لگا۔

"تم ایک راجپوت کی بیٹی ہو اور ایک راجپوت کی شریک حیات ہو۔ تم نے ایک غیور اور جرأت مند قوم کی کوکھ سے جنم لیا۔ اسی قوم کی آغوش میں تربیت پائی لیکن آج تمہاری گفتگو بزدلی اور کم ہمتی کی ترجمانی کر رہی ہے۔ تمہارے دل و دماغ پر مسلمانوں کی وقتی فتح کے اثرات ہیں اور اپنی قوم کے چند گمراہ لوگوں کی روش کو دلیل بنا کر میرے سامنے پیش کر رہی ہو۔ مگر اتنا سمجھ لو کہ میں اپنے باپ دادا کے مذہب سے بے وفائی نہیں کروں گا۔ چاہے ایک ایک راجپوت دیوتاؤں سے کیا ہوا عہد توڑ دے اور اس ہجوم میں شامل ہو جائے جو نصرت و کامرانی کے نشے سے سرشار ہے۔ مجھے بھگوان نے ایک راجپوت کی حیثیت سے پیدا کیا ہے۔ میں آخری سانس تک اپنی پہچان برقرار رکھنے کے لئے اسی لباس میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ پھر مجھے موت آ جائے مقدس آگ میرے جسم کو پھونک ڈالے اور پھر جمنا کا پانی میری راکھ کو بہا کر لے جائے۔" بھیم سنگھ نے نہایت سختی سے اپنی بیوی کے مشورے کو جھٹلا دیا تھا۔

شمس الدین التمش ایک درویش صفت حکمران تھا۔ اس کی رحم دلی اور انکسار نے دشمنوں کے ساتھ ان غیر مسلموں کو بھی متاثر کیا جو اب تک ایمان نہیں لائے تھے۔ التمش کے تخت نشین ہوتے ہی حلقۂ کفار میں عجیب سی لرزش پیدا ہوئی اور بھیم سنگھ کا بیٹا پرتاپ سنگھ بھی اپنے باپ کا ہم خیال تھا۔ اس لئے بے چاری کلاوتی بہت زیادہ پریشان نظر آتی تھی۔ باپ اور بیٹے دونوں نے مل کر اس کا جینا دشوار کر دیا تھا۔ بھیم سنگھ اور پرتاپ سنگھ راجپوتوں کی مکمل شکست کے باوجود نئے زمانے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ وہ زمانہ جو راجپوتوں کو ان کا کھویا ہوا اقتدار لوٹا دے گا اور مسلمانوں کو ان کے وطن غزنی کی طرف واپسی کے لئے مجبور کر دے گا۔ مگر حالات اس کے برعکس تھے۔ قطب الدین ایبک کو مسلسل فتوحات حاصل ہو رہی تھیں اور ہندوؤں کی دھرتی ماں پیہم مسلمانوں کے قدموں کے نیچے روندی جا رہی تھی۔

اجمیر سے برابر خبریں آ رہی تھیں کہ راجپوتوں کا اصل مرکز مسلمان درویش کے سامنے جھکا جا رہا ہے۔ کلاوتی

ان اطلاعات کو بہت غور سے سنتی اور پھر اپنے شوہر کو نقل کر دیتی کہ شاید اس طرح ان کے فیصلے بدل جائیں۔ ایک دن اس نے بھیم سنگھ اور پرتاب سنگھ سے نئی ہواؤں کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔

''موسم بہت تیزی سے بدل رہا ہے۔ دوسرے راجپوت بزدل نہیں ہیں کہ وہ عرب سے آنے والی ہواؤں کا خیر مقدم کر رہے ہیں۔ ان ہواؤں کی تاثیر ہی یہ ہے کہ جلتی ہوئی روحیں شگفتہ و شاداب ہو جاتی ہیں۔ اگر یہ جنگ فوجوں کی کثرت سے جیتی جا سکتی تو مسلمان کبھی فاتح قرار نہیں پاتے۔ وہ تعداد میں ہندوؤں سے بہت کم ہیں اور ان کی شمشیروں کی کاٹ بھی دنیا سے نرالی نہیں۔''

''پھر ایسا کیوں ہو رہا ہے؟'' بھیم سنگھ جھنجھلا کر اپنی بیوی سے پوچھتا۔

''یہ سب کچھ اس درویش کی تعلیمات کا اثر ہے۔'' کلاوتی اپنے شوہر کو جواب دیتی۔ اس کے اخلاق کی شمشیر کا زخم کبھی نہیں بھرتا۔ وہ چاہے تو پورے ہندوستان سے تنہا جنگ کر سکتا ہے۔ اسے تمہارے تمام لشکر مل کر بھی شکست نہیں دے سکتے۔ تم نے اپنے بہترین جادوگر بھیجے مگر اس کے سامنے پہنچ کر ایک ایک ساحر اپنا طلسم بھول گیا۔ تمہیں جوگی جے پال پر ناز تھا مگر آج وہی جوگی اس مسلمان درویش کے پیروں پر سر رکھے ایک نگاہ کرم کی بھیک مانگ رہا ہے۔ کیا تم اب بھی ان ہواؤں کو نہیں پہچانتے؟ اگر کوئی انسان آگ میں جل جانا چاہتا ہے تو اسے کون روکے گا؟ لیکن جلنے سے پہلے ایک بار ان ہواؤں کے اثرات کو محسوس کرنے کی کوشش تو کرے۔ آج ہزاروں راجپوت ان ہی ہواؤں کی لوریاں سن کر خیر و عافیت کی گہری نیند سو رہے ہیں لیکن ایک ہم ہیں کہ ہمارے دن بھی مضطرب ہیں اور راتیں بھی بے خواب۔ یہ کہتے کہتے کلاوتی اداس ہو گئی۔ وہ ایک گیانی عورت تھی اور یہی گیان اسلام کی طرف اس کا دامن کھینچ رہا تھا۔

پھر جب قطب الدین ایبک کا انتقال ہوا تو راجپوت بھیم سنگھ نے اپنی بے پناہ خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کلاوتی سے کہا۔

''مسلمانوں کا سلطان مر گیا۔ اب تم دیکھو گی کہ چند روز میں یہ سلطنت بھی بکھر جائے گی۔ پھر وقت میرے خوابوں میں رنگ بھرے گا۔ مندروں کی گھنٹیاں اسی زور و شور سے بج اٹھیں گی اور برہمن اسی طرح ہمیں دیوتاؤں کی عظمت کے گیت سنائیں گے۔''

کلاوتی شوہر کی یہ گفتگو سن کر سلگ اٹھی۔ ''مندروں پر کس نے پہرے بٹھائے ہیں؟ ان کے دروازے تو اب بھی کھلے ہوئے ہیں۔ گھنٹیاں تو اسی پرشور انداز میں بج رہی ہیں۔ برہمن تو اسی طرح بھجن گا رہے ہیں مگر جانے والوں کو پھر بھی کوئی نہیں روک سکتا۔ تم اپنے مندروں کی طرف نہیں مسلمانوں کی مسجدوں کی جانب دیکھو۔ وہاں ان کے حاکم اور رعایا صف بہ صف کاندھے ملائے کھڑے ہیں۔ ان میں امیر و غریب کا کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ تمہارے مذہبی رہنماؤں نے بھگوان کے پجاریوں کو کتنے فرقوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ہندوؤں کے ان طبقوں کی طرف بھی دیکھو جن کی زندگی حیوانوں سے بدتر ہے۔ نہ حکمران ان کے سروں پر سایہ کرتے ہیں اور نہ دیوتا انہیں دھوپ کی تپش سے محفوظ رکھتے ہیں۔ وہ صدیوں سے جل رہے ہیں۔ مسلمانوں نے انہیں نفرتوں کی دھوپ سے نکال کر محبت کی چھاؤں میں بٹھایا ہے۔ اس لئے وہ برہمنوں کے بھجن اور کیرتن سننے کے بجائے اذانیں سن رہے ہیں اور راجپوتوں کی بستی میں پہلی اذان اسی درویش نے دی ہے جو خود تو اجمیر میں موجود ہے لیکن اس کا پیغام دہلی میں سنا جا رہا ہے۔ قطب الدین ایبک کی موت پر جشن نہ مناؤ کہ مسلمانوں کے یہاں انسانوں کا قحط نہیں ہے۔ کوئی دوسرا سلطان آ جائے گا اور تم اسی طرح اپنی ناکام حسرتوں کی آگ میں جلتے رہو گے۔'' کلاوتی انتہائی جوش اضطراب میں بول رہی تھی مگر بھیم سنگھ اور

پرتاب کے دلوں پر اس کی باتوں کا کوئی اثر مرتب نہیں ہو رہا تھا۔ دونوں باپ بیٹے کے دل پتھر کے تھے جن سے ٹکرا کر ہر بار کلاوتی کے نرم و نازک الفاظ ٹوٹ جاتے تھے۔

گردش روز و شب جاری رہی اور وقت تیز رفتاری کے ساتھ گزرتا رہا۔ قطب الدین ایبک کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا آرام شاہ تخت دہلی پر جلوہ افروز ہوا مگر وہ ایک نااہل حکمران تھا۔ آرام شاہ کی حماقتوں کے سبب ایک ہی سال کے اندر تمام ملک انتشار کی نذر ہو گیا۔ بالآخر امرا نے ایک متفقہ فیصلے کے تحت آرام شاہ کو معزول کر دیا اور اس کی جگہ قطب الدین ایبک کے منہ بولے بیٹے اور داماد شمس الدین التمش کو تخت دہلی پر بٹھا دیا۔ التمش ان دنوں بدایوں میں تھا۔ امرا نے اسے خط لکھ کر بلایا۔ وہ خط ملتے ہی فوراً دہلی پہنچا اور سلطنت پر قابض ہو گیا۔

جب آرام شاہ کو امرا کے ارادے اور التمش کی آمد کی خبر ہوئی تو وہ شہر سے نکل کر دہلی کے ایک قریبی علاقے میں خیمہ زن ہو گیا اور جس وقت اسے یہ اطلاع ملی کہ التمش اس کے تخت پر قابض ہو گیا ہے تو اس نے اپنے باپ کے چند وفادار سرداروں سے مدد مانگی۔ قطب الدین ایبک کے کچھ امرا جو سیاسی بصیرت نہیں رکھتے تھے آرام شاہ کے ساتھ تعاون کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ آرام شاہ ایک بڑا لشکر لے کر دہلی پر حملہ آور ہوا۔ التمش نے بڑی مردانگی کے ساتھ مقابلہ کیا۔ یہاں تک کہ اسے عظیم الشان فتح حاصل ہوئی اور آرام شاہ میدان جنگ سے فرار ہو گیا۔ اس فتح کے بعد شمس الدین التمش کو ہندوستان کا بااختیار بادشاہ تسلیم کر لیا گیا۔ آرام شاہ نے ایک سال سے کچھ کم مدت تک حکومت کی۔

شمس الدین التمش ایک درویش صفت حکمران تھا۔ اس کی رحم دلی اور انکسار نے دشمنوں کے ساتھ ان غیر مسلموں کو بھی متاثر کیا جو اب تک ایمان نہیں لائے تھے۔ التمش کے تخت نشین ہوتے ہی حلقۂ کفار میں عجیب سی لرزش پیدا ہوئی اور ایک بار پھر بے شمار ہندوؤں نے اپنے ماتھوں کا قشقہ کھرچ ڈالا ......اور گردنوں میں پڑی ہوئی زنار توڑ کر پھینک دی۔ جب التمش کے حسن اخلاق کا چرچا عام ہوا تو کلاوتی نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور ایک دن اپنے شوہر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"قطب الدین ایبک دنیا سے رخصت ہوا تو شمس الدین التمش نے عنان حکومت سنبھال لی۔ جانے والے سے آنے والا زیادہ بڑا انسان ہے۔ تم دیکھ رہے ہو کہ تمہارے ہم قوم کس ذوق و شوق سے مسجدوں کی طرف جا رہے ہیں۔ کیا اب بھی تم نے مندروں کی ویرانی پر نظر نہیں کی؟ کیا تم مندر چھوڑنے والے آخری شخص ہو گے؟ کیا میری زندگی میں وہ وقت نہیں آئے گا کہ میں تمہیں اور پرتاب سنگھ کو ان لوگوں کی قطار میں کھڑا دیکھ سکوں جو یہ کہتے ہیں کہ خدا ایک ہے اور وہ بے جان پتھر کی مورتوں میں کبھی نہیں ڈھل سکتا۔" کلاوتی کے لہجے میں بڑا کرب تھا' بڑی خلش تھی۔

مگر بھیم سنگھ اور پرتاب سنگھ کے سنگلاخ سینوں میں ابھی تک کوئی ہلکا سا شگاف بھی نہیں پڑا تھا۔ وہ اسی انداز میں سوچ رہے تھے کہ ایک دن مسلمانوں کی حکومت زوال پذیر ہو گی۔ کاروان شب فنا کی وادیوں میں گم ہو جائے گا اور راجپوتوں کی اقبال مندی کا سورج دوبارہ طلوع ہو گا۔ یہ دو دیوانے تھے جو کھلی آنکھوں سے ایک ہی خواب دیکھے جا رہے تھے۔

پھر ایک دن اچانک کلاوتی بیمار ہو گئی۔ بھیم سنگھ اور اس کا بیٹا سمجھ رہے تھے کہ یہ کوئی عارضی روگ ہے جو بہت جلد دور ہو جائے گا لیکن کلاوتی کا مرض بڑھتا چلا گیا۔ بڑھاپے نے اسے پہلے ہی تھکا دیا تھا۔ پھر راجپوتوں کی شکست نے اس کے دل و دماغ پر برا اثر ڈالا اور جب وہ اپنے بزرگوں کے عقائد سے لڑتے لڑتے سلامتی کے راستے پر جانا

چاہتی تھی تو شوہر اور بیٹے کی محبت نے اسے ناقابل شکست زنجیر پہنا دی تھی۔ کلاوتی جب بھی اپنے کرب کا اظہار کرتی تو بھیم سنگھ عالم طیش و غضب میں ایک ہی بات کہتا۔

"اگر تجھے مسجدوں سے اتنی ہی محبت ہے تو اکیلی کیوں نہیں چلی جاتی؟"

جواب میں کلاوتی تڑپ اٹھتی ...... میں تنہا کیسے جاؤں کہ سنسار کے موہ نے مجھے جکڑ رکھا ہے۔ اگر چلی بھی گئی تو لوگ طعنے دے دے کر مار ڈالیں گے کہ شوہر کو بڑھاپے میں چھوڑ دیا۔

"میرے بڑھاپے کی فکر نہ کرو کہ میں اب بھی تنہا جینے کا حوصلہ رکھتا ہوں۔" بھیم سنگھ نے اسی زہر آلود لہجے میں جواب دیا۔ "کلاوتی تو میرے لئے اسی دن مر گئی تھی جب تیرے دل میں پہلی بار اپنے پرکھوں کے مذہب کے خلاف بغاوت کا جذبہ ابھرا تھا۔"

"ہاں میرا دیہانت (انتقال) اسی روز ہو گیا تھا مگر میں اپنے شوہر اور بیٹے کے لئے اس امید پر زندہ تھی کہ شاید تم دونوں کو بھی وہ روشنی مل جائے جسے میں اپنے دل کے قریب محسوس کر رہی ہوں۔"

اب بھیم سنگھ کے لئے کلاوتی کی باتیں ناقابل برداشت ہو گئی تھیں۔ "کلاوتی مجھے خبر نہیں تھی کہ تیری فطرت اس قدر حریص ہے اور تیرے خون میں زمانہ سازی کا زہر بھرا ہوا ہے۔ مسلمانوں کو اقتدار کیا ملا تو ان کے مذہب کی بھی دیوانی ہو گئی۔ یہ بدعہدی ہے، یہ نفاق ہے جسے بھگوان بھی معاف نہیں کریں گے اور میں خود بھی شما نہیں کروں گا۔ میرا دل چاہتا ہے کہ تیرا گلا وقت سے پہلے گھونٹ کر تجھے موت کی گہری نیند سلا دوں۔" بھیم سنگھ کے ہونٹوں سے نفرت کی آگ برس رہی تھی۔ "تجھے راجپوتوں کی تاریخ تو یاد ہو گی کہ جب وہ اپنے دشمن سے مقابلہ کرنے کے لئے گھروں سے نکلتے اور اگر انہیں یہ اندیشہ لاحق ہوتا کہ دشمن غالب آ جائیں گے تو وہ اپنے مکانوں کو آگ لگا دیتے اور بیویوں کو اس خوف سے جلا ڈالتے کہ دشمنوں کے سیاہ ہاتھ ان کی عزت و آبرو کے دامن تک نہ پہنچ سکیں۔ یہ بھی ایک ایسی ہی جنگ ہے۔ دشمن تیرے دل و دماغ پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ تو مسلمانوں کا مذہب اختیار کر کے اپنے دھرم سے بے وفائی کرے میرا دل چاہتا ہے کہ تجھے بھی آگ کا ایندھن بنا ڈالوں۔" بھیم سنگھ جوش جذبات میں اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا۔

باپ کی یہ وحشیانہ کیفیت دیکھ کر بیٹے پرتاب سنگھ کا دل پگھلنے لگا۔ آج پہلی بار اسے اپنی ماں پر ترس آ رہا تھا۔ پتا جی! آپ یہ کیسی سنگ دلانہ گفتگو کر رہے ہیں۔ اگر ماتا جی کے نظریات سے آپ کو اتنی ہی نفرت ہے تو پہلے اجمیر اور دہلی کے ان ہزاروں راجپوتوں کے گھروں کو آگ لگائیں جو علی الاعلان مسلمانوں کے مذہب میں داخل ہو چکے ہیں۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ وہ آپ کی محبت میں اپنے نظریات کی مسلسل قربانی دے رہی ہے اور آپ ان کی زندگی کا خاتمہ کرنے کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔" پرتاب سنگھ کا لہجہ باغیانہ تو نہیں تھا مگر اس کی گفتگو سے سرکشی کے آثار نمایاں ہو چلے تھے۔

جوان بیٹے کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر باپ کو ہوش آ گیا۔ پھر وہ خاموشی سے اٹھ گیا اور کلاوتی کی حالت روز بروز بگڑتی چلی گئی۔

پھر وہ لمحات بھی آ گئے جب کلاوتی کی سانسیں اکھڑنے لگیں۔ شوہر بھیم سنگھ اور بیٹا پرتاپ سنگھ دونوں اس کے سرہانے بیٹھے تھے۔ ان دونوں کے علاوہ خاندان کے چند بوڑھے مرد اور عورتیں بھی کلاوتی کے آخری وقت میں موجود تھیں۔ جب بوڑھی عورت کے تنفس میں انتشار پیدا ہو گیا اور زندگی کا کوئی امکان باقی نہیں رہا تو کلاوتی نے نحیف آواز میں شوہر کو پکارا۔

"میرے قریب آجاؤ اب ایسا لگتا ہے کہ میں زندہ نہیں بچوں گی۔" کلاوتی نے اپنی اس اذیت ناک کیفیت کی طرف اشارہ کیا جس سے وہ دوچار تھی۔

بھیم سنگھ کو یکایک احساس ہو گیا اور ایک عمر کی رفاقت نے اسے اشک ریزی پر مجبور کر دیا۔ "نہیں کلاوتی! ایسی مایوس کن باتیں نہ کرو۔ تم بہت جلد صحت یاب ہو جاؤ گی۔" بھیم سنگھ نے بیوی کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"تمہارے جذبے اور تمہاری محبت سے سچائی کو نہیں بدلا جا سکتا اور سچائی یہ ہے کہ میں اس دنیا سے جانے والی ہوں۔ بس چند لمحوں کی بات ہے کہ تم سے ہر رشتہ منقطع ہو جائے گا۔ اس لئے میری وصیت کو بہت غور سے سنو۔"

صورت حال کی سنگینی نے باپ اور بیٹے کو چونکا دیا۔ اب وہ ہمہ تن گوش ہو کر کلاوتی کے نحیف و نزار جسم پر جھکے ہوئے تھے اور اس کی باتیں سننے کی کوشش کر رہے تھے۔

"میں مر جاؤں تو میرے جسم کو آگ کے حوالے نہ کرنا۔" کلاوتی نے اب اپنی بغاوت کا کھل کر اظہار کر دیا تھا۔

"کیوں؟" ایسی نازک ساعتوں میں بھی بھیم سنگھ کے ماتھے پر بل پڑ گئے تھے۔

"اس لئے کہ اب میں آگ کے تقدس کو تسلیم نہیں کرتی۔" کلاوتی کی آواز لرز رہی تھی، مگر چہرے پر غیر معمولی ٹھہراؤ تھا۔

"ماتا جی! بھگوان کا نام لیں۔" بیٹا پرتاپ سنگھ گھبرا کر بولا۔

"رام کو آواز دو' کرشن کو پکارو کہ ان ہی کے نام سے انسان کو مکتی (نجات) حاصل ہوتی ہے۔"

"بیٹے! میں بہت کوشش کرتی ہوں مگر یہ نام میرے ہونٹوں پر نہیں آتے۔" کلاوتی نے بڑی بیبا کی کے ساتھ اعتراف کر لیا۔

"پھر تیری زبان پر کس کا نام آتا ہے؟" بھیم سنگھ نے اس نازک وقت میں بمشکل اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔

"اللہ اور محمد ﷺ اب صرف یہی دو نام یاد آتے ہیں۔" یہ کہتے کہتے کلاوتی کے چہرے پر ایک روشنی سی پھیل گئی اور ہونٹوں پر ایک آسودہ سی مسکراہٹ ابھر آئی۔

بھیم سنگھ بازی ہار چکا تھا' مگر وہ اپنی بیوی کے آخری وقت میں مشتعل ہونا نہیں چاہتا تھا۔ "تو پھر مسلمانوں کے خدا کو یاد کر کے تو اپنی ضد نہیں چھوڑے گی۔"

"یہ ضد نہیں پربھو (مالک) مکتی مارگ (نجات کا راستہ) ہے۔" کلاوتی کی آواز لحظہ بہ لحظہ مدھم ہوتی جا رہی تھی۔ میری آخری خواہش ہے کہ تم بھی پرکھوں کی روش چھوڑ کر اسی راستے پر چلنا آج میرا جیون شانتی سے بھر گیا ہے۔ اتنا سکون تو زندگی میں کبھی محسوس نہیں کیا۔ سارے پاٹھ' سارے بھجن اور سارے کیرتن رائیگاں گئے۔ اگر کچھ کام آیا تو وہی دو نام اللہ اور محمد ﷺ...... میں تمہیں بھی ان ہی دونوں ناموں کے سہارے چھوڑ کر جا رہی ہوں۔"

یہ کہہ کر کلاوتی خاموش ہو گئی۔ پھر اس نے بولنا بھی چاہا تو ہونٹوں کو جنبش دینے کے سوا کچھ نہ کر سکی۔ بس محبت آمیز نظروں سے اپنے شوہر اور بیٹے کو دیکھتی رہی۔ یکایک اس کی آنکھوں کی پتلیاں پھرنے لگیں۔ سانس آہستہ ہوتے ہوئے ڈوبنے کی منزل میں آ گئی۔ روح جسم کا ساتھ چھوڑنے والی تھی کہ ناگہاں کلاوتی کی زبان پر وہی دو نام ابھرے۔

جن کی خاطر وہ برسوں سے اپنے شوہر اور بیٹے کے ساتھ جنگ کر رہی تھی ...... اللہ ...... محمد ﷺ ...... ابھی

فضاؤں میں ان الفاظ کی گونج باقی تھی کہ ایک راجپوت عورت کی زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔
اب بھیم سنگھ پرتاپ سنگھ اور دوسرے خاندانی رشتے داروں کے لئے ایک اور سنگین مرحلہ درپیش تھا۔ کلاوتی نے وصیت کی تھی کہ اسے آگ میں نہ جلایا جائے۔ ایک ہندو عورت کی حیثیت سے وہ آگ کی مستحق تھی' مگر آخری وقت میں اس نے اپنے بھگوانوں اور دیوتاؤں کا نام لینے سے انکار کر دیا تھا۔ لوگوں کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کلاوتی کا انجام ہندو دھرم پر ہوا ہے یا مذہب اسلام پر۔ برہمن کہہ رہے تھے کہ اس نے اپنے پرکھوں کے دھرم پر جان دی ہے۔ آگ میں نہ جلانے کی وصیت کرنا اور اللہ اور محمد ﷺ کے ناموں کی تکرار کرنا اسلام کی علامت نہیں۔ وہ مسلمانوں کے مذہب سے متاثر تھی۔ اس لئے آخری وقت میں ہوش و حواس گم ہو جانے کے سبب بہکی بہکی باتیں کر رہی تھی۔ تمام برہمنوں' پنڈتوں اور گیانیوں کا یہی فیصلہ تھا کہ کلاوتی کا خاتمہ ہندو مذہب پر ہوا لہٰذا اس کے تن مردہ کو آگ میں جلایا جائے اور پھر اس کی آگ مقدس جمنا کے پانی میں بہا دی جائے۔
برہمن اپنا فیصلہ سنا چکے تھے مگر بھیم سنگھ اپنی بیوی کا شدید مخالف ہوتے ہوئے بھی پنڈتوں کے فیصلے سے مطمئن نہیں تھا۔ کلاوتی کی لاش پلنگ پر رکھی تھی اور وقت تیزی سے گزرتا جا رہا تھا۔ باپ اور بیٹا شدید ذہنی کشمکش کا شکار تھے۔ پھر جب یہ واقعہ مسلمانوں نے سنا تو وہ حیران رہ گئے۔ ان لوگوں نے خود تو کوئی فتویٰ نہیں دیا مگر بھیم سنگھ سے اتنا ضرور کہا کہ وہ مفتی اعظم شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ سے ملاقات کر کے انہیں ساری صورت حال بتائیں۔ جب کلاوتی کی آگ میں نہ جلائے جانے کی وصیت موجود ہے تو پھر ایک ہندو عورت کا انتم سنسکار کس طرح کیا جائے گا۔
بالآخر اس کشمکش سے نجات حاصل کرنے کے لئے بھیم سنگھ' اس کا بیٹا پرتاپ سنگھ اور کچھ مسلمان شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ کے مکان پر پہنچے اور جب تمام واقعہ بے کم و کاست بیان کیا تو شیخ الاسلام نے فوری فتویٰ دے دیا کہ وہ عورت اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھی۔ اس لئے اس کے عمل کو بطور دلیل پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اگر وہ پورا کلمہ اپنی زبان سے ادا کر دیتی تو پھر اسے مسلمانوں کی صف میں شمار کیا جا سکتا تھا۔ اسلام خدا کی وحدانیت کے بعد رسالت کی صداقت پر مکمل گواہی دینے کا نام ہے' چونکہ مرنے والی نے پوری شہادت نہیں دی اس لئے وہ مسلمان کہلانے کی حقدار نہیں۔ اس کا حشر ہندوؤں کے مذہب پر ہوا ہے۔ نتیجتاً اس کی آخری رسمیں بھی ہندو مذہب کے مطابق ادا کی جائیں گی۔
بھیم سنگھ کا کام آسان ہو گیا تھا مگر شیخ الاسلام کے حلقے میں موجود ایک دوسرے شخص نے اس فتوے پر اعتراض وارد کر دیا۔ اس شخص کا کہنا تھا کہ مرنے والی کے وارثوں کو حضرت خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفۂ اکبر حضرت قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کے روبرو حاضر ہونا چاہئے۔ وہ عقیدے اور ایمان کے نکتے کو ہم سب سے بہتر سمجھتے ہیں۔
شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ یہ سن کر برہم ہو گئے۔ وہ اپنے دل میں حضرت قطب رحمۃ اللہ علیہ کے لئے حسد اور عداوت کا شدید جذبہ رکھتے تھے۔ اس لئے بے اختیار بول اٹھے۔
''خانقاہ کے ایک گوشے میں قوالیاں سننے والے ایک فقیر کو دین کے علم سے کیا نسبت؟ شیخ الاسلام ہم ہیں اور مذہبی معاملات میں ہمارا فیصلہ ہی حرف آخر ہے۔''
بھیم سنگھ نے حیرت سے نجم الدین صغریٰ کے چہرے کو دیکھا اور پھر اس شخص سے مخاطب ہوا جس نے حضرت قطب رحمۃ اللہ علیہ کا حوالہ دیا تھا۔
''یہ بزرگ کون ہیں اور کہاں رہتے ہیں؟'' بھیم سنگھ نے دریافت کیا۔
''وہ حضرت خواجہ اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفۂ اکبر ہیں اور ''مہرولی'' میں قیام فرما ہیں۔'' اجنبی شخص نے وضاحت

کرتے ہوئے کہا۔ ''اس وقت ''مہرولی'' کا شمار دہلی کے مضافاتی علاقے میں ہوتا تھا۔

حضرت خواجہ اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کا نام سن کر بھیم سنگھ چونک اٹھا۔ یہ وہی نام تھا جس سے ایک ایک راجپوت کی سماعت آشنا تھی اور یہ وہی درویش تھے جن کی روحانی قوتوں نے پرتھوی راج کو زندہ گرفتار کر کے شہاب الدین غوری کے حوالے کیا تھا اور یہ وہی مسلمان بزرگ تھے جن کا ذکر کرتے کرتے کلاوتی موت کی آغوش میں جا پہنچی تھی۔ آج پہلی بار بھیم سنگھ کو اپنے دل میں شدید اضطراب کی لہر محسوس ہوئی تھی۔ حضرت خواجہ اجمیری رحمۃ اللہ علیہ دہلی میں موجود نہیں تھے مگر ان کے مرید کا اس شہر میں مقیم ہونا کسی سعادت سے کم نہیں تھا۔ بھیم سنگھ فوراً ہی اپنے بیٹے کے ہمراہ ''مہرولی'' جانے کے لئے آمادہ ہو گیا۔

پھر جب وہ حضرت قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کی بارگاہ میں حاضر ہوا تو اپنے ہوش و خرد ہی گنوا بیٹھا۔ حضرت قطب رحمۃ اللہ علیہ کے نورانی چہرے پر بھیم سنگھ اور اس کے بیٹے کی نگاہ ٹھہرنا دشوار تھا۔ جب بھی وہ دونوں بت پرست حضرت قطب رحمۃ اللہ علیہ کی طرف دیکھتے' انہیں محسوس ہوتا جیسے ان کے جسم جل اٹھے ہوں۔ حضرت قطب رحمۃ اللہ علیہ کے جبروت کا یہ عالم تھا کہ بھیم سنگھ اور پرتاپ سنگھ ایک مرد درویش کے ہیبت و جلال سے لرز رہے تھے۔ حضرت قطب رحمۃ اللہ علیہ نے آنے والوں کی کیفیت کو محسوس کر لیا اور پھر آپ حالت جمال میں ظاہر ہوئے۔

''آپ لوگوں نے کیسے زحمت کی؟'' حضرت قطب رحمۃ اللہ علیہ کا لہجہ اس قدر شیریں اور مہربان تھا کہ بھیم سنگھ اور پرتاپ سنگھ کی تمام سرکشی فنا ہو کر رہ گئی اور دونوں کے سیاہ دل ایک مرد روشن ضمیر کے آگے جھک گئے۔

پھر بھیم سنگھ نے رک رک کر اپنی بیوی کلاوتی کی موت کا واقعہ سنایا۔

حضرت قطب رحمۃ اللہ علیہ چند لمحوں تک غور کرتے رہے اور پھر آپ نے بھیم سنگھ کو مخاطب کر کے فرمایا۔

''یہاں کس شخص کو اس عورت کے مسلمان ہونے پر شک ہے؟''

بھیم سنگھ نے شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ کا نام لیا تو حضرت قطب رحمۃ اللہ علیہ نے جواباً فرمایا: ''ان کا اپنا نظریہ درست ہو سکتا ہے مگر تم نے جو حالات بیان کئے ہیں ان کے مطابق معلوم ہوتا ہے کہ وہ عورت ایک طویل عرصے سے اسلام کی محبت میں گرفتار تھی۔ تمہاری بیوی کے ہوش مند ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس نے آگ میں جلائے جانے کی رسم سے صریحاً انکار کر دیا۔ پھر مرتے وقت اپنے دیوتاؤں کے نام بھی نہیں لئے' تمہارے بقول اس کے ہونٹوں پر دو بار اللہ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اسمائے گرامی کا نزول ہوا۔ جب اس کی قوت گویائی سلب کی جا رہی تھی اس وقت بھی اس نے ''اللہ اور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو یاد کیا تھا۔ دل سے تو وہ اسلام کی حقانیت کی پہلے ہی قائل تھی مگر زبان سے بھی اس نے اپنے عقیدے کا اظہار کیا۔ وہ جب تک زندہ رہی تم لوگوں کو بھی اسلام کی طرف بلاتی رہی۔ یہ کوئی اضطراری کیفیت نہیں تھی اور یہ کوئی ہذیانی عمل بھی نہیں تھا۔ اس نے اپنے پورے ہوش و حواس میں ''اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم'' کا اقرار کیا تھا۔ اگرچہ یہ مروجہ گواہی نہیں تھی' لیکن پھر بھی میں اسے مکمل شہادت تسلیم کرتا ہوں۔ اس نے شریعت کے قانون کے مطابق دل اور زبان دونوں سے گواہی پیش کی اس لئے وہ مسلمان تھی اور اس کی آخری رسوم بھی اسلامی طریقے سے ادا ہونی چاہئیں۔''

حضرت قطب رحمۃ اللہ علیہ کی ایک نظر کرم نے بھیم سنگھ اور پرتاپ سنگھ کے دلوں میں چھپے ہوئے بتوں کو پہلے ہی پگھلا دیا تھا اور جب آپ نے ان دونوں سے طویل گفتگو کی تو کفر کی ساری رسمیں دھری کی دھری رہ گئیں۔

پھر اہل مجلس نے دیکھا کہ دونوں باپ بیٹے زار و قطار رو رہے تھے اور برملا اس کا اعتراف کر رہے تھے کہ ان دونوں نے مرنے والی کو بہت آزار پہنچائے ہیں۔

جواباً حضرت قطب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ "انسان کی آنکھ سے بہنے والے آنسو خدا کے نزدیک بہت زیادہ پسندیدہ ہیں۔ اگر انسان کی نیت درست ہے تو وہ آنسو عام گناہوں کو دھو دیتے ہیں۔" حضرت قطب رحمۃ اللہ علیہ کا اتنا فرمانا تھا کہ بھیم سنگھ اور پرتاپ سنگھ دونوں نے اس مرد جلیل کے آستانے پر سر رکھ دیئے اور جس طرح کلاوتی نے حضرت خواجہ اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کا اسم گرامی سن کر اپنا مذہب بدل ڈالا تھا۔ اسی طرح بھیم سنگھ اور پرتاپ سنگھ حضرت قطب رحمۃ اللہ علیہ کے حضور اپنے عقائد فروخت کر آئے تھے۔

پھر جب دونوں باپ بیٹے واپس گئے تو انہیں مرحومہ کلاوتی کے چہرے پر عجیب سا حسن نظر آ رہا تھا۔ بھیم سنگھ اور پرتاپ سنگھ دونوں نے بیک وقت یہ بات محسوس کی۔ مرنے والی کے چہرے پر ایک اجالا سا تھا ورنہ عام بت پرستوں کی لاشوں کا یہ حال ہوتا ہے کہ ان کے چہرے مسخ ہو جاتے ہیں۔

پھر وہ منظر بڑا عجیب تھا جب کلاوتی کا جنازہ اٹھا۔ بھیم سنگھ اور پرتاپ سنگھ کے مسلمان ہونے کی خبر تیزی سے گردش کر رہی تھی اور دہلی کے مسلمان اپنے ایک ہم قوم کی بیوی کے غم میں شریک ہونے کے لئے جمع ہو رہے تھے۔ ان مسلمانوں میں غریب بھی شامل تھے اور امیر بھی۔ عام کلمہ گو بھی شریک تھے اور درباری امراء بھی۔ جنازے کو کاندھا دینے والوں میں کوئی تفریق نہیں تھی۔ مسلمان علماء اور واعظ بھی کلاوتی کے جنازے کے ساتھ ساتھ تھے۔ پہلی بار بھیم سنگھ اور اس کے بیٹے پرتاپ سنگھ نے ان آسمانی کلمات کی گونج زمین پر سنی تھی۔

"دنیا میں جو کچھ ہے وہ فنا ہو جانے والا ہے سوائے خداوند ذوالجلال کے۔"

لوگ جنازے کے ساتھ چل رہے تھے اور باآواز بلند قرآن حکیم کی یہ آیت تلاوت کر رہے تھے۔

"بے شک! جو کچھ ہے وہ اپنے اللہ کی طرف لوٹ کر جانے والا ہے۔"

بھیم سنگھ اور پرتاپ سنگھ کو اس بات کا موقع ہی نہیں ملتا تھا کہ وہ اپنی بیوی اور ماں کو کاندھا دے سکیں۔ جنازے میں شریک مسلمان اتنے پرجوش تھے کہ جنازہ مسلسل ان ہی کے کاندھوں پر منتقل ہو رہا تھا۔ بھیم سنگھ نے قبول اسلام سے پہلے بھی راجپوتوں میں بے شمار جنازے اٹھتے دیکھے تھے مگر لوگوں کی محبت کا یہ انداز نہیں تھا۔

پھر جب کلاوتی کے تن مردہ کو قبر میں اتارا گیا تو بھی سنگھ اور اس کے بیٹے کی نظروں کے سامنے ماضی کے کئی لرزہ خیز مناظر ابھر آئے۔ لکڑیوں کے انبار میں مرنے والے کی لاش کو رکھنا...... پھر اس میں آگ لگا دینا...... انسانی جسم کا جلنے کے بعد اکڑ جانا...... اور پھر اسے لکڑیوں کی ضرب سے دوبارہ بھڑکتے ہوئے شعلوں کے درمیان گرا دینا...... شمشان میں چاروں طرف انسانی گوشت کی بو کا پھیل جانا...... یہ بڑے خوفناک مناظر تھے جنہیں دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ مرنے کے بعد انسانی جسم کے ساتھ کس قدر تکلیف دہ سلوک کیا جاتا ہے۔ پہلے ہندوؤں میں مردے جلانے کی یہ رسم تھی کہ وہ لاش کو لکڑیوں کے ڈھیر پر رکھ دیتے تھے۔ پھر جب آگ بھڑکتی تھی تو انسانی جسم جلنے کی وجہ سے اکڑنے لگتا تھا اور کبھی کبھی تو یوں ہوتا تھا کہ رگ پٹھے جلنے کے سبب مردہ جسم میں غیر معمولی تناؤ پیدا ہو جاتا تھا اور وہ چتا کی جلتی ہوئی لکڑیوں پر اٹھ کر بیٹھ جاتا تھا۔ نتیجتاً مردے کے وارث اس بے جان لاش پر لکڑیاں برساتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ مردہ دوبارہ آگ میں گر کر جلنے لگتا تھا۔ پھر جب پے در پے ایسے کئی واقعات پیش آئے تو ہندوؤں نے جلانے کی رسم میں تھوڑی سی ترمیم کر دی...... اور اب طریقۂ کار یہ ہے کہ مردہ جسم کے سینے پر اس قدر بھاری لکڑیاں رکھی جاتی ہیں کہ آگ کی سوزش سے ان میں کوئی تناؤ پیدا نہ ہو سکے۔

جب کلاوتی کو قبر میں اتارا جا رہا تھا تو آج پہلی بار بھیم سنگھ کو اپنے سابق مذہب کی قدیم رسمیں بہت بھیانک نظر آ رہی تھیں۔ پھر جب کلاوتی کو مٹی دی جا رہی تھی تو مسلمانوں کی زبان پر ان آیات قرآنی کا ورد جاری تھا۔

"ہم نے تمہیں خاک سے پیدا کیا اور خاک ہی میں ملا دیا اور پھر خاک ہی سے دوبارہ اٹھائیں گے۔"
بھیم سنگھ اور دوسرے نومسلم راجپوت ان آیات الٰہی کا مفہوم سمجھنے سے قاصر تھے' مگر پھر بھی ان کے دلوں پر ایک ہیبت سی طاری تھی۔

❊❊❊

حضرت قطب رحمتہ اللہ علیہ کے جلال روحانی سے متاثر ہو کر بھیم سنگھ اور پرتاپ سنگھ دولت ایمان سے سرفراز ہو گئے تھے۔ اب بھیم سنگھ کا اسلامی نام رائے سعید الدین تھا اور پرتاپ سنگھ کو رائے نعیم الدین ذیشان کہہ کر پکارا جاتا تھا۔
پھر ایک دن رائے سعید الدین نے اپنے بیٹے نعیم الدین ذیشان سے کہا ...... "فرزند! اب میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ تمہاری ماں مجھ سے عمر میں چھوٹی تھی مگر وہ ہمیں چھوڑ کر چلی گئی ...... اصولی طور پر مجھے دنیا سے پہلے رخصت ہونا چاہئے تھا لیکن موت و زیست پر کس کا اختیار ہے ...... وہ پیچھے رہ گئے کرتے تھے جو قصد سفر پہلے ...... کون جانے کہ میں کل ہی تمہیں چھوڑ کر دوسری دنیا میں چلا جاؤں اس لئے بہتر ہے کہ میری موت سے پہلے تم اپنا گھر آباد کر ڈالو۔"
یہ نعیم الدین ذیشان کی شادی کی طرف اشارہ تھا۔ رائے نعیم الدین نے کچھ دن تو انکار کیا مگر جب باپ کا اصرار حد سے گزر گیا تو وہ شادی کے لئے آمادہ ہو گیا۔ ممکن ہے کہ نعیم الدین ذیشان زندگی کے اس اہم ترین مسئلے کو کچھ دن اور نظر انداز کر دیتا مگر جب اس کے باپ نے یہ کہا کہ اس پر زندگی کا ایک قرض باقی ہے جسے وہ بیٹے کی شادی کے بعد ہی ادا کر سکتا ہے تو نعیم ذیشان اپنے والد کے حکم کے آگے مجبور ہو گیا اور پھر اس کی شادی اعتماد خان کی لڑکی سعدیہ خانم سے کر دی گئی۔
قبول اسلام سے پہلے اعتماد خان' ٹھاکر مان سنگھ کے نام سے پوری دہلی میں شہرت رکھتا تھا۔ دو راجپوت خاندانوں میں ایک بار پھر گہرے رشتے قائم ہو گئے تھے مگر اس طرح کہ اب وہ مسلمان تھے اور ناموں کے ساتھ ان کی تمام قدیمی رسمیں ماضی کے مقبروں میں گم ہو چکی تھیں۔

❊❊❊

نعیم الدین ذیشان کی شادی کے دوسرے روز ہی اس کے باپ رائے سعید الدین نے سلطان شمس الدین التمش کے دربار میں حاضری کی درخواست دی۔ یہ درخواست فوراً ہی منظور ہو گئی۔ پھر جب رائے سعید الدین' سلطان التمش کے دربار میں داخل ہوا تو لوگ اس بوڑھے راجپوت کی آن بان دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے۔ سر اور داڑھی کے سفید بالوں کے باوجود اس کے جسم میں وہی تناؤ تھا جو گزری ہوئی سرکش جوانی کا پتا دیتا تھا۔
رائے سعید الدین ایک خاص انداز سے آگے بڑھا۔ اس کی رفتار میں غرور کا شائبہ تک نہیں تھا' لیکن پھر بھی یہ محسوس ہوتا تھا کہ فرش شاہی پر قدم رکھنے والا کسی خوف یا جھجک کا شکار نہیں ہے۔ وہ سلطان کے روبرو جا رہا تھا مگر اس طرح کہ خود اس کے اپنے وجود کی نفی نہیں ہو رہی تھی۔ رائے سعید الدین تخت شاہی کے نزدیک پہنچ کر ٹھہر گیا۔ ایک نظر سلطان شمس الدین کی طرف دیکھا' آداب شاہی کے مطابق سر کو جھکایا پھر اپنی تلوار نیام سے نکالی اور شہنشاہ ہند کے قدموں میں رکھ دی۔
"سلطان! اب عقائد کے اعتبار سے میں اور آپ برابری کا درجہ رکھتے ہیں کہ اسلام کا یہی فیصلہ ہے۔" دربار شاہی میں رائے سعید الدین کی بارعب آواز گونج رہی تھی۔ "بے شک نئے مذہب سے وابستگی نے مجھے آپ کا بھائی بنا دیا ہے لیکن پھر بھی ایک فرق مراتب ہم دونوں کے درمیان موجود ہے۔ آپ فرمانروا ہیں اور میں فرمانبردار ...... آپ کا حکم اس وقت تک نہیں ٹالا جا [illegible] ہے۔ میں نے اپنے عہد گمراہی

میں بے شمار جنگیں لڑیں۔ مسلمانوں کے خلاف بھی شمشیر کھینچی مگر سب کچھ رائیگاں گیا۔ اب ہدایت ملی ہے تو اس وقت کہ زندگی کی شام ہو رہی ہے ......'' رائے سعید الدین کا لہجہ بڑا پراثر تھا۔ تمام درباری اس بوڑھے راجپوت کی گفتگو حیرت سے سن رہے تھے۔

''تمہارے جذبات قابل قدر ہیں رائے!'' سلطان شمس الدین التمش کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔ ''تم زندگی کی شام کا ذکر کر رہے ہو۔ اگر رات کے آخری لمحے میں بھی کسی شخص کو ہدایت مل جائے تو وہ ایک خوش نصیب انسان ہے۔ میں بھی تمہاری خوش بختی پر گواہی دیتا ہوں کہ میرے پیرو مرشد حضرت قطب رحمتہ اللہ علیہ کے صدقے میں تمہیں تمہاری بیوی اور تمہارے بچے کو منزل نجات مل گئی۔''

''میں نے اپنا مذہب حضرت قطب رحمتہ اللہ علیہ کے حوالے کر دیا اور یہ شمشیر آپ کی نذر کر دی۔'' رائے سعید الدین احترام شاہی کے باوجود بڑی بے نیازی سے بول رہا تھا۔

''رائے! ہم سمجھتے ہیں کہ تم کچھ کہنا چاہتے ہو مگر شاید تمہیں اپنے جذبوں کے اظہار کے لئے الفاظ نہیں مل رہے۔'' سلطان شمس الدین التمش نے درمیان میں مداخلت کی۔

''سلطان محتشم! کچھ ایسی ہی کیفیت ہے کہ جسے بیان کرتے ہوئے شرم محسوس ہو رہی ہے۔'' رائے سعید الدین اپنے دل کی بات کہتے ہوئے جھجک رہا تھا۔

''جب تم سلطان کو اپنا بھائی کہتے ہو تو پھر وہ بات بھی کہہ ڈالو جو تمہارے ہونٹوں کی قید سے آزاد ہونے کے لئے بے چین ہے۔'' سلطان شمس الدین التمش کا لہجہ مشفقانہ تھا۔

''میں چاہتا ہوں کہ مسلمان ہونے کے بعد اپنی شمشیر کا قرض ادا کر دوں ......ورنہ ایک کلمہ گو کی حیثیت سے مجھے میدان حشر میں اپنے خدا کے سامنے شرمسار ہونا پڑے گا۔'' رائے سعید الدین نے کچھ اتنی عجیب خواہش کا اظہار کیا تھا کہ پورا دربار اس کی بات سن کر چونک اٹھا۔

سلطان شمس الدین التمش نے رائے سعید الدین کی طرف دیکھا جو عمر کی ستر منزلوں سے گزر چکا تھا۔ مگر اب بھی اس کے چہرے پر دشمنوں کے خون سے ہولی کھیلنے کا جوان جذبہ موجود تھا۔ فرمانروائے ہند بوڑھے راجپوت کی آرزوئے بے تاب دیکھ کر مسکرایا۔

''تم اپنی شمشیر کا قرض ادا کر چکے ہو رائے! سلطان التمش نے سعید الدین کی خواہش کے جواب میں کہا......اب تم خدا کو یاد کرو اور خدمت خلق کو اپنا شعار بناؤ۔ ہر موسم کے لئے الگ لباس ہوتا ہے۔ برف باری میں باریک کپڑے انسانی جسم کو شدید نقصان بھی پہنچا سکتے ہیں۔''

سلطان التمش نے اشارات و کنایات میں رائے سعید الدین کو یہ بات سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ اب وہ معرکہ آرائی کی منزل سے گزر چکا ہے اور یہ ضعیف و ناتواں جسم جنگ کے قابل نہیں رہا ہے۔

ابھی سلطان کے الفاظ کی بازگشت باقی تھی کہ اہل دربار نے رائے کی بگڑتی ہوئی حالت کو دیکھا۔ تمام حاضرین محسوس کر رہے تھے کہ رائے کی گردن مزید جھک گئی ہے۔ سرخ و سفید رنگ دھواں ہو گیا ہے اور پورا جسم ندامت کے پسینے سے تر ہو چکا ہے۔ رائے پوری شدت سے اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا مگر اس کے لرزتے ہوئے قدم صاف بتا دے رہے تھے کہ بوڑھا راجپوت اندر سے ٹوٹ کر بکھر گیا ہے۔

سلطان شمس الدین التمش نے بھی فوراً ہی رائے کی اس کیفیت کا اندازہ کر لیا۔ ''ہمارے قریب آؤ۔'' سلطان نے رائے سعید الدین کو حکم دیا۔

بوڑھا راجپوت کانپتے ہوئے قدموں سے یہاں تک آگے بڑھا کہ شاہ کی کرسی اور اس کے درمیان بہت کم فاصلہ رہ گیا۔ پھر سلطان نے اپنے بائیں جانب مڑ کر محافظ کو اشارہ کیا۔ محافظ نے ادب سے خم ہو کر رائے سعید الدین کی وہ تلوار اٹھائی جو التتمش کے قدموں میں رکھی ہوئی تھی۔ سلطان نے محافظ سے تلوار لے لی اور اسے رائے سعید الدین کی نیام میں ڈالتے ہوئے کہا۔

''ہم تمہارے جذبوں کے قدردان ہیں رائے! تم مایوس نہ ہو کہ عنقریب تمہیں بھی جہاد میں شمولیت کا اعزاز بخشا جائے گا۔ پھر تمہاری شمشیر کا جو قرض باقی رہ گیا ہے اسے سرمیدان اتار دینا۔''

اہل دربار کو یوں محسوس ہوا جیسے بادشاہ کے چند لفظوں نے ایک تن مردہ میں جان ڈال دی ہو۔ رائے سعید الدین پہلے تو جوش میں تن کر کھڑا ہو گیا۔ پھر وہ سلطان کے سامنے نصف قد تک جھک گیا۔ رائے کی خوشی ناقابل بیان تھی۔

''میرے عادل بادشاہ کی عمر دراز ہو۔ میں نے یہی سنا تھا کہ سلطان کسی کو مایوس نہیں کرتے۔ خدائے واحد کی قسم! میں بھی اپنے شہنشاہ کو مایوس نہیں کروں گا۔''

یہ کہہ کر رائے سعید الدین الٹے قدموں واپس ہوا اور دربار سے نکل کر اپنے گھر چلا گیا جہاں کلاوتی کے نہ ہونے سے وحشت سی برس رہی تھی۔

❋❋❋

پھر رائے سعید الدین کی زندگی کا وہ سب سے خوش نصیب لمحہ بھی آ گیا۔ 631ء میں سلطان شمس الدین التتمش نے مالوہ پر حملے کا منصوبہ ترتیب دیا۔ راستے کے تمام نشیب و فراز سے آگاہی حاصل کرنے کے بعد جب سلطانی لشکر مالوہ کی جانب روانہ ہوا تو سپاہیوں میں بوڑھا رائے سعید الدین بھی شامل تھا۔ یہ وقت کی عجیب کرشمہ سازی تھی کہ رائے نے تمام عمر جن بتوں کی پوجا کی تھی آج وہی پتھر کے مجسمے اس کی یلغار کا نشانہ تھے۔

رائے سعید الدین اپنی شمشیر کا قرض اتارنے کیلئے دیوانہ وار جنگ کر رہا تھا۔ اس نے کئی ہندوؤں کو موت کے گھاٹ اتارا مگر یہ لڑائی بہت مختصر تھی۔ سلطان التتمش نے جلد ہی مالوہ کے قلعے پر قبضہ کر کے اسے تباہ و برباد کر ڈالا۔ معرکہ آرائی ختم ہوئی تو رائے سعید الدین تھکا تھکا نظر آتا تھا۔ ساتھی سپاہیوں نے رائے سے اس افسردگی کا سبب پوچھا تو وہ بڑے اداس لہجے میں کہنے لگا۔

''میں نہیں جانتا تھا کہ یہ خونریزی اس قدر محدود ہو گی۔ پیاس بجھنا تو درکنار' میری شمشیر کے تو ہونٹ بھی تر نہ ہو سکے۔''

رائے ابھی اپنی محرومیوں کا مرثیہ پڑھ ہی رہا تھا کہ سلطان شمس الدین التتمش نے اجین پر لشکر کشی کا اعلان کیا۔ یہ خبر کیا تھی زندگی کی ایک برقی رو تھی جو رائے سعید الدین کے بوڑھے جسم میں آگ بن کر دوڑنے لگی۔ وہ اپنے ساتھی فوجیوں کو مخاطب کر کے والہانہ انداز میں کہنے لگا۔

''شاید اب کی بار میں اس قرض سے سبکدوش ہو جاؤں ...... اور شاید اس مرتبہ میری تلوار کی پیاس بجھ جائے۔''

❋❋❋

اجین کو ہندوؤں کے مشہور راجہ بکرماجیت نے آباد کیا تھا۔ بکرماجیت کا تعلق ''پوار'' قوم سے تھا۔ وہ بہت نیک دل اور منصف مزاج حکمران تھا۔ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق بکرماجیت کا درجہ عام انسانوں سے کہیں زیادہ بلند ہے۔ وہ دیوتا تو نہیں تھا مگر اس کے پرستاروں نے اسے دیوتاؤں کی صف میں کھڑا کر دیا تھا۔ بکرماجیت نے قلم کے

خلاف بھرپور جنگ کی اور عوام الناس کو جفا پرستوں کے خونی پنجوں سے نجات دلائی۔ اس نے اجین کا مشہور بت خانہ ''مہا کال'' بھی تعمیر کرایا اور ان برہمنوں کے وظیفے مقرر کیے جو اس بت خانے میں رہ کر دن رات عبادت کرتے تھے۔ پھر گردش ماہ و سال کے زیر اثر حکومتیں بدلتی رہیں اور بکرما جیت جیسا حکمران دوبارہ پیدا نہ ہو سکا۔ برہمنوں نے اپنے اقتدار کی خاطر مخلوق خدا پر بے شمار ظلم ڈھائے جس کے نتیجے میں ہندوؤں کی یکجہتی ختم ہو گئی اور وہ گروہ در گروہ تقسیم ہو کر رہ گئے۔ یہاں تک کہ مسلمان ایک انتہائی طاقتور اور اخلاقی اور سیاسی نظام لے کر ہندوستان میں داخل ہوئے اور زمینی علاقوں کے علاوہ مقامی باشندوں کے دل بھی فتح کر لیے۔

مالوہ کی تسخیر کے بعد شمس الدین التمش نے اجین کے حکمران کو خط لکھا۔

''میں تجھے آخری بار تنبیہ کرتا ہوں کہ مسلمانوں کی مخالفت سے باز آ جا! سازشیں ترک کر کے اسلامی حکومت کے سامنے سر تسلیم خم کر دے کہ اب اسی میں تیری عافیت ہے۔ اگر تو کسی عیاری کے بغیر خراج گزاروں کی قطار میں شامل ہو جائے گا تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ تجھے تیری سلطنت بھی بخش دی جائے گی اور مکمل آزادیاں بھی۔ ہم مسلمان جبر سے کام نہیں لیتے ...... ہم امن کے سفیروں کے بہترین دوست ہیں ...... اور ظلم کے نقیبوں کے بدترین دشمن ......''

راجہ اجین سلطان التمش کے خط سے متاثر ہو کر صلح پر آمادہ ہو چلا تھا مگر کم نظر مشیروں اور ''مہا کال'' کے برہمن پجاریوں نے اسے ہلاکت و بربادی کے راستے پر ڈال دیا۔ راجہ کو یقین دلا دیا کہ دیوتا قلعے کی حفاظت کریں گے اور سلطان التمش کو ذلت آمیز شکست کا سامنا کرنا پڑے گا ......

پھر راجہ نے یہی الفاظ التمش کے خط کے جواب میں تحریر کر دیئے کہ ...... ''دیوتا ہماری حفاظت کر رہے ہیں۔''

التمش نے ایک نظر اہل دربار کی طرف دیکھا اور پھر غائبانہ طور پر راجہ اجین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم اپنی مذہبی رسم کے مطابق تجھے صلح کا پیغام دے چکے مگر تو نے امن اور سلامتی کے تمام راستے بند کر دیئے۔ میں بہت جلد تیری محفوظ پناہ گاہوں تک پہنچ رہا ہوں۔ تجھے چند دنوں کی مہلت حاصل ہے۔ اس دوران اپنے پجاریوں کی فوج کو جمع کر لے۔ پھر تجھ پر یہ راز ظاہر ہو جائے گا کہ پتھروں کے مجسمے انسانی تقدیروں کا فیصلہ نہیں کر سکتے۔'' اور پھر سلطان التمش اجین کی جانب روانہ ہو گیا۔ وہ خود اسلامی لشکر کی قیادت کر رہا تھا۔

❁❁❁

اور پھر اجین کے محاذ پر گھمسان کا ایسا رن پڑا کہ رائے سعید الدین کی نا آسودہ تمنائیں سیراب ہو گئیں۔ راجہ کی فوجیں پسپا ہو چکی تھیں۔ بے شمار سپاہی لقمہ اجل بن چکے تھے اور فوجیوں کے ایک دستے نے میدان جنگ سے فرار ہو کر "مہاکال" کے مندر میں پناہ حاصل کی تھی۔ مندر کے آہنی دروازے بند کرنے کے بعد وہ سپاہی اپنے آپ کو محفوظ سمجھ رہے تھے۔ سلطان شمس الدین التمش نے راجہ کے روپوش سپاہیوں کو خبردار کرتے ہوئے کہا کہ وہ مندر سے باہر نکل آئیں اور ہتھیار ڈال دیں ورنہ انہیں اپنی عبادت گاہ کو سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

راجہ کے سپاہیوں نے التمش کے اس اعلان کو قابل اعتنا نہیں سمجھا اور بدستور مندر کے دروازے بند رکھے۔ سلطان نے مجبور ہو کر مندر پر یلغار کی اور اس کی فوجوں نے "مہاکال" کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ دیکھنے والوں نے دیکھا جب مندر میں نصب قدآور بتوں کو مسمار کیا جا رہا تھا۔ اس وقت رائے سعید الدین پر نا قابل بیان وحشت طاری تھی اور وہ بڑی بے رحمی کے ساتھ پتھر کے مجسموں کو ریزہ ریزہ کر رہا تھا۔ یہ وہی بت تھے جنہیں اس کے بزرگ صدیوں سے پوجتے آئے تھے اور خود اس نے بھی پون صدی تک ان ہی بتوں کے قدموں میں اپنی پیشانی رگڑی تھی۔ آج وہی پجاری اپنے دیوتاؤں کا سب سے بڑا دشمن تھا۔

اسی ہنگامے میں ایک ہندو سپاہی نے رائے کی پشت سے اس پر وار کیا۔ زخم کاری تھا اس لئے رائے سعید الدین سنبھل نہیں سکا اور مندر کے فرش پر گر پڑا۔ پھر بھی اس نے اپنے ہاتھ سے تلوار نہیں چھوڑی۔

ہر طرف انسانی زندگی سسک رہی تھی۔ چیخیں تھیں' شور تھا' فریادیں تھیں۔ کسی کو کسی کا ہوش نہیں تھا۔ مگر رائے کے حواس ابھی تک بحال تھے۔ وہ ٹوٹے ہوئے بتوں کے درمیان اس طرح پڑا تھا کہ اس کے جسم سے خون جاری تھا۔ تلوار پر ہاتھ کی گرفت لحظہ بہ لحظہ مضبوط ہوتی جا رہی تھی اور سماعت کی تمام قوتیں اس آواز کے انتظار میں جاگ رہی تھیں جو رائے سعید الدین کو فتح کی خبر سنانے والی تھی۔ رائے کے قریب اور بھی سپاہی مختلف حالتوں میں زمین پر پڑے ہوئے تھے۔ ان میں سے کچھ فوجی مر چکے تھے اور باقی عالم نزع میں گرفتار تھے۔ مرنے والے سپاہیوں میں بڑی تعداد ہندوؤں کی تھی جو اپنے عقیدے کے مطابق بتوں پر قربان ہو گئے تھے۔ بڑا عجیب انقلاب تھا کل تک دشمن کے خلاف ہونے والی معرکہ آرائیوں میں رائے بھی یہی آرزو لے کر برسر پیکار ہوتا تھا کہ وہ بھی کسی دیوتا کے قدموں میں بھینٹ چڑھ جائے اور پھر اسے زندگی کی سب سے بڑی سعادت حاصل ہو جائے گی...... مگر آج وہ ان بتوں کی خاطر جان دینے والوں کے انجام پر ہنس رہا تھا۔

رائے کے جسم سے خون جاری تھا اور نقاہت لحظہ بہ لحظہ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ کئی بار اس کی آنکھوں کے سامنے ہلکا سا اندھیرا بھی چھایا تھا اور یہ تاریکی اس بات کی علامت تھی کہ موت کہیں قریب ہی منڈلا رہی ہے۔ وہ موت سے

خوف زدہ نہیں تھا کہ قبول اسلام کے بعد تو موت اس کا ایمان بن گئی تھی۔ رائے بس ایک تصور سے ہراساں تھا کہ کہیں فتح کی نوید سننے سے پہلے اس کی سانسوں کا سلسلہ نہ ٹوٹ جائے۔ اس لئے وہ اپنی آنکھیں کھلی رکھنا چاہتا تھا۔ رائے کو اپنے اس عمل کے برقرار رکھنے میں سخت دشواری پیش آ رہی تھی۔ جریان خون کے سبب اس کا جسم نڈھال ہوتا جا رہا تھا۔ انتہائی کوشش کے بعد بھی جب اس کی آنکھیں جھپکنے لگیں تو وہ اپنے پیدا کرنے والے کو پکار اٹھا۔

''اے خدا! میں نے تیرے دشمنوں سے جنگ کی مگر اس انداز سے نہ لڑ سکا جو مجاہدین کے لڑنے کا حق ہے۔ دنیا کا ایک ایک ذرہ تیرے علم کے دائرے میں سمٹا ہوا ہے۔ تو دلوں کا حال بھی جانتا ہے اور ان اندیشوں کی بھی خبر رکھتا ہے جو انسانی ذہن میں پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ صنم خانوں سے قدیم نسبت کے سبب اگر کسی بت کو توڑتے وقت میرے ہاتھوں میں ہلکی سی بھی لرزش پیدا ہوئی ہو تو میری اس کوتاہی کو معاف کر دینا کہ میرا دامن گناہوں سے بھرا ہوا ہے۔

جیسے جیسے بدن کا خون بہتا جا رہا تھا رائے کی آواز بھی مدھم ہوتی جا رہی تھی۔ آنکھوں کی دھند پہلے سے زیادہ بڑھ گئی تھی اور ہوش و حواس کم ہوتے جا رہے تھے۔ ایک راجپوت کے اعصاب اس طرح ٹوٹ رہے تھے جیسے زلزلے کے اثر سے چٹانیں بکھر رہی ہوں۔

یکایک رائے کی سماعت نے آوازوں کا وہ شور سن لیا جس کے انتظار میں اس کی روح حیات و موت کے درمیان معلق ہو کر رہ گئی تھی۔

سلطان شمس الدین التمش فرمانروائے ہند کو اس شاندار فتح پر مبارکبادیں پیش کی جا رہی تھیں۔ فرط مسرت سے رائے کی آنکھیں چھلک اٹھیں۔ وہ بھی اپنے سلطان کی بارگاہ میں نصرت و کامرانی کے اس نشاط انگیز موقع پر تہنیت پیش کرنا چاہتا تھا' مگر جسمانی نقاہت نے رائے سے چیخنے کا حوصلہ چھین لیا تھا اور چیخ کے بغیر یہ ممکن نہیں تھا کہ سلطان تک اس کی آواز پہنچ جاتی۔ عجیب بے چارگی تھی۔ وہ سلطان سے کہنا چاہتا تھا کہ اس نے اپنی شمشیر کا قرض اتار دیا ہے مگر صدائیں بلند کرنے کا مرحلہ گزر چکا تھا۔ اب تو خاموشی ہی گویائی تھی اور سکوت ہی تقریر کوئی سننے والا قریب ہوتا تو نگاہوں کی زبان سمجھ لیتا۔ بے بسی کا احساس شدید ہوا تو آنسوؤں میں بھی روانی آ گئی اور خون کے آخری قطرے بھی کھوکھلے جسم کا ساتھ چھوڑنے لگے۔

رائے نے ہوش و حواس کی باقی ماندہ قوتیں سمیٹیں اور اپنے اس ہاتھ کو بلند کرنے کی کوشش کی جس میں خون آلود شمشیر موجود تھی۔ یہ ایسا ہی اشارہ تھا جیسے کسی ڈوبنے والے انسان کا پورا جسم زیر آب جا چکا ہو اور اس نے اپنا ایک ہاتھ پانی کی سطح سے اوپر اٹھانے کی کوشش کی ہو کہ شاید اس طرح اہل ساحل کو غرق ہونے والے کی آخری پناہ گاہ کا پتا چل جائے۔ رائے بھی اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اگرچہ اس کا ہاتھ چند ہی ساعتوں کے لئے فضا میں لہرایا تھا لیکن مسلمان سپاہیوں نے خون آلود شمشیر کی آخری جنبش دیکھ لی تھی اور اس کے ساتھ ہی کچھ آوازیں بیک وقت گونج اٹھی تھیں۔

''وہ ابھی زندہ ہے......'' سلطان شمس الدین التمش کے فوجیوں نے بلند آواز میں ایک بھڑکتے ہوئے چراغ کی سیاہی مائل روشنی پر گواہی دی تھی۔ پھر رائے کو بھاری قدموں کی آوازیں سنائی دینے لگیں جو دم بہ دم قریب تر ہوتی جا رہی تھیں۔ رائے نے اپنا ہاتھ بلند کرنے کی ایک اور کوشش کی مگر یہ ناکام ترین کوشش تھی۔ بوڑھے راجپوت سعید الدین کا ہاتھ صرف لرز کر رہ گیا۔

''سلطان...... کے حضور...... میرا...... سلام......''

سپاہیوں نے مرنے والے کی آخری خواہش سنی اور ایک فوجی دوڑتا سلطان شمس الدین التمش کے قریب پہنچا۔ سلطان اس وقت ایک عجیب سے عالم سکوت میں کھڑا ہوا شکستہ بتوں کو دیکھ رہا تھا۔ سپاہی نے اپنے ایک ہم پیشہ کی دلی کیفیت بیان کرتے ہوئے کہا۔

''سلطان عالی قدر! وہ موت کے قریب پہنچ چکا ہے اور شاید آپ کو آخری بار دیکھنے کی خواہش رکھتا ہے۔'' سپاہی کے لہجے میں تشویش کے ساتھ ایک کرب بھی شامل تھا۔

سلطان التمش کی نظریں ٹوٹے ہوئے بتوں سے گزر کر زخمی سپاہی کے چہرے پر مرکوز ہوگئیں۔ پھر شہنشاہ ہند رائے سعید الدین کی طرف بڑھا جو موت کی منزل پر پہنچ کر زندگی کو ایک نظر دیکھنے کے لئے ٹھہر گیا تھا۔

سلطان نے زخمی سپاہی کو دیکھا' حافظے پر زور دیا اور بوڑھے راجپوت کو پہچان لیا۔

''رائے سعید الدین ...... فاتح اجین ......'' التمش کی اعلیٰ ظرفی نے مرنے والے کو اعلیٰ ترین فوجی اعزاز بخش دیا تھا۔

رائے کی آنکھوں کے چراغ پوری شدت سے بھڑک اٹھے اور موت کا وہ رنگ ابھر آیا جس پر بظاہر زندگی کی روشنی کا گمان ہوتا تھا۔ بت پرستی کی راہ سے بت شکنی کی منزل تک پہنچنے والے راجپوت مسلمان نے اس اعزاز پر سلطان کا شکریہ ادا کرنے کی کوشش کی مگر زبان لڑکھڑا گئی۔ الفاظ ادا ہوئے مگر سماعت آشنا نہ ہو سکے۔ موت و زیست کی اس کشمکش میں رائے کے چہرے پر کئی رنگ نمایاں ہوگئے تھے۔ بے کسی' جھنجھلاہٹ' غصے اور ناطاقتی کے ملے جلے رنگ ...... سلطان نے لمحوں کی تاخیر کے بغیر اپنے سپاہی کی قلبی کیفیات کا مشاہدہ کر لیا۔ پھر وہ آگے بڑھا اور یہاں تک خم ہوا کہ رعایا اور حکمران کے درمیان بہت کم فاصلہ رہ گیا۔ سلطان شمس الدین التمش' رائے سعید الدین کے لرزتے ہونٹوں سے وہ لفظ چھین لینا چاہتا تھا جس پر فرشتہ اجل کی گرفت مکمل ہوگئی تھی مگر ہندوستان کا فرمانروا اپنے اس ارادے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ رائے کی جنبش لب تو نظر آئی تھی' مگر الفاظ گم ہوگئے تھے۔

موت کی آندھی کا آخری جھونکا آیا۔ زندگی کا درخت جڑ سے اکھڑ گیا مگر زمین بوس ہونے سے پہلے اس کی ایک شاخ اہل چمن کو اپنا پیغام منتقل کر گئی تھی۔ مرنے سے قبل رائے کا ہاتھ بلند ہوا تھا اور تلوار چھوٹ کر سلطان التمش کے قدموں میں گر گئی تھی۔

والی ہند مزید جھکا اور اس نے رائے کی تلوار اٹھالی جس پر بت پرستوں کا خون جم گیا تھا۔ سلطان کچھ دیر تک اس تلوار کو دیکھتا رہا۔ یہ ایک ایسے سپاہی کی تلوار تھی جو بت پرستوں کے گھر میں پیدا ہوا' پجاریوں کے بھجن سن کر جوانی کی منزلیں طے کیں۔ تمام عمر بتوں کے دفاع اور تحفظ کے لئے لڑتا رہا اور زندگی کے آخری لمحات میں ان ہی بتوں کو توڑ کر دنیا سے رخصت ہوگیا۔ سلطان التمش دوبارہ خم ہوا اور اس نے اپنے ہاتھوں سے رائے کی تلوار اس کے سینے پر رکھ دی۔

''خدا اس مرد حری کی مغفرت کرے اور اس کی طرح ہمارا انجام بھی بخیر ہو۔'' سلطان التمش نے یہ الفاظ اس قدر سوگوار لہجے میں ادا کئے کہ مندر کی فضا بھی غمناک نظر آنے لگی۔

جن لوگوں نے مسلمان ہونے کے بعد رائے کا اضطراب دیکھا تھا وہ گواہی دے رہے تھے کہ مرنے والے نے اپنی شمشیر کا قرض اتار دیا تھا۔

***

اجین سے واپسی کے بعد سلطان شمس الدین التمش نے رائے سعید الدین کے بیٹے رائے نعیم الدین ذیشان کو

دربار میں طلب کیا تھا اور پھر باپ کی شجاعت و وفاداری کے صلے میں اسے بھی انعام و اکرام کے ساتھ فوجی ملازمت دے دی گئی تھی۔ اس موقع پر سلطان شمس الدین التمش نے نعیم الدین ذیشان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔

''انسانی اقتدار تو زمین کے موسموں کی طرح بدلتا رہتا ہے۔ آج حکومت میرے دروازے پر دست بستہ کھڑی ہے تو کل کسی دوسرے کی کنیز بن جائے گی۔ تم ان بدلتے ہوئے موسموں سے زیادہ تاثر قبول نہ کرنا۔ یہ سب وقتی چیزیں ہیں مگر دوام صرف اس جذبے کو حاصل ہے جو حق کی تلاش میں بے قرار رہتا ہے اور مخلوق خدا کی خدمت کے لئے متحرک رہتا ہے۔ تم اپنے باپ کی زندگی اور موت کی مثال سامنے رکھنا وہ بت پرستی سے تائب ہونے کے بعد چند سال زندہ رہا مگر اس طرح کہ اس کے سینے میں شہادت کی آرزو پیہم سلگتی رہی۔ پھر اسے موت آ گئی مگر ایسی موت کہ جس کے لئے لاکھوں انسان صدیوں تک ترستے رہتے ہیں۔''

سلطان التمش چند لمحوں کے لئے خاموش ہو گیا۔ پھر اس نے رائے نعیم الدین ذیشان کو دوبارہ مخاطب کر کے بڑے پرسوز لہجے میں کہا۔ ''نوجوان! تمہارا خمیر اسی مٹی سے اٹھا ہے اور تم اپنی ہی زمین پر زندہ ہو...... مگر ایک نظر ان لوگوں کی طرف بھی دیکھو جو سیکڑوں میل کا فاصلہ طے کر کے یہاں تک پہنچے ہیں۔ انہوں نے مذہب کی محبت میں اپنے گھروں کی یادوں کے نقوش تک مٹا ڈالے۔ ان کے آباؤ اجداد کے بام و در انہیں پکارتے رہے...... مگر جب وہ مکانوں کے دروازوں کو کھلا چھوڑ کر منزل کی طرف بڑھے تو پھر مڑ کر نہیں دیکھا۔ تم نہیں جانتے کہ کیسی کیسی یادیں ان کے راستے روک رہی تھیں اور کیسی کیسی نسبتیں ان کے دامن کھینچ رہی تھیں۔ انہوں نے بیک وقت دو محاذوں پر جہاد کیا۔ ان کے لئے ایک محاذ ان کا اپنا نفس تھا اور دوسرا محاذ مشرکین کی وہ جماعت تھی جس نے ایک خدا کے بجائے بے شمار معبود تراش لئے تھے۔ ان لوگوں نے تائید غیبی کے سہارے دونوں محاذوں پر معرکہ آرائی کی اور فتح و نصرت کے پرچم لہرائے...... تمہاری وفاداریاں پہلے اللہ کے ساتھ ہیں جو اپنی ذات میں لاشریک ہے...... پھر سلطان التمش کے ساتھ...... کل سلطان نہیں رہے گا مگر تمہارا خدا ''حی و قیوم'' ہے بس اسی سے اپنا عہد استوار رکھنا۔

رائے نعیم الدین ذیشان کا سر اطاعت سے اپنے حکمراں کی بارگاہ میں مزید خم ہو گیا۔

''خدا سلطان کی عمر دراز کرے۔ آپ نے راہ طلب میں جس طرح نئے مسافروں کی حوصلہ افزائی کی ہے وہ اہل دل کے لئے سرمایہ قرار ہے۔ جب آزمائشوں کے ہجوم میں ان کے قدم لڑکھڑائیں گے تو انہیں آپ کی محبتیں استقامت بخشیں گی۔ میں ذاتی طور پر آپ کا مقروض ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ قرض کس طرح ادا ہو گا لیکن اگر کبھی امتحان کی ساعت آئی تو آپ کی فوج کا یہ ادنیٰ سپاہی قصر اعتبار کی بنیادوں میں اپنے جسم کے ٹکڑے رکھ دے گا۔''

رائے نعیم الدین نے بڑے عجیب انداز سے سلطان کی نوازشات کا شکریہ ادا کیا اور پھر اپنے فرائض کی ادائیگی میں ہمہ تن مشغول ہو گیا۔

✻✻✻

روز و شب کے قافلے نے کچھ اور منزلیں طے کر لی تھیں۔ ملک میں حالات پرسکون تھے اور اسی خوشگوار فضا میں خدا نے رائے نعیم الدین کو اولاد کی دولت سے سرفراز کیا۔ اب وہ ایک خوبصورت بیٹے کا باپ بن چکا تھا۔ رائے نعیم الدین ذیشان نے اپنے لڑکے کا نام شجاع الدین کامران تجویز کیا۔ یہ بچہ پیدائشی مسلمان تھا۔ اس لئے ماں باپ نے اس کے نام سے راجپوت قوم کی نشانی وابستہ نہیں کی۔ رائے نعیم الدین کی بیوی سعدیہ خانم نے اشارتاً شوہر سے کہا بھی کہ وہ بچے کے نام کے ساتھ اس خاندانی علامت کو برقرار رہنے دیں مگر رائے نعیم الدین نے بیوی کو مطمئن کرنے کے لئے جواباً کہا۔

"جس ماضی اور خاندان سے بت پرستی کا تصور ابھرتا ہو اسے ختم کر دینا ہی بہتر ہے لیکن اگر تم چاہو تو اسے رائے شجاع الدین کہہ کر بھی پکار سکتی ہو۔"

سعدیہ خانم نے شوہر کے اس جواب پر کوئی اعتراض نہیں کیا اور وہ اپنے معصوم بچے کی پیشانی پر روشن مستقبل کی لکیر تلاش کرنے لگی۔

رائے نعیم الدین ذیشان کو کبھی کبھی بڑی شدت سے اپنے مرحوم باپ رائے سعید الدین کی یاد آتی اور پھر ان کی موت کا آخری منظر مجسم ہو کر آنکھوں کے سامنے ابھرنے لگتا۔ پھر اسی منظر کے سینے سے جلتی ہوئی آرزو کا ایک شرربار پودا پھوٹتا کہ کاش وہ بھی اپنے باپ کی طرح میدان جنگ کا رخ کرے اور خاندانی روایت کو زندہ رکھنے کے لئے موت کو گلے لگا لے۔ وہ ہر حال میں سلطان التمش سے کئے ہوئے عہد کو نبھانا چاہتا تھا لیکن دو سال خاموشی سے گزر گئے۔ ملک کے کسی گوشے سے بغاوت کی کوئی صدا بلند نہیں ہوئی اور کسی خطے سے سرکشی کی کوئی خبر نہیں ملی۔ یہ صورت حال امن و امان کا پتہ دیتی تھی اور اہل وطن اس بات سے خوش نظر آتے تھے کہ اب زمین کی پیاس انسانی خون کے بجائے بارش کے پانی سے بجھے گی۔ رائے نعیم الدین بھی اس فضا میں مسرور و مطمئن تھا مگر دل میں اضطراب کی لہریں اس لئے اٹھتی تھیں کہ وہ جلد از جلد شریک جنگ ہو کر سلطان التمش کے احسانات کا صلہ دینا چاہتا تھا۔ یہ ایک غیرت مند راجپوت کا احساس تھا جو اسے ہمہ وقت بے قرار رکھتا تھا...... ورنہ ہوش و خرد کے تقاضے تو یہی تھے کہ شمشیریں نیام سے باہر نہ آئیں اور کسی خونریزی کے بغیر اسلامی سلطنت کی حدود وسیع تر ہوتی چلی جائیں۔

ابھی رائے نعیم الدین ذیشان کی یہ ذہنی کشمکش جاری تھی کہ سلطان شمس الدین التمش نے جسمانی تھکن دور کرنے کے لئے ملتان کا رخ کیا۔ فرمانروائے ہند کا خیال تھا کہ وہ دارالحکومت سے نکل کر ملک کے دور دراز علاقے میں چلا جائے گا تو آب و ہوا بھی تبدیل ہو جائے گی اور سیاسی ہنگاموں کے شور میں بھی کسی قدر کمی واقع ہو جائے گی۔ اس طرح وہ کچھ عرصے کے بعد تازہ دم ہو کر واپس آ جائے گا۔ یہ محض انسانی منصوبہ بندی تھی۔ نسل آدم ہمیشہ دیوار کے سامنے دیکھتی ہے۔ اسے خبر نہیں ہوتی کہ پس دیوار کیا ہو رہا ہے؟ سلطان التمش کے ساتھ بھی یہی حادثہ پیش آیا۔ وہ گھر سے سکون کی تلاش میں نکلا تھا مگر ملتان پہنچتے ہی بیماری نے اس کے جسم کا محاصرہ کر لیا۔ پھر جان لیوا مرض نے اس قدر طول کھینچا کہ سلطان بستر مرگ پر دراز ہو گیا۔ جب حالت بہت زیادہ بگڑنے لگی تو سلطنت کے معتمد امراء سلطان التمش کو عماری میں ڈال کر دہلی لائے۔ شاہی طبیبوں نے دن رات مسیحائی کی اور تمام نادر کتابوں کی ورق گردانی کر ڈالی۔ اس بیماری کے کئی مجرب نسخے موجود تھے مگر ان میں صحت و زندگی کا کوئی نسخہ نظر نہیں آتا تھا۔

اس دوران رائے نعیم الدین نے وزراء کی بڑی منت و سماجت کے بعد سلطان کے حضور رسائی حاصل کی۔ اڑتے اڑتے اس کے کانوں تک یہ خبریں پہنچی تھیں کہ سلطان کا وقت آخر ہے۔ ایسے نازک اور سنگین لمحات میں رائے نعیم الدین کی جان پر بن آئی تھی۔ وہ ایک بار اپنے مہربان فرمانروا کی عیادت کر کے اپنی روح کا بوجھ اتار دینا چاہتا تھا۔ بالآخر اسے اس شرط پر اجازت مل گئی کہ وہ سلطان کو دور ہی سے دیکھ کر واپس چلا جائے گا۔

پھر جب رائے نعیم الدین التمش کے کمرے میں داخل ہوا اور جیسے ہی اس کی نظر سلطان کے چہرے پر پڑی وہ اپنی قوت برداشت کھو بیٹھا۔ چٹانوں کی طرح مضبوط اعصاب رکھنے والا راجپوت بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ اس پر ایسی وارفتگی طاری تھی کہ وزیروں سے کیا ہوا عہد بھی فراموش کر بیٹھا دیوانہ وار سلطان کے بستر کے قریب پہنچا اور رقت آمیز لہجے میں کہنے لگا۔

"اے میرے شہنشاہ! اگر اس موقع پر صدقہ جان کی رعایت موجود ہو تو یہ غلام اپنی زندگی آپ پر قربان کر سکتا

ہے......'' رائے نعیم الدین نے اپنے جذبہ جاں نثاری کو عملی شکل دینے کی خواہش کا اظہار کیا تھا......مگر سلطان کے بستر کے قریب کھڑے ہوئے بااثر وزیروں نے ایک نومسلم کی اس آرزو کو بدترین خوشامد سے تعبیر کیا تھا اور ان کے چہروں پر ابھرنے والے رنگ رائے نعیم الدین کا مذاق اڑا رہے تھے۔

سلطان التمش نے ایک نظر نعیم الدین ذیشان کی جانب دیکھا اور پھر بڑی نحیف آواز میں کہا۔

''میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم دل کی گہرائیوں سے نذرانہ جان پیش کرنے پر آمادہ ہو۔ میں جانتا ہوں کہ یہ کوئی تکلف اور نمائش نہیں مگر رسم فنا کو کیا کروں کہ انسان کی کوئی تدبیر اسے ٹال نہیں سکتی۔'' یہ کہہ کر سلطان خاموش ہو گیا۔ اس کی سانسیں بے ربط ہو گئی تھیں۔ رائے نعیم الدین خلوت شاہی سے اس طرح نکلا کہ چہرے پر وحشت برس رہی تھی اور آنکھیں اشکبار تھیں۔ اب اسے اس امر میں کوئی شک باقی نہیں رہا تھا کہ سرزمین ہند بہت جلد ایک عظیم حکمران سے محروم ہو جانے والی تھی۔

پھر ایسا ہی ہوا۔ 20 شعبان 633ھ کو سلطان شمس الدین التمش کا انتقال ہو گیا۔ اپنے مہربان اور عادل شہنشاہ کی موت پر عوام اتنا روئے کہ شاعری کی زبان میں بارش کا سا سماں پیدا ہو گیا تھا۔

اب بااختیار وزیروں اور امیروں کو تخت کے وارث کی تلاش تھی۔ سلطنت کے دو وارث موجود تھے۔ ایک سلطان کا بڑا بیٹا رکن الدین فیروز شاہ اور دوسرے التمش کی چہیتی بیٹی رضیہ سلطانہ......التمش نے اپنی زندگی ہی میں بہت سے امور سلطنت رضیہ ہی کو سونپ دیئے تھے۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس کی بیٹی میں حکمرانی کی ساری صلاحیتیں موجود ہیں اور وہ اپنے تمام بھائیوں سے زیادہ لائق اور ہوش مند ہے مگر قوم کے سرداروں نے ایک عورت کی حکمرانی گوارا نہیں کی اور سلطان کے بڑے بیٹے رکن الدین فیروز شاہ کو ہندوستان کے تخت پر بٹھا دیا۔

***

رکن الدین فیروز شاہ فطرتاً ایک عیش پرست انسان تھا۔ حکومت کیا ہاتھ آئی کہ ہر طرف سرمستی کے دروازے کھل گئے۔ اس نے سلطان التمش کے جمع کئے ہوئے خزانوں کو میراثیوں اور بھانڈوں میں لٹانا شروع کر دیا۔ رکن الدین کی ماں ''شاہ ترکاں'' کی ایک ترکی لونڈی تھی جس نے التمش کے حرم میں داخل ہو کر بڑا گہرا اثر ڈالا تھا۔ یہ عورت انتہائی کینہ پرور تھی۔ پھر جب اس کے بیٹے رکن الدین فیروز شاہ نے خوبصورت رقاصاؤں کے آنچل میں پناہ ڈھونڈی اور لبریز ساغر و مینا میں اپنی سانسیں ڈبو دیں تو شاہ ترکان کو قسمت آزمائش کا موقع مل گیا۔ اب ہندوستان کے اقتدار پر اس کی مکمل گرفت تھی۔ شاہ ترکان نے اپنے اختیارات سے پورا فائدہ اٹھایا اور التمش کی کئی نکاحی بیویوں کو بڑی ذلت و رسوائی کے ساتھ قتل کرا دیا۔ اس کے علاوہ التمش کے حرم میں جو ترکی خواتین شامل تھیں وہ بھی شاہ ترکان کے جبر و تشدد سے محفوظ نہ رہ سکیں۔ اس سنگدل عورت نے ان معزز خواتین سے بہت خوف ناک انتقام لیا۔ انہیں در در پھرایا۔ یہاں تک کہ وہ اعلیٰ نسل عورتیں فاقہ کشی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئیں۔

شاہ ترکان نے صرف التمش کی بیویوں اور کنیزوں ہی سے انتقام نہیں لیا بلکہ اس کی اولاد پر بھی لرزہ خیز مظالم ڈھائے۔ التمش کے سب سے چھوٹے لڑکے قطب الدین کو شاہ ترکان ہی کے اشارے پر قتل کیا گیا۔ جب اس معصوم بچے کا سر شاہ ترکان کے سامنے لایا گیا تو وہ ہیجانی انداز میں قہقہہ زن ہوئی اور اپنے وفادار سپاہیوں سے مخاطب ہو کر بولی۔

''آج میں بہت خوش ہوں میں نے اپنی زندگی کا مقصد حاصل کر لیا ہے۔''

سلطنت کے کچھ بھی خواہوں او[illegible] تاثر قبول کیا اور اسلامی اقتدار کو

بچانے کے لئے رکن الدین فیروز شاہ سے کہا۔

''کوئی حکومت ظلم و ناانصافی کی بنیادوں پر زیادہ دن تک قائم نہیں رہ سکتی۔''

میں امورِ سلطنت کو تم سے زیادہ بہتر سمجھتا ہوں۔ رکن الدین فیروز شاہ نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔ ''میں شاہ کا بیٹا ہوں اور مزاجِ شاہی سے خوب آشنا ہوں تم غلامانِ سلطنت مجھے آدابِ حکمرانی سکھاتے ہو۔''

یہ بیہودہ جواب سن کر ذی ہوش امراء خاموش ہو جاتے مگر ان کے دل مستقبل کی ہلاکت و بربادی سے لرزتے رہتے۔

چند امراء نے جان پر کھیل کر رکن الدین کی ماں شاہ ترکان کی شکایت کی تو فیروز شاہ برہم ہو گیا۔

''وہ میری ماں ہیں اور انہیں سیاہ و سفید پر پورا اختیار حاصل ہے۔'' یہ کہہ کر رکن الدین فیروز شاہ نے ان امیروں کے قتل کا حکم جاری کر دیا جنہوں نے ترکان شاہ کے مظالم کے خلاف احتجاج کیا تھا۔

اپنے ساتھیوں کا المناک انجام دیکھ کر دوسرے وزراء نے ہونٹ سی لئے اور اپنی جانیں بچانے کے لئے گوشہ نشین ہو گئے۔

رکن الدین فیروز شاہ کی خلوت میں سیمیں بدن عورتوں کا رقص جاری تھا۔ ہوشربا ساز بج رہے تھے اور قیمتی قالینوں پر شراب بہہ رہی تھی۔ ایک ولی صفت انسان کے گھر شیطان پیدا ہو گیا تھا اور بڑی بے حیائی کے ساتھ اپنے باپ کی وراثت کو لٹا رہا تھا۔

ان تمام حالات کا یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ پورے ملک میں انتشار پھیل گیا۔ رکن الدین فیروز شاہ کے چھوٹے بھائی غیاث الدین محمد نے جو اودھ کا حکم تھا۔ فرمانروائے ہند کی اطاعت سے انکار کر دیا اور اس نے لکھنوتی کے محصولات کی رقم جو دہلی کے خزانے میں جمع کرنے کے لئے بھیجی تھی اسے راستے ہی سے واپس منگوا لی۔ اس کے بعد بدایوں، لاہور، ملتان اور ہانسی کے حاکموں نے آپس میں خط و کتابت کر کے رکن الدین فیروز شاہ کی اطاعت سے انکار کر دیا اور وہ کھلے ہوئے باغیوں کی صف شامل ہو گئے۔ جب رکن الدین کو یہ پریشان کن خبریں ملی تو وہ مہوشوں کی آغوش سے اٹھا اور باغی امرا کی سرکوبی کے لئے دہلی سے نکل کر ''کیلوکھڑی'' کی طرف بڑھا...... مگر بغاوت مکمل ہو چکی تھی ...... التمش کے عہد کے کئی امرا شاہی فوجوں سے الگ ہو کر دہلی پہنچ گئے اور باہم مشورے کے بعد رضیہ سلطانہ کو تخت پر بٹھا دیا گیا۔ رضیہ نے اقتدار حاصل کرتے ہی رکن الدین کی ماں شاہ ترکان کو گرفتار کر کے قید خانے میں ڈال دیا۔

فیروز شاہ کو اس انقلاب کی خبر ملی تو وہ بدحواسی کے عالم میں دہلی کی طرف پلٹا اور کیلوکھڑی کے مقام پر ٹھہر گیا۔ رضیہ کی حامی فوجوں نے بڑی جانبازی سے رکن الدین کے لشکر کا مقابلہ کیا۔ بالآخر ایک طویل خونریزی کے بعد فیروز شاہ کو شکست ہوئی اور پھر اسے قید کر کے قلعے میں نظر بند کر دیا گیا۔ کچھ دن بعد اسی حالتِ اسیری میں رکن الدین کا انتقال ہوا۔ اس نے صرف چھ ماہ اور آٹھ دن حکومت کی۔

❋❋❋

اس دوران رائے نعیم الدین ذیشان اپنے گھر میں روپوش رہا۔ وہ رکن الدین فیروز شاہ کو اس لئے پسند نہیں کرتا تھا کہ خود سلطان التمش کو اپنے بیٹے سے کوئی رغبت نہیں تھی۔ مگر جب رضیہ سلطانہ اقتدار میں آئی تو رائے نعیم الدین گوشہ نشینی سے نکل کر دربار میں آیا اور ہندوستان کی پہلی خاتون حکمراں کو یہ کہہ کر اپنی وفاداریوں کا یقین دلایا۔

''آپ میرے شہنشاہ کی صاحبزادی ہیں۔ سلطان آپ سے محبت کرتے تھے۔ اس لئے میں بھی آپ کی جنبشِ نگاہ کا پابند ہوں۔''

رضیہ سلطانہ! رائے نعیم الدین کے اظہار وفاداری سے بہت خوش ہوئی اور اس نے فوری طور پر نومسلم فوجی کا عہدہ بڑھا دیا۔

رائے نعیم الدین ذیشان نے رضیہ سلطانہ کی حمایت میں کئی جنگیں لڑیں اور فتوحات بھی حاصل کیں۔ مگر رضیہ کی اقبال مندی کا دور بہت مختصر تھا۔ رضیہ سلطانہ نے تین سال چھ دن تک حکومت کی۔ یاقوت حبشی کے ساتھ بے تکلفانہ تعلقات رکھنے کے سبب درباری امراء رضیہ سے سخت ناراض تھے......اور پھر اسی ناراضگی نے بغاوت کا رنگ اختیار کر لیا۔

باغی سرداروں نے دیگر امراء سے مشورہ کر کے سلطان شمس الدین التمش کے دوسرے بیٹے معز الدین بہرام شاہ کو اپنا حکمران تسلیم کر لیا۔ بہرام شاہ نے سیاسی مصلحت کے پیش نظر کسی تاخیر کے بغیر رضیہ سلطانہ پر لشکر کشی کی۔ دونوں فوجوں میں سخت مقابلہ ہوا لیکن رضیہ کی فوجیں بہرام شاہ کے حملے کی تاب نہ لاسکیں۔ وہ میدان جنگ سے فرار ہوگئی اور پھر کچھ زمینداروں نے اسے گرفتار کر کے معز الدین بہرام شاہ کے روبرو پیش کر دیا۔ بہرام شاہ اپنی بہن سے بہت زیادہ خائف رہتا تھا۔ اس لئے اس نے بے دریغ رضیہ کے قتل کا حکم جاری کر دیا۔

جب التمش کی بیٹی موت کی نیند سو گئی تو ان فوجی سرداروں اور سپاہیوں پر بھی قہر شاہی نازل ہوا جنہوں نے رضیہ سلطانہ کی حمایت میں پر جوش جنگ لڑی تھی۔ ان معتوب فوجیوں میں رائے نعیم الدین ذیشان بھی شامل تھا۔ بہرام شاہ مخالف سپاہیوں کو قتل کرنے سے پہلے پوچھتا تھا کہ آخر تم لوگوں نے میرے مقابلے میں رضیہ کا ساتھ کیوں دیا تھا؟ جواب میں ہر سپاہی اپنی غلطی تسلیم کر کے جان بخشی چاہتا تھا مگر بہرام شاہ نے کسی کو معاف نہیں کیا اور بڑی بے دردی کے ساتھ ان سب کو فنا کے گھاٹ اتار دیا۔

رائے نعیم الدین ذیشان سے بہرام شاہ نے یہی سوال کیا تھا......مگر اس وقت تمام اہل دربار ساکت رہ گئے تھے جب ایک مسلمان راجپوت نے بہرام شاہ کی توقعات کے خلاف انتہائی باغیانہ جواب دیا تھا۔

رائے نے کہا تھا۔ ''میری حیثیت سلطان التمش کے غلام کی سی تھی۔ اس لئے میں انجام کی پروا کئے بغیر اپنی آقا زادی کے اقتدار کے لئے لڑ رہا تھا۔''

رائے نعیم الدین ذیشان کا جواب سن کر بہرام شاہ نے نہایت تحقیر آمیز لہجے میں کہا تھا۔ ''اگر تو اپنے آقا سے نسبت کا اسی قدر لحاظ رکھتا تھا تو میں بھی تیرے آقا کا فرزند تھا۔ پھر تو نے میرے خلاف اپنی شمشیر کیوں بے نیام کی؟''

''اس لئے کہ سلطان اپنی صاحبزادی کو ہندوستان کا حکمراں دیکھنا پسند کرتے تھے......اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ وہ آپ سے بہتر فرمانروا تھیں۔''

بہرام شاہ کو رائے نعیم الدین کی اس بیباکی نے کسی شعلے کی طرح بھڑکا دیا تھا مگر وہ اس نومسلم سپاہی کو شکست دینے کیلئے عیاری پر اتر آیا۔ ''اگر تو شاہ کے حضور اپنی غلطی اور گستاخی کو تسلیم کرتے ہوئے رحم کی درخواست کرے تو ہم تجھ پر مہربان ہو سکتے ہیں......اور اس نامراد زندگی کو واپس کر سکتے ہیں جس کی ساعتیں شمار کی جا چکی ہیں۔''

رائے نعیم الدین کی گردن کے تناؤ میں مزید اضافہ ہوگیا۔ ''زندگی موت پر خدا کے سوا کسی کا اختیار نہیں......اور بالفرض محال اگر آپ میری زندگی پر قادر ہو بھی جائیں تو میں آپ سے چند سانسوں کی بھیک نہیں مانگوں گا۔ لعنت کا یہ طوق پہن کر نہ میں دربار میں آسکتا ہوں اور نہ کسی گوشہ گمنامی میں زندہ رہ سکتا ہوں۔''

پندار شاہی ٹوٹ چکا تھا۔ معز الدین بہرام شاہ [illegible] گفتگو کو برداشت نہ کر سکا اور پھر رائے

نعیم الدین ذیشان کو قتل کر دیا۔

یہ واقعہ 638ھ میں پیش آیا۔ مرتے وقت رائے نعیم الدین کا چہرہ پرسکون تھا۔ اس نے بڑی شان سے رسم وفا نبھائی تھی۔ اگرچہ کفار سے جنگ کرنے کی آرزو پوری نہ ہو سکی تھی لیکن رائے زادہ اپنے انجام سے مطمئن تھا کہ اس کے نزدیک ایفائے عہد ہی زندگی کی سب سے بڑی سعادت تھی۔

قسمت نے رائے نعیم الدین کو یہ سعادت بخش دی تھی لیکن اس کی بیوی کو عین جوانی میں بیوہ بنا ڈالا تھا...... اور اس کے بیٹے شجاع الدین کامران کو کمسنی میں یتیمی کے اعزاز سے سرفراز کر دیا تھا۔

❋❋❋

رائے نعیم الدین کے قتل ہوتے ہی اس کی بیوی اور بچہ ایک خوفناک انقلاب کا شکار ہو گئے تھے۔ جب سعدیہ خانم شجاع الدین کامران کو لے کر اپنے دولت مند اور با اثر باپ اعتماد خان کے گھر میں داخل ہوئی تو خون کا ایک ایک رشتہ اجنبی بن گیا۔ باپ، بیوہ بیٹی کو دیکھتے ہی پکار اٹھا۔

''سعدیہ! تم یہاں سے اسی وقت چلی جاؤ۔ آج ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی رشتہ باقی نہیں رہا'' اعتماد خان کی زبان سے ادا ہونے والا ایک ایک لفظ زمانہ سازی کا ترجمان تھا۔

سعدیہ خانم ابھی بیٹھی بھی نہ تھی کہ اسے وہ شخص گھر سے نکل جانے کا حکم دے رہا تھا جو رشتوں کی گہرائی کے باعث اس کے لئے سب سے زیادہ محترم تھا۔ سعدیہ خانم پہلے تو سمجھ ہی نہ سکی کہ اچانک کیا ہو گیا ہے مگر جب اس نے باپ کے چہرے پر نفرت و غضب کا واضح عکس دیکھ لیا تو وہ کمرے کے درمیان ہی کھڑی رہی۔ اب اس نے باپ کے گھر بے تکلفانہ انداز میں بیٹھنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔

''بابا جان! میں نے آپ کی پذیرائی اور شفقت کا یہ انداز پہلے تو کبھی نہیں دیکھا تھا'' سعدیہ خانم اپنے باپ اعتماد خان کے رویے کو سمجھنا چاہتی تھی۔ اس لئے اس کے لہجے میں حیرت کے سوا کوئی دوسرا جذبہ شامل نہیں تھا۔

''میرا رویہ نہیں بدلا ہے۔'' اعتماد خان ایک ایسا دعویٰ کر رہا تھا جو اس کے عمل سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ ''جو کچھ ہوا تمہارے عاقبت نااندیش شوہر کی طرف سے ہوا۔ میں نے اسے سنبھلنے کا بہت موقع دیا مگر وہ حرص و ہوس کے گرداب میں الجھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ وقت کی بے رحم موجیں نہ صرف اسے غرق کر گئیں بلکہ ہلاکتوں کے طوفان کو میرے گھر کا پتا بتا گئیں۔ میں نے اپنے سفینے کو غرقابی سے کس طرح بچایا ہے' یہ تو میرا ہی دل جانتا ہے۔'' اب اعتماد خان کی بدسلوکی کا سبب ظاہر ہونے لگا تھا' مگر پھر بھی کچھ گوشے پوشیدہ تھے۔

''میرے شوہر کی فطرت میں ہوس شامل تھی اور نہ وہ حریص تھا۔ مرنے والے کو جس طرح آپ نے یاد کیا ہے وہ دنیا کا سب سے زیادہ اذیت ناک عمل ہے۔'' شوہر کا ذکر کرتے ہی سعدیہ خانم کی پلکیں بھیگنے لگی تھیں۔

''میں نے اسے سمجھایا تھا کہ وقت کے تیور خطرناک ہیں۔'' اعتماد خان کے لہجے کی جارحیت بدستور قائم تھی۔

''میں نے اسے بہت پہلے ہی خبردار کر دیا تھا کہ رضیہ سلطانہ کی حکومت کو پائیداری حاصل نہیں۔ اس لئے وہ بہرام شاہ کا ساتھ دے۔ مگر وہ اطاعت فرمانبرداری کے نام پر اس قدر پستیوں میں گر چکا تھا کہ اسے عقب میں کھڑی ہوئی موت بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ تمہارا شوہر ایک متوازن انسان نہیں' جنونی شخص تھا۔ اس کی وحشت و دیوانگی نے ہمارے راستے میں بھی زوال و رسوائی کے کانٹے بو دیئے تھے...... لیکن وہ تو میرا تدبر تھا جس نے اس گھرانے کو تباہی سے بچا لیا۔'' اعتماد خان کی ہوس پرست سیاست کے چہرے سے نقاب ہٹتا جا رہا تھا۔

''میں دربار شاہی میں اعلان کر چکا ہوں کہ رضیہ سلطانہ کی اطاعت تسلیم کرتے ہی میں نے اپنے داماد رائے نعیم

الدین' اپنی بیٹی سعدیہ خانم اور اپنے نواسے شجاع الدین کامران سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ یہ تینوں افراد نمک حرام اور غدار تھے' اس لئے ان تینوں سے میرا کوئی رشتہ باقی نہیں رہا ہے۔ میری یہی ذہانت اور مستقبل شناسی میرے کام آ گئی۔ خدا کا شکر ہے کہ سلطان معز الدین بہرام شاہ نے کسی تاخیر کے بغیر میرے اعتراف کو قبول کر لیا......اور اس عظیم خاندان کی وہ ساکھ برقرار رہی جسے تمہارے خودغرض اور احمق شوہر نے برباد کرنے کی بھرپور کوشش کی تھی۔"

سعدیہ خانم نے ایک نظر اپنے ہوش مند اور مدبر باپ کو دیکھا۔ پھر چند قدم آگے بڑھ کر اپنی ماں بلقیس خانم کے سامنے ٹھہر گئی۔ اس دوران اس کا سات سالہ بیٹا شجاع الدین کامران اپنے ماموں قائم خان راجپوت کے کمرے میں چلا گیا تھا۔ جہاں اس کی پانچ سالہ ماموں زاد بہن یاسمین خانم موجود تھی۔ جب سلطان التمش کے دور میں رائے نعیم الدین ذیشان کو اعلیٰ فوجی عہدہ حاصل ہو گیا تھا تو اس کے خسر اعتماد خان نے اس رشتے کو مضبوط کرنے کیلئے اپنے بیٹے قائم خان کی لڑکی یاسمین خانم کو شجاع الدین کامران سے منسوب کر دیا تھا۔ دونوں بچے آپس میں بے پناہ محبت کرتے تھے مگر شجاع الدین کامران دوسرے رشتے کی نزاکتوں سے بے خبر' صرف بچپن کی معصوم رفاقتوں کے زیر اثر یاسمین خانم سے ملنے کیلئے اس کے کمرے میں چلا گیا تھا۔

سعدیہ خانم اس خوفناک زلزلے میں اپنے بیٹے پر نظر نہ رکھ سکی اور رشتوں کی عمارت کو بچانے کیلئے اپنی ماں بلقیس خانم سے گفتگو کرنے لگی۔

"بابا جان نے تو بے مثال ذہانت سے اپنی ساکھ بچالی اور ایک عظیم گھرانے کو تباہی و بربادی سے محفوظ رکھا' مگر کیا آپ بھی اس ناقابل فراموش کارنامے میں ان کی شریک ہیں؟"

سعدیہ خانم نے لفظوں کی وہ نشتر زنی کی تھی کہ اگر ماں کے سینے میں دل ہوتا تو خون ہو کر آنکھوں سے بہنے لگتا۔ لیکن وہاں ایسی کسی شے کا وجود نہیں تھا۔ لہو کا تو ذکر ہی کیا......ماں کی آنکھوں میں تو بیوہ بیٹی کیلئے ایک آنسو بھی نہیں تھا......

بلقیس خانم نے بیٹی کو غضب ناک نظروں سے دیکھا۔ "تم کیسی اولاد ہو کہ ماں باپ کی زندگی اور عزت و وقار سے ایک بھیانک کھیل کھیل رہی ہو۔ کیا بابا جان نے تمہیں نہیں بتایا کہ اس مکان پر تمہارے قیام کا گزرنے والا ہر لمحہ اس عظیم گھرانے کی بنیاد تک ڈھا کر رکھ دے گا؟ تمہارا صرف ایک شوہر آغوش فنا میں پہنچا ہے۔ یہاں کئی معصوم اور بے گناہ ہستیاں موت کی نیند سو جائیں گی۔ تم کیسی بے رحم ہو کہ اپنی آسائش کیلئے پورے خاندان کو خاک میں ملا دینا چاہتی ہو۔"

"بس مادر محترم! بس!" سعدیہ خانم کی قوت برداشت جواب دے گئی تھی۔ وہ درمیان ہی میں بول پڑی مگر حد ادب قائم تھی۔ اس نے بلقیس خانم کی طرف پتھرائی ہوئی آنکھوں سے دیکھا۔ "میری ماں! تم بھی......میری ماں! تم بھی؟" سعدیہ خانم کے ہونٹ دوبارہ کانپے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ قدموں کا توازن بگڑنے لگا تو سعدیہ خانم نے اس سنگی ستون کا سہارا لیا جسے قیمتی پتھروں سے تراشا گیا تھا۔ پھر کچھ دیر تک وہ ساکت کھڑی رہی۔ اس کے اعصاب بھی غیر معمولی دباؤ کی زد میں تھے اور سانسیں بے ربط ہو گئی تھیں۔ آنکھوں کے گوشے بھیگ جانا چاہتے تھے۔ مگر سعدیہ خانم نے کسی نہ کسی طرح سیلاب اشک کو روک لیا۔ وہ ماں باپ کے گھر رونے آئی تھی کہ صدمات کی یہ گھٹا کھل کر برس جائے اور اس غبار کی اذیت سے نجات حاصل ہو جو شوہر کی موت سے اب تک اس کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا... لیکن زندگی کے صحرا میں یہ غبار اب سعدیہ خانم کی تقدیر بن کر رہ گیا تھا......اور تقدیر کے آئینے سے منہ چھپانا ممکن نہیں

''اس سے پہلے کہ ہم پر غضب شاہی نازل ہو جائے' خدا کیلئے تم یہاں سے چلی جاؤ۔'' اعتماد خان نے بیٹی کی دلی کیفیت کا احساس کئے بغیر چیختے ہوئے کہا۔

سعدیہ خانم پتھر کے ستون سے سر ٹیکے کھڑی تھی۔ باپ کی تیز آواز سنی تو اس نے سر اٹھایا اور بہت آہستہ لہجے میں کہنے لگی۔ ''جا رہی ہوں بابا جان! میرا بیٹا شجاع الدین کہاں ہے؟ اسے بلا دیجئے۔''

ابھی فضاؤں میں سعدیہ خانم کے الفاظ کی گونج باقی تھی کہ اعتماد خان اپنے بیٹے قائم خان راجپوت کے کمرے کی طرف بڑھا جہاں شجاع الدین کامران' یاسمین خانم کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ چند لمحوں بعد اعتماد خان اسے کھینچتا ہوا لایا اور سعدیہ خانم سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

''بس اب یہاں سے چلی جاؤ کہ آنے والا ایک ایک لمحہ مجھے کسی عذاب کی خبر دے رہا ہے۔'' اعتماد خان کے لہجے میں سفاکانہ اجنبیت تھی۔

سعدیہ خانم نے بیٹے کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر شجاع الدین کامران پیچھے ہٹ گیا اور اپنے نانا اعتماد خان کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''میں اکیلا نہیں جاؤں گا یاسمین بھی میرے ساتھ جائے گی۔'' بچپن کی معصومیت بوڑھی سیاست کا کھیل سمجھنے سے قاصر تھی۔ اس لئے شجاع الدین کامران ضد کرنے لگا۔

''تجھے جانا ہوگا۔'' اعتماد خان نے نواسے کی معصوم اور نازک ضد کو بھی سیاست کی آگ میں جھونک دیا۔ ''اب کبھی اس گھر میں قدم نہ رکھنا کہ یاسمین کا تجھ سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔''

''میں روزانہ آؤں گا۔ یہ میرا گھر ہے' یاسمین کا گھر ہے۔'' شجاع الدین کامران حالات کی جفا کاریوں سے بے نیاز اپنے رشتوں کا حوالہ دے رہا تھا۔

اس دوران یاسمین خانم بھی اپنے دادا اور دادی کے قریب آ گئی تھی۔ اس نے کامران کے آخری الفاظ سن لئے تھے۔ ان ہی کے جواب میں اعتماد خان سے کہنے لگی۔ ''دادا! میں کامران بھائی کے ساتھ جاؤں گی۔''

معصومیت نے ایک اور ضد کی تھی مگر اسے بھی کچل دیا گیا۔ اعتماد خان نے پوتی کا ہاتھ پکڑ لیا اور بیٹی کو جھڑکتے ہوئے کہا۔ ''اب اس کھیل کو ختم کر دو کہ مجھ پر تمہارے قیام کی ایک ایک ساعت بھاری ہے۔''

سعدیہ خانم بمشکل آگے بڑھی اور بیٹے کے کاندھوں پر اپنے لرزتے ہوئے ہاتھ رکھ دیئے۔ ''شجاع الدین! اپنے مکان پر چلو یہ تمہارا گھر نہیں ہے۔''

''ماں! ہمارا گھر کہاں ہے؟ وہ گر چکا۔'' کامران نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔ یکایک اس کی آنکھوں سے دہشت جھلکنے لگی تھی۔

''نہیں بیٹے! وہی بے در و دیوار کا گھر ہمارا حقیقی گھر ہے۔ ہم اس مکان میں نہیں رہ سکتے کہ مالکوں نے اسے شاہوں کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے۔'' سعدیہ خانم بیٹے کو وہ بات سمجھانا چاہتی تھی جو شجاع الدین کامران کی عقل سے بالاتر تھی۔

یتیم بچہ حیرت سے ماں کا چہرہ دیکھنے لگا۔ پھر کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو دوبارہ مچل اٹھا۔ عجیب حشر خیز منظر تھا۔ سعدیہ خانم بیٹے کو جلد از جلد اس سائبان سے دور لے جانا چاہتی تھی' مگر کامران اپنے کھنڈر نما مکان کے تصور ہی سے سہما ہوا تھا۔

''نہیں ماں! میں وہاں نہیں جاؤں گا۔'' اس کا لرزتا ہوا ہاتھ اٹھا اور بیٹے کے نازک رخساروں پر گہرا نشان چھوڑ گیا۔ اب خوف و دہشت نے مکمل طور ... کر لیا تھا۔ وہ ڈر کر ماں کے

قدموں سے لپٹ گیا۔

پھر سعدیہ خانم جس طرح بیٹے کو لے کر واپس لوٹی وہ کیفیت ناقابل بیان تھی۔

آج تو داغ کو ہم لوگ ترے کوچے سے
اس طرح کھینچ کے لائے ہیں کہ جی جانتا ہے

شجاع الدین کامران کی چیخیں دور تک گونجتی رہیں۔ وہ بار بار اپنے بچپن کے ساتھی کو پکار رہا تھا۔

''یاسمین! تم میرے گھر ضرور آنا۔ وہاں مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔''

❋❋❋

پھر چشم فلک نے وہ خوں رنگ منظر بھی دیکھا جب ایک برقع پوش خاتون ایک معصوم بچے کے ساتھ اینٹوں اور پتھروں کے ڈھیر پر کھڑی تھی۔ یہ رائے نعیم الدین ذیشان کا مکان تھا جسے سلطان معز الدین بہرام شاہ کے حکم پر مسمار کر دیا گیا تھا۔ وفاداریوں کا قرض اتارتے اتارتے رائے نے اپنی جان دیدی تھی مگر پھر بھی حساب برابر نہیں ہوا تو حکومت وقت نے اس کا مکان سود میں لے لیا تھا۔

برقع پوش خاتون سعدیہ خانم تھی' رائے نعیم الدین ذیشان کی جواں سال بیوہ' جسے کچھ دیر پہلے ہوشمند ماں باپ نے پہچاننے سے انکار کر دیا تھا......اور وہ معصوم بچہ شجاع الدین کامران تھا' شمشیر زنوں کا خوف زدہ وارث' جو کبھی اپنی تباہ حال چار دیواری کو دیکھتا تھا......اور کبھی اپنی ماں کے چہرے کو جو نقاب کے ساتھ ساتھ رنج والم کے بے شمار پردوں میں لپٹا ہوا تھا۔

دھوپ کی رنگت زرد ہو چلی تھی اور دور کہیں اندھیروں کا رہزن اپنی آمد کا اعلان کر رہا تھا۔ سعدیہ خانم کو اپنی بیوگی کی پہلی رات اسی کھنڈر نما مکان میں گزارنی تھی۔ وہ لاکھ بہادر راجپوتوں کی اولاد سہی مگر اس نے زندگی کی تنہائیوں کو پہلے کبھی اتنے قریب سے نہیں دیکھا تھا۔ اس کی نظروں کے سامنے کئی چمن اجڑے تھے لیکن اپنے آشیانے کی بربادی کا یقین نہیں آتا تھا کہ خوابوں اور آرزوؤں کے سنہری تنکوں کا انجام اتنا مختصر ہوگا۔ ناگہاں بس ایک برق لہرائے گی اور ہر طرف دھواں پھیل جائے گا۔

جن آنکھوں نے ماں اور باپ کے سامنے اشک ریزی سے انکار کر دیا تھا' وہ آنکھیں اب تنہائی میں برس رہی تھیں۔ پھر اچانک سعدیہ خانم کو احساس ہوا کہ شجاع الدین کامران بھی اسے دیکھ کر رونے لگا ہے۔ آنسوؤں کا یہ طوفان تو ساری زندگی کیلئے آیا تھا مگر سعدیہ خانم نے بیٹے کے شکستہ جذبات کا خیال کر کے ان آنسوؤں کا راستہ روک دیا جو ایک بیوہ کے دل پر جمی ہوئی غبار کی دبیز تہوں کو دھونے کی کوشش کر رہے تھے۔ اشکوں پر پہرے لگائے گئے تو پگھلنے والا غبار دوبارہ اپنی کثافتوں کے ساتھ جم گیا۔

سعدیہ خانم نے اپنے کھنڈر کی طرف سے نظریں ہٹائیں اور بیٹے شجاع الدین کی طرف دیکھنے لگی۔

''کامران! رات سر پر ہے' اندھیری اور سرد رات...... بیٹے! میری مدد کرو اور پتھر ہٹا کر اتنی جگہ بنالو کہ جس پر تمہاری ماں اپنی چادر تان سکے۔''

❋❋❋

سعدیہ خانم نے پتھروں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہٹانا شروع کر دیئے۔ معصوم کامران ماں کو دیکھ کر رونا بھول گیا اور اپنے نازک ہاتھوں سے ماں کی مشقتوں کو کم کرنے کی کوشش کرنے لگا...... مگر یہ ایک قہر تھا جسے کلیوں جیسی جان برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ شجاع الدین کامران صرف چند سنگریزے ہی ہٹا سکا اور وہ بھی اس طرح کہ اس کے ہاتھوں کے گلاب خراشوں سے بھر گئے تھے۔

سعدیہ خانم نے بیٹے کے ہاتھوں پر کہیں کہیں خون کے قطرے دیکھے تو لرز کر رہ گئی۔ رائے نعیم الدین ذیشان کا خون آلود جسم دیکھ کر اب اس میں اتنی ہمت نہیں رہی تھی کہ وہ شوہر کی نشانی سے بھی لہو ٹپکتا ہوا دیکھ سکے۔

''تم رک جاؤ کامران!'' سعدیہ خانم نے بیٹے سے انتہائی پر سوز لہجے میں کہا۔ ''تم ایک طرف بیٹھ جاؤ میں خود ان پتھروں کو صاف کرلوں گی۔''

''نہیں مام! یہ کیسے ہوگا؟ پتھر بہت بھاری ہیں۔ آپ بھی زخمی ہو جائیں گی۔'' کامران کا احساس جاگ اٹھا تھا اور وہ ماں کے منع کرنے کے باوجود بساط بھر پتھروں کو ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔

اور واقعتاً پتھر بہت بھاری تھے۔ ناز و نعم میں پلی ہوئی ایک خانہ نشین خاتون یہ گراں بار محنت نہیں کر سکتی تھی۔ یہاں تک کہ سعدیہ خانم تھک کر بیٹھ گئی اور حسرت سے ان بھاری پتھروں کو دیکھنے لگی جن کے نیچے اس کا ماضی اور مستقبل دب کر رہ گئے تھے۔

اس دوران سعدیہ خانم نے یہ بھی محسوس کیا کہ رائے نعیم الدین ذیشان کا کھنڈر دیکھ کر اکثر راہ گیر تیزی سے گزر جاتے تھے جیسے ان پر نادیدہ خوف غالب ہو اور وہ کسی وادی عذاب سے گزر رہے ہوں۔ کوئی کوئی راہ چلنے والا ٹھہر جاتا تھا اور اس مکان پر قہر شاہی کے نزول کا سبب بھی بیان کر دیتا تھا۔ زیادہ تبصرہ کرتا تو اپنے ساتھی سے یہ بھی کہہ دیتا کہ وحشی اور دیوانے اپنے مرنے کے بعد ایسا ہی شاندار ورثہ چھوڑ جاتے ہیں۔ شجاع الدین کامران تو ان باتوں کے مفہوم ہی سے ناآشنا تھا مگر بزدلی اور نفرت کے یہ جلتے ہوئے نشتر سعدیہ خانم کی رگ احساس کو کاٹ دینا چاہتے تھے۔

بہت سے لوگ اس راستے گزرے لیکن کسی نے رک کر یہ نہیں پوچھا کہ اے پردہ دار خاتون! تو کس لئے اداس بیٹھی ہے؟ ہمارے توانا بازو کس دن کام آئیں گے؟ مگر یہ کون کہتا' پوری بستی شاہ کے خوف سے لرز رہی تھی۔ پھر کون اپنے گھر کو رائے نعیم الدین کے مکان کا ہم رنگ بنانے کی خواہش کرتا۔ لوگ آتے ایک بیوہ عورت اور معصوم بچے کو سیاسی زلزلے کا شکار دیکھ کر ڈرے سہمے گزر جاتے۔

اب سورج غروب ہونے کے قریب تھا اور سردی بڑھتی جا رہی تھی۔ مکان مسمار ہو جانے کے باعث تمام کپڑے ملبے کے ڈھیر میں دب گئے تھے۔ شاید لباسوں کو بھی غضب شاہی کے نزول کا خوف تھا۔ کہیں ان سے باز

پرس نہ ہو جائے کہ ایک معتوب گھر کے افراد کو برفانی ہواؤں کی یلغار سے بچانے کے لئے تحفظ کیوں فراہم کیا گیا؟

سورج افق مغرب پر کچھ اور جھک گیا۔ سعدیہ خانم نے اداس نظروں سے آسمان کی طرف دیکھا اور پھر معصوم کامران پر نگاہ کی جس کے بدن میں ہلکی ہلکی لرزش پیدا ہونے لگی تھی۔ ماں نے اپنی گرم چادر اتار کر مقتول کے وارث پر ڈال دی۔

''پھر آپ کیا اوڑھیں گی؟'' کم سنی کے باوجود حساس بیٹا خاموش نہ رہ سکا۔

''صبر کرو خدا کوئی نہ کوئی انتظام کر دے گا'' سعدیہ خانم نے کامران کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

وقت کی رفتار بڑھتی ہوئی سردی کا ساتھ نہ دے سکی۔ وہ منجمد سی ہو کر رہ گئی تھی۔ اچانک موسم کا یہ جمود ٹوٹا اور رائے نعیم الدین کی بیوہ کو اپنے خون میں حرارت کا احساس ہونے لگا۔ یہ حرارت کسی آتش کدے سے مستعار نہیں لی گئی تھی۔ اس حرارت کا سبب ایک شخص کا نعرۂ مستانہ تھا جس نے کچھ دیر کے لئے موسم کی فطرت بدل دی تھی۔

سعدیہ خانم اس شخص سے واقف تھی۔ وہ دہلی کا ایک مجذوب تھا جو راتوں کو شہر کی گلیوں میں نعرہ زنی کرتا ہوا گھومتا رہتا تھا۔ نصف شب کے قریب سعدیہ خانم کی دیوار کے نیچے سے بھی گزرتا تھا۔ اس کے نعرے مختلف ہوتے تھے۔

''کب تک خون بہاؤ گے...... کیا تم چاہتے ہو کہ آسمانوں سے بھی خون کی بارش کر دی جائے...... کل رات میں سویا ہوا تھا اور لٹیرے میری فصل کاٹ کر لے گئے...... تو مر چکا ہے اور سنہری سانپ تیرے جسم کو ڈس رہے ہیں۔''

وہ مجذوب اسی قسم کے پراسرار نعرے لگاتا ہوا گزر جاتا تھا۔ لوگ اسے پاگل سمجھتے تھے' مگر اہل نظر جانتے تھے کہ اس کی بے ربط باتیں ایک خاص مفہوم رکھتی ہیں۔ وہ بے سبب اپنے ہونٹوں کو جنبش نہیں دیتا جب بھی بولتا تو کوئی گہرا راز فاش کر دیتا مگر اس راز کی کسی کسی کو خبر ہوتی۔

رائے نعیم الدین کے قتل سے ایک رات پہلے مجذوب نے جگر شگاف چیخ مار کر کہا تھا۔

''درندو! تم کب تک ناحق خون بہاؤ گے؟'' اور دوسرے دن صبح ہوتے ہی رائے نعیم الدین کو سلطان بہرام شاہ کے حکم پر قتل کر دیا گیا تھا۔

اب اسی مجذوب نے سعدیہ خانم کے قریب پہنچ کر دل کی طاقت سے نعرہ زنی کی تھی۔

''کیسے قزاق ہیں؟ جان کے ساتھ مکان بھی نہیں چھوڑتے۔''

سعدیہ خانم مجذوب کی آواز سن کر چونک اٹھی تھی اور پھر اس نے بڑے کرب ناک لہجے میں کہا۔ ''دیکھ رہے ہو بابا؟''

مجذوب نے جلتی ہوئی سرخ آنکھوں سے سعدیہ خانم کی طرف دیکھا اور اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔ یہ خاموش رہنے کا اشارہ تھا۔ سعدیہ خانم چپ ہو گئی۔

پھر وہ مجذوب آگے بڑھا اور پتھروں کے ڈھیر پر کھڑے ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اچانک اس کے جسم کو حرکت ہوئی۔ وہ جھکا اور ایک بھاری پتھر اٹھاتے ہوئے بولا۔

''انسانوں کے دل سے زیادہ سخت نہیں ہے۔''

اس کے بعد وہ کچھ نہیں بولا۔ خاموشی سے پتھر اٹھا اٹھا کر پھینکتا رہا۔ مجذوب بظاہر بہت کمزور نظر آ رہا تھا لیکن بہر حال مرد تھا اس لئے ایک غمزدہ عورت اور معصوم بچے کے مقابلے میں اس کی کوششیں زیادہ بارآور ثابت ہو رہی تھیں۔

سورج کی آخری کرن بھی بجھ گئی مگر اس عرصے میں مجذوب پتھروں کے اس ڈھیر کو صاف کرنے میں کامیاب ہو گیا جس کے نیچے کپڑوں کا صندوق دبا ہوا تھا۔ اس عالم بے چارگی میں سعدیہ خانم کے دھواں چہرے پر روشنی کی ایک ہلکی سی لکیر ابھر کر ڈوب گئی۔ اس وقت سردی سے بچنے کیلئے گرم لباس کا مل جانا بھی کسی خزانے سے کم نہیں تھا۔

"بیٹی دوسرا گھر بنا لے۔ عنقریب حساب ہونے والا ہے۔ اس کا گھر تیرے گھر سے بھی زیادہ شکستہ و تاریک ہو گا۔" مجذوب بے معنی سے چند جملے کہہ کر ایک طرف چلا گیا۔ سعدیہ خانم نے نظر اٹھا کر دیکھا تو دور دور تک اس کا پتا نہیں تھا۔ وہ کچھ دیر اس مرد قلندر کی آمد پر حیران ہوتی رہی کہ آج مجذوب بے وقت کیوں آ گیا تھا ورنہ اس کا دورہ تو آدھی رات کے بعد ہوتا تھا۔ سعدیہ خانم اس مجذوب کو ایک بے ضرر قسم کا پاگل سمجھتی تھی، مگر آج اس کی حرکتوں میں کچھ عقل کی نشانیاں بھی جھلکتی تھیں۔

سعدیہ خانم نے اپنے منتشر خیالات سے پیچھا چھڑایا اور شکستہ صندوق کھول کر لباس اور چادریں نکالنے لگی، پھر کچھ دیر بعد کپڑوں کی ایک جھونپڑی سی بن گئی جس پر کسی خانہ بدوش کے گھر کا گمان ہوتا تھا۔

شجاع الدین کامران جو روتے روتے نڈھال ہو گیا تھا ماں کی آغوش میں سر رکھ کر سو گیا۔ کل جب رائے نعیم الدین ذیشان کو قتل کیا گیا تھا اس وقت سے دوسرے دن رات تک سعدیہ خانم نے غذا نام کی کوئی چیز نہیں کھائی تھی۔ شوہر کی موت کے صدمے نے اسے اس قابل ہی نہیں چھوڑا تھا کہ وہ بھوک کا احساس کرتی، پھر بھی اس نے معصوم کامران کو وہ تھوڑا بہت کھانا کھلا دیا تھا جو گھر میں موجود تھا، لیکن دوسرے دن صبح جب مکان کو مسمار کر دیا گیا تو اشیائے خوردنی میں سے کوئی چیز بھی محفوظ نہیں رہ سکی۔ اگرچہ اس کا بیٹا صبح سے بھوکا تھا، لیکن وہ یہ سوچ کر مطمئن تھی کہ ماں باپ کے گھر جا کر اسے کچھ نہ کچھ کھلا دے گی پھر آبائی مکان پر سعدیہ خانم کے ساتھ جو سلوک ہوا اس میں غذا تو غذا پانی کی گنجائش بھی نہیں نکلتی تھی۔

کامران اس وقت بھی بھوکا سو رہا تھا۔ یہ سوچ کر سعدیہ خانم کی آغوش سلگ اٹھی۔ ممتا نے بڑی اذیت کے ساتھ کروٹیں لیں مگر اسے بھی حالت جبر میں سو جانا پڑا۔

ابھی رات کی چند ساعتیں ہی گزری تھیں کہ وہ مجذوب دوبارہ آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کپڑا تھا اور کپڑے میں کوئی چیز لپٹی ہوئی تھی۔ مجذوب نے چادروں کے خیمے کے اندر جھانکا اور وہ کپڑا سعدیہ خانم کی طرف بڑھا دیا۔

"یہ کیا ہے؟" سعدیہ خانم نے چونک کر پوچھا۔

"روٹی جس کا کھلانا تیرے پڑوسیوں اور عزیزوں پر فرض تھا، مگر یہ فرض کو نہیں جانتے اور مسلمان کہلاتے ہیں۔ مجھے ان لوگوں نے کفار قرار دے دیا ہے پھر بھی میری غم زدہ بچی! تو اس کافر کے ہاتھ کا کھانا قبول کر لے۔"

مجذوب کی اس محبت پر سعدیہ خانم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے مجذوب کے ہاتھ سے کپڑا لے لیا اور غور سے اسے دیکھتی رہی۔

"کیا سوچ رہی ہے میری بیٹی؟" مجذوب نے سعدیہ خانم سے کہا۔ "مجھے شاہوں نے اپنے دستر خوان پر بہت بلایا، مگر میں نے ادھر تھوکا بھی نہیں۔ آج پہلی بار تیرے لئے کسی غریب کے گھر سے بھیک مانگی ہے، کھا لے۔ بھیک کی روٹی کھا لے۔" شعلہ بار لہجہ رکھنے والے مجذوب کی آواز شدت جذبات سے لرز رہی تھی۔

"بابا! تم بھی میرے غموں میں اضافہ کرتے ہو۔" مجذوب کی محبت کے اس انداز نے سعدیہ خانم کو رلا دیا تھا۔

"پھر کیا کروں؟ تیری بھوک تو نہیں دیکھ سکتا۔" مجذوب کی آواز الجھنے لگی تھی۔ شاید اندھیرے میں نظر نہ آنے والے آنسوؤں نے اس کی آواز کو بھی بھگو د

سعدیہ خانم مجبور ہو گئی پھر مجذوب چادروں کے سائبان سے باہر نکل گیا تو اس نے سوتے ہوئے کامران کو اٹھایا۔

''کیا آج ابا جان مجھے اپنے ہاتھ سے کھانا نہیں کھلائیں گے؟'' معصوم بچے نے غلطی سے ماضی کے آئینے پر پتھر مار دیا تھا۔ شیشے کے کئی ٹکڑے بیک وقت سعدیہ خانم کے سینے میں اتر گئے۔ دل پر پھر غبار چھایا اور آنکھوں سے پھر سیلاب امڈ پڑا۔

رائے نعیم الدین ذیشان جب بھی گھر پر موجود ہوتا کامران کو اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلاتا۔ یہ برسوں پرانی عادت تھی اور اس عادت میں دو دن سے بڑا خلل واقع ہو گیا تھا۔ سعدیہ خانم نے کامران کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

''تمہارے ابا جان بہت دور جا چکے ہیں۔ اب وہ تمہیں کبھی کھانا نہیں کھلائیں گے۔ جاتے وقت مجھ سے کہہ گئے تھے کہ میں تمہیں اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاؤں۔'' سعدیہ خانم نے بیٹے کے سامنے جھوٹ کی ایک اونچی دیوار کھڑی کر دی تا کہ شجاع الدین کامران اس کے پار جھانک کر حقیقت کا چہرہ نہ دیکھ سکے۔

کامران نے تاریکی میں ماں کی طرف دیکھنے کی کوشش کی مگر وہاں ایک انسانی ہیولے کے سوا کچھ نہیں تھا۔

کامران! تم ایک فرمانبردار بیٹے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ اپنے ابا جان کا حکم نہیں ٹالو گے۔'' سعدیہ خانم نے اسے ایک اور فریب دیا۔

''مام! ابا جان کو کس نے قتل کر دیا؟'' سعدیہ خانم غموں کی جس لے کو توڑنا چاہتی تھی کامران اسے دوبارہ جوڑ رہا تھا۔ ''ان کا دشمن کون تھا؟ نانا اس شخص سے بدلہ کیوں نہیں لیتے؟ ماموں اسے پکڑ کر میرے سامنے کیوں نہیں لاتے؟ میں اس سے پوچھوں گا کہ اس نے میرے باپ کو کیوں قتل کیا؟'' کامران نے ایک زبان میں کئی سوال کر ڈالے تھے مگر سعدیہ خانم بیٹے کو کسی ایک سوال کا جواب بھی نہیں دے سکتی تھی۔ وہ مسلسل خاموش بیٹھی رہی۔

ماں کے سکوت سے اکتا کر کامران نے ایک اور سوال کر دیا۔ ''میں نے اس سے کہہ دیا تھا مگر یاسمین بھی اب تک نہیں آئی۔ شاید آتی ہی ہو گی۔ یاسمین کو آ جانے دیں پھر میں اسی کے ساتھ کھانا کھاؤں گا۔''

معصومیت عجیب عجیب ضدیں کر رہی تھی۔ سعدیہ خانم نے بیٹے کے ذہن سے اس بوجھ کو ہٹانے کیلئے کہا۔

''اب رات زیادہ ہو گئی ہے یاسمین کل صبح آئے گی۔''

شجاع الدین کامران بڑی مشکل سے بہلا۔ پھر اس نے مجذوب کا لایا ہوا معمولی کھانا کھایا تو دل پر ایک اور چوٹ لگی۔ سعدیہ خانم نے جھوٹ کے مرہم سے بیٹے کے اس زخم کو بھی بھرنے کی کوشش کی۔ یہاں تک کہ کامران اپنے ہی سوالوں سے تھک کر سو گیا۔

❊❊❊

آج رات کے پہلے ہی حصے میں مجذوب کی نعرہ زنی شروع ہو گئی تھی۔ یہ سب کچھ خلاف معمول تھا۔ سعدیہ خانم نے سوچا کہ شاید آج بابا اپنے دورے پر گئے ہی نہیں ہیں اور حقیقت بھی یہی تھی کہ مجذوب رائے نعیم الدین کے کھنڈر کے آس پاس ہی چکر لگا رہا تھا۔ عام طور پر مجذوب کی نعرہ زنی نصف شب کے بعد جاری ہوتی تھی...... لیکن آج اس نے اپنی پچھلی تمام روایتوں کو توڑ ڈالا تھا۔ ہمیشہ مجذوب کا لہجہ غضب ناک ہوتا تھا' مگر آج اس کی صداؤں میں ناقابل بیان کرب شامل تھا۔ رہ رہ کر رات کے سناٹے میں اس کی چیخیں ابھر رہی تھیں۔

''تو سچا...... تیرا وعدہ سچا...... پھر مجھے سردی میں ٹھٹھرتے ہوئے کیوں دیکھ رہا ہے؟ آگ کیوں نہیں دیتا؟

مجذوب کی فریاد سے سعدیہ خانم کا دل دہل رہا تھا مگر وہ اسے گریہ وفغاں سے روک نہیں سکتی تھی۔

پھر مجذوب کی آوازیں بند ہوئیں تو کامران کی چیخیں گونجنے لگیں۔ ''مام! ابا جان آئے ہیں۔ ان کے جسم سے خون بہہ رہا ہے۔ لوگ انہیں تلواروں سے مار رہے ہیں...... مام! جلدی سے اٹھو ابا جان کو بچا لو۔''

سعدیہ خانم پر وحشت طاری ہو گئی۔ اس نے کامران کو سینے سے لگا کر پیار کرنا شروع کر دیا۔ ''نہیں میرے بیٹے! اب کوئی تمہارے ابا جان کو نہیں مارے گا۔''

کامران نے اپنے مقتول باپ کے بارے میں کوئی بھیانک خواب دیکھا تھا جس سے ڈر کر وہ مسلسل چیخ رہا تھا۔ سعدیہ خانم اسے بہت دیر تک تسلیاں دیتی رہی۔ پھر کامران کا خوف کچھ کم ہوا تو وہ دوبارہ سو گیا...... مگر ایک جوان بیوہ رات بھر جاگتی رہی۔

پھر یہ روزانہ کا معمول ہو گیا کہ شجاع الدین کامران دن کی روشنی میں سہا رہتا اور رات ہوتے ہی اس کی وحشتوں میں اضافہ ہو جاتا۔ جب آنکھ لگتی تو کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ کر چیختا ہوا اٹھ بیٹھتا۔ سعدیہ خانم دیر تک اپنے بیٹے کو سمجھاتی رہتی اور پھر رات کے آخری حصے میں کامران کے ڈرنے اور جاگنے کا یہ عمل ختم ہو جاتا۔ تب کہیں جا کر کچھ دیر کیلئے سعدیہ خانم کی آنکھوں میں نیند کا بسیرا ہوتا۔ وہ بمشکل ایک دو گھنٹے سوتی ہوگی کہ قریب کی مسجد کا مؤذن اسے خبردار کر دیتا۔

''اللہ سب سے بڑا ہے۔'' سعدیہ خانم بھی اپنے اللہ کی کبریائی بیان کرنے کے لئے بستر خاک چھوڑ دیتی اور پھر کچھ دیر بعد سورج نکل آتا۔ زیست بڑی بے آرامی میں بسر ہو رہی تھی۔ شوہر کی موت نے سعدیہ خانم کے شب و روز کو ویران کر دیا تھا۔ وہ گھبرا کر کامران کی طرف پلٹتی تو وہاں ایک وحشت زدہ بچے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اب زندگی ویران تر ہو کر رہ گئی تھی۔

اس دوران وہ بے حال مجذوب دن میں بھی نظر آنے لگا تھا۔ دونوں وقت کہیں سے چند روٹیاں مانگ کر لاتا اور ماں بیٹے کے سامنے رکھ کر کہنے لگتا۔

''میرے بچو! اسے کھا لو۔ میں جانتا ہوں کہ یہ خشک روٹیاں اور بے مزا سالن تمہارے حلق سے نہیں اترتا مگر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ سلطان بہرام شاہ کے دور حکومت میں بے شمار انسان فاقے کی حالت میں سو جاتے ہیں تمہیں اتنا بھی میسر ہے تو بہت ہے۔ میں تمہارے لئے شاہی دسترخوان کی غذائیں بھی لا سکتا ہوں' مگر ان سے تو بندگان خدا کا خون ٹپکتا ہے اس لئے میں اپنے بچوں کو انسانی گوشت کھلانا نہیں چاہتا۔ یہ میری مجبوری ہے اور میں اس مجبوری پر اپنے دونوں بچوں سے معافی کا طلب گار ہوں۔''

مجذوب کی باتیں سن کر سعدیہ خانم رونے لگتی۔ ''بابا! آپ ہماری وجہ سے کب تک اس اذیت میں مبتلا رہیں گے؟ ہماری ضرورتوں نے تو آپ کی آزادیاں بھی چھین لیں۔ کل تک آپ شاہوں سے بھی زیادہ بے نیاز تھے ......لیکن آج ہماری خاطر در در بھٹک رہے ہیں اور کمتر لوگوں کے سامنے دست سوال دراز کر رہے ہیں۔''

''نہیں میری بیٹی! ایسا نہیں ہے۔'' مجذوب جس نے زندگی بھر عقل و ہوش کی باتیں نہیں کی تھیں ایک بیوہ عورت کے سامنے پوری آگہی کے ساتھ بول رہا تھا۔ ''میری بے نیازیاں ختم نہیں ہوئی ہیں۔ وہ ذات بے نیاز جب تک میری غیرت کو برقرار رکھنا چاہے گی میں اسی طرح بے نیاز رہوں گا' جو شخص تیرے اور اس معصوم بچے کیلئے بھیک مانگ کر لا رہا ہے وہ اپنی بھوک کی خاطر بھیک مانگ رہا ہے اور جو بھیک دے رہے ہیں وہ اپنی غرض کے لئے بھیک دے رہے ہیں۔ تجھ پر کسی کا کوئی احسان نہیں ہے۔ سب کے سب اس آگ سے بچنے کی فکر میں ہیں جو ازل سے

بھڑک رہی ہے۔ یہ کیسا سستا سودا ہے کہ دو روٹیوں کے بدلے میں کتنے آدم زادے اس آگ سے نجات پا جائیں گے۔ وہ آگ جس سے بچنے کیلئے حکمرانوں کی حکومتیں' سلطانوں کی سلطنتیں' دینار و درہم کے انبار اور سیم و زر کے ذخیرے بھی کم ہیں۔ بیٹی! تو اداس نہ ہو کہ ہم سب پر تیرا احسان عظیم ہے۔"

مجذوب کی باتیں سعدیہ خانم کو کچھ اور رلا دیتیں۔ پھر وہ خاموش ہو جاتی۔

مگر کب تک؟ ایک باحیا خاتون کا احساس دوبارہ جاگ اٹھتا اور پھر وہ سخت شکایتی لہجے میں مجذوب سے کہنے لگتی۔ "آخر میری غیرت کے بھی تو کچھ تقاضے ہیں؟ میں جوان ہو کر بھی ایک بوڑھے شخص پر بوجھ بنی ہوئی ہوں۔"

مجذوب خلاف عادت مسکرانے لگتا۔ "بے شک! تم بڑی غیرت مند ہو لیکن اس جذبے کے اظہار کو کسی اور وقت کیلئے اٹھا رکھو۔ ابھی تو باپ زندہ ہے۔ پھر جب باپ چلا جائے گا تو محنت و مزدوری کر کے تمام جذبوں کو آسودہ کر لینا۔ میں تجھے کیسے بتاؤں میری بچی کہ تیرے آنے والے دن بہت بھاری ہیں۔ تو بڑی آزمائش میں ہے۔ یہ لوگ تجھے سکون اور عزت سے محنت بھی نہیں کرنے دیں گے۔" مجذوب کی آنکھیں بھیگنے ہی والی تھیں کہ وہ اپنے دل کا درد چھپانے کیلئے تیزی سے نعرہ زنی کرتا ہوا کسی طرف چلا گیا۔

سعدیہ خانم سخت پریشان تھی۔ شوہر کی یادیں اسے مسلسل آزار پہنچاتیں اور وہ اس آزار سے بچنے کیلئے شجاع الدین کامران کے معصوم چہرے کی طرف دیکھنے لگتی کہ اب یہی چہرہ اس کی ذات اور مستقبل کے خوابوں کا آئینہ تھا ...... مگر جیسے ہی اس آئینے پر سعدیہ خانم کی نظر پڑتی وہ آئینہ جگہ جگہ سے شکستہ نظر آنے لگتا۔ سعدیہ خانم نے کامران کو اس مکتب میں دوبارہ بھیجنے کی کوشش کی تھی جہاں رائے نعیم الدین ذیشان نے اپنی زندگی میں بیٹے کو داخل کرایا تھا۔

پھر جب رائے کے قتل کے بعد شجاع الدین کامران اپنی تعلیم کا سلسلہ برقرار رکھنے کے لئے دوبارہ درس گاہ میں پہنچا تو اس پر علم کے دروازے بند کر دیئے گئے۔

ساتھی طالب علموں نے یہ کہہ کر اس کا استقبال کیا۔ "کامران ایک غدار باپ کا بیٹا ہے۔ ہم اس کے ساتھ نہیں پڑھیں گے۔" بچوں کا یہ ایک معصومانہ احتجاج تھا' مگر اس کے پس پردہ بوڑھوں کی خباثت نفس متحرک نظر آ رہی تھی ...... ورنہ اتنی چھوٹی عمر میں بچوں کو کیا معلوم ہوتا کہ غداری کیا ہے اور ایک غدار کے بیٹے کے ساتھ کس طرح سلوک کیا جاتا ہے؟

کامران اپنے ساتھیوں کے اس شور کو برداشت نہ کر سکا اور درس گاہ کے دروازے ہی میں کھڑے رونے لگا۔ استاد کیلئے شاگرد کی یہ حرکت انتہائی ناپسندیدہ تھی۔

"کامران! تم اپنے گھر جاؤ۔ نافرمانوں کے بیٹے تعلیم حاصل نہیں کر سکتے۔ ہم اسی بچے کو علم سکھاتے ہیں جو فرمانبردار ہونے کے ساتھ ساتھ فرمانبرداروں کی اولاد بھی ہو۔"

استاد اپنے شاگرد کی ذہنی سطح سے بلند باتیں کر رہا تھا۔

"جناب! میں نے کیا غلطی کی ہے؟" اپنے لئے مکتب کا دروازہ بند ہوتے دیکھ کر شجاع الدین کامران سسکنے لگا۔

"بس! تم اپنے گھر جاؤ۔" استاد کے پاس شاگرد کے سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

کامران ناکام و نامراد گھر واپس لوٹ گیا۔ سعدیہ خانم نے اپنے بیٹے کے آنسو دیکھ کر ہی سمجھ لیا تھا کہ اس کی موہوم خوشیوں کا ایک اور دروازہ بند ہو گیا ہے۔ سعدیہ خانم کی زندگی اب خون اور آنسوؤں کے درمیان تقسیم ہو کر رہ گئی تھی۔ شوہر کے جسم سے ٹپکتے ہوئے لہو کے قطروں کی یادیں ...... اور بیٹے کی آنکھوں سے بہتے ہوئے اشکوں کی

شام کو مجذوب روٹی لے کر آیا تو سعدیہ خانم عام دنوں سے کچھ زیادہ ہی اداس نظر آ رہی تھی۔ مجذوب کا دھوپ میں جلا ہوا گرد آلود چہرہ دھواں ہو گیا...... جسم کے پسینے اور شاہراہوں کی دھول میں جکڑے ہوئے بال کچھ اور الجھ گئے۔ جب سعدیہ خانم نے اسے آج کا واقعہ سنایا تو وہ دیوانوں کی طرح ہنسنے لگا۔ کچھ دنوں سے مجذوب بہت سنجیدہ ہو گیا تھا لیکن آج اچانک اس کی وہی وحشیانہ ہنسی لوٹ آئی تھی۔

''تیرے بیٹے کو وہ علم سیکھنا بھی نہیں چاہئے جو شاہوں کے خوف سے دماغوں میں سہم گیا ہو اور حرص و ہوس کے ہاتھوں نے جس کا گلا گھونٹ دیا ہو۔''

❊❊❊

کچھ دن بعد لوگوں نے دیکھا کہ وہ مجذوب سعدیہ خانم کے گھر کی چار دیواری بنانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ یہ چار دیواری بڑی بے ترتیب تھی' مگر جاننے والے جانتے تھے کہ مجذوب کوئی معمار نہیں تھا۔ وہ ایک بیوہ عورت اور ایک معصوم بچے کی مدد سے منتشر پتھروں کو جوڑ رہا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے ایک ٹیڑھا ترچھا سا کمرہ تیار کر دیا تھا۔ جس کی چھت پر لکڑیاں ڈال دی گئی تھیں۔ دھوپ اور سردی سے امان مل گئی تھی' مگر پانی کے تیوروں کا اندازہ نہیں تھا کہ ابھی برسات بہت دور تھی۔

سعدیہ خانم نے اس دوران کئی بار مجذوب سے شکایت کی تھی کہ وہ اس کی خاطر اپنے ناتواں جسم کو مسلسل آزار پہنچا رہا ہے۔ مجذوب نے بھی بے نیازانہ انداز میں اپنی منہ بولی بیٹی کو جواب دے دیا تھا۔

''زندگی تو نام ہی آزارِ مسلسل کا ہے......اور جو لوگ اسے آزار نہیں سمجھتے ان کے لئے ایک بڑا اور دائمی عذاب قبر میں پرورش پا رہا ہے۔ عنقریب وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔''

❊❊❊

روز و شب کا قافلہ تیزی سے گزرتا رہا۔ یہاں تک کہ سعدیہ خانم کی عدت کا زمانہ بھی ختم ہو گیا۔ شدید ضرورت کے تحت تو وہ عدت کے ایام میں بھی گھر سے نکل سکتی تھی۔ اب اسے زیادہ آزادی حاصل تھی اور وہ اپنی اس آزادی کو معاشی وسائل کے حصول کیلئے استعمال کرنا چاہتی تھی۔

اسی دن جب رات کو مجذوب روٹی لے کر آیا تو سعدیہ خانم بری طرح مچل گئی۔ ''اب میں آپ کو بھیک کی یہ ذلت برداشت نہیں کرنے دوں گی۔ کل سے آپ گھر میں بیٹھ کر آرام کریں گے اور میں خود محنت و مزدوری کے لئے باہر نکلوں گی۔''

مجذوب نے سعدیہ خانم کو محبت آمیز نظروں سے دیکھا۔ ''بیٹی! اپنا گھر تو قبر ہے آج تک کرائے کی جگہ پر بسر ہوتی رہی ہے......اور اس جان بیقرار کو آرام تو اسی وقت ملے گا جب دینے والے کی رضا شامل ہو گی۔ میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا کہ میں نے تجھے اور تیرے بیٹے کو بھیک کے ٹکڑوں پر نہیں پالا ہے۔ اگر کسی سے دو روٹیاں مانگی ہیں تو اسے دس روٹیاں واپس بھی کی ہیں۔ یہ ایک بیٹی کا اپنے باپ پر حق تھا۔ میں شرمندہ ہوں کہ تیرا حق ادا نہ کر سکا۔ خبر نہیں کہ کس لمحے موت کا قزاق زندگی کے کارواں کو لوٹ لے اس لئے آج ہی مجھے معاف کر دے۔ کل کون جانے کہ چند الفاظ ادا کرنے کیلئے اپنے ہونٹوں کو جنبش بھی دے سکوں یا نہیں؟'' سعدیہ خانم نے اس عرصے میں پہلی بار مجذوب کو اس قدر دل گرفتہ دیکھا تھا اور آواز کی رقت لرزش کو محسوس کیا تھا۔

''بابا! تم مجھے کب تک رلاتے رہو گے؟'' سعدیہ خانم کی آنکھوں کے دریا میں ایک بار پھر طغیانی آ گئی تھی۔

''آنکھیں تو رونے ہی کیلئے ہیں۔ اپنے غم میں چھلکیں یا دوسرے کی تکلیف پر برسیں۔ یہ بارش ہوتی رہے تو

اچھا ہے ورنہ دل کی دنیا میں قحط پڑ جاتا ہے۔" آج مجذوب کے لہجے میں وہی تپش لوٹ آئی تھی جس کے سبب وہ ساری دہلی میں مشہور تھا...... "آج میں بھی تمہارے ساتھ کھانے میں شرکت کروں گا۔"

یہ بڑی عجیب بات تھی۔ سعدیہ خانم کے ساتھ کامران بھی چونک اٹھا۔

"آج بھوک برداشت نہیں ہو رہی ہے۔ میں تو تم لوگوں سے چھپا کر سرِ شام ہی کچھ کھا لیتا ہوں۔" یہ کہہ کر مجذوب اٹھا' ہاتھ دھوئے اور پھر اسی جگہ آ کر بیٹھ گیا...... "بسم اللہ کرو کہ انسان بڑا ناشکرا ہے۔"

اس کے ساتھ ہی بوسیدہ دسترخوان کی طرف تین ہاتھ بڑھے۔ مجذوب نے چند لقمے لے کر اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

سعدیہ خانم سوالیہ نظروں سے مجذوب کی جانب دیکھنے لگی۔

"میری بھوک بس اتنی ہی ہے...... کیا غذا اور کیا شکم کے تقاضے؟ تمہاری محبتوں میں شریک ہونا تھا سو ہو گیا۔"

پھر جب ایک بیوہ عورت اور ایک یتیم بچہ کھانا کھا چکے تو مجذوب سعدیہ خانم سے مخاطب ہوا۔

"انسانی فطرت ہے کہ وہ کھو جانے والی چیزوں کو یاد کر کے روتا ہے۔ تم کچھ دن پہلے اپنی عزیز ترین شے کھو چکی ہو۔ اگر کل کچھ اور کھو جائے تو اس قدر غم نہ کرنا کہ منکرین کی صف میں کھڑی نظر آؤ۔"

"بابا! آج آپ یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟" سعدیہ خانم ایک بار پھر چونک اٹھی تھی۔

"پاگلوں کے ساز کی کوئی لے نہیں ہوتی ہے۔ وہ جس طرح چاہتے ہیں راگ چھیڑ دیتے ہیں۔" یکایک مجذوب کا قہقہہ گونجا۔ پھر یہ قہقہہ دم بہ دم تیز ہوتا چلا گیا۔ سعدیہ خانم اور کامران اپنے اجنبی سرپرست کو حیرت سے دیکھنے لگے۔ پھر جب ان کی حیرت خوف میں تبدیل ہونے لگی تو مجذوب کا قہقہہ بند ہو گیا۔ "تم لوگوں نے کئی ماہ سے میری ہنسی کو اسیر کر رکھا تھا آج ہنسنا چاہتا ہوں تو ہنسنے نہیں دیتے۔"

"بابا! میں بہت شرمسار ہوں۔" سعدیہ خانم کو شاید اپنی گستاخی کا احساس ہو گیا تھا۔

"نہیں! نہیں! تجھے ندامت کیوں ہو؟ تو نے کیا کیا ہے؟ میں ہی دیوانہ ہو گیا ہوں۔" اچانک مجذوب بہت زیادہ اداس نظر آنے لگا تھا۔ "کیا کروں' زبان رکتی ہی نہیں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں کہا نہیں جاتا اور جو کچھ دیکھ رہا ہوں' دیکھا نہیں جاتا۔" شدتِ کرب میں مجذوب نے دونوں ہاتھوں سے اپنے بالوں کو جکڑ لیا تھا۔

سعدیہ خانم اور کامران گھبرا کر کھڑے ہو گئے۔ ان کے خیال میں مجذوب کسی اندرونی تکلیف سے دوچار تھا۔

"بابا! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔" اب کی بار شجاع الدین کامران سہمی ہوئی آواز میں بولا تھا۔

"بیٹھ جاؤ! میرے بچو! میں بالکل ٹھیک ہوں۔" مجذوب فوراً ہی سنبھل گیا تھا۔ "کبھی کبھی ہوش کا دورہ پڑتا ہے۔ آج اسی دورے کے زیرِ اثر ہوں۔ مگر تم پریشان نہ ہو۔ وقت کی لہر ہے' ڈوب جائے گی۔" یہ کہہ کر مجذوب خاموش ہو گیا اور زمین پر اپنی انگلی سے بے ترتیب لکیریں کھینچنے لگا۔

رائے نعیم الدین ذیشان کے کھنڈر کی نوتعمیر کمرے کی فضا ساکت تھی۔ پھر اس سکوت کو مجذوب کی تیز آواز نے توڑ دیا۔ "اس دنیا نے تجھے کفر کی طرف لوٹانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔" یہ کہتے کہتے مجذوب کھڑا ہو گیا۔ وہ سعدیہ خانم سے مخاطب تھا۔ "ابھی یہ دنیا تجھ پر اور بھی ستم توڑے گی مگر تو اسی طرح ثابت قدم رہنا۔ میں نے بھی اپنے پیدا کرنے والے سے تیرے ایمان کی سلامتی مانگی ہے۔ تیری آبرو کے تحفظ کے لئے دستِ طلب دراز کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میرا خدا اس دعا کو درِ قبولیت سے ناکام نہیں لوٹائے گا۔ ایک دن تیرے شوہر کے قاتل بھی اپنے خون میں نہا جائیں گے مگر اس سے تیرے سہاگ کی سرخی تو واپس نہیں آئے گی۔ پھر اگر ساری زمین بھی لہو سے رنگین ہو جائے تو تجھ کیا؟ بھول جا' سب کچھ بھول ... نے سعدیہ خانم کے سر پر ہاتھ

رکھ دیا اور شجاع الدین کامران کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

مجذوب کا یہ عمل بھی خلافِ معمول تھا۔ سعدیہ خانم کو ایک بار پھر چونک جانا پڑا۔ ''بابا! آپ کہیں جا رہے ہیں؟ کیا اب واپس نہیں آئیں گے؟'' سعدیہ خانم نے رقت آمیز لہجے میں پوچھا۔

''ہاں! ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔'' مجذوب نے کامران کو اپنی آغوش سے جدا کیا اور سعدیہ خانم کے سر سے ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا۔ ''شاہ نے بلایا ہے کم سے کم یہ فقیر حاضر ہو کر تو دیکھے کہ اس کا دربار کیسا ہے؟'' مجذوب نے کہا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ ماں اور بیٹا دونوں غم انگیز سکوت کے عالم میں دیکھتے رہ گئے۔

''مام! کیا فقیر بابا بھی چلے گئے؟'' مجذوب کے جاتے ہی کامران نے سعدیہ خانم سے سوال کیا۔

''ادب سے نام لو۔ وہ فقیر نہیں ہیں۔ صرف بابا کہہ کر پکارو۔'' سعدیہ خانم نے تلخ لہجے میں بیٹے کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

''انہوں نے تو خو کہا ہے کہ وہ بھیک مانگ کر ہمارے لئے روٹی لاتے ہیں۔'' کچھ نہ سمجھنے کے باوجود بھی کامران اپنی بات کے جواب میں ایک معقول دلیل پیش کر رہا تھا۔

''ٹھیک ہے! تم اب جا کر سو جاؤ۔'' سعدیہ خانم نے بیٹے کے مزید سوالات سے بچنے کے لئے کہا۔ وہ اسے کیا سمجھاتی کہ بابا نے کس کے لئے بھیک مانگی ہے؟

ہلکی سی لرزش کے بعد کامران تو خاک کے بستر پر لیٹ کر سو گیا۔ مگر سعدیہ خانم مسلسل جاگ رہی تھی۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اور ذہن پر دحشت سی طاری تھی۔ مجذوب نے آج لہجہ بدل کر بڑی بے ربط باتیں کی تھیں لیکن کہیں کہیں یہ بے جوڑ الفاظ اپنا مفہوم ظاہر کر رہے تھے۔ ایسا مفہوم جس کے پیچھے حادثات کی تیز چاپ سنائی دیتی تھی۔

''خدا خیر کرے۔'' یہ کلمات کئی بار اس کی زبان سے ادا ہوئے' مگر وحشت و اضطراب میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔

سعدیہ خانم کا خیال تھا کہ گزشتہ کئی ماہ کی طرح بابا آج بھی شب کے ابتدائی حصے میں لوٹ آئیں گے اور پھر کسی پہرے دار کی طرح رات بھر نعرہ زنی کرتے رہیں گے۔ تنہا عورت ہونے کے سبب بابا کی یہ موجودگی بڑی غنیمت تھی۔ ان کی وجہ سے وہ کچھ دیر چین کی نیند سو لیتی تھی۔ ورنہ رات بھر یہی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کہیں تاریکی میں کوئی سرکاری ہرکارہ آ جائے اور اس کی عزت و آبرو کے لالے پڑ جائیں۔ اگرچہ بابا ایک کمزور مرد تھے لیکن بہرحال محبت کرنے والے مرد تھے۔ ان کے ہوتے ہوئے ڈھارس سی بندھی رہتی تھی۔ مگر آج یہ محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ناکام سہارا بھی چھن جانے والا ہے۔

سعدیہ خانم بہت دیر تک نماز پڑھ کر دعائیں کرتی رہی اور پھر بستر پر دراز ہو کر بابا کا انتظار کرنے لگی۔ بابا سرِ شام نکل جانے کے بعد دوبارہ اندر داخل نہیں ہوتے تھے۔ بس قرب و جوار میں ان کے فلک شگاف نعرے گونجتے رہتے تھے۔ یہاں تک کہ فجر کی اذان ہو جاتی تھی اور انسانی سروں پر مسلط رہنے والا رات کے اندھیروں کا خوف ٹل جاتا تھا۔

پھر حسبِ معمول نصف شب کے قریب مجذوب کی آواز گونجی۔

''اے راندۂ درگاہ! کتے بھی تجھ سے زیادہ وفادار اور معتبر ہیں۔ تو ان کی قطار میں شامل ہو کر دیکھ وہ بھی تجھے قبول نہیں کریں گے۔'' آج مجذوب کا نعرہ بڑا عجیب تھا۔ سعدیہ خانم اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"تم نے اپنے دروازے بند کر لئے اور ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ سردی سے ٹھٹھر کر مر گیا۔ مجبوریوں کے خون سے زمین کو سینچا اور اقتدار کی فصل اگا کر بدمست ہو گئے ...... پیچھے مڑ کر کیوں نہیں دیکھتے کہ ایک اور لشکر بھی تمہارے تعاقب میں ہے ...... مگر تم نہیں دیکھ سکتے کہ تمہاری آنکھوں کی روشنی لٹ چکی ہے ...... گناہوں کی دلدل ...... موت کی خندقیں ...... اور سڑی ہوئی لاشیں ...... تمہارا انجام لکھا جا چکا۔ اب اس تحریر کو کاٹنے والا کون ہے؟ کوئی نہیں ...... کوئی نہیں ...... کوئی نہیں۔"

مجذوب کا شرربار لہجہ مدھم ہوتا جا رہا تھا اور پھر آہستہ آہستہ وہ غضب ناک آواز فضا کی وسعتوں میں گم ہو گئی۔

جب تک مجذوب کی نعرہ زنی جاری رہی' سعدیہ خانم چین سے نہ بیٹھ سکی۔ پھر وہ آواز یکسر غائب ہو گئی تو سعدیہ خانم کو قدرے سکون میسر ہوا کہ مجذوب کا علاقہ بہت طویل تھا اور اب وہ اپنے علاقے کے کسی دوسرے حصے میں نعرہ زن ہو گا۔

❋❋❋

صبح ہوئی تو سعدیہ خانم کو اپنے دروازے پر ایک اور انقلاب کی آہٹ محسوس ہونے لگی۔ وقت گزرتا جا رہا تھا لیکن مجذوب بابا کا دور دور بھی پتا نہیں تھا پھر انتظار کرتے کرتے شام ہو گئی لیکن مجذوب نہیں آیا۔ کہنے کو وہ کسی کا پابند نہیں تھا' مگر جب سے سعدیہ خانم کے ساتھ یہ حادثہ پیش آیا تھا' اس نے خود بخود اپنی ذات پر یہ پابندی عائد کر لی تھی۔ ایک بیوہ اور ایک یتیم بچے کے لئے دو وقت کھانا فراہم کرنا اور پھر کھنڈر سے کچھ اینٹیں چن کر ماں بیٹے کے لئے ایک کمرہ بنا دینا یہ ساری ذمے داریاں مجذوب نے اپنے آپ قبول کی تھیں۔ اسے ان کاموں پر اکسانے والا کوئی دوسرا نہیں تھا اور ہو بھی کون سکتا تھا کہ جس نے شاہوں کی بات نہ مانی ہو' وہ ایک بیوہ عورت سے کیا مرعوب ہوتا؟ یہ تو اس کے اندر کا انسان تھا جو ایک بے سہارا عورت اور ایک لاوارث بچے کے غموں کو تقسیم کرنے آ گیا تھا۔

سعدیہ خانم سوچ رہی تھی کہ شاید بابا کا کام ختم ہو گیا۔ اس لئے وہ کہیں اور چلے گئے۔ پھر بھی یہ سب قیاس آرائیاں تھیں۔ سعدیہ خانم کو ابھی مجذوب بابا کا انتظار کرنا تھا۔ آدھی رات تک ...... اور پھر آدھی رات گزر جانے کے بعد تک ......

پورا دن فاقے سے گزرا تھا کہ کل تک روٹی کی فراہمی بابا کے ذمے تھی۔ اگر سعدیہ خانم بابا کا انتظار نہ کرتی تو پھر یہ ممکن تھا کہ وہ پہلی بار گھر کی چار دیواری سے نکل کر ذاتی محنت و مشقت سے چند روٹیاں حاصل کرتی اور بیٹے کے ساتھ اپنی بھوک کا بھی انتظام کرتی ...... مگر ایسا نہ ہو سکا۔ بابا کا انتظار لازم تھا اور اس انتظار پر پیٹ کی قربانی دی جا سکتی تھی۔

شام گزری تو رات کا آغاز ہو گیا۔ ابھی مجذوب بابا کے آنے کا وقت تھا۔ اس لئے ماں بیٹے کی آنکھوں میں جلنے والی شمع بھی اب تک نہیں بجھی تھی۔ اس کی روشنی میں وہی توانائی تھی جو کسی آنے والے کا پتا دیتی رہتی ہے۔ پھر انتظار کا یہ مرحلہ نصف شب کے سناٹے تک پہنچ گیا۔ اس دوران انتظار کی طویل مسافت سے تھک کر کامران بھوکا ہی سو گیا تھا ...... مگر سعدیہ خانم جاگ رہی تھی کہ مجذوب کے طلوع ہونے کا صحیح وقت نصف شب کے بعد ہی شروع ہوتا تھا۔

پھر نصف شب بھی گزر گئی لیکن مجذوب بابا کا نہ کوئی عکس ابھرا اور نہ ان کے قدموں کی کوئی چاپ سنائی دی۔ وہ بڑا عجیب شخص تھا۔ اس کی آمد تو بہت پر شور ہوتی تھی۔ وہ اگر بیس گلیاں پہلے قدم رکھتا تو آخری گلی کے لوگوں کو بھی معلوم ہو جاتا کہ آنے والا آ گیا ہے۔

اب سعدیہ خانم کو یقین ہو چلا تھا کہ بابا اس سے خفا ہو کر یہ علاقہ ہی چھوڑ گئے ہیں۔ جب ذہن میں ایک وسوسہ پیدا ہوا تو پھر بہت سے اندیشے سر ابھارنے لگے۔ سعدیہ خانم کو گزشتہ شب کی کئی باتیں یاد آنے لگیں۔ بابا کے ایک ایک لفظ سے ظاہر ہو رہا تھا جیسے وہ عنقریب بچھڑ جانے والے ہیں۔ بچھڑنے والے ہی ایسی باتیں کرتے ہیں جن پر نصیحت اور وصیت کا گمان ہوتا ہے۔ کل رات مجذوب بابا بھی اسی قسم کی گفتگو کر رہے تھے۔ سعدیہ خانم اس سے زیادہ نہ سوچ سکی' یکایک اس کے جسم پر لرزہ سا طاری ہو گیا اور ایک بار پھر خوف و دہشت کی یلغار نے اس کے دل و دماغ کو وحشت اثر بنا دیا۔

وہ رات بھر خدا سے دعائیں کرتی رہی کہ اس کے بابا تمام آفات و حادثات سے محفوظ رہیں اور اگر وہ روٹھ کر گئے ہیں تو ایک بار ان کے قدموں کو اس طرف موڑ دے کہ وہ ان سے اپنی غلطیوں کی معافی مانگ سکے لیکن سعدیہ خانم کی ساری دعائیں رائیگاں گئیں۔ مجذوب بابا کو نہ آنا تھا اور نہ وہ آئے۔ یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔

معصوم کامران کا بھوک کے مارے برا حال تھا۔ بچپن حالات کے تقاضوں کو نہیں سمجھتا۔ وہ بس اپنی خواہشات کی تکمیل چاہتا ہے۔ جب روٹی نہیں ملی تو ماں پر بگڑنے لگا۔ پھر مجذوب کی ذات بھی اس کی جھنجھلاہٹ کا نشانہ بن گئی۔

"کل سے غائب ہیں۔ انہیں پتا ہی نہیں کہ ہم نے دو وقت سے روٹی نہیں کھائی ہے۔ اگر آج میرے باپ زندہ ہوتے تو میں اس طرح بھوکا نہ رہتا۔" ذرا سی ٹھیس لگتے ہی ماضی کے زخم خون دینے لگے تھے۔

"خاموش ہو جاؤ کامران!" سعدیہ خانم نے بیٹے کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "تمہیں اپنی روٹی کی فکر ہے اور بابا کا خیال نہیں کہ ان پر کیا گزر رہی ہے؟ وہ بیمار بھی تو ہو سکتے ہیں۔"

"اگر بیمار ہیں تو یہاں کیوں نہیں آ جاتے؟ میں انہیں دوا پلاؤں گا۔" ماں نے بابا کی غیر حاضری کا جواز پیش کیا تو کامران اپنے شکم کی آگ کو بھول گیا اور مجذوب کا انتظار کرنے لگا' لیکن جانے والے جانے ہی کے لئے ہوتے ہیں اگر انہیں آنا ہوتا تو پھر جاتے ہی نہیں۔

چاروں طرف دن کا اجالا پھیل گیا' مگر مجذوب کی کوئی خبر نہیں ملی۔ اب سعدیہ خانم کی قوت برداشت جواب دے چکی تھی۔ اس نے برقع کے انداز میں چادر سر پر ڈالی۔ کامران خاموشی سے ماں کے طرز عمل کو دیکھ رہا تھا۔ جب سعدیہ خانم باہر جانے کے لئے تیار ہو گئی تو اس نے بیٹے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"کامران! میرے ساتھ چلو۔ یقیناً کوئی خاص بات ہے جو بابا اب تک نہیں آئے۔"

"آپ کہاں جائیں گی؟" کامران نے حیرت سے سوال کیا۔ "آپ کو بابا کا مکان معلوم ہے؟"

"نہیں ......" سعدیہ خانم نے جواباً کہا۔ "میں بے خبر سہی مگر دوسرے محلے والوں سے تو پوچھا جا سکتا ہے۔ بے شمار لوگ ان سے واقف ہیں۔ کوئی نہ کوئی ضرور پتا بتا دے گا۔"

ابھی سعدیہ خانم نے گھر سے باہر قدم نہیں نکالا تھا کہ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔

سعدیہ خانم نے کامران کو اشارہ کیا کہ وہ باہر جا کر دیکھے اور آنے والے کے بارے میں دریافت کرے کہ وہ کون ہے اور کیا چاہتا ہے؟

کامران باہر نکلا تو اس نے ایک طویل قامت شخص کو اپنے دروازے کے سامنے کھڑے دیکھا۔

"آپ کون ہیں اور کس سے ملنا چاہتے ہیں؟" کامران نے آنے والے سے اس طرح دریافت کیا کہ اس کے لہجے سے شائستگی ظاہر ہو رہی تھی۔

''بیٹے! تم مجھے نہیں جانتے۔'' اجنبی شخص نے بڑی محبت سے کہا۔ اس دوران سعدیہ خانم بھی دروازے کے پیچھے آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ ''کیا رائے نعیم الدین ذیشان کا یہی مکان ہے اور کیا تم ہی ان کے بیٹے شجاع الدین کامران ہو؟''

اجنبی شخص نے اس طرح گفتگو کا آغاز کیا جیسے وہ گھر کے تمام افراد سے بخوبی واقف ہو۔

سعدیہ خانم اس شخص کی گفتگو سن کر چونک اٹھی تھی اور اس کا تیزی سے گردش کرتا ہوا ذہن کسی نئے حادثے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ کامران اجنبی کے سوالات کا جواب دیتا' سعدیہ خانم خود ہی پردے کے پیچھے سے بول پڑی۔

''ہاں! یہی رائے مرحوم کا مکان ہے اور آپ جس بچے سے گفتگو کر رہے ہیں' یہ ان ہی کا بیٹا ہے۔'' سعدیہ خانم نے انتہائی خشک لہجے میں کہا۔ یہ وہی لہجہ تھا جس کے متعلق اسلام نے واضح حکم دیا ہے کہ مسلم خواتین نامحرم مردوں سے کلام کرتے وقت اپنے لہجے کو سخت کر لیا کریں تاکہ ان کے سینوں میں چھپا ہوا شیطان بیدار نہ ہو سکے۔

اجنبی شخص چند لمحوں تک خاموش رہا۔ پھر اس نے آہستہ سے پوچھا۔ ''معاف کیجئے کیا آپ ہی سعدیہ خانم ہیں؟''

''جی ہاں! مگر آپ اپنے ان سوالات کا مقصد تو بتائیے۔'' سعدیہ خانم کے لہجے میں کچھ اور سختی آ گئی تھی۔

''معذرت خواہ ہوں بہن کہ یہ سوالات بہت ضروری تھے۔'' اجنبی کے الفاظ سے شدید ندامت کا اظہار ہو رہا تھا۔ ''معاملہ ہی کچھ ایسا ہے کہ جب تک میں پوری تسلی نہ کر لوں اس وقت تک یہ امانت منتقل نہیں کر سکتا۔ آپ تو جانتی ہیں کہ ایک امانت کا بار گراں کیا ہوتا ہے اور امین کی ذمہ داریاں کیا ہوتی ہیں؟ یہی وجہ ہے کہ مجھے ایک ایک بات تفصیل سے معلوم کرنی پڑ رہی ہے۔ اگر میرے اس عمل سے آپ کو تکلیف پہنچی ہے تو مجھے معاف کر دیں۔''

''آپ کی باتیں اب بھی الجھی ہوئی ہیں۔'' سعدیہ خانم نے کہا۔ ''میں اب تک نہیں جان سکی کہ وہ امانت کیا ہے اور اس کا مجھ سے کیا تعلق ہے؟''

''آپ مجذوب بابا سے تو واقف ہوں گی؟'' اجنبی نے نیا سوال کیا۔

بابا کا نام سن کر ایک لمحے کے لئے سعدیہ خانم لرز گئی اور اس کا ذہن اندیشوں سے بھر گیا۔ پھر بمشکل اپنے اضطراب پر قابو پاتے ہوئے سعدیہ خانم نے کہا۔ ''اگر ایک بیٹی اپنے باپ سے واقف نہیں ہو گی تو پھر کون ہو گا؟ بابا کہاں ہیں اور کیسے ہیں؟'' سعدیہ خانم انتہائی کوشش کے باوجود اپنی پریشانی کو ایک اجنبی شخص سے پوشیدہ نہ رکھ سکی۔

سعدیہ خانم اجنبی کے جواب کی منتظر تھی مگر وہاں ایک گہرا سکوت طاری تھا۔

''آپ بتاتے کیوں نہیں کہ بابا کس حال میں ہیں؟'' سعدیہ خانم کے لہجے کی سختی میں اب کسی قدر غصہ بھی شامل ہو گیا تھا۔

''اب وہ اس دنیا میں نہیں رہے۔'' سعدیہ خانم نے محسوس کر لیا تھا کہ اجنبی کی آواز کانپ رہی ہے۔

''کیا...... بابا...... آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو؟''

سعدیہ خانم بدحواس ہو گئی تھی اور اسے اپنی سماعت پر شک ہونے لگا تھا۔

''جس طرح یہ خبر آپ کو رلا گئی ہے اسی طرح میری آنکھوں کو بھی اشکبار کر سکتی ہے۔'' اب اجنبی کے لہجے کی رقت صاف نمایاں ہو گئی تھی۔ ''اگر وہ آپ کے لئے بابا کی حیثیت رکھتے تھے تو میں بھی انہیں باپ کا درجہ دیتا تھا۔ اس واردات غم کا مختصر بیان یہ ہے کہ ہم دونوں یتیم ہو گئے۔''

"یہ کب ہوا اور کیسے ہوا؟" سعدیہ خانم نے اپنے آپ کو سنبھالنے کے لئے دیوار کا سہارا لیا۔ "اندر آ جاؤ پھر مجھے تفصیل سے بتاؤ کہ میرے بابا پر کیا گزری؟ آؤ! اندر آ جاؤ! بابا کے رشتے سے تم بھی میرے بھائی ہو۔"

سوگوار اجنبی جھجکتے قدموں سے کمرے کے اندر آ گیا۔ سعدیہ خانم ایک گوشے میں کھڑی ہو گئی۔ "بیٹھ جاؤ کہ یہ فرش خاک ہی ہمارا بستر ہے۔"

"مجھے بابا سب کچھ بتا چکے ہیں۔" اجنبی نے کھڑے کھڑے کہا۔ "میں کسی حد تک آپ کے غموں سے واقف ہوں لیکن زیادہ دیر ٹھہر نہیں سکتا۔ بس ایک امانت ہے جسے آپ تک پہنچانے آیا ہوں۔" یہ کہہ کر اجنبی نے اپنے پیرہن کی جیب سے ایک لپٹا ہوا کپڑا نکالا اور کامران کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "بیٹے! یہ اپنی والدہ کو دے دو۔"

جیسے ہی کامران نے اجنبی سے وہ کپڑا لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا' سعدیہ خانم درمیان ہی میں بول اٹھی۔ "اس میں کیا ہے؟"

"کچھ اشرفیاں ہیں۔ جن کے متعلق بابا کا حکم ہے کہ انہیں آپ اپنے استعمال میں لائیں۔" اجنبی نے مختصر سی وضاحت کی اور خاموش ہو گیا۔

✻✻✻

''آپ کو بابا کی ظاہری حالت اور ان اشرفیوں کی موجودگی پر حیرت ہو رہی ہوگی؟'' اجنبی شخص نے سعدیہ خانم کے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا جو ابھی زبان تک نہیں آیا' لیکن آنکھوں سے عیاں تھا۔

''ہاں! مجھے حیرت ہو رہی ہے۔'' سعدیہ خانم نے انتہائی غم زدہ لہجے میں کہا۔

''یہ راز میرے سوا شاید ہی کوئی دوسرا شخص جانتا ہوگا کہ بابا کا تعلق تبریز (ایران) کے شاہی خاندان سے تھا۔ وہ عین عالم جوانی میں تمام عیش ونشاط کو ٹھکرا کر دہلی چلے گئے تھے۔ پھر بھی بابا کے عزیز انہیں کسی نہ کسی شخص کے ہاتھ نقد رقم بھیجتے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ دہلی کے امراء بھی بابا کو قیمتی نذرانے پیش کرتے تھے۔ سارا شہر جانتا ہے کہ بابا ایک مستجاب الدعوات بزرگ تھے۔ ان کی دعاؤں سے یہاں کے بے شمار لوگ فیض یاب ہوئے ہیں مگر بابا نے ایک تنکہ (سکہ) بھی اپنے پاس نہیں رہنے دیا جو آیا بے دریغ لٹا دیا...... لیکن جب سے انہیں آپ کی پریشانیوں کا علم ہوا تھا' وہ دولت کو لٹانے میں بہت محتاط ہو گئے تھے۔ میں ان کے حقیر ترین خادموں میں سے تھا۔ کل تک مجھے ایک ایک دانے کی محتاجی تھی۔ یہ بابا ہی کی دعاؤں کا صدقہ ہے کہ آج بہت آسودگی کی زندگی بسر کر رہا ہوں۔ بابا جو روٹیاں آپ کیلئے لاتے تھے انہیں ایک غریب عورت پکاتی تھی آج وہ عورت بھی خوشحال لوگوں کی قطار میں شامل ہو گئی ہے۔''

ابھی اجنبی شخص کی بات مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ جذبات سے بے قابو ہو کر سعدیہ خانم درمیان ہی میں بول اٹھی۔ ''مگر بابا تو کہتے تھے کہ وہ اس کیلئے بھیک مانگ کر روٹی حاصل کرتے تھے۔'' سعدیہ خانم کہنے کو تو کہہ گئی' مگر اسے فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ ''نہیں بھائی! ایسا نہیں ہے۔ میری زبان لڑکھڑا گئی۔ بابا نے پہلے ہی کہا تھا مگر جب میں نے انہیں ٹوکا کہ وہ دوسروں کیلئے یہ ذلت کیوں برداشت کرتے ہیں تو جواب میں بابا نے وضاحت کی تھی کہ اگر وہ کسی سے دو روٹیاں مانگتے ہیں تو اسے دس روٹیاں واپس بھی کر دیتے ہیں۔''

اجنبی مسکرایا' لیکن یہ مسکراہٹ اذیت ناک غم کی تہوں میں لپٹی ہوئی تھی۔ ''وہ اپنے نفس کی سرکشی کو کچلنے کیلئے ایسی ہی باتیں کرتے تھے۔ بھلا بابا کسی سے کیا بھیک مانگتے؟ دہلی کے وزیر و امیر تو خود ان کے در کے بھکاری تھے۔''

یہ کہہ کر وہ اجنبی شخص چند لمحوں کیلئے خاموش ہو گیا۔ پھر کہنے لگا۔ ''مجھے یہاں زیادہ دیر ٹھہرنے کی اجازت نہیں ہے۔ یہی بابا کا حکم تھا کہ امانت دے کر فوراً واپس لوٹ جاؤں۔''

''مگر مجھے اتنا تو بتا دو کہ بابا کا انتقال کس طرح ہوا اور ان کی قبر کہاں ہے؟ کم سے کم میں بدنصیب عورت اپنے باپ کی آخری آرام گاہ تو دیکھ لوں گی۔ دنیا میں تو کوئی سننے والا نہیں ہے جب وحشتیں زیادہ تنگ کریں گی تو مٹی کے ڈھیر کے سامنے فریاد کر لیا کروں گی۔'' سعدیہ خانم کے چہرے پر رنج والم کے گہرے سائے پھیل گئے تھے اور آنکھیں مسلسل اشک برسانے لگی تھیں۔

''ان کی قبر کا کوئی نشان نہیں ہے۔'' اجنبی بہت دیر سے اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا' مگر جب

سعدیہ خانم کو روتے دیکھا تو خود بھی بے اختیار ہو گیا۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور آواز لرزنے لگی۔ "میں نے اس قربت کے دوران بابا کو ایک ہی دعا مانگتے دیکھا۔ وہ اکثر رات کی تنہائی میں جمنا کے کنارے شدید کرب ناک لہجے میں کہا کرتے تھے۔

"اے بے نیاز مطلق! اپنی اس صفت جلیلہ کے صدقے میں مجھے بھی دنیا والوں سے بے نیاز کر دے..... تو اس پر قادر ہے کہ انسان کو زندگی میں رسوا کرے یا مرنے کے بعد..... یا دونوں حالتوں میں ذلیل کرے یا پھر دونوں صورتوں میں اسے رسوائی سے بچا لے..... یہ بڑی عجیب دعا تھی میں اس دعا کا ایک مفہوم تو سمجھتا تھا کہ وہ اپنی زندگی میں کسی آدم زاد کے احسان مند نہیں ہونا چاہتے تھے ......اور ایسا ہی ہوا ......مگر مرنے کے بعد کی رسوائی سے محفوظ رہنے کا کیا مفہوم تھا یہ راز بابا کی موت کے بعد ہی کھل سکا۔ کل رات انہوں نے مجھے اپنی بارگاہ میں طلب کر کے اشرفیاں میرے حوالے کی تھیں۔ آپ کا نام و نشان بتا کر وصیت کی تھی کہ میں یہ امانت آپ تک پہنچا دوں پھر مجھے رخصت کرتے ہوئے کہا تھا۔

"کل ہم اس دنیا سے بہت دور چلے جائیں گے اگر ہم سے تمہاری کوئی حق تلفی یا دل آزاری ہو گئی ہو تو اسے معاف کر دینا۔"

پھر جب میں دریائے جمنا کے اس مخصوص گھاٹ پر پہنچا جہاں بابا روزانہ غسل کر کے فجر کی نماز پڑھتے تھے تو لوگوں کا ایک اژدھام دیکھا' یہ سب آس پاس کے علاقے میں رہنے والے لوگ تھے جو بابا سے بے حد عقیدت رکھتے تھے۔ میں نے قریب جا کر دیکھا تو سب لوگ زار و قطار رو رہے تھے۔ پھر جب ایک شخص سے گریہ وزاری کا سبب معلوم کیا تو اس نے بتایا کہ بابا دنیا سے رخصت ہو گئے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ جنازہ کہاں ہے تو بتانے والے نے بتایا کہ بابا کے جسم کو پانی کی ایک تیز موج بہا کر لے گئی۔ بابا حسب معمول دریا میں غسل کر رہے تھے کہ پانی کی ایک سرکش لہر قریب ہی سے اٹھی اور بابا کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے چلی گئی۔ لوگوں نے یہ بھی بتایا کہ سارا دریا پرسکون تھا اور دور دور بھی نہانے والے نہا رہے تھے مگر کہیں کوئی موج نہیں اٹھی' کسی مقام پر پانی نے سرکشی اختیار نہیں کی۔ میں لوگوں سے اس واقعے کی کیا وضاحت کرتا؟ صرف آپ کو بتا رہا ہوں کہ بابا اسی موت کی دعا مانگا کرتے تھے۔ خدا نے انہیں موت کے بعد کی رسوائی سے بچا لیا۔ شاید وہ اس بات سے خوف زدہ رہتے تھے کہ کہیں یہ دنیا والے جنازے کو کاندھا دے کر انہیں رسوا نہ کر دیں۔ بالآخر دعا قبول ہو گئی۔ خدا نے بابا کو غرق کر دیا۔ نہ جنازہ اٹھا اور نہ کہیں مزار بنایا گیا......نہ لوگوں کو تیارداری کی زحمت دی اور نہ تجہیز و تکفین کا احسان اٹھایا۔ بے نشان رہنا چاہتے تھے' بے نشان ہی رہے۔" یہ کہتے کہتے اجنبی کی آواز ڈوب گئی اور پھر وہ فوراً ہی لرزتے قدموں سے باہر نکل گیا۔

سعدیہ خانم اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھی۔ وہ اجنبی سے کچھ اور دریافت کرنا چاہتی تھی' مگر جنبش لب کا یارا نہیں تھا بہت دیر تک کھڑے کھڑے روتی رہی پھر کچھ ہوش آیا تو کامران کے ہاتھ سے لے کر کپڑے میں لپٹی ہوئی اشرفیوں کو زمین پر پھینک دیا۔

"مام! اسے کھول کر تو دیکھو کہ بابا نے کیا بھیجا ہے؟"

سعدیہ خانم کے طرز عمل کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے شجاع الدین کامران بول اٹھا۔

"سونے کے ان چند سکوں کو کیا دیکھوں' میری تو زندگی کا سرمایہ ہی لٹ گیا۔ اب میں اس شخص کو کہاں ڈھونڈوں گی جو میرا حقیقی باپ نہیں تھا' مگر اپنی محبت میں حقیقی باپ سے بھی افضل تھا۔" اب سعدیہ خانم فرش پر بیٹھ چکی

تھی۔ اس کا سر دونوں گھٹنوں کے درمیان تھا اور وہ سسکیوں کے ساتھ رو رہی تھی۔ کبھی کبھی ان ہی سسکیوں سے درد و فراق میں ڈوبی ہوئی آواز ابھرنے لگتی تھی۔

''اے خدا! مجھے صبر دے۔ اگر یہ میرے گناہوں کی سزا ہے تو معاف کر دے کہ رنج والم کا یہ تسلسل تو پہاڑوں میں بھی شگاف ڈال دے گا...... اور اگر یہ آزمائش ہے تو مجھ پر رحم کر کہ میں آزمائش کے لائق نہیں ہوں۔''

سعدیہ خانم بہت دیر تک اس مجذوب کو یاد کر کے روتی رہی جو اپنے مزاج اور خاندان کے اعتبار سے شاہوں کی اولاد تھا مگر عام دنیا والے اسے بھکاری سمجھتے تھے۔

❋❋❋

پھر جب سعدیہ خانم نے رومال کھولا تو اس میں اشرفیاں موجود تھیں۔ اس وقت کی قوت خرید کے اعتبار سے یہ ایک بہت بڑی رقم تھی۔ سعدیہ خانم حیرت سے سونے کے اس ذخیرے کو دیکھتی رہی جو محدود ضرور تھا' مگر سرمایہ داری کی ایک روشن علامت تھا۔ سعدیہ خانم ان اشرفیوں کو دیکھنا نہیں چاہتی تھی لیکن بھوک اور کامران کے مسلسل تقاضوں نے اسے مجبور کر دیا تھا کہ وہ اشرفیوں کو نہ صرف دیکھے بلکہ شمار بھی کرے۔

اور جب سونے کے یہ سکے گنے گئے تو تعداد میں پچاس تھے۔ معصوم کامران سونے کی چمک دیکھ کر خوش تھا' لیکن سعدیہ خانم کی نظریں اس کاغذ پر مرکوز تھیں جو اشرفیوں کے نیچے سے برآمد ہوا تھا۔ سعدیہ خانم نے غیبی خزانے کو نظرانداز کر دیا اور اس کاغذ کو کھولنے لگی جس کا تعلق یقینی طور پر مجذوب بابا کی کسی تحریر سے تھا۔

سعدیہ خانم نے کبھی بابا کو لکھتے ہوئے تو نہیں دیکھا تھا' مگر جب اس نے خط پڑھنا شروع کیا تو انداز تخاطب صاف بتا رہا تھا کہ اس تحریر کا لکھنے والا بابا کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ بابا نے لکھا تھا۔

''میری محبوب بیٹی سعدیہ! میں نے تجھے مظلوم نہیں لکھا کہ خدا کسی پر ظلم نہیں کرتا...... اور میں نے تجھے بدنصیب کہہ کر بھی مخاطب نہیں کیا کہ کوئی مسلمان اس وقت تک بدنصیب نہیں ہوتا جب تک وہ اپنے ایمان کو تباہ نہ کر ڈالے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ تیرا ایمان ابھی تک سلامت ہے اور میں نے اپنے خدا سے بھی یہی دعا کی ہے کہ وہ تیرے ایمان کو شیطان کی دست درازیوں سے محفوظ رکھے۔ یہ چند اشرفیاں تیرے اور کامران کیلئے چھوڑے جا رہا ہوں ابھی کچھ دن تیرا گھر سے نکلنا مناسب نہیں جب تک یہ رقم موجود ہے اس وقت تک کسی کی مزدوری کرنے کی ضرورت نہیں پھر جب یہ چار سکے ختم ہو جائیں تو محنت و مزدوری میں بھی کوئی عار نہیں کہ مسلمان خواتین نے اپنے کردار و عمل سے ایسی روشن مثالیں بھی قائم کی ہیں۔

اور آخر میں ایک اہم بات کہ زندگی کبھی کبھی مسلسل آزمائش بن کر رہ جاتی ہے۔ اگر آسمانوں پر یہی فیصلہ ہو چکا ہے تو پھر اہل زمین کو چاہئے کہ وہ خوش دلی کے ساتھ سر تسلیم خم کر دیں۔ اسی میں عافیت ہے اور اسی میں ان کیلئے نجات ہے۔ میں نے تیری آبرو کے تحفظ کیلئے بہت دعائیں کی ہیں۔ شاید بارگاہ ذوالجلال میں میری یہ درخواست قبول ہوئی ہے۔ میں کبھی ختم نہ ہونے والے سفر پر جا رہا ہوں۔ کل صبح تجھ سے ملے بغیر رخصت ہو جاؤں گا۔ میں نے مزید کچھ دن قیام کیلئے التجا کی تھی' مگر میری یہ درخواست مسترد کر دی گئی۔ میرے بچھڑنے کا زیادہ غم نہ کرنا کہ تیرے لئے یہاں اور بھی بے شمار غم ہیں۔ سدا رہے نام اللہ کا...... تیرا بے نام و نشان بابا۔''

مختصر سا خط تھا' مگر اس نے سعدیہ خانم کو کئی دن تک رلایا۔ وہ دن میں کئی بار خط کو دیکھتی تھی اور گھنٹوں روتی رہتی تھی۔ اس عالم میں کوئی بے قرار آنسو کاغذ پر گر کر تحریر کو دھندلا کر دیتا تھا۔ پھر کچھ دن بعد اشکوں کے ایک ایک قطرے نے جمع ہو کر بابا کی تحریر کو مٹا دیا۔ اب سعدیہ خانم کے ہاتھوں میں ایک نم آلود کاغذ تھا جس پر ہر طرف سیاہی

کے دھبے پھیل گئے تھے۔ کاغذ کی حالت دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ اس پر بھی کچھ لکھا گیا تھا..... مگر وہ تحریر کیا تھی' اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بس سعدیہ خانم کی آنکھوں میں مرنے والے کی تحریر کا ایک عکس باقی رہ گیا تھا اور وہ آنکھیں بند کر کے اسی عکس کے سہارے بابا کے محبت نامے کو تصور میں روشن کر لیا کرتی تھی۔

اب جس جگہ کہ داغ ہے واں پہلے درد تھا

❊❊❊

کسی طرح بھی مجذوب بابا کی موت کا ازالہ ممکن نہیں تھا' مگر سعدیہ خانم نے یہ سوچ کر اشکوں کے طوفان پی لئے تھے کہ ان کی مادی محبتیں تو اس تباہ حال گھرانے کے کام آ جائیں گی۔ بابا نے اپنے پیچھے اشرفیوں کا اس قدر معقول ذخیرہ چھوڑا تھا کہ ان سونے کے سکوں کے سہارے سعدیہ خانم اور شجاع الدین کامران کی زندگی کے کئی سال فراغت و آسودگی سے گزر سکتے تھے۔

سعدیہ خانم نے کامران کے ہاتھوں سے اشرفیاں لے لیں اور انہیں کمرے کے ایک گوشے میں یہ سوچ کر دفن کر دیا کہ کہیں وقت کے قزاقوں کو غریب کے اس خزانے کی خبر نہ ہو جائے اور پھر ماں بیٹے کے سروں پر افلاس کے مہیب سائے اس طرح منڈلانے لگیں جیسے مردہ خور گدھ کسی مرے ہوئے جانور کی تلاش میں آسمان پر مسلسل پرواز کرتے رہتے ہیں۔ سعدیہ خانم کو بھی اپنی قوم اور اپنے معاشرے کے ان گدھوں سے سخت خطرہ لاحق تھا جو کئی دن سے اس کے مر جانے کا انتظار کر رہے تھے۔

جب سعدیہ خانم بابا کی اس بے مثال محبت کو زمین کے نیچے محفوظ کر چکی تو اس نے کچھ دن کا خرچ چلانے کیلئے ایک اشرفی نکال لی۔

دونوں ماں بیٹوں پر یہ تیسرا فاقہ تھا۔ سعدیہ خانم تو کسی نہ کسی طرح اپنی نقاہت کو برداشت کر رہی تھی مگر کامران کی حالت غیر ہوتی جا رہی تھی۔ سعدیہ خانم نے بیٹے کے پژمردہ چہرے کو دیکھا اور پھر بڑے مشفقانہ لہجے میں کہنے لگی۔

"بیٹے کچھ دیر اور صبر کر لو میں تمہارے کھانے کیلئے ابھی انتظام کرتی ہوں۔" یہ کہہ کر سعدیہ خانم گھر سے نکلی اور بازار کی طرف چلی گئی۔

وہ بہت سستے کا زمانہ تھا۔ کھانے پینے کی چیزیں یا دیگر سامان خریدنے کیلئے چھوٹے سکوں کی ضرورت تھی۔ مجبوراً سعدیہ خانم ایک ہندو سنار کی دکان پر گئی اور اس کے سامنے اشرفی رکھتے ہوئے بولی۔

"آپ اس اشرفی کو چھوٹے سکوں میں تبدیل کر دیں تاکہ میں اپنی ضرورت کا سامان خرید سکوں۔"

ہندو صراف نے اشرفی کو بغور دیکھا اس پر ہندوستانی حکمران کے بجائے ایرانی شہنشاہ کی مہر تھی۔ سنار اشرفی کو دیکھ کر چونکا۔ اپنی ہتھیلی پر رکھ کر کئی بار اس طلائی سکے کا جائزہ لیا۔ پھر بڑی بیزاری کے عالم میں کہنے لگا۔ "یہ اشرفی ہمارے ملک کی تو نہیں معلوم ہوتی۔"

"اشرفی کہیں کی بھی ہو' اس کا تعلق خالص سونے سے ہوتا ہے۔" سعدیہ خانم کو سنار کی یہ تاویل و حجت گراں گزر رہی تھی۔ "آپ اشرفی پر لگی مہر کو نہ دیکھیں' اس کو پرکھیں کہ یہ سونا ہے یا پیتل؟" سعدیہ خانم کا لہجہ شائستہ تھا' لیکن پھر بھی اس کے الفاظ میں گہری تلخی پوشیدہ تھی۔

ہندو سنار ایک مسلم پردہ دار خاتون کا یہ انداز دیکھ کر سنبھل گیا مگر پھر بھی اپنی فطرت عیار کے مظاہرے سے باز نہیں آیا تھا۔ بڑی بے پروائی کے ساتھ کہنے لگا۔ "میں اسے بھنا سکتا ہوں مگر اتنی قیمت میں نہیں جو تم چاہتی ہو۔"

"آخر کیوں؟" سعدیہ خانم نے صراف سے پوچھا۔ "کیا یہ اصلی سونا نہیں ہے؟"

"سونا ضرور ہے مگر اس میں کافی ملاوٹ بھی ہے اور ملاوٹ کے بغیر اشرفی تشکیل نہیں پا سکتی۔ اس لئے تمہیں سونے کے مقررہ دام بھی نہیں مل سکتے۔" خالص سونے کا کاروبار کرنے والوں کی نیت میں چھپا ہوا کھوٹ ابھر آیا تھا۔

سعدیہ خانم نے فوراً ہی صراف سے اشرفی واپس لے لی۔ پھر وہ دوسرے سنار کی دکان پر گئی۔ تاجروں کی ایک ہی نسل تھی' اس لئے مزاج بھی یکساں تھا۔ دوسرے صراف نے بھی اسی حیلہ سازی سے کام لیا۔ مزید ستم ظرفی یہ کہ تیز آواز میں سعدیہ خانم سے کہنے لگا۔ "ایران کے شاہی خاندان کی یہ اشرفی تمہارے پاس کیسے آئی؟ مجھے تو کچھ شک ہو رہا ہے۔" سنار نے در پردہ سعدیہ خانم پر یہ الزام عائد کر دیا تھا کہ وہ اشرفی اس کا ذاتی سرمایہ نہیں بلکہ کہیں سے چرائی گئی ہے۔

سعدیہ خانم اپنی مجبوری کو سمجھتی تھی۔ اس لئے اشرفی واپس لے کر چپ چاپ پہلے والے سنار کی دکان پر واپس چلی آئی اور یہ خالص سونے کا سکہ اسی قیمت پر دینے کیلئے رضا مند ہو گئی جس کی پیشکش وہ صراف کچھ دیر پہلے کر چکا تھا۔

سعدیہ خانم نے شدید عالم جبر میں اس خسارے کو بھی برداشت کر لیا۔ اس کی ذاتی مجبوریوں نے سونے کی ایک چوتھائی قیمت کم کر دی تھی۔ بہر حال بابا کی محبتوں سے فاقہ کشی کا یہ وقت گراں گزر گیا تھا اور سعدیہ خانم بازار سے کھانے پینے کا اتنا سامان خرید لائی تھی کہ چند ماہ گھر میں بیٹھ کر اپنے اور کامران کے پیٹ کی آگ بجھا سکے۔

کھانا کھانے کے بعد سعدیہ خانم مجذوب بابا کے تصور میں کھو گئی۔ کیا عجیب انسان تھا؟ اپنی ذات کیلئے شعلہ بار......اور دوسروں کیلئے شبنم فشاں......خاندانی اعتبار سے شاہ اور ظاہری حلیئے سے فقیر و گداگر......ایک بار سعدیہ خانم کے خیالات کی زنجیر ابھری تو پھر اس میں بے شمار یادوں کے حلقے جڑتے چلے گئے۔ کئی بار سعدیہ خانم کو اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا' کئی بار سینے میں آگ سی لگی' کئی بار ہونٹوں سے دھواں سا اٹھا......اور کئی بار آنکھوں سے خون سا ٹپکا۔ بابا کی جدائی نے اسے دوسری بار یتیم بنا دیا تھا۔ پہلی بار اس وقت جب میکے کے دروازے بند ہوئے تھے......اور دوسری مرتبہ اس وقت جب بابا نے کہا تھا۔ "بیٹی! میں جا رہا ہوں۔" اور وہ اتنی دور چلے گئے تھے کہ بس سوچ لیں اور اداس ہو جائیں۔

اب یاد رفتگان کی بھی ہمت نہیں رہی
لوگوں نے اتنی دور بسائی ہیں بستیاں

بہت دیر تک سعدیہ خانم کے سینے میں حشر سا برپا رہا مگر جب کامران کے معصوم چہرے پر نظر پڑی تو اس نے اپنے دل کی بے ترتیب دھڑکنوں اور شکستہ اعصاب پر قابو پانے کی کوشش کی کہ اب اسے ہر حال میں اپنے بچے کے مستقبل کیلئے خوش رہنا تھا۔ اس خیال کے آتے ہی سعدیہ خانم نے ہونٹوں پر ایک جبری مسکراہٹ سجا لی' مگر اس مسکراہٹ کی زندگی بھی ایک روزہ تھی۔ دوسرے دن ہی سعدیہ خانم کے لبوں کا یہ تبسم بھی بے کسی کی موت مر گیا۔

ابھی وہ دوپہر کے کھانے سے فارغ بھی نہیں ہوئی تھی کہ اسے اپنے دروازے پر کئی بھاری دستکیں سنائی دیں۔ سعدیہ خانم نے دروازہ کھولا تو سامنے تین مسلح سپاہی کھڑے تھے۔ سعدیہ خانم ابھی سپاہیوں سے ان کی آمد کا سبب دریافت کرنے بھی نہیں پائی تھی کہ شاہی فوجیوں کے عقب سے وہ ہندو سنار برآمد ہوا جس کے ہاتھ سعدیہ خانم نے اشرفی فروخت کی تھی۔

ابھی سعدیہ خانم حیرت سے ان چاروں افراد کو دیکھ رہی تھی کہ ایک سپاہی انتہائی کرخت لہجے میں اسے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ''تم اسی وقت ہمارے ساتھ قاضی کی عدالت میں چلو تم پر چوری کا الزام ہے۔''

سعدیہ خانم نے اپنی بے گناہی ثابت کرنے کی بہت کوشش کی' مگر سپاہیوں نے ایک بیوہ عورت کی زبان سمجھنے سے انکار کر دیا تھا۔ بالآخر وہ ایک ملزمہ کی حیثیت سے عدالت میں پیش کر دی گئی۔

عدالت پہنچ کر سعدیہ پر یہ راز فاش ہوا کہ ہندو سنار کم قیمت پر اشرفی خرید کر پہلے تو بہت خوش تھا مگر جب اسے یہ معلوم ہوا کہ سعدیہ خانم حکومت وقت کے ایک معتوب فوجی افسر کی بیوہ ہے تو وہ خوف سے لرزنے لگا' پھر اس نے رات ہی میں قاضی شہر کے گھر پہنچ کر اشرفی اس کے سامنے رکھ دی۔ قاضی بھی صورتحال کو نہ سمجھ سکا اور اسے اشرفی بیچنے والی عورت کے کردار پر شک ہو گیا۔ نتیجتاً سعدیہ خانم کو عدالت میں طلب کر لیا گیا۔

''یہ ایرانی اشرفی تمہارے پاس کہاں سے آئی؟'' قاضی شہر نے سعدیہ خانم سے سوال کیا۔

''مجھے میرے بابا نے دی تھی۔'' سعدیہ خانم نے بیباک لہجے میں کہا۔

''تمہارا باپ کون ہے؟'' قاضی نے دوسرا سوال کیا۔

''اعتماد خان ...... مگر اس اشرفی سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔'' سعدیہ خانم نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''پھر تم کس بابا کی بات کر رہی ہو؟'' قاضی الجھنے لگا۔

''وہ میرے روحانی باپ تھے۔ دہلی کے ایک مجذوب۔'' سعدیہ خانم نے جواباً کہا۔ ''ایک دن پہلے ان کا انتقال ہو گیا۔ وفات سے پہلے انہوں نے ایک شخص کے ہاتھ مجھے یہ اشرفیاں بھیجی تھیں۔''

''اس پاگل نے تمہیں یہ اشرفیاں دی تھیں جو دہلی کی گلیوں میں رات رات بھر چیختا پھرتا تھا اور جس کی وجہ سے سونے والوں کی نیندیں حرام تھیں۔'' یہ کہتے کہتے قاضی کے چہرے پر نفرت و حقارت کے کئی رنگ ابھر آئے۔ ''وہ عقل و ہوش سے بیگانہ ایک بھکاری یہ ایرانی اشرفیاں کہاں سے لا سکتا ہے؟ یقیناً اس نے کسی رئیس شہر کے گھر نقب لگائی ہو گی۔'' قاضی عدالت' ایک مرد مجذوب کے خلاف زہر فشانی کرنے لگا۔

''کرسی انصاف پر بیٹھنے والے ایک مہذب شخص سے اس قدر ناشائستہ لہجے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔'' قاضی کے طرز تخاطب پر سعدیہ خانم کے جسم کا لہو جلنے لگا تھا۔ ''جس مرد خدا نے مجھ بیوہ کے مسمار شدہ گھر کی دیواریں اپنے ہاتھوں سے کھڑی کیں ...... اور جو شخص چار ماہ تک میرے یتیم بچے کی کفالت کرتا رہا' آج وہ ایک منصف عادل کی نظر میں پاگل اور بھکاری ٹھہرا ہے۔ یہ کہاں کا انصاف ......''

قاضی شہر نے سعدیہ خانم کی بات کاٹ دی اور سپاہیوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ ''ایک عورت ہونے کی وجہ سے میں اس زبان درازی کو نظر انداز کرتا ہوں۔ اسے اس کے گھر لے جا کر چھوڑ دو اور باقی اشرفیاں بحق سرکار ضبط کر کے شاہی خزانے میں جمع کر دو۔'' قاضی کرسی سے اٹھ گیا۔ انصاف ہو چکا تھا۔

کچھ دیر بعد سلطان معز الدین بہرام شاہ کے وفادار قاضی کے حکم پر سعدیہ خانم کے کھنڈر کا ایک گوشہ کھود کر مجذوب بابا کی دی ہوئی اشرفیاں برآمد کر رہے تھے۔ معصوم شجاع الدین کامران سہما ہوا' ماں کی ٹانگوں سے لپٹا کھڑا تھا اور سعدیہ خانم ایک پتھر کے مجسمے میں تبدیل ہو گئی تھی۔ وہ وقت کی روٹی کا آخری ذریعہ چھن جانے کے باوجود اس کی آنکھوں میں نمی کا عکس تک نہیں تھا۔

✻✻✻

مجذوب بابا کی بچی ہوئی اشرفی کتنے دن کام آتی؟ سعدیہ خانم بھی اس رقم کو محفوظ رکھنا چاہتی تھی اس لئے

دوسرے دن ہی مزدوری کرنے گھر سے نکل کھڑی ہوئی۔ گردش وقت نے ابھی تک پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ اس وقت دہلی میں مسلمانوں کی آبادی بہت کم تھی۔ یا تو شاہی فوجیوں کی بستیاں تھیں یا پھر ان نومسلموں کے گھرانے تھے جنہوں نے چند سال پہلے اپنا آبائی مذہب تبدیل کر کے اسلام کے سائے میں پناہ لی تھی۔ سعدیہ خانم باری باری اپنے ہم مذہبوں کے در پر گئی مگر اس کے پہنچتے ہی ایک ایک دروازہ بند ہوگیا۔ سلطان معز الدین بہرام شاہ کے خوف سے کوئی مسلمان سعدیہ خانم کی شکل تک دیکھنے کا روادار نہیں تھا۔ اگرچہ بہرام شاہ نے ایسا کوئی حکم جاری نہیں کیا تھا کہ رائے نعیم الدین ذیشان کی بیوہ اور بچے پر خدا کی زمین تنگ کر دی جائے لیکن حق نمک ادا کرنے کیلئے لوگوں نے خود ہی اپنے جسموں کو شاہ کی وفاداریوں کی زنجیروں میں اس طرح جکڑ لیا تھا کہ وہ غلاموں سے بھی بدتر نظر آرہے تھے۔ ایسے غلاموں سے سعدیہ خانم کیا توقع رکھ سکتی تھی۔ اس غیرت مند خاتون نے کسی کے آستانہ کرم پر دست سوال دراز نہیں کیا تھا۔ بس محنت و مزدوری طلب کی تھی۔ دہلی کے کچھ درویشوں اور پرہیزگار عالموں نے سعدیہ خانم اور اس کے بچے کو شاہی عتاب کے باوجود اپنے یہاں پناہ دینے کی کوشش کی تھی' لیکن سعدیہ خانم اس بے لوث محبت کو قبول نہ کر سکی۔ درویشوں اور عالموں کی یہ مختصر سی جماعت خود فاقہ کشی کا شکار تھی۔ اس لئے سعدیہ خانم انہیں مزید زیر بار نہ کر سکی۔

باپ اعتماد خان اور بھائی قائم خان راجپوت' سلطان بہرام شاہ کے دربار میں رسائی رکھتے تھے اور آسودہ حال زندگی گزار رہے تھے......مگر سعدیہ خانم کیلئے یہ خونی رشتے فنا ہو چکے تھے۔ اس لئے زندگی کے ان دروازوں کو خود اس نے اپنے ہاتھوں سے بند کر دیا تھا۔

کئی دن کی تلاش کے بعد سعدیہ خانم کو کسی بھی مسلمان کے یہاں ملازمت نہ مل سکی تو وہ اپنے دور کے ایک رشتے دار کرشن راؤ کے مکان پر چلی گئی۔ کرشن راؤ ابھی تک مسلمان نہیں ہوا تھا۔ پھر بھی اسے زندگی کی تمام سہولتیں اور آزادیاں حاصل تھیں۔

''آؤ بیٹی آؤ۔'' سعدیہ خانم کو دیکھتے ہی بوڑھے کرشن راؤ کی آنکھوں میں چمک آگئی۔ ''میں جانتا تھا کہ ایک دن تم ضرور لوٹ کر آؤ گی۔'' کرشن راؤ کے لہجے میں بزرگانہ محبت کی جھلک تھی۔

''میں کسی رشتے سے متاثر ہو کر نہیں آئی ہوں۔'' سعدیہ خانم نے کرشن راؤ کے گھر میں بیٹھنے سے پہلے ہی اپنی آمد کا سبب بیان کر دیا تھا۔

''ٹھیک ہے۔'' کرشن راؤ' سعدیہ خانم کے تیور دیکھ کر ہی سمجھ گیا کہ ہوائیں ابھی تک مخالف سمت میں چل رہی ہیں۔ ''تم اطمینان سے بیٹھو۔ میں تو پرانے رشتے کی بات کر رہا تھا۔ اگر تمہیں اپنے ماضی کا ذکر پسند نہیں ہے تو میں آئندہ ایک حرف بھی زبان پر نہیں لاؤں گا۔'' کرشن راؤ زمانے کے تمام نشیب و فراز سے آشنا تھا۔ اس لئے لہجہ بدل کر بولنے لگا۔ ''کچھ دیر بیٹھو! اگر تمہیں یہ گھر اتنا ہی ناپسند ہے تو اسی وقت واپس چلی جاؤ لیکن مجھے تمہارے اس طرز سلوک سے بہت اذیت پہنچے گی۔''

سعدیہ خانم اپنے بیٹے شجاع الدین کامران کے ساتھ کچھ دیر کیلئے کرشن راؤ کے یہاں ٹھہر گئی۔ بہت دور سے چل کر آئی تھی اس لئے اس کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔

''اگر تم ہمیں اچھوت نہ سمجھتی ہو تو پھر کچھ پانی یا شربت پی لو۔'' کرشن راؤ نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''ہمارے مذہب میں کوئی اچھوت نہیں ہوتا۔'' سعدیہ خانم نے کسی طنز کے بغیر انتہائی شائستہ لہجے میں کہا۔

''مجھے پیاس لگی ہے اور میں آپ کے یہاں پانی پینا پسند کروں گی۔ نعمتیں تو سبھی خدا کی ہیں مگر پانی پر کسی انسان کی

ملکیت ثابت نہیں ہوتی اس لئے پانی پینے میں مجھے کوئی عار نہیں ہے۔"

سعدیہ خانم کو آمادہ پا کر کرشن راؤ نے اپنی جوان بیٹی مالتی کو آواز دی جو رشتے میں سعدیہ خانم کی بہن ہوتی تھی۔ مالتی چاندی کے کٹورے میں سعدیہ کیلئے پانی لے کر آئی۔ اس کے چہرے پر تناؤ تھا' اجنبیت تھی۔ مذہب کی تبدیلی مالتی کو سعدیہ خانم سے بہت دور لے گئی تھی۔ سعدیہ نے بھی اس بیگانگی کو زیادہ اہمیت نہیں دی۔ البتہ چاندی کے کٹورے کو غور سے دیکھا جس سے کرشن راؤ کی امارت کا اظہار ہو رہا تھا......اور شاید جان بوجھ کر چاندی کا یہ قیمتی برتن سعدیہ خانم کے سامنے لایا گیا تھا کہ اس طرح ایک بیوہ اور فاقہ کش عورت کرشن راؤ کی دولت کے مظاہرے سے متاثر ہو سکے۔ مگر یہ کرشن راؤ کی خام خیالی تھی۔ سعدیہ خانم نے دنیا کی کسی شے سے تاثر قبول کرنا اسی وقت ختم کر دیا تھا جب اس کا شوہر قتل ہوا تھا اور ماں باپ نے خون کے رشتوں پر خود غرضی اور زمانہ پرستی کی سیاہی مل دی تھی۔ اس صورت میں کرشن راؤ کا یہ نقرئی کٹورا سعدیہ خانم کو کیا متاثر کر سکتا تھا۔ پھر بھی اس نے اسلامی رواداری سے کام لیتے ہوئے مالتی کی مزاج پرسی کی۔

"تم ٹھیک تو ہو مالتی؟" سعدیہ خانم کے لہجے میں وہی اپنائیت تھی۔

مگر مالتی کے چہرے پر نخوت کے سائے نمایاں تھے۔ اس نے پانی لاتے وقت سعدیہ خانم کو دیکھ کر اپنی مذہبی رسم کے مطابق سلام بھی نہیں کیا تھا۔ پھر جب سعدیہ خانم نے مالتی کی خیریت دریافت کی تو اس غرور کی نمائش میں مزید اضافہ ہو گیا۔

"ہاں ٹھیک ہوں۔" مالتی اس طرح جواب دے کر چلی گئی تھی جیسے کوئی شخص کسی بھکاری سے پیچھا چھڑانے کیلئے اپنا دروازہ بند کر لیتا ہے۔

اس بدسلوکی کے جواب میں سعدیہ خانم کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم ابھر آیا جس میں نہ کوئی شکایت تھی......نہ کوئی مطالبہ اور نہ کوئی طنز۔

کرشن راؤ نے بیٹی کے اس جارحانہ سلوک کا اندازہ کر لیا تھا اس لئے فوراً ہی تلخ فضا کا رخ دوسری طرف موڑ دیا اور سعدیہ خانم کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔ "اب بتاؤ کہ تم نے ہم لوگوں کو کس لئے یاد کیا ہے؟"

"میں ایک شدید ضرورت سے آپ کے پاس آئی ہوں۔" سعدیہ خانم نے تکلف کی تمہید کا سہارا لئے بغیر کہا اور اس سے پہلے کہ کرشن راؤ سعدیہ سے اس کی ضرورت کی وضاحت طلب کرتا وہ خود ہی بول اٹھی۔ "میں آپ کے یہاں محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالنا چاہتی ہوں۔"

بوڑھے کرشن راؤ نے اپنی سود خور نگاہوں سے چند لمحوں کیلئے سعدیہ خانم کی طرف دیکھا۔ پھر اس قدر سرد لہجے میں بولا جیسے کوئی زہریلا سانپ اپنے شکار کو دیکھ کر ہونٹوں پر زبان پھیر رہا ہو۔

"میرے ہوتے ہوئے تمہیں مشقت کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ بھگوان کے دیئے ہوئے دھن سے یہ گھر بھرا پڑا ہے جتنی ضرورت ہو قرض لے لو۔ زندگی میں کبھی کوئی موقع میسر آئے تو واپس لوٹا دینا ورنہ میں ابھی سے معاف کئے دیتا ہوں۔"

منافقانہ محبت کی یہ شبنم آگ بن گئی اور سعدیہ خانم کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کا پورا چہرہ جھلس گیا ہے۔

"نہیں کرشن راؤ جی! وہ انسان قرض کس طرح لے سکتا ہے جس کے دونوں ہاتھ کٹ چکے ہوں۔" سعدیہ خانم نے روایتی صبر و ضبط کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی تھی' لیکن پھر بھی لفظوں میں اس آرزو کی تپش تھی جو سینے کی گہرائیوں میں جل رہی تھی۔

"تمہارے تو دونوں ہاتھ سلامت ہیں۔" کرشن راؤ کا کثیف ذہن ایک لطیف زبان کی نزاکتوں کو نہیں سمجھ سکا تھا۔

"خدا میرے ہاتھوں کو برقرار رکھے مگر۔ یہ سچ ہے کہ قرض لینے والے ہاتھ کٹ چکے ہیں۔ شاید آپ کو نظر نہیں آئے۔" سعدیہ خانم کا لہجہ پرسکون تھا۔

"میں سمجھ گیا۔" کرشن راؤ نے ایک بار پھر لہجہ بدلا۔ "میں تو اپنا فرض ادا کر رہا تھا اگر تمہیں میری محبت کا یہ انداز پسند نہیں تو پھر جس طرح تم خوش رہ سکو میں ہر حال میں تمہاری مدد کرنے کیلئے تیار ہوں۔"

"مجھے آپ کی مدد درکار نہیں روزی چاہئے۔" سعدیہ خانم صاف اور واضح لہجے میں بول رہی تھی۔

"مجھے دل سے تو یہ بات گوارہ نہیں مگر تمہاری خاطر برداشت کرلوں گا۔" کرشن راؤ ایک مرتبہ پھر انتہائی عیارانہ انداز میں پلٹا تھا۔ "تم گھر کا کام کاج کر دیا کرو۔ اس کے بدلے میں تمہیں دو وقت کی روٹی اور ماہانہ تنخواہ مل جایا کرے گی۔"

بھوک کے عفریت کے خلاف حصار کھینچنے کے بعد سعدیہ خانم کو شجاع الدین کامران کے مستقبل کی فکر ہوئی۔ وہ ذاتی حیثیت میں ایک پڑھے لکھے خاندان سے تعلق رکھتی تھی اس لئے اپنے بیٹے کو بھی علم کی دولت سے مالا مال دیکھنا چاہتی تھی۔ دہلی میں جس قدر بڑی درس گاہیں موجود تھیں ان کے نگران حکومت وقت کے زیر اثر تھے۔ وہ پہلے ہی کامران پر ان مکتبوں کے دروازے بند کر چکے تھے۔ مجبوراً سعدیہ خانم نے عارضی طور پر بیٹے کی تعلیم کا سلسلہ منقطع کر دیا تھا مگر جب دو وقت کی روٹی میسر آنے لگی تو ایک بار پھر سعدیہ خانم کے دل میں کامران کی تعلیم جاری رکھنے کا جذبہ بیدار ہو گیا۔

بالآخر کئی دن تک غور و فکر کرنے کے بعد ایک اندھیری رات میں سعدیہ خانم نے مولانا شمس الدین کے دروازے پر دستک دی۔ مولانا شمس الدین ان علماء میں سے ایک تھے جنہوں نے سعدیہ خانم کو اپنے یہاں قیام کرنے کی پیشکش کی تھی۔ مگر سعدیہ خانم نے مولانا کے غربت و افلاس کو دیکھ کر وہاں رہنے سے انکار کر دیا تھا۔ پھر بھی وہ اس مرد مسلمان کا بڑا احترام کرتی تھی۔ مولانا شمس الدین نے کبھی کبھی کوئی سرکاری ملازمت قبول نہیں کی۔ وہ خود بھی دن بھر محنت مزدوری کرتے تھے اور پھر عصر کی نماز کے بعد مغرب تک چھوٹے بچوں کو کسی معاوضے کے بغیر مذہبی تعلیم دیا کرتے تھے۔ مولانا کے اسی کردار سے متاثر ہو کر سعدیہ خانم نے شب کی تاریکی میں ان کے دروازے پر دستک دی تھی۔

دستک کی آواز سن کر مولانا شمس الدین دروازے پر آئے اور ایک برقع پوش خاتون کو اپنے سامنے پا کر چند لمحوں کیلئے حیرت زدہ رہ گئے۔ پھر جب سعدیہ خانم نے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا تو مولانا شمس الدین نے اسلامی تواضع کا مظاہرہ کرتے ہوئے سعدیہ خانم کو خوش آمدید کہا۔

زمین کے اجلے فرش پر بیٹھ کر سعدیہ خانم نے مختصراً اپنی تباہی کی داستان مولانا شمس الدین کو سنائی اور پھر اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ کامران کو تعلیم و تربیت سے آراستہ کر دیں ورنہ ایک یتیم بچہ دنیا کی سنگدلی کا شکار ہو کر اپنے راستے سے بھٹک جائے گا۔

مولانا شمس الدین پہلے بھی سعدیہ خانم کی دکھ بھری زندگی سے کسی قدر واقف تھے اور آج جب رائے نعیم الدین ذیشان کی بیوہ نے اپنے فسانہ غم کے مزید اوراق الٹے تو مولانا بہت دیر تک اس باہمت خاتون کے چہرے کو دیکھتے رہے پھر انتہائی غمزدہ لہجے میں کہنے لگے۔

''بیٹی! میں نے تو اپنے وسائل کی حد تک تمہارے غم بانٹنے کی کوشش کی تھی' مگر تمہاری غیرت نے اسے گوارہ نہیں کیا۔ یہ امر بہت تکلیف دہ ہے مگر اس سے انسانی کردار کی بلندی کا اظہار ہوتا ہے۔ پھر اسی بلندی پر عمل کا ایک چراغ روشن ہوتا ہے اور اسی چراغ کی روشنی میں گم کردہ راہ مسافر اپنی منزل تلاش کرتے ہیں۔ تم بھی ایک ایسا ہی چراغ ہو جسے تیل کی نہیں انسانی خون کی ضرورت ہوتی ہے۔ تم سے پہلے بھی دختران اسلام نے ایسے بہت سے چراغ روشن کئے ہیں۔ تم اس راستے پر اکیلی چلنے والی نہیں ہو۔ یاد رکھو کہ میرے پاس تمہارے لئے صرف خوبصورت الفاظ نہیں شرکت غم کا جذبہ بھی ہے اور عمل بھی...... تم کسی احسان کو محسوس کئے بغیر مجھ سے جو کچھ طلب کرو گی میں تمہیں اس باپ کی طرح دے دوں گا جس پر بیٹی کے بے شمار حقوق ہوتے ہیں۔''

مولانا شمس الدین کی گفتگو سن کر سعدیہ خانم آبدیدہ ہو گئی۔ مجذوب بابا کے بعد یہ دوسرا موقع تھا جب سعدیہ خانم نے کسی غیر انسان کے سامنے آنسو بہائے تھے۔ پھر وہ اس شخص کا شکریہ ادا کر کے اپنے گھر لوٹ گئی جو رشتوں کے اعتبار سے باپ نہیں تھا' لیکن حقیقی باپ سے زیادہ شفیق و مہربان تھا۔

❊❊❊

اب سعدیہ خانم کے شب و روز اس طرح گزر رہے تھے کہ نماز فجر ادا کرنے کے بعد وہ کامران کو لے کر کرشن راؤ کے گھر چلی جاتی تھی۔ کامران ابھی اتنا چھوٹا تھا کہ وہ اسے تنہا نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ کرشن راؤ کے یہاں سعدیہ خانم کی ذمے داریاں گھر کی صفائی اور پانی بھرنے تک محدود تھیں۔ دوپہر تک وہ اس کام سے فارغ ہو جاتی۔ پھر شجاع الدین کامران کو عصر کی نماز سے کچھ دیر پہلے مولانا شمس الدین کے یہاں چھوڑ آتی۔ مولانا کا گھر سعدیہ خانم کے مکان سے قریب تھا۔ اس لئے اسے یہ آسانی میسر تھی کہ جیسے ہی مغرب کی اذان کے وقت مولانا کے یہاں بچوں کے درس کا وقت ختم ہوتا وہ کامران کو لے کر گھر آ جاتی اور پھر کھانا کھا کر ایک کھنڈر نما مکان میں دونوں بیٹے سو جاتے۔ نیند کی آغوش میں جانے سے پہلے اکثر کامران اپنی ماں سے مختلف سوالات کرتا۔

''اس کے باپ کو کس لئے مار ڈالا گیا؟''

''یاسمین ہمارے گھر کیوں نہیں آتی؟''

''نانی اور نانا نے ہمیں اپنے گھر سے کیوں نکال دیا؟''

''آپ کرشن راؤ کے یہاں جھاڑو کیوں دیتی ہیں؟''

''ہمارے نوکر کہاں چلے گئے؟''

شجاع الدین کامران ایسے بہت سے سوالات اپنی ماں سے پوچھتا رہتا۔ سعدیہ خانم اسے کیا بتاتی کہ اس کے باپ کو کس جرم میں موت کی سزا دی گئی...... اور یہ قریبی رشتے داران دونوں کی زندگی کے صحرا میں تنہا چھوڑ کر کیوں چلے گئے؟ یہ ایسے سوالات تھے جن کے جوابات سن کر کامران کے معصوم ذہن پر برا اثر پڑ سکتا تھا اس لئے سعدیہ خانم نہایت ہوشیاری سے بیٹے کو ٹالنے کی کوشش کرتی۔ یہاں تک کہ وہ مضطرب اور بے سکون بچہ تھک کر سو جاتا اور کچھ دیر بعد اچانک چیختا ہوا اٹھ کر بیٹھ جاتا۔

اب تک کوئی رات ایسی نہیں گزری تھی کہ شجاع الدین کامران نے اپنے مرحوم باپ کو خواب میں نہ دیکھا ہو...... اور بے نیام شمشیریں لئے ہوئے کچھ لوگ اس کا تعاقب نہ کر رہے ہوں۔ یہ ایک ایسا خواب تھا جو کامران کی زندگی کا معمول بن چکا تھا۔ سعدیہ خانم نے اپنی بیوگی اور بے چارگی پر صبر کر لیا تھا مگر کامران کی یہ مسلسل اذیت اس کیلئے ناقابل برداشت تھی۔ وہ مختلف زاویوں سے بیٹے کو سمجھانے کی کوشش کرتی کہ کسی طرح کامران کے ذہن سے

باپ کی موت کے اثرات زائل ہو جائیں...... مگر وہ ایک حقیقت تھی اور جب کوئی خوفناک خیال یا کوئی تلخ یاد بچے کے ذہن پر نقش ہو جائے تو پھر اس نقش کو مٹایا نہیں جا سکتا۔ کامران کے ساتھ بھی یہی صورتحال کسی سائے کی طرح لپٹی ہوئی تھی۔ لاوارث اولاد کیلئے باپ کا نعم البدل کوئی دوسرا شخص نہیں ہو سکتا۔ پھر سعدیہ خانم کامران کو کس طرح مطمئن کرتی؟ طلسماتی کہانیوں اور جھوٹے خوابوں سے ایک بچہ کچھ دیر کیلئے بہل سکتا ہے' مگر یہ محرومیوں کا مستقل علاج نہیں۔

سعدیہ خانم کو کامران کے احساس محرومی اور مسلسل خوف و دہشت نے ایک ناقابل بیان کرب میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ اس سلسلے میں مولانا شمس الدین سے بھی کئی بار ذکر کر چکی تھی اور مولانا اسے یقین دلا چکے تھے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یادوں کا یہ زخم بھر جائے گا اور کامران تصورات کے اذیت ناک گرداب سے نکل کر خوشگوار لمحات کے ساحل پر ٹھہر جائے گا...... مگر یہ سب قیاس آرائیاں تھیں اور انسانی ذہن کے تراشے ہوئے امکانات تھے۔ کامران یادوں کے بھنور سے نکل بھی سکتا تھا اور اس میں الجھ کر غرق بھی ہو سکتا تھا۔

❋❋❋

پھر ایک دن سعدیہ خانم لرز کر رہ گئی جب وہ حسب معمول کامران کو لینے کیلئے مولانا شمس الدین کے گھر پہنچی تو مولانا نے بتایا کہ وہ کسی ضرورت کے تحت اندر چلے گئے تھے۔ واپس آئے تو کامران پڑھنے والے بچوں کے کمرے میں موجود نہیں تھا۔ پھر جب انہوں نے دوسرے بچوں سے کامران کے متعلق دریافت کیا تو بچوں نے بتایا کہ وہ اپنے گھر چلا گیا ہے۔ یہ سن کر سعدیہ کانپ گئی۔ اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں مولانا شمس الدین سے کہا۔

''کامران گھر نہیں پہنچا ہے۔''

مولانا شمس الدین کے چہرے پر ندامت کا ایک تیز رنگ ابھر آیا۔ ''بیٹی! مجھ سے بھول ہو گئی۔ میں یہ سمجھ کر مطمئن ہو گیا تھا کہ مکانوں کی چند قطاریں چھوڑ کر تمہارا گھر ہے اس لئے کامران آسانی سے پہنچ جائے گا۔''

سعدیہ خانم کسی مجسمے کی طرح ساکت کھڑی تھی۔

''تم اللہ پر بھروسہ رکھو۔'' مولانا شمس الدین نے ایک غم زدہ ماں کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''میں مغرب کی نماز ادا کر لوں پھر تمہارے ساتھ مل کر کامران کو اس وقت تک تلاش کرتا رہوں گا جب تک وہ تمہاری آغوش محبت تک نہیں پہنچ جاتا۔'' یہ کہہ کر مولانا قریب مسجد کی جانب چلے گئے اور ساتھ ہی اپنی بیوی سے کہتے گئے کہ وہ ان کے آنے تک سعدیہ خانم کی دلجوئی کرتی رہے۔

پھر جب مولانا مغرب کی نماز ادا کر چکے تو انہوں نے سعدیہ خانم سے کہا۔ ''بیٹی! تمہارے خیال میں کامران گھر کے علاوہ اور کہاں جا سکتا ہے؟''

''بزرگ! میں اس سلسلے میں کوئی اندازہ نہیں کر سکتی۔'' سعدیہ خانم کی آواز ابھری مگر اس طرح جیسے اس کا دل ڈوب رہا ہو۔

''چلو! پہلے تمہارے گھر دیکھتے ہیں شاید اس دوران وہ پہنچ گیا ہو۔'' مولانا شمس الدین نے ایک امکان ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

جواب میں سعدیہ خانم نے کچھ نہیں کہا بس خاموشی سے مولانا کے پیچھے پیچھے اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔ سعدیہ نے یہ دو سو گز کا فاصلہ اس طرح طے کیا جیسے وہ موت کی ہولناک وادی سے گزر کر اپنے مکان تک پہنچی ہو راستے میں ایک امید موہوم تھی کہ شاید کامران گھر پہنچ گیا ہو' مگر جب قریب پہنچ کر سعدیہ خانم نے دروازہ بند دیکھا تو

اس کا دل ڈوبنے لگا اور قدم غیر متوازن نظر آنے لگے۔ مولانا شمس الدین ایک شکستہ ماں کے جذبات کو سمجھتے تھے۔ انہوں نے فوراً سعدیہ خانم کو سہارا دیا اور غم کے اس سیلاب کو روکنے کیلئے الفاظ کے بند باندھنے لگے۔

''تم تو ایک شجاع اور حوصلہ مند خاتون ہو ابھی تو خدا نے تمہیں کسی بری خبر سے محفوظ رکھا ہے پھر تمہارے چہرے پر مایوسی کے یہ آثار کیسے؟''

''بزرگ! جانے والا مجھ سے سب کچھ لے گیا بس یہ اس کی ایک نشانی ہی تو رہ گئی ہے۔ خدا وہ وقت نہ لائے کہ آفات کے غبار میں یہ نشانی بھی گم ہو جائے۔'' کامران کی روپوشی نے سعدیہ خانم کو اس طرح ڈھا دیا تھا جیسے مسلسل بارشوں سے کوئی کچی دیوار بیٹھ جاتی ہے۔

مولانا شمس الدین کی یادداشت کے ذخیرہ میں جس قدر الفاظ موجود تھے وہ انہوں نے سب کے سب سعدیہ خانم کی تسکین قلب کے لئے استعمال کر ڈالے مگر ایک ماں کو کسی طرح قرار نہیں آ رہا تھا۔ فراق کا علاج صرف وصال ہے کسی اور دوا سے یہ مرض ٹھیک نہیں ہوتا۔

اسی کشمکش میں بہت دیر گزر گئی۔ اچانک مولانا شمس الدین کے ذہن میں ایک خیال ابھرا۔ ''تم بتاتی ہو کہ وہ اپنی ماموں زاد بہن یاسمین سے بہت مانوس ہے کہیں کامران اپنے نانا کے گھر نہ چلا گیا ہو۔''

مولانا کا یہ خیال ایک واضح مفہوم رکھتا تھا۔ جسے سنتے ہی سعدیہ خانم بے قرار ہو گئی۔ ''ہاں! یہ ممکن ہے۔'' اس کے لہجے میں وحشت تھی۔

''پھر ہمیں اعتماد خان کے مکان پر تلاش کرنا چاہئے۔''

''نہیں میں اپنی غرض کیلئے وہاں نہیں جاؤں گی۔ وہ دروازے میرے لئے بند ہو چکے۔ اگر خدانخواستہ کوئی یہ اطلاع دے کہ وہاں کامران کی لاش پڑی ہوئی ہے تب بھی میں اپنے بیٹے کے تن مردہ کو اٹھانے وہاں نہیں جاؤں گی۔'' یہ کہہ کر سعدیہ خانم رونے لگی۔ ''خدایا! مجھ پر رحم کر میں تیری بہت گناہ گار نام لیوا ہوں۔''

''تم نہیں تو میں خود جاؤں گا۔'' یہ کہتے کہتے مولانا شمس الدین سعدیہ خانم کے گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ اعتماد خان کا مکان کافی فاصلے پر تھا' مگر اسی محلے کے آخری کنارے پر آباد تھا۔ پھر جیسے ہی مولانا چند قدم آگے بڑھے انہیں رات کے اندھیرے میں دو سائے نظر آئے۔ ایک سایہ بہت مختصر تھا جس پر کسی بچے کا گمان ہوتا تھا۔ مولانا شمس الدین ٹھہر گئے۔ وہ شخص بچے کو لئے سعدیہ خانم کے گھر کی طرف ہی آ رہا تھا۔ مولانا کو یقین سا آ گیا کہ وہ بچہ شجاع الدین کامران ہے۔ پھر جب فاصلے کم ہوئے تو بچے کی سسکیاں ابھرنے لگیں۔

''میں وہاں نہیں جاؤں گا مجھے ڈر لگتا ہے۔''

چند لمحوں کے بعد وہ شخص بچے کو لئے ہوئے رائے نعیم الدین ذیشان کے دروازے پر پہنچ گیا۔ مولانا شمس الدین بھی اسی شخص کے ساتھ پلٹ آئے تھے۔ مولانا نے دیکھا کہ بے قرار ماں دروازے ہی پر کھڑی تھی۔ پھر جب سعدیہ کی نظر کامران پر پڑی تو اس نے کسی حجاب کے بغیر اپنے بچے کو ایک اجنبی شخص کے ہاتھ سے چھین کر سینے سے لگا لیا۔

''بیٹے! تم کہاں چلے گئے تھے؟'' پہاڑوں جیسی استقامت رکھنے والی عورت ریت کی طرح بکھر گئی اور تیز آواز سے رونے لگی۔

آنے والا اجنبی شخص چند ساعتوں کے لئے خاموش کھڑا رہا پھر جب اس نے دیکھا کہ سعدیہ خانم اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دے رہی تو وہ خود ہی

''سعدیہ بی بی! یہ میں ہوں ترکمان خان۔'' دراز قامت اجنبی کی بھاری آواز گونجی۔ سعدیہ خانم نے نظر اٹھا کر دیکھا وہ اس کے باپ اعتماد خان کا افغانی النسل ملازم ترکمان خان تھا۔ سعدیہ اسے خاموشی سے دیکھتی رہی۔ ترکمان خان کو اس کی شادی سے ایک سال پہلے ملازم رکھا گیا تھا۔

ابھی سعدیہ خانم ترکمان خان سے کچھ پوچھنے بھی نہیں پائی تھی کہ وہ خود ہی کہنے لگا۔ ''تمہارا بیٹا کامران آقا کے گھر چلا گیا تھا......اور آقا کو یہ بات پسند نہیں۔ ان کا حکم ہے کہ یہ دوبارہ ادھر کا رخ نہ کرے۔ یاسمین بی بی کی ماں نہیں چاہتیں کہ ان کی بیٹی پر ایک یتیم بچے کا سایہ پڑے۔'' یہ کہہ کر ترکمان خان آگے بڑھا مگر چند قدم چل کر واپس لوٹ آیا۔ ''سعدیہ بی بی! مجھے معاف کرنا کہ میں اپنے آقا کے حکم سے مجبور ہوں۔'' ایک شخص کے دل میں ہمدردی کا ایک دھندلا سا جذبہ ابھرا تھا' مگر آقا کی وفاداریوں نے فوراً ہی اس جذبے کو قتل کر دیا۔

''جاؤ! جاؤ! یہاں سے چلے جاؤ۔ تم سب مجبور ہو۔'' سعدیہ خانم اچانک بھڑک اٹھی تھی' لیکن ترکمان خان جا چکا تھا۔

***

اس کے بعد مولانا شمس الدین بھی اپنے گھر چلے گئے۔ پھر جب کھنڈر کا وحشت خیز سناٹا مکمل ہو گیا تو سعدیہ خانم نے چراغ کی روشنی میں کامران کا چہرہ دیکھا۔ اس کے دونوں رخساروں پر گہرے نیلے نشانات ابھرے ہوئے تھے۔ سعدیہ خانم کے دل و دماغ ایک بار پھر جذبات کے زلزلے کی زد میں آ گئے۔ اس نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''بیٹے! یہ کیسے نشانات ہیں؟'' یہ کہتے کہتے سعدیہ خانم کے ہونٹ جل اٹھے تھے۔

''مجھے یاسمین کی ماں نے مارا تھا۔'' شجاع الدین کامران بھی پرسش حال پر رو پڑا۔

''کیوں مارا تھا؟'' یکایک سعدیہ خانم کے لہجے میں سختی آ گئی تھی۔

''میں یاسمین سے کہہ رہا تھا وہ ہمارے گھر چلے۔'' کامران کی سسکیاں جاری تھیں۔ ''پھر نانا نے بھی مارا اور کہا کہ اگر اب تو ادھر آیا تو تیرے ہاتھ پاؤں باندھ کر کنویں میں ڈال دیا جائے گا۔''

''کیا تم دوبارہ وہاں جاؤ گے؟'' سعدیہ خانم نے کامران کے رخساروں پر ابھرے ہوئے نشانات کو دونوں ہاتھوں سے چھوتے ہوئے کہا۔

''ہاں! جاؤں گا۔'' راجپوت زادے کی فطری سرکشی لوٹ آئی تھی۔ ''میں کسی سے بات بھی نہیں کروں گا بس یاسمین کو اپنے گھر لے کر آ جاؤں گا۔''

سعدیہ خانم بیٹے کا باغیانہ فیصلہ سن کر سہم سی گئی' مگر اس نے فوراً ہی مامتا کی کمزوریوں پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''یہ میرا حکم ہے کہ تم آئندہ یاسمین کے گھر نہیں جاؤ گے۔'' سعدیہ خانم کا لہجہ اس قدر درشت تھا کہ شجاع الدین کامران ڈر کر ماں کی طرف دیکھنے لگا۔ ''اب یاسمین سے تیرا کوئی رشتہ نہیں ہے۔''

''آپ تو کہتی تھیں کہ میرے یاسمین سے دو رشتے ہیں۔'' شجاع الدین کامران کی آواز سہمی ہوئی تھی۔

''سب رشتے ٹوٹ گئے۔ بات کو یوں سمجھنے کی کوشش کرو کہ میں نے تم سے جھوٹ بولا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا جب ایک محبت کرنے والی ماں نے اپنے یتیم بچے کا دل توڑ دیا تھا۔ شوہر کی موت کے بعد کامران کی بڑی سے بڑی ضد پر ڈانٹنا تو کجا' سعدیہ خانم نے اپنے بیٹے کو بگڑی ہوئی نظروں سے بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے بعد کامران کیلئے اس دنیا میں نفرتیں ہی نفرتیں ہیں۔ محبت کا کوئی سائبان تو درکنار' کسی دیوار کا سایہ بھی نہیں ہوگا۔ یہی سوچ کر سعدیہ خانم اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ کامران کی خوشی پر لٹا دینا چاہتی تھی۔ مگر آج اس کا بیٹا جو خوشی طلب کر رہا تھا' وہ ذلت آمیز بھی تھی اور تباہ کن بھی۔ یاسمین جسے وہ ریشم کی ایک نازک سی ڈور سمجھتی تھی' اب کامران کیلئے ایک آہنی زنجیر بنتی جا رہی تھی۔ سعدیہ خانم اسی زنجیر کو بے رحمی کے ساتھ توڑ دینا چاہتی تھی۔ اس کے خیال میں یہ بے رحمی کامران کے مستقبل کو فتنوں سے بچانے کیلئے ضروری تھی اور پھر اپنے اسی خیال کے پیش نظر سعدیہ خانم نے کامران سے کہا

تھا۔

"یاسمین سے تیرے تمام رشتے ٹوٹ گئے اور یہ رشتے میں نے توڑ دیئے۔ اب اس کا نام' اس کا تصور' اس کی گلی تیرے لئے حرام ہے۔" جس قدر جارحیت ممکن تھی' ماں نے بیٹے کے حق میں استعمال کی۔ سعدیہ خانم اسی نشتر زنی کو کامران کے زخموں کا علاج سمجھتی تھی۔

"بیٹے! تو کب تک یہ ذلت برداشت کرتا رہے گا۔" سعدیہ خانم نے کچھ دیر خاموش رہ کر کہا۔ "اپنے رخساروں کے نشانات دیکھ تجھے خبر ہے کہ تیرے برگ گل جیسے رخساروں کے ان نشانات نے ماں کے دل پر کتنے زخم چھوڑے ہیں۔ تو نہیں جانتا بیٹے! کچھ بھی نہیں جانتا کہ آج تیری ماں پر کیا گزر گئی ہے؟" ضبط کی تمام حدیں ٹوٹ گئیں اور جذبات کا گرم لاوا آنکھوں کے راستے سے بہنے لگا۔ کامران بھی ماں کی یہ کیفیت دیکھ کر بہت رویا۔ پھر ایک بیوہ عورت اور ایک یتیم بچے کے آنسوؤں میں وہ سیاہ رات ڈوب گئی جس کے مقدر میں کوئی روشن صبح تحریر نہیں کی گئی تھی۔

❊❊❊

دنیا والوں کیلئے وقت بہت خوشگوار تھا۔ مگر سعدیہ خانم کیلئے آرزوؤں کی ایک لاش تھی جسے اٹھائے ہوئے وہ روزانہ ایک بت پرست کرشن راؤ کے گھر جاتی تھی۔ کرشن راؤ ایک مغرور اور سنگدل راجپوت تھا۔ اس نے انسانی ہمدردی کے جذبات سے مجبور ہو کر سعدیہ خانم کو یہ بدترین ملازمت نہیں دی تھی۔ وہ ایک تنگ نظر ہندو کی حیثیت سے سعدیہ خانم کو اپنے انتقام کا ہدف بنانا چاہتا تھا۔ کرشن راؤ کو اپنے اس منصوبے میں بظاہر کامیابی حاصل ہو گئی تھی لیکن وہ اخلاقی طور پر سعدیہ خانم کو شکست نہیں دے سکا تھا۔ تقریباً دو سال کے طویل عرصے میں سعدیہ خانم نے ایک بار بھی کرشن راؤ کو شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔ طبیعت کی خرابی میں بھی وہ پابندی کے ساتھ اپنے مزدورانہ فرائض انجام دیتی۔ کسی ایک لمحے کیلئے بھی اس نے کرشن راؤ کی طرف رحم طلب نظروں سے نہیں دیکھا۔ اس کے نزدیک محنت و مشقت ایک مسلمان کا امتیازی نشان تھا۔ وہ کاہلی اور غیر ذمے داری کو جرم سمجھتی تھی اور اس کے خیال میں یہ گناہ عظیم تھا کہ وہ کسی شخص سے قرض یا رعایت طلب کرے۔ اس دوران کرشن راؤ نے بارہا کوشش کی تھی کہ سعدیہ خانم اپنے منصب سے گر کر اس کے سامنے دنیوی آسائش کیلئے دست سوال دراز کرے۔

اس عرصے میں کرشن راؤ نے یہ حرکت بھی کی تھی کہ اپنے چاندی اور سونے کے سکوں کا انبار سعدیہ خانم کے سامنے رکھ دیا تھا۔

سعدیہ خانم نے سیم و زر کے اس ذخیرے کو دیکھ کر کرشن راؤ سے پوچھا تھا۔ "یہ کیا ہے؟"

کرشن راؤ نے دولت کے نشے میں ڈوبی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ کہا تھا۔ "یہ وہ شے ہے جس سے انسان دنیا میں معزز و محترم کہلاتا ہے۔"

"میں اسے تسلیم نہیں کرتی۔" سعدیہ خانم نے بڑی بے باکی سے کرشن راؤ کے سود خور نظریات کو جھٹلا دیا تھا۔

بوڑھا کرشن راؤ کسی عیار شاطر کی طرح فوراً ہی پلٹ پڑا۔ "میں تم سے بحث نہیں کرتا۔ یہ چاندی اور سونے کا ڈھیر ہے' ہمارے بزرگوں کی روایت کے مطابق اگر سونے اور چاندی کو سال میں ایک بار گھر کے ملازم دھوپ نہ دیں تو ان سکوں کو زنگ لگ جاتا ہے۔ ہم اپنے سرمائے کو زنگ سے بچانا چاہتے ہیں اور آج دولت کو دھوپ دینے کا کام تمہارے سپرد کرتے ہیں۔"

پرانے سرمایہ داروں کا یہ بڑا عجیب کھیل تھا کہ وہ ملازموں کے ذریعے اپنی دولت کو دھوپ دینے کی رسم ادا کرتے تھے۔ اس رسم کی ادائیگی سے ان کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ ملازم دولت کے اس ذخیرے میں سے کچھ سکے چرا

لیں اور اس طرح دھوپ لگنے کے بعد دولت تھوڑی بہت خشک ہو جائے۔ بعض ملازم فطرتاً دیانت دار ہوتے تھے' اس لئے دھوپ لگنے کے بعد بھی دولت خشک نہیں ہوتی تھی۔ اس صورت میں وہ رئیس دوبارہ ملازموں کو حکم دیتا تھا کہ مزید دھوپ دی جائے۔ پھر یہ عمل اس وقت تک جاری رہتا تھا' جب تک ملازمین دولت کے اس انبار میں سے کچھ سکے چرا نہیں لیتے تھے۔

سرمایہ داروں کی یہ بڑی انوکھی اور شرمناک تفریح تھی کہ اپنے نوکروں کو چوری پر تو اکساتے تھے مگر انہیں شریفانہ انداز میں ان کی محنت کا حق نہیں دیتے تھے۔ کرشن راؤ نے بھی سعدیہ خانم کے ساتھ یہی اذیت ناک کھیل کھیلنے کی کوشش کی تھی۔

''میں آپ کی ملازمہ ہوں اور ہر وہ کام کرنے کی پابند ہوں جس سے میرا وقار مجروح نہ ہوتا ہو'' کرشن راؤ کی بات سن کر سعدیہ خانم نے جواباً کہا۔ ''میں آپ کی دولت کو دھوپ دینے کیلئے تیار ہوں مگر کیا یہ سکے شمار کر لئے گئے ہیں۔'' سعدیہ خانم نے کرشن راؤ سے ایک غیر متوقع سوال کر دیا تھا۔

''نہیں!'' کرشن راؤ کے چہرے پر اچانک غرور کی ایک واضح علامت ابھر آئی۔ ''ہم لوگ اپنی دولت کا شمار نہیں کرتے۔''

''پہلے آپ اپنے کسی دوسرے ملازم سے اس دولت کا شمار کرا لیجئے' پھر سیم و زر کے ان سکوں کو دھوپ دے دوں گی۔'' سعدیہ خانم نے کرشن راؤ کی بات ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ ''یہ ایک امانت ہے اور جس امانت کا کوئی حساب موجود نہ ہو اس کا بوجھ مجھ ناتواں سے نہیں اٹھ سکتا۔''

اب کرشن راؤ کے چہرے پر غرور و تکبر کے بجائے ندامت کا رنگ تھا۔ افلاس کے کمزور ہاتھوں نے سرمایہ داری کے بت پر ضرب شدید لگائی تھی جس کے اثر سے کرشن راؤ کانپ کر رہ گیا۔ مگر اپنے ہونٹوں کو جنبش نہ دے سکا۔

❊❊❊

پھر ایک دن کرشن راؤ نے سعدیہ خانم کی رگ احساس پر نئے انداز سے نشتر زنی کی۔

''بیٹی! اگر تم برا نہ مانو تو میں تم سے ایک بات پوچھوں؟'' کرشن راؤ کا لہجہ بظاہر بہت نرم اور ہمدردانہ تھا مگر اندر سے کسی بے ضمیر انسان کے دل کی طرح کھوکھلا تھا۔

''پہلے آپ اپنے الفاظ واپس لیں۔ پھر مجھ سے کوئی سوال کریں۔'' سعدیہ خانم اس طرح برگشتہ نظر آ رہی تھی جیسے کوئی انسان جبر و تشدد سہتے سہتے اچانک بغاوت پر اتر آیا ہو۔ ''میں آپ کو بیٹی کہہ کر پکارنے کا حق نہیں دیتی۔ مجھے اپنی حیثیت معلوم ہے میں اول و آخر آپ کی ملازمہ ہوں۔''

''چلو یوں ہی سہی۔'' کرشن راؤ کے منہ سے زہر کی بوندیں ٹپکنے لگیں۔ ''میں تم سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ جس اسلام کی خاطر باپ دادا کی ریت چھوڑی' صدیوں پرانے رسم و رواج سے ناتا توڑا' اس اسلام نے تمہیں کیا دیا؟ بیوگی...... غربت و افلاس...... ماں باپ سے محرومی...... بہن بھائیوں اور رشتے داروں سے دوری...... اپنی قوم سے ایسی اجنبیت کہ اچھوت بھی تمہیں دیکھ کر شرمائیں۔ کیا تم نے اسی دن کیلئے نیا مذہب قبول کیا تھا؟'' آج کرشن راؤ کی تمام خباثتیں بے نقاب ہو گئی تھیں۔

سعدیہ خانم نے نگاہ تحقیر سے بوڑھے راجپوت کی طرف دیکھا۔ چند لمحے خاموش رہی اور پھر باوقار لہجے میں کہنے لگی۔ ''ایک بت پرست یہ راز نہیں سمجھ سکتا کہ اسلام نے مجھے کیا دیا؟ یہ اسلام ہی تھا کہ جس نے مجھے بے جان مورتیوں کی پرستش کے دائرے سے باہر نکالا...... اور یہ اسلام ہی ہے جو مجھے آفات و مصائب کے ہجوم میں بھی کسی

انسان کے آگے جھکنے نہیں دیتا۔ مسلمانوں نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا' اس کا ذمہ دار اسلام نہیں جو آزمائش کے وقت منہ موڑ کر چلے گئے' اس کے ذمہ دار وہ خود ہیں۔ پھر بھی وہ ایک مسلمان ہی تھا جس نے شاہی عتاب کو ٹھوکر مار کر اپنے ناتواں ہاتھوں سے مجھ بیوہ کا مکان تعمیر کیا اور پھر جب تک زندہ رہا مجھے اور میرے بچے کو رزق فراہم کرتا رہا۔"

کرشن راؤ نے آج پہلی بار سعدیہ خانم کو شدید عالم غضب میں دیکھا تھا۔ ضبط کے کنارے ٹوٹے تو جذبات کا سمندر ابل پڑا۔ "یہ آخری موقع ہے جو آپ نے میرے ذاتی عقائد میں مداخلت کی ہے اگر آئندہ اس سلسلے میں ایک لفظ بھی آپ کی زبان پر آیا تو میں یہ ملازمت جاری نہ رکھ سکوں گی۔ میری محنت و مزدوری کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ کوئی مجھ پر ترس کھائے یا گردش وقت کو میری مجبوریوں کا نام دے کر مجھ سے اذیت ناک سلوک کرے۔ میں مجبور نہیں ہوں اور کوئی بھی مسلمان مجبور نہیں ہوتا۔ مجھے اور میرے بچے کو خالی پیٹ موت آ گئی تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہو گی۔ موت تو انہیں بھی آتی ہے جن کے شکم بھرے ہوتے ہیں۔" یہ کہہ کر سعدیہ خانم اپنے گھر جانے لگی۔

"نہیں! میرا یہ مقصد نہیں تھا۔" عیار فطرت کرشن راؤ' سعدیہ خانم کے شعلہ بار تیور دیکھ کر سہم سا گیا تھا۔ "میں نے تو صرف تمہاری ہمدردی میں یہ بات کہی تھی..... مجھے دکھ......"

سعدیہ خانم نے فوراً ہی کرشن راؤ کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "مجھے تمہاری ہمدردیوں کی ضرورت نہیں ہے۔" پھر وہ کچھ کہے بغیر چلی گئی اور کرشن راؤ کے چہرے کی ہر جھری سے ایک نیا فتنہ سر ابھارنے لگا۔

❋❋❋

حادثہ گزر چکا تھا مگر سعدیہ خانم کے ذہن میں مسلسل کرشن راؤ کے آواز گونج رہی تھی۔ اہل دنیا کے سلوک نے سعدیہ خانم کو زندگی سے بیزار کر دیا تھا۔ مگر وہ اپنے بیٹے شجاع الدین کامران کی وجہ سے جینے کیلئے مجبور تھی۔ اسی دن نصف شب کے قریب' سعدیہ خانم نے اٹھ کر نماز ادا کی اور پھر بہت دیر تک اپنے خدا کے حضور گریہ وزاری کرتی رہی۔

"اے میرے پالنے والے! مجھے استقامت دے کہ یہ زندگی کی بڑی سخت منزل ہے......اے زمین و آسمان کے نور! میرے ایمان کے اس چراغ کو کفر کی آندھیوں سے محفوظ رکھ کہ تیری تائید کے بغیر انسان اندھیروں سے نجات نہیں پا سکتا۔"

اس کے بعد وہ کامران کے بہتر مستقبل کیلئے دعائیں مانگتی رہی۔

اور کامران کا وہی حال تھا ہر وقت دنیا سے بیزار سا' اپنے ہم عمر بچوں سے دور' باپ کی محبت سے محروم' تنہائی کا اسیر' خوابوں اور تمناؤں کی پیہم شکست کا شکار۔ اب اس کی عمر سات سال کے قریب ہو چکی تھی۔ مولانا شمس الدین اس کی تعلیم و تربیت پر غیر معمولی توجہ دیتے تھے مگر وہ ہمیشہ بجھا بجھا سا رہتا تھا۔ دوسرے طالب علموں کی طرح نہ اس میں سوال کرنے کی کوئی تڑپ تھی اور نہ جواب دینے کی جرأت۔ بس ایک وحشت سی تھی جو اس کے دل و دماغ پر چھائی رہتی تھی۔

اس دوران سعدیہ خانم کے منع کرنے کے باوجود وہ کئی بار یاسمین کے گھر جا چکا تھا......اور ہر مرتبہ نانا' نانی' ماموں اور ممانی نے اسے جس بے رحمی کے ساتھ گھر سے نکالا تھا۔ وہ سلوک تو حساس انسان کسی جانور سے بھی روا نہیں رکھتے۔

سعدیہ خانم جب بھی بیٹے کو اس حالت میں گھر واپس آتا ہوا دیکھتی تو کچھ دیر کیلئے اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتی اور چیخ چیخ کر کامران سے کہنے لگتی۔

''بیٹے! میں نے بیوگی کا زخم برداشت کرلیا' نفرت وتحقیر کی تمام جراحتیں دل پر سہہ لیں ...... مگر ذلت و رسوائی کا یہ نشتر برداشت نہیں ہوتا۔

پھر کبھی ایسا بھی ہوا کہ سعدیہ خانم کا ہاتھ اٹھ گیا اور کامران کے نرم و نازک رخساروں پر کئی نیلے نشانات ابھر آئے اور پھر ان ہی نشانات نے اسے گھنٹوں رلایا۔

سعدیہ خانم نے مولانا شمس الدین سے بھی کامران کی اس روش کا ذکر کیا۔ مولانا شمس الدین نے جواباً کہا۔

''کامران پر سختی نہ کرو کہ تمہارا یہ جارحانہ رویہ اسے اور باغی بنا دے گا۔ وہ ایک ایسا بچہ ہے جو اپنے ہم عمروں سے بچھڑ گیا ہے۔ اس کی معصوم خواہشیں معصوم ساتھی کو تلاش کرتی ہیں۔ اسے بچوں سے ملنے دو کہ یہ فطرت کا تقاضا ہے۔''

''بزرگ! میں جانتی ہوں مگر کامران کیلئے اس کے ہم عمر ساتھی کہاں تلاش کروں؟ محلے کے تمام دروازے اس پر بند ہیں۔ کوئی ماں اس سے اپنے بچے کو ملنے نہیں دیتی۔ کامران کا باپ شاہی معتوب کیا ٹھہرا کہ اس کے بیوی بچے پر بھی قہر ٹوٹ پڑا۔ یہ کیسا جرم ہے اور کیسی اس کی سزا ہے؟'' سعدیہ خانم مولانا شمس الدین کے سامنے رونے لگی۔ اگرچہ رسم اشک ریزی اس کی عادت کے خلاف تھی' لیکن وہ اس صدمے کو برداشت نہ کرسکی۔

مولانا شمس الدین بہت دیر تک اسے تسلیاں دیتے رہے۔ ''صبر کرو بیٹی کہ دنیا بہت بری جگہ ہے۔ انسان نے تخت و تاج کی چمک اور شمشیروں کی آب کو خدا سمجھ لیا ہے۔ وہ ایک شاہ سے وفاداریوں کے اظہار میں بے شمار بندگان خدا کا خون بہا رہے ہیں۔ زمین ناانصافیوں سے بھر گئی ہے۔ آدم زادوں نے اپنے ہوس کدوں کی آرائش کیلئے عدالتوں میں آگ لگا دی ہے۔ ہر طرف حرص کا دھواں پھیلا ہوا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہارا دم گھٹا جارہا ہے۔ مگر بیٹی! سانس لینے کی کوشش کرو۔ خدا تمہیں حوصلہ بخشے گا۔ وہ اپنے پکارنے والوں کو تنہا نہیں چھوڑتا۔ تم بھی اس زمین پر تنہا نہیں ہو۔ ایمان کی آبرو بچانے کے لئے جاں سے بھی گزر جانا پڑ جاتا ہے۔ یہ دنیا پرستوں کی چند روزہ چلت پھرت ہے' اس سے فریب میں نہ پڑ جانا۔ میں تمہیں ہمہ وقت اپنی حقیر دعاؤں میں شامل رکھتا ہوں' مگر خدا ہی جانتا ہے کہ کیا ہونے والا ہے؟ صبر کرو کہ ہر مصیبت گزرنے کیلئے ہے۔ ایک دن آفات کا یہ سیلاب بھی گزر جائے گا۔''

مولانا شمس الدین کے اس مشفقانہ عمل سے سعدیہ خانم ایک بار پھر جی اٹھتی اور حالات کے افق پر اپنے اس خواب کی پرچھائیاں دیکھنے لگتی' جن میں صرف معصوم کامران کا چہرہ جھلکتا تھا۔

❋❋❋

وقت اپنے کاندھوں پر بے شمار زندگیوں کا بوجھ اٹھائے آگے بڑھ رہا تھا کہ ایک دن کرشن راؤ نے سعدیہ خانم کے ساتھ بڑا اذیت ناک مذاق کیا۔ وہ شروع ہی سے اپنے خاندان کی اس مسلمان خاتون کیلئے شدید انتقامی جذبہ رکھتا تھا ...... اور اسی جذبے کی تسکین کیلئے کرشن راؤ نے سعدیہ خانم کو ذلت آمیز نوکری دی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ مصائب سے تنگ آکر یا تو سعدیہ خانم اپنا مذہب ترک کردے گی یا پھر بقیہ زندگی اس کی خوشامد میں گزار دے گی۔ مگر جب کئی سال بعد بھی سعدیہ خانم کے قدم نہیں لڑکھڑائے تو کرشن راؤ نے نیا منصوبہ ترتیب دیا اور وہ بوڑھا ہونے کے باوجود تازہ دم نظر آنے لگا۔

ایک دن سعدیہ خانم اپنے کام پر پہنچی تو کرشن راؤ نے بڑے والہانہ انداز میں اس کا استقبال کیا۔ سعدیہ خانم نے بدلی ہوئی روش پر کوئی دھیان نہیں دیا ...... اور وہ جھاڑو لے کر گھر کی صفائی کرنے لگی۔

''تم یہ کام چھوڑ دو۔'' اچانک کرشن راؤ نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''کیوں......؟'' سعدیہ خانم کے ہاتھ رک گئے اور وہ سوالیہ نظروں سے کرشن راؤ کی طرف دیکھنے لگی۔

''مجھے اس بات کا احساس ہے کہ تم بہت زیادہ کام کرتی ہو۔'' کرشن راؤ نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''کام کم یا زیادہ نہیں ہوتا۔ کام ہر حال میں کام ہوتا ہے۔ آپ اپنے احساس کو درمیان میں نہ لائیں۔'' سعدیہ خانم نے کرشن راؤ کے ہمدردانہ الفاظ کو اسی کے منہ پر مار دیا تھا۔

''آج سے تم یہ کام چھوڑ کر نئی ذمے داریاں قبول کرو گی۔'' کرشن راؤ نے سعدیہ خانم کی تلخ کلامی کا کوئی اثر لئے بغیر خوشگوار لہجے میں کہا۔

''وہ نئی ذمے داریاں کیا ہوں گی؟'' سعدیہ خانم نے دریافت کیا۔

''گھر کی صفائی کرنے اور پانی بھرنے میں تمہیں بہت دشواری ہوتی ہے۔ اس لئے میں نے سوچا ہے کہ تم صبح سویرے آکر کرشن بھگوان کی مورتی کو غسل دے دیا کرو اور مندر کا فرش صاف کر دیا کرو۔ یہ بہت مختصر کام ہے۔ اس کے بعد تمہیں فرصت ہی فرصت ہو گی۔ پھر اگر تم چاہو تو کسی دوسری جگہ بھی ملازمت کر سکتی ہو اس طرح تمہاری آمدنی میں مزید اضافہ ہو سکتا ہے۔'' کرشن راؤ کی خباثت نے جو نیا منصوبہ تراشا تھا' اب اس کی شکل واضح ہو گئی تھی۔

سعدیہ خانم کچھ دیر تک شدید حیرت کے عالم میں کرشن راؤ کو دیکھتی رہی' پھر اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ ابھر آئی۔

''آپ کا وہ مندر کہاں ہے؟'' سعدیہ خانم کا لہجہ حیرت انگیز طور پر بہت زیادہ پرسکون نظر آ رہا تھا۔ ''پہلے میں اس مندر کو دیکھنا چاہتی ہوں۔''

کرشن راؤ فوراً ہی اٹھا......اور سعدیہ خانم کو اپنے طویل و عریض مکان کے دوسرے حصے میں لے گیا جہاں ایک بڑا سا کمرہ پوجا پاٹ کیلئے وقف کر دیا گیا تھا۔ اس کمرے میں کرشن کا ایک مجسمہ نصب تھا۔

''یہ ہے ہمارا مندر۔'' کرشن راؤ نے کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

سعدیہ خانم باہر ہی کھڑی رہی اور کرشن کے بت کو غور سے دیکھنے لگی؟

''مجھے کیا کرنا ہو گا؟'' سعدیہ خانم نے کرشن راؤ سے اس طرح پوچھا جیسے کچھ دیر پہلے ادا کئے جانے والے الفاظ اس کے ذہن سے محو ہو گئے ہوں۔

''تم سورج نکلنے سے پہلے بھگوان کرشن کی مورتی کو غسل دے دیا کرو۔ اس کے بعد تمہاری کوئی ذمے داری نہیں۔'' کرشن راؤ کا لہجہ بہت سرد تھا۔

''گویا نماز فجر کے وقت میں تمہارے بھگوان کو غسل دیا کروں۔'' سعدیہ خانم کی آواز میں غضب کا ٹھہراؤ تھا۔

چند لمحوں کیلئے کرشن راؤ سے کوئی جواب نہ بن پڑا اور وہ انتہائی سراسیمگی کے عالم میں سعدیہ خانم کو دیکھنے لگا جس کے چہرے پر غیر معمولی تحمل کے علاوہ ایک ایسا رنگ بھی موجود تھا جو کرشن راؤ کے غلیظ منصوبے کا مذاق اڑا رہا تھا۔

''میرا مطلب ہے کہ اگر یہ وقت مناسب نہیں تو پھر سورج نکلنے کے بعد ایسا کر دیا کرو۔'' کرشن راؤ بوکھلاہٹ کا شکار ہو گیا تھا۔

''اس طرح تو آپ کی پوجا کا وقت گزر چکا ہو گا۔'' سعدیہ خانم کے لہجے میں مکمل استقامت تھی اور وہ ایک تنگ نظر بت پرست کا شائستہ الفاظ میں مضحکہ اڑا رہی تھی۔

''تم پوجا کے وقت کا خیال نہ کرو۔ یہ تمہارے سوچنے کی باتیں نہیں بس اپنے کام سے کام رکھو۔'' کرشن راؤ کے پاس سعدیہ خانم کی دلیل کا کوئی [illegible] تھا۔

"چلئے! میں آپ کی پوجا کے اوقات کے بارے میں نہیں سوچتی' مگر مجھے انسانی فطرت کے سیاہ پہلو پر غور کرنے کا حق حاصل ہے۔" اب سعدیہ خانم کھل کر اپنے دل کی بات کہہ رہی تھی۔ "آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں جن پتھروں کے مجسموں سے اپنی عقل اور دل کا دامن چھڑا چکی' کسی نہ کسی طرح ان کی خدمت گزاری سے وابستہ رہوں۔ کرشن راؤ جی! یہ کیسی اذیت پسندی ہے؟ جب اہل دنیا خدا کے بندوں کے دل فتح نہیں کر سکتے تو ان کی مجبوریاں خرید کر اپنے شیطانی جذبوں کو تسکین دینا چاہتے ہیں۔ میں تقریباً دو سال سے آپ کی گھناؤنی سوچ کا مشاہدہ کر رہی ہوں۔ بالآخر آپ کا ایک ایک جذبہ میرے سامنے بے نقاب ہو گیا۔ میں ایک مسلمان عورت ہوں جسے بنیادی طور پر تہذیب و شائستگی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ آج میں اسی تہذیب کے صدقے میں معاف کئے دیتی ہوں۔ ورنہ ایک مسلمان سے کسی بت خانے کی صفائی کا مطالبہ بڑی بے رحمی ہے' بڑی سفاکی ہے۔ خدا اسے ستمگروں کے نرغے میں اپنے نام لیواؤں کی حفاظت کرے۔" یہ کہہ کر سعدیہ خانم واپس جانے لگی۔

کرشن راؤ شکست کھا چکا تھا' مگر اپنے شیطانی جذبوں کی تسکین کیلئے قہقہے لگانے لگا۔ جب تک سعدیہ خانم بوڑھے راجپوت کے گھر کی حدود سے باہر نہیں نکل گئی اس وقت تک کرشن راؤ کے الفاظ اس کا تعاقب کرتے رہے۔ کرشن راؤ کہہ رہا تھا۔

"کچھ بھی سہی! بھگوان کے ایک پجاری نے ایک مسلمان کو دو سال تک غلامانہ زندگی گزارنے پر مجبور تو کئے رکھا۔ یہی میری فتح ہے اور یہی میرے دیوتاؤں کی برتری ہے۔"

سعدیہ خانم کے پاس اس بے ہودہ دعوے کے بہت سے جوابات تھے' مگر اس نے اپنی سماعتوں پر پہرے بٹھا دیئے اور باوقار خاموشی کے ساتھ اپنے گھر واپس آ گئی۔

سعدیہ خانم کے لئے کرشن راؤ کی ملازمت ترک کر کے بیروزگار ہو جانا بظاہر ایک بہت بڑا حادثہ تھا...... مگر وہ اس حادثے کے گزر جانے پر بہت خوش اور مطمئن نظر آ رہی تھی۔ یہ اسکی آزمائشی زندگی کا ایک اور بڑا امتحان تھا...... لیکن خدا نے اسے اس امتحان میں بھی سربلند رکھا تھا' جب سعدیہ خانم نے مولانا شمس الدین کو یہ واقعہ سنایا تو وہ بہت دیر تک اپنے خیالات میں گم بیٹھے رہے۔ پھر سعدیہ خانم کو مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگے۔

"بیٹی! ابھی اس بت خانہ ہند میں اہل ایمان کو بڑی آزمائشوں سے گزرنا ہے خدا تمہیں اس وادی پرخار میں ثابت قدم رکھے ابھی ان کانٹوں کی پیاس بجھانے کیلئے بڑے آبلے درکار ہوں گے۔" مولانا شمس الدین بہت کھوئے کھوئے نظر آ رہے تھے۔ ان کی باتوں کا انداز ایسا تھا جیسے وہ اپنے آپ سے گفتگو کر رہے ہوں۔

سعدیہ خانم کو مولانا شمس الدین کی موجودگی سے ایک عجیب سا اطمینان قلب حاصل تھا...... مگر وہ لمحے بڑے اذیت ناک تھے جب چند روز کے بعد مولانا شمس الدین بھی دنیا سے رخصت ہو گئے۔ مولانا اچانک بیمار ہوئے اور یکایک چل بسے۔ زندگی سے موت تک بڑا مختصر سا سفر تھا جسے مولانا نے ہنستے ہوئے طے کر لیا...... مگر آخری سانسیں لینے سے پہلے وہ سعدیہ خانم اور شجاع الدین کامران کو دیکھ کر بہت روئے تھے۔ خود ان کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس لئے ساری محبتیں سعدیہ خانم اور کامران کیلئے وقف کر دی تھیں۔ انتقال سے پہلے مولانا شمس الدین نے اپنی شریک حیات کو وصیت کی تھی کہ وہ سعدیہ اور کامران کا بہت خیال رکھیں۔ یہ خیال اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ وہ ان دونوں ماں بیٹے کو اپنے آپ سے دور نہ کریں...... ورنہ مولانا شمس الدین کے گھر میں بھی فاقہ کشی کے سوا کیا رکھا تھا؟

سعدیہ خانم کی فکر انگیز تنہائیاں کچھ اور بڑھ گئیں۔ دو وقت کی روٹی کا مسئلہ...... مولانا شمس الدین کی بزرگانہ شفقتوں سے محرومی کا مسئلہ...... یہ تین بنیادی مسائل تھے جو سعدیہ خانم کے سامنے سر اٹھائے کھڑے تھے۔ روٹی کا

مسئلہ فی الوقت اتنا سنگین تھا کہ سعدیہ خانم نے کرشن راؤ کی دو سالہ ملازمت کے دوران تھوڑا بہت پس انداز کر
جس کے سہارے دو چار ماہ بسر کئے جا سکتے تھے...... لیکن مولانا شمس الدین کی بے وقت موت نے کامران کی تع
تربیت کے سلسلے میں بڑی سنگین صورت حال پیدا کر دی تھی۔ یہ مولانا شمس الدین ہی تھے جو اپنا قیمتی وقت ضا
کے ایک بگڑے اور سہمے ہوئے بچے کو دوبارہ جرأت و ہمت کے دائرے میں کھینچ لانا چاہتے تھے...... ورنہ دنیا
کے اتنی فرصت تھی جو ایک معتوب عورت کے مسائل پر سوچنے کی زحمت بھی گوارا کر سکے۔

پھر ایسا ہی ہوا۔ مولانا شمس الدین کی موت کے بعد کامران اس قید و بند سے بھی آزاد ہو گیا۔ مولانا کی بیو
کچھ دن تک اپنے شوہر کی وصیت پر عمل کرنے کی کوشش کی مگر کامران کے دل و دماغ پر کسی کو کوئی گرفت حاصل
تھی۔ وہ دوبارہ اپنی دہشت اور سرکشی کے اسی خول میں بند ہو گیا جس سے نکالنے کیلئے مولانا شمس الدین نے دو
تک شدید محنت کی تھی۔

پھر چند روز بعد کامران کی تعلیم کا یہ برائے نام سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ مولانا شمس الدین کی بیوہ کے ایک
اپنی بہن کی تنہائی کا خیال کر کے انہیں اپنے گھر لے گئے۔ اس نیک سیرت عورت نے چلتے وقت سعدیہ خانم
بھی کہ دوری کے باوجود یہ قربتیں قائم رہیں گی ...... مگر ایسا ممکن نہیں تھا۔ مولانا شمس الدین کے برادر نسبتی کا م
سعدیہ خانم کے گھر سے اس قدر فاصلے پر تھا کہ وہ مہینے میں بمشکل ایک یا دو بار ہی وہاں جا سکتی تھی۔ اس طرح یہ
قائم رہتے ہوئے بھی ختم ہو گیا...... اور سعدیہ خانم ایک مرتبہ پھر تنہا رہ گئی۔

❊❊❊

مولانا شمس الدین کے انتقال کے تین ماہ بعد سیاست کی بساط پر ایک اور ہنگامہ برپا ہوا۔ اقتدار کے بڑ
بڑے مہرے زیر و زبر ہو کر رہ گئے۔ وزیر نظام الملک نے سلطان معز الدین بہرام شاہ کے خلاف سازش کی اور
فتنہ انگیز چالوں سے اس نے دوسرے امراء کو بھی بدظن کر دیا۔ یہاں تک کہ تمام امرائے سلطنت اپنی فوجوں
ساتھ دہلی کی طرف روانہ ہوئے اور بہرام شاہ کا محاصرہ کر لیا۔ تقریباً ساڑھے تین ماہ تک شاہ کی وفادار فوجوں اور
لشکروں کے درمیان جنگ ہوتی رہی' بہت ممکن تھا کہ بہرام شاہ اس آفت ناگہاں کے گرداب سے نکل جاتا' مگر ا
کے ساتھ رعایا کی اکثریت بھی اس کے خلاف ہو چکی تھی۔ نتیجتاً سلطان کے سپاہی مسلسل پسپا ہوتے چلے گئے اور
عذاب کا وہ شعلہ بار بھی آ گیا جب بہرام شاہ کے تاج و تخت میں آگ لگ گئی۔ نظام الملک کی سازش کامیاب
اور اس نے آگے بڑھ کر بہرام شاہ کو زنجیریں پہنا دیں۔

کچھ دن تک معزول سلطان زنداں کے اندھیروں میں اپنی شکستہ زندگی کی منتشر سانسیں شمار کرتا رہا۔ ابتداء
باغی امراء کا خیال تھا کہ معز الدین بہرام شاہ کو ایک قیدی کی حیثیت سے زندہ رکھا جائے' مگر بعد میں اسے ل
راستے کا کانٹا سمجھ کر قتل کر دیا گیا۔

ایک رات وزیر نظام الملک چند سپاہیوں کے ہمراہ قید خانے میں داخل ہوا۔ اس وقت سلطان بہرا
زنجیریں پہنے گداگروں کی مانند زنداں کی دیوار سے پشت ٹیکے بیٹھا تھا۔ سپاہیوں کے بھاری قدموں کی آواز سن
گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔

نظام الملک پر نظر پڑتے ہی بہرام شاہ نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔ ''کیا میرا قصور معاف کر دیا گیا؟ مجھے یقی
کہ میری طرف سے تمہارے دل نرم ہو جائیں گے اور میں بہت جلد دن کا اجالا دیکھ سکوں گا۔ زنداں کے ان ک
اندھیروں میں میرا دم گھٹا جا رہا ہے۔ نظام الملک! مجھے باہر لے چلو میں تمہارے اقتدار کی سرحدوں سے بہت دو

[دو]ں گا۔'' سلطان بہرام شاہ صورت حال کو سمجھے بغیر ہذیانی انداز میں گفتگو کر رہا تھا۔

''ہاں! آج کی رات یہ آہنی زنجیریں تیرے ناکارہ جسم کا ساتھ چھوڑ دیں گی۔'' نظام الملک کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ رقصاں تھی۔

''تو پھر کاٹ دے ان زنجیروں کو...... تجھے تیری نمک خواریوں کی قسم۔'' سلطان بہرام شاہ نے اپنے دونوں [ہاتھ اس] طرح بلند کئے جیسے کسی فاقہ کش بھکاری نے روٹیاں تقسیم کرنے والے شخص کے آگے اپنا کشکول بڑھا دیا ہو۔

نظام الملک نے اپنے ایک سپاہی کو اشارہ کیا۔ سپاہی نے اپنی شمشیر بے نیام کی اور بہرام شاہ کے ہاتھوں کی [زنجیرو]ں پر ایک بھرپور وار کیا۔ فولاد سے فولاد ٹکرایا تو قید خانے کی نیم تاریک فضا میں چنگاریاں ناچنے لگیں اور تلوار کی [د]ھار مڑ گئی۔

''نظام الملک! انہیں اپنے ہاتھوں سے کھول دے۔'' بہرام شاہ نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

''نہیں! میرے محترم فرمانروا! یہ ایک سلطان کے ہاتھوں میں پڑی ہوئی زنجیر ہے شاہ کے مراتب کا لحاظ رکھتے [ہوئ]ے اسے کسی سپاہی کی شمشیر ہی کاٹ سکتی ہے۔'' وزیر نظام الملک کے ہونٹوں سے مسلسل نفرت و تحقیر کی بارش ہو [رہی تھ]ی لیکن گردش وقت نے سلطان بہرام شاہ کی آنکھوں پر گہرے پردے ڈال دیئے تھے۔

پھر دوسرے سپاہی نے اپنے بازوؤں کی قوت آزمائی یہاں تک کہ زنجیر کٹ گئی۔

''اب میں آزاد ہوں؟'' سلطان معزالدین بہرام شاہ بچوں کی طرح خوش نظر آرہا تھا۔

''سلطان عالی قدر! آزادی اتنی آسانی سے نہیں ملتی۔'' نظام الملک ایک بار پھر مسکرایا۔

بہرام شاہ چونک اٹھا۔ پہلی مرتبہ اسے احساس ہوا کہ کوئی نیا عذاب اس کے گرد اپنا دائرہ تنگ کر رہا ہے۔ ''آخر [تو کیا ک]ہنا چاہتا ہے نظام الملک۔'' بہرام شاہ کی آواز میں ہلکی ہلکی لرزش تھی۔

''میں نے سلطان سے یہی وعدہ تو کیا تھا کہ آج کی رات یہ زنجیریں ایک ناکارہ جسم کا ساتھ چھوڑ دیں گی۔'' [نظ]ام الملک بڑے عیارانہ انداز میں بہرام شاہ کو اذیت پہنچا رہا تھا...... ''میری زبان سے ادا ہونے والا ایک ایک لفظ [...]ہے...... اور سلطان خوب جانتے ہیں کہ میں اپنے عہد کا کس قدر پابند ہوں۔'' نظام الملک حرفوں کے نشتر سے [بہرام ش]اہ کی شہ رگ کاٹ رہا تھا۔

''تو جھوٹ بولتا ہے نمک حرام۔'' سلطان بہرام شاہ اپنے غدار وزیر کے تیور دیکھ کر چیخ اٹھا ...''میں سمجھتا تھا [ک]ہ شاید تو اپنے گناہوں سے تائب ہو گیا ہے۔''

''آپ کا اندازہ غلط تھا سلطان ذی وقار!'' نظام الملک کی سازشوں کے ترکش نے طنز کا ایک نیا تیر چھوڑا اور [ب]ہرام شاہ کے سینے میں پیوست ہو گیا۔ ''صرف قیاسات اور اندازوں پر حکومت نہیں کی جا سکتی۔ میں کل بھی نمک حرام [تھ]ا اور آج بھی اسی صفت کا مالک ہوں۔ مجھ میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے مگر چند لمحوں کے بعد آپ کی تقدیر [بد]ل جائے گی۔'' یہ کہہ کر نظام الملک نے اپنے سپاہیوں کو اشارہ کیا۔

[ب]یک وقت کئی شمشیریں بے نیام ہوئیں اور سلطان بہرام گھبرا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ زنداں کے ایک طویل و [ع]ریض کمرے میں چکر لگا رہا تھا اور نظام الملک کے سپاہی سست رفتاری سے اس کا تعاقب کر رہے تھے۔ یہ ایک [د]لچسپ تماشا تھا جو کچھ دیر جاری رہا۔ پھر جب سلطان بہرام شاہ تھک کر زمین پر گر گیا تو فرشتگان اجل اس کے قریب [پہن]چ گئے۔

بہرام شاہ نے ہاتھ جوڑ کر نظام الملک سے بخشش کی درخواست کی اور رو رو کر زندگی کی بھیک مانگی ...... مگر

سانسوں کا کھیل ختم ہو چکا تھا۔ ایک سپاہی کی تلوار فضا میں لہرائی اور سلطان بہرام شاہ کی گردن کٹ کر دور جا گری۔
سعدیہ خانم نے بہرام شاہ کے قتل کی خبر سنی تو چند ساعتوں کے لئے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی سانسیں رک گئی ہوں۔ پھر جب ان جذباتی لمحات کا طلسم ٹوٹا تو وہ زار و قطار رونے لگی۔ رائے نعیم الدین ذیشان کا قاتل آج خود بھی اپنے خون میں نہایا ہوا بے دست و پا پڑا تھا اور شاہی گورکن اس کی قبر کھود رہے تھے۔
سعدیہ خانم شجاع الدین کامران کو سینے سے لگائے ہوئے رو رو کر کہہ رہی تھی۔
''بیٹے! تیرے باپ کا قاتل آج اس دنیا میں نہیں رہا۔ اسے بھی کسی نے قتل کر دیا۔''
اس خبر سے شجاع الدین کامران بہت خوش ہوا اور اس نے بے اختیار اپنی ماں سے پوچھا۔
''اب کیا ابو جان واپس آ جائیں گے؟'' یہ بڑا معصومانہ سوال تھا جس نے سعدیہ خانم کو مزید اشکبار کر دیا۔ وہ بہت دیر تک سکتے کے سے عالم میں بیٹھی رہی۔ پھر جب کامران نے ماں کو پکارتے ہوئے اپنا سوال دہرایا تو سعدیہ خانم ہوش کی دنیا میں لوٹ آئی۔
وہ شدید وحشت زدہ انداز میں ایک ہی بات کہہ رہی تھی...... ''جانے والے کبھی واپس نہیں آتے۔ تیرے باپ بھی واپس نہیں آئیں گے۔ چاہے ساری دنیا ہی قتل کیوں نہ ہو جائے۔''
ماں کا یہ مایوس کن جواب سن کر شجاع الدین کامران بھی رونے لگا اور پھر بہت دیر تک اس ویران کھنڈر میں مجلس گریہ و زاری برپا رہی۔

***

معز الدین بہرام شاہ کے قتل سے سعدیہ خانم کو صرف اتنا فائدہ پہنچا کہ وہ شاہی حلقۂ عتاب سے باہر نکل آئی تھی۔ زمانہ پرست محلے دار اور پڑوسی ان دو سالوں میں پہلی بار اس کے گھر آئے تھے اور اپنی اپنی مجبوریاں بیان کر رہے تھے۔ سعدیہ خانم کے پاس کہنے کے لئے تو بہت کچھ تھا' مگر اس نے بڑے حوصلے کے ساتھ اپنے ہونٹوں کو سی لیا...... اور اگر کچھ کہا بھی تو بس یہ کہ اسے محلے والوں سے کوئی شکایت نہیں جب ماں باپ ہی نے اولاد کی محبت کو دربار شاہی میں فروخت کر دیا تو پھر...... کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی۔
انتہائی قوت برداشت کا مظاہرہ کرنے کے باوجود سعدیہ خانم پر وہ وقت بہت گراں تھا جب سلطان بہرام شاہ کے قتل کے بعد دوسرے لوگوں کی طرح باپ اعتماد خان اور ماں بلقیس خانم بھی اس کی پرسش حال کیلئے آئے۔ وہ دونوں بھی وقت کی نزاکت کے ساتھ اپنی مجبوریاں بیان کر رہے تھے...... سعدیہ خانم نے ماں باپ کے احترام کی روایت کو زندہ رکھا مگر ان کی کسی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔
پھر جب ان دونوں نے اپنی بیٹی کو یہ پیشکش کی کہ وہ اس کے کھنڈر کو دوبارہ تعمیر کرا سکتے ہیں...... اور گزر اوقات کیلئے کچھ ماہانہ رقم بھی دے سکتے ہیں تو وہ خاموش نہ رہ سکی۔
''اس کا وقت گزر چکا۔ آپ میرے لئے اپنے پرسکون ذہنوں کو پریشان نہ کریں کہ پھر کوئی دوسرا شاہ تخت دہلی پر نمودار ہو گا اور آپ اس کی وفاداریوں سے مجبور ہو کر پھر اپنی بیوہ بیٹی اور یتیم نواسے کو فراموش کر دیں گے۔ میرا اور میرے بچے کا خیال چھوڑ دیں' ایک سعادت مند بیٹی امیر و کبیر باپ کو یہی مشورہ دے سکتی ہے کہ وہ ہر حال میں اپنے آرام و آسائش سے وفادار رہیں۔''
ماں باپ دونوں شرمسار تھے اور سعدیہ خانم کو اس بات پر رضامند کرنا چاہتے تھے کہ وہ کسی نہ کسی طرح ان کی امداد قبول کر لے۔ مگر سعدیہ خانم اپنے ماں باپ کے ذریعے حاصل کئے جانے والے تعاون کے تصور کو بھی جھٹلا چکی

بہت دیر بعد آخر اعتماد خان کی زبان پر دل کی بات آ گئی۔ وہ تھکے تھکے لہجے میں کہہ رہا تھا۔
''بیٹی سعدیہ! خدا نے تمہارے باپ کو عزت بھی دی ہے اور دولت بھی...... میرا محل نما مکان اتنا تنگ نہیں ہے
م اور کامران اس کے کسی گوشے میں نہ سما سکو۔ بات دراصل یہ ہے کہ تمہارا اس مکان میں قیام کرنا ہمارے لئے
ف ثابت نہیں ہوگا۔''
اعتماد خان نے جھجکتے ہوئے دوبارہ اپنا سلسلۂ کلام جوڑ دیا۔ اس کی زبان کی لڑکھڑاہٹ صاف محسوس ہو رہی تھی
وہ کہہ رہا تھا۔
''راج جوتشی (شاہی نجومی) نے مجھے خبردار کیا ہے کہ اگر تمہارے قدم اس گھر میں آئے تو وہ گھر بھی تباہ و برباد
ہو جائے گا۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ دور رہ کر تمہاری کفالت بھی کر سکوں اور اپنے گھر کو بھی تباہی سے بچا لوں۔''
ابھی سعدیہ خانم اپنے باپ کی اس سنگدلانہ بات کا جواب دینے بھی نہیں پائی تھی کہ ماں بلقیس خانم بول اٹھی۔
''ہاں بیٹی! یہی وہ مجبوری ہے جسے ہم تمہارے سامنے بیان کرنا نہیں چاہتے تھے۔''
''مگر اب تو بیان کر چکے۔'' سعدیہ خانم ماں باپ کی باتیں سن کر تلخ انداز میں مسکرانے لگی۔
''تم خود بھی بہت ذہین اور معاملہ فہم ہو۔'' ماں نے بیٹی کی مسکراہٹ کا غلط مفہوم لیا اور پرامید لہجے میں کہنے
لگی۔ ''ہمیں یقین ہے کہ تم وقت کی گردش کو سمجھتے ہوئے ہوش مندی سے کام لو گی۔ ہم بہرحال تمہارا بھلا چاہتے
ہیں۔''
اب سعدیہ خانم کی قوت برداشت جواب دے چکی تھی۔ ''نجومیوں نے آپ کو یہ نہیں بتایا کہ کسی منحوس انسان کی
قربت کرنے سے بھی آدمی پر زوال و بربادی کے سائے منڈلانے لگتے ہیں۔ بات صرف قدموں کی ہے...... میرے قدم
ہوں یا آپ کے قدم...... ان قدموں کا سلسلہ ہمیشہ کیلئے ٹوٹ جانا چاہئے ورنہ تباہی آپ کا مقدر بن جائے گی۔ خدا
کیلئے یہاں سے چلے جایئے...... کل ایک باپ معاشرے میں ذلت کے خوف سے اپنی بیٹی کو زندہ دفن کر دیا کرتا
تھا...... اور آج ایک باپ نجومیوں کے کہنے سے بیٹی کیلئے نئے انداز کی قبر کھودنا چاہتا ہے......'' یہ کہہ کر سعدیہ خانم نے
آسمان کی طرف دیکھا۔ ''اے خدا! تیری وحدانیت اور قدرت لازوال پر گواہی دینے والے یہ کیسے بندے ہیں جو
اب تک اپنی آستینوں میں بت چھپائے ہوئے ہیں۔ مجھے ان کے سائے سے بھی محفوظ رکھ۔''
اس کے بعد اعتماد خان اور بلقیس خانم نے اپنی بیٹی کو سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر اس غیرت مند خاتون نے
صاف صاف کہہ دیا کہ زندگی کو برقرار رکھنے کیلئے بھیک قبول کرنا اس کا مزاج نہیں ہے۔
بالآخر اعتماد خان اور بلقیس خانم واپس چلے گئے۔ وہ اس بے وفا دنیا کی ایک رسم نبھانے کے لئے آئے تھے۔
جب وہ رسم ادا ہو گئی تو بیٹی اور نواسے کو حالات کے اسی مقبرے میں اسی طرح چھوڑ کر چلے گئے۔

❋❋❋

وقت تیزی سے گزرتا رہا۔ سلطان معز الدین بہرام شاہ کے قتل کے بعد چند روز کے لئے اعز الدین تخت شاہی پر جلوہ افروز ہوا اور اس نے سارے شہر میں اپنے اقتدار کا اعلان کرا دیا۔ اعز الدین کو امرائے سلطنت میں سے صرف نظام الملک کی حمایت حاصل تھی کہ وہ اس دور کا سب سے بڑا ابن الوقت تھا اور ہر آنے والے حکمراں کو سجدہ ریز ہو کر سلام کرتا تھا۔ دوسرے سرداران اقوام اعز الدین سے شدید نفرت کرتے تھے۔ وہ عقل و دانش اور اخلاق ظاہری سے محروم ایک انتہائی کم ظرف انسان تھا۔ کسی امیر کو بھی اس کا اقتدار گوارہ نہیں تھا مگر وہ سب کے سب وقت کی چالوں کے آگے مجبور تھے۔ بساط اقتدار خالی پڑی تھی اور انہیں سیاست کا کھیل جاری رکھنے کے لئے کوئی مناسب مہرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ آخر طویل غور و فکر کے بعد امرائے دربار نے اپنی ضرورت کی فوری تکمیل کے لئے کئی خفیہ اجلاس منعقد کئے پھر ان اجلاسوں میں یہ بات طے پا گئی کہ کوئی متبادل حکمراں تلاش کر کے اعز الدین جیسے کمینے شخص سے نجات حاصل کر لی جائے۔

اس وقت سلطنت ہند کے جائز وارث اور سلطان شمس الدین التمش کے دو بیٹے شہزادہ ناصر الدین اور شہزادہ جلال الدین اسیری کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ سلطان رکن الدین فیروز شاہ کا بیٹا علاؤ الدین مسعود بھی زنداں کے اندھیروں میں اپنی بدنصیبیوں کا ماتم کر رہا تھا۔ مجبوراً تمام امرائے سلطنت نے باہمی مشوروں کے بعد تینوں شہزادوں کو قید خانے سے باہر نکالا اور حکمرانی کے لئے علاؤ الدین مسعود کا انتخاب کر لیا۔

کردار کے اعتبار سے التمش کا بیٹا ناصر الدین محمود ایک مثالی انسان تھا۔ اس کے بعد شہزادہ جلال الدین کی شخصیت بھی کشش انگیز تھی، لیکن امراء نے حیرت ناک طور پر التمش کے پوتے علاؤ الدین مسعود کو دونوں امیدواروں پر ترجیح دی۔ شاید اس لئے کہ بے کردار اور کم نظر ہونے کے سبب علاؤ الدین مسعود کسی حیل و حجت کے بغیر ان کے ہاتھوں کا کھلونا بن سکتا تھا۔ الغرض چند روزہ نام نہاد حکمرانی کے بعد اعز الدین برطرف کر دیا گیا اور علاؤ الدین مسعود ہندوستان کا نیا حکمران قرار پایا۔ نظام الملک سلطان بہرام شاہ کے قتل میں پیش پیش تھا۔ نتیجتاً بہت آسانی کے ساتھ وزارت عظمیٰ کے عہدے پر فائز ہو گیا۔

نظام الملک فطری طور پر ایک شوریدہ سر، فریب کار اور خود غرض انسان تھا۔ اس لئے بہت جلد سلطان علاؤ الدین مسعود کے اعصاب پر مسلط ہو گیا اور من مانے انداز میں حکومت کرنے لگا۔ ایک بار پھر دوسرے امرائے سلطنت نے اپنی ذلت محسوس کی اور نظام الملک کو بساط سیاست سے ہٹانے کے لئے تدبیریں کرنے لگے۔ انجام کار 2 جمادی الاول 640ھ کو نظام الملک بھی اس طرح قتل کر دیا گیا کہ وہ اپنے آخری لمحات میں زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا ...... اور خنجر بیداد بڑے سفاکانہ انداز میں اس کی شہ رگ پر رواں تھا۔

سلطان علاؤ الدین مسعود اپنے دونوں چچاؤں کے ساتھ نہایت عزت و تکریم سے پیش آیا۔ پھر کچھ دن بعد ہی

ناصر الدین محمود کو صوبہ بہرائچ کا اور جلال الدین کو قنوج کا حاکم مقرر کر دیا گیا۔

642ھ میں مغلوں نے سندھ کے نواح پر حملہ کیا اور اوچ کا محاصرہ کر لیا۔ سلطان علاؤ الدین مسعود وقت ضائع کئے بغیر اپنے امیروں کے ہمراہ اوچ کی طرف بڑھا۔ جب شاہی لشکر دریائے بیاس کے کنارے پہنچا تو مغل اوچ کے قلعے کا محاصرہ ختم کر کے جنگل کی طرف فرار ہو گئے۔ علاؤ الدین مسعود نے اس واقعے کو اپنی بلند اقبالی سے تعبیر کیا...... کچھ مصاحبوں اور خوشامدیوں نے بھی ہوا دی۔ جس کے نتیجے میں علاؤ الدین مسعود نے زمین چھوڑ کر فتوحات کے آسمانوں میں پرواز شروع کر دی۔ اسی کامرانی کے نشے میں وہ دہلی واپس آیا۔ اگرچہ سیاست کے میدان میں یہ کوئی بڑی فتح نہیں تھی مگر علاؤ الدین کم ظرف تھا۔ اس لئے نصرت کے جام سے قطرے پیتے ہی چھلک اٹھا۔ غرور کی تیز لہر نے اس کے دل کو بھی تاریکیوں کے گرداب میں الجھا دیا اور ذہن کو بھی پستیوں کی دلدل میں غرق کر دیا۔ اقتدار کا پہلا سال ہی علاؤ الدین مسعود کو راس نہیں آیا۔ بدکردار خوشامدی بہت تیزی سے اس کے گرد حصار کھینچنے لگے۔ پھر اہل دربار نے علاؤ الدین مسعود کو راتوں رات بدلتے ہوئے دیکھا۔ اب وہ تسخیر و فتح کے منصوبے بنانے والا سلطان نہیں، ایک عیش پرست حکمران تھا۔ دن رات شراب کے نشے میں ڈوبا رہتا اور اس کے مضطرب ہاتھ سیم تن عورتوں کے ریشمی آنچلوں سے کھیلتے رہتے۔ خاندان التمش کے چند وفاداروں نے علاؤ الدین مسعود کو تباہی کے راستے پر جانے سے روکنے کی کوشش کی تو وہ غضب شاہی کا نشانہ بن گئے۔ انہیں سرکاری ملازمتوں سے برطرف کر دیا گیا۔ جو لوگ شاہ کی ہمدردی میں اعتدال سے آگے بڑھ گئے تھے ان کی زبانیں کاٹ دی گئیں یا پھر انہیں حوالہ زنداں کر دیا گیا۔

علاؤ الدین مسعود کے کردار میں بڑی خوفناک تبدیلیاں واقع ہو گئی تھیں۔ صلہ رحمی ماضی کی ایک بے اثر داستان بن گئی تھی اور عدل و انصاف محض افسانے تھے۔ جب مظلوموں کی جماعت علاؤ الدین کے دروازے پر گریہ وزاری کرتی تو وہ انتہائی قہرناک انداز میں چیخ اٹھتا۔

"ان بے ادبوں اور گستاخوں سے کہہ دو کہ ہماری سماعتیں ایسے شور کی عادی نہیں۔"

کوئی ستم رسیدہ انصاف طلب کرتا تو علاؤ الدین مسعود اپنے خدمت گاروں کو حکم دیتا۔

"انصاف کے تمام دروازے بند کر دو۔ بس ایک ہی دروازہ کھلا رکھو۔ ہمارے عشرت کدے کا دروازہ۔"

اب علاؤ الدین مسعود کا ایک ہی کام تھا کہ وہ دوسروں کی جائیدادوں پر غاصبانہ قبضہ کر کے اپنے ذاتی خزانے کا منہ بھر دے۔ شراب نوشی، ہوس کوشی اور دولت پرستی نے سلطان کو انسانی سطح سے گرا کر خون آشام درندہ بنا دیا۔ سینے میں رحم کی قندیل بجھی تو ظلم و ہوس کے آتش کدے روشن ہو گئے۔ پھر ان آتش کدوں نے اس کے اقتدار کو جلا ڈالا اور ہندوستان کا گوشہ گوشہ فتنہ و فساد سے بھر گیا۔

اس سنگین موقع پر اسلامی سلطنت کے بہی خواہوں نے ایک بار پھر اپنی اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر سیاسی معاملات میں مداخلت کی۔ ایک بار پھر خفیہ اجلاس منعقد ہوئے اور سلطان علاؤ الدین کی معزولی کا فیصلہ کر لیا گیا۔

باغی امراء نے علاؤ الدین مسعود کے حقیقی چچا اور سلطان شمس الدین التمش کے سب سے چھوٹے بیٹے ناصر الدین محمود کے پاس ایک قاصد بھیجا اور اس سے درخواست کی کہ وہ جلد از جلد دہلی پہنچ جائے۔ ناصر الدین محمود کو جب اپنے بھتیجے کے حالات کا علم ہوا اور اس نے سرائے سلطنت کو اپنی موافقت میں پایا تو وہ کسی تاخیر کے بغیر بہرائچ سے دہلی روانہ ہو گیا۔

وقت نے ایک اور کروٹ لی اور 26 محرم 644ھ کو سلطان علاؤ الدین مسعود کے اقتدار کا خاتمہ ہو گیا جس نے

انصاف کے دروازے بند کرنے کا حکم دیا تھا' اس پر عزت و وقار کے تمام دروازے بند ہو گئے۔ اب وہ زنداں کے اندھیروں میں ایڑیاں رگڑ رہا تھا اور دوسری طرف ناصر الدین محمود کے سر پر تاج شاہی سجایا جا رہا تھا۔

کچھ دن بعد حالت اسیری ہی میں علاؤ الدین مسعود کو موت آ گئی۔ اس نے چار سال اور ایک مہینے اس طرح حکومت کی کہ وہ ظالم و غاصب کہلایا اور اس کے نامہ اعمال میں کوئی نیکی تحریر نہیں کی گئی۔

❋❋❋

ان سیاسی انقلابات سے سعدیہ خانم کی زندگی کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ صرف ایک پریشان حال بیوہ تھی اور اسے اسی عالم میں ساری زندگی بسر کرنا تھی۔ سلطان معز الدین بہرام شاہ کے قتل سے اسے بس ایک ہی فائدہ پہنچا تھا کہ شاہی معتوب ہونے کے سبب جن اہل شہر نے اس پر اپنے گھروں کے دروازے بند کر دیئے تھے اب وہی لوگ رسم دنیا نبھانے کے لئے کبھی کبھی اس کی خیریت دریافت کر لیا کرتے تھے۔ سعدیہ خانم نے ''ترک تعلقات'' پر نہ کوئی شکایت کی تھی اور نہ ''تجدید تعلقات'' پر کسی خوشی کا اظہار کیا تھا۔ وہ شوہر کی موت کے بعد بھی محنت و مزدوری کرتی تھی اور دس سال گزرنے کے بعد بھی یہی مشقت اس کی تقدیر تھی۔

آسمان بھی وہی تھا اور زمین بھی وہی...... مگر سعدیہ خانم کی اذیتوں میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اپنے بیٹے شجاع الدین کامران کا مستقبل سنوارنے کے لئے اس نے جس قدر کوششیں کی تھیں' وہ سب کی سب رائیگاں گئی تھیں۔ کامران اب دس گیارہ سال کا ہو چکا تھا۔ سعدیہ خانم سمجھی تھی کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی اصلاح ہو جائے گی مگر وہ لحظہ بہ لحظہ بگڑتا ہی جا رہا تھا۔ سعدیہ خانم چاہتی تھی کہ اس کا بیٹا زیادہ نہیں تو اتنی تعلیم ضرور حاصل کر لے جو اسے انسان بنانے میں معاون ثابت ہو لیکن کامران کا دل کتابوں سے اس قدر اچاٹ ہو گیا تھا کہ وہ اکثر و بیشتر مکتب سے فرار ہو کر محلے کے شریر بچوں کے ساتھ فضول کھیلوں میں مشغول ہو جاتا تھا۔ کامران کی یہ روش دیکھ کر سعدیہ خانم لرز اٹھی تھی۔ پھر اس نے بگڑتی ہوئی اولاد کو سنوارنے کے لئے سختیاں بھی کیں مگر کامران کے رویے میں اچانک ایک بڑی تبدیلی آ گئی تھی۔ جب سعدیہ خانم نے اسے جارحانہ انداز میں تنبیہ کی تو ایک دن وہ کھلی ہوئی بغاوت پر اتر آیا۔

''کیا آپ یہ چاہتی ہیں کہ میں گھر چھوڑ کر چلا جاؤں۔''

کامران کی سرکشی دیکھ کر سعدیہ خانم رونے لگی۔ ''کیا تو بھی اپنی ماں کو چھوڑ کر چلا جائے گا؟'' سعدیہ خانم کے لہجے میں بڑا کرب تھا' بڑی محرومی تھی۔

''اگر آپ مجھے مکتب میں بھیجیں گی تو میں گھر چھوڑ کر چلا جاؤں گا......'' ایک باغی بیٹے نے مظلوم ماں کے ساتھ رہنے کے لئے عجیب شرط پیش کر دی تھی۔

سعدیہ خانم نے مصلحتاً کامران کی اس شرط کے آگے اپنا سر پر غرور جھکا دیا کہ بیٹے کے سوا دنیا میں اس کا کوئی سہارا نہیں تھا۔ سعدیہ خانم نے بارہا یوں بھی سوچا کہ وہ کامران کی محبت کے سامنے خم ہونے سے انکار کر دے مگر اس طرح گمراہی کے کئی راستے کھل جاتے۔ بالآخر وہ مجبور ہو گئی اور اس نے کامران کو عاجزی کے لہجے میں صرف نصیحتوں کے ذریعے راہ راست پر لانے کی کوشش کی لیکن باپ کی محبتوں سے محروم اور زمانے کا جارحیت کا شکار بچہ جب ایک بار توازن کی راہ سے بچھڑا تو پھر بھٹکتا ہی چلا گیا۔

❋❋❋

[illegible] سلطان ناصر الدین محمود جلوہ افروز تھا۔

اس رحم دل اور نیک سیرت حکمران نے تاریخ ہند میں محبت و رواداری اور عدل و انصاف کے نئے باب روشن کئے تھے مگر سعدیہ خانم کی قسمت پر مسلسل تاریکیاں چھاتی جا رہی تھیں۔ اس کی زندگی کی روشنی شجاع الدین کامران کے مستقبل سے وابستہ تھی اور کامران کا مستقبل اندھیروں میں ڈوبتا جا رہا تھا۔

پھر دس سال اور گزر گئے۔ اس طویل عرصے میں وقت نے سعدیہ کے دل پر عجیب عجیب زخم سجائے۔ ماں اور باپ دونوں فالج کا شکار ہو کر دنیا سے رخصت ہو گئے۔ جس گھر کو تباہی سے بچانے کے لئے انہوں نے نجومیوں کی پیش گوئی پر عمل کیا تھا' وہی گھران دونوں کے لئے قبر بن گیا۔ بیماری کے دوران سعدیہ خانم ماں باپ کی عیادت کے لئے گئی مگر اس طرح کہ ملازمین کے ذریعے اپنے جذبات منتقل کر کے باہر ہی سے واپس چلی آئی۔ گھر کے اندر وہ اپنے منحوس قدم رکھنا نہیں چاہتی تھی کہ بہرحال اسے اپنے میکے کی سلامتی عزیز تھی۔ پھر جب ماں باپ نے اپنے خدمت گاروں سے کئی مرتبہ کہلوایا کہ وہ مرنے سے پہلے اسے دیکھنا چاہتے ہیں تو سعدیہ خانم اس انداز سے اپنے آبائی مکان میں داخل ہوئی کہ اس نے وہاں کا پانی پینا بھی گوارہ نہیں کیا۔

اب یاسمین بھی جوان ہو چکی تھی۔ پہلی بار جب کامران اپنی ماں کے ساتھ نانی نانا کے گھر گیا تو اس نے یاسمین خانم کو بدلی ہوئی حالت میں دیکھا۔ بچپن دونوں کو جذبات کی ایک عجیب سرحد پر چھوڑ کر ماضی کے غبار میں گم ہو گیا تھا۔ جس سے ملنے کے لئے کامران صحرائے بے آب میں کسی پیاسے کی طرح ترستا تھا' جس کی خاطر اس نے قریب ترین رشتوں کی نفرتیں برداشت کی تھیں' اپنے رخساروں پر نانا اور ماموں کی انگلیوں کے نشانات محفوظ کئے تھے' آج بچپن کی وہی ساتھی' وہی رفیق اس کے سامنے کھڑی تھی۔

کامران یاسمین کو دیکھ کر بے اختیار ہو گیا......"میں نے تمہارا کتنا انتظار کیا مگر تم ایک بار بھی میرے گھر نہیں آئیں۔" بچپن کی خاموشی کو آج جوانی کا نیا لہجہ مل گیا تھا۔

"کیا تمہیں میری غربت وہاں آنے سے روکتی رہی؟" کامران اس قدر جذباتی ہوا کہ اس کی آنکھیں چھلک اٹھیں۔

یاسمین کامران کی قلبی کیفیات کا یہ تغیر دیکھ کر گھبرا سی گئی۔ "نہیں کامرن! میں غربت و امارت میں کوئی فرق محسوس نہیں کرتی۔" یاسمین کی آواز میں لرزش سی تھی اور آنکھوں میں وہ خوف نمایاں تھا جو کسی کے قدموں کی آہٹ سن کر جاگ اٹھا تھا۔

"تو پھر کیوں نہیں آئیں؟" کامران کے ہونٹ جلنے لگے۔ "ایک بار تو آئی ہوتیں۔ کم سے کم اس دنیا میں رشتوں کا اعتبار تو رہ جاتا۔"

اس سے پہلے کہ یاسمین کامران کی باتوں کا کوئی جواب دیتی' قدموں کی وہ آہٹ قریب تر ہو گئی جس نے چند لمحے پہلے یاسمین کی آنکھوں میں خوف کا گہرا عکس ابھار دیا تھا۔

پھر ایک نفرت آمیز آواز گونجی۔ "یاسمین! تم دوسرے کمرے میں جاؤ۔ یہاں تمہارا کیا کام ہے؟" یہ آواز یاسمین کی ماں کی تھی جس میں ساری دنیا کی رعونت سمٹ آئی تھی۔

سعدیہ خانم نے بڑے بھائی کے رشتے سے اس متکبر عورت کو سلام کیا' مگر وہ کوئی جواب دیئے بغیر یاسمین کے پیچھے پیچھے چلی گئی۔ سعدیہ خانم اس ناروا سلوک کے بعد ایک ساعت کے لئے بھی ماں کے پاس نہ بیٹھ سکی اور کامران کو لے کر اپنے اسی کھنڈر میں واپس آ گئی جس کے درودیوار پر گزشتہ پندرہ سال سے وحشت و حسرت برس رہی تھی۔

پھر کچھ دن بعد وہ دوبارہ اپنے ماں باپ کی مزاج پرسی کے لئے گئی تو یاسمین خانم کامران کے سامنے نہ آسکی۔ اس کی آمد پر پہرے لگا دیئے گئے تھے۔ پھر کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد جب کامران یاسمین کے کمرے میں جانے لگا تو اس کی مغرور ماں راستے میں حائل ہو گئی۔

''تمہارا یاسمین سے پردہ ہے۔ تم اس کے کمرے میں نہیں جا سکتے۔'' قائم خان راجپوت کی بیوی حقارت آمیز سلوک پر اتر آئی تھی۔

''پردہ غیروں سے ہوتا ہے......'' شجاع الدین کامران کی شریانوں میں دوڑنے والا راجپوتی خون بھی حرارت غضب سے جلنے لگا تھا۔ ''میرا اور یاسمین کا ایک دوسرا رشتہ بھی ہے۔ وہی رشتہ پردے کی ان پابندیوں کو قبول نہیں کرتا۔''

''میں نے یاسمین سے تمہارا ہر رشتہ منقطع کر دیا ہے۔'' یاسمین کی ماں غصے کی شدت سے مغلوب ہو کر چیخ اٹھی۔

''رشتے اس طرح نہیں توڑے جاتے......'' اپنی ممانی کا وحشیانہ سلوک دیکھ کر کامران اونچی آواز میں بولنے لگا تھا۔

اسی دوران کامران کا ماموں قائم خان راجپوت بھی اپنے کمرے سے نکل آیا تھا۔ وہ بھی آتے ہی بھانجے پر برس پڑا۔

''کامران! بڑوں کے ساتھ ادب سے بات کرنا سیکھو۔ غربت و افلاس نے تمہیں اخلاقی طور پر بھی دیوالیہ کر دیا ہے۔ اب یہ تمیز بھی باقی نہیں رہی کہ تمہارا مخاطب کون ہے؟''

کامران ماموں کے سامنے شرمسار سا ہو گیا اور سر جھکائے اپنے بیمار نانی نانا کے کمرے کی طرف واپس جانے لگا' مگر اس سے پہلے یاسمین کی ماں وہاں پہنچ چکی تھی۔ اس نے انتہائی درشت لہجے میں سعدیہ خانم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''میں یہاں تمہاری آمد پر کوئی اعتراض نہیں کرتی' مگر آئندہ کامران کے ساتھ تمہارا وجود میرے لئے ناقابل برداشت ہو گا۔''

سعدیہ خانم حیرت و اذیت سے اپنی بھاوج کا چہرہ دیکھنے لگی جس کے ہر تاثر اور ہر زاویے میں نفرت و ذلت کے سوا کچھ نہیں تھا۔

''جب تک میں زندہ ہوں کامران کو یہاں آنے دو۔'' اعتماد خان نحیف آواز میں بولا۔ آخر دل کے کسی بعید ترین گوشے میں سوئی ہوئی نواسے کی محبت بیدار ہو گئی تھی۔ یا پھر موت کے خوف نے اسے اپنا رویہ بدلنے پر مجبور کر دیا تھا۔

''نہیں کامران یہاں نہیں آئے گا۔'' اعتماد خان کی سرکش بہو نے خسر کے تمام تر احترام کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔

''آئے گا......وہ یقیناً آئے گا......اسے یہاں آنے سے کون روک سکتا ہے؟'' آج اعتماد خان اپنے حقیقی لہجے میں بول رہا تھا۔

''وہ اس گھر کی بیرونی حدود میں بھی داخل نہیں ہو سکتا۔ یہ چار دیواری اس پر حرام ہے۔'' یاسمین کی ماں کا غصہ اپنے عروج پر تھا۔ ''یہ میرا گھر ہے......اور صاحب خانہ کی اجازت کے بغیر کسی کو یہاں آنے کا حق حاصل نہیں ہے۔'' اس نے بڑے تحقیر آمیز لہجے میں اپنے خسر کو تنبیہ کی۔ ''اگر آپ کو اپنے نواسے سے ملنا ہے تو کوئی اور ٹھکانہ ڈھونڈ

لیجئے۔"

یہ ایک مفلوج انسان کے لئے بڑا طعنہ تھا۔ اعتماد خان کے فالج زدہ جسم پر کیا گزری' اس کا تو کوئی اندازہ نہیں کر سکا مگر اس کی آنکھیں اشک برسا کر اپنے بیٹے قائم خان راجپوت سے احتجاج کرنے لگیں جو اپنی بیوی کے پیچھے خاموش کھڑا تھا۔ یہ صورتحال سعدیہ خانم کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ وہ شدید کرب کے عالم میں اٹھی اور قائم خان کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔

"بھائی صاحب! میں آپ کے اس سلوک کا شکوہ نہیں کرتی جس کا ذکر کرتے ہوئے میرے دشمن بھی شرما جاتے ہیں۔ مگر ان محترم ہستیوں کے جذبات کا تو خیال کیجئے جنہیں ہمارے رویے مسلسل آزار پہنچا رہے ہیں' میں اس گھر میں قدم رکھنا تو کجا' اس طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتی۔ یہ تو میرے ماں باپ کی بیمار زندگی ہے جو مجھے اس نفرت کدے میں کھینچ لاتی ہے۔ آپ مطمئن رہیں! کامران آئندہ اس گھر میں نہیں آئے گا۔"

"ہم یہی چاہتے ہیں ......" قائم خان نے اپنی مظلوم بہن کے ہر جذبے کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "تمہارے یہاں آنے پر کسی کو کوئی اعتراض نہیں لیکن کامران کی موجودگی ہم سب کے لئے ناقابل برداشت ہے۔"

"سب کی بات نہ کیجئے ......" سعدیہ خانم بھی خاموش نہ رہ سکی۔ صرف اپنا اور بھابی کا نام لیجئے کہ ان آنکھوں میں کامران کی زندگی کانٹے کی طرح کھٹکتی ہے۔"

"یوں ہی سمجھ لو ......" قائم خان کے بجائے اس کی بیوی کہنے لگی۔ "بہتر ہے کہ تم کامران کے قدموں کو اس طرف آنے سے روک دو۔ اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔" یاسمین کی ماں نے دبے لفظوں میں ایک ایسی صورت حال کی طرف اشارہ کیا تھا جو بہت زیادہ خوفناک تھی۔

سعدیہ خانم کچھ دیر تک اپنی بھابی کی طرف دیکھتی رہی۔

"آپ اطمینان رکھیں ایسا ہی ہوگا۔" سعدیہ خانم کا لہجہ ڈوبتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ "مجھ گناہ گار کی آمد بھی ماں باپ کے دم تک ہے۔ پھر میں افلاس زدہ کہاں ......اور اس عظیم الشان محل میں چند لمحوں کا بسیرا کہاں؟" یہ کہہ کر سعدیہ خانم چلی گئی اور مفلوج ماں باپ کے آنسو تیزی سے بہنے لگے۔ جس دنیا کو حاصل کرنے کے لئے اعتماد خان اور بلقیس خانم نے بیٹی کو حالات کے گرداب میں چھوڑ دیا تھا' آج اسی دنیا کی بے وفا موجیں ان کے سفینہ حیات کو غرق کرنے کے لئے تیزی سے آگے بڑھ رہی تھیں۔

❋❋❋

گھر پہنچ کر آج پہلی بار سعدیہ خانم کو احساس ہوا کہ اس کے سر پر ایک اور نئی بلا منڈلا رہی ہے۔ اب تک اس نے بے شمار بلاؤں کا سامنا بڑی بے جگری کے ساتھ کیا تھا' مگر یاسمین کی ماں کے لفظوں میں جو بلا پوشیدہ تھی' اس کی آمد کے خوف نے سعدیہ خانم پر لرزہ طاری کر دیا تھا۔

اس نے بڑی محبت سے کامران کو اپنے قریب بٹھایا اور خوشامدانہ لہجے میں کہنے لگی۔

"بیٹے! میں نے تجھے تیرے حال پر چھوڑ دیا اور کبھی اپنی مرضی مسلط کرنے کی کوشش نہیں کی۔ میرے ہاتھوں کی طرف دیکھ جن پر غیروں کی خدمت کے نشانات اتنے گہرے ہیں کہ تو آسانی سے انہیں دیکھ سکتا ہے۔"

شجاع الدین کامران خاموشی سے ماں کی باتیں سنتا رہا۔

"میں نے کبھی تجھ سے یہ بھی نہیں کہا کہ تو کوئی روزگار تلاش کر اور ماں کو آرام سے زندگی بسر کرنے دے۔ میرا آرام تو تیری ذات کا قرار ہے۔ مگر میں دیکھ رہی ہوں کہ تیری بے قراریاں بڑھتی ہی جا رہی ہیں۔ مجھے بس آج اتنا بتا

دے کہ تیری بے قراریوں کا اختتام کہاں ہوگا؟ اگر تیرا اضطراب اسی طرح بڑھتا رہا تو ایک دن تیری ماں کی جان چلی جائے گی......" یہ کہتے کہتے سعدیہ خانم رونے لگی۔

کامران کچھ دیر تک حیرت سے اپنی ماں کو دیکھتا رہا۔ پھر سوگوار لہجے میں کہنے لگا۔ "میں آپ کی بات نہیں سمجھا۔ مجھے کیا ہوگیا ہے؟ میں تو وہی ہوں۔ اگر آپ کو میرے بیکار گھومنے پر اعتراض ہے تو میں کل سے کوئی کام تلاش کرلوں گا۔ میری وجہ سے آپ کو مزید کوئی دکھ اٹھانا نہیں پڑے گا......" کامران نے شدید ندامت سے دوچار ہو کر ماں کے سامنے سر جھکا دیا تھا۔

"تیری بیکاری تو پہلے ہی ایک مستقل غم تھا' مگر اب ایک نئے غم نے میرے دل میں گھر بنالیا ہے......اور یہ غم مجھے قبر میں پہنچا کر ہی میرا پیچھا چھوڑے گا۔" سعدیہ خانم کے آنسو مسلسل بہہ رہے تھے۔

"خدا کے لئے مجھے اپنے اس غم کے بارے میں بتایئے جو آپ سے آپ کی زندگی چھین لینا چاہتا ہے۔" شجاع الدین کامران کے لہجے کی اداسی کچھ اور بڑھ گئی تھی۔

"بیٹے! تو یاسمین کو بھول جا......" بالآخر سعدیہ خانم کے سینے میں چھپا ہوا غم اس کی زبان تک آ گیا۔ "تیرے اور اس کے درمیان بڑے فاصلے حائل ہو چکے ہیں۔ تیرا باپ زیر زمین سو رہا ہے اور یاسمین کے باپ کے گھر پر اقتدار پہرہ دے رہا ہے۔ تیری ماں دوسروں کے گھروں میں کام کر کے دو وقت کی روٹی حاصل کرتی ہے......اور یاسمین کی ماں کے جوتے اٹھانے کے لئے بھی ایک علیحدہ ملازم ہے۔ یہ فرق تیری سمجھ میں کیوں نہیں آتا؟ زمین پر کھڑے ہوکر آسمان کو دیکھا تو جا سکتا ہے' چھوا نہیں جا سکتا......" سعدیہ خانم کے دل کا درد قطرہ قطرہ آنکھوں سے بہہ رہا تھا۔

"ماں! ہم بھی کبھی آسمان تھے......" کامران نے حقائق کو نظر انداز کرتے ہوئے انتہائی جذباتی لہجے میں کہا۔ "اگر آج وقت نے ہمیں زمین پر پہنچا دیا ہے تو اس سے رشتے تبدیل نہیں ہو جاتے۔"

"نہیں بیٹے! تیرا خیال غلط ہے۔ انسان کی حیثیت بدل جانے سے رشتے بھی بدل جاتے ہیں۔ اب دکھوں کے ساتھی اس زمین پر نہیں بستے۔ وہ چلے گئے' فنا ہو گئے۔ اب لوگ کیف و نشاط کی بستیاں ڈھونڈتے ہیں۔ کھنڈروں میں ویرانیوں میں کوئی نہیں آتا۔ تو بھی صرف اپنے کھنڈر کا اعتبار کر۔ محلات کے بلند میناروں کی طرف نہ دیکھ کہ یہ سب شعبدہ باز ہیں' فریب کار ہیں......" سعدیہ خانم کی اشک ریزی میں مزید اضافہ ہوگیا تھا۔

"میں کسی کے محل کی طرف نہیں دیکھتا' میری آنکھیں تو صرف یاسمین کی جانب نگراں ہیں۔ وہ میرا حق ہے اور میں کسی کو اپنا حق چھیننے نہیں دوں گا......" شجاع الدین کامران اچانک مشتعل ہوگیا تھا۔ "میں نے باپ کی موت کا صدمہ برداشت کرلیا مگر اپنی موت گوارا نہیں کروں گا۔"

"یاسمین پر تیرا کوئی حق نہیں' جب تک کہ اس کے ماں باپ تجھے یہ حق استعمال کرنے کی اجازت نہ دیں......" سعدیہ خانم بیٹے کے خوفناک عزائم دیکھ کر کانپ اٹھی تھی۔ "تجھے یہ حق کس نے دیا کہ تو دوسروں کو بھی غموں کی آگ میں جلا ڈالے۔ یہ خود غرضی ہے' بد دیانتی ہے۔ تو اگر کسی قابل ہوتا تو شاید تیرے ماموں اور ممانی اپنا ارادہ بدل دیتے۔ وہ ٹھیک سوچتے ہیں' کوئی ماں باپ بھی اپنی پھولوں جیسی بیٹی کو حادثات کے شعلوں میں نہیں جھونکتے' گردش تقدیر نے تجھے آگ بنا دیا ہے۔ حرص و ہوس کو اتنا نہ بڑھا کہ لالہ و گل بھی تیری آگ میں جلنے لگیں۔ یہ گناہ ہے' گناہ عظیم ہے......" شدت جذبات سے سعدیہ خانم کی آواز لرز رہی تھی اور رخسار گرم آنسوؤں سے بھر گئے تھے۔

"انہیں بھی یہ حق کسی [illegible] کی زندگی کا حق چھین لیں۔" کامران نے مکمل بغاوت

کی روش اختیار کرلی تھی۔ ''میں آخری بار آپ سے کہتا ہوں کہ میں وہاں اس وقت تک جاتا رہوں گا جب تک یاسمین میرے سامنے انکار نہیں کردے گی۔'' کامران نے ایک مجبور ماں کے سامنے اپنے سرکش جذبوں کا فیصلہ سنا دیا تھا۔

''یاسمین انکار کرچکی ہے۔'' سعدیہ خانم نے بیٹے کو حالات کا رخ سمجھانے کی آخری کوشش کی۔

''یہ غلط ہے۔'' کامران کی آواز ادب واحترام کی حدوں سے گزر گئی تھی۔ ''آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ یاسمین نے آج تک انکار نہیں کیا۔'' کامران کھلے لفظوں میں ماں پر جھوٹ کا الزام تو نہیں لگا سکا مگر درپردہ اس کی گفتگو کا مقصد یہی تھا کہ اسے باز رکھنے کے لئے سعدیہ خانم دروغ گوئی سے کام لے رہی ہے۔

''یاسمین کی خاموشی ہی اس کا انکار ہے۔'' ماں نے ایک بار پھر بگڑتی ہوئی صورتحال کو سنبھالنا چاہا۔

''میں خاموشی کی زبان نہیں سمجھتا۔'' کامران کے وہی باغیانہ تیور تھے۔ ''میں جنبش لب کو دیکھتا ہوں۔ میری سماعت الفاظ سننا چاہتی ہے اور جب تک یاسمین کے ہونٹوں پر حرف انکار نہیں ابھرے گا میں اسی طرح اس کے گھر جاتا رہوں گا۔''

جذبات کے شعلے اس طرح بھڑک رہے تھے کہ انہیں بجھانے کے لئے عقل اور دلیل کا دریا بھی ناکافی تھا' لیکن سعدیہ خانم زندگی سے ناراض ہوجانے والے بیٹے کو منانے کی کوشش کرتی رہی۔ ''کامران! یہ بڑی ذلت ہے۔ جو لوگ تجھے ایک لمحے کے لئے دیکھنا پسند نہیں کرتے ان کے در پر بار بار جانا شدید رسوائی ہے۔'' سعدیہ خانم نے ایک نئے زاویے سے بیٹے کو کھینچ کر اپنے دائرے میں واپس لانے کی کوشش کی تھی۔

''میں اس میں اپنی رسوائی نہیں سمجھتا۔'' کامران کی ضد اسی طرح برقرار تھی۔ ''ذلیل و حقیر تو وہ لوگ ہیں جنہوں نے میرا بگڑا ہوا وقت دیکھ کر برسوں پرانے رشتے کاٹ کر پھینک دیئے۔'' یہ کہتے ہوئے کامران اٹھا اور گھر سے باہر نکل گیا۔ جذباتی بیٹے نے مظلوم ماں کی اذیتوں میں مزید اضافہ کردیا تھا۔

❊❊❊

پھر کچھ عرصہ اسی طرح گزر گیا۔ یہاں تک کہ سعدیہ خانم کے ماں باپ کا انتقال ہوگیا۔ پہلے باپ رخصت ہوئے اور چند ماہ بعد ہی ماں کی آنکھیں بھی بند ہوگئیں۔ اس دوران سعدیہ خانم اپنے مفلوج ماں باپ کی عیادت کے لئے جاتی رہی۔ پھر جس روز وہ ماں کے دفن کے بعد گھر واپس آنے لگی تو اس کے بھائی اور بھاوج نے بیک زبان کہا۔

''آج ہمارے اور تمہارے درمیان آخری تعلق بھی ختم ہوگیا۔ اب یہ رشتہ اسی صورت میں برقرار رہ سکتا ہے کہ کامران کبھی ادھر کا رخ نہ کرے۔ آج تک یہاں اس کا وجود اس لئے برداشت کیا جاتا رہا ہے کہ ہمیں بوڑھے ماں باپ کی دل شکنی کا خیال آجاتا تھا۔ اب وہ دنیا میں نہیں رہے تو پھر کوئی سلسلہ بھی باقی نہیں رہا۔''

سعدیہ خانم نے ان باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خاموشی سے رخصت ہونے لگی تو قائم خان راجپوت نے اسے آخری بار روکتے ہوئے کہا۔ ''اپنے بیٹے کو صاف لفظوں میں اس کی حقیقت سمجھا دو ورنہ اب مجھ سے یہ ذلت برداشت نہیں ہوگی۔''

یہ دوسری دھمکی تھی جس کی شدت کو سعدیہ خانم نے اچھی طرح محسوس کرلیا تھا۔ مگر وہ کیا کرتی اور اپنے بھائی بھاوج کو کس طرح سمجھاتی کہ اس نے کامران پر اس کی حیثیت کس طرح واضح کی ہے۔

اور پھر سعدیہ خانم کو جس حادثے کا خوف تھا وہ اپنی پوری ہولناکیوں کے ساتھ پیش آگیا۔ کامران کو ماں کے سامنے اس طرح لایا گیا کہ اس کا پورا جسم زخموں سے چور تھا۔ کامران کو لانے والے قائم خان راجپوت کے محافظ اور ملازمین تھے۔ خود قائم خان بھی ان کے ہمراہ سعدیہ خانم کے گھر آیا تھا۔ جب سعدیہ خانم بیٹے کی یہ حالت دیکھ کر

رونے لگی تو قائم خان نے انتہائی وحشیانہ لہجے میں بہن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''یہ سب کچھ اچانک نہیں ہوا ہے۔ میں تمہیں کئی بار تنبیہ کر چکا تھا کہ کامران پاگل ہو گیا ہے۔ اسے زنجیریں پہنا دو۔ مگر تم نے ایسا نہیں کیا۔ قائم خان راجپوت کی بات کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ مجبوراً مجھے اس دیوانے کی وحشت دور کرنے کے لئے سختی سے کام لینا پڑا۔''

''اس قدر سختی؟ خدا کی پناہ!'' غیر معمولی قوت برداشت کا مظاہرہ کرنے کے باوجود سعدیہ خانم کے منہ سے چیخیں نکل گئیں۔ ''میرے معصوم بچے کے ساتھ جانوروں جیسا سلوک۔''

''تم غلط کہتی ہو۔'' قائم خان راجپوت غضب ناک لہجے میں بولا۔ ''میں نے ایک جانور کے ساتھ انسانی سلوک کیا ہے۔ اگر میں بھی وحشت و دیوانگی پر اتر آتا تو نتائج کچھ اور ہوتے۔''

''کیا آپ اسے جان سے مار دیتے؟'' سعدیہ خانم اپنے بھائی کے لہجے میں چھپی ہوئی درندگی دیکھ کر لرز اٹھی تھی۔

''اگر کسی دیوانے کا ہاتھ ایک معزز و محترم شخص کے گریبان تک پہنچنے لگے تو پھر اس کا ہاتھ کاٹ دیا جاتا ہے۔'' قائم خان راجپوت کا غیظ و غضب ہر گزرے ہوئے لمحے کے ساتھ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

''کیا کیا ہے کامران نے؟'' بالآخر سعدیہ خانم بھی تیز لہجے میں بول اٹھی۔

''مجھے بھی تو معلوم ہو کہ میرا بیٹا یہ سنگین جرم کس طرح کر رہا ہے؟'' سعدیہ خانم نے پہلی بار بڑے بھائی سے اس لہجے میں بات کی تھی جس نے ادب و احترام کی حدیں پامال کر ڈالی تھیں۔

''جب میں نے تمام رشتے توڑ ڈالے تو وہ پھر یاسمین سے کیوں ملنا چاہتا ہے؟'' قائم خان نے اپنی بے آبروئی کا جواز پیش کرتے ہوئے کہا۔

''کامران کے اس عمل سے آپ کے دامن وقار پر کوئی بدنما داغ کس طرح ابھرتا ہے؟'' سعدیہ خانم نے بیٹے کی صفائی پیش کی۔

''وہ آخر بچپن میں ساتھ ساتھ کھیلے ہیں۔ رفاقت کا یہی نقش اس کے ذہن پر جم گیا ہے۔ وہ نوعمری میں یتیم ہوا۔ زندگی کی ہر آسائش سے محروم رہا۔ عزیزوں کی نفرتیں دیکھیں' پڑوسیوں کا تحقیر آمیز سلوک برداشت کیا۔ قہر و ذلت کی وہ کونسی برق تھی جو اس کے آشیانے دل پر نہیں ٹوٹی۔ ایسی اذیت ناک اور سنگین فضا میں اگر وہ اپنے بچپن کی یادوں کو زندہ رکھنے کے لئے یاسمین کی طرف دیکھتا ہے تو اس میں کون سا گناہ ہے؟''

''میرے نزدیک یہ گناہ عظیم ہے۔'' قائم خان نے سعدیہ خانم کی کسی توجیہ کو قبول نہیں کیا تھا۔ ''میں تم ماں بیٹے کی عیاریوں کو خوب سمجھتا ہوں۔ تم لوگ مجھے رسوا کر کے اپنا کوئی ناپاک مقصد حاصل کرنا چاہتے ہو۔ مگر یاد رکھو کہ میں اس طوفان کو اپنے گھر کی طرف نہیں آنے دوں گا۔ انجام کار یہ موجیں تمہارے ہی کھنڈر کا رخ کریں گی اور ایک دن پتھر کے اس ڈھیر کو بھی بہا کر لے جائیں گی جو تم لوگوں کے سر چھپانے کے لئے آخری سہارا ہے۔'' یہ کہہ کر قائم خان راجپوت اپنے محافظوں اور ملازمین کی مختصر سی فوج کے ساتھ واپس چلا گیا۔

سعدیہ خانم کی برباد دنیا پر نئی قیامت نازل ہو گئی تھی۔ وہ محنت مزدوری کو بھول کر زخمی بیٹے کی تیمارداری کر رہی تھی۔ قائم خان کے زرخرید غلاموں نے کامران کو بری طرح زدو کوب کیا تھا' مگر پھر بھی اس کے جسم کی کوئی ہڈی نہیں ٹوٹی تھی۔ جب زخم آہستہ آہستہ بھرنے لگے تو سعدیہ خانم نے ایک دن بڑے شکستہ لہجے میں بیٹے سے کہا۔

''کامران! تمہاری ماں کے عیش و عشرت میں جو کچھ کمی تھی اسے تم نے پورا کر دیا۔ ایک سعادت مند بیٹے کو بھی

کرنا چاہیے۔" سعدیہ خانم کے لفظوں میں وہ درد پوشیدہ تھا کہ اس کی خلش سے شجاع الدین کامران بھی رونے لگا۔
"مام! میں جانتا ہوں کہ میری وجہ سے آپ کو کیا کیا آزار پہنچ رہے ہیں؟" شدت کرب نے کامران کے ہونٹوں کو اس طرح جکڑ لیا جیسے آہنی دھاگوں سے اس کے لب سی دیئے گئے ہوں اور وہ اپنی قوت ارادی کا سہارا لے کر ایک ایک گرہ کو کھولنے کی کوشش کر رہا ہو۔" مجھے اپنی نافرمانیوں کا احساس ہے مگر اس دل کے تقاضوں کو کیا کروں جس کی ایک خوشی بھی دنیا سے برداشت نہیں ہوتی۔ اب آپ بھی میرے مرجانے کی دعا کیا کریں کہ اس طرح آپ کو اپنی زندگی کے آخری غم سے نجات مل جائے گی۔"
"کامران! خدا کے لئے......خدا کے لئے......" سعدیہ خانم کو بیٹے کی اس جذباتی گفتگو نے وارفتہ کر دیا تھا۔
"نہیں مام اب کچھ نہیں ہو سکتا۔" کامران کے رخساروں پر آنسو بہہ رہے تھے اور ہونٹوں پر وحشی جذبوں کی آگ بھڑک رہی تھی۔" میرا انجام بھی بابا جان سے مختلف نہیں ہوگا۔ آخر اس خون میں بھی تو ان ہی کے خون کی مہک ہے۔ کوئی تو بتائے کہ مجھے کس جرم پر مارا گیا؟ آپ کے بعد اس دنیا میں یاسمین کے سوا مجھ سے محبت کرنے والا کون ہے؟ ہر طرف نفرتیں ہی نفرتیں ہیں۔ میں بھی ان نفرتوں کا جواب دوں گا۔ ذرا چلنے پھرنے کے قابل ہو جاؤں۔ پھر قائم خان راجپوت کو بتاؤں گا کہ زر خرید غلاموں کے ہاتھوں میں زیادہ طاقت ہوتی ہے یا آزاد بازوؤں میں؟ جب تک میں اس شخص کے جسم پر اتنے زخم نہیں ابھار دوں گا جتنے نشانات میرے بدن پر ہیں اس وقت تک مجھ پر زندگی حرام ہے۔ انصاف اسی کو کہتے ہیں۔"
پہلی بار سعدیہ خانم نے بیٹے کی آنکھوں کی طرف دیکھا' جو آنکھیں ہر وقت اداس اور کھوئی کھوئی سی رہتی تھیں۔ آج ان ہی آنکھوں میں انتقام کا خون اتر آیا تھا۔
"نہیں! میرے بیٹے نہیں۔" سعدیہ خانم نے بے اختیار ہو کر کامران کے پاؤں پکڑ لئے۔ یہ ایک ماں کا شدید اضطراری جذبہ تھا۔" بیٹے میں تجھ ہی سے تیری زندگی کی بھیک مانگتی ہوں۔ وہ بہت بڑے لوگ ہیں۔ ان کے پاس دولت ہے......اقتدار ہے......اور تو اکیلا بھی ہے اور بے وسیلہ بھی۔"
"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا مام! غیرت مند انسان اپنی جنگ اکیلے ہی لڑتے ہیں۔ آپ کیا ساری دنیا میری موت کا انداز دیکھے گی۔ میں مرتے وقت بھی کسی کو آواز نہیں دوں گا۔ ایک راجپوت زادے کا خون جس پر حالات نے برف جما دی تھی دوبارہ اپنی اصلی حالت کی طرف لوٹا تو اس کی حدت نے ایک ایک شریان کو جلا ڈالا تھا۔

❋❋❋

شجاع الدین کامران کے زخم بھر چکے تھے اور وہ چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا تھا۔ سعدیہ خانم نے ایک بار پھر بیٹے کو سمجھانے کی کوشش کی۔

''جن کی تقدیریں روٹھ جاتی ہیں انہیں وقت کی رفتار کے آگے سرکشی اختیار نہیں کرنی چاہیے۔'' سعدیہ خانم اپنے جذباتی بیٹے کو طاقت اور کمزوری کا فلسفہ سمجھا رہی تھیں۔

''اگر ہوائیں سرد ہوں تو ہمیں اپنے گھر کے روزنوں کو بند کر دینا چاہیے کہ دنیا کا طاقتور ترین انسان بھی موسم کا مقابلہ نہیں کر سکتا' جو دیوانے بے لباسی کے عالم میں گھروں سے نکل جاتے ہیں انہیں یخ بستہ ہوائیں چاٹ لیتی ہیں اور وہ سر راہ ٹھٹھر کر مر جاتے ہیں۔ تو اپنی غم زدہ ماں کو تنہا چھوڑ کر کس طوفان کا مقابلہ کرنے جا رہا ہے؟ تجھے خبر بھی ہے کہ وہ کیسا طوفان ہے؟''

''میں خوب جانتا ہوں......'' کامران نے تمسخر آمیز لہجے میں کہا۔ ''میں نے ایسے کئی طوفان دیکھے ہیں۔''

''بیٹے! تو نے طوفان ہی تو نہیں دیکھے......'' سعدیہ خانم لرز اٹھی۔ ''خدا وہ وقت نہ لائے کہ تیری زندگی کا سفینہ کسی طوفان سے آشنا ہو...... ہر خونی موج میرے سر سے گزرے کہ ابھی تیری ماں زندہ ہے......'' ایک لمحے میں سعدیہ خانم کی آنکھوں کے سامنے سترہ اٹھارہ سال کا وہ طویل دور ابھر آیا جس کی ہر ساعت اذیت و کرب میں ڈوبی ہوئی تھی...... ''طوفان تو تیری اس مظلوم ماں نے دیکھے ہیں جس کا اس دنیا میں کوئی پرسان حال نہیں' خود اولاد بھی اس کے درد کو نہیں سمجھتی۔''

''مام! میں آپ کے دکھوں سے خوب واقف ہوں......'' کامران اچانک شرمسار سا نظر آنے لگا۔

''تو جھوٹ بولتا ہے کامران!'' سعدیہ خانم شعلے کی طرح بھڑک اٹھی۔ ''اگر تجھے احساس ہوتا تو اس طرح اپنے جسم پر زخموں کی فصل نہ بوتا۔''

''اس کا ذمے دار میں نہیں ہوں......'' کامران یکایک مشتعل ہو گیا۔ ''یہ اس شخص کی مہربانیوں کا زندہ ثبوت ہے جو آپ کا حقیقی بھائی ہے اور جس کی سنگدلی کے خلاف آپ نے کبھی گواہی نہیں دی۔'' جوش جذبات میں کامران طعنہ زنی پر اتر آیا تھا۔

''ہاں! وہ میرا بھائی ہے......'' سعدیہ خانم بہت تھکی ہوئی نظر آ رہی تھی...... اس نے آہ سرد کھینچتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اعتراف ہے کہ قائم خان راجپوت میرا حقیقی بھائی ہے اور اس کی رگوں میں بھی وہی خون دوڑ رہا ہے جس خون نے میرے جسم کو تراشا ہے۔''

''پھر آپ نے اس خون کا احتساب کیوں نہیں کرتیں؟'' شجاع الدین کامران کا لہجہ تلخ تر ہوتا جا رہا تھا۔ ''میرے ہاتھوں میں زنجیر کیوں ڈالتی ہیں؟ مجھے آزاد رہنے دیجیے کہ ایک دن میں قائم خان راجپوت کے جسم سے

اس خون کا ایک ایک قطرہ نکال دوں گا پھر دیکھ لیجئے گا کہ آپ کے اور قائم خان کے خون میں بڑا فرق ہے۔'' کامران کے بگڑے ہوئے تیوروں میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔
''میں نے احتساب کا عمل اپنے خدا پر چھوڑ دیا ہے......'' سعدیہ خانم کے پاس کامران کے سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس نے بیٹے کے جلتے ہوئے جذبات کو سرد کرنے کی ایک اور کوشش کی۔
''خدا ان کے کام نہیں کرتا جو اپنے کام خدا پر چھوڑ دیتے ہیں۔'' شجاع الدین کامران حیرت انگیز طور پر بڑی منطقی گفتگو کر رہا تھا۔ ''یہ ہمارا ذاتی کام ہے کہ ہم ظالموں کے بڑھتے ہوئے ہاتھوں کو کاٹ دیں۔ میں کئی سال سے دیکھ رہا ہوں کہ آپ مجھے مسلسل بزدلی کا سبق سکھا رہی ہیں' آپ تو یہی چاہتی ہیں کہ میں آگے بڑھ کر ستم گروں کے خنجر پر اپنی گردن رکھ دوں ......اور جب میرا سر تن سے جدا ہو جائے تو آپ سرراہ میری لاش پر ماتم کریں اور ہر گزرنے والے سے چیخ چیخ کر کہیں کہ خدا کی یہی مرضی تھی۔''
''نہیں بیٹے! ہرگز نہیں......'' سعدیہ خانم بدحواس نظر آنے لگی۔ ''میں ایسا نہیں سوچتی ...... تیرے خیالات بڑے گمراہ کن ہیں' یہ ایک دن مجھے تباہ کر ڈالیں گے۔ میں عمل کی قائل ہوں مگر ایسا عمل جو مثبت ہو۔ میں تیری طرح منفی سوچ نہیں رکھتی' تو جس منزل کی جانب بڑھ رہا ہے اس کا ہر کوچہ' ہر موڑ بربادی کی طرف جاتا ہے۔''
''آخر وہ آپ کا مثبت عمل کیا ہے؟'' شجاع الدین کامران شدید جھنجلاہٹ کا شکار ہو گیا تھا۔ ''آپ کے اس عمل کے نتائج کب برآمد ہوں گے؟ میری محترم ماں! مجھے بتائیں کہ وہ عمل کیا ہے؟ اگر اس میں میرے خوابوں کی تعبیر پوشیدہ ہے تو میں اسی راستے پر چلوں گا......'' کامران کے چہرے اور لہجے سے بچوں کی سی معصومیت ظاہر ہو رہی تھی۔

''اس عمل کا تعلق صرف تیری ذات سے ہے۔'' کامران کو آمادہ پا کر سعدیہ خانم کا دل ٹھہرنے لگا۔ ''میں تجھے ایک عالم و فاضل انسان بنانا چاہتی تھی مگر تو نے مولانا شمس الدین جیسے بزرگ کی محبت کو بھی جھٹلا دیا' یہاں تک کہ وہ زیر خاک سو گئے اور تو دہلی کی گلیوں میں آوارہ پھرنے لگا۔ اب میں مولانا کو کہاں سے ڈھونڈ کر لاؤں۔ وہ وقت تو گزر گیا تیرے بچپن کے خوبصورت دن ہواؤں کے ساتھ اڑ گئے۔ میں انہیں کہاں تلاش کروں کہ اب وہ دن لوٹ کر نہیں آئیں گے۔'' سعدیہ خانم کی آواز کانپ رہی تھی اور پلکوں پر آنسو لرز رہے تھے۔ ''اگر تیری تعلیم مکمل ہو جاتی تو آج اس طرح خوابوں کے اندھیرے میں نہ بھٹکتا' اجالوں کی منزل تیرے پیروں کے نیچے ہوتی ......اور دیکھنے والے تجھے دیکھ کر پکار اٹھتے کہ وہ روشنی کا سفیر آ رہا ہے۔'' سعدیہ خانم کے ہونٹوں سے اس کی آرزوؤں کا طوفان بہہ رہا تھا۔
''افسوس! کامران تو نے میرے کتنے خوابوں کو قتل کیا ہے' میں نے بدترین لوگوں کی غلامی اس لئے اختیار کی تھی کہ تو آزادانہ زندگی بسر کرے ......میں نے اپنے پورے جسم پر محنت و مشقت کے آبلے اس لئے سجائے تھے کہ تیرا بدن بے داغ رہے......مگر میں دیکھ رہی ہوں کامران کہ تیرے روئیں روئیں پر سیاہ نشانات ہیں اور دنیا والے تیری طرف انگلیاں اٹھا کر چیخ رہے ہیں کہ وہ تاریکیوں کا نقیب آ رہا ہے......'' سعدیہ خانم چند لمحوں کے لئے خاموش ہو گئی اور پھر فریادی لہجے میں کہنے لگی۔ ''آج تجھے دیکھ کر ایک شخص بھی نہیں کہہ سکتا کہ یہ رائے نعیم الدین ذیشان کا وارث ہے۔''
''آپ کے نزدیک رائے نعیم الدین کا وارث بننے کے لئے کن صفات کا ہونا ضروری ہے؟'' شجاع الدین کامران نے اپنی ماں سے سوال کرتے ہوئے کہا۔
''سعدیہ خانم اسی موقع کی تلاش میں تھی' اس نے بڑی ذہانت سے گفتگو کا رخ موڑتے ہوئے کہا۔ ''رائے کا وارث خدا کے سوا کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتا' اس کی پہلی اور آخری پہچان یہی ہے کہ وہ خوددار اور غیرت مند ہوتا

ہے' وہ بے ضمیروں سے کوئی رشتہ نہیں رکھتا......" سعدیہ خانم نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ کامران کے ذہن پر الفاظ کی ضرب لگائی۔

"میں آپ کا مفہوم نہیں سمجھا مادر گرامی!" شجاع الدین کامران نے چونکتے ہوئے کہا۔"آپ کے خیال میں کیا میں نے بے غیرتی کا لبادہ اوڑھ لیا ہے؟"

"ہاں! تو نے اپنے بزرگوں کی قبا چاک کر دی......" سعدیہ خانم کا لہجہ پرجلال تھا۔"اب تیری نظریں زمانہ پرستوں کے لباس زرنگار پر جمی ہوئی ہیں......اور تیرے ہاتھ بھیک کے لئے پھیلتے جارہے ہیں۔"

شجاع الدین کامران کی آنکھیں فرط حیرت سے پھیل گئیں اور اس کے چہرے پر شدید ناگواری کا رنگ ابھر آیا......"میں بھکاری؟ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں مام؟" کامران کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔

"ہاں تو ایک بھکاری ہے' رائے نعیم الدین ذیشان کا بے غیرت وارث......" آج سعدیہ خانم نے ہر مصلحت کو بالائے طاق رکھ دیا تھا۔"تو نے اپنی ایک سفلی خواہش کے لئے بزرگوں کی عظیم روایات کو فروخت کر دیا' تیرا گناہ ناقابل معافی ہے کامران۔"

"میں بے ضمیر......بے احساس......بے غیرت......" کامران کے ہونٹوں سے الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہو رہے تھے۔ وہ بے اختیاری کے عالم میں کھڑا ہو گیا۔ اس کا چہرہ تانبے کی طرح سرخ ہو رہا تھا۔

"وحشت و دیوانگی کے اس مظاہرے سے تیرا جرم کم نہیں ہو گا کامران!" سعدیہ خانم کا لہجہ بھی مزید تلخ ہو گیا تھا۔

کامران سنبھل گیا۔ اس نے اپنے اعصاب پر قابو پایا اور دھیمی آواز میں ماں سے کہنے لگا۔

"آپ وضاحت کے ساتھ مجھے میرا جرم بتائیں' میں زیادہ دیر تک آپ کی ناراضگی برداشت نہیں کر سکتا۔ میں نے آج تک آپ کو اس حالت میں نہیں دیکھا۔" کامران کے غصے پر اس کی محبت غالب آ گئی تھی۔

"تیرا جرم یہ ہے کہ تو اپنے ماموں قائم خان راجپوت کی نفرتوں سے محبت کی بھیک مانگ رہا ہے۔" آخر سعدیہ خانم نے گفتگو کا واضح انداز اختیار کر لیا۔"جو لوگ تجھے مسلسل ٹھکرا رہے ہیں تو ان ہی کے آستاں پر سجدہ کرنے کے لئے جگہ ڈھونڈ رہا ہے۔ اس سے بڑی بے حیائی اور کیا ہو گی کامران؟"

"میں نے قائم خان کے سامنے کبھی اپنا ہاتھ دراز نہیں کیا......"

شجاع الدین کامران ایک بار پھر بھڑک اٹھا۔"میں انہیں صرف یاسمین کی وجہ سے برداشت کر رہا ہوں......" کامران نے اپنی منطق پیش کی۔

"آخر یاسمین سے تیرا کیا رشتہ ہے؟" سعدیہ خانم نے غضب ناک لہجے میں پوچھا۔

"آپ خوب جانتی ہیں کہ یاسمین سے میرا کیا رشتہ ہے؟" کامران نے مبہم مگر بھرپور انداز میں جواب دیتے ہوئے کہا۔

"میں تیری زبان سے اس رشتے کی تفصیلات سننا چاہتی ہوں......" سعدیہ خانم بہت زیادہ برہم نظر آ رہی تھی۔

"آج تجھے بتانا ہی ہو گا کہ یاسمین تیری کون ہے؟ میں کچھ دیر کے لئے تکلف اور ادب کی تمام دیواریں گرائے دیتی ہوں' آج مجھے آزادانہ فضا میں سب کچھ بتا دے کہ تو اس لڑکی کے لئے اپنے آپ کو ہلاکت میں کیوں ڈال رہا ہے؟"

شجاع الدین کامران پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ اس نے آج تک اپنی شفیق و مہربان ماں کو اس لہجے میں گفتگو کرتے نہیں دیکھا تھا۔

''بول میرے نادان بیٹے کہ تیری مجبور ماں کے پاس اس دیوانگی کو برداشت کرنے کے لئے زیادہ وقت نہیں ہے.....'' سعدیہ خانم کا کرب ناقابل بیان تھا۔

''یاسمین میری بہن ہے۔'' آخر ایک طویل وقفے کے بعد کامران نے سکوت توڑا۔ اس کی آواز کی لرزش صاف نمایاں تھی۔

''یہ رشتہ ختم ہو چکا۔'' سعدیہ خانم نے انتہائی جارحیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''رشتے ختم نہیں ہوتے۔'' شجاع الدین کامران نے ایک بار پھر وہی طفلانہ ضد کی۔

''جب کوئی تجھ سے رشتہ قائم رکھنا نہیں چاہتا تو پھر تجھے اصرار کیوں ہے؟'' سعدیہ خانم نے حقائق کا چہرہ بے نقاب کرتے ہوئے کہا۔ ''اہل غیرت اسی کو بھیک کہتے ہیں۔ قائم خان تیرے گداگرانہ وجود کو بھی برداشت نہیں کرتا اور تو مسلسل اپنا دامن پھیلا رہا ہے۔ خدا کی قسم کامران! میں نے آج تک تجھ جیسا بھکاری نہیں دیکھا۔ کیسا راجپوت ہے؟ یہ سلوک تو کوئی اچھوت بھی گوارا نہیں کرے گا۔ رشتہ اسے کہتے ہیں کہ اگر تو ان کی طرف ایک قدم بڑھتا تو وہ دو قدم آگے آکر تیرا استقبال کرتے۔ تیرے راستے میں اپنی آنکھیں بچھا دیتے۔ مگر میں برسوں سے دیکھ رہی ہوں کہ وہ تجھے بھیک کے لائق بھی نہیں سمجھتے۔'' سعدیہ خانم نے کامران کی غیرت قومی پر ایک کاری ضرب لگائی جس کی تکلیف سے وہ تڑپ اٹھا۔

''میں نے بھی اس رشتے کی زنجیر کاٹ کر پھینک دی ہے۔'' کامران کا لہجہ بھی شرر بار ہو گیا تھا۔

''پھر اس طرف بار بار کیوں دیکھتا ہے؟'' سعدیہ خانم بیٹے کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر سراسیمہ سی نظر آنے لگی۔ رشتوں کی راکھ میں کیا ڈھونڈ رہا ہے میرے بچے۔ وہاں کوئی دہکتا ہوا انگارہ تو کجا' دم توڑتی ہوئی چنگاری بھی موجود نہیں۔''

''نہیں مام! آپ کی نظر کمزور ہے۔'' شجاع الدین کامران نے پر زور لہجے میں کہا۔ ''ابھی اس راکھ کے درمیان' ایک شعلہ موجود ہے۔ میں اسی شعلے کی نسبت سے قائم خان راجپوت کی حویلی کی طرف دیکھتا ہوں۔''

''کیسا شعلہ.....؟'' سعدیہ خانم چونک اٹھی۔

''میری محبت کا شعلہ۔'' کامران بے اختیار ہو گیا' مگر فوراً ہی احساس ندامت سے اس کی گردن جھک گئی اور چہرے پر گہری سرخی پھیل گئی۔

''تیری محبت؟'' سعدیہ خانم نے استفہامیہ انداز میں کہا۔ اس کا سر بدستور جھکا ہوا تھا۔

''تجھے جو کچھ کہنا ہے بے جھجک ہو کر کہہ دے۔'' سعدیہ خانم کی آواز معمول سے زیادہ تیز تھی۔ ''آج حد ادب قائم نہیں۔ میری طرف سے تجھے اظہار رائے کی پوری آزادی ہے۔''

کامران نے سنبھلنے کی کوشش کی اور پھر بہت آہستہ لہجے میں کہنے لگا۔ ''وہ یاسمین خانم ہے' قائم خان راجپوت کی بیٹی۔''

''میں نے آگ کی آغوش میں آج تک گلاب کا کوئی پھول کھلتے نہیں دیکھا۔'' سعدیہ خانم کا لہجہ نہایت تضحیک آمیز تھا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آتا کامران کہ میں کس کس طرح تیری کم نظری کا ماتم کروں؟ تجھے اس لڑکی سے خوش گمانی ہے جس نے قائم خان راجپوت کے سائے میں پرورش پائی ہے۔ جب تو اس سے بچھڑا تھا تو یاسمین کی عمر چار سال تھی۔ اب وہ بیس اکیس سال کی ایک ہوشمند لڑکی ہے۔ سترہ سال تک اس نے تیرے باپ تیری ماں اور تیرے خلاف ترتیب دی جانے والی نفرت و حقارت کی ایک طویل داستان سنی ہے اور جس کے کسی لفظ سے وفا کی خوشبو نہیں

آتی۔ پھر اس کے دل میں تیری محبت کا کوئی نقش کس طرح زندہ رہ سکتا ہے؟ اگر حالات کے گرد و غبار میں وہم و گمان کی کوئی لکیر ابھری بھی ہوگی تو حادثات کی ہواؤں نے اسے مٹا دیا ہوگا۔ تو آج تک اسی فریب کے سہارے زندہ ہے؟ خدا کی پناہ! خدا کی پناہ۔!'' سعدیہ خانم کے لہجے میں شدید حیرت بھی تھی اور بے اندازہ کرب بھی۔

شجاع الدین کامران کسی وحشت زدہ کی طرح اپنی ماں کے چہرے کو دیکھنے لگا۔ اسے سعدیہ خانم کی باتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

''بچپن کے موسم کی ایک ہلکی سی دھند کو تو نے سورج کی تیز روشنی کیسے سمجھ لیا کامران!'' سعدیہ خانم دوبارہ بیٹے سے مخاطب ہوئی۔ ''اور اس فانی دنیا میں تو سورج کی روشنی بھی پائیدار نہیں' شام ہوتے ہی وہ بھی کہیں روپوش ہو جاتا ہے۔''

''نہیں مام! آپ میرے حق میں زیادتی کر رہی ہیں۔'' آخر کامران نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

''تو شبنم کے چند قطروں کی بات کر رہا ہے جو دھوپ کی ہلکی سی تپش بھی برداشت نہیں کرتے اور دیکھتے ہی دیکھتے ہوا میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔ یہاں تو سترہ سال سے آگ کا طوفان آیا ہوا ہے بیٹے! فضاؤں سے مسلسل انگارے برس رہے ہیں۔ کیا ڈھونڈ رہا ہے میری جان! اب تو کچھ بھی نہیں بچا ہوگا ...... کچھ بھی نہیں ...... کچھ بھی نہیں۔'' یہ کہتے کہتے سعدیہ خانم کی پلکیں بھیگنے لگی تھیں۔

''مادر گرامی! آپ کے اندازے غلط ہیں۔'' شجاع الدین کامران نے ماں کی پیش کردہ تمام حقیقتوں کو جھٹلا دیا۔ ''آپ نانی نانا اور ماموں کے سنگدلانہ طرز عمل کے باعث اس گھر کے تمام افراد سے خفا ہو گئی ہیں۔ یاسمین بھی آپ کے جذبات غضب کا شکار ہے۔ آپ اس سے حسد رکھتی ہیں۔'' اپنے دل کے خلاف گواہی دینے پر کامران بھی ماں سے ناراض ہو گیا تھا اور اس نے ماں کے مقدس رشتے کو پامال کر ڈالا تھا۔

''یہ تو کہہ رہا ہے کامران؟'' سعدیہ خانم نے مبہوت ہو کر کامران کی طرف گھبرا کر کہا۔ ''میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ خاندانی حالات کے سبب آپ کا دل یاسمین کی طرف سے صاف نہیں ہے۔ ایک نوجوان عاشق نے مردم گزیدہ اور جہاندیدہ ماں کو الفاظ کے پیچ و خم سے بہلانے کی کوشش کی۔

''میرا دل آئینے سے بھی زیادہ شفاف ہے کامران۔'' سعدیہ خانم نے پہلی بار اپنی ذات پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر میرا بھائی اور بھاوج ماضی کے جرائم کے باوجود مجھ سے معذرت کا ایک لفظ کہہ دیں تو میں انہیں معاف کر سکتی ہوں۔ مگر وہاں تو آج بھی گناہوں پر اصرار ہے' سفاکی اور ظلم کی تکرار ہے۔''

شجاع الدین کامران کچھ دیر کے لئے شرمندہ نظر آنے لگا۔

''میں یاسمین سے حسد نہیں رکھتی۔ تجھے زمانے کے نئے فتنوں سے بچانا چاہتی ہوں۔'' سعدیہ خانم نے دل پر جبر کر کے اپنی گفتگو کو جاری رکھا۔ ''وہ دنیا پرست ماں باپ کی بیٹی ہے۔ اس کی ساعتوں میں اکیس سال تک خودغرضی اور تجارت کا زہر ٹپکا ہے اور اب وہ خود بھی مجسم زہر کا ایک پیالہ بن گئی ہے۔ اسے تجھ جیسا جو مرد بھی چھوئے گا ہلاک ہو جائے گا۔ وہ خالص سود کی کمائی پر پلنے والے تاجروں کی بستی میں رہتی ہے۔ اسے کوئی تاجر ہی راس آ سکتا ہے۔ شجاع الدین کامران جیسا احمق نوجوان نہیں' جسے نہ اپنی صبح کا پتا ہے اور نہ شام کی خبر۔'' سعدیہ خانم نے بڑے جارحانہ انداز میں اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔

''یاسمین نہیں بدل سکتی مام! یہ میرا دل کہتا ہے۔'' کامران کے جذبات نے عقل کا فیصلہ سننے سے انکار کر دیا

سعدیہ خانم سوچنے لگی۔ ایک دیوانے پر ہوش وخرد کی باتوں کا کوئی اثر مرتب نہیں ہو رہا تھا۔ مجبوراً اس نے اپنی گفتگو کا زاویہ بدل ڈالا۔ میں کچھ دیر کے لئے تیرا دعویٰ تسلیم کئے لیتی ہوں' مگر مجھے اتنا تو بتا دے کہ کیا کبھی تو نے اپنے لئے یاسمین کو بے قرار پایا ہے؟ کیا کبھی وہ ان سترہ اٹھارہ سالوں میں تیرے گھر آئی ہے؟ تیرے غموں پر اپنے کچھ آنسو برباد کئے ہیں اور کبھی تجھ سے زبانی ہمدردی کا اظہار کیا ہے؟ میرے سامنے صرف ایک مثال پیش کر دے۔ میں اپنے سارے الفاظ واپس لے لوں گی اور اعتراف کر لوں گی کہ میری آنکھوں کی روشنی ختم ہو چکی ہے اور ذہنی توازن بگڑ گیا ہے۔ میں نے جو کچھ دیکھا وہ غلط تھا......اور جو کچھ سوچا وہ ایک مخبوط الحواس عورت کا واہمہ تھا۔''

''آپ خوب جانتی ہیں کہ یاسمین کتنی مجبور ہے؟'' عاشق کو ایک بار پھر اس کے دل نے فریب میں مبتلا کر دیا تھا۔

''ہاں! میں اس کی مجبوریوں سے واقف ہوں۔'' سعدیہ خانم کا لہجہ مصلحت آمیز تھا۔ ''میں جانتی ہوں کہ ایک مسلمان دوشیزہ کتنی مجبور ہوتی ہے' مگر جب یاسمین کے باپ کے حکم پر تجھے زدوکوب کیا جا رہا تھا' اس وقت اس نے اپنے کسی تاثر کا اظہار کیا تھا؟ اس نے اپنے بے رحم باپ سے کہا تھا کہ وہ تجھ پر ظلم وتشدد نہ کرے؟'' سعدیہ خانم نے بڑا عجیب سوال کر دیا تھا۔

کامران بدحواس نظر آنے لگا۔ اس کے پاس ماں کے سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

''کیا وہ اپنی تماشا گاہ سے باہر آئی اور کیا اس نے ستمگروں کے بڑھتے ہوئے ہاتھوں کو روکنے کی کوشش کی؟ اہل درد تو کسی جانور کے ساتھ ہونے والے ظلم کو بھی برداشت نہیں کرتے اور تو تو آخر ایک انسان تھا۔'' سعدیہ خانم نے اپنے جذباتی بیٹے کو عقل اور دلائل کی زنجیروں میں جکڑ لیا تھا۔

''یہاں بھی اس کی مجبوریاں دامن کش تھیں۔'' کامران ابھی تک دل شوریدہ کے حصار سے باہر نہیں نکلا تھا۔

''اسے مجبوری نہیں کہتے فرزند!'' سعدیہ خانم کے لہجے کی جارحیت دوبارہ عود کر آئی تھی۔ ''یہ رشتوں کے ٹوٹ جانے کا کھلا ہوا اعلان ہے جسے تیرے کان سننا نہیں چاہتے۔ تیری ذات یاسمین کے لئے ایک دلچسپ تماشے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ اگر وہ لوگ تجھے قتل بھی کر دیتے تو اس کی بے نیازی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اگر تیری لاش بھی قائم خان راجپوت کی حویلی کے دروازے پر پڑی رہتی تو یاسمین کی خواب گاہ ناز کے پردوں میں کوئی جنبش نہیں ہوتی۔ میں تجھے کیسے سمجھاؤں میرے بیٹے! کیسے سمجھاؤں؟'' یہ کہہ کر سعدیہ خانم نے کامران کی طرف سے منہ پھیر لیا اور دیوار سے سر ٹیک کر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ ایک ایسی شکستہ اور نڈھال عورت نظر آ رہی تھی جیسے اس کی زندگی کا آخری سہارا بھی چھن گیا ہو۔

کامران کچھ دیر تک اپنی نیم جاں ماں کو خاموشی سے دیکھتا رہا اور پھر غصے میں بھرا ہوا مکان سے باہر چلا گیا۔ اس کے وحشی دل نے عقل وہوش کی کسی بات کو تسلیم نہیں کیا تھا۔

✽✽✽

دوسرے دن طلوع ہونے والا سورج بڑی المناک خبر لے کر آیا۔ صبح ہوتے ہی چند سپاہی آئے اور شجاع الدین کامران کو پکڑ کر لے جانے لگے۔ سعدیہ خانم نے ان کی بہت منت وسماجت کی۔ پھر کہیں جا کر سپاہیوں نے بتایا کہ اس کے بیٹے پر چوری کا الزام ہے۔ یہ الزام اس قدر عجیب تھا کہ سعدیہ خانم فریاد تک نہ کر سکی۔ بس حیرت سے اپنے بیٹے کو جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ جسے بیڑیاں پہنا کر بے دردی کے ساتھ کھینچا جا رہا تھا اور جو انتہائی تلخ لہجے میں چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ میں چور نہیں ہوں۔ میرے خلاف سازش کی گئی ہے۔

محلے کے لوگ اپنے اپنے گھروں سے باہر نکل آئے تھے اور کامران کو نفرت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ کچھ لوگ اس کی بے گناہی پر یقین رکھتے تھے' مگر اپنے ہونٹوں کو جنبش نہیں دے سکتے تھے۔ آمرانہ نظام کی یہی دین ہوتی ہے کہ جذبے سینوں میں تڑپتے تڑپتے مر جاتے ہیں لیکن زبانوں پر نہیں آتے۔

پھر شجاع الدین کامران کو عدالت میں پیش کر دیا گیا۔ زور و شور کے ساتھ مقدمہ چلا۔ نقلی مدعی نے اپنے مجرم کو پہچان لیا' جھوٹی گواہیاں سامنے آئیں اور بالآخر کامران کو دو سال کی سزا سنا دی گئی۔ سعدیہ خانم سر عدالت چیختی رہی کہ اس کا بیٹا بے گناہ ہے' مگر قاضی کو جو شہادتیں درکار تھیں وہ اسے مل چکی تھیں۔ ظاہری انصاف کے تقاضے پورے ہو چکے تھے۔ اس لئے کامران کو قید خانے میں ڈال دیا گیا۔

سعدیہ خانم جانتی تھی کہ اس منصوبے کے پیچھے کس کے ہاتھ گردش کر رہے ہیں؟ قائم خان راجپوت نے ایک بار پھر کامران کے جسم کو نئے انداز سے تشدد کا نشانہ بنایا تھا۔ وہ ہر قیمت پر اپنے سرکش بھانجے کو یامین کے راستے سے ہٹا دینا چاہتا تھا۔ اس کے ایک اشارے پر کامران کو قتل بھی کیا جا سکتا تھا۔ مگر اس کھلے تشدد میں قائم خان کو اپنی رسوائی کا بھی اندیشہ تھا۔ اس لئے وہ بہت دبیز پردوں میں کامران سے انتقام لے رہا تھا۔ سعدیہ خانم اپنے بھائی کی اس وحشیانہ کارروائی کو سمجھ چکی تھی' لیکن اس کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا۔ وہ کئی راتیں بڑے کرب کے عالم میں جاگ کر سوچتی رہی کہ بیٹے کی بے گناہی پر کس کے سامنے فریاد کرے۔ قاضی عدالت نے اسے یہ کہہ کر مایوس کر دیا تھا کہ تمام شہادتیں کامران کو مجرم ثابت کر رہی ہیں۔ پھر اچانک ان اندھیروں میں روشنی کی ایک کرن سی ابھری اور سعدیہ خانم کا ڈوبتا ہوا دل ٹھہر سا گیا۔

اس نے سلطان ناصر الدین محمود کے عدل و انصاف اور رحم دلی کے بے شمار واقعات سنے تھے۔ ان ہی واقعات کی شہرت نے سعدیہ خانم کو بھی سہارا دیا اور اس کی امید بندھ گئی کہ اگر کسی طرح وہ سلطان کی بارگاہ تک پہنچ جائے تو کامران کو زنداں کی تاریکیوں سے نجات مل سکتی ہے۔ اس خوش آئند تصور نے سعدیہ خانم کو مزید ایک رات سونے نہیں دیا۔

پھر جب طویل اور اذیت ناک انتظار کے بعد صبح ہوئی تو وہ دیوانہ وار "قصر سفید" کی طرف بڑھی۔ وہ چاہتی تھی کہ کسی طرح اس کے ہاتھ ایک بار زنجیر انصاف کو چھو لیں اور سلطان ناصر الدین محمود اس پر کئے جانے والے مظالم کی روداد سن لے۔ مگر قائم خان راجپوت کا منصوبہ اپنی جگہ ہر اعتبار سے مکمل تھا۔ سعدیہ خانم کئی ماہ تک شاہی محل کے دروازے پر پہنچ کر ناکام و نامراد واپس آتی رہی۔ اسنے دربانوں سے بڑے عاجزانہ لہجے میں درخواست کی۔ مگر کوئی دل بھی نہیں پگھلا کہ ہر دل پر قائم خان راجپوت کے اقتدار کے پہرے تھے۔

جب مجبوریاں اپنی انتہا کو پہنچ گئیں تو بیٹے کی محبت سعدیہ خانم کو اس سفاک بھائی کے دروازے پر دوبارہ لے گئی جس نے اپنے نفس کی تسکین کے لئے خون کا ایک ایک رشتہ توڑ ڈالا تھا۔ قائم خان جانتا تھا کہ بہن اس سے ملنے کے لئے کیوں آئی ہے؟ اپنی جفا کاریوں کو چھپانے کی غرض سے اس نے سعدیہ خانم کو گھر کے اندر آنے سے روک دیا۔ ایک غم زدہ ماں اور ایک شکستہ جاں بہن بھائی کے دروازے پر بہت دیر تک کھڑی رہی' مگر محافظوں نے اسے اندر جانے کی اجازت نہیں دی۔ شدت اضطراب میں سعدیہ خانم نے کئی بار سوچا کہ وہ چیخ چیخ کر تمام لوگوں کو قائم خان کی داستان کا ایک ایک حرف سنا ڈالے مگر اپنے ہی خاندان کی رسوائی کے خوف سے اس نے زبان کو اتنی سختی سے دبا لیا کہ ہونٹ خون دینے لگے۔

مہینے میں ایک بار سعدیہ خانم کو بیٹے سے ملنے کی اجازت دی جاتی تھی۔ کئی مرتبہ اس نے کامران سے روتے

ہوئے کہا۔ ''بیٹے! شاید میرے مقدر میں یہی ایک اعزاز باقی رہ گیا تھا کہ رائے نعیم الدین ذیشان کے وارث کو چور قرار دے کر قید خانے کے سپرد کر دیا جائے۔''

کامران اپنی ماں کی دل فگار باتیں سنتا رہتا اور پھر جب بھی اس کے ہونٹوں کو جنبش ہوتی تو بس ایک ہی جملہ دہراتا۔

''ماں! ذرا در زنداں کھلنے تو دو پھر آپ کا یہ ناکارہ بیٹا اہل دنیا کے تمام قرض اتار دے گا۔ میں دیکھوں گا کہ قائم خان راجپوت کتنے پردوں میں چھپے گا؟ وقت کا نشتر تو آہنی دیواروں کو بھی کاٹ دیتا ہے۔''

اسیری کے زمانے میں ایک دن ایک نوجوان شجاع الدین کامران سے ملنے کیلئے آیا۔ کچھ دیر تک کامران آنے والے کو نہیں پہچان سکا...... مگر جب اس نے اپنے حافظے پر زور دیا تو ماضی کا ایک ایک دھندلا نقش روشن ہو گیا۔ وہ نوجوان شجاع الدین کامران کا ہم مکتب تھا۔ مولانا شمس الدین مرحوم کا ہونہار شاگرد' ایک غریب خاندان کا لائق فرزند' ایک ترک سپاہی کا بیٹا کمال الدین احمد...... وہ عمر میں شجاع الدین کامران سے دو تین سال بڑا تھا۔ مولانا شمس الدین کمال احمد کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ کمال مولانا کی درس گاہ کا سب سے ذہین طالب علم تھا۔ آج طویل عرصے کے بعد کامران نے اپنے بچپن کے ایک ساتھی کو دیکھا تھا۔ انتہائی ناسازگار فضا میں بھی کمال احمد کو دیکھ کر کامران کے ناراض چہرے پر زندگی کی تازگی و شادابی کا رنگ ابھر آیا تھا۔

''تم کیسے ہو کمال الدین احمد؟'' کامران نے بچپن کی یادوں کا سہارا لے کر اسی معصوم اور سادہ لہجے میں سوال کیا۔

''وقت بہت کم ہے میرے بھائی کامران مگر مختصراً بتائے دیتا ہوں کہ استاد گرامی کے انتقال کے بعد میں اپنی تعلیم جاری رکھنے کے لئے ہانسی چلا گیا تھا۔ وہاں میرے کچھ رشتے دار رہتے ہیں...... چند روز پہلے دہلی آیا اور پھر تم سے ملنے تمہارے گھر گیا تو اس ناخوشگوار واقعے کی اطلاع ملی۔''

''کمال احمد! تمہیں یہاں آتے ہوئے شرم محسوس نہیں ہوئی؟'' شجاع الدین کامران نے ایک چبھتا ہوا سوال کیا۔

''میں تم سے پہلے کہہ چکا ہوں کہ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ تم نہیں جانتے کہ میں بڑی سفارشوں کے بعد تم تک پہنچا ہوں۔ مجھے ملاقات کیلئے چند لمحے دیئے گئے ہیں۔ تمہیں خدا کا واسطہ ان لمحوں کو برباد نہ کرو...... اور یاد رکھو کہ دوستوں سے ملنے کیلئے کسی خاص مقام اور رعایت کا تعین نہیں کیا جاتا۔ میری نظر میں گھر اور قید خانہ دونوں برابر ہیں۔ میں صرف یہ کہنے کیلئے آیا ہوں کہ تم اپنے ماموں کے راستے سے ہٹ جاؤ۔ زندگی میں اور بھی خوبصورت راستے ہیں...... قدم تو بڑھاؤ...... بے شمار راہیں تمہارا استقبال کرنے کیلئے بے چین ہیں۔''

ابھی کمال الدین احمد کے لہجے کی گونج باقی تھی کہ کامران کی غضب ناک آواز ابھری۔

''تو آخر تم بھی قائم خان راجپوت کے نمائندے نکلے۔ واپس لوٹ جاؤ کمال الدین احمد! میں تمہاری شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتا۔ تم مولانا شمس الدین کے شاگرد ہو؟ مجھے یقین نہیں آتا۔'' شجاع الدین کامران غصے سے کانپنے لگا تھا۔

''میں مولانا شمس الدین ہی کا شاگرد ہوں...... اور مجھے اس نسبت پر فخر بھی ہے۔'' نوجوان کمال الدین احمد نے کسی اشتعال کے بغیر کہا۔ ''میں کس کا نمائندہ ہوں' اسے جانے دو۔ تم بس اتنا سمجھ لو کہ میں نے یہاں آنے سے پہلے تمہاری والدہ محترمہ سے ملاقات کی تھی۔ وہ تمہارے اندازے سے کہیں زیادہ غمزدہ ہیں۔ انہیں مزید کوئی دکھ نہ پہنچاؤ

کہ اس طرح تمہاری دنیا بھی خراب ہو جائے گی اور آخرت بھی...... وہ جس طرح کہتی ہیں اسے کسی حجت کے بغیر مان لو۔ قائم خان راجپوت کی حویلی میں دنیا کا بہترین خزانہ بھی پوشیدہ ہو تو اسے ٹھوکر مار دو کہ تمہاری ماں کی یہی مرضی ہے۔''

''میں اپنے سینے میں کسی خزانے کی ہوس نہیں رکھتا۔'' کامران مشتعل ہونے کے سبب کمال احمد کی بات سمجھنے سے عاجز تھا۔

''میں نے مثال دینے کیلئے خزانے کا لفظ استعمال کیا تھا۔'' کمال الدین احمد نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''کامران اپنی زندگی خراب نہ کرو کہ تمہارے خلاف اٹھنے والے بہت طاقتور ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ تم مجرم نہیں ہو مگر عدالت نے اہل دنیا کو جو داستان سنائی ہے اس نے تمہیں ایک داغدار انسان بنا دیا ہے۔''

''میں کسی کے سامنے اپنی پارسائی کا بھی دعویٰ نہیں کرتا۔ اب میں ان تمام داغوں کو اپنے بدن پر سجا کر پاکیزہ کرداروں کی محفل میں جاؤں گا۔ مجھے نصیحتیں مت کرو کہ میری سماعت بہت زخم خوردہ ہے۔ تمہیں میری بربادیوں کا ماتم کرنے کے بجائے سلطان ناصر الدین محمود کو مبارکباد پیش کرنا چاہئے کہ اس کی مملکت عدل و انصاف سے بھر گئی ہے۔''

''سلطان پر الزام تراشی نہ کرو کہ وہ ایک شریف النفس انسان ہیں۔'' کمال الدین احمد نے کامران کے ذہن پر چھائے ہوئے غبار کو صاف کرنے کی کوشش کی۔ ''انہیں کیا خبر کہ کرسی انصاف پر بیٹھنے والوں نے اپنے نفس کی غلامی اختیار کر لی ہے۔''

''پھر عدالت کی بنیاد کیوں ڈالی تھی اور کرسی انصاف کو کیوں سجایا تھا؟'' کامران کے غصے میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ ''اگر اسلام کے نام پر بھی یہی ظلم روا رکھنا تھا تو پھر برہمنوں کی حکومت میں کیا خرابی تھی؟ عدالتوں کی جگہ مذبح خانے کھول دیئے ہوتے۔ اچھوت نہ سہی مسلمان سہی۔ انسان کو قتل ہونا ہے' قتل ہوتا رہے گا۔'' کامران کے سوچنے کا انداز مکمل طور پر باغیانہ تھا۔

کمال الدین احمد حیرت و کرب کے ساتھ اپنے بچپن کے دوست کو دیکھتا رہا جس کے ذہن پر منفی خیالات نے یلغار کر دی تھی اور جہاں اندھیروں کے سوا کسی چیز کا گزر نہیں تھا۔

''تم چلے جاؤ کمال! اور کسی مکتب میں اپنی تعلیم مکمل کرو۔ میں بھی کسی زنداں یا مقتل کی درس گاہ میں داخل ہو کر موت کی تربیت حاصل کروں گا کہ اب فرشتہ اجل ہی میرا استاد ہے۔'' یہ کہہ کر شجاع الدین کامران نے منہ پھیر لیا۔

کمال الدین احمد کچھ دیر تک سکوت کے عالم میں کھڑا رہا اور پھر بلند آواز میں کہنے لگا۔ ''کامران! میں کسی امیر کا گماشتہ بن کر نہیں' ایک دوست کی حیثیت سے تمہارے پاس آیا تھا۔ اگر کبھی تمہیں میری گواہی کی ضرورت محسوس ہوئی تو تم مجھے کسی زمانہ ساز رشتے دار کی طرح بے زبان نہیں پاؤ گے۔ میں تم سے دور سہی مگر تمہارے لئے دعا کرتا رہوں گا۔''

''بس کمال واپس لوٹ جاؤ کہ مجھے تمہاری دعاؤں کی ضرورت نہیں ہے۔'' کامران اتنی زور سے چیخا کہ زنداں کے سناٹوں میں گہرا شگاف پڑ گیا۔

❋❋❋

کچھ دن بعد ایک اور تکلیف دہ واقعہ پیش آیا جس نے کامران کی اذیتوں میں مزید اضافہ کر دیا۔ داروغہ زنداں نے اسے تنہائی میں طلب کرتے ہوئے کہا۔

''اگر تم میرے سامنے قائم خان راجپوت سے اپنے جرم کی معافی مانگ لو تو پھر یہ زنجیریں بھی کٹ سکتی ہیں اور تمہارے نامرادروز وشب پر آسودہ زندگی کے دروازے بھی کھل سکتے ہیں۔''

کامران حیرت سے داروغہ زنداں کو دیکھتا رہا۔ پھر بہت نرم لہجے میں بولا۔ ''یہ آپ کی خواہش ہے یا قائم خان کے ذہن میں ایسا کوئی ہمدردانہ خیال پیدا ہوا ہے؟''

''قائم خان نے تمہاری بے سہارا ماں پر ترس کھا کر یہ فراخدلانہ پیشکش کی ہے۔'' داروغہ زنداں ایک ظالم کی شان میں قصیدہ پڑھ رہا تھا۔ ''قائم خان ایک عظیم انسان ہے......''

ابھی داروغہ زنداں کی بات مکمل ہونے بھی نہیں پائی تھی کہ شجاع الدین کامران کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ ''اگر وہ مجھے سزائے موت دینے پر قادر ہوتا تو میں اس سے اپنی زندگی کی بھیک مانگنا بھی گوارا نہ کرتا۔ وہ اس دنیا کا سب سے جھوٹا انسان ہے......اور قانون ایک درندے کی مسلسل وکالت کر رہا ہے۔ پہلے قاضی عدالت نے اس کے گناہ کی پردہ پوشی کی اور اب آپ اس کے چہرے کی سیاہی کو دھونے کی کوشش کر رہے ہیں۔'' کامران کا لہجہ بہت تلخ تھا۔

داروغہ زنداں بھڑک اٹھا۔ ''تجھے قید و بند کی سختیوں نے بدحواس کر دیا ہے۔ میں قائم خان کی وجہ سے تیری بے ہودگیوں کو نظر انداز کر رہا ہوں تو اس دن بھی حضور سلطان کی شان میں گستاخیاں کر رہا تھا اگر میں چاہوں تو تجھے ناصر الدین محمود کے سامنے پیش کر کے تیری زندگی کا قضیہ ہی ختم کرا سکتا ہوں ......تو جانتا ہے کہ والی ہند پر الزام تراشی کے جرم کی سزا موت کے سوا کچھ نہیں۔'' داروغہ زنداں نے کمال الدین احمد سے ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔

''میں تو خدا سے چاہتا ہوں کہ میری زندگی میں وہ مبارک دن آئے جب میرے ہاتھ ہوں اور سلطان ناصر الدین محمود کا گریبان ......پھر میں ان سے پوچھوں کہ آپ کے سایۂ کرم میں کیسے کیسے بے ضمیر پرورش پا رہے ہیں۔'' شجاع الدین کامران کو زنداں کے اندھیرے بھی خوف زدہ نہیں کر سکے تھے اور وہ اسی بے باک لہجے میں گفتگو کر رہا تھا جو اس کی فطرت کی خاص پہچان تھا۔

داروغہ زنداں کامران کو سلطان ناصر الدین محمود کے سامنے پیش نہیں کر سکتا تھا کہ اس طرح اس بے قصور نوجوان کو انصاف مل جاتا اور قائم خان راجپوت کا منصوبہ ناکام ہو جاتا۔ وہ تو محض ایک شاطرانہ دھمکی تھی جس سے متاثر ہو کر شجاع الدین کامران گھٹنے بھی ٹیک سکتا تھا' مگر داروغہ زنداں کو اندازہ نہیں تھا کہ یہ بائیس تیئس سالہ نوجوان کس قدر سرکش فطرت کا مالک ہے؟ بالآخر قید خانے کے منتظم اعلیٰ نے اپنی جھوٹی انا کو برقرار رکھنے کے لئے شجاع الدین کامران کو مزید دھمکیاں دیں مگر جب ایک سربکف راجپوت زادے نے ظلم و ناانصافی کے مطالبات ماننے سے انکار کر دیا تو داروغہ زنداں تشدد پر اتر آیا اور پھر کامران کے جسم پر اس انداز سے مشق ستم کی گئی کہ وہ زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے بے ہوش ہو گیا۔

پھر داروغہ زنداں نے اپنے ظلم کے واضح نشانات کو چھپانے کے لئے سعدیہ خانم اور کامران کی ملاقات پر بھی پابندی لگا دی' نہ کوئی وکیل' نہ کوئی ترجمان' نہ کوئی مشفق' نہ کوئی مہربان ......وقت کے آہنی گنبد میں ایک بیوہ کی کمزور آواز کون سنتا؟

✻✻✻

دو سال تک اپنی ناکردہ گناہی کی سزا پانے کے بعد کامران قید خانے سے باہر آیا تو سعدیہ خانم دروازے پر بیٹھے کی منتظر تھی۔ اس نے دیوانہ وار آگے بڑھ کر کامران کو سینے سے لگایا اور اس کے پتھر جیسے چہرے کو دونوں ہاتھوں

کے درمیان لے کر دیکھنے لگی۔ "بیٹے یہ کیسے نشانات ہیں؟ جب تجھے حوالہ زنداں کیا گیا تھا تو اس وقت تیرا چہرہ بے داغ تھا' پھر یہ سب کچھ کیسے ہو گیا؟ آخر مجھے ایک سال تک تجھ سے دور کیوں رکھا گیا؟"

شجاع الدین کامران وہاں خاموش رہا' لیکن گھر آ کر اس نے سعدیہ خانم کو داروغہ زنداں سے ہونے والی گفتگو اور بعد کے تمام واقعات تفصیل سے سنا ڈالے۔ اس نے اپنی سنگدلی کو چھپانے کے لئے آپ پر ملاقات کے دروازے بند کر دیئے پتا نہیں اس نے ایسا کیوں کیا؟ ایک مجبور و غمزدہ ماں اگر اپنے بیٹے کے جسم کچھ نئے زخموں کے نشانات دیکھ بھی لیتی تو اس سے کیا فرق پڑتا؟ خوفزدہ تو ان سے ہوا جاتا ہے جن کے ہاتھوں میں طاقت ہوتی ہے۔ نحیف و نزار لوگوں سے ڈرنا ہی کیا کہ ان کی آوازیں اپنے گھر کی چار دیواری سے باہر نہیں جاتیں۔

"میرے جذباتی بیٹے! کاش تو اس حقیقت کو سمجھ لیتا کہ طاقت کے بغیر اس دنیا میں سانس لینا کتنا دشوار ہے؟ تیرے پاس نہ قلم کی طاقت ہے اور نہ تلوار کی ...... پھر تو کس بنیاد پر ستم گروں کا مقابلہ کرنے چلا ہے؟" سعدیہ خانم نے کامران کو راہ راست پر لانے کی ایک اور کوشش کی۔

شجاع الدین کامران کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے چہرے پر تناؤ کی کیفیت پیدا ہونے لگی۔ "ہاں مام! اب میں طاقت حاصل کروں گا' پھر قائم خان راجپوت سے معرکہ آرائی ہو گی۔"

"نہیں بیٹے! انتقام کا یہ غبار تیرے دل و دماغ کو زنگ آلود بنا دے گا ......" سعدیہ خانم کامران کی حالت دیکھ کر گھبرا گئی۔ اس کا پرانا مرض دوبارہ ابھر آیا تھا۔ "تو قائم خان سے انتقام لینے کے لئے زندہ نہیں رہے گا' تجھے اپنے بزرگوں کا کھویا ہوا وقار بحال کرنا ہے' تیرا دادا شہید تھا اور تیرا باپ ملک و ملت کا وفادار ...... تو شہادت کے راستے پر جائے گا یا وفاداری کی شاہراہ پر ...... قائم خان کی کمینگی کا جواب یہ ہے کہ تو عظمت و بلندی کا مینار بن جا کہ پھر تجھے دیکھتے ہوئے ان کی گردنیں کج ہو جائیں اور آنکھیں پتھرا جائیں۔"

❋❋❋

اب شجاع الدین کامران طاقت حاصل کرنے کے لئے شاہی فوج میں شمولیت اختیار کرنا چاہتا تھا۔ ہزاروں دشواریوں کے بعد وہ فوج کے اعلیٰ افسروں تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ مگر یہاں بھی گردش تقدیر اس کے تعاقب میں تھی۔ فوجی افسر کامران کے مضبوط جسم اور دراز قامتی سے متاثر ہو چلے تھے لیکن قائم خان راجپوت کی درپردہ سازشوں نے ایک بار پھر اس کے مستقبل پر سیاہی پھیر دی۔ فوجی افسروں کو بتایا گیا کہ شجاع الدین کامران کا باپ رائے نعیم الدین ذیشان حکومت کا غدار تھا اور اسی لئے اسے موت کی سزا دی گئی تھی۔ فوجی افسروں نے کامران سے جواب طلب کیا تو اس نے پر جوش لہجے میں کہا۔

"میں شہیدوں اور وفاداروں کی اولاد ہوں۔"

فوجی افسر کامران کے دعوے کا مفہوم سمجھ گئے اور انہیں اس کی بے گناہی کا یقین آ گیا۔ مقتول رائے نعیم الدین کو سلطان التمش کی بیٹی رضیہ سلطانہ کی حمایت میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنا پڑا تھا۔ وہ ایک سیاسی جنگ تھی' فوجی افسروں نے اس حقیقت کو پوری سچائی کے ساتھ محسوس کیا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس وقت سلطان التمش کا لڑکا سلطان ناصر الدین محمود برسر اقتدار تھا۔ اس لئے فوجی عہدیداروں نے کامران کے باپ کی قربانی کو غداری سے تعبیر نہیں کیا بلکہ اپنے سامنے کھڑے ہوئے نوجوان کو ستائشی نظروں سے دیکھا۔

کامران اپنی پہلی فتح کے قریب پہنچ چکا تھا مگر اچانک کسی خفیہ ہاتھ نے بساط زندگی کو ایک بار پھر الٹ دیا۔ فوجی افسروں کو بتایا گیا کہ شاہی سپاہ میں شامل ہونے کی آرزو رکھنے والا نوجوان ایک سزا یافتہ چور ہے' پھر جب قاضی

عدالت نے اس بات کی تصدیق کر دی تو کامران کو انتہائی ذلت و رسوائی کے بعد فوجی خیمے سے نکال دیا گیا۔ طاقت حاصل کرنے کا خواب بکھر چکا تھا۔

❊❊❊

پھر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ شجاع الدین کامران کرشن راؤ کے مکان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جب کرشن راؤ کے ملازموں نے بتایا کہ سعدیہ خانم کا بیٹا اس سے ملنا چاہتا ہے تو بوڑھے راجپوت کے خشک اور موٹے ہونٹوں پر ایک عیار مسکراہٹ ابھر آئی۔

''اسے فوراً بھیج دو......'' کرشن راؤ نے اپنے ملازمین کو حکم دیتے ہوئے کہا۔ ''میں جانتا تھا کہ وہ ایک دن میرے پاس ضرور آئے گا۔''

کرشن راؤ کا ایک مسلح خادم تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا اور پھر کچھ دیر بعد ہی شجاع الدین کامران اس شخص کے سامنے کھڑا تھا جس نے کئی سال پہلے سعدیہ خانم کو بڑی اذیتیں پہنچائی تھیں۔

''آ! میرے ناراض بیٹے!'' کرشن راؤ کے مکروہ چہرے پر اس کے منافقانہ جذبے پوری شدت کے ساتھ روشن ہو گئے۔ ''کیسے یاد آ گئی مجھ گناہ گار کی؟''

''مجھے طاقت دے کرشن راؤ' میں تیرے پاس اسی لئے آیا ہوں۔'' شجاع الدین کامران کی آواز سے کمرہ گونج اٹھا اور کرشن راؤ کے مسلح خدمت گار ایک مسلم نوجوان کو حیرت سے دیکھنے لگے۔

❊❊❊

''کیسی طاقت؟'' شجاع الدین کامران کی بات سن کر کرشن راؤ بھی چونک اٹھا تھا اور اس کے چہرے پر ابھرنے والی فاتحانہ مسکراہٹ کچھ دیر کیلئے معدوم ہو گئی تھی۔

''وہی طاقت جو میرے دشمنوں سے میرے زخموں کا حساب طلب کر سکے۔'' کامران نے انتہائی تند و تیز لہجے میں کہا۔

''بیٹھ جا! میرے خاندان کی روٹھی ہوئی نشانی۔'' کرشن راؤ پوری طرح سنبھل چکا تھا۔ اس نے اپنے خدمت گاروں کو آنکھ کے اشارے سے باہر جانے کیلئے کہا اور جب مکمل تنہائی ہو گئی تو بوڑھا راجپوت دوبارہ کامران سے مخاطب ہوا۔

''میں تو ایک تھکا ہوا بت پرست ہوں۔'' کرشن راؤ کی آواز بہت زیادہ سرد تھی۔ ''پتھر کے مجسموں کا پجاری اہل ایمان کو کس طرح طاقت دے سکتا ہے؟ مجھے سمجھنے کی کوشش کر میرے بچے! بڑھاپے میں تو میری عقل بھی مفلوج ہو کر رہ گئی ہے۔'' کرشن راؤ کی عیاریاں کئی زاویوں سے شجاع الدین کامران کے گرد حصار کھینچ رہی تھیں۔

''کرشن راؤ! بہت زمانہ ہوا کہ میری ماں نے تیری امداد قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا مگر اب وقت بدل چکا ہے اور میں تیری طرف ہاتھ بڑھا رہا ہوں۔ لا اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے کہ آج مجھے تیری شدید ضرورت ہے۔'' کامران کی حیثیت بظاہر ایک بھکاری کی سی تھی' مگر چہرے پر راجپوتوں کا وہی نسلی جلال روشن تھا اور زبان میں وہی تلخی تھی جو کسی حکمران قوم کے لہجے کا اظہار کرتی ہے۔

''کیسی مدد؟ میں ابھی تک کچھ نہیں سمجھا۔'' کرشن راؤ اپنے تمام تر تجربے کے ساتھ یہ الجھی ہوئی بازی کھیل رہا تھا۔

کامران نے مختصراً اپنے ماموں قائم خان راجپوت کے ظلم و تشدد کا ذکر کیا مگر یاسمین خانم کا حوالہ نہیں آنے دیا۔

کرشن راؤ خاموشی سے ایک برگشتہ نوجوان کی روداد زندگی سنتا رہا۔ پھر بڑے سفاکانہ لہجے میں بولا۔ ''تیرا دادا اسلام کے نام پر بت پرستوں کے ہاتھوں مارا گیا......اور تیرے باپ کو اسلام کے دعویداروں نے قتل کر دیا۔ تیری ماں نئے مذہب کو دل سے لگائے ہوئے در در بھٹک رہی ہے......اور تو اپنے ہم مذہبوں کے جور و جفا کا شکار ہو کر ایک بت پرست کے دروازے پر ہاتھ پھیلائے کھڑا ہے......آخر تجھے اسلام نے کیا دیا؟ میں نے بہت دن پہلے تیری ماں سے بھی یہی سوال کیا تھا اور وہ میرے منہ پر تھوک کر چلی گئی تھی۔ آج میں تیرے سامنے بھی وہی سوال دہراتا ہوں اگر تو مجھے مطمئن کر دے گا تو یقین کر کہ تجھ پر بے پناہ طاقتوں کے دروازے کھل جائیں گے۔ میں تیرے دست و بازو کو نئے انداز سے تراشوں گا۔ پھر تیرا ہاتھ قائم خان کے حلقوم پر ہوگا اور وہ تجھ سے اپنی زندگی کی بھیک مانگ رہا ہوگا۔''

''مجھے اسلام سے کوئی شکایت نہیں' اس کے بعض ماننے والوں سے گلہ ہے۔'' شجاع الدین کامران کے وہی تیور تھے۔ ''کرشن راؤ! مذہب اور عقیدت کی بات نہ کر کہ وہ انسان کا سب سے نازک مسئلہ ہے۔ غربت و افلاس بھی اس جذبے کو فروخت کرنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ میں تیرے پاس اپنا مذہب بیچنے نہیں آیا ہوں' مجھے قائم خان راجپوت سے لڑنے کیلئے سونے کی تلوار دے۔''

''یہ سودا اتنا آسان نہیں رائے نعیم الدین ذیشان کے جذباتی بیٹے۔'' اب کرشن راؤ اپنے اصلی رنگ میں ظاہر ہونے لگا۔ ''تجارت کی بات کرتا ہے تو تجھے بازار کے مزاج کو سمجھنا ہوگا۔ میں یقیناً اس قابل ہوں کہ تجھے سونے کی کیا' ہیرے جواہرات سے مرصع تلوار بھی دے سکتا ہوں مگر اس کے بدلے میں تو مجھے کیا دے گا؟''

کرشن راؤ نے ایک آسان سا سوال کیا تھا' مگر اس کا جواب بہت مشکل تھا۔ شجاع الدین کامران کچھ دیر تک الجھتا رہا اور پھر ایک طویل ذہنی کشمکش کے بعد کہنے لگا۔

''میں تجھے اپنے مذہب کے سوا سب کچھ دے سکتا ہوں۔'' کامران کے لہجے میں شکستگی کے بجائے تمکنت تھی' جوش تھا۔ ''میں تجھے اپنے توانا بازو دے سکتا ہوں' تیری مزدوری کر سکتا ہوں مگر غلامی نہیں۔''

کرشن راؤ اس پیشکش کے بارے میں سوچنے لگا پھر مسکراتے ہوئے بولا۔ ''سونے کی تلوار سے تیری کیا مراد ہے؟''

''میں فنون سپہ گری سے ناواقف ہوں۔'' کامران نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے شاہی افواج میں شامل ہونے کی کوشش کی تھی اور سلطان ناصرالدین محمود کے اعلیٰ فوجی افسروں نے مجھے منتخب بھی کر لیا تھا' مگر قائم خان کی گواہی نے میرے آبرومندانہ مستقبل پر ایسی لکیر کھینچ دی کہ میرا خون بھی اسے صاف نہیں کر سکتا۔'' شجاع الدین کامران حالات کو سمجھے بغیر اپنے جذبات کا غبار دھونے کی کوشش کر رہا تھا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ شمشیرزنی کی تربیت حاصل کروں اور جب میرے بازوؤں میں کاٹ پیدا ہو جائے تو میں قائم خان کا پورا جسم زخموں سے بھر دوں ......اور اس کا چہرہ سیاہ کر کے دہلی کے ایک ایک کوچے میں پھراؤں ......اور اس شہر کے بسنے والے ایک ایک فرد کو بتاؤں کہ یہ وہ شخص ہے جس نے اپنے خون کے ساتھ بے وفائی کی اور جس نے چند سکوں کیلئے دربار شاہی میں بھکاریوں کی طرح ہاتھ پھیلا دیئے۔'' شجاع الدین کامران برسوں کی سلگتی ہوئی آگ کو بجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''مجھے اپنی زندگی کے اس اہم ترین فیصلے تک پہنچنے کیلئے کچھ وقت درکار ہوگا۔'' آخر کرشن راؤ نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔

''وقت؟'' کامران سر سے پاؤں تک ایک سوال بن کر رہ گیا۔ ''تجھے کتنا وقت درکار ہوگا کرشن راؤ؟ کیا تو سوچتے سوچتے کئی ماہ گزار دے گا جبکہ مجھ پر ایک ایک لمحہ گراں ہے۔'' شجاع الدین کامران ایک برق تپاں کی طرح بے قرار نظر آ رہا تھا۔

''بس ایک رات۔'' کرشن راؤ نے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''آج رات کے اندھیرے میں میرا ذہن کسی نتیجے پر پہنچ جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ آنے والی صبح تیرے لئے نئی زندگی کا پیغام لے کر آئے۔'' کرشن راؤ بہت محتاط لہجے میں بول رہا تھا۔

''ایک رات کا فاصلہ بہت زیادہ ہے کرشن راؤ!'' کامران کا پیچ و تاب ناقابل بیان تھا۔ ''ہو سکتا ہے کہ اس دوران میرے قدم کسی نئے راستے پر چلے جائیں ......اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قائم خان راجپوت مجھے ہلاک کر ڈالے۔

تشدد کا نشانہ نہ ہوگا۔ میں نہیں چاہتا کہ انتقام سے پہلے ایک کمزور جانور کی موت مار دیا جاؤں۔ مجھے آزمائش میں نہ ڈال کرشن راؤ! میرے پاس وقت بہت کم ہے۔"

"مجھے تیرے ہاتھوں میں تلوار دینے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ابھی اور اسی وقت میرے ایک اشارے پر فولاد کے ٹکڑوں کا انبار لگایا جا سکتا ہے۔ مگر یہ سارے ٹکڑے اس وقت تک بے جان ہیں جب تک ان کے پیچھے کوئی منظم منصوبہ موجود نہ ہو۔" کرشن راؤ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بول رہا تھا۔

"قائم خان راجپوت کی دشمنی اتنی آسان نہیں۔ وہ حکومت کا ایک بااثر آدمی ہے۔ اگر میرے منصوبے میں کہیں کوئی ہلکی سی بھی کوتاہی باقی رہ گئی تو وہ اژدھا مجھے اور میرے سیکڑوں ساتھیوں کو جھینگروں اور چھپکلیوں کی طرح نگل جائے گا۔ اس لئے مجھے سوچنے دے بیٹے کہ بس ایک رات کی بات ہے۔ پھر اجالا ہی اجالا ہے۔ ایسا اجالا جس کی ایک ایک کرن میں تیرے دشمنوں کا خون جھلک رہا ہوگا۔" کرشن راؤ کا نفاق اپنے عروج پر تھا۔

شجاع الدین کامران لاجواب ہو کر رہ گیا۔ پھر جب وہ واپس جانے لگا تو کرشن راؤ نے اپنے معتمد خاص راما راؤ کو آواز دی۔ راما راؤ دروازے پر کھڑا تھا۔ اپنے آقا کی آواز سنتے ہی اندر داخل ہوا اور سوالیہ نظروں سے کرشن راؤ کی طرف دیکھنے لگا۔ راما راؤ پچاس پچپن سال کا ایک دراز قامت راجپوت تھا۔ کشادہ سینہ' مضبوط بازو' چوڑی پیشانی' گھنی مونچھیں' بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اور تانبے کی طرح دہکتی ہوئی سرخ رنگت نے اسے ایک بارعب انسان بنا دیا تھا۔

"مہاراج نے مجھے کس لئے یاد فرمایا ہے۔" راما راؤ نے بڑے ادب کے ساتھ سوال کیا تھا۔

"راما راؤ یہ ہمارا روٹھا ہوا بیٹا ہے شجاع الدین کامران۔" کرشن راؤ نے بڑی عیاری کے ساتھ کامران کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "اس کے باپ دادا حملہ آور مسلمانوں کی طاقت کے سیلاب میں بہہ گئے۔ یہ اس قافلے کا ایک بھٹکا ہوا مسافر ہے جسے امیر کارواں نے سسک سسک کر مرنے کیلئے راستے میں چھوڑ دیا ہے۔ اس کے بڑوں نے باہر سے آنے والے قزاقوں کے ہاتھ پرکھوں کا دھرم بیچ دیا مگر یہ بڑے گھاٹے کا سودا تھا۔ باپ کے خون سے اسی کے ہم مذہبوں نے اپنی شمشیروں کی پیاس بجھا لی اور بیوہ ماں پر اسلام کے نام لیواؤں نے اپنے گھروں کے دروازے بند کر دیئے۔ عزیزوں نے اس طرح منہ موڑا کہ پلٹ کر ایک بار بھی نہیں دیکھا۔ بے چاری نے محنت و مزدوری کر کے اسے جوان کیا تو حقیقی ماموں قائم خان راجپوت اس کی جان کا دشمن ہو گیا۔ نہ جانے دکھوں کا یہ کیسا سلسلہ ہے کہ کہیں ختم ہی نہیں ہوتا۔"

ابھی کرشن راؤ کچھ اور کہتا کہ اچانک کامران درمیان میں بول اٹھا۔ "کرشن راؤ! میرے بزرگوں کا ذکر نہ چھیڑ کہ یہ سودا صرف تیرے اور میرے بیچ طے ہوا ہے۔" کامران کا لہجہ بہت تلخ تھا۔ "کیا تو میری بربادیوں کی تشہیر کر کے مجھے اپنے آدمیوں کے سامنے رسوا کرنا چاہتا ہے؟ تیری یہ حرکت کاروباری شرائط کے خلاف ہے۔ میں نے تیرے ہاتھ صرف اپنی جسمانی مشقت فروخت کی ہے۔ میں اپنے ذاتی مسائل میں کسی قسم کی مداخلت برداشت نہیں کرتا۔"

"نہیں میرے بیٹے! میں تیری تحقیر نہیں کر رہا ہوں۔" کرشن راؤ کامران کے چہرے پر برہمی کا رنگ دیکھ کر اچانک پلٹ گیا تھا۔ راما راؤ ہمارا خاص آدمی ہے۔ بھگوان نہ کرے' اگر مجھے تیری رسوائی ہی منظور ہوتی تو میں اپنے ملازموں کی فوج کو جمع کر لیتا پھر تیری محرومیوں کے قصے مزے لے لے کر سناتا...... لیکن تو دیکھ رہا ہے کہ اس کمرے میں ہم تینوں آدمیوں کے علاوہ کوئی چوتھا شخص موجود نہیں۔ راما راؤ کو بھی محض اس لئے طلب کیا گیا ہے کہ وہ تیرے کام میں بہت معاون ثابت ہوگا'

کرشن راؤ کی منافقت کے چند تیز چھینٹوں نے کامران کے غصے کی آگ کو بجھا دیا۔

"راما راؤ! آج سے کامران ہمارے حلقے میں شامل ہو گیا ہے۔" کرشن راؤ نے بڑی ذہانت سے ایک نوجوان کی سرکشی کو کچل دیا تھا۔ "کامران کو چاندی کے اتنے سکے دے دو کہ وہ اور اس کی ماں کئی سال کیلئے اپنی تمام ضرورتوں سے بے نیاز ہو جائیں۔" کرشن راؤ نے اپنے معتمد خاص کو حکم دیتے ہوئے کہا۔

راما راؤ چند قدم پیچھے ہٹا اور ملحقہ کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا پھر کچھ دیر بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھوں میں سکوں سے بھری ہوئی ایک تھیلی تھی۔

راما راؤ نے مسکراتے ہوئے وہ تھیلی کامران کی طرف بڑھا دی۔

"یہ کیا ہے؟" شجاع الدین کامران کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔ اس کے ماتھے پر کئی بل نمایاں ہو گئے تھے۔

"یہ تمہاری خدمات کا پیشگی معاوضہ ہے۔" کرشن راؤ نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ "اس تھیلی میں وہ چیز پوشیدہ ہے جو تمہیں دنیا کے بیشتر غموں سے نجات دے دے گی۔"

"ابھی میں نے کوئی مزدوری نہیں کی۔ پر یہ معاوضہ کیسے قبول کر لوں؟" شجاع الدین کامران تھیلی کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے جھجک رہا تھا۔

"یہ معاوضہ نہیں۔" کرشن راؤ بہت دیر کے بعد مسکرایا۔ "یہ ہماری تاجرانہ دوستی کی پہلی نذر ہے۔ رشتوں کو استوار کرنے کیلئے پہلا تحفہ ہے اس کے بعد ہم اور قریب آئیں گے پھر تیرے گھر پر سونے کے سکوں کی بارش ہو گی۔"

شجاع الدین کامران حیرت و سکوت کے عالم میں کھڑا رہا۔

"یہ سوچنے کا وقت نہیں۔" کرشن راؤ نے پرجوش انداز میں کہا۔ "تم لوگوں کو سوچنے کی بہت عادت ہے اور اسی سوچ نے تیرے باپ کو ہلاکت کی منزل تک پہنچا دیا۔ اگر وہ ایک لمحے کیلئے سلطان سے اپنے طرز عمل پر معذرت کر لیتا تو تمہیں زندگی کے یہ سیاہ دن کبھی نہ دیکھنا پڑتے۔ قائم خان راجپوت تجھے محض اس لئے ستا رہا ہے کہ تیرے پاؤں زمین سے اکھڑ گئے ہیں۔ اپنے قدموں کو سونے کی زنجیروں سے جکڑ لے۔ پھر تو بھی معتبر ہو جائے گا۔ شاید تجھے لوگ سجدے بھی کرنے لگیں اور ایک دن تو بھی کسی دیوتا کا روپ دھار لے۔"

کامران کے چہرے پر کئی رنگ ابھر کر ڈوبتے رہے۔

"آج میں تجھے وہ چیز دے رہا ہوں کہ جس کے بغیر کوئی تحریک کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوتی۔ اسے مضبوطی سے پکڑ لے۔" کرشن راؤ بڑے جذباتی حربے استعمال کر رہا تھا۔

بالآخر شجاع الدین کامران نے تھیلی کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

"اب تیری فتح کو دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔" کرشن راؤ نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "تو نے وقت کی رفتار کا صحیح اندازہ کر لیا اب قائم خان راجپوت کی کیا حیثیت ہے' میں تو ساری دنیا کو تیرے آگے خم ہوتے دیکھ رہا ہوں۔"

"تو ٹھیک کہتا ہے کرشن راؤ! یہی چیز تو مجھ سے روٹھ گئی تھی۔" کامران نے نقرئی سکوں کی تھیلی کو بہت غور سے دیکھا اور تیز قدموں کے ساتھ نکل کر چلا گیا۔

✻✻✻

کامران کے جاتے ہی کرشن راؤ نے ایک اور قہقہہ لگایا۔ یہ بڑا وحشیانہ قہقہہ تھا۔ راما راؤ بھی اس کی دیوانگی میں شریک ہو گیا تھا۔

''آج میں بہت خوش ہوں راما! بہت خوش' تیرے اندازے سے بھی زیادہ خوش۔'' کرشن راؤ ہذیانی لہجے میں بول رہا تھا۔ ''آج میرے بدترین دشمن کا بیٹا مجھ سے اپنی زندگی کی بھیک مانگنے آیا تھا اور میں نے اس کے پھیلے ہوئے دامن میں چاندی کے چند ٹکڑے ڈال دیئے۔'' یہ کہہ کر اس نے سعدیہ خانم کے ساتھ پیش آنے والا پورا واقعہ تفصیل سے سنا دیا۔

''پربھو (مالک) یہ آپ کی بڑی فتح ہے۔'' راما نے اس کے گھٹنوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔

''اس کی ماں نے مجھے بڑے دکھ دیئے ہیں راما۔'' یہ کہتے کہتے کرشن راؤ کا بوڑھا جسم کانپنے لگا۔

راما راؤ اپنے آقا کی حالت دیکھ کر گھبرا گیا۔ ''ہمارے لئے آپ کا جیون بہت مول وان (قیمتی) ہے۔'' اس کے ساتھ ہی راما راؤ ملحقہ کمرے کی طرف بھاگا پھر جب وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں سونے کی ایک منقش صراحی تھی جس پر جگہ جگہ قیمتی پتھر جگمگا رہے تھے۔ راما راؤ نے سونے کے پیالے میں شراب بھری اور اپنے مالک کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

''پربھو! تھوڑی سی مدرا پی لیں کہ اس کے چند گھونٹ آپ کے من میں بھڑکتی ہوئی اگنی کو بجھا دیں گے۔ ویدنے کہا ہے کہ یہ کرودھ (غصہ) آپ کیلئے بڑا ہانی کارک (نقصان دہ) ہے۔''

کرشن راؤ جس کی عمر ستر سال سے متجاوز ہو چکی تھی۔ اپنے خدمت گار راما راؤ کے اس احساس ذمہ داری سے بہت خوش ہوا اور شراب کے بھرے ہوئے پیالے کو ایک ہی سانس میں پی گیا۔

کچھ دیر تک خاموش بیٹھا رہا پھر آہستہ آہستہ کہنے لگا۔ ''راما! میں ہر اس ہندو سے انتقام لوں گا جو اپنے مذہب کو چھوڑ کر مسلمان ہو گیا ہے...... مگر میرا پہلا ہدف وہ لوگ ہوں گے جو میرے رشتے دار ہیں اور رشتے داروں میں سرفہرست اس عورت کا نام ہے جو آج کل سعدیہ خانم کہلاتی ہے...... اور جسے اپنے اکیلے خدا پر بڑا ناز ہے۔'' کرشن راؤ کا لہجہ بہت دھیما تھا' مگر لفظوں کے درمیان انتقام کی آگ اسی شدت سے بھڑک رہی تھی۔ ''راما! میرا بدلہ لینے کا ڈھنگ بڑا انوکھا ہوگا۔ سعدیہ خانم سوچ بھی نہیں سکتی کہ میں اسے کس طرح اذیت پہنچاؤں گا؟ کامران اپنے ماموں کو نیچا دکھانے کیلئے بے قرار ہے مگر مجبوریاں اس کے ہاتھوں کو اٹھنے نہیں دیتیں۔ وہ مفلس اور بے سہارا ہے۔ میری دولت اس کے ہاتھوں کو اتنا دراز کر دے گی کہ وہ بہت آسانی کے ساتھ قائم خان کے گریبان تک پہنچ جائیں گے۔'' کرشن راؤ شراب کے نشے سے سرشار ہو کر اپنے منصوبے کو بے نقاب کر رہا تھا۔ ''اگر کامران قائم خان کو ہلاک کرنے میں کامیاب ہو گیا تو یہ ہماری دوہری فتح ہوگی۔ قائم خان کی لاش قبر میں اتار دی جائے گی اور کامران کو قتل کے جرم میں دار پر کھینچ دیا جائے گا۔ پھر...... پھر......'' کرشن راؤ اچانک وحشیوں کی مانند ہنسنے لگا۔ ''پھر سعدیہ خانم کی گریہ وزاری قابل دید ہوگی۔ کوئی نہیں جانتا راما کہ کیا حشر اٹھے گا اور کیسا ماتم برپا ہوگا بس دیوتا ہی جانتے ہیں۔''

راما راؤ اپنے آقا کی ذہانت کو پہلے بھی تسلیم کرتا تھا' مگر آج تو بوڑھے راجپوت کا ذہن ان راستوں پر سفر کر رہا تھا جہاں سے گزرنے کے بارے میں کوئی عام انسان سوچ بھی نہیں سکتا۔

''مہاراج!'' ایک بار پھر راما راؤ گھٹنوں کے بل جھک گیا۔ ''اس میں کوئی سندیہہ (شک) نہیں کہ آپ ہی ہندو دھرم کے (کلنک) ہیں۔ میں بڑے بڑے سنتوں اور پجاریوں کو دیکھ رہا ہوں کہ وہ کرانتی (انقلاب) کے بعد اپنے گھروں میں بے خبری کی نیند سو رہے ہیں بس ایک آپ ہیں کہ اکیلے جاگ رہے ہیں اور یہ غم آپ کو ایک پل کیلئے بھی سونے نہیں دیتا۔'' راما راؤ اپنے آقا کی تعریف میں زمین و آسمان کے فاصلے کم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

کرشن راؤ نے خمار آلود آنکھوں سے اپنے وفادار خادم کی طرف دیکھا اور لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''آخر تو

کیا کہنا چاہتا ہے راما؟"
"میں بھگوان سے آپ کے جیون کیلئے مزید ایک ہزار سال کی بھیک مانگتا ہوں۔" راما راؤ کچھ اور خم ہو گیا تھا۔
"ابھی ہم بہت دن زندہ رہیں گے راما! مگر تو اتنا فکرمند کیوں ہے؟" کرشن راؤ نے چونک کر پوچھا۔
"کہیں وہ نوجوان ملیچھ قائم خان پر حملہ کرتے ہوئے پکڑا نہ جائے اور پھر اس کی زبان کاٹنے لگے۔"
"اس سے کیا فرق پڑتا ہے راما! کسی کے ہاتھ کانپیں یا زبان...... ہمارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔" کرشن راؤ ہر خطرے سے بے نیاز نظر آ رہا تھا۔
"وہ کہہ سکتا ہے کہ قائم خان پر حملہ کرنے کی طاقت آپ نے اسے بخشی تھی۔" راما راؤ کے لہجے سے تشویش کا اظہار ہو رہا تھا۔
"نہیں راما! ہرگز نہیں۔" کرشن راؤ اس طرح ہنسا جیسے وہ ساری دنیا کا مذاق اڑا رہا ہو۔ "کیا تو سمجھتا ہے کہ ہم کامران کے حالات سے بے خبر ہیں؟ ہماری آنکھیں ہر وقت اپنے دشمنوں کا تعاقب کرتی رہتی ہیں' ہمیں معلوم ہے کہ وہ ایک سزا یافتہ مجرم ہے پھر کون اس کی باتوں پر اعتبار کرے گا۔"
"ٹھیک ہے پربھو! بڑوں کی باتیں بڑے ہی جانیں۔" راما راؤ نے سر جھکا دیا۔ "میں تو مہاراج کا سیوک ہوں کچھ کہنے کی یوگتا (صلاحیت) نہیں رکھتا۔ پھر بھی آپ کو کچھ ہو گیا تو دہلی کے سارے ہندو اناتھ (یتیم) ہو جائیں گے۔"
"کچھ نہیں ہوگا راما! ہمیں کچھ نہیں ہوگا۔" اب شراب کے اثر سے کرشن راؤ جھومنے لگا تھا۔ "ہم اس وقت تک زندہ رہیں گے جب تک رام راج (ہندو اقتدار) واپس نہیں آ جائے گا۔"
"بھگوان کرے ایسا ہی ہو۔" راما راؤ سیدھا ہوا اور شراب کا دوسرا پیالہ بھرنے لگا۔
"ایسا ہی ہوگا۔" کرشن راؤ لہرایا۔ "بس اب راج نیتی (سیاست) کا ذکر چھوڑ دے اور کچھ بوگ ولاس (عیش وعشرت) کی باتیں کر۔"
"جانتا ہوں پربھو! اب رات بھی گہری ہوتی جا رہی ہے۔" راما راؤ اپنے آقا کو شراب کا پیالہ دینے کے بعد کھڑا ہو گیا۔
"پجاری رام سروپ کہاں ہے؟" کرشن راؤ نے سوال کیا۔ "وہ کئی دن سے ہمارے سلام کیلئے نہیں آیا۔"
راما راؤ اپنے آقا کا اشارہ سمجھ چکا تھا' مگر زبان سے کچھ نہیں بولا۔
"اب ہم راتری پوجا کریں گے۔" کرشن راؤ نے واضح الفاظ میں اپنا مقصد بیان کرتے ہوئے کہا۔ دنیا تو یہی سمجھتی ہے کہ کرشن راؤ رات کی عبادت کرنا چاہتا ہے مگر مندر کا پجاری رام سروپ اور راما راؤ ہی جانتے تھے کہ یہ بوڑھا راجپوت شب کے اندھیرے میں کیا کرتا ہے؟ کرشن راؤ کا معمول تھا کہ وہ شام ہوتے ہی اپنی طویل وعریض حویلی کے ایک زمین دوز کمرے میں جی بھر کے شراب پیتا تھا اور پھر تمام اہل خانہ کے سامنے یہ کہہ کر مندر چلا جاتا کہ وہ سورج نکلنے تک بھگوان کی پوجا کرے گا۔ دہلی کے ہندوؤں کا ایک بڑا حلقہ کرشن راؤ کو دیوتاؤں کا انتہائی عقیدت مند سمجھتا تھا۔ بے شمار لوگوں کے خیال میں وہ سرمایہ دار ہوتے ہوئے بھی سنیاسی تھا اور اپنی زندگی کے آخری ایام کا ایک ایک لمحہ بھگوان کے چرنوں میں گزار رہا تھا۔ اب انہیں یہ خوفناک راز کون بتاتا کہ کرشن راؤ مندر میں داخل ہو کر شیو کے مجسمے کے آگے جھک جاتا پھر پجاری رام سروپ مندر کا دروازہ بند کر دیتا۔ مندر کے چند خدمت گار یہی سمجھتے کہ کرشن راؤ شیو کی پوجا کر رہا ہے مگر وہ ہوس کا بندہ مندر کے زیرِ زمین بنے ہوئے اس حصے میں چلا جاتا جہاں

کئی آراستہ کمرے تھے اور ان کمروں میں خوبصورت دیو داسیاں رہتی تھیں۔ کرشن راؤ رات بھر دیو داسیوں کے درمیان رہ کر شغل مئے نوشی کرتا' عشق و محبت میں ڈوبے ہوئے گیت سنتا اور نوجوان پجاریوں کے ہوشربا رقص دیکھتا۔ پھر صبح کے قریب مندر سے نکل کر دریائے جمنا کے گھاٹ پر غسل کرتا اور سیکڑوں ہندوؤں کے سامنے پنڈتوں کے بھجن سنتا۔ اس کے بعد گھر واپس آ کر اپنے سود خوری کے کاروبار میں مشغول ہو جاتا۔

❋❋❋

آج رات بھی حسب معمول کرشن راؤ اپنے خدمت گار راما کے ساتھ مندر پہنچا۔ اسے دیکھتے ہی مندر کا پجاری رام سروپ ادب کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔

''پجاری! کیا تو نے دنیا چھوڑنے کا ارادہ کر لیا ہے؟'' کرشن راؤ کی آواز میں ہلکا سا غصہ شامل تھا۔ ''کیا اب تو اتنا بڑا بھگت ہو گیا ہے کہ تجھے ہمارا خیال ہی نہیں آتا؟''

''مہاراج! بس دو راتیں ہی تو ایسی گزری ہیں کہ میں آپ کے درشن کو حاضر نہ ہو سکا۔'' پجاری رام سروپ نے گھبرا کر ہاتھ جوڑ دیئے۔ ''اور پھر میرے پاس کوئی نئی اطلاع بھی نہیں تھی۔ سارے کام آپ کی مرضی کے مطابق چل رہے ہیں۔''

کرشن راؤ نے جھومتے ہوئے کمرے کے دروازے کی طرف دیکھا۔

''پجاری رام سروپ بدحواسی کے عالم میں آگے بڑھا اور اس نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔

کرشن راؤ کے کانپتے ہوئے قدم جواب دیتے جا رہے تھے۔ اس لئے وہ فوراً ہی پجاری کی آراستہ مسند پر بیٹھ گیا۔

''مہاراج! کچھ جل پان کریں گے؟'' پجاری رام سروپ نے بھکاریوں کے سے لہجے میں کہا۔ جل پان سے اس کی مراد بظاہر پانی پینے سے تھی مگر در پردہ وہ کرشن راؤ سے شراب کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔

''نہیں رام سروپ! ہم مدرا پان (شراب نوشی) کرتے کرتے اکتاہٹ کا شکار ہو چکے ہیں۔ یہ زندگی کی یکسانیت ہمیں مارے ڈالتی ہے۔'' کرشن راؤ اچانک بہت زیادہ سنجیدہ نظر آنے لگا تھا۔

''پھر مہاراج کیا چاہتے ہیں؟'' رام سروپ نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

''اب ہم کچھ پینا نہیں چاہتے رام سروپ۔'' کرشن راؤ نے ریشمی تکیئے پر سر ٹیکتے اور ٹانگیں پھیلاتے ہوئے کہا۔ ''ہم چاہتے ہیں کہ کوئی ہمارے حلق میں مسلمانوں کے خون کا سمندر انڈیل دے پھر شاید ہماری پیاس بجھ جائے۔''

''ایسا ہی ہو گا مہاراج۔'' اگرچہ رام سروپ مندر کا سب سے بڑا پجاری تھا لیکن کرشن راؤ کے سامنے اس کی حیثیت ایک ادنیٰ غلام کی سی تھی۔ ''دیوتا چاہیں گے تو ایسا ہی ہو گا۔'' رام سروپ نے کرشن راؤ کو مطمئن کرنے کیلئے پرجوش لہجے میں کہا۔

''دیوتا تو چاہتے ہی رہیں گے مگر تم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے؟'' کرشن راؤ کی آواز سے کسی قدر تلخی جھلک رہی تھی۔

پجاری رام سروپ سر سے پاؤں تک ایک سوالیہ نشان بن کر رہ گیا۔

''ہمارے آدمیوں کی کارگزاری اطمینان بخش نہیں ہے۔'' کرشن راؤ نے بیزاری سے کہا۔

''نہیں ان داتا! کسی نے آپ کو غلط اطلاع پہنچائی ہے۔'' رام سروپ گڑگڑانے لگا۔ ''آپ کے غلاموں نے ناقابل فراموش کارنامے انجام دیئے ہیں اور ان کارناموں کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ اب میواتی لٹیروں کی تعداد

لاکھوں تک پہنچ گئی ہے۔"

"میں جانتا ہوں رام سروپ۔" کرشن راؤ نے تیز لہجے میں کہا۔ "تعداد اور بھی بڑھ سکتی ہے مگر ہمیں قزاقوں کی اس بھیڑ سے کوئی خاص سیاسی فائدہ نہیں پہنچ رہا ہے۔"

"میں مہاراج کا مطلب نہیں سمجھا۔" پجاری رام سروپ نے حیران ہو کر پوچھا۔ وہ اچانک بہت زیادہ پریشان نظر آنے لگا تھا۔

"میواتی لٹیرے ہندوستان کی مقامی جنتا پر حملہ آور ہو رہے ہیں۔" کرشن راؤ نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "ہم چاہتے ہیں کہ مسلمان فوجی ان کی یلغار کا نشانہ بنیں تا کہ باہر سے آنے والے ملیچھوں کی طاقت کا شیرزاہ بکھر جائے۔"

"ان داتا کا فرمانا بجا ہے مگر صورت حال ابھی تک ہمارے قابو میں نہیں ہے۔" پجاری رام سروپ آہستہ بول رہا تھا۔

"دہلی کے مضافات کا جنگلی علاقہ میواتی لٹیروں کا مسکن ہے اگر گھنے اور تاریک درختوں کی اوٹ نہ ہو تو شاہی فوجیں ایک دن میں تمام قزاقوں کو نیست و نابود کر سکتی ہیں۔ بھگوان کی کرپا ہے کہ ہمیں ناصر الدین محمود جیسا سیدھا سادا حکمراں میسر آیا۔ سلطان کی نیکی اور شرافت سے اس کے ساتھی امیر و وزیر ناجائز فائدے اٹھا رہے ہیں۔ انہیں اسلامی حکومت کی بنیادیں مضبوط کرنے کے بجائے اپنا اقتدار زیادہ عزیز ہے۔ زرنگار کرسیاں انہیں آپس میں لڑا رہی ہیں۔ ان کی اس بے خبری اور خود غرضی نے میواتیوں کو کچھ اور بھی دلیر بنا دیا ہے۔ بے شک وہ اچھوتوں اور نیچ ذات کے ہندوؤں پر ظلم ڈھا رہے ہیں مگر اس طرح اسلامی حکومت کی جڑیں کمزور ہو رہی ہیں۔"

"وہ کیسے......؟" کرشن راؤ یکا یک اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"مقامی آبادی کے غیر محفوظ رہنے کا ایک ہی مطلب ہے کہ موجودہ حکومت اپنی رعایا کے جان و مال سے لاتعلق ہو گئی ہے اور انہیں درندوں کے حوالے کر دیا ہے۔" پجاری رام سروپ نے اپنی منطق پیش کرتے ہوئے کہا۔ "اگر کچھ دن اور میواتی لٹیروں کا تشدد جاری رہا تو سارے اچھوت اسلامی اقتدار سے مایوس ہو جائیں گے۔ آج وہ سمجھتے ہیں کہ اسلام انہیں برہمنوں کے صدیوں پرانے جبر و تشدد سے نجات دے دے گا...... لیکن جب وہ کھلے آسمان کے نیچے بے اماں کھڑے رہیں گے تو موسم کی سختیاں انہیں کھا لیں گی اور پھر مجبور ہو کر وہ مسلمانوں کی طرف دیکھنا بند کر دیں گے۔ یہ ہماری بڑی فتح ہو گی اور اس طرح ہندو دھرم سے اچھوتوں کا اخراج رک جائے گا۔"

"رام سروپ! تو کبھی کبھی بڑے پتے کی بات کہتا ہے۔" کرشن راؤ مسکرانے لگا۔

"ان داتا! میں اس لائق تو نہیں کہ رائے دے سکوں مگر اتنی دنتی (درخواست) ضرور کروں گا کہ میواتیوں کو ابھی جنگلوں کے اندھیروں میں گم رہنے دیں کہ تاریکیاں ہی ان کی سب سے بڑی پناہ گاہ ہیں۔ اگر وہ روشنی کا پیچھا کرتے ہوئے شہروں کی طرف آئے تو ہلاک کر دیئے جائیں گے۔ یہ سچ کتنا ہی کڑوا ہو مگر سچ ہے کہ کھلے میدانوں میں لاکھوں قزاقوں کے غول بھی مسلمانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ وہ ملیچھ بہت سخت جان اور جنگ جو ہیں۔" یہ کہہ کر پجاری رام سروپ نے سر جھکا لیا۔

"تو ٹھیک کہتا ہے برہمن!" کرشن راؤ نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "ہم تیری ذہانت کے قائل ہیں لیکن میواتیوں کی طرف سے ہمارے نذرانوں میں بہت کمی واقع ہو گئی ہے۔ خزانے خالی نظر آتے ہیں۔" کرشن راؤ نے تنبیہ کے لہجے میں کہا۔

''میں نے میواتی لٹیروں کے سردار نرسنگا سے بات کی تھی۔ وہ اپنی اس کوتاہی پر بہت شرمندہ نظر آتا ہے۔''
پجاری رام سروپ نے تاویل پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''نرسنگا کا کہنا ہے کہ مضافاتی بستیوں میں رہنے والے تمام باشندوں کا مال لوٹا جا چکا۔ اب ان کے پاس تن کے کپڑوں کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ اس لئے مہاراج کے پاس بھیجے جانے والے نذرانوں میں کمی آ گئی ہے۔''

''آخر اس کا کوئی توڑ بھی ہے؟'' کرشن راؤ نے جھنجھلا کر پوچھا۔

''نرسنگا نے وعدہ کیا ہے کہ بہت جلد اس کمی کو پورا کر دے گا۔'' پجاری رام سروپ نے کہا۔ ''نرسنگا کا ارادہ ہے کہ وہ اپنے کچھ لٹیروں کو دور دراز کے علاقوں میں بھیج کر لوٹ مار کا بازار گرم کرے اور پھر جس قدر سونا چاندی ہاتھ آئے اسے ان داتا کے چرنوں میں ڈھیر کر دے۔''

''فی الحال ہم نے نرسنگ کا عذر قبول کر لیا۔'' کرشن راؤ نے انتہائی غرور و تکبر کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''کل ہی نرسنگا کو ہمارا پیغام پہنچا دو کہ راجپوت کے خزانے کو سونے اور چاندی کے ٹکڑوں کی شدید ضرورت ہے۔ ہمیں عنقریب بہت بڑا محاذ کھولنا ہے اور اس محاذ پر بے پناہ دولت خرچ ہوگی۔''

''بہتر ان داتا!'' پجاری رام سروپ نے عاجزانہ لہجے میں کہا۔

''اور تیرے مندر کی دیوداسیوں کا کیا حال ہے؟'' اچانک کرشن راؤ نے گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

''کچھ دن سے ایک بھی دیوداسی تجھ سے دھرم کا پاٹھ پڑھنے کے لئے مندر میں داخل نہیں ہوئی۔''

''مہاراج! دیوداسیوں کے قحط کے ذمے دار بھی مسلمان ہیں۔'' رام سروپ نے نیا انکشاف کرتے ہوئے کہا۔ ''اب شاذ و نادر ہی کوئی بے سہارا ہندو لڑکی مندروں کا رخ کرتی ہے۔ اس کے خیال میں دیوداسی بننے سے بہتر ہے کہ وہ اپنا مذہب بدل کر مسلمان ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اب شیو یا شنکر کے نام پر کوئی لڑکی پجارن بننے کے لئے تیار نہیں۔''

''یہ بڑی سنگین صورت حال ہے رام سروپ! ہمیں فوری طور پر اس کا ازالہ کرنا ہوگا۔'' کرشن راؤ نے جھنجھلا کر کہا۔ ''ہم ان دیوداسیوں کو بھی اپنے دشمن کے خلاف استعمال کریں گے۔ تجھے لازم ہے کہ زیادہ سے زیادہ لڑکیاں تلاش کر اور انہیں جوگنوں کے لباس پہنا دے۔ پھر میں ان مسلمانوں کو دیکھوں گا کہ وہ کس طرح اپنے دامن بچاتے ہیں۔'' یہ کہہ کر کرشن راؤ چند لمحوں کے لئے خاموش ہو گیا پھر چونکتے ہوئے بولا۔ ''شکنتلا کہاں ہے؟ اسے ہمارے پاس بھیج دے۔''

پجاری رام سروپ تیزی سے باہر نکلا اور شکنتلا کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ شکنتلا اس وقت آنکھیں بند کئے رباب کے تار چھیڑ رہی تھی اور ایک ماتمی نغمہ اس کے ہونٹوں پر مچل رہا تھا۔

''یہ گیت گانے کا وقت نہیں ہے دیوداسی؟'' رام سروپ نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا۔ ''تجھے مہاراج کرشن راؤ یاد کر رہے ہیں۔''

شکنتلا نے عجیب سی نظروں سے پجاری رام سروپ کی طرف دیکھا اور تھکے تھکے قدموں سے کرشن راؤ کے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ وہ جانتی تھی کہ بوڑھے راجپوت نے اسے کیوں طلب کیا ہے؟

پھر جیسے ہی وہ کرشن راؤ کے روبرو پہنچی وہ خبیث بوڑھا چیخ اٹھا۔ ''شکنتلا ہم نے تیری تمام سیوائیں سویکار کیں...... ہم تجھ سے بہت خوش ہیں...... مانگ کیا مانگتی ہے؟ آج کی رات جو مانگے گی وہی پائے گی۔''

شکنتلا جبراً مسکرائی۔ ''مہاراج اپنے ہاتھوں سے اس داسی کو زہر کا پیالہ دیدیں کہ اب تو مر جانے کو جی چاہتا

ہے۔"

"نہیں دیوداسی! ابھی نہیں۔" کرشن راؤ جھومنے لگا۔ "ابھی تو تیری جوانی کے دن ہیں' اس عمر میں بھی کوئی مرتا ہے؟"

شکنتلا چارو ناچار ایک کنیز کی طرح بوڑھے کرشن راؤ کے قریب بیٹھ گئی۔ "ان داتا! آپ صرف حکم دیں میری جوانی کا ذکر چھوڑ دیں۔"

"آج کے بعد تیری خدمات شجاع الدین کامران کے لئے وقف ہیں۔" کرشن راؤ نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"کون؟" شکنتلا چونک اٹھی۔ "یہ تو کسی مسلمان کا نام معلوم ہوتا ہے۔"

"ہاں! وہ ہمارے ہی قبیلے کا بچھڑا ہوا ایک فرد ہے۔"

اچانک کرشن راؤ کا لہجہ زہر آلود ہو گیا تھا۔ "ہم کل دن کے اجالے میں اسے تیرے پاس بھیجیں گے اب تیری زندگی کا ایک ہی مقصد ہوگا کہ وہ لامحدود اندھیروں میں ڈوب جائے۔"

❊❊❊

شکنتلا بہت دیر تک حیرت سے کرشن راؤ کے چہرے کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر آہستہ لہجے میں کہنے لگی۔
''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی ٹھاکر!''

کرشن راؤ نے شجاع الدین کامران کے بارے میں پوری تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ''وہ ایک انتہائی جذباتی نوجوان ہے' میں اس کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں۔''

شکنتلا کی سیاہ غلافی آنکھیں کشادہ ہوتی جارہی تھیں۔

گردش وقت نے کامران کو ایک بھکاری کی شکل میں میرے دروازے تک پہنچا دیا ہے۔ اگرچہ میں نے اس کے پھیلے ہوئے دامن میں چاندی کے چند سکے ڈال دیئے ہیں لیکن یہ اس کی بیماری کا مستقل علاج نہیں ہے' مجھے خبر ہے کہ جب وہ اپنے ماموں قائم خان راجپوت سے انتقام لے لے گا تو اسے میری ضرورت محسوس نہیں ہوگی اور پھر وہ اپنی منزل کی طرف واپس لوٹ جائے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس دوران تیرا ہوشربا حسن اس کے پیروں میں کبھی نہ ٹوٹنے والی زنجیر ڈال دے......''

ابھی کرشن راؤ کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ شکنتلا درمیان ہی میں بول اٹھی۔ ''میرے گناہ معاف کردو ٹھاکر کہ اب میں بہت تھک گئی ہوں۔'' شکنتلا کی آواز میں ساری دنیا کا کرب سمٹ آیا تھا۔

''نہیں دیوداسی! ابھی تجھے بہت کارنامے انجام دینا ہیں۔'' کرشن راؤ بڑے سفاکانہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔

''کیا میرا یہ کارنامہ کم ہے کہ میں اپنے شریر اور آتما سے محروم ہوگئی۔'' اچانک شکنتلا کے ہونٹوں سے تلخیوں کا زہر ٹپکنے لگا تھا۔ ''یہ کوئی زندگی ہے کہ ایک عورت ہوتے ہوئے بھی مجھے بھیڑ اور بکریوں کی قطار میں رکھا گیا۔ جانور بھی مجھ سے بہتر ہیں کہ انہیں حیوان سمجھ کر معاف کردیا جاتا ہے۔ دنیا مجھے دیوداسی سمجھتی ہے' مگر مندر کے پجاری خوب جانتے ہیں کہ میں کون ہوں؟ ایک مہذب ویشیا (طوائف) جو بھجنوں کے شور میں بے لباس ہوکر اس شخص کے سامنے ناچتی ہے جو ہندو دھرم کا رکشک (محافظ) ہے۔'' شکنتلا نے براہ راست کرشن راؤ کی ذات کو اپنی دشنام طرازی کا ہدف بنایا تھا۔

''دیوداسی!'' کرشن راؤ لفظوں کی اس ضرب کو برداشت نہ کرسکا اور وحشیوں کی طرح چیخ اٹھا۔ ''یہ تو کہہ رہی ہے شکنتلا؟'' کرشن راؤ کی زبان سے قہر و غضب کی چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔ ''کیا اسی دن کیلئے میں نے تجھ پر رحم کھایا تھا؟ اگر میں چاہتا تو مندر میں جھاڑو دینے والے ادنیٰ ترین خادم تجھے اپنی خوراک بنا لیتے' مگر یہ میرا احسان عظیم ہے کہ میں نے بڑے پجاری کو بھی تیری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی اجازت نہیں دی۔''

بدنصیب شکنتلا اس مظلوم چڑیا کی طرح سہم گئی جس کی طرف خونخوار باز کے پنجے لپک رہے تھے۔

''کیا تو نے اپنی دوسری ہم جنسوں کا حشر نہیں دیکھا؟'' کرشن راؤ دوبارہ چیخا۔ ''یہاں اور بھی تو دیوداسیاں ہیں

جو چند راتوں سے زیادہ ٹھاکر کی خدمت انجام نہ دے سکیں۔ وہ اس قابل ہی نہیں تھیں کہ کرشن راؤ انہیں زیادہ دن برداشت کر سکے' تو خوب جانتی ہے کہ وہ دیوداسیاں آج کس حال میں ہیں؟'' بوڑھا راجپوت ایک مجبور لڑکی پر کئے جانے والے احسانات کی فہرست پیش کر رہا تھا۔''میں نے ایک احسان یہ بھی کیا ہے کہ تجھے دھرم کی شکشا (تعلیم) دلائی۔ اب تو ایک جاہل دیوداسی نہیں بلکہ برہمنوں کی مذہبی رسمیں جاننے والی ایک باخبر عورت ہے' کیا تو اپنی گردن سے میرے احسانات کا طوق اتار کر پھینک سکتی ہے شکنتلا؟'' کرشن راؤ نے انتہائی طیش کے عالم میں دیوداسی سے سوال کیا۔

شکنتلا خوف و دہشت کی کیفیت میں مبتلا خاموش بیٹھی رہی۔

''اگر تو میرے احسانات کی زنجیریں توڑ کر مندر کی حدود سے فرار ہو جانا چاہتی ہے تو اسی وقت نکل جا۔ میں تجھے نہیں روکوں گا۔'' کرشن راؤ کسی شعلے کی طرح بھڑکتا ہی جا رہا تھا۔''یہاں سے نکل کر باہر کی دنیا بھی دیکھ لے' پھر تجھے اندازہ ہو جائے گا کہ عورت کیلئے کہیں کوئی پناہ گاہ موجود نہیں۔ سارے ہی مرد درندے ہیں' مگر ان میں ٹھاکر سب سے بہتر درندہ ہے۔ اپنے شکار کو شفقت و کرم کی نگاہ سے دیکھنے والا درندہ...... مگر اتنا یاد رکھنا شکنتلا کہ ٹھاکر کے حصار سے نکل جانے والے زیادہ دن چین کی سانس نہیں لے سکتے یا تو وہ ہلاک کر دیئے جاتے ہیں یا پھر ان کی حالت بھکاریوں سے بھی بدتر ہو جاتی ہے۔'' کرشن راؤ نے واضح لہجے میں شکنتلا کو تنبیہہ کر دی تھی۔

دیوداسی شدت خوف سے کانپنے لگی' پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔''مجھے معاف کر دو ٹھاکر کہ میں اپنی گستاخ کلامی پر بہت شرمندہ ہوں' یہ بے مقصد زندگی کبھی کبھی جینے کی خواہش سے بیزار کر دیتی ہے اور ذہن میں عجیب عجیب خیالات ابھرنے لگتے ہیں۔''

''اپنے پاگل پن پر قابو حاصل کر دیوداسی ورنہ تیرے یہ خیالات تجھے بہت آزار پہنچائیں گے۔'' کرشن راؤ کے لہجے میں کسی قدر نرمی پیدا ہو گئی تھی۔''اور یاد رکھ کہ تیری زندگی بے مقصد نہیں ہے۔ میں نے ایک خاص مقصد کیلئے تجھ پر عنایتوں کی بارش کی ہے' غور سے سن کہ عنقریب ایک سرکشیدہ مسلمان تیرے پاس آنے والا ہے' وہ بہت سادہ اور احمق ہے اس نے آج تک کسی عورت کو قریب سے نہیں دیکھا...... اور اس کے ہونٹوں نے کسی نشہ آور شے کا ذائقہ نہیں چکھا۔ اب تیرا ایک ہی کام ہے کہ تو شجاع الدین کامران کو دونوں لذتوں سے آشنا کر دے۔ ابھی وہ بغاوت کی ابتدائی منزل میں ہے' اسے بہت آسانی کے ساتھ گمراہ کیا جا سکتا ہے۔'' کرشن راؤ شکنتلا کو اپنے منصوبے کی تفصیلات سمجھا رہا تھا۔''اگر وہ اپنا مذہب ترک کر کے ہندو دھرم کی طرف واپس لوٹ آئے تو یہ تیرا بڑا کارنامہ ہوگا' ہو سکتا ہے کہ میں تیرے اس کارنامے سے خوش ہو کر تجھے زندگی بھر کیلئے آزاد کر دوں۔''

شکنتلا انتہائی جبر کے عالم میں مسکرانے لگی۔

''اگر یہ نہ ہو سکے تو پھر کم سے کم کامران کو اتنا گمراہ ضرور کر دے کہ وہ دوبارہ اپنے آپ کو نہ پا سکے۔'' کرشن راؤ کا ایک بہت زیادہ مشتعل نظر آنے لگا تھا۔

''ایسا ہی ہوگا ٹھاکر!'' شکنتلا کی مسکراہٹ بھی گہری ہو گئی تھی۔

''تو مجھے اپنی تسخیر اور فتح کا پہلا ثبوت فراہم کر دے' شکنتلا! پھر میں تیرے توبہ شکن حسن کو مسلمانوں کے بڑے بڑے سپہ سالاروں پر آزماؤں گا۔'' کرشن راؤ کا لہجہ مزید جذباتی ہو گیا تھا۔''میں نے سنا ہے کہ یہ گوشت خور قوم بہت رنگین مزاج ہوتی ہے' پتھر کے مجسموں کی پرستش نہیں کرتی' مگر میں اس کے سامنے ہزاروں زندہ بت پیش کروں گا' پھر وہی بت ان خدا پرستوں کو [illegible]

دیوداسی شکنتلا گھبرا گئی۔ ''آخر آپ ... سے کیا چاہتے ہیں ٹھاکر؟''

''ابھی میں تجھے اپنے اس منصوبے کے بارے میں تفصیل سے نہیں بتا سکتا شکنتلا!'' کرشن راؤ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''ابھی میرے ذہن میں کچھ دھندلی سی لکیریں ابھر رہی ہیں۔ ابھی ان لکیروں میں رنگ نہیں بھرا ہے اور وہ جوڑی بھی نہیں گئی ہیں۔ ہر لکیر الگ الگ ہے' جب میں ان لکیروں کو ملا کر تصویر مکمل کرلوں گا تو پھر تجھے سب کچھ بتادوں گا' فی الحال شجاع الدین کامران میرے منصوبے کا پہلا شکار ہے۔ اگر تو نے اس مغرور لڑکے کو اپنے دیوتاؤں کے قدموں پر جھکا دیا تو میں سمجھ لوں گا کہ میرا ذہن غلط نہیں سوچ رہا ہے' میرے اس خوفناک منصوبے کی کامیابی کا انحصار تیری پہلی کامیابی پر ہے۔ اگر تو کامران کو گمراہ کرنے میں کامیاب ہوجاتی ہے تو پھر تجھے تازہ دم دیوداسیوں کی ایک فوج تیار کرنی ہوگی۔'' کرشن راؤ نے اپنے منصوبے کا ابتدائی خاکہ مبہم انداز میں بیان کرتے ہوئے کہا۔

دیوداسی شکنتلا گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

''شکنتلا! تجھے کیا ہوگیا ہے؟'' ایک طویل سکوت کے بعد کرشن راؤ نے دیوداسی کو پکارا۔

شکنتلا چونک کر کرشن راؤ کی طرف دیکھنے لگی۔

''یہ تیرے سوچنے کی باتیں نہیں دیوداسی!'' کرشن راؤ اچانک مسکرانے لگا۔ ''ابھی ہندو دھرم کا یہ نگہبان زندہ ہے' میں اپنے دیوتاؤں کو ان ملیچھ حملہ آوروں کے سامنے شرمندہ نہیں ہونے دوں گا۔''

شکنتلا جبراً مسکرانے لگی۔

''اپنے ذہن سے ان پریشان خیالات کو جھٹک دے اور میرے جلتے ہوئے دل و دماغ پر اپنے نغموں کی اوس ٹپکا دے کہ میں بہت پیاسا ہوں دیوداسی!'' کرشن راؤ نے کسی بوالہوس بوڑھے کے انداز میں کہا۔

شکنتلا نے اپنی مصنوعی مسکراہٹ پر مجبوری کی ایک اور گہری تہہ چڑھائی' پھر وہ کسی زرخرید لونڈی کی طرح اٹھی' نیا لباس تبدیل کیا' کرشن راؤ کو اپنے ہاتھوں سے شراب پلائی...... اور پھر کسی پیشہ ور رقاصہ کی طرح ناچنے لگی۔

شکنتلا ہندو دھرم کا بہت زیادہ گیان رکھتی تھی' مگر اس کی مجبوریاں اسے ایک سرمایہ دار بوڑھے کے سامنے شرمناک حالت میں نچا رہی تھیں۔ بڑا عجیب منظر تھا' سرمایہ دار شدید کیف و مستی کے عالم میں جھوم رہا تھا...... اور علم اپنے تمام تر سامان رسوائی کے ساتھ رقص کر رہا تھا۔

❊❊❊

دوسری طرف آدھی رات کے قریب رائے نعیم الدین ذیشان کے کھنڈر نما مکان میں ایک خاموش سا ہنگامہ برپا تھا۔ سعدیہ خانم اپنے بیٹے شجاع الدین کامران سے مخاطب تھی۔

''مجھے صرف اتنا بتا دے کہ تو نے یہ چاندی کے سکے کہاں سے حاصل کئے ہیں۔'' جوش جذبات سے اس کا چہرہ جل رہا تھا' مگر آواز گھٹی گھٹی تھی۔

''مام! میں آپ کو یہ نہیں بتا سکتا۔'' کامران نے قدرے ناگوار لہجے میں کہا۔ ''اور آپ کو اس بات کی جستجو ہونی بھی نہیں چاہئے کہ یہ سکے کہاں سے آئے ہیں؟ میں نے اپنا فرض پورا کر دیا۔''

''کیسا فرض؟'' سعدیہ خانم نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

''یہی کہ جوان ہونے کے بعد بھی میں آپ کی کفالت نہیں کر سکتا تھا۔'' کامران کے لہجے میں احساس فخر تھا۔

''آج میں نے اس داغ کو دھو دیا' آئندہ آپ مجھ پر یہ تہمت نہیں تراشیں گی کہ میں غیر ذمہ دار اور نکما ہوں۔''

چند لمحوں کیلئے سعدیہ خانم ساکت ہو کر رہ گئی' پھر انتہائی شکستہ آواز میں بولی۔ ''تو میری محبتوں کو تہمت کا نام

دے رہا ہے کامران؟ میری زبان سے ادا ہونے والے الفاظ تیرے نزدیک ایک داغ کی حیثیت رکھتے ہیں؟ میں نے تیری پرورش کو ایک بوجھ سمجھا ہے؟ اور کیا میں تجھ سے اپنی ماں کا حساب طلب کر رہی ہوں؟''

''مجھے آپ سے محبت بھی ہے مام! اور میں آپ کی عزت بھی کرتا ہوں۔'' شجاع الدین کامران کے لہجے میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ ''مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ آپ نے برسوں تک مجھے نااہل سمجھ کر طعنہ زنی کی ہے۔ آج میں اپنے اسی گناہ کا کفارہ ادا کر رہا ہوں۔ بے شک! بے روزگاری ایک جرم ہے اور مفلسی ایک گناہ' میں اپنے سابقہ گناہوں سے تائب ہوتا ہوں اور یقین دلاتا ہوں کہ آئندہ مجھ سے اس قسم کا کوئی گناہ سرزد نہیں ہوگا۔'' کامران کے لہجے میں کوئی طنز نہیں تھا' مگر لفظوں میں تلخیوں کا زہر بھرا ہوا تھا۔ ''مجھ پر آپ کا جتنا قرض ہے' میں اسے بہت جلد اتار دوں گا۔''

''تو میرا قرض ان سکوں سے اتار دے گا جن کے بارے میں بتاتے ہوئے مجھے خود بھی شرم محسوس ہوتی ہے۔'' اچانک سعدیہ خانم کی آواز بلند ہو گئی تھی۔ ''کامران! میں محلے والوں کو اپنے گھر کا تماشا دکھانا نہیں چاہتی۔ خدا کیلئے مجھے بتا دے کہ یہ سب کچھ کیا ہے؟ میں تیرے اس جرم کو فراموش کر دوں گی کہ تو نے میری محبت کو دولت کے ترازو میں تول کر ہمیشہ کیلئے بے وقعت کر دیا۔''

''میں نے آپ کی محبت کا سودا نہیں کیا مام! مگر یہ اس دنیا کی سب سے بڑی سچائی ہے کہ کوئی ماں بھی ایک ناکارہ اولاد کو برداشت نہیں کرتی۔ یہ بات آپ پر واضح ہو جانی چاہئے کہ مجھے ان سکوں کے حصول میں کوئی شرم محسوس نہیں ہوئی۔ یہ میری محنت کا نتیجہ ہیں۔ ایسی محنت کہ جس کا اندازہ آپ بھی نہیں کر سکتیں۔'' شجاع الدین کامران کے لہجے میں ماں کا احترام بھی تھا' مگر معاشرے کی رسموں سے بغاوت بھی۔

''میں یہی تو جاننا چاہتی ہوں کامران! آخر وہ کون سی محنت ہے کہ جس نے تجھے ایک ہی رات میں اتنا آسودہ حال کر دیا کہ تو پہچاننے میں بھی نہیں آ رہا۔'' سعدیہ خانم شدید جھنجھلاہٹ کا شکار نظر آ رہی تھی۔

''میں اپنی اس محنت کے بارے میں کسی قسم کی وضاحت ضروری نہیں سمجھتا۔'' کامران کی بے پروائی کے انداز میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ ''بس اتنا بتا سکتا ہوں کہ میں نے کسی کے یہاں چوری نہیں کی۔ اگرچہ آپ کے بھائی قائم خان راجپوت کی محبتوں نے مجھے قانونی طور پر ایک چور ثابت کر دیا ہے۔ لیکن یہ سچ ہے کہ میرے ہاتھ بھی مال حرام کی طرف نہیں بڑھے...... اور آپ خود جانتی ہیں کہ میں کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔'' شجاع الدین کامران نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''ہاں! میں خوب جانتی ہوں کہ تو جھوٹا نہیں ہے۔'' سعدیہ خانم نے بے اختیار کہا۔ ''مگر اپنی ماں سے یہ رازداری بھی کسی جھوٹ سے کم نہیں ہے۔ میں اس محنت کی تفصیل جاننا چاہتی ہوں' میرے جذباتی بیٹے! تیری طرف سے میرا دل ہر وقت ڈرتا رہتا ہے۔ پتہ نہیں کب کوئی شعبدہ باز تیری حیران نگاہوں کے سامنے لفظوں کا طلسم کھڑا کر دے اور تو اپنی سادگی میں مات کھا جائے' بہت برا دور ہے رائے نعیم الدین کے سادہ دل فرزند! بہت برا دور ہے۔'' سعدیہ خانم کی آواز کانپ رہی تھی۔

''میں اس دور کا مزاج خوب سمجھتا ہوں مام! مجھے زیادہ سمجھانے کی کوشش نہ کیجئے کہ میں اپنی زندگی کے بارے میں ناقابل ترمیم فیصلہ کر چکا ہوں۔'' شجاع الدین کامران کے لہجے میں سختی پیدا ہو گئی تھی۔ ''میں ایک نامعلوم منزل کی طرف جا رہا ہوں' آپ کو یہی اطلاع دینے حاضر ہوا تھا۔''

''نامعلوم منزل؟'' سعدیہ خا[illegible] ...تنا بڑا فیصلہ کر لیا؟''

"مجبوری تھی مام! اگر میں اس کا ذکر کر دیتا تو آپ کبھی اجازت نہیں دیتیں۔" شجاع الدین کامران نے مبہم الفاظ میں کہا۔

"کیا تیرے نزدیک میری اجازت کی کوئی اہمیت نہیں؟" یہ کہتے کہتے سعدیہ خانم کے ہونٹ جل اٹھے تھے۔

"معافی کا خواستگار ہوں کہ میں نے اپنی زندگی کے اس موڑ پر آپ کے مشورے کی ضرورت کو محسوس نہیں کیا۔" کامران کے چہرے سے بے زاری کا اظہار ہو رہا تھا' بہت جلدی میں تھا مام! بس فیصلہ کر لیا اور چل کھڑا ہوا۔ اب پیچھے مڑ کر نہیں دیکھوں گا۔ اگر میرے قدموں نے کسی دن منزل کو روند ڈالا تو واپس آ جاؤں گا' پھر شاید وضاحت کر سکوں کہ میں نے وہ فیصلہ اتنی عجلت میں کیوں کیا تھا؟"

"جب نئی منزل کی تلاش میں تجھے ماں کے مشوروں کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تو ملے بغیر بچھڑ گیا ہوتا۔ رات کے اندھیرے میں آنے کی کیا ضرورت تھی؟" یک بیک سعدیہ خانم کا لہجہ بھی پتھروں کی طرح سخت ہو گیا تھا۔

"یہ بھی ایک مجبوری تھی۔" کامران نے جواباً کہا۔

"کیسی مجبوری؟" سعدیہ خانم نے ناراض لہجے میں سوال کیا۔

"میں نہیں چاہتا تھا کہ آپ میرے پیچھے کسی مالی مسئلے کا شکار ہوں' اسی لئے یہ چند سکے لے کر آیا تھا۔" کامران نے اپنی آمد کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے یہ گوارا نہیں کہ آپ اس بڑھاپے میں ناپسندیدہ لوگوں کی مزدوری کرتی پھریں۔"

"جب تجھے میری تکلیف کا اس قدر احساس ہے تو پھر بتا کیوں نہیں دیتا کہ تو نے اپنی کس محنت کے عوض یہ سکے حاصل کئے ہیں۔" سعدیہ خانم نے ایک اور ناکام کوشش کی۔

یہ ایک راز ہے جسے وقت سے پہلے میں آپ پر بھی فاش نہیں کر سکتا۔" شجاع الدین کامران انکار کی اسی روش پر قائم تھا۔

"اگر میں تجھے لب کشائی کیلئے حکم دوں۔" سعدیہ خانم نے تیز لہجے میں کہا۔

"آج میں اس حکم کو بھی نظر انداز کر دوں گا۔" شجاع الدین کامران کی سختی اسی طرح برقرار تھی۔ "ہاں! آپ یہ حکم دے سکتی ہیں کہ میں اپنے ہاتھ سے اپنی گردن کاٹ دوں' آج مجھے نافرمان ہو جانے دیجئے کہ اسی میں میرا سکون مضمر ہے۔ آپ تو انتہائی شفیق و مہربان ہیں' پھر میرے سکون کیلئے اپنے سوالات کا سلسلہ ختم کیوں نہیں کر دیتیں؟"

"یہ سوالات کا سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک تو چاندی کے ان سکوں کا راز ظاہر نہیں کر دے گا۔" سعدیہ خانم برہم نظر آنے لگی تھی...... "تجھے ماں کے سکون کا خیال نہیں کامران؟"

"مام! میں آپ کو کیا بتاؤں کہ میرے ذہن میں اس وقت کسی دوسرے خیال کا گزر نہیں۔" شجاع الدین کامران اس جذباتی حربے کو بھی برداشت کر گیا تھا۔

"تو پھر اچھی طرح سمجھ لے کہ تیری ماں یا تو بھوکی مر جائے گی یا پھر وہ مزدوری کیلئے نکل کھڑی ہو گی۔" سعدیہ خانم نے بھی اپنا آخری فیصلہ سنا دیا تھا۔ "اس مال حرام کی گٹھڑی کو اٹھا کر باہر پھینک دے' بیٹے کہ تیری ماں ایک لمحے کیلئے بھی اس کی موجودگی برداشت نہیں کر سکتی۔ اگر ہمیں سیم و زر کا یہ ڈھیر اتنا ہی عزیز ہوتا تو تیرا باپ بھی اپنے خون سے غسل نہ کرتا۔ قتل ہونے سے پہلے دہلی کے امراء نے اسے بہت سمجھایا تھا کہ وہ سلطان کے احترام میں اپنی گردن کو خم کر دے' پھر اس پر دنیا کی تمام نعمتوں اور آسائشوں کے دروازے کھل جائیں گے...... مگر وہ بڑا غیرت مند تھا' جب اسے موت آئی تو دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اس کی گردن میں وہی تناؤ تھا جس سے شجاعت و مردانگی کی تاریخ رقم

ہوتی ہے۔ میں اسی مردِ غیور کی بیوہ ہوں کامران! شدتِ جذبات سے سعدیہ خانم کی آواز لرز رہی تھی۔ ''اور تو بھی تو اسی کا بیٹا ہے' پھر تیرے خون کا رنگ بدل کیوں گیا؟ میرے بچے ایک بار کہہ دے کہ تیرے خون کا رنگ نہیں بدلا ہے بلکہ میری بینائی کمزور ہوگئی ہے۔''

''یہ اسی خون کا تو اثر ہے کہ میں منزلِ فنا کی طرف جا رہا ہوں۔'' شجاع الدین کامران بھی پرجوش ہوگیا تھا۔ ''اگر میری رگوں میں رائے نعیم الدین ذیشان کا لہو شررفشاں نہ ہوتا تو میں بھی ذلت آمیز زندگی سے کوئی معاہدہ کر لیتا۔''

''تو پھر ان سکوں کو واپس کر دے بیٹے اور اپنی ماں کی آغوش میں سما جا! تو بیمار ہوگیا ہے' میں تیری مسیحائی کروں گی' میرے سوا تیرا کوئی غمگسار نہیں۔ میں تجھے کیسے بتاؤں کہ یہ دنیا والے تجھے مار ڈالیں گے۔'' سعدیہ خانم بہت زیادہ جذباتی ہوگئی تھی۔

اگر کوئی دوسرا موقع ہوتا تو شاید کامران بھی اس صورتحال کی سنگینی سے متاثر ہو کر رونے لگتا' لیکن اس وقت سعدیہ خانم کا فریادی لہجہ بھی اسے متاثر نہ کر سکا۔

''میں اپنی زندگی رہن رکھ چکا مام! اب اس سودے کی شرائط میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔'' کامران نے بھرپور استقامت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''جب آپ حوالے کیلئے رائے نعیم الدین کا نام پیش کرتی ہیں تو پھر اس حقیقت کو کیوں بھول جاتی ہیں کہ آخر میں بھی ان ہی کا بیٹا ہوں۔ شوہر کے فیصلے پر آپ فخر کر سکتی ہیں' مگر بیٹے کے ارادوں کو زنجیر پہنانے کیلئے آپ خون اور نسل کے واسطے دینے لگتی ہیں۔ مادرِ محترم! یہ کیسی ناانصافی ہے؟ ابھی تو میں قتل بھی نہیں ہوا ہوں' پھر موت سے پہلے یہ شورِ ماتم کیسا؟''

سعدیہ خانم کے اعصاب بکھر گئے اور وہ ہذیانی انداز میں چیخنے لگی۔ ''میری محبت کو ناانصافی قرار دیتا ہے بے رحم' جب تیرا باپ قتل ہوا تھا تو اس صدمے کو برداشت کرنے کیلئے میرے جسم میں خون کا ایک دریا موجود تھا' مگر آج کچھ بھی نہیں۔ میری طرف دیکھ کہ آنکھوں کا پانی خشک ہو چلا ہے۔ مجھے زندگی کے ایک ہی امتحان نے اس قدر تھکا دیا ہے کہ میں نے سانسوں کا یہ سفر کانٹوں پر گھسٹ گھسٹ کر طے کیا ہے۔ میرے بدن کا ایک ایک رواں زخمی ہے کامران! مجھے دوسری آزمائش میں نہ ڈال کہ اب میں بہت تھک گئی ہوں۔''

شجاع الدین کامران نے سعدیہ خانم کے اس ماتمی احتجاج کا کوئی جواب نہیں دیا۔ ''میں جا رہا ہوں مام! مجھے اپنی دعاؤں کے سائے میں رخصت کریں کہ راجپوتوں کی یہی تاریخ ہے۔''

''اب تو راجپوت نہیں کامران! ایک مسلمان ہے۔'' سعدیہ خانم نے کرب آمیز لہجے میں کہا۔ ''تو مجھے چھوڑ کر جا رہا ہے۔ اس حالت میں کہ میرا کوئی سہارا نہیں۔''

''میں کچھ دن کیلئے جا رہا ہوں زندگی نے وفا کی تو بہت جلد لوٹ آؤں گا۔'' شجاع الدین کامران جانے کیلئے مڑا۔

''تو سمجھتا ہے کہ مجبور ہوں۔'' اچانک سعدیہ خانم کے اندر وہ عورت بیدار ہوگئی تھی جس نے آفات و مصائب کے وقت ساری دنیا کو ٹھوکر پر مار دیا تھا۔ ''میری ممتا سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتا ہے؟ تجھے تیری نافرمانیاں مبارک ہوں اور مجھے میری زندگی کی یہ ویرانیاں۔'' کچھ دیر کیلئے سعدیہ خانم کی کمر میں نمایاں ہونے والا ہلکا سا خم دور ہوگیا تھا اور وہ ایک ایسی عورت نظر آنے لگی تھی جو بیٹے کے آگے دامن پھیلانے کے بجائے کسی محاذِ جنگ کی طرف جا رہی ہو۔

شجاع الدین کامران باہر جانے کیلئے دروازے میں داخل ہو چکا تھا

سعدیہ خانم بہت تیزی سے جھکی اور اس نے چاندی کے سکوں کی تھیلی اٹھا کر کامران کی طرف پھینک دی۔
''اپنے ساتھ باپ کی اس گٹھڑی کو بھی لیتا جا کہ تیری ماں اتنی مجبور نہیں ہے۔''
شجاع الدین کامران نے پلٹ کر چند لمحوں کیلئے ماں کی طرف دیکھا اور پھر تھیلی کو اٹھا کر باہر نکل گیا۔
سعدیہ خانم ایک بار لرز کر رہ گئی' اس کے قدم غیر متوازن ہو گئے تھے۔ قریب تھا کہ وہ لہرا کر زمین پر گر جاتی' مگر اس نے شکستہ چارپائی کا سہارا لیا اور وہ بمشکل تمام اپنے آپ کو بچا سکی۔
وہ آدھی رات کا وقت تھا' چاند کی آخری تاریخیں تھیں اور ہر سمت گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ کامران لاکھ نافرمانبردار سہی' مگر آج تک وہ اتنی رات گئے کبھی مکان سے باہر نہیں گیا تھا۔ سعدیہ خانم گھبرا کر اٹھ بیٹھی اور تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی' اس نے چاہا کہ وہ باہر نکل کر کامران کو روک لے' مگر اچانک کسی احساس کی شدت نے اس کے قدموں میں زنجیریں ڈال دیں' وہ خاموشی کے ساتھ دروازے میں کھڑی شجاع الدین کامران کے ہیولے کو دیکھتی رہی' جو آہستہ آہستہ مکان سے دور ہوتا جا رہا تھا۔
پھر جب سرکش بیٹے کا سایہ بھی اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تو سعدیہ خانم خود کلامی کے انداز میں کہنے لگی۔
''وہ بھی چلا گیا۔ اے میرے نادان اور فریب خوردہ دل! تیرا دعویٰ تھا کہ خون خون سے جدا نہیں ہوتا...... اور جسم سے اس کے اعضاء الگ نہیں ہوتے' مگر آج تو یہ انہونی بھی دیکھ لے کہ سب کچھ الٹ گیا۔ میں نے ہمیشہ تیرا کہا مانا اور تیرے اشاروں کو معتبر سمجھا...... حالانکہ میرا تجربہ مجھے کچھ اور ہی سکھاتا رہا' جب ماں باپ نے نگاہیں پھیر لی تھیں اس وقت بھی خونی رشتوں کا سوال تھا' میں نے تیرے مشورے پر اس حقیقت کو جھٹلا دیا تھا کہ بیٹا آخر بیٹا ہوتا ہے' وہ مجھے چھوڑ کر نہیں جائے گا...... مگر اس منظر کو غور سے دیکھ لے کہ بیٹا بھی چلا گیا۔''
پھر وہ اپنے آپ کو مخاطب کر کے کہنے لگی...... ''سعدیہ خانم! اسی کو گردش وقت کہتے ہیں اور تقدیر اسی کا نام ہے۔ اندھیرے میں اپنا سایہ بھی جدا ہو جاتا ہے۔ سب روشنی کے پرستار ہیں۔ کوئی اپنی انا کا غلام ہے اور کوئی اپنی غرض کا' یہ سب غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔''
اس کے بعد کچھ دیر کیلئے سناٹا چھا گیا' سعدیہ خانم خاموش ہو گئی تھی۔ یکا یک اس کے ہونٹ کانپنے لگے۔
''اے خدا! کامران کو معاف کر دے اور اس کی حفاظت فرما۔ وہ بہت نادان ہے' میری نافرمانی کے جرم میں اس کی گرفت نہ کرنا کہ اس طرح وہ ہلاک ہو جائے گا۔ اس کے گناہوں کو بخش دے' میرے معبود کہ ہم ٹھکرائے ہوئے لوگوں کیلئے تیری رحمت کے سوا کوئی سائبان نہیں۔''

گہری تاریکیوں میں گھر سے نکل کر شجاع الدین کامران ایک ویرانے راستے پر جا رہا تھا' پھر اس کے بڑھتے ہوئے قدم اسے شہر خموشاں کی طرف لے گئے۔ یہ مسلمانوں کا قبرستان تھا اور اسی گورستان میں شجاع الدین کامران کے باپ رائے نعیم الدین کی قبر تھی' اندھیرا ہونے کے سبب کامران بہت دیر تک ٹھوکریں کھاتا رہا' لیکن بالآخر وہ اپنے باپ کی قبر ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گیا۔
کچھ لمحے حیرت وسکوت میں گزر گئے' پھر کامران بے قرار ہو کر باپ کی قبر سے لپٹ گیا اور گریہ وزاری کرنے لگا۔
''بابا! کاش! میں آپ کا بیٹا نہ کہلاتا اور میری رگوں میں ایک اچھوت کا خون ہوتا کہ اس طرح میری زندگی سر جھکا کر گزر جاتی۔ ماں مجھے نافرمان اور باغی سمجھتی ہیں' مگر میں انہیں اپنی مجبوریاں کس طرح سمجھاؤں؟ آپ نے بھی تو

لوگوں کے غلط مطالبات تسلیم نہیں کئے تھے اور آپ کو یہ دن دیکھنا پڑے۔ پھر ماں مجھے بزدلی اور نامردی کا سبق کیوں دیتی ہیں؟ بابا! آج کل آپ مجھے بہت یاد آتے ہیں' اگر آپ موجود ہوتے تو میرے جذبوں کی سچائی پر گواہی دیتے۔ میں اس شخص کو کیسے معاف کردوں جس نے مجھے ہمیشہ کیلئے داغدار بنا دیا' میں ایک سربلند باپ کا بیٹا تھا' مگر آج کچھ بھی نہیں۔

میں سر اٹھا کے چلوں کیا کہ میرا سر ہی نہیں

یہ سر میرے کاندھوں پر ایک بارگراں ہے۔ آج میں اسی بوجھ کو اتارنے کیلئے کرشن راؤ کے دروازے پر جا رہا ہوں۔ کرشن راؤ نے میری ماں کو بہت آزار پہنچائے ہیں' لوگ یہی سمجھیں گے کہ میں نے بے غیرتی کا لبادہ اوڑھ لیا ہے' مگر میں کسی سے اپنے دل کی بات نہیں کہہ سکتا' میرے سینے میں ایک حشر برپا ہے۔ اس حشر کے بارے میں خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ بابا! خدا سے دعا کریں کہ میں بھی جلد از جلد آپ تک پہنچ جاؤں' مگر اس طرح کہ مجھ پر دنیا کا کوئی قرض باقی نہ رہے۔"

شجاع الدین کامران باپ کی قبر پر بہت دیر تک روتا رہا اور اس کے آنسو خاک پریشاں میں جذب ہوتے رہے' پھر وہ اٹھا اور اس نے قبر کی مٹی لے کر اپنے چہرے پر مل لی۔

"اس مٹی کی قسم! میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔" کامران کا لہجہ بہت تیز تھا۔ قبرستان کی خاموش فضا اور رات کے سناٹے میں اس کی آواز دور تک گونجتی چلی گئی۔

پھر جیسے ہی وہ واپس جانے کیلئے پلٹا اسے ایک اور آواز سنائی دی۔ وہ بڑی پرہیبت آواز تھی۔ اگر کوئی کمزور اعصاب کا انسان ہوتا تو شاید آواز کی دہشت سے اس کی حرکت قلب بند ہوجاتی...... مگر کامران کے اعصاب فولاد سے بھی زیادہ سخت تھے۔ وہ ایک لمحے کیلئے گھبرایا' مگر فوراً ہی پرسکون ہو کر اس طرف دیکھنے لگا جدھر سے وہ آواز ابھری تھی۔

کہنے والا کہہ رہا تھا۔

"زمانے کی قسم! انسان بڑے خسارے میں ہے' آسمانوں پر جو کچھ لکھا جا چکا اسے کوئی نہیں مٹا سکتا...... حق! حق احق۔"

وہ آواز جس نے سناٹے اور ویرانی کے سینے میں گہرا شگاف ڈال دیا تھا' کامران اس آواز کو سنتا رہا' بس چند کلمات تھے جو فضا میں ارتعاش پیدا کر کے معدوم ہوگئے تھے۔

کامران نے اس طرف دیکھنے کی کوشش کی جدھر سے وہ آواز ابھری تھی' مگر وہاں اندھیرے کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔ اگر کامران کچھ دور چل کر قبرستان کے ایک گوشے میں پہنچ جاتا تو شاید اس کی ملاقات ایک ایسے درویش سے ہوجاتی جو دنیا کے ہنگاموں سے دور مردوں کی بستی میں بہت دنوں سے چلہ کش تھا۔

کامران چند لمحوں تک نظریں جما کر قبرستان کے گردوپیش کا جائزہ لیتا رہا' مگر تاریکی نے اس کی نظروں کے سامنے ایک دیوار کھینچ دی تھی' مجبوراً وہ آہستہ قدموں سے دروازے کی طرف بڑھ گیا اور نامعلوم شخص کی آواز اس کا تعاقب کرتی رہی۔"

"زمانے کی قسم! انسان بڑے خسارے میں ہے۔"

شجاع الدین کامران نے رات کا باقی حصہ شہر کی گلیوں میں ادھر ادھر گھوم کر گزار دیا اور پھر سورج نکلتے ہی وہ کرشن راؤ کی حویلی پہنچ گیا۔ یہ حویلی دریائے جمنا کے کنارے انتہائی پرفضا مقام پر آباد تھی۔ حویلی سے تھوڑے فاصلے

پر مندر تعمیر کیا گیا تھا' بہت کم لوگ اس راز سے باخبر تھے کہ کرشن راؤ کی حویلی میں ایک طویل زمین دوز سرنگ موجود تھی اور سرنگ کا ایک دروازہ مندر کے بڑے پجاری رام سروپ کے کمرے میں کھلتا تھا۔ اس سرنگ کو خاص حالات میں استعمال کیا جاتا تھا ورنہ کرشن راؤ عام طور پر مندر کے بڑے دروازے سے اپنی عبادت گاہ میں داخل ہوتا تھا۔

حویلی پہنچ کر کامران نے کرشن راؤ سے براہ راست ملنے کی کوشش کی' مگر راما راؤ نے اسے صحن ہی میں روک دیا۔

''مہاراج نے رات بھر جاگ کر عبادت کی ہے وہ ابھی ابھی حویلی لوٹے ہیں' اس لئے تجھے اس وقت تک انتظار کرنا ہوگا جب تک ٹھاکر نیند سے بیدار نہیں ہو جاتے۔'' راما راؤ کا لہجہ قدرے سخت تھا۔

''مجھے بھی انتظار کرنا ہوگا؟'' شجاع الدین کامران نے چونک کر کہا' اس کی آواز بھی معمول سے زیادہ بلند تھی۔

''راما تو خوب جانتا ہے کہ میں کون ہوں؟ کیا ٹھاکر نے کل تجھ سے میرا تعارف نہیں کرایا تھا؟''

''ہاں! میں تجھے پہچانتا ہوں۔'' راما راؤ مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ میں طنز اور تحقیر کی جھلک صاف نمایاں تھی۔

''تو پھر اندر جا کر ٹھاکر کو اٹھا دے اور اسے بتا دے کہ رائے نعیم الدین ذیشان کا بیٹا شجاع الدین کامران آیا ہے۔'' یہ ایک سرکش نوجوان کا لہجہ تھا جسے راما راؤ بھی محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا۔

راما راؤ کیلئے کامران کا یہ انداز گفتگو نا قابل برداشت تھا' مگر وہ کچھ سوچ کر تلخیوں کے اس گھونٹ کو پی گیا۔ پھر تیزی سے پلٹا اور اندر چلا گیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد شجاع الدین کامران کرشن راؤ کے سامنے کھڑا تھا۔

''اسے واپس لے لے کرشن راؤ! میری ماں نے ان سکوں کو قبول نہیں کیا۔'' شجاع الدین کامران کا لہجہ تند و تیز تھا۔ ''وہ مجھ سے اس کے حصول کا ذریعہ دریافت کرتی رہیں' مگر میں انہیں تیرا نام نہیں بتا سکتا تھا۔''

''مجھے یقین تھا کامران کہ تو اپنی زبان نہیں کھولے گا۔'' کرشن راؤ مسکرایا۔ رات بھر جاگ کر شکنتلا کا رقص دیکھنے سے اس کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں اور کچھ شراب کا اثر بھی باقی تھا۔ اس لئے کرشن راؤ کی آواز میں ہلکی ہلکی لرزش تھی۔ ''میں جانتا تھا کہ تیری ماں بہت ضدی ہے' مگر تجھے اس کی ضد پر قربان نہیں ہونا چاہئے۔''

''پھر تو نے کیا فیصلہ کیا ٹھاکر؟'' کامران نے سکوں کی تھیلی پھینکتے ہوئے کہا۔ ''میرے اور تیرے درمیان بس ایک رات کی شرط تھی۔ رات گزر چکی' اب تجھے بھی کسی نتیجے پر پہنچ جانا چاہئے۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔''

''میرے جذباتی بیٹے! میں تیرے بارے میں فیصلہ کر چکا۔'' کرشن راؤ کی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہو گئی تھی۔

''بیٹھ جاؤ کہ آج سے تو میرا دایاں بازو ہے۔ میں تجھے طاقت بخشوں گا۔ ایسی طاقت کہ جس کے سامنے قائم خان راجپوت بھی پناہ مانگے گا۔''

شجاع الدین کامران نے چونک کر کرشن راؤ کی طرف دیکھا اور پھر قیمتی قالین پر بیٹھ گیا۔

''میرے قریب آ کہ تو میرا جانشین ہے۔'' کرشن راؤ بہت زیادہ مہربان نظر آ رہا تھا۔

شجاع الدین کامران سرکتا رہا' یہاں تک کہ کرشن راؤ کے قریب پہنچ گیا۔

کرشن راؤ نے جوش جذبات کا مظاہرہ کرتے ہوئے کامران کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا' پھر اس کی آواز گونجی۔

''راما! میرے تمام خدمت گاروں کو کمرے میں طلب کر کہ آج میں اپنی زندگی کا سب سے اہم اعلان کرنا چاہتا ہوں۔''

راما راؤ نے حیرت سے اپنے آقا کی طرف دیکھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد کرشن راؤ کا طویل و عریض کمرہ مسلح خدمت گاروں سے بھر گیا۔ وہ سب کے سب راجپوت تھے اور سرخ پگڑیاں پہنے ہوئے تھے' ان کی مونچھیں خم دار تھیں اور ماتھوں پر سرخ و زرد رنگ کے "تلک" کا نشان چمک رہا تھا۔

اچانک کرشن راؤ کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔

"میرے وفادار خادمو! میں تم پر نازاں ہوں کہ تم نے اپنے آقا کو کبھی مایوس نہیں کیا؟"

"آئندہ بھی ایسا ہی ہوگا۔" بیک وقت سینکڑوں آوازیں کمرے میں گونجنے لگیں۔

"میرے کان ایسی ہی آوازیں سننے کے عادی ہیں سورماؤ!" احساس فخر سے کرشن راؤ کی گردن کچھ اور بلند ہوگئی۔ "مگر تم یہ نہیں جانتے کہ تمہارا ٹھاکر اب بوڑھا ہو چکا ہے۔" ایک مختصر سے سکوت کے بعد کرشن راؤ دوبارہ اپنے خدمت گاروں سے مخاطب ہوا۔

"مہاراج! آپ ہمیشہ سچ بولتے ہیں' مگر یہ بات غلط ہے کہ آپ بوڑھے ہو چکے ہیں۔" دوبارہ سینکڑوں آوازیں گونج اٹھیں۔ "زمین و آسمان اپنے محور سے ہٹ سکتے ہیں لیکن ہمارا ٹھاکر بوڑھا نہیں ہوسکتا۔ آپ تو وہ ہیں جن پر ہزاروں جوانیاں قربان کی جاسکتی ہیں۔"

"تمہارے جذبات قابل قدر ہیں' مگر موت کسی کو معاف نہیں کرتی۔" کرشن راؤ نے بارعب آواز میں کہا۔

"میری آنکھیں کسی بھی وقت بند ہوسکتی ہیں' تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میرا کوئی بیٹا نہیں۔ اس لئے میں زندگی ہی میں اپنا جانشین نامزد کرنا چاہتا ہوں۔"

تمام خدمت گار سناٹے میں آگئے۔

"اور میرا جانشین یہ ہے۔" کرشن راؤ نے شجاع الدین کامران کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ کیسے ہوسکتا ہے ٹھاکر؟ خدمت گار تقریباً چیخ اٹھے۔" ایک مسلمان آپ کا جانشین اور ہمارا سردار کس طرح ہوسکتا ہے؟"

"یہ ممکن ہے۔" کرشن راؤ نے پر زور لہجے میں کہا۔ "ایک بہادر ہی دوسرے بہادر کا جانشین ہوسکتا ہے۔ کامران مسلمان سہی' مگر میرے خاندان کی نشانی ہے۔ وہ اپنے مذہب پر قائم رہے گا اور تم اپنے دھرم پر' بس اب تم اسے سلام کرو اور اس کے قدموں میں جھک کر تعظیم پیش کرو۔"

تمام راجپوت خدمت گار کچھ دیر تک سکتے کے عالم میں کھڑے رہے' پھر آہستہ آہستہ ایک ایک کر کے شجاع الدین کامران کے قدم چھونے لگے۔

جھکنے والا آخری شخص راما راؤ تھا' جب وہ سیدھا ہوا تو کرشن راؤ نے اسے حکم دیتے ہوئے کہا۔

"راما! مندر کے پجاریوں کو خبردار کردے کہ ہم اپنے جانشین کے ساتھ اس طرف آرہے ہیں۔"

پھر وہ پلٹ کر شجاع الدین کامران سے مخاطب ہوا۔ "یہ ہماری طاقت کا ایک ادنیٰ مظاہرہ ہے۔ کچھ دیر بعد ہم تجھے ایک اور منظر دکھائیں گے۔"

شجاع الدین کامران ایک مجسمے کی طرح ساکت کھڑا ہوا تھا۔

❋❋❋

راما! میرے جانشین پر سے چاندی کے سکے نچھاور کرکے انہیں غریبوں میں تقسیم کردے۔ کرشن راؤ نے اپنے خدمت گار کو دوسرا حکم دیتے ہوئے کہا۔

راما راؤ کا چہرہ بجھا بجھا سا تھا' مگر اس نے اپنے آقا کے حکم کی تعمیل میں شجاع الدین کامران پر چاندی کے سکوں سے بھری ہوئی تھیلی لٹا دی اور اپنے ایک ماتحت سے کہا کہ وہ ان تمام سکوں کو ضرورت مندوں میں بانٹ دے۔

اس کے بعد راما راؤ کمرے سے نکل گیا کہ اسے مندر کے بڑے پجاری رام سروپ کو بھی ٹھاکر کے فیصلے سے آگاہ کرنا تھا' پھر جب کرشن راؤ کے دوسرے خدام بھی ایک ایک کرکے چلے گئے تو شجاع الدین کامران نے قدرے ناگوار لہجے میں کہا۔

ٹھاکر! میں تیری اس حرکت کا مفہوم نہیں سمجھا۔''

''کیسی حرکت؟'' کرشن راؤ مسکراتے ہوئے بولا۔

''یہی کہ میں تیرا وارث کس طرح بن گیا؟'' شجاع الدین کامران برہم نظر آرہا تھا۔ ''میں تیرا جانشین کس طرح ہوسکتا ہوں کہ تو ہزاروں دیوتاؤں کا پجاری ہے اور میں ایک خدا کا ماننے والا ہوں۔''

''یہی سوال مجھ سے راما نے بھی کیا تھا۔'' کرشن راؤ کا انداز سرد تھا۔ ''اور میں نے اسے بھی وہی جواب دیا تھا جو تجھے دے رہا ہوں۔ بے شک! میرے اور تیرے درمیان مذہب کی کبھی نہ عبور کی جانے والی خلیج حائل ہے' پھر بھی تو اپنے عقیدے پر قائم رہے گا اور میں اپنے دھرم کا پالن کرتا رہوں گا۔ یہ تو ایک تجارتی معاہدہ ہے اور اس معاہدے کے تحت میں تجھے اپنا جانشین سمجھتا ہوں۔''

''مگر تو نے اچانک اتنا بڑا اعزاز کیسے دے دیا کرشن راؤ؟'' شجاع الدین کامران نے دوسرا سوال کیا جو بڑا معنی خیز تھا۔

کرشن راؤ ایک لمحے کیلئے بھی کسی سوچ میں نہیں ڈوبا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس نے کامران کے تمام سوالوں کے جوابات پہلے ہی سوچ لئے تھے۔ وہ کسی فکر اور تردد کے بغیر بولا۔ ''یہ فیصلہ میں نے ایک دن میں نہیں کیا بیٹے! وقت کے بے شمار نشیب و فراز سے گزرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تجھ جیسا بہادر اور سچا نوجوان ہی میرا وارث ہوسکتا ہے۔''

شجاع الدین کامران حیرت سے کرشن راؤ کی طرف دیکھنے لگا۔

''دراصل بات یہ ہے کہ میں اپنے خدمت گاروں پر زیادہ اعتبار نہیں کرتا۔ کرشن راؤ نے اچانک ایک نئی چال چلی۔ یہ جاگیریں' یہ باغات اور یہ سونے چاندی کے ڈھیر اسی وقت تک ہیں جب تک میری آنکھیں کھلی ہیں' جس روز

ہی یہ آنکھیں بند ہوئیں اسی دن تمام سانپ اپنے اپنے سوراخوں سے باہر نکل آئیں گے اور میری ساری دولت کو ٹ جائیں گے۔'' یہ کہتے کہتے کرشن راؤ بہت زیادہ اداس نظر آنے لگا تھا۔

شجاع الدین کامران کی حیرت و پریشانی میں مزید اضافہ ہوگیا۔

''تو مجھے بہت آسودہ حال انسان سمجھتا ہے؟'' کرشن راؤ نے دل گرفتہ لہجے میں کہا۔ ''تمام دنیا یہی سمجھتی ہے کہ ٹھاکر دہلی کا سب سے زیادہ طاقتور اور مالدار شخص ہے۔ مگر کسی کو نہیں معلوم کہ کرشن راؤ اندر سے کس قدر ٹوٹ پھوٹ گیا ہے۔ میری صرف ایک بیٹی ہے کامنی۔ جس کا شوہر مراری لال گزشتہ بیس سال سے ایک اپاہج کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ شادی کے تین دن بعد ہی اسے فالج کے موذی مرض نے ناکارہ بنا دیا تھا۔ اب وہ ایک زندہ لاش ہے۔ جس کی سیوا کر کے کامنی اپنی ریشم جیسی زندگی کو کانٹوں پر کھینچ رہی ہے۔ کامنی کے بھی کوئی اولاد نہیں۔ تو نہیں جانتا بیٹے کے عنقریب کرشن راؤ بے نام و نشان ہو جانے والا ہے۔ میرے بعد اس غمزدہ عورت اور بدنصیب داماد کا کوئی پرسان حال نہیں ہوگا۔ دولت کے انبار پر یہی لوگ قبضہ کرلیں گے جو آج میرے جاں نثار کہلاتے ہیں۔''

''آخر آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟'' شجاع الدین کامران اس کی باتوں سے متاثر ہو چلا تھا۔

''میری خواہش ہے کہ جب تو اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے اور قائم خان راجپوت تجھ سے اپنی زندگی کی بھیک مانگنے لگے تو فتح کے نشے میں مجھ بوڑھے کو فراموش نہ کر دینا۔'' کرشن راؤ کا لہجہ اثر انگیز تھا۔

شجاع الدین کامران سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

''میں نہیں چاہتا کہ میرے بعد کامنی اور مراری لال ان لوگوں کے محتاج ہو کر رہ جائیں۔'' یکا یک کرشن راؤ کی آواز سے رقت جھلکنے لگی تھی۔ میں چاہتا ہوں کہ مرنے سے پہلے تجھے اپنے کاروبار کا منتظم اعلیٰ بنا دوں۔ اس طرح میری بیٹی اور داماد عزت و سکون کی زندگی بسر کرسکیں گے اور تو بھی خوشحالی سے ہمکنار ہو سکے گا۔ میں تجھے ایک دولت مند انسان کے روپ میں دیکھنا چاہتا ہوں۔

ابھی کرشن راؤ کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ شجاع الدین کامران نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''میری بات چھوڑ دے ٹھاکر کہ میں قائم خان راجپوت سے انتقام لینے کے بعد زندہ رہنا نہیں چاہتا۔ مجھے دنیا کی رسموں سے بھی نفرت ہے اور دنیا والوں سے بھی۔'' شجاع الدین کامران اچانک بھڑک اٹھا اور اس کے بجھے ہوئے زخم ایک بار پھر لو دینے لگے تھے۔

''تو کیوں مرے گا؟'' ہلاک ہو جائیں تیرے دشمن' کرشن راؤ نے ناراض ہوتے ہوئے کہا۔ ''ابھی تو نے دیکھا ہی کیا ہے؟ سچ تو یہ ہے کہ تو ابھی پیدا بھی نہیں ہوا ہے۔ یہ کوئی زندگی ہے کہ تو دو روٹیوں اور اجلے کپڑوں کیلئے ترستا رہے۔ کامران! تیری زندگی آج سے شروع ہو رہی ہے۔ میں تجھے بعد میں سب کچھ سمجھا دوں گا۔ فی الحال میرے ساتھ مندر چل! پھر تجھے اندازہ ہوگا کہ زندگی کیا ہے؟ میرے کسی فیصلے کو شک کی نظروں سے نہ دیکھ کہ اسی میں تیری بھلائی ہے۔''

شجاع الدین کامران خاموش ہوگیا۔ وہ ہر صورت میں اپنے ماموں قائم خان راجپوت سے انتقام لینے کیلئے طاقت حاصل کرنا چاہتا تھا اور طاقت کرشن راؤ کی مرضی کے بغیر نہیں مل سکتی تھی۔

❋❋❋

پھر کچھ دیر بعد بوڑھا ٹھاکر شجاع الدین کامران کو لے کر مندر پہنچا۔ راما راؤ پہلے ہی پجاری رام سروپ کو اطلاع دے چکا تھا۔ اس لئے مندر کا تمام عملہ ٹھاکر کا استقبال کرنے کی غرض سے مندر کے دروازے پر موجود تھا۔

جیسے ہی کرشن راؤ شجاع الدین کامران کے ہمراہ مندر کے قریب پہنچا' سینکڑوں پجاری اور قرب و جوار کے لوگ اسے دیکھ کر پرجوش نعرے لگانے لگے۔ سب کی گردنیں جھکی ہوئی تھیں۔ کرشن راؤ ان کے سروں پر ہاتھ رکھ کر آشیرباد دیتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ سب سے آخر میں پجاری رام سروپ اس طرح کھڑا ہوا تھا جیسے کوئی زرخرید غلام اپنے آقا کے حکم کا منتظر ہو۔

''پجاری! ہم تیرے کمرے میں کچھ دیر آرام کریں گے۔'' کرشن راؤ نے رام سروپ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''یہ میرا سوبھاگ ہوگا مہاراج!'' رام سروپ کچھ اور جھک گیا تھا۔ ''میں تو یہی سمجھوں گا کہ جیسے بھگوان خود چل کر میرے دروازے تک آئے ہوں۔'' رام سروپ نے بدترین خوشامد کا انداز اختیار کیا تھا۔ ''آپ تو ہندو دھرم کے رکھشک ہیں' پالن ہار ہیں۔ آپ نہ ہوتے تو کون جانے کہ ہمارا کیا حال ہوتا؟'' رام سروپ گداگرانہ انداز میں کرشن راؤ کی عظمتوں کے قصیدے پڑھ رہا تھا اور کرشن راؤ ایک خاص شان بے نیازی کے ساتھ کمرے کی طرف جا رہا تھا۔

جب فاصلہ زیادہ ہو گیا تو رام سروپ بھاگتا ہوا آگے بڑھا اور اس نے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔

پہلے کرشن راؤ اندر داخل ہوا' پھر اس نے پلٹ کر دیکھا شجاع الدین تذبذب کا شکار ہو کر باہر ہی ٹھہر گیا تھا۔

''بے جھجک اندر چلا آ کہ یہ سب تیرے غلام ہیں۔'' کرشن راؤ کا لہجہ انتہائی متکبرانہ تھا۔

شجاع الدین کامران جھجک کر آگے بڑھا اور دروازے میں داخل ہو گیا۔ رام سروپ نے فوراً ہی دروازہ بند کر دیا۔ کامران کی مضطرب نگاہوں نے ادھر ادھر دیکھا۔ بڑا عجیب منظر تھا۔ کمرے کے ایک حصے میں دیوی دیوتاؤں کے چھوٹے چھوٹے مجسمے نصب تھے۔ ان میں گنیش کا مجسمہ بھی تھا۔ جس کے چہرے پر ہاتھی کے چہرے کا گمان ہوتا تھا۔ ایک طرف ہنومان کا مجسمہ تھا' جس کی شبیہہ ایک بندر سے ملتی تھی۔ دوسری جانب درگاہ کی مورتی تھی جس کے جسم سے کئی ہاتھ نمودار ہو رہے تھے۔ کامران بدحواسی کی کیفیت میں مجسموں کو دیکھنے لگا' پھر اس کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔

''یہ تو مجھے کہاں لے آیا ٹھاکر؟'' شجاع الدین کامران نے انتہائی تلخ لہجے میں سوال کیا۔

''یہ وہ جگہ ہے جہاں سے بیٹھ کر تو قائم خان راجپوت کے خلاف اپنی جنگ کا آغاز کرے گا۔'' کرشن راؤ نے پجاری کی آرام دہ مسند پر دراز ہوتے ہوئے کہا۔

''یہ تو تیری عبادت گاہ ہے ٹھاکر! میں یہاں کیسے رہ سکتا ہوں؟'' شجاع الدین کامران کچھ پریشان سا نظر آنے لگا تھا۔

''تو یہاں ہمارے دیوتاؤں کی پوجا کرنے کیلئے نہیں آیا ہے۔'' کرشن راؤ نے مسکراتے ہوئے کہا یہ مندر تیری جائے پناہ بھی ہے اور تربیت گاہ بھی۔ تجھے یہاں فنون سپاہ گری سکھائے جائیں گے تاکہ تو شمشیر زنی کے ہنر سے واقف ہو جائے اور پھر تیری تلوار قائم خان راجپوت کا گلا کاٹ سکے۔'' کرشن راؤ نے مندر میں اپنے آنے کی توجیہہ پیش کرتے ہوئے کہا۔

''کیا تیری عبادت گاہ میں شمشیر زنی اور شہسواری کی تربیت دی جاتی ہے؟'' شجاع الدین کامران ابھی تک کرشن راؤ کے جواب سے مطمئن نہیں ہوا تھا۔ ''ان کاموں کیلئے تو کھلے میدان درکار ہوتے ہیں' پھر مندر کا ایک خفیہ گوشہ کیوں؟'' شجاع الدین نے کرشن راؤ کی بیان کردہ توجیہہ پر اعتراض کرتے ہوئے کہا۔

کرشن راؤ مسکرایا۔ ''نوجوانی کے اشتعال اور بڑھاپے کے ٹھہراؤ میں یہی تو فرق ہوتا ہے۔ میں تیری تربیت کیلئے کھلے میدانوں کا انتخاب بھی کر سکتا تھا۔ مگر تجھے معلوم ہے کہ تیرا دشمن کتنا باخبر ہے؟ افسوس! تو اب تک قائم خان

راجپوت کو نہیں پہچانا۔ اس کے جاسوس ہر طرف شکاری کتوں کی طرح تیری خوشبو سونگھتے پھر رہے ہیں جو تجھے کسی جرم کے بغیر زنداں کے حوالے کرا سکتا ہے۔ وہ تیری شمشیر زنی کی تربیت سے کس طرح بے خبر رہ سکتا ہے؟ اس کی عیار نظریں ہر وقت تیرے تعاقب میں ہیں۔ پھر میں تجھے کسی کھلے میدان میں قائم خان راجپوت کی خوراک بننے کیلئے کیسے چھوڑ سکتا ہوں؟'' کرشن راؤ نے ایک مضبوط دلیل پیش کی تھی جسے سن کر شجاع الدین کامران لاجواب سا نظر آنے لگا۔

''میں تجھے شمشیر زنی کے ساتھ دشمنوں سے نبرد آزما ہونے کے دوسرے طریقے بھی سکھاؤں گا۔'' کرشن راؤ نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''جب دشمن بہادر ہو تو اس کے سینے پر وار کرنے میں لذت حاصل ہوتی ہے مگر جب کوئی حریف کمینگی پر اتر آئے تو اس کی پشت کو نشانہ بنانا چاہئے۔ قائم خان راجپوت بھی ایک عیار دشمن ہے۔ وہ اس طرح زیر دام نہیں آئے گا۔ اسے شکست دینے کیلئے ابھی تجھے کئی ہنر سیکھنے ہوں گے۔ میں نہیں چاہتا کہ تو ٹھاکر کی پناہ میں آنے کے بعد بے موت مارا جائے۔ اس میں میری بھی شدید رسوائی ہے کہ کرشن راؤ کے ہوتے ہوئے تو مات کھا جائے۔ اچانک بوڑھے ٹھاکر کا لہجہ پر جوش ہو گیا تھا۔ اب مجھے اس وقت تک کیلئے زیر زمین روپوش ہو جانا پڑے گا جب تک تیرے کمزور ہاتھ فولاد کے سانچے میں نہ ڈھل جائیں اور اگر تو نے میری بات نہیں مانی تو پھر......'' کرشن راؤ نے جان بوجھ کر اپنی بات نامکمل چھوڑ دی۔

شجاع الدین کامران چند لمحوں تک موجودہ حالات کے بارے میں سوچتا رہا' پھر کرشن راؤ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگا۔

''کیا قائم خان راجپوت کو اس بات کی خبر نہیں ہوئی کہ میں ہندوؤں کی عبادت گاہ میں داخل ہوا تھا؟ کامران نے ذہانت سے بھرپور ایک عجیب سا سوال کیا۔ ''غیر مذہب کے لوگوں سے رابطہ رکھنے پر بھی تو ایک ہنگامہ کھڑا ہو سکتا ہے۔''

''یقیناً ہو سکتا ہے مگر اس صورت میں کہ تو بار بار مندر کے دروازے میں داخل ہو۔'' کرشن راؤ نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

شجاع الدین کامران استفہامیہ نظروں سے کرشن راؤ کی طرف دیکھنے لگا۔

''آج کے بعد باہر کا کوئی آدمی تیرا عکس تک نہیں دیکھ سکے گا۔'' کرشن راؤ نے ایک جذباتی نوجوان کو مطمئن کرتے ہوئے کہا باہر کی فضا تجھے راس نہیں آئے گی۔ میرے بیٹے! اس لئے ابھی تجھے کچھ دن زیر زمین ہی جینا ہوگا۔''

''کیا اس دوران قائم خان راجپوت مجھے تلاش نہیں کرے گا؟'' شجاع الدین کامران کے بے قرار ذہن نے ایک اور کروٹ لی۔

''بے شک! وہ تجھے ڈھونڈے گا' مگر اسے تیرا پتہ کون بتائے گا؟ کرشن راؤ نے جواباً کہا۔

وہ میری ماں کو بھی اذیتیں پہنچا سکتا ہے۔'' یہ کہتے کہتے کامران کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ ''مجھ تک رسائی حاصل کرنے کیلئے میری بوڑھی ماں پر تشدد بھی کر سکتا ہے۔''

''کیا تو نے اپنی ماں کو بتا دیا ہے کہ تیرے اور میرے درمیان نیا رشتہ قائم ہو چکا ہے؟'' جواب دینے کے بجائے کرشن راؤ نے خود ہی ایک نیا سوال کر ڈالا۔

''ہرگز نہیں۔ کیا تو مجھے اس قدر احمق اور وعدہ شکن سمجھتا ہے ٹھاکر؟'' شجاع الدین کامران کے لہجے میں تلخی

تھی۔

''پھر قائم خان یہاں تک کیسے پہنچے گا؟'' کرشن راؤ نے کہا۔ ''میں اپنے انجام سے نہیں ڈرتا' مگر مجھے ماں کا خیال پریشان کر رہا ہے۔ ٹھاکر کہیں ایسا نہ ہو کہ قائم خان کسی پست حرکت کا مظاہرہ کرے اور پھر میں اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکوں۔ اس وقت کیا ہوگا کرشن راؤ؟ میں تیری اونچی اونچی دیواریں توڑ کر نکل جاؤں گا۔ مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔ کوئی نہیں روک سکتا۔'' شجاع الدین کامران پر ہذیانی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔

''بیٹھ جا! میرے بیٹے! کرشن راؤ سیدھا ہوا اور کامران کا ہاتھ پکڑ کر کھینچنے لگا۔ میں اسی لئے تیرے ہاتھ میں تلوار دینا چاہتا ہوں۔ جب شمشیر کے قبضے پر تیری گرفت مضبوط ہو جائے گی تو پھر کسی قائم خان کو یہ حوصلہ نہیں ہوگا کہ وہ تیری طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ سکے۔ خالی ہاتھ کس کس سے لڑے گا۔ اگر اپنی ماں کو پرسکون دیکھنا چاہتا ہے تو خاموشی سے میری پناہ گاہ میں داخل ہو جا...... ورنہ بے رحم زمانے کے پتھر ہوں گے...... اور تیری ماں کا نحیف و نزار بدن۔''

کرشن راؤ نے کامران کے گرد اپنی عیاریوں کا ایسا مضبوط حصار کھینچ دیا تھا کہ وہ جذباتی نوجوان اس سے نکلنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ بالآخر کامران کرشن راؤ کے قریب ہی مسند پر بیٹھ گیا۔

''پجاری رام سروپ نے شربت سے کرشن راؤ اور شجاع الدین کامران کی تواضع کی' پھر ٹھاکر اٹھا اور کامران کو اپنے ساتھ لے کر مندر کے زیر زمین حصے میں چلا گیا جہاں دیوداسیوں کے کمرے بنے ہوئے تھے۔

کرشن راؤ اپنے مخصوص کمرے میں داخل ہوا اور اس نے دیوداسی شکنتلا کو طلب کر لیا۔ شجاع الدین کامران حیرت سے اس سرنگ کو دیکھ رہا تھا جس سے گزر کر وہ ایک نئی دنیا میں پہنچ گیا تھا۔

''یہ کون سی جگہ ہے ٹھاکر؟'' شجاع الدین کامران نے آراستہ کمرے پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

''یہ تیرے ٹھاکر کی آرام گاہ ہے۔'' کرشن راؤ نے مخملیں بستر پر دراز ہوتے ہوئے کہا۔ ''جب یہ بوڑھا جسم پوجا کرتے کرتے تھک جاتا ہے تو کچھ دیر یہاں لیٹ کر بھجن سنتا ہوں۔'' کرشن راؤ صریحاً جھوٹ بول رہا تھا۔

شجاع الدین کامران قریب ہی پڑی ہوئی ایک آبنوسی کرسی پر بیٹھ گیا۔

اسی دوران دیوداسی شکنتلا کمرے میں داخل ہوئی اور ایک اجنبی نوجوان کو دیکھ کر رک گئی۔

''چلی آ شکنتلا! یہ میرا ہی ناراض بیٹا ہے جس کا میں نے تجھ سے ذکر کیا تھا۔'' کرشن راؤ نے ایک شاداب مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

شکنتلا نے ایک لمحے کیلئے گہری نظروں سے شجاع الدین کامران کی طرف دیکھا اور پھر سر جھکائے ہوئے آگے بڑھی۔ یہاں تک کہ اس نے اپنے دونوں ہاتھ کرشن راؤ کے پیروں پر رکھ دیئے۔ یہ ایک تعظیمی انداز تھا' جس نے شجاع الدین کامران کے ذہن پر نیا اثر مرتب کیا اور وہ سوچنے لگا کہ یہ بوڑھا راجپوت اپنے حلقے میں کس قدر بااثر ہے۔ سینکڑوں توانا راجپوت بھی اس کے قدموں پر خم نظر آتے ہیں اور ان گنت پجاری بھی۔

ابھی کامران اپنے خیالات میں الجھا ہوا تھا کہ ٹھاکر کا ہاتھ دراز ہوا اور شکنتلا کے سر پر سایہ فگن ہو گیا۔ ''جیتی رہ دیوداسی کہ تو نے ہندو دھرم کی بہت سیوا کی ہے۔ پہلے مجھے بھجن سنا دے کہ میری آتما شانت ہو جائے' پھر میں اپنے بیٹے کے بارے میں تفصیل سے بتاؤں گا۔'' کرشن راؤ کامران کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

شکنتلا نے اپنی عقیدت کا اظہار کرنے کیلئے کرشن راؤ کے پیروں پر سر رکھ دیا' پھر تیزی سے اٹھی اور کامران کی جانب دیکھے بغیر کمرے سے باہر چلی گئی۔

اور جب واپس آئی تو اس کے ساتھ دوسری دیوداسیوں کی ایک قطار تھی۔ وہ دیوداسیاں اپنے ہاتھوں میں مختلف ساز اٹھائے ہوئے تھیں۔ کرشن راؤ پر نظر پڑتے ہی تمام دیوداسیاں باادب ہوگئیں۔ انہوں نے اپنے ساز کمرے کے فرش پر رکھے اور ٹھاکر کے احترام میں سجدہ ریز ہوگئیں۔

''مہاراج کی عمر دراز ہو کہ آپ اس دور میں ہندو مذہب کے سب سے بڑے نگہبان ہیں۔''

ہر دیوداسی یہ مخصوص کلمات ادا کرتی اور فرش پر بیٹھ جاتی۔ الغرض جب ساری دیوداسیاں غلامانہ رسم ادا کر چلیں تو کرشن راؤ بھی اٹھ کر بیٹھ گیا۔

شکنتلا سب دیوداسیوں سے آگے تھی۔ پھر اس کی مخروطی انگلیوں نے ساز کے تاروں کو چھوا اور اس کے ساتھ ہی کمرے کی فضا میں ایک ''من موہنی'' آواز گونجنے لگی۔

''ہرے کرشنا...... ہرے کرشن......

ہرے راما...... ہرے راما......

شکنتلا کی آواز میں بڑا سوز تھا۔ اگرچہ شجاع الدین کامران کی سماعت ہندوؤں کے اس مشہور بھجن سے ناآشنا تھی لیکن شکنتلا کی آواز کے سحر نے اس کے دل میں گداز پیدا کر دیا تھا۔

کامران نے کرشن راؤ کی طرف دیکھا۔ بوڑھا ٹھاکر آنکھیں بند کئے جھوم رہا تھا' مگر کامران نے ایک ہی نظر میں محسوس کرلیا کہ کرشن راؤ کے جسم کی یہ جنبش مصنوعی تھی اور اس کا گہرا سرخ چہرہ ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا۔ اس کے برعکس شکنتلا کی آنکھیں بھی بند تھیں' مگر اس کے چہرے سے ایک مخصوص کرب نمایاں تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے شکنتلا کے رخساروں پر آنسو بہنے لگے اور آواز دم بہ دم تیز ہوتی چلی گئی۔

''دیوداسی! تو سدا سکھی رہے کہ تیرے بھجن سن کر میرے دھرم کو نیا جیون مل جاتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرا شریر دھرتی کی سیماؤں (حدود) سے گزر کر دور کہیں آکاش کے نامعلوم اجالوں میں کھو گیا ہے۔ آتما کا سارا بوجھ اتر گیا ہے اور کسی پیڑ کے پتے کی طرح ہواؤں میں اڑ رہا ہوں۔'' یہ کہہ کر بوڑھے راجپوت نے دوسری دیوداسیوں کو آنکھ کا اشارہ کیا۔ اس اشارے کا صاف مطلب تھا کہ وہ کمرے سے چلی جائیں۔

دیوداسیوں نے رخصت ہوتے وقت دوبارہ کرشن راؤ کو سجدہ کیا اور اپنے اپنے ساز اٹھا کر کمرے سے نکل گئیں۔

اب صرف شکنتلا کمرے میں موجود تھی' جو سوالیہ نگاہوں سے کرشن راؤ کی جانب دیکھ رہی تھی۔

''یہ میرے عظیم خاندان کی گمشدہ نشانی ہے' شجاع الدین کامران!'' کرشن راؤ نے اپنی سفید بل کھاتی ہوئی مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ اس طرح وہ راجپوت قوم کی سربلندی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ ''اگرچہ اس کے باپ دادا نے اپنے پرکھوں کا دھرم بدل ڈالا اور سنسار کی ریت کے مطابق یہ ہندوؤں کیلئے غیر ہوگیا' لیکن میں اسے پریشان نہیں دیکھ سکتا۔ آج سے یہ میرے کاروبار کا منتظم ہے اور تجارتی اعتبار سے میرا جانشین۔ ابھی یہ نوجوان بھی ہے اور دنیا کی ہواؤں سے ناآشنا بھی۔ اس کے ماموں نے اقتدار کے نشے میں اس پر اور اس کی ماں پر بڑے ''الم ڈھائے ہیں۔ یہ ایک غیرت مند باپ کا خوددار بیٹا ہے۔ یہ اپنے دشمن سے انتقام لینا چاہتا ہے' مگر بے دست و پا ہے۔ میں اس کے ہاتھوں میں تلوار دینا چاہتا ہوں اور لرزتے قدموں کو استقامت۔ تو اسے جنگ کے تمام آداب سکھا دے کہ پھر یہ کسی محاذ پر شکست کا منہ نہ دیکھے۔''

شکنتلا نے جواباً شجاع الدین کامران کی طرف دیکھا۔ ابھی وہ کچھ کہنے بھی نہیں پائی تھی کہ کامران بے اختیار

بول اٹھا۔

''ٹھاکر! یہ تو کیا کہہ رہا ہے؟'' کامران کی آواز نہایت تندو تیز تھی۔ ''ایک عورت مجھے آداب جنگ سکھائے گی؟''

''ہاں بیٹے! یہ عورت ہی تیرا علاج ہے۔'' کرشن راؤ نے انتہائی سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''اسے ایک نرم و نازک دیوداسی نہ سمجھ' یہ بڑی گیانی لڑکی ہے۔ تجھے تلوار سے زیادہ راج نیتی (سیاست) کی ضرورت ہے اور دلی میں اس سے بہتر راج نیتی کوئی نہیں جانتا۔ اگر آج چانکیہ (ہندوؤں کا مشہور سیاستدان) زندہ ہوتا تو اس پر ناز کرتا۔'' کرشن راؤ نے ایک عجیب انداز سے دیوداسی شکنتلا کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

''تیرا خیال غلط ہے ٹھاکر! میں سیاست نہیں شمشیر چاہتا ہوں۔'' شجاع الدین کامران کے لہجے میں وہی تلخی اور گستاخی تھی جسے دیکھ کر شکنتلا کو بھی چونک جانا پڑا۔

''سیاست کو اتنا حقیر نہ سمجھ میرے نادان بچے کہ سیاست ہی اس دنیا کا سب سے تیز ہتھیار ہے۔'' کرشن راؤ نے کامران کی سرکشی کو کم کرنے کیلئے نرم انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''سیاست اس خوبی سے قائم خان راجپوت کا گلا کاٹ سکتی ہے کہ دشمن بھی اپنے خون میں نہا جائے گا اور تیرے ہاتھ بھی صاف رہیں گے۔ میں یقیناً تجھے تلوار دوں گا مگر اس کے ساتھ ہی تیری سیاسی تربیت بھی ضروری ہے۔''

شجاع الدین کامران کا غصہ آہستہ آہستہ سرد ہوتا جا رہا تھا۔

''تیری جنگی تربیت سردار نرسنگا کرے گا' ہمارا جیالا سپاہی۔'' کرشن راؤ نے کامران کو مطمئن کرنے کیلئے کہا۔

سردار نرسنگا کا نام سن کر شکنتلا کے سینے میں خوف و دہشت کا ایک طوفان اٹھا اور وہ اندر ہی اندر کانپ کر رہ گئی۔ یہ وہی میواتی لٹیروں کا سردار نرسنگا تھا جس نے شکنتلا سے دوشیزگی کا اعزاز چھین کر اسے کرشن راؤ کے حوالے کر دیا تھا اور پھر وہ بظاہر ایک دیوداسی بنا دی گئی تھی' لیکن درپردہ اس کا ایک ہی کام تھا کہ وہ بوالہوس بوڑھے کرشن راؤ کیلئے تسکین قلب و نظر کے مواقع فراہم کرتی رہے۔ آج جب کرشن راؤ نے نرسنگا کا نام لیا تو اس کی نظروں کے سامنے بے رحم ماضی کے تمام مناظر ابھر آئے۔ شکنتلا نے کسی تاخیر کے بغیر اپنے جذبات پر قابو پا لیا اور اس معصوم نوجوان کو دیکھنے لگی جو ایک سنگدل قذاق سردار نرسنگا کا تازہ ترین شکار بننے والا تھا۔

نرسنگا کا نام سن کر شجاع الدین کامران کچھ نہیں بولا' مگر وہ سوالیہ انداز میں کرشن راؤ کی طرف دیکھنے لگا۔

''میں تجھے اپنے کسی دوسرے سپاہی کے بھی حوالے کر سکتا تھا' لیکن نرسنگا بڑا ماہر تیغ زن ہے۔ وہ تیری تلوار میں ایسی کاٹ پیدا کر دے گا کہ بیک وقت کئی دشمنوں کی گردن کو نشانہ بنایا جا سکتا ہے۔'' کرشن راؤ نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

شجاع الدین کامران بدستور خاموش رہا۔

''تیرا دن نرسنگا کے ساتھ جنگل میں بسر ہوگا اور رات مندر کے اس زیر زمین حصے میں۔'' کرشن راؤ نے اپنے منصوبے کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''تیرے جسم کی تربیت سردار نرسنگا کرے گا اور ذہن کی تربیت دیوداسی شکنتلا۔ اب تجھے ایک طویل عرصے تک روپوش رہنا ہوگا کہ دشمنوں کو تیرے ٹھکانے کا پتا نہ چل سکے۔

''ٹھاکر! مجھے کب تک یہ قیدیوں جیسی زندگی بسر کرنی ہوگی؟'' بالآخر شجاع الدین کامران نے ایک نیا سوال کر ڈالا۔

''میری عنایات کو مصیبت سمجھتا ... کرتا ہے؟'' کرشن راؤ نے تلخ لہجے میں

کہا۔

''تیری نامراد زندگی میں یہ پہلا دن ہے جب تو ٹھاکر کرشن راؤ کے قریب بیٹھ کر اس قدر گستاخانہ انداز میں بات کر رہا ہے۔ وہ دن یاد کر جب تجھے دیکھ کر تیرے ہم قوم بچے اپنے گھروں کے دروازے بند کر لیتے تھے اور تو اچھوتوں سے بھی بدتر زندگی گزار رہا تھا۔ میں نے تیرے قدموں پر ٹیڑھی گردن والے سینکڑوں راجپوتوں کو جھکا دیا' مگر تو پھر بھی مسلسل ناشکری کا مظاہرہ کر رہا ہے۔'' کرشن راؤ کی آواز لحظہ بہ لحظہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ ''کامران! میں تیرے سوالات سے تنگ آ چکا ہوں۔ آج واضح طور پر یہ بات سن لے کہ اگر تجھے میری نوازشات قبول نہیں تو اسی وقت واپس لوٹ جا۔ میں کسی جانشین اور وارث کے بغیر بھی عزت مندانہ زندگی گزار سکتا ہوں۔ اسے میری مجبوری نہ سمجھ کہ میں مسلمانوں کے حملے سے پہلے بھی ایک ناقابل تسخیر راجپوت تھا اور مرتے وقت بھی ٹھاکر کرشن راؤ ہی رہوں گا۔ ضرورت مند تو ہے' میں نہیں۔''

کرشن راؤ کے بگڑتے ہوئے تیور دیکھ کر شجاع الدین کامران سنبھل گیا۔

''میرا یہ مطلب نہیں تھا ٹھاکر!'' کامران کے لہجے میں یکایک نرمی پیدا ہو گئی تھی۔ ''میں تو یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ مجھے کب تک یہ روپوشی کی زندگی بسر کرنی ہوگی؟''

''ایک سال' دو سال' پانچ سال' دس سال۔ یا اس سے بھی زیادہ۔'' کرشن راؤ نے کامران کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''جب تک تو میرے قائم کردہ معیار کے مطابق امتحان میں کامیاب نہیں ہو جاتا۔''

''پھر میں اپنی ماں سے کس طرح ملاقات کر سکوں گا؟'' شجاع الدین کامران نے انتہائی کربناک لہجے میں کہا۔

''میں اسے روتا ہوا چھوڑ آیا تھا ٹھاکر۔ وہ تو بس جوش انتقام ہے' جس نے مجھے تیرے دروازے تک پہنچا دیا ہے ورنہ میں اپنی ماں سے زیادہ دن دور نہیں رہ سکتا' مجھے یہ بھی گوارا نہیں کہ وہ اس عمر میں کسی ناپسندیدہ شخص کی مزدوری کرے۔ یہ کہتے کہتے کامران کی نظروں کے سامنے بچپن کا وہ منظر ابھر آیا جب سعدیہ خانم کرشن راؤ کے یہاں صفائی کا کام کرتی تھی اور پھر ایک دن اسے یہ ملازمت بھی ترک کرنی پڑی تھی۔ چند لمحوں کیلئے کامران کا پورا وجود آگ کی ایک بھٹی بن گیا اور اس کے دل کی گہرائیوں میں نفرتوں کا الاؤ دہکنے لگا۔ مگر یہ موقع جذبوں کے اظہار کا نہیں تھا' اس لئے شجاع الدین کامران نے اپنے احساسات کو سختی سے کچل ڈالا اور عام سے لہجے میں بات کرنے لگا۔ ''اگر وہ تیرے دیئے ہوئے سکے قبول کر لیتیں تو پھر میں ان کے معاش کی طرف سے بے فکر ہو جاتا۔ اس کے بعد اگر مجھے پچاس سال بھی تیرے زیر زمین کمروں میں محصور رہنا پڑتا تو میں بخوشی اس قید کو برداشت کر لیتا۔''

''اگر تجھے اپنے دشمن کو شکست خوردہ دیکھنا ہے تو پھر سب کچھ برداشت کرنا ہوگا۔'' کرشن راؤ نے انتہائی بے نیازی کے انداز میں کہا۔ ''اب تیری ماں مزدوری کرے یا فاقہ کشی کی حالت سے دوچار ہو جائے' تجھے وقت کے ہر فیصلے کو قبول کرنا ہوگا۔ دنیا کا نظام تیری مرضی کا پابند نہیں ہے۔''

شجاع الدین کامران کے چہرے پر گہرے کرب کے آثار نمایاں ہو گئے۔ ''ٹھاکر! میں تو سمجھتا تھا کہ یہ کام چند ماہ کے مختصر سے عرصے میں تکمیل پا جائے گا'......''

''حکومت کے ایک بااثر انسان سے ٹکرانے کیلئے صرف چند ماہ کی مہلت؟ تو پاگل ہو گیا ہے کامران!'' کرشن راؤ نے تحقیر آمیز لہجے میں کہا۔

''میں رات دن ایک کر دوں گا ٹھاکر!'' شجاع الدین کامران نے کسی معصوم بچے کے انداز میں کہا۔ ''اگر تو حکم دے گا تو میں آگ اور خون کے دریا میں کود جاؤں گا' مگر اس طویل ترین وقفے کو مختصر کر دے ٹھاکر! بہت مختصر...... تیرا

بڑا کرم ہوگا۔'' پہلی بار کامران کے لہجے سے کسی سوالی کی گفتگو کا رنگ جھلک رہا تھا۔

''میں تیری خاطر اپنے آپ کو ہلاکت میں نہیں ڈال سکتا۔'' کرشن راؤ نے بیزاری کے لہجے میں کہا۔ ''میں تجھے اسی وقت یہاں سے باہر نکلنے کی اجازت دوں گا جب مجھے یقین ہوجائے گا کہ قائم خان کی گردن پر تیرے ہاتھوں کی گرفت مضبوط ہوچکی ہے۔ اگر میں نے تیرے ہاتھوں میں کسی قسم کی کمزوری محسوس کی تو پھر یہ عرصہ کچھ اور بھی طویل ہوسکتا ہے۔ تیری ناکامی کا ایک ہی مطلب ہے کہ پھر کرشن راؤ بھی مارا گیا۔''

کامران کیا جواب دیتا کہ کرشن راؤ کے دلائل بہت مضبوط تھے۔

''اور اگر اس دوران قائم خان راجپوت دنیا میں نہیں رہا؟'' کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد شجاع الدین کامران کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔

''قائم خان! اس وقت تک نہیں مرے گا جب تک تیرے انتقام کی آگ نہیں بجھ جائے گی۔'' کرشن راؤ نے اس طرح کہا جیسے وہ قائم خان کے انجام کو مستقبل کے آئینے میں دیکھ رہا ہو۔

''اور اگر اس وقت تک یاسمین کی شادی ہوگئی؟'' کامران اپنی زبان پر قابو نہ رکھ سکا اور جوش اضطراب میں ایک انتہائی نازک راز کو فاش کر بیٹھا۔

''یاسمین کون ہے؟'' کرشن راؤ نے چونک کر پوچھا۔

شجاع الدین کامران اپنے ہونٹوں کی لغزش پر پریشان سا نظر آنے لگا۔ اس نے ٹھاکر کے سوال کا جواب دینے کے بجائے دیوداسی شکنتلا کی طرف دیکھا۔

کرشن راؤ ایک زمانہ آشنا انسان تھا۔ وہ فوراً ہی کامران کی خاموش نگاہوں کا مفہوم سمجھ گیا۔ ''تو اپنے کمرے میں جا دیوداسی! میں تجھے دوبارہ طلب کروں گا۔''

جب شکنتلا اٹھ کر چلی گئی تو کرشن راؤ نے اپنا سوال دہرایا۔

زبان بہک چکی تھی۔ مجبوراً کامران کو اپنی زندگی کے اس جذباتی باب کو ورق ورق کر کے کھولنا پڑا۔

کرشن راؤ بہت غور سے ایک نوجوان عاشق کی داستان درد سنتا رہا' پھر بڑے مہربان لہجے میں بولا۔ ''کیا یاسمین تجھ سے محبت کرتی ہے؟''

''میں اسی یقین کے سہارے تو زندہ ہوں ٹھاکر۔'' ایک لمحے میں کامران کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے۔

''اب دو مسئلے ہوگئے۔ ایک قائم خان راجپوت سے انتقام کا مسئلہ اور دوسرا یاسمین کے ساتھ تیری شادی کا مسئلہ۔'' کرشن راؤ نے اپنی خمدار مونچھوں کو بل دیتے ہوئے کہا۔ ''میں نہ کہتا تھا کہ تجھے دشمن سے انتقام لینے کے ساتھ ساتھ دنیاوی شان و شوکت کی بھی ضرورت ہے۔'' کرشن راؤ نے بڑی ہوشیاری سے کامران کے جذبات پر ضرب لگائی تھی۔ ''اس کے بعد ہزاروں قائم خان تجھے اپنی بیٹیوں کا رشتہ دینے میں فخر محسوس کریں گے۔''

شجاع الدین کامران کے چہرے پر مسرت و نشاط کی ایک تیز لہر ابھری' مگر دوسرے ہی لمحے ڈوب گئی۔ ''اگر دولت مند ہونے کے باوجود قائم خان نے میری بات نہیں مانی؟'' کامران کی آواز اچانک بجھ کر رہ گئی تھی۔ بیک وقت سینکڑوں وسوسوں اور اندیشوں نے اسے گھیر لیا تھا۔

''کیسے نہیں مانے گا؟ کرشن راؤ نے چیختے ہوئے کہا۔ ''جب میں چاہوں گا تو اس کی زبان میرے حکم کے مطابق گردش کرے گی اور بالفرض یہ ممکن نہ ہوسکا تو میرے غلام اس کی بیٹی کو اسی مندر میں اٹھا لائیں گے۔ پھر تو اسی رسم کو زندہ کرے گا جس کی بنیاد سمراٹ [illegible] بن جائے گی اور تو پرتھوی راج

کا روپ دھار لے گا۔ لاکھ مسلمان سہی لیکن تیری رگوں میں بھی تو راجپوتی خون دوڑ رہا ہے۔ جب لوگ شرافت کی زبان نہ سمجھیں تو پھران پر اتنا تشدد کرنا چاہیئے کہ ان کے سر قدموں پر جھک جائیں اور ہونٹوں سے فریادیں بلند ہونے لگیں۔"

شجاع الدین کامران نے اپنے بچپن میں راجپوت سمراٹ پرتھوی راج چوہان اور اس کی محبوبہ سنجوگتا کا قصہ سنا تھا اور اس نے پرتھوی کی جرأت سے متاثر ہو کر اپنی ماں کے سامنے یاسمین کے بارے میں بھی اس قسم کے جذبات کا مظاہرہ کیا تھا' مگر سعدیہ خانم نے اسے سختی سے ڈانٹتے ہوئے کہا تھا۔

"اب تو راجپوت نہیں۔ ایک شریف اور غیرت مند مسلمان کا بیٹا ہے۔ کافروں کی تمام رسموں کو فراموش کردے کہ اب ان سے تیرا کوئی رشتہ نہیں رہا۔"

کانوں میں ماں کے الفاظ گونجے تو شجاع الدین کامران گھبرا کر بول اٹھا۔

"نہیں ٹھاکر! میں یاسمین کو اس طرح رسوا نہیں کر سکتا۔" کامران کے لہجے سے ندامت اور پریشانی کا اظہار ہو رہا تھا۔

"دوسروں کی رسوائی کے احساس کو سینے سے کھرچ دے اور صرف اپنی تحقیر و تذلیل کو یاد رکھ کہ لوگوں نے تجھے کس کس طرح رسوا کیا ہے۔" یہ کہتے ہوئے کرشن راؤ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "اب میں ذرا آرام کروں گا۔ شام کو تجھ سے ملاقات ہوگی۔ سردار نرسنگا بھی آئے گا' پھر ہم سب مل کر تیرے مستقبل کیلئے کوئی شاندار منصوبہ ترتیب دیں گے۔ آج سے تو ٹھاکر کرشن راؤ کے کمرے کا مالک ہے۔ اسے جس طرح چاہے استعمال کر۔ تیری زبان کی ہر جنبش حکم کا درجہ رکھتی ہے اپنے غلاموں سے کام لے اور زندگی کی ان لذتوں سے آشنائی پیدا کر جو تیرے ہم مذہبوں نے تجھ پر حرام کردی ہیں۔" یہ کہہ کر کرشن راؤ کمرے سے باہر نکل گیا۔

اب بوڑھا ٹھاکر دیوداسی شکنتلا کے سامنے کھڑا تھا اور اسے رازدارانہ سرگوشیوں میں سمجھا رہا تھا۔

"آج کے بعد سے کامران میرے کمرے میں قیام کرے گا اور میں اس تہہ خانے میں منتقل ہو جاؤں گا جس سے تو خوب واقف ہے۔" کرشن راؤ کے ہونٹوں پر انتہائی غلیظ مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔ "اب میں اپنے حقیقی چہرے کے ساتھ اس کے سامنے جانا نہیں چاہتا۔ کامران کو میری خفیہ سرگرمیوں کے بارے میں شبہ تک نہیں ہونا چاہیئے۔ دوسرے لوگوں کی طرح وہ بھی مجھے ایک دھرماتما ہی سمجھتا رہے۔ اسی میں ہماری کامیابی ہے۔ آئندہ تو اسی تہہ خانے میں مجھ سے ملے گی اور اس غیرت مند مسلمان زادے کی ایک ایک حرکت کی اطلاع دے گی۔ میں دیکھوں گا کہ یہ اپنی روایتوں کے ساتھ کتنے دن زندہ رہتا ہے؟ سردار نرسنگا اسے قزاق بنا دے گا اور تو اسے شراب کے نشے میں غرق کر دے گی۔"

"ایسا ہی ہوگا ٹھاکر!" شکنتلا نے ایک ادائے محبوبانہ کے ساتھ مسکراتے ہوئے کہا۔

"اس کی سب سے بڑی کمزوری ہمارے ہاتھ آچکی ہے۔" کرشن راؤ نے شکنتلا کے بکھرے ہوئے بالوں سے کھیلتے ہوئے کہا۔ "شکستہ دل اور نوجوان عاشق کو بہک جانے پر مجبور کردینا بہت آسان ہے دیوداسی!"

"یقیناً ٹھاکر! یقیناً" شکنتلا کی مسکراہٹ کا رنگ گہرا ہو گیا۔

اور اس کے ساتھ ہی کرشن راؤ ایک فاتح کے انداز میں چلتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

❀❀❀

کرشن راؤ کے جانے کے بعد شکنتلا کے دل میں ایک حشر سا جاگ اٹھا۔ ٹھاکر نے سردار نرسنگا کا نام لے کر ایک بار پھر ماضی کے اس مقتل کی یاد دلائی تھی' جہاں شکنتلا کو اس وقت ذبح کیا گیا تھا جب وہ پندرہ سولہ سال کی ایک کمسن اور بے سہارا لڑکی تھی۔ آج کرشن راؤ نے اسی نرسنگا کو طلب کیا تھا کہ ایک اور نوجوان تباہی و بربادی کے راستے پر چلا جائے۔ اگرچہ ٹھاکر اسے روز ہی رات کے اندھیروں میں رسوا کرتا تھا' مگر وہ نرسنگا کو ایک لمحے کیلئے بھی فراموش نہیں کر سکی تھی۔ یہی وہ پہلا درندہ تھا جس نے اس کے بدن سے حیا کا لباس نوچ کر پھینکا تھا اور اسے ٹھاکر جیسے بوالہوس بوڑھے کیلئے ایک کٹھ پتلی بنا کر چھوڑ دیا تھا۔ آج اسی نرسنگا کو طلب کیا گیا تھا کہ وہ مندر کی زمین دوز پناہ گاہ میں داخل ہوا اور اپنا نیا شکار اٹھا کر لے جائے۔ نرسنگا کا نیا شکار شجاع الدین کامران تھا۔

ایک مسلم نوجوان کو ہلاکت کا نشانہ بنتے دیکھ کر اصولی طور پر شکنتلا کو خوش ہونا چاہئے تھا' مگر وہ فطرتاً ایک بڑی عجیب لڑکی تھی۔ جب بھی اس کی کسی ہم جنس کو ''دیوداسی'' بنانے کیلئے مندر میں لایا جاتا تو وہ لرز کر رہ جاتی اور دھرم کے نام پر نفس پرستی کا ہدف بننے والی لڑکی کے حق میں دعائے خیر کرتی' مگر شکنتلا کی دعائیں کون سنتا کہ اس کی دعائیں تو شیشے کی بنی ہوئی تھیں اور یہ پوری بستی پتھروں کی تھی۔ دیوتا پتھر...... پجاری پتھر کے...... عمارتیں پتھر کی...... ایک نرم و نازک سا بے اماں شیشہ' کب تک پتھروں سے ٹکراتا' مندر کے ہر گوشے میں اس کی دعاؤں کے ٹکڑے بکھرے ہوئے نظر آتے تھے۔ آج جب اس نے شجاع الدین کامران کو اپنے سامنے پایا تو ایک بار پھر شدت خوف سے اس کا دل دھڑکنے لگا۔ کامران کی معصومیت پر شکنتلا کو ترس آ رہا تھا' مگر اس کے ساتھ ہی اسے حیرت بھی تھی کہ ایک مسلمان لڑکا کرشن راؤ کے چنگل میں کس طرح پھنس گیا تھا۔

شکنتلا نے کرشن راؤ اور شجاع الدین کامران کے درمیان ہونے والی نامکمل گفتگو سنی تھی' جس میں کسی قائم خان راجپوت اور کسی لڑکی یاسمین کا ذکر بھی آیا تھا' مگر اس سے پہلے کہ وہ صورتحال کو سمجھنے کی کوشش کرتی اسے کمرے سے اٹھا دیا گیا تھا۔ اگرچہ کرشن راؤ نے ایک دن پہلے ہی اسے حکم دیا تھا کہ وہ اس مسلمان زادے کو شراب نوشی اور جسم پرستی کی لعنت میں مبتلا کر دے۔ لیکن وہ ٹھاکر کے منصوبے کے پورے پس منظر سے ناواقف تھی۔ اس لئے شکنتلا کو ایک بے چینی سی تھی کہ شجاع الدین کامران مسلمان ہوتے ہوئے یہاں کیوں آیا ہے؟ ٹھاکر نے شکنتلا سے بھی کہا تھا کہ کامران اپنے ماموں سے انتقام لینا چاہتا ہے اور وہ اس نوجوان کی جذباتی کمزوری سے بھرپور فائدہ اٹھائے گا۔ شکنتلا سوچ رہی تھی کہ آخر وہ کیا کمزوری ہے جس نے ایک معصوم مسلمان زادے کو ایک سفاک ہندو کے دروازے تک پہنچا دیا ہے۔

شکنتلا بہت دیر تک حالات کے اس پہلو پر غور کرتی رہی' پھر اس نے اپنے آپ کو مطمئن کرنے کیلئے یہ کہہ کر ذہن سے سارے پریشان خیالات کو جھٹکنے کی کوشش کی۔

"تجھے کیا شکنتلا کہ لوگ سرفراز ہوتے ہیں یا انہیں بے عزت کر کے زندگی کے بازار میں پھرایا جاتا ہے تو برباد ہو چکی۔ اب اگر ساری دنیا بھی تباہ ہو جائے تو کیا غم؟"

کہنے کو یہ انداز فکر بڑا فطری تھا' مگر شکنتلا جیسی حساس لڑکی شجاع الدین کامران کو برباد ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ دیوداسی کی سوچ کا بنیادی سبب یہ تھا کہ وہ مسلمانوں کے بارے میں بہت زیادہ حسن ظن رکھتی تھی۔ شکنتلا سمجھتی تھی کہ دہلی پر مسلمانوں کے قبضے کے بعد اس جیسی بیشمار ہندو لڑکیوں کی حالت زار بدل جائے گی۔ شکنتلا کو باہر کی فضاؤں کا اندازہ نہیں تھا کہ اس کے شب و روز کرشن راؤ کے مذہبی قید خانے میں بسر ہو رہے تھے۔ پھر بھی اس اندھیرے میں وہ روشنی کا ایک خواب مسلسل دیکھ رہی تھی۔ لیکن آج جب اس نے ایک مسلم نوجوان کو ٹھاکر کے پھیلائے ہوئے جال کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا تو وہ بری طرح چونک اٹھی' جس مذہب کی یادوں کے سہارے اس نے نجات کے خواب دیکھے تھے' آج اسی مذہب کا ایک پیروکار کرشن راؤ کے بت کدے میں داخل ہو گیا تھا۔

شکنتلا اپنی ہی سوچوں میں الجھ کر رہ گئی تھی۔ وہ شجاع الدین کامران سے اس تجارتی معاہدے کی تفصیلات پوچھنا چاہتی تھی' جس کے تحت ٹھاکر نے اسے اپنا جانشین بنا دیا تھا' مگر ابھی دونوں کے درمیان تکلف اور فاصلے کی دیوار حائل تھی۔ اس لئے شکنتلا کسی مناسب وقت کا انتظار کرنے لگی۔

دوسری طرف ٹھاکر کا معتمد خاص راما راؤ اپنے آقا کے روبرو حاضر تھا اور انتہائی شکایت آمیز لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"ٹھاکر! آپ نے یہ کیا کیا کہ اپنے وفاداروں کے سروں کو ایک ملیچھ (مسلمان) کے قدموں پر جھکا دیا۔"

"نہیں راما! میں نے اپنے جاں نثاروں کی کوئی تحقیر نہیں کی۔" کرشن راؤ پوری سنجیدگی کے ساتھ جواب دے رہا تھا۔

"آخر وہ کون سی مجبوری تھی ٹھاکر کہ آپ آکاش سے گرے اور پاتال میں اترتے چلے گئے۔" راما راؤ نے بڑے کربناک لہجے میں کہا۔ "میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ ہاتھ کبھی کسی مسلمان کے پیروں کو چھوئیں گے۔ مہاراج! مجھے مطمئن کر دیں کہ میری آنکھوں نے جو کچھ دیکھا تھا' وہ سب جھوٹ تھا۔ پوراتن کرودھ کی اگنی میں پھنکا جا رہا ہے۔ اگر ٹھاکر آپ کے شبدوں نے اس اگنی کو نہیں بجھایا تو آپ کا یہ داس جل کر راکھ ہو جائے گا۔"

"راما! تجھے کیا ہو گیا ہے؟" اچانک کرشن راؤ کا لہجہ بدل گیا۔ "آج تو کیسی بچوں جیسی باتیں کر رہا ہے؟" یہ کہہ کر کرشن راؤ نے شجاع الدین کامران کے باپ اور دادا کے مسلمان ہونے کا واقعہ پوری تفصیلات کے ساتھ سنا دیا۔ ٹھاکروں کے خون کی قسم! یہ ہمارے خاندان کی بڑی رسوائی تھی۔ کرشن راؤ کا چہرہ بھی غصے کی آگ میں جل اٹھا تھا۔ راما! میں آخری سانس تک اپنی اس شکست کو فراموش نہیں کر سکتا۔ میں نے بہت کوشش کی تھی کہ رائے سعید الدین اور نجم الدین ذیشان کو اپنے ہاتھوں سے ہلاک کر ڈالوں' مگر تو جانتا ہے راما کہ میں کتنا مجبور تھا۔ دیوتاؤں نے میری ان مجبوریوں کی لاج رکھی اور ان دونوں دھرم کے باغیوں کو ذلت و رسوائی کے ساتھ اس دنیا سے اٹھا لیا' پھر میں نے اس لڑکے کامران کی ماں سعدیہ خانم کو اپنے یہاں ملازمت دے کر راجپوت نسل کی توہین کا انتقام لینا چاہا' مگر وہ بددماغ عورت ایک دن میری غلامی کی پہنائی ہوئی زنجیر توڑ کر بھاگ گئی۔ میں نے چاہا تھا کہ وہ غربت و افلاس کے ہاتھوں مجبور ہو کر ہمارے دیوتاؤں کو غسل دے اور مندر کی صفائی کرے...... لیکن وہ بدنصیب میرے منہ پر تھوک کر چلی گئی۔" کرشن راؤ کے بدن کا ایک ایک انگ نفرت و غضب کی آگ میں جل اٹھا تھا۔ "راما! میری طرف غور سے دیکھ کہ وہ تھوک میرے چہرے سے بہتے بہتے پورے جسم پر پھیل گیا ہے۔ کیا تو مجھے اتنا بے غیرت سمجھتا ہے کہ تیرا

ٹھاکر اس تھوک کی دلدل میں خاموشی کے ساتھ ڈوب جائے گا؟"

راما راؤ بدحواسی کے عالم میں ٹھاکر کی طرف دیکھنے لگا۔ "نہیں ٹھاکر! کبھی نہیں۔" راما راؤ کی آواز سے ہلکی سی لرزش نمایاں تھی۔

"پھر تو نے مجھ پر شک کیوں کیا؟" کرشن راؤ اپنے خدمت گار سے ناراض ہو گیا تھا۔

"میں اپنے دل کا اطمینان چاہتا ہوں ٹھاکر۔" راما راؤ نے جواباً کہا۔ "اگر تیری کوئی دلیل مجھے مطمئن نہیں کر سکی تو میں تجھ سے بہت دور چلا جاؤں گا۔ میں نے صرف تیرے لئے غلامی کا طوق پہنا ہے۔ اب یہ ممکن نہیں کہ تو مجھے جس کے سامنے چاہے جھکا دے۔"

راما راؤ کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر ٹھاکر سنبھل گیا۔ "ہاں! میں تجھے مطمئن کروں گا کہ تو ہی میرا جاں نثار ہے...... اور تو ہی میرا حرف اعتبار ہے۔" کرشن راؤ کا انداز بڑا شاطرانہ تھا۔ "تو نہیں جانتا راما کہ وہ لڑکا کتنا سرکش اور بدگمان ہے۔ میری ہر بات کو شبہات کی نظر سے دیکھتا ہے' اس لئے میں نے مصلحتاً اسے اپنا جانشین بنایا۔ وہ میرے اس فیصلے پر یقین نہیں کر رہا تھا۔ مجبوراً میں نے تجھے اور دوسرے خدمت گاروں کو اطاعت و فرمانبرداری کا حکم دیا'" کرشن راؤ نے اپنے منصوبے کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "میرے اس مظاہرے سے اس کا بے قرار ذہن ٹھہر سا گیا ہے اور مجھے میری کامیابی کی منزل سامنے نظر آ رہی ہے۔ وہ ایک لمحے کیلئے بھی اپنی ماں کو تنہا چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھا' مگر میں نے اپنی ذہانت سے دونوں ماں بیٹے کے درمیان ایک ناقابل شکست دیوار کھینچ دی ہے۔ اب وہ مغرور عورت کبھی اپنے بیٹے سے نہیں مل سکے گی۔ میں کامران کو نرسنگا کی نگرانی میں ایک خونریز ڈاکو بناؤں گا۔ وہ ہمارے لئے لوگوں کی گردنیں کاٹے گا اور ان کے مال کو لوٹ کر ہمارے خزانوں کے منہ بھرے گا۔ پھر جب میں کامران کی کارکردگی سے مطمئن ہو جاؤں گا تو اسے قائم خان راجپوت کی طرف چھوڑ دوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ میرا تربیت یافتہ بھیڑیا قائم خان کے جسم کو پھاڑ ڈالے گا۔ اگر پکڑا گیا تو اسے پھانسی ہو جائے گی اور سعدیہ خانم دہلی کی گلیوں میں بین کرتی پھرے گی۔ اگر کامران قائم خان کو قتل کر کے اس حصار سے باہر نکل گیا تو پھر ساری زندگی ہمارے اشاروں پر ناچے گا اور یہ ہماری بڑی فتح ہو گی۔ ایک مسلمان اپنے ہی ہم مذہبوں کا خون بہائے گا' یہ کیسا نشاط انگیز اور دلچسپ تماشا ہو گا راما؟" کرشن راؤ کا ایک مکروہ قہقہہ فضا میں گونج اٹھا۔ "میری پہلی کوشش یہی ہو گی کہ کامران قائم خان کو قتل کر کے قانون کی گرفت سے محفوظ رہے۔ اس طرح سعدیہ خانم روز جئے گی اور روز مرے گی۔ تو نہیں جانتا راما کہ میں اس عورت سے کیسا بھیانک انتقام لینا چاہتا ہوں۔ دیوتا میری مدد کریں اور تیرا ذہن شک کے غبار سے صاف ہو جائے۔"

راما راؤ تیزی سے اٹھا اور ٹھاکر کے قدموں پر جھک گیا۔ "اب میرا بیاکل من شانت ہو گیا ٹھاکر۔" راما راؤ کا لہجہ بہت اثر انگیز تھا۔ "سچ ہے کہ تیری چالوں کو کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ دیوتا ہی جانیں کہ تو کس وقت کیا سوچ رہا ہے اور کون کون سی چیزیں تیرے خیالات کی زد میں آ رہی ہیں۔ میرے من میں اب سندیہہ (شک) کی کوئی لہر موجود نہیں اب میں پوری طرح شانت ہوں ٹھاکر!"

کرشن راؤ نے اپنے خدمتگار کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے آشیرواد دیا۔ "راما! ابھی ہمیں بہت کام کرنے ہیں۔ بیکار کی سوچ میں اپنے ذہن کو پریشان نہ کیا کر۔"

راما راؤ چلا گیا اور بوڑھا ٹھاکر سونے کیلئے لیٹ گیا۔

اس دوران دیوداسی شکنتلا نے شجاع الدین کامران سے کھانے کیلئے پوچھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کسی نوجوان ا

دلکش لڑکی نے اسے تنہائی میں اس طرح مخاطب کیا تھا۔

کامران نے چونک کر دیوداسی کو دیکھا اور سر کو اثباتی انداز میں جنبش دی۔ شکنتلا واپس چلی گئی اور جب دوبارہ کمرے میں داخل ہوئی تو اس کے پیچھے پیچھے دوسری دیوداسی کھانے کا خوان اٹھائے ہوئے اندر آئی۔ کامران نے حیرت سے اس عورت کو دیکھا اور شکنتلا سے پوچھنے لگا۔

کیا یہاں کوئی مرد نہیں ہے؟"

"نہیں" شکنتلا نے بے ساختہ جواب دیا۔ یہاں صرف دیوداسیاں رہتی ہیں۔

"ٹھیک ہے۔" کامران نے بیزاری سے کہا۔ "کھانا رکھ دو اور تم دونوں باہر چلی جاؤ۔"

شکنتلا کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔ اس نے پلٹ کر دوسری دیوداسی کی طرف دیکھا۔ وہ تیزی سے باہر نکل گئی' مگر شکنتلا اپنی جگہ کھڑی رہی۔

"میں نے تم سے بھی یہی بات کہی تھی۔" شجاع الدین کامران کا لہجہ بدستور تلخ تھا۔ مجھے تمہاری موجودگی بھی گوارا نہیں۔

"میں یہاں ٹھہرنے کیلئے مجبور ہوں۔" یہ کہہ کر شکنتلا بے تکلفی کے انداز میں کامران کے سامنے بیٹھ گئی۔ "ٹھاکر نے مجھے یہی حکم دیا تھا کہ میں تمہاری ہر ضرورت کا خیال رکھوں۔" شکنتلا کے لہجے میں مٹھاس بھی تھی اور اپنائیت بھی۔

شجاع الدین کامران کو ایک بار پھر چونک جانا پڑا۔ "تم نے کھانا پہنچا دیا' بس یہی تمہارا فرض تھا۔ اب جاؤ کہ میں کسی غیر عورت کا سایہ بھی برداشت نہیں کرتا۔"

"میں غیر نہیں ہوں۔" شکنتلا چند لمحوں میں تکلف اور حجاب کے سارے فاصلے عبور کر جانا چاہتی تھی۔

کامران نے شدید حیرت کے عالم میں شکنتلا کی طرف دیکھا اور برہم ہو کر بولا۔ "میرے اور تمہارے درمیان کوئی رشتہ نہیں۔"

"تم اعتراف نہ کرو' مگر ایک رشتہ موجود ہے۔" شکنتلا نے بڑے یقین کے ساتھ کہا۔ "ایک مظلوم کا دوسرے مظلوم سے ناقابلِ شکست رشتہ۔"

شجاع الدین کامران جواب میں کچھ اور کہنا چاہتا تھا' مگر شکنتلا یہ کہہ کر کمرے سے نکل گئی۔ "تم اطمینان سے کھانا کھاؤ' وقت ثابت کر دے گا کہ تمہارا مجھ سے کیا رشتہ ہے؟"

کامران نے اپنی زندگی میں پہلی بار سبزیوں اور دالوں پر مشتمل کھانا استعمال کیا تھا۔ جس کا ذائقہ بہت عجیب سا محسوس ہو رہا تھا' مگر کھانے سے زیادہ دیوداسی شکنتلا کی باتیں عجیب تھیں' جن کے پیچ و خم میں وہ بری طرح الجھ کر رہ گیا تھا۔

شام ہوتے ہی مندر میں چراغ جل اٹھے اور اس کے ساتھ ہی دیوداسیوں کے کمرے بھی روشن ہو گئے۔

اچانک پجاری رام سروپ کمرے میں داخل ہوا اور شجاع الدین کامران کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

چلئے چھوٹے ٹھاکر کہ بڑے ٹھاکر اپنی نشست گاہ میں آپ کے منتظر ہیں۔"

"میں ٹھاکر نہیں ہوں۔" شجاع الدین کامران چراغ پا ہو گیا۔ "تم لوگ خوب جانتے ہو کہ میں ایک مسلمان ہوں اور ٹھاکروں سے میرا کوئی رشتہ نہیں۔"

"اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے؟" رام سروپ نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ "آپ ٹھاکر کے جانشین ہیں اس لئے ٹھاکر ہی کہلائیں گے۔ ویسے نوجوان! تمہارا تعلق بھی راجپوت خاندان سے رہ چکا ہے۔ یہ حوالہ

کوئی گالی تو نہیں۔'' پجاری رام سروپ کا انداز گفتگو بہت پیچیدہ اور سرد تھا۔

شجاع الدین کامران بیزاری کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ رام سروپ کمرے سے نکل کر مختلف راہداریوں سے گزرنے لگا۔ کامران اس کی تقلید کر رہا تھا۔ پجاری کئی الجھے ہوئے نیم تاریک راستوں سے گزرا۔ پھر ایک تہہ خانے میں اتر گیا۔ کامران نے چونک کر دیکھا۔ تہہ خانے سے باہر آتے ہی اسی انداز کے کمرے بنے ہوئے تھے۔ رام سروپ نے کچھ اور راہداریاں طے کیں' پھر وہ دوسرے تہہ خانے میں اتر گیا۔ کامران شدید حیرت و استعجاب سے دوچار' پجاری کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ جب رام سروپ تیسرے تہہ خانے میں داخل ہوا تو شجاع الدین کامران خاموش نہ رہ سکا۔

''کیا تمہارا ٹھاکر تحت الثریٰ میں رہتا ہے؟'' کامران کے لہجے میں شدید جھنجلاہٹ تھی۔ ''یہ کوئی مندر ہے یا طلسم خانہ؟''

رام سروپ ہلکے سے قہقہے کے ساتھ بولا۔ ''یہ تمہاری خوش نصیبی ہے نوجوان کہ ٹھاکر تم سے کسی پردے کے بغیر ملتا ہے ورنہ وہ عظیم انسان اتنی آسانی سے کسی کو ''درشن'' نہیں دیتا۔ اس کا مقام اس قدر گہرائیوں میں ہے کہ عام آدمی تو وہاں تک پہنچنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔''

شجاع الدین کامران پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ کچھ دیر کیلئے اسے سوچنا پڑا کہ وہ کس عذاب میں گرفتار ہو گیا ہے؟ مگر یہ موقع الجھنے کا نہیں تھا۔ کامران نے اپنے ذہن سے منتشر خیالات کو جھٹک دیا۔ اب وہ بہت احتیاط کے ساتھ چل رہا تھا...... اور اس پراسرار راستے کے ہر موڑ کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

بالآخر پجاری رام سروپ ایک کمرے میں داخل ہو گیا۔ کامران نے دیکھا کہ کرشن راؤ ایک ریشمی مسند پر دراز تھا اور اس کے دائیں جانب ایک دراز قامت شخص بیٹھا تھا۔

یکایک کرشن راؤ کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔ ''پجاری! سردار نرسنگا کی دعوت کا اہتمام کر۔''

رام سروپ نے اپنے سر کو قدرے خم کیا اور الٹے پاؤں کمرے سے نکل گیا۔

کرشن راؤ نے کامران کی طرف دیکھا اور پرجوش لہجے میں بولا۔ ''آ میرے بیٹے کہ سردار نرسنگا کب سے تیرا منتظر ہے۔''

ایک لمحے کیلئے بھی کامران کی نظریں نرسنگا کے چہرے سے نہیں ہٹی تھیں۔ وہ چوڑی پیشانی' بڑی آنکھوں اور لمبی ناک والا ایک ایسا انسان تھا جسے دیکھ کر ہیبت سی محسوس ہوتی تھی۔ نرسنگا کی سرخ رنگت میں سیاہی اس طرح شامل ہو گئی تھی جیسے تانبے کو آگ میں بہت زیادہ تپایا گیا ہو۔

''نرسنگا! یہ ہے میرا بیٹا کامران۔'' کرشن راؤ نے نرسنگا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میرا سچا وارث! میرا بہادر جانشین۔''

شجاع الدین کامران آہستہ آہستہ چلتا ہوا مسند کی طرف بڑھا۔ اس دوران بوڑھا ٹھاکر سیدھا ہو چکا تھا اور سردار نرسنگا اپنی نشست سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

پھر جیسے ہی کامران قریب پہنچا' نرسنگا نے دونوں ہاتھ جوڑ کر ہندوؤں کی مخصوص رسم کے مطابق اسے سلام کیا۔ چند لمحوں تک تو کامران تذبذب کا شکار رہا' اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ نرسنگا کے سلام کا جواب کس طرح دے' مگر پھر کچھ سوچ کر اس نے نرسنگا کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

نرسنگا نے بھی جواباً اپنا ہاتھ بڑھایا۔ جب دونوں ہاتھ ملے تو کرشن راؤ نے بلند آواز میں پکار کر کہا۔

''نرسنگا! میں نے اپنے جانشین کا ہاتھ تیرے ہاتھ میں دے دیا' اب تو اس نرم و نازک ہاتھ کو آگ اور بجلیوں
کر دے۔ اس میں فولاد کی سی کاٹ اور سختی پیدا کر دے کہ اب یہی ہاتھ میرے بڑھاپے کا سہارا ہے۔'' کرشن
کے لہجے سے بظاہر بڑی محبت اور تڑپ کا اظہار ہو رہا تھا۔ مگر وہ ایک بہت باریک منافقت تھی جسے کامران جیسا
لڑکا دیکھ نہیں سکتا تھا۔
''نہیں ٹھاکر! یہ ہاتھ پھولوں کے کسی درخت کی لچکتی ہوئی شاخ نہیں۔'' سردار نرسنگا اونچی اور گرجدار آواز میں
''یہ تو کوئی پتھر ہے یا لوہے کا کوئی ٹکڑا۔ میں اسے ایسا تراشوں گا کہ ساری دنیا تماشا دیکھے گی۔ تیرے جانشین کو
ہونا چاہئے ٹھاکر! تو بہت ہوشیار ہے' کبھی گھاٹے کا سودا نہیں کرتا۔'' یہ کہہ کر سردار نرسنگا نے شجاع الدین
ن کے ہاتھ پر دباؤ ڈالا۔
کامران کے جسم میں دوڑنے والے گرم لہو کی گردش بھی کچھ تیز ہو گئی۔ جواباً اس نے بھی نرسنگا کے ہاتھ کو دبایا'
بہت عیار تھا میواتی لٹیروں کے سردار نے اپنے ہاتھ کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔
میں جانتا ہوں نوجوان کہ تو پہاڑ کی ایک چٹان ہے۔'' اس کے ساتھ ہی نرسنگا کے ہاتھ کی گرفت کمزور ہو گئی۔
شجاع الدین کامران نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور ٹھاکر کے سامنے بیٹھ گیا۔
ابھی نئی گفتگو کا آغاز نہیں ہوا تھا کہ پجاری رام سروپ شراب سے بھری ہوئی صراحی اور دو پیالے لے کر آیا اور
نے کیف و مستی کا یہ سامان سردار نرسنگا کے سامنے رکھ دیا۔
نرسنگا نے لبریز صراحی کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا اور پھر بڑے عاجزانہ لہجے میں کرشن راؤ سے
ب ہو کر کہنے لگا۔ ''معاف کرنا ٹھاکر! تجھ جیسے دھرماتما کے سامنے شراب پینا بڑی بے ادبی ہے' مگر کیا کروں کہ
اس کے بغیر ایک لمحہ بھی نہیں گزار سکتا۔'' نرسنگا کے چہرے پر ندامت کا ہلکا ہلکا عکس صاف نظر آ رہا تھا۔ ''میرا کام
تنا خوفناک ہے کہ میں ہوش میں رہ کر اسے انجام نہیں دے سکتا۔''
''کوئی بات نہیں نرسنگا۔'' کرشن راؤ نے اس کی گستاخی کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ راجپوتوں میں شراب نوشی
رسم عام ہے' مگر میں اسے پسند نہیں کرتا اور مجھے یہ بھی گوارا نہیں کہ کسی دوسرے کے شوق میں مداخلت کروں۔''
پھر نرسنگا نے شجاع الدین کامران کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
کامران کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ ''میں اس ناپاک شے کو دیکھنے کا بھی روادار نہیں۔''
ٹھیک کہتے ہو نوجوان! نرسنگا نے ایک آہ سرد کھینچتے ہوئے کہا' تمہاری عمر میں ہم بھی یہی دعویٰ کرتے تھے' مگر
ت کی بے رحم ہوائیں سب کچھ اڑا کر لے گئیں اور اب اندازہ ہوتا ہے کہ شراب کیسی وفادار ساتھی ہے۔'' یہ کہہ کر
نگا نے پیالہ بھرا اور کسی پیاسے کی طرح پینے لگا۔
پھر جب وہ پوری طرح سرشار ہو گیا تو اس نے کرشن راؤ سے کہا۔ ٹھاکر! کیا میں تیرے جانشین کو اپنے ساتھ
لے جاؤں؟''
''اس وقت نہیں کرشن راؤ نے جواب دیا۔'' کل صبح میں اسے تیری سلطنت کی حدود میں بھیج دوں گا اور پھر شام
تے ہی یہ مندر واپس آ جائے گا۔ میں نہیں چاہتا کہ اس کی راتیں کانٹوں پر بسر ہوں۔'' کرشن راؤ کے لہجے سے
ردی کے ایک خاص جذبے کا اظہار ہو رہا تھا'' تیرا کام یہ ہے نرسنگا کہ اسے دن کے اجالے میں تمام فنون جنگ
ھا دے۔ یہ جنگل کی راتوں سے آشنا نہیں ہے۔''
''جیسا حکم ٹھاکر!'' سردار نرسنگا نے سر جھکا دیا۔

''شجاع الدین کامران نے حیرت سے اس شخص کی طرف دیکھا جو شراب کی پوری صراحی پی جانے کے بعد بھی ہوش میں تھا' نہ اس کی آنکھوں میں لرزش تھی نہ اس کے چہرے کا رنگ بدلا تھا اور نہ زبان لڑکھڑائی تھی۔

کچھ دیر تک کمرے پر بوجھل سکوت طاری رہا' پھر اس سکوت کو ٹھاکر کی آواز نے توڑ دیا وہ پجاری رام سروپ کو پکار رہا تھا پجاری آیا' مگر اس طرح کہ اس کی سانسیں چڑھی ہوئی تھیں۔

''چھوٹے ٹھاکر کو ان کے کمرے میں پہنچا دے' کل صبح سورج نکلتے ہی سردار نرسنگا کا آدمی آئے گا اور اس کے ہمراہ چھوٹے ٹھاکر شہسواری سیکھنے کیلئے جنگل کی طرف جائیں گے۔''

پجاری رام سروپ جھکا اور پھر سیدھا ہو کر شجاع الدین کامران کی طرف دیکھنے لگا' کرشن راؤ نے بھی اپنی گفتگو کے دوران دوبارہ چھوٹے ٹھاکر کا لفظ استعمال کیا تھا' مگر کامران نے اس کا کوئی تاثر قبول نہیں کیا' اس نے حالات کے دھارے کے ساتھ بہنے کی ابتدا کر دی تھی۔

کامران نے کمرے سے رخصت ہوتے ہوئے پرجوش انداز میں سردار نرسنگا سے ہاتھ ملایا۔

''سردار! کل صبح ہماری ملاقات ہوگی۔'' کامران کے لہجے میں غیر معمولی اعتماد تھا۔

''میں چھوٹے ٹھاکر کا انتظار کروں گا...... وہ میری زندگی کا یادگار دن ہوگا۔'' نرسنگا کی گردن میں ہلکا سا خم تھا جیسے وہ کامران کے سامنے احترام کا مظاہرہ کر رہا ہو۔

''شجاع الدین کامران بے نیازانہ مڑا اور پجاری رام سروپ کے ساتھ ساتھ کمرے سے نکل گیا' پھر وہی پر پیچ راہ داریاں تھیں اور وہی پراسرار راستے تھے جن سے گزر کر کامران اپنے کمرے تک پہنچا تھا۔

''اچھا! چھوٹے ٹھاکر! میں میں چلتا ہوں۔'' پجاری رام سروپ نے اجازت طلب کرتے ہوئے کہا۔ ''صبح ہوتے ہی جگا دوں گا کہ آپ کو سردار نرسنگا کے پاس جانا ہے۔''

شجاع الدین کامران خاموش رہا اور رام سروپ واپس چلا گیا۔

پجاری کے جاتے ہی دیوداسی شکنتلا رات کا کھانا لے کر کمرے میں آئی۔

''کہاں چلے گئے تھے چھوٹے ٹھاکر۔'' شکنتلا نے بے تکلفانہ انداز میں پوچھا۔

''تمہیں اپنے کام سے کام رکھنا چاہئے۔'' کامران نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔

''یہ بھی میرے فرائض میں شامل ہے کہ تمہاری مزاج پرسی کروں۔'' شکنتلا نے کھانا رکھتے ہوئے کہا۔

''میں ٹھیک ہوں۔'' کامران کا منہ بگڑ گیا۔

شکنتلا خاموشی سے واپس چلی گئی۔

کامران نے جیسے ہی کھانا ختم کیا شکنتلا دوبارہ کمرے میں داخل ہوئی۔ اب اس کے ہاتھوں میں شراب کی صراحی اور ایک منقش پیالہ تھا۔ کامران شراب کے برتن دیکھتے ہی بھڑک اٹھا...... ''سردار نرسنگا بھی مجھے شراب پلانے کی کوشش کر رہا تھا اور اب تو بھی......؟''

شکنتلا کھنکتی ہوئی آواز میں ہنسی اور پھر صراحی کی شراب پیالے میں انڈیلنے لگی۔ ''یہاں رہو گے تو یہی کچھ ہوگا چھوٹے ٹھاکر۔''

''شراب' محبت' رقص' موسیقی آخر ہمارے مہمان ہو۔ اگر پیاسے رہ گئے تو ہم بڑے ٹھاکر کو کیا جواب دیں گے؟''

شجاع الدین کامران غصے سے بے قابو ہو چکا تھا۔ اس کا ہاتھ بلند ہوا' کمرے میں ایک زوردار آواز پیدا ہوئی اور شکنتلا کے رخسار پر ایک نیلا نشان ابھر آیا۔ کامران نے پوری طاقت سے دیوداسی کے تھپڑ مارا تھا۔ شکنتلا کے ہاتھ سے پیالہ چھوٹ گیا اور کمرے کے فرش پر دور تک شراب پھیل گئی۔

شکنتلا کی آنکھوں میں چند لمحوں کیلئے اداسی کے گہرے بادل چھا گئے اور پھر وہ جبراً مسکرانے لگی۔

''چھوٹے ٹھاکر! میں آپ کی داسی ہوں۔ اگر میرے جسم کے ٹکڑے بھی کر دو گے تو کیا فرق پڑے گا...... مگر بڑے ٹھاکر یہی چاہتے ہیں کہ آپ جی بھر کے شراب پئیں۔ سردار نرسنگا بھی ٹھاکر ہی کے اشارے پر آپ کو شراب پلانا چاہتا تھا۔'' یہ کہہ کر شکنتلا فرش کو صاف کرنے لگی۔

پھر وہ اٹھی' دروازے میں رک کر کامران کی طرف دیکھا اور سر جھکائے ہوئے چلی گئی۔

کچھ دیر کیلئے شجاع الدین کامران کے ذہن پر شکنتلا کی آنکھیں نقش ہو کر رہ گئیں' ان آنکھوں میں شکایتوں کا ایک سیلاب سا کروٹیں لے رہا تھا۔ کامران کے دل میں تاسف کا ایک ہلکا سا جذبہ ابھرا کہ وہ بے گناہ لڑکی خواہ مخواہ اس کے غصے کا شکار ہو گئی تھی...... مگر کامران نے فوراً ہی ان خیالات سے اپنا پیچھا چھڑا لیا اور اٹھ کر دروازہ بند کر دیا۔

❋❋❋

اسی کمرے کے نیچے تہہ خانے میں سردار نرسنگا اور کرشن راؤ ایک نوخیز ہندو لڑکی رمولا کا رقص دیکھ رہے تھے۔

رمولا ایک نیچ خاندان کی لڑکی تھی' ماں باپ نے اپنے مذہب کی محبت میں بیٹی کو رقص کی تعلیم دی تھی۔ رمولا ہر سال رام لیلا کے موقع پر ہزاروں ہندوؤں کے سامنے رقص کرتی' شائقین اس کے متناسب جسم اور فن رقص کی تعریف کرتے' پھر دہلی کے گردونواح میں رمولا کے رقص کی اس قدر شہرت ہوئی کہ یہ خبر اڑتے اڑتے سردار نرسنگا کے کانوں تک بھی پہنچ گئی۔ نرسنگا نے دن کے اجالے میں اپنے آدمیوں کے ذریعے جو عام شہریوں کا لباس پہنے ہوئے تھے' رمولا کے ماں باپ کو یہ پیغام پہنچایا کہ وہ ہنسی خوشی اپنی بیٹی اس کے حوالے کر دیں۔ جب کچھ دن بعد رمولا کے رقص سے سردار کا دل بھر جائے گا تو وہ ان کی بیٹی کو واپس کر دے گا۔ اس کے بدلے میں انہیں منہ مانگی قیمت دے دی جائے گی تاکہ وہ اپنی تھکی ماندی زندگی کے بقیہ دن سکھ چین سے گزار سکیں۔ نرسنگا کے آدمی رمولا کے ماں باپ کے پاس اپنے سردار کا پیغام لے کر پہنچے تو وہ بھڑک اٹھے' انہیں خوب اندازہ تھا کہ نرسنگا کے خفیہ ٹھکانے پر کسی لڑکی کے رقص کرنے کا کیا مفہوم ہوتا ہے؟ نتیجتاً ماں باپ نے انکار کر دیا اور ساتھ ہی یہ تنبیہ بھی کر دی کہ اگر نرسنگا نے طاقت کا استعمال کرنے کی کوشش کی تو وہ سلطان ناصر الدین محمود کے دربار میں فریاد لے کر جائیں گے اور انہیں پورا پورا انصاف حاصل ہو گا۔

نرسنگا کے آدمی چپ چاپ لوٹ گئے...... اور دوسرے دن آدمی رات کے وقت رمولا کو اس طرح گھر سے اٹھا لیا گیا کہ اس کے ماں باپ قتل کر دیئے گئے۔ رمولا نے تین چار روز نرسنگا کے جنگلی عشرت کدے میں گزارے' اب وہ دوشیزگی کے اعزاز سے محروم ایک کٹھ پتلی تھی' جسے نرسنگا کی آنکھ اور ہاتھ کے اشارے پر ناچنا پڑ رہا تھا' پھر یہ بے رحم سردار رمولا کو لے کر کرشن راؤ کے پاس پہنچا' اس وقت دونوں بھیڑیئے مندر کے سب سے نچلے تہہ خانے میں ایک ستم رسیدہ لڑکی کا رقص دیکھ رہے تھے۔

کرشن راؤ بہت خوش تھا اور شراب کے نشے میں جھوم جھوم کر نرسنگا سے کہہ رہا تھا۔

''نرسنگا! تو میرا بہت خیال رکھتا ہے۔ میں شکنتلا سے اکتا گیا تھا تو نے اس لڑکی کو بھیج کر پچھلے سارے قرض اتار دیئے۔''

ٹھاکر! تیرے اس غلام نے تجھے کبھی مایوس نہیں کیا۔'' نرسنگا پر بھی ا ب شراب کا ہلکا ہلکا اثر ہونے لگا تھا۔
''تو جھوٹ بولتا ہے نرسنگا!''
کرشن راؤ نے سردار کو ڈانٹتے ہوئے کہا' مگر اس کی یہ خفگی مصنوعی ی۔
''بہت دنوں سے تو نے لوٹ کا مال نہیں بھیجا۔ میں نے اپنے آدمیوں سے کہلا بھی دیا تھا کہ خزانہ خالی ہوتا جا رہا ہے۔
''ٹھاکر! تمہیں کیا معلوم کہ حالات کتنے خراب ہو چکے ہیں' خوف و وحشت کے باعث اب کوئی تجارتی قافلہ بھی ادھر سے نہیں گزرتا۔ میں غریبوں کو بار بار کیا لوٹوں کہ ان کے پاس کچھ بھی نہیں رہا۔ سوچ رہا ہوں کہ شہر میں داخل ہو کر دیشوں (بنیوں' سبزی اور غلہ فروشوں) کے گھروں پر شب خون ماروں کہ آج کل ان ہی کی تجوریوں میں ساری دولت قید ہو گئی ہے۔''
''ابھی نہیں...... ابھی نہیں کرشن راؤ گھبرا کر بولا۔'' میں سیاسی فضا کا جائزہ لے رہا ہوں ابھی بدنظمی اور پھیل جائے' پھر میں تجھے اشارہ کروں گا۔''
''جیسے تیرا حکم ٹھاکر! نرسنگا نے کہا اور رمولا کے رقص کے ایک دلفریب زاویے کو بغور دیکھنے لگا۔
''فی الحال تو میرا ایک کام کر دے نرسنگا۔'' ٹھاکر نے لڑکھڑاتے ہوئے لہجے میں کہا۔ اس مسلمان زادے کامران کو شہسواری اور شمشیرزنی کی تربیت کے دوران دو چار آدمیوں کے قتل میں الجھا دے۔''
''اس سے کیا ہو گا ٹھاکر؟'' نرسنگا نے چونک کر کہا۔
''پھر اس کی واپسی کے تمام دروازے بند ہو جائیں گے۔'' کرشن راؤ مسکرایا' اسے اپنے جرم کا احساس یہاں سے فرار نہیں ہونے دے گا۔''
''اسے ایک ہی وار میں ہلاک کر دے۔''
نرسنگا نے کرشن راؤ کی مسکراہٹ کے جواب میں قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔''ایک بے چارے معصوم لڑکے کو تڑپا تڑپا کر کیوں مار رہا ہے ٹھاکر؟''
''وہ بے چارہ نہیں۔ غداروں کی اولاد ہے۔ میں اس کی شہ رگ سے آہستہ آہستہ خون چوسوں گا' پھر وہی خون اس کی ماں کی آنکھوں سے قطرہ قطرہ ٹپکے گا۔ تو تو خوب جانتا ہے نرسنگا کہ ایسی موت میں بڑی لذت ہے۔''
یہ کہتے کہتے کرشن راؤ نے ایک سسکی لی جیسے کوئی اژدہا اپنے شکار کو دیکھ کر سانس لے رہا ہو۔
جیسی تیری مرضی ٹھاکر! تو شہر کا مالک ہے۔'' اس کے ساتھ ہی سردار نرسنگا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔
بہت رات ہو گئی مجھے واپس جانا ہے۔''
''اب کہاں جائے گا کہ شہر کے دروازے بند ہو چکے ہیں۔ کرشن راؤ نے گھبرا کر کہا۔'' صبح منہ اندھیرے ہی نکل جانا' میں تجھے اتنی رات گئے جانے نہیں دوں گا کہ تیری زندگی بڑی قیمتی ہے۔ نرسنگا! سلطان کے سپاہی قدم قدم پر پہرہ دے رہے ہیں' اگر تجھے کچھ ہو گیا تو میری پوری تحریک دم توڑ دے گی۔''
نرسنگا دوبارہ بیٹھ گیا اور رمولا کا رقص دیکھنے لگا' جس کے پاؤں ناچتے ناچتے شل ہو گئے تھے۔
سعدیہ خانم اپنے دروازے پر کھڑی تھی اور اس گزرگاہ کو دیکھ رہی تھی جس پر دور دور تک کوئی سایہ متحرک نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہ دوسری رات تھی جب اس کھنڈر میں اس کا بیٹا کامران موجود نہیں تھا۔ دونوں راتیں اس نے آنکھوں میں کاٹ دی تھیں۔ ایک لمحے کیلئے بھی سعدیہ خانم نے پلکیں نہیں جھپکی تھیں۔ اسے یقین تھا کہ کامران کا غصہ اتر جائے گا

تو وہ واپس لوٹ آئے گا' مگر جب کسی کے قدموں کی چاپ تک سنائی نہیں دی تو سعدیہ خانم لرز اٹھی' اب اس کے دل میں عجیب وسوسے پیدا ہو رہے تھے۔ کامران کو چاندی کے سکوں سے بھری ہوئی تھیلی کس نے دی تھی اور وہ گھر سے نکل کر کہاں چلا گیا تھا؟ ان دو سوالوں نے سعدیہ خانم سے اس کی نیند چھین لی تھی۔ دوسری رات کا ایک حصہ گزر جانے کے بعد بھی جب کامران واپس نہیں آیا تو سعدیہ خانم بے قرار ہو کر گھر سے نکل کھڑی ہوئی۔ اسے بیٹے کی منزل کا پتہ معلوم نہیں تھا۔ تلاش کرنے کہاں جاتی؟ بس محلے کے کچھ گھروں پر دستک دے سکی' جواب میں سعدیہ خانم کو جو کچھ حاصل ہوا وہ بڑا تکلیف دہ تھا۔ بعض لوگوں نے تو اپنے دروازے ہی نہیں کھولے اور اگر کوئی شخص باہر نکل بھی آیا تو اس نے ایک بیوہ عورت کو یہ کہہ کر دھتکار دیا کہ ہمارا کسی چور سے کوئی تعلق نہیں' ہم کیا بتائیں کہ اس کا مجرم بیٹا کہاں گیا؟ ہمارے بچے ایک مجرم سے دوستی نہیں کرتے۔ سعدیہ خانم سوچ کر گھر سے نکلی تھی کہ شاید کامران کے دوستوں سے اس کا کوئی سراغ مل سکے' مگر آج معلوم ہوا کہ اس کے بیٹے کا کوئی دوست ہی نہیں تھا۔ سعدیہ خانم اس طرح گھر واپس آئی جیسے کوئی اپاہج انسان سینے کے بل گھسٹ گھسٹ کر چل رہا ہو۔ کھنڈر کچھ اور ویران ہو گیا تھا۔ تنہائیاں کچھ اور بڑھ گئی تھیں۔ سعدیہ خانم کو محسوس ہوا جیسے رائے نعیم الدین ذیشان کو دوبارہ قتل کر دیا گیا ہو۔ بیوگی کا لباس پہننے کے ساتھ وہ لاوارث بھی ہو گئی تھی۔

سعدیہ خانم دروازے ہی میں دیوار سے سر ٹیک کر بیٹھ گئی' اس کی نظریں تاریک راستے پر جمی ہوئی تھیں کہ شاید جانے والا لوٹ آئے۔ اچانک سعدیہ خانم کے ذہن میں ایک شعلہ سا لپکا۔

"کہیں قائم خان راجپوت نے......؟"

سعدیہ خانم اس سے آگے نہ سوچ سکی۔

"اے خدا! میرے بیٹے کو قائم خان کی شر انگیزیوں سے محفوظ رکھ کہ وہ بہت نادان ہے۔ میری دل آزاریوں کے جرم میں اس کی گرفت نہ کر کہ تو بڑا معاف کرنے والا ہے۔"

رات کے سناٹے میں اس عورت کی دردناک آواز گونج رہی تھی' جس پر دنیا والوں کو کسی پتھر کا گمان ہوتا تھا۔

❊❊❊

شجاع الدین کامران بہت دیر سے کرشن راؤ کے اس ریشمی بستر کے قریب کھڑا تھا' جس کا انداز شاہانہ تھا' مگر اسے محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے ریشم کے ایک ایک تار میں سو سو کانٹے پرو دیئے گئے ہوں۔ کامران گھبرا کر ہٹ جاتا اور پھر کمرے میں ٹہلنے لگتا۔ اسے بڑی شدت سے ماں کی یاد آ رہی تھی۔ یہاں تک کہ اسی کشمکش میں آدھی رات گزر گئی۔

کامران ٹہلتے ٹہلتے تھک گیا تھا کہ یکایک اسے ایک عجیب سی آواز سنائی دی' اس نے گھبرا کر پیچھے کی طرف دیکھا' کمرے کی دیوار میں ایک شگاف پیدا ہوا اور دوسرے ہی لمحہ کامران کو دیوداسی شکنتلا نظر آئی۔ یہ منظر اس قدر ناقابل فہم تھا کہ چند ساعتوں کیلئے کامران بھی پتھرا کر رہ گیا۔

تم نے ایک دروازہ بند کیا تو میں دوسرے دروازے سے چلی آئی۔" شکنتلا کے ہونٹوں پر وہی مسکراہٹ تھی۔

تو نے ایسا کیوں کیا؟"

کامران کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔

"میں نہیں آؤں گی تو پھر کون آئے گا؟" شکنتلا کا دعویٰ کچھ عجیب سا تھا۔" خیر! اسے چھوڑو تھا کر تم اتنا بتاؤ کہ ابھی تک سوئے کیوں نہیں؟"

کامران بے قرار ہو گیا۔ ایسا لگا جیسے شکنتلا کی نازک انگلیوں نے اس کے دل کے زخموں کو چھو لیا ہو۔" ماں کی

یادیں سونے نہیں دیتیں......مگر تم کیوں جاگ رہی ہو۔" کامران کا لہجہ بہت شکستہ تھا جیسے دہکتے ہوئے انگارے راکھ بن گئے ہوں۔

"اس لئے کہ میری کوئی ماں نہیں ہے جس کے سینے پر سر رکھ کر سو سکوں۔" یہ کہتے کہتے شکنتلا کانپ کر رہ گئی' مگر اس نے فوراً ہی دل کے درد کو جبری مسکراہٹ کے پردے میں چھپالیا۔"اس پر سو جاؤ چھوٹے ٹھاکر کہ یہ بستر ماں کی آغوش سے زیادہ قیمتی ہے۔" شکنتلا کا ایک ایک لفظ زہریلا نشتر تھا جو شجاع الدین کامران کی روح میں پیوست ہو گیا تھا۔

"تیری ہمدردیوں کا شکریہ دیوداسی! مگر خدا کیلئے میرا پیچھا چھوڑ دے۔ میں واپس جانے کیلئے نہیں آیا ہوں۔" کامران ہذیانی انداز میں چیخا۔

شکنتلا سہم گئی' لیکن فوراً ہی سنبھل کر بولی۔"میں بس اتنا ہی کہنے آئی تھی کہ سردار نرسنگا کے قریب نہ جانا اس راستے پر جانے والا کبھی لوٹ کر نہیں آیا۔" یہ کہہ کر شکنتلا اسی خفیہ راستے سے واپس چلی گئی۔

❊❊❊

دیوداسی شکنتلا کے جانے کے بعد بھی شجاع الدین کامران بہت دیر تک ٹہلتا رہا۔ اس کے دل و دماغ میں خیالات کی یورش نے ایک حشر سا اٹھا دیا تھا۔ ماں کی تنہائی اور بے کسی کا تصور ہی کیا کم اذیت ناک تھا کہ شکنتلا کی ہمدردانہ مداخلت کے سبب صورتحال کچھ اور الجھ گئی تھی۔ کرشن راؤ کے مندر میں دیوداسی کی حیثیت ایک کنیز سے زیادہ نہیں تھی۔ پھر ایک کنیز نے اپنے آقا کے فیصلے کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے کیوں کہا تھا کہ...... ''سردار نرسنگا کے قریب نہ جانا۔''

شجاع الدین کامران شدید اضطراب کے عالم میں سوچ رہا تھا...... ''شکنتلا نے ایسا کیوں کہا؟ وہ نہیں جانتی کہ اس احمقانہ حرکت کا کیا انجام ہوگا؟'' ان سوالات نے کامران کو مزید وحشت میں مبتلا کر دیا تھا۔

''نرسنگا کون ہے اور شکنتلا اس کے قریب جانے سے کیوں روک رہی ہے؟ ایک ہندو لڑکی کو اس کی ذات سے کیا دلچسپی ہوسکتی ہے...... اور اگر ہے تو کیوں ہے؟''

ذہن میں ایک سوال نے کروٹ لی تو دوسرے نے سر ابھارا...... اور پھر یہ سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔ سوچتے سوچتے رات آدھی سے زیادہ بیت گئی۔ مندر کی نامانوس فضا' شکنتلا کی پراسرار گفتگو...... اور ماں کی مسلسل یادوں نے کامران کو مجبور کیا کہ وہ اس قید خانے سے نکل کر اپنی دنیا میں واپس لوٹ جائے۔ اس کے چٹان جیسے ارادوں میں ہلکی سی لرزش پیدا ہونے لگی تھی' مگر اچانک کامران کی نظروں کے سامنے کئی چہرے ابھر آئے۔

پہلا چہرہ خود کرشن راؤ کا تھا جو آج کل اس پر ساری دنیا سے زیادہ مہربان نظر آرہا تھا۔ ٹھاکر کے چہرے کے پیچھے اسے ایک اور چہرہ نظر آیا۔ یہ اس سفاک ساہوکار کا چہرہ تھا جو اپنی دولت کے ڈھیر سے سعدیہ خانم کی مجبوریاں خریدنا چاہتا تھا۔

دوسرا چہرہ قائم خان راجپوت کا تھا جس نے اپنی بیوہ بہن کو ناقابل بیان آزار پہنچائے تھے' پھر کامران کے جسم کو اپنے تشدد کا نشانہ بنایا تھا...... اور آخر میں اپنے ہی بھانجے کو مجرم ثابت کر کے ہمیشہ کیلئے اس کے گلے میں رسوائی کا طوق ڈال دیا تھا۔

اور تیسرا چہرہ قاضی عدالت کا تھا جس کی زر پرستی نے انصاف کو یتیم بنا دیا تھا اور قانون کو آگ لگا دی تھی۔

ویسے اور ابھی کئی چہرے تھے جو کبھی کبھی شجاع الدین کامران کو اپنی آنکھوں کے سامنے متحرک نظر آتے تھے۔ جیسے اس کے نانا اعتماد خان اور بلقیس خانم کے چہرے۔ مگر ان چہروں سے کامران کو زیادہ نفرت نہیں تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ جب اعتماد خان اور بلقیس خانم نے اسے پہچاننے سے انکار کیا تھا تو اس کی عمر بہت کم تھی...... اور جب وہ ہوش کی منزل میں پہنچا تو نانا نانی مفلوج ہو چکے تھے۔ اعتماد خان اور بلقیس خانم کیلئے کامران کے دل میں کچھ یوں بھی ایک نرم گوشہ موجود تھا کہ ان دونوں نے آخری وقت میں اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا تھا۔

مگر جہاں تک کرشن راؤ' قائم خان راجپوت اور قاضی عماد کا سوال تھا تو یہ تینوں چہرے ایک لمحے کیلئے بھی کامران کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوتے تھے۔ اس وقت بھی یہی چہرے کامران کی نگاہوں کا محور تھے۔

''مگر میں دیوداسی شکنتلا کی بات مان لوں' سردار نرسنگا کے قریب نہ جاؤں...... اور خاموشی کے ساتھ کرشن راؤ کے پراسرار مندر سے نکل کر اپنی دنیا میں واپس چلا جاؤں......'' شجاع الدین کامران نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ پھر خود ہی جواب دیتے ہوئے بولا...... ''اگر میں سر جھکا کر لوٹ جاؤں تو پھر ان قصابوں کا کیا ہوگا جو میرے باوقار خاندان کو ہوس کے مذبح خانے میں قتل کر چکے۔ اب میری ماں ایک غدار کی بیوہ ہے اور ناپسندیدہ لوگوں کے گھروں میں مزدوری کرنے والی ایک نحیف و نزار عورت...... اس ستم رسیدہ عورت کے ہونٹوں کی گمشدہ مسکراہٹ کون واپس کرے گا؟ کوئی نہیں' کوئی نہیں...... اچانک شجاع الدین کامران کی سماعتوں میں ایک شور سا گونجنے لگا۔ پھر شور اتنا بڑھا کہ وہ بستر سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور کسی وحشت زدہ انسان کی طرح کمرے میں ٹہلنے لگا۔

''تو اپنے باپ کو زندہ نہیں کر سکتا کامران!'' وہ پھر اپنے آپ سے مخاطب ہوا...... ''جب رائے نعیم الدین ذیشان واپس نہیں آسکتا تو پھر تیری ماں کی بیوگی کا دور بھی ختم نہیں ہو سکتا...... اور بیوگی ہی اس تنگ نظر معاشرے میں سب سے بڑی لعنت ہے......'' یہ کہتے کہتے شجاع الدین کامران پر دیوانگی طاری ہو گئی...... ''تیری ماں کی بیوگی کا ذمہ دار کون ہے؟ سلطان معزالدین بہرام شاہ...... مگر وہ تو قتل ہو کر زیر زمین جا چکا ہے۔ پھر تیرے باپ کے خون کا حساب کون دے گا؟ بہرام شاہ کا بیٹا...... لیکن اس کا کوئی بیٹا نہیں...... پھر تو اپنا قرض کس سے طلب کرے گا؟ سلطان ناصر الدین محمود سے کہ وہ بہرام شاہ کا چھوٹا بھائی ہے...... لیکن وہ تو بے قصور ہے کہ ایک انسان کے گناہوں کا بوجھ دوسرا نہیں اٹھا سکتا......'' شجاع الدین کامران کے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ نفرتوں کا ایسا شور تھا کہ انتقام کی آوازوں کے سوا کچھ سنائی نہیں دیتا تھا...... ''سلطان ناصر الدین بھی مجرم ہے کہ ساری دنیا اس کی انصاف مزاجی کے گیت گاتی ہے اور ایک بے گناہ شخص ہندوؤں کی عبادت گاہ میں منہ چھپائے پڑا ہے...... لیکن ناصر الدین کیسے مجرم ہو سکتا ہے کہ اس کی عدالت تک تو تیرا قدم پہنچا ہی نہیں۔'' کامران اپنے آپ سے مخاطب تھا۔ ''سلطان کی عدالت کا دروازہ قائم خان راجپوت نے بند کر دیا کہ بنیادی مجرم وہی ہے...... پھر اس مجرم کو سزا کون دے گا؟ سرکاری قانون جو اس کے ہاتھوں میں کسی چڑیا کی طرح تڑپ رہا ہے...... اور اس کے آہنی پنجرے میں یاسمین بھی سسک سسک کر دم توڑ رہی ہے......'' یاسمین کا خیال آتے ہی کامران کے دل میں درد کے نئے دریچے کھل گئے...... ''نہیں میں واپس نہیں جا سکتا......'' شجاع الدین کامران اپنے خیالات کے حصار میں پلٹ آیا۔

''اب شکنتلا آئے گی تو میں اس سے کہہ دوں گا کہ وہ میرے قریب نہ آئے...... اور مجھے کوئی نصیحت نہ کرے کہ میں بہرا ہو چکا ہوں۔ میں سردار نرسنگا سے ضرور ملوں گا۔ اگر اس کی قربت میں میری موت پوشیدہ ہے تو میں اس موت کو بھی چھو کر دیکھوں گا...... آخر یہ زندگی بھی کس کام کی کہ میرے دشمن سر اٹھا کر چلیں اور مجھے دیکھ کر دنیا والے پکار اٹھیں کہ وہ جا رہا ہے ایک سزا یافتہ مجرم۔''

پھر یہ شور آہستہ آہستہ کم ہو گیا اور کامران نے آنکھیں بند کر لیں۔ خیالات کے انتشار کا جو طوفان آیا تھا وہ گزر گیا۔ اب وہ اپنی زندگی کے بارے میں آخری فیصلہ کر چکا تھا۔

شجاع الدین کامران دن چڑھے تک سوتا رہا۔ اس دوران دیوداسی شکنتلا دو بار خفیہ راستے سے داخل ہوئی اور کامران کو سوتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ شکنتلا نے اسے بہت قریب سے دیکھا تھا۔ کامران کے چہرے پر معصومیت کے

دونوں ہاتھ جوڑ دیئے تھے۔ وہ زیر لب کہہ رہی تھی۔

''اے پرمیشور! اسے ٹھاکر کے چنگل سے بچالے کہ یہ بہت نادان ہے۔ ایک بار بھٹک گیا تو ساری زندگی ٹھوکریں کھاتا رہے گا۔''

اپنی مذہبی رسم کے مطابق شکنتلا کامران کے حق میں دعا کر کے خفیہ راستے سے چلی گئی تھی اور اب کمرے کے عام دروازے پر بڑی بے قراری کے ساتھ ٹہل رہی تھی۔ اسی اثنا میں پجاری رام سروپ بھی وہاں پہنچ گیا تھا اور اس نے دیوداسی سے پوچھا تھا۔

''کیا ابھی چھوٹے ٹھاکر بیدار نہیں ہوئے؟'' اگرچہ رام سروپ کے الفاظ سے ادب کا اظہار ہو رہا تھا لیکن اس کا لہجہ نہایت تحقیر آمیز تھا۔

''میں بھی اسی انتظار میں ہوں کہ وہ جاگ جائیں......''

شکنتلا نے بیزاری کے انداز میں کہا...... وہ رام سروپ کے سامنے اپنے ہمدردانہ جذبے کی نمائش کرنا نہیں چاہتی تھی کہ اس کی یہ حرکت خطرے کا پیش خیمہ بن سکتی تھی۔

''تو نے دروازے پر دستک دی؟'' رام سروپ نے سخت لہجے میں کہا۔ یہ بدکردار پجاری کرشن راؤ کے قدموں پر سجدے کرتا تھا' مگر شکنتلا سے اس طرح مخاطب تھا جیسے دیوداسی اس کی زرخرید لونڈی ہو۔

''ہاں! مہاراج! میں کئی بار ایسا کر چکی ہوں مگر چھوٹے ٹھاکر پھر بھی نہیں جاگے۔ شاید دیر سے آنکھ لگی ہو۔ شکنتلا نے خون کے گھونٹ پی کر ہونٹوں پر جبری مسکراہٹ سجالی۔

''روز ایک نئی مصیبت کھڑی ہو جاتی ہے......'' رام سروپ اپنی زندگی سے بیزار نظر آ رہا تھا...... ''وہ جاگ جائے تو اس سے کہہ دینا کہ سردار نرسنگا کا آدمی اس کا انتظار کر رہا ہے۔'' یہ کہہ کر رام سروپ چلا گیا۔

شکنتلا چپ چاپ کھڑی رہی۔ وہ دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہی تھی کہ کامران اسی طرح دن بھر سوتا رہے اور نرسنگا سے ملاقات کا وقت گزر جائے...... مگر فوراً ہی اسے اپنی حماقت کا احساس ہو گیا اور سینے میں کوئی شے ٹوٹ کر اس طرح بکھر گئی جیسے دیوداسی کے دل میں شیشے کے کئی ٹکڑے پیوست ہو گئے ہوں۔

''وہ کبھی تو جاگے گا۔ اس کی نیند وقت کی رفتار کو نہیں روک سکتی۔ نرسنگا کا آدمی اسی طرح انتظار کرتا رہے گا۔ جانے والے کے پیروں میں کون بیڑیاں ڈال سکتا ہے......'' یہ سوچ کر شکنتلا اداس ہو گئی تھی۔ ایک لمحے کیلئے اس کے ذہن میں خیال ابھرا کہ وہ خفیہ راستے سے کامران کے کمرے میں داخل ہو جائے' اسے جھنجوڑ کر اٹھا دے اور چیخ چیخ کر کہے کہ جنگل کی طرف نہ جانا...... وہاں نرسنگا رہتا ہے...... اور نرسنگا انسان نہیں' درندہ ہے۔

شکنتلا مضطرب ہو کر آگے بڑھی' مگر کسی نادیدہ زنجیر نے اس کے قدموں کو جکڑ لیا۔

''اگر اس موقع پر پجاری رام سروپ آ گیا تو کیا ہوگا؟ اور اگر خود کامران نے اسے جھڑک دیا تو پھر...... اس نے یہ پوچھ لیا کہ میں اس کی کون ہوں؟'' شکنتلا کا دل ڈوبنے لگا...... ''اور اگر ٹھاکر پر یہ راز فاش ہو گیا کہ میں اسے نرسنگا سے دور رکھنے کی کوشش کر رہی ہوں......'' دیوداسی اس سے زیادہ نہ سوچ سکی۔ وہ ٹھاکر کے بنائے ہوئے قانون سے بغاوت کرنے کا انجام جانتی تھی۔

ایک بار ایک دیوداسی پرمیلا نے ٹھاکر کے کھینچے ہوئے حصار سے نکلنے کی کوشش کی تھی اور پجاری رام سروپ کے منہ پر صاف صاف کہہ دیا تھا کہ ''تم سب دھرم کے چولے میں چھپے ہوئے بھیڑیے ہو جو بھولی بھالی استریوں کا ماس (گوشت) کھا کر اور رکت (خون) پی کر دیوتاؤں کے نام کی مالا جپتے ہو۔

''تیرا گناہ ناقابل معافی ہے...... مگر پھر بھی میں تجھے پرانشچت (کفارہ ادا کرنے) کا ایک موقع دیتا ہوں' اگر تو میرے پیروں پر سر رکھ کر بآواز بلند کہے کہ وہ تیرے پاپی من کی شرارت تھی جس نے تجھے کچھ دیر کیلئے گمراہ کر دیا تھا......اور ٹھاکر کا قائم کردہ مذہبی نظام تمام غلطیوں سے پاک ہے...... تو میں تیری سانسیں واپس کر سکتا ہوں۔''

ٹھاکر چاہتا تھا کہ دیوداسی پرمیلا سب لوگوں کے سامنے اپنے جرم کا اعتراف کر لے' مگر وہ ایک ضدی لڑکی تھی۔ اس نے معافی مانگنے کے بجائے سینکڑوں پجاریوں اور دیوداسیوں کے سامنے ٹھاکر کے منہ پر تھوکتے ہوئے کہا تھا۔

''تیرا یہ نظام ہوس جو سراسر پاپ کی کیچڑ میں لتھڑا ہوا ہے' میں اسے گنگا جل کی طرح پوتر اور صاف کہہ دوں؟ یہ کبھی نہیں ہوگا ٹھاکر! میں اپنے بعد آنے والی لڑکیوں کو دھوکہ نہیں دوں گی۔ مجھے یہاں سے نکل جانے دے۔ پھر میں ہندوستان کے ایک ایک تیرتھ اور ایک ایک مندر میں داخل ہو کر ان معصوم عورتوں کو تیری گھناؤنی حرکتوں کے بارے میں بتاؤں گی جو دیوداسی بننے کے خواب دیکھتی ہیں اور سمجھتی ہیں کہ انہیں ایک ہی رات میں سنسار کے سارے دکھوں سے مکتی مل جائے گی۔''

ٹھاکر نے انتہائی قہر کے عالم میں اپنا جابرانہ فیصلہ سنا دیا تھا۔

''پرمیلا پر زندگی اور آسائش کے سارے دروازے بند کر دیئے جائیں۔''

پھر اس معصوم لڑکی کو ٹھاکر کے اوباش خدمت گاروں کے حوالے کر دیا گیا' جن کا سرغنہ راما راؤ تھا۔

کچھ دن بعد جمنا کے اس مخصوص گھاٹ پر پرمیلا کی لاش ملی' جہاں دوسری دیوداسیاں غسل کیا کرتی تھیں۔ پرمیلا کی حالت بہت شکستہ تھی۔ اس کا پورا جسم داغدار تھا اور بہیمانہ تشدد کا آئینہ دار۔ پرمیلا کا لرزہ خیز انجام دیکھ کر مندر کی دوسری دیوداسیاں کئی راتوں تک سو نہیں سکی تھیں۔ ان میں سے اکثر سوتے سوتے چیخ اٹھتی تھیں...... ''ہمیں معاف کر دے ٹھاکر کہ ہم دیوتاؤں کی نہیں تیری داسیاں ہیں۔''

پرمیلا کا حشر یاد کر کے چند لمحوں کیلئے شکنتلا بھی کانپنے لگی تھی۔ اس نے فوراً ہی اپنی بگڑتی ہوئی اعصابی کیفیت پر قابو پا یا اور شجاع الدین کامران کے کمرے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اب وہ اس مسلم زادے سے مزید کچھ کہنا نہیں چاہتی تھی۔ شکنتلا کو خدشہ تھا کہ کہیں کامران کی زبان نہ لڑکھڑا جائے...... اور پھر پرمیلا کی طرح اس کی لاش بھی جمنا کے گھاٹ پر پائی جائے۔ ان خوفناک وسوسوں اور اندیشوں کے باوجود شکنتلا چاہتی تھی کہ کامران اس کے دل کی زبان سمجھ لے اور ٹھاکر کے مقتل سے نکل کر اپنی پرسکون دنیا میں واپس لوٹ جائے۔

❊❊❊

وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا۔ کامران کا دروازہ بدستور بند تھا اور شکنتلا کسی اطاعت گزار کنیز کی طرح اپنی سوچوں میں گم کھڑی تھی کہ پجاری رام سروپ ایک بار پھر آیا۔

کیا جاگ گئے چھوٹے ٹھاکر؟'' رام سروپ کا لہجہ بہت تلخ تھا' جیسے وہ کوئی ناگوار فعل انجام دے رہا ہو۔

''نہیں!'' شکنتلا نے آہستہ سے کہا...... ''میں خود بھی کئی بار دستک دے چکی ہوں' مگر اندر سے کوئی جواب نہیں آتا۔''

پجاری رام سروپ جھنجھلا کر آگے بڑھا اور اس نے زور زور سے دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔

کچھ دیر بعد دروازہ کھلا۔ شجاع الدین کامران سرخ آنکھوں کے ساتھ رام سروپ کی طرف دیکھ رہا تھا......

''کیا ہے؟ اس قدر شور کیوں مچا رہے ہو۔'' کامران کی آواز سے ناپسندیدگی کا اظہار ہو رہا تھا۔

''چھوٹے ٹھاکر! کامران کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر رام سروپ گھبرا گیا اور اسکے لہجے کی تلخی عاجزی میں

تبدیلی ہوگئی......"سردار نرسنگا کا آدمی بہت دیر سے آپ کا انتظار کر رہا ہے۔"
"ٹھہرو! میں ابھی چلتا ہوں۔" یہ کہہ کر کامران نے دروازہ بند کرلیا۔ کمرے کے ایک گوشے میں رکھے ہوئے طشت کی طرف بڑھا' منہ دھویا اور باہر نکل آیا۔ رام سروپ کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے ایک بار کامران نے مڑکر دیوداسی شکنتلا کی طرف دیکھا جو اداس ایک بے جان مجسمہ نظر آرہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں کئی ناآسودہ حسرتیں کروٹ لے رہی تھیں' مگر کامران شکنتلا کی آنکھوں کی زبان سمجھنا نہیں چاہتا تھا۔
کامران طویل راہداری سے گزر کر چلا گیا...... اور اس کے ہونٹوں پر چند الفاظ مچل کر رہ گئے۔
"تقدیر کے لکھے کو کوئی نہیں مٹا سکتا۔"
یہ الفاظ اس قدر مدھم لہجے میں ادا کئے گئے تھے کہ ان کی بازگشت شکنتلا کے سوا کوئی دوسرا نہیں سن سکتا تھا۔

✽✽✽

پجاری رام سروپ' شجاع الدین کامران کو لے کر اپنے کمرے میں آیا جہاں سردار نرسنگا کا آدمی پہلے سے موجود تھا۔ کامران نے اسے ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا کہ وہ ایک کریہہ المنظر انسان تھا۔ سیاہ رنگ اور بھدے نقوش رکھنے والا ایک بدصورت آدمی' جس کی سرخ آنکھیں کسی خونخوار درندے کا تاثر پیش کر رہی تھیں۔
"میں آپ کا داس ہوں کھشیما!" نرسنگا کے آدمی نے کھڑے ہوکر ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا......"سردار نے مجھے حکم دیا تھا کہ میں صبح سویرے آپ کو لے کر جنگل پہنچ جاؤں...... مگر شاید چھوٹے ٹھاکر سوئے ہوئے تھے۔"
کامران نے سر کی ہلکی سی جنبش سے کھشیما کے سلام کا جواب دیا......"چلو! میں تیار ہوں۔"
پھر وہ تینوں مندر کے ایک زمین دوز راستے سے گزر کر ایک ایسے مقام پر پہنچے جہاں چاروں طرف سایہ دار درختوں کے جھنڈ تھے۔ کامران بڑی حیرت سے اس پراسرار فضا کو دیکھ رہا تھا۔ اگرچہ اس نے ایک طویل راستہ طے کیا تھا لیکن اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ یہ کون سی جگہ ہے اور وہ کدھر سے گزر رہا ہے۔ کرشن راؤ اور اس کے آدمیوں نے بڑی ذہانت سے یہ لمبی سرنگ تعمیر کی تھی۔ کچھ دیر تک درختوں کے درمیان ان کا سفر جاری رہا' پھر یکایک کامران نے دیکھا کہ اس کی نظروں کے سامنے ایک اور مندر موجود تھا۔ یہ مندر اپنے طول وعرض میں بہت چھوٹا بھی تھا اور ویران بھی۔ درودیوار پر کائی جمی ہوئی تھی اور ایسا لگتا تھا جیسے یہاں بہت کم لوگ پوجا کرنے کیلئے آتے ہیں۔ پجاری کا کمرہ نسبتاً صاف تھا۔ رام سروپ کو دیکھتے ہی بوڑھے برہمن نے بھی دونوں ہاتھ جوڑ دیئے کہ رام سروپ مرتبے میں اس سے بڑا پجاری تھا۔
"سب کچھ ٹھیک ہے برج موہن؟" رام سروپ نے پجاری سے پوچھا۔
"مہاراج کی کرپا اور بڑے ٹھاکر کی آشیرواد کے سہارے جیون کی ٹوٹی ہوئی نیا کو کھینچ رہا ہوں۔ پتا نہیں کب موت کی باڑھ آجائے اور لکڑی کے یہ کمزور ٹکڑے الگ ہوکر بکھر جائیں۔ پانی کی اس بوند کو ایک نہ ایک دن تو اپار ساگر میں ملنا ہی ہے......" برج موہن انتہائی شکستہ لہجے میں اپنے بڑھاپے کی کیفیت بیان کر رہا تھا۔
"کسی غیر شخص کے قدم تو اس طرف نہیں آئے...... اور تجھ پر کسی کو شک تو نہیں ہے؟" رام سروپ نے برج موہن سے سوال کیا۔ غیر سے مراد سلطان کے جاسوس تھے جو دن رات فتنہ گروں کی تلاش میں رہتے تھے' مگر انہیں آج تک ہندو پجاریوں پر کسی قسم کا شبہ نہیں ہوسکا تھا کہ عبادت گاہوں کے تہ خانوں میں کیسے کیسے فتنے پرورش پا رہے تھے۔ شاید اس کی وجہ مسلمانوں کی روایتی شجاعت تھی جس کے زیر اثر وہ دشمن کی کمین گاہوں کو اس انداز میں تلاش نہیں کرتے تھے۔ رام سروپ [illegible] جیسے شجاع الدین کامران بھی سمجھنے

سے عاجز رہا۔

''مجھ جیسے بوڑھے پجاری پر کون شک کرسکتا ہے۔ مہاراج!'' برج موہن نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اچانک اس کی ظاہری کیفیت بدل گئی تھی اور اب وہ ایک انتہائی عیار انسان نظر آرہا تھا۔

''ایسا ہوگا بھی نہیں...... لیکن اگر کسی اجنبی کی آنکھوں میں ایسی کوئی پرچھائی نظر آئے تو ٹھاکر کا حکم ہے کہ انہیں فوراً اطلاع دی جائے۔'' رام سروپ نے مبہم الفاظ میں کہا اور پھر شجاع الدین کامران کی طرف اشارہ کیا......

''پجاری! یہ چھوٹے ٹھاکر ہیں' انہیں سردار نرسنگا کے پاس جانا ہے۔''

برج موہن نے چونک کر کامران کی طرف دیکھا اور حسب عادت دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

''یہ اسی راستے سے روزانہ صبح سردار کے پاس جائیں گے اور شام کو واپس لوٹ آئیں گے۔ تیرا فرض ہے کہ تو انہیں اپنی نگرانی میں بڑے مندر کی سرنگ تک پہنچا دے۔'' رام سروپ نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

بوڑھا برج موہن کسی خدمت گار کی طرح چپ کھڑا تھا' مگر اس کی آنکھوں میں کئی سوالات لرز رہے تھے۔

''یہ بڑے ٹھاکر کے جانشین ہیں۔'' رام سروپ نے فوراً ہی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

برج موہن نے احترام کے طور پر سر جھکا دیا اور تینوں کو اپنے کمرے میں لے گیا۔ یہ بظاہر ایک عام سا کمرہ تھا مگر اس کے ایک گوشے میں بھی وہی تہ خانہ موجود تھا۔ پجاری رام سروپ' کھیما اور شجاع الدین کامران سرنگ میں داخل ہوگئے۔ پھر جب وہ سرنگ ختم ہوگئی تو حد نگاہ تک ایک گھنا جنگل پھیلا ہوا تھا۔ رام سروپ نے کامران کو ہاتھ جوڑ کر سلام کیا۔

''الوداع! چھوٹے ٹھاکر! میرا کام ختم ہوا۔ واپسی میں کھیما یا سردار نرسنگا کا کوئی آدمی آپ کو بڑے مندر تک پہنچا دے گا۔ جلدی لوٹنے کی کوشش کیجئے گا تاکہ آسانی سے یہ سفر طے کرسکیں' اگر اندھیرا پھیل گیا تو پھر بہت دشواری ہوگی......'' رام سروپ اس طرح نصیحت کررہا تھا جیسے وہ شجاع الدین کامران کا سب سے بڑا ہمدرد ہو۔

❋❋❋

سردار نرسنگا کا غلام کھیما کامران کو لے کر جنگل میں داخل ہوگیا۔ بہت گھنا اور خوفناک جنگل تھا۔ دن میں بھی ہر طرف گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ جنگل کے کنارے تناور بانسوں کی ایک باڑھ لگی ہوئی تھی جس نے لٹیروں کی پناہ گاہ کو بہت زیادہ مضبوط بنا دیا تھا۔ الجھے ہوئے کانٹوں کی یہ فصیل' پتھروں کی کسی فصیل سے کم نہیں تھی۔ اگر بانسوں کو کاٹ کر درمیان میں راستہ نہ بنایا جاتا تو باہر سے آنے والا کوئی شخص جنگل میں داخل بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ شجاع الدین کامران کھیما کے ساتھ ساتھ ہر شے کو بڑی حیرت سے دیکھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔

راستے میں اسے کئی سانولی اور سیاہ عورتیں نظر آئیں۔ کامران عورتوں کو دیکھ کر گھبرا سا گیا۔ وہ عورتوں کی نیم عریانی سے وحشت زدہ نظر آرہا تھا۔ اس نے پہلی بار آدم زادوں کو اس حالت میں دیکھا تھا......''یہ کون ہیں؟''

''یہ ہماری بیٹیاں' بہنیں اور بیویاں ہیں۔'' کھیما نے جواب دیا۔

کامران نے دوبارہ کوئی سوال نہیں کیا...... وہ ایک انتہائی مخدوش اور حساس علاقے سے گزر رہا تھا۔ اس لئے خاموشی ہی میں اس نے اپنی عافیت سمجھی۔

جگہ جگہ جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں جنہیں دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ یہ جنگل میں رہنے والوں کے مکانات ہیں' قدم قدم پر کامران کو نیم وحشی انسان دکھائی دے رہے تھے جن کے بدن جلے ہوئے کوئلے کی طرح سیاہ تھے۔ چمکتے

تھے۔ ان کے کاندھوں پر کمانیں لٹکی ہوئی تھیں اور پنڈلیوں سے بڑے بڑے چھرے بندھے ہوئے تھے۔
یہ تمام وحشی لٹیرے بڑی خونخوار نظروں سے کامران کی طرف دیکھتے تھے' مگر جیسے ہی کھٹیما کی آواز بلند ہوتی...... ''جے نرسنگا''...... تو یہ قزاق بھی جواب میں نعرے لگانے لگتے۔ پھر کھٹیما اپنی زبان میں انہیں کچھ سمجھاتا اور لٹیروں کے سر احتراماً جھک جاتے۔
جنگل کے وسط میں پہنچ کر کھٹیما ایک جھونپڑی کے سامنے رک گیا۔ دروازے پر آٹھ قوی ہیکل وحشی بے نیاز شمشیریں لئے ہوئے ٹہل رہے تھے۔ کھٹیما نے انہیں دیکھتے ہی ''جے نرسنگا'' کا نعرہ بلند کیا اور بتایا کہ چھوٹے ٹھاکر آگئے ہیں اور سردار سے ملنا چاہتے ہیں۔
ایک پہرے دار نے کھٹیما کی بات غور سے سنی اور تیزی کے ساتھ جھونپڑی میں داخل ہو گیا...... پھر کچھ دیر بعد واپس آیا اور ہاتھ کے اشارے سے ان دونوں کو اندر جانے کیلئے کہا۔
کھٹیما اور شجاع الدین کامران آگے بڑھے...... اور جھونپڑی کے دروازے میں داخل ہو گئے۔ جھونپڑی باہر سے بہت مختصر نظر آ رہی تھی۔ اندر بھی دونوں جانب مسلح پہرے دار موجود تھے۔ کامران نے حیرت سے دیکھا' کھٹیما اچانک نیچے اترنے لگا۔ کامران نے بھی اس کی تقلید کی۔ سیڑھیاں اگرچہ کچی تھیں مگر انہیں بہت مضبوط بنایا گیا تھا۔ کامران ایک لمحے کیلئے جھجکا لیکن پھر بے نیازانہ آگے بڑھنے لگا۔ سیڑھیاں اتر کر وہ ایک کشادہ صحن میں پہنچ گیا تھا۔ یہ ایک طویل و عریض غار معلوم ہوتا تھا۔ یہاں ہر طرف مشعلیں روشن تھیں...... اور تیز روشنی میں محافظوں کے سیاہ چہرے صاف نظر آ رہے تھے۔ کسرتی جسم رکھنے والے یہ تمام محافظ نیزہ بردار تھے۔
کھٹیما نے انہیں دیکھ کر حسب دستور ''جے نرسنگا'' کا نعرہ بلند کیا۔ جواب میں اسی نعرے کی گونج سنائی دی اور کھٹیما ایک بار پھر نیچے اترنے لگا۔ شجاع الدین کامران چونک اٹھا۔ نرسنگا کی پراسرار رہائش گاہ اور مندر کے تہ خانوں کی ظاہری ساخت میں کوئی فرق نہیں تھا۔ اگر تھا تو بس اتنا کہ مندر میں قیمتی پتھر استعمال کئے گئے تھے...... اور نرسنگا کی پناہ گاہ سخت مٹی کی بنی ہوئی تھی۔
کامران صحیح طور پر تو شمار نہ کر سکا' مگر اس کا اندازہ تھا کہ وہ سات تہ خانوں سے گزر کر سردار نرسنگا کی آرام گاہ تک پہنچا ہے۔ یہاں بھی مسلح محافظوں کی دو رویہ قطاریں تھیں۔ کھٹیما نے بڑے والہانہ انداز میں نعرہ زنی کی اور کامران سے مخاطب ہوا۔
''چھوٹے ٹھاکر! اس غلام کی رسائی یہیں تک ممکن تھی۔ سامنے سردار کی خواب گاہ ہے' آپ اطمینان سے چلے جائیے۔''
شجاع الدین کامران نے مسلح محافظوں پر ایک نظر ڈالی اور اطمینان سے چلتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ یہ نسبتاً ایک آراستہ کمرہ تھا' جگہ جگہ دیواروں پر شیروں کے کٹے ہوئے سر آویزاں تھے...... اس کمرے کے اندر ایک اور کمرہ موجود تھا۔ کمرے کے دروازے پر سات سادھو نما انسان بیٹھے ہوئے تیز آواز میں کچھ پڑھ رہے تھے۔ کامران کیلئے ان کی زبان نامانوس اور اجنبی تھی۔ اس لئے وہ سادھوؤں کی پڑھنت سمجھنے سے قاصر رہا۔
کامران چند لمحوں تک حیران و پریشان ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ وہاں ایک ہی انداز کے کئی کمرے بنے ہوئے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس کمرے میں داخل ہو اور کس سے سردار نرسنگا کا پتا پوچھے؟ آخر ایک مختصر سی ذہنی کشمکش کے بعد وہ شور مچاتے ہوئے سادھوؤں سے مخاطب ہوا۔
''میں سردار نرسنگا سے ملنا چاہتا ہوں...... وہ کہاں ہیں؟'' کامران کی آواز بلند تھی۔

جواب میں ایک سادھو کا ہاتھ بلند ہوا اور اس نے بائیں جانب اشارہ کیا۔
کامران نے کسی جھجک کے بغیر آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور پکار کر کہا...... ''سردار نرسنگا! میں شجاع الدین کامران آیا ہوں۔''
''آ، چھوٹے ٹھاکر!'' کمرے کے اندر دائیں جانب سے ایک گرجدار آواز ابھری۔ یہ آواز نرسنگا کی تھی۔
شجاع الدین کامران نے آواز کی طرف پلٹ کر دیکھا اور دروازہ بند کر دیا۔ سامنے ایک آراستہ مسند پر نرسنگا لیٹا ہوا تھا اور اس کے قریب ہی ایک سیم تن لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔
''تو میرے استقبال کیلئے دروازے تک نہیں آیا سردار! آخر میں تیرا مہمان ہوں۔'' کامران نے شکایت کی۔
''آج میں بہت تھکن محسوس کر رہا ہوں ٹھاکر!'' نرسنگا نے اٹھنے کی کوشش کی اور اس لڑکی نے سردار کو سہارا دیا...... ''رات بھر جاگ کر بڑے ٹھاکر کے ساتھ پوجا کی تھی۔ صبح سویرے اتنا طویل سفر طے کر کے یہاں پہنچا۔ بس یہی وجہ تھی کہ میں تیرے سواگت کیلئے دروازے تک نہ آسکا......'' یہ کہہ کر سردار نرسنگا اٹھا...... ''ٹھاکر! تو ایک بہادر نوجوان ہے' اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال نہ کر۔'' نرسنگا نے کامران کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔
کامران جذباتی تھا' فوراً ہی بہل گیا۔ سردار نرسنگا نے اس خوبصورت لڑکی کی طرف دیکھا' جو کسی روشن صبح کی طرح چمک رہی تھی۔
''ٹھاکر! یہ تیرے سردار کی بیوی ہے امر پالی۔'' نرسنگا نے کامران سے اس نازنین کا تعارف کراتے ہوئے کہا' جس کی حیثیت بھیڑیوں کے غول میں ایک الھڑ ہرنی سے زیادہ نہیں تھی۔
بیوی کا لفظ سن کر کامران نے اپنے سر کو ہلکی سی جنبش دی۔ یہ احترام کا ایک مظاہرہ تھا۔
''اور یہ چھوٹے ٹھاکر ہیں' مہاراج کرشن راؤ کے جانشین۔'' نرسنگا امر پالی سے مخاطب ہوا...... ''میں تجھے ان کے بارے میں پوری تفصیل سے سب کچھ بتا چکا ہوں...... اب یہ ہمارے مہمان ہیں اور آج پہلے دن ہماری مملکت میں آئے ہیں' ان کی آمد پر جشن کا انتظام کر' میں ذرا ٹھاکر کا اپنی رعایا سے تعارف کرا دوں۔
امر پالی نے عجیب سی نظروں سے کامران کی طرف دیکھا' ان آنکھوں کی زبان بھی دیو داسی شکنتلا سے ملتی جلتی تھی۔ کامران گھبرا کر دوسری طرف دیکھنے لگا اور پھر اس نے فضا بدلنے کیلئے ان سادھوؤں کا ذکر چھیڑ دیا' جو دروازے پر بیٹھے ہوئے پرشور آوازوں میں چیخ رہے تھے۔
''وہ کون لوگ ہیں سردار؟'' کامران نے سادھوؤں کے متعلق دریافت کرتے ہوئے کہا۔
''وہ تیرے سردار کے دعا گو ہیں ٹھاکر!'' نرسنگا نے پرجوش لہجے میں کہا...... ''اس بستی کے بہترین جادوگر' یہ ان کے منتروں اور جاپوں ہی کا اثر ہے کہ آج تک نرسنگا کی عزت و آبرو اور جان و مال کو کوئی گزند نہیں پہنچا۔ جدھر جاتا ہوں کامیابیاں میرے قدم چومتی ہیں' طوفان سر جھکا دیتے ہیں اور آندھیاں اپنی رفتار بدل دیتی ہیں۔ یہ جادوگروں کا کھینچا ہوا حصار ہے کہ جس سے ٹکرا کر میرے دشمنوں کے خنجر ان ہی کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔ وہ بڑے لوگ ہیں ٹھاکر! بہت بڑے لوگ۔''
کامران کا ذہن ایک بار پھر الجھ کر رہ گیا۔ وہ ایک ایسی بستی میں آ گیا تھا جو خود بھی پراسرار تھی اور اس کے رہنے والے بھی۔
''کیا سوچ رہے ہو ٹھاکر؟'' نرسنگا نے اسے آواز دی۔'' وہ جادوگر تیرے بھی کام آئیں گے اور تو ایک دن اپنے دشمنوں پر ضرور فتح حاصل کرے گا۔''

کامران مصلحتاً مسکرانے لگا۔

اچانک سردار نرسنگا امرپالی سے مخاطب ہوا...... ''مجھے ایک جام اور دے تاکہ میں اپنے جسم کی تھکن پر غالب آسکوں۔''

امرپالی جھکی اور اس نے مسند پر رکھی ہوئی صراحی سے پیالے میں شراب بھری' پھر ایک ادائے خاص کے ساتھ امرپالی نے شراب کا پیالہ نرسنگا کی طرف بڑھایا۔ نرسنگا نے ایک ہی گھونٹ میں ساری شراب پی لی اور کمرے سے باہر نکل آیا۔

سردار کے باہر آتے ہی وہ ساتوں جادوگر کھڑے ہو گئے اور کمرے میں انتہائی پرشور آوازیں گونجنے لگیں۔ اجنبی لوگوں کی اجنبی زبان تھی۔ کامران کچھ بھی نہیں سمجھ سکا' پھر ان جادوگروں نے اپنے آگے رکھے ہوئے کشکول اٹھائے۔ وہ کشکول دہکتے ہوئے انگاروں سے بھرے ہوئے تھے۔ سادھوؤں نے مٹھی بھر بھر کر انگاروں پر لوبان ڈالا اور سارا کمرہ ایک خوشبودار دھویں سے بھر گیا۔ سادھوؤں کے ہونٹ تیزی سے گردش کر رہے تھے۔ کامران شدید حیرت کے انداز میں ان لوگوں کو دیکھ رہا تھا جن کا ظاہری حلیہ غیر مہذب اور وحشی انسانوں سے مشابہ تھے۔ اگرچہ اس نے دہلی کی گلیوں میں بہت سے ہندو سادھوؤں کو گھومتے ہوئے دیکھا تھا' مگر یہ جوگی ان سب سے مختلف تھے۔

سردار نرسنگا باہر نکل آیا...... مسلح محافظوں نے اپنے سردار کو دیکھ کر ''جے نرسنگا'' کے نعرے بلند کئے اور اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ ہر تہ خانے سے گزرتے وقت یہی عمل دہرایا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ جب نرسنگا اپنی جھونپڑی سے نکل کر جنگل میں آیا تو اس کے گرد پچاس ساٹھ مسلح محافظ موجود تھے۔

نرسنگا نے اپنے ایک محافظ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا...... ''سنکھ بجاؤ اور میری رعایا کو جمع کرو۔''

محافظ نے اپنی کمر سے لٹکا ہوا سنکھ اٹھایا اور زور زور سے پھونکنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں کامران نے ایک عجیب منظر دیکھا' چاروں طرف سے بیشمار وحشی بھاگتے ہوئے نرسنگا کی طرف آرہے تھے۔ ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی...... بوڑھے بھی تھے اور بچے بھی۔ یہ تمام وحشی قریب پہنچتے ہی نرسنگا کا نام لے کر ''جے کار'' کرتے اور پھر فوراً ہی سجدہ ریز ہو جاتے۔ کامران حیرت زدہ تھا۔ سارے جنگلی اس طرح نرسنگا کے سامنے اوندھے پڑے ہوئے تھے جیسے وہ کوئی حقیر مخلوق ہو اور نرسنگا ان کا دیوتا ہو۔

پھر جب سارے وحشی جمع ہو گئے تو نرسنگا نے انہیں کھڑے ہونے کا حکم دیا۔ بس جنبش لب کی دیر تھی۔ تمام جنگلی انتہائی فرمانبردار غلاموں کی طرح ایستادہ ہو گئے۔

''یہ چھوٹے ٹھاکر ہیں' مہاراج کرشن راؤ کے جانشین! نرسنگا نے شجاع الدین کامران کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا...... ''مہاراج کے رشتے سے اب یہ تمہارے لئے بھی محترم ہیں۔ انہیں غور سے دیکھ اور سمجھ لو کہ اس جنگل میں میرے بعد یہی سردار کی حیثیت رکھتے ہیں۔''

جواب میں وحشیوں نے ''چھوٹے ٹھاکر'' کی عظمتوں کا نعرہ بلند کیا اور پورا جنگل اس شور سے گونج اٹھا۔

''اب اپنے اپنے کاموں پر واپس جاؤ۔'' شور کم ہوا تو نرسنگا نے چیخ کر کہا۔ اس کا دایاں ہاتھ فضا میں بلند تھا اور تمام جنگلی الٹے قدموں واپس جا رہے تھے۔

اچانک وحشیوں کی اگلی قطار سے ایک دراز قامت اور توانا شخص آگے بڑھا۔ اس نے اپنے دونوں گھٹنے ٹیک کر اور سر جھکا کر کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

"سردار! وہ پاپی نانکاری آپ کے فیصلے کا انتظار کر رہا ہے۔"

"ہاں! مجھے یاد آیا۔ کہاں ہے وہ گندی ماں کا گندا بیٹا؟" نرسنگا اس طرح چیخا جیسے کئی دن کا بھوکا شیر دھاڑ رہا ہو۔

"اسے آپ کے حکم کے مطابق درخت سے لٹکا دیا گیا ہے۔"

"چلو! میں اس کے جرم کی سزا سنا دوں۔" نرسنگا نے کہا اور تیز قدموں سے آگے بڑھا۔

پھر جنگل کے درمیان میں ایک جگہ رک کر اس نے دیکھا۔ سامنے برگد کے ایک درخت سے ایک شخص لٹک رہا تھا۔ نرسنگا نے اس پر حقارت آمیز نظر ڈالی اور اپنے خدمت گار کو دوبارہ "شنکھ پھونکنے کا حکم دیا۔

شنکھ کی آواز گونجتے ہی جنگل میں ایک طوفان سا آ گیا اور چاروں طرف سے بھگدڑ سی مچ گئی۔ تمام وحشی دوبارہ اس درخت کے پاس جمع ہونے لگے' پھر جب سارے جنگلی ایک مرکز پر سمٹ آئے تو نرسنگا اس شخص سے مخاطب ہوا' جس کا نام نانکاری تھا اور جو انتہائی اذیت ناک حالت میں درخت سے بندھا ہوا لٹک رہا تھا۔

"او حقیر کیڑے! تو اپنی حیثیت بھول گیا اور سردار نرسنگا کے نظام سے بغاوت کرنے لگا۔"

"مجھے معاف کر دے سردار کہ وہ میری بڑی بھول تھی...... مجھے میرے پاگل دماغ نے بہکا دیا تھا' مگر اب میں اپنے گناہوں سے توبہ کر چکا ہوں اور نرسنگا سے رحم کی بھیک مانگتا ہوں...... وہ نرسنگا جو مہان ہے اور امر ہے' جس سے موت بھی بچ کر چلتی ہے اور جس کے فیصلے سے کوئی اختلاف نہیں کر سکتا۔" نانکاری کسی بھکاری کی طرح گڑگڑا رہا تھا۔

"نہیں نانکاری! ہرگز نہیں......" نرسنگا پوری طاقت سے چیخا...... "تو بڑا پاپی ہے۔ دیوتا کسی انسان کے بڑے سے بڑے گناہ کو معاف کر سکتے ہیں مگر نرسنگا کے قانون میں معافی کا کوئی لفظ موجود نہیں۔ تو نے دیوی کے قدموں میں سر جھکا کر عہد کیا تھا کہ کبھی اپنے سردار سے بے وفائی نہیں کرے گا' مگر سارا جنگل گواہ ہے کہ تو نے اپنے عہد کو توڑ دیا۔ میرے کھینچے ہوئے دائرے سے نکلنے کی کوشش کی اور اپنے پیروں کی طرف نہیں دیکھا کہ وہ نرسنگا کی اٹوٹ زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔"

یہ کہہ کر نرسنگا نے اپنے ایک خدمت گار سے تیر و کمان طلب کئے۔ نانکاری چیخا...... "رحم نرسنگا! رحم۔"

نرسنگا ہذیانی انداز میں ہنسا' اس نے کمان میں تیر جوڑا اور نانکاری کے جسم کا نشانہ لیا۔

تمام وحشیوں نے پرشور آوازوں میں گانا شروع کر دیا۔

"نرسنگا عظیم ہے...... جنگل کے ایک ایک گوشے پر اس کے بنائے ہوئے قانون کی حکمرانی ہے...... ہم سب اس کے غلام ہیں...... کسی میں اتنی ہمت نہیں کہ اس کے سامنے سرکشی اختیار کر سکے۔ جب وہ قہر کی حالت میں نمودار ہوتا ہے تو غداروں کیلئے موت بن جاتا ہے...... وہ "ارجن" کا نام لیوا ہے...... اس کا تیر کبھی خطا نہیں کرتا۔"

پھر جیسے ہی وحشیوں کا گیت ختم ہوا' نرسنگا کے طاقتور بازوؤں کی رگیں ابھر آئیں...... اور دوسرے ہی لمحے نانکاری کی چیخ سے گرد و پیش کی فضا لرز اٹھی۔

نرسنگا کا تیر نانکاری کے دل میں پیوست ہو چکا تھا اور وہ کسی ذبح کئے جانے والے جانور کی طرح تڑپ رہا تھا۔

"اس کے جسم کے ایک ایک روئیں میں اپنے تیر پرو دو۔" نرسنگا نے خدمت گار کو کمان واپس کرتے ہوئے کہا۔

ابھی جنگل کی پرہول فضاؤں میں نرسنگا کے جابرانہ حکم کی گونج باقی تھی کہ تمام مسلح پہرے داروں نے اپنی کمانیں چڑھا لیں اور پھر نانکاری کی لاش پر تیروں کی بوچھاڑ ہونے لگی...... یہاں تک کہ مرنے والے کے بدن میں

ہدف بننے کی گنجائش باقی نہ رہی' بعد میں چھوڑے جانے والے تیر دوسرے تیروں سے ٹکرا کر زمین پر گرنے لگے۔

''بس!'' سردار نرسنگا چیخا۔ ''اس کی لاش جلا کر راکھ ہوا میں اڑا دو۔ نرسنگا کی نافرمانی کا یہی انجام ہوتا ہے۔''

یہ کہہ کر نرسنگا آگے بڑھ گیا۔ ہر طرف گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا اور اس کے محافظ سر جھکائے ہوئے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔

''تو اسے معاف بھی کر سکتا تھا نرسنگا!'' شجاع الدین کامران نے اس تکلیف دہ سکوت کو توڑتے ہوئے کہا۔

''ہاں! چھوٹے ٹھاکر! میں اسے معاف کر سکتا تھا..... مگر تو نہیں جانتا کہ نرسنگا کون ہے؟'' نرسنگا نے غضبناک لہجے میں کہا..... ''دیوتاؤں کی قسم! نرسنگا وفاداروں کی بہت قدر کرتا ہے۔ ان کی بڑی سے بڑی غلطی کو بھی ہنس کر برداشت کر لیتا ہے..... لیکن وہ لوگ جو اپنا عہد توڑ دیتے ہیں ان کیلئے نرسنگا بہت شقی القلب ہے' درندوں سے بھی زیادہ سفاک اور خون آشام..... اس حرام کار نا نکاری کو میں نے دنیا کی ہر آسائش فراہم کی مگر وہ بہت ناشکرا تھا۔ اس ناپسندیدہ ذکر کو چھوڑ ٹھاکر! تجھے یہاں بڑے عجیب عجیب تماشے نظر آئیں گے۔ تو اپنے کام سے کام رکھنا۔''

کامران چپ چاپ چلتا رہا۔ نرسنگا شدید غصے کی حالت میں زمین پر پاؤں مارتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ یکا یک درختوں کے جھنڈ سے ایک عورت چیختی ہوئی نکلی اور نرسنگا سے لپٹ گئی۔

''تو مجھے چھوڑ کر کہاں جا رہا ہے بے رحم!'' عورت نے نرسنگا کا گریبان پکڑ لیا۔ وہ اپنی ظاہری حالت سے پاگل نظر آ رہی تھی۔

کامران ایک لمحے کیلئے لرز کر رہ گیا۔ اسے یقین تھا کہ نرسنگا آگ کے شعلے کی مانند بھڑک جائے گا۔ پھر نا نکاری کی طرح اس گستاخ عورت کی لاش بھی زمین پر تڑپتی ہوئی نظر آئے گی..... مگر خلاف توقع ایسا نہیں ہو سکا۔ نرسنگا تار کے درخت کی طرح سیدھا کھڑا رہا۔ شدت غضب سے اس کی تانبے جیسی رنگت سیاہ ہو گئی تھی اور دانت اس طرح آپس میں پیوست ہو گئے تھے کہ جبڑوں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔

''اب وہ ویشیا امر پالی تیری تنہائیوں کی ساتھی بن گئی ہے۔ عورتوں کا خون پینے والے بھیڑیئے! مجھے بتا کہ میں کہاں جاؤں؟''

نرسنگا خاموش کھڑا رہا' مگر چہرہ بتا رہا تھا کہ اس کی قوت برداشت جواب دیتی جا رہی ہے۔

عورت پر وحشت طاری تھی۔ اس نے جارحیت کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی اور نرسنگا کا گریبان پھٹ گیا۔

نرسنگا نے پلٹ کر قہر آلود نظروں سے اپنے خدمت گاروں کی طرف دیکھا..... ''تم اچھی طرح جانتے ہو کہ تمہارا سردار عورت پر ہاتھ نہیں اٹھاتا۔ اب یہ میرے لئے ناقابل برداشت ہو گئی ہے اسے لے جا کر زنجیریں پہنا دو۔ آئندہ اگر یہ میرے راستے میں آئی تو پھر تم سب سے جواب طلب کروں گا۔''

سردار کا حکم سنتے ہی کئی خدمت گار آگے بڑھے اور اس پاگل عورت کو کھینچتے ہوئے ایک طرف لے گئے۔ نرسنگا نے اپنا سفر جاری رکھا۔ عورت کی خوفناک چیخیں دور تک سنائی دے رہی تھیں۔

''نرسنگا! تجھ پر دیوتاؤں کا قہر ٹوٹے۔''

''ٹھاکر! لوگ اپنی اوقات بھول جاتے ہیں۔'' اچانک نرسنگا کامران سے مخاطب ہوا۔ یہ نیچ عورت چاہتی ہے کہ میں اس سے محبت کروں اور پھر ساری دنیا کے سامنے اسے اپنی بیوی تسلیم کر لوں۔ جیسے سردار نرسنگا کا دل نہ ہوا' دیوالی کا کوئی کھلونا ہو گیا کہ لوگ بازار گئے اور خرید لائے۔''

شجاع الدین کامران کیا جواب دیتا' بس خاموشی سے نرسنگا کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔

پھر کامران نے دیکھا کہ گھنے جنگل کا علاقہ ختم ہوگیا اور سامنے دور تک ایک وسیع و عریض میدان پھیلا ہوا تھا جہاں بہت سے وحشی نوجوان جمع تھے۔ کوئی شہسواری کی مشق کر رہا تھا اور کوئی شمشیر زنی۔ نرسنگا کو دیکھ کر ہر شخص اپنی مصروفیات بھول گیا اور پھر سب کے سب سجدے میں چلے گئے۔

نرسنگا نے انتہائی باوقار انداز میں ان نوجوانوں سے شجاع الدین کامران کا تعارف کراتے ہوئے کہا......

''کل سے ہمارا ٹھاکر بھی تم لوگوں کے ساتھ شریک جنگ ہوجائے گا۔''

''آج کیوں نہیں سردار؟'' کامران نے حیرت زدہ ہوکر کہا۔

''آج میں تیری آمد کی خوشی میں جشن منانا چاہتا ہوں ٹھاکر!'' نرسنگا نے واپس لوٹتے ہوئے کہا...... ''آج ان بدبختوں نے میرا دن تباہ کر کے رکھ دیا۔ پتا نہیں سویرے کس کا منہ دیکھا تھا؟''

''سردار! تو خوب جانتا ہے کہ مجھ سے یہ دن کاٹے نہیں کٹ رہے ہیں۔'' شجاع الدین کامران نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

''ہاں! مجھے اندازہ ہے۔'' نرسنگا کی آواز میں ٹھہراؤ تھا...... ''بس! ایک رات ہی تو بیچ میں ہے' کل تیرے فولادی بازو ہوں گے' تلواروں کی بجلیاں ہوں گی اور زمین کا سینہ چیرتے ہوئے گھوڑوں کے سم ہوں گے۔''

شجاع الدین کامران مزید کچھ نہ کہہ سکا اور نرسنگا کے ساتھ اس کی جھونپڑی میں لوٹ آیا۔

پھر نرسنگا کے حکم پر شراب اور رقص کی محفل سجائی گئی۔ اس ہنگامے میں نرسنگا کے تمام معتمد محافظ اور ساتوں جادوگر شریک تھے۔ رقص و شراب کا یہ ہنگامہ بہت دیر تک جاری رہا۔ جب سارے لوگ نشے میں ڈوب گئے تو نرسنگا نے جادوگروں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''اپنے گیان کی تہ میں اتر جاؤ اور تلاش کرو کہ سردار نرسنگا کی اس محفل میں اس کا کوئی دشمن تو موجود نہیں؟''

عجیب و غریب سوال تھا۔ تمام لوگ کانپ کر رہ گئے۔ خود کامران بھی بہت زیادہ پریشان نظر آرہا تھا۔ اگر کسی جادوگر نے غلطی سے اس کا نام لے دیا تو کیا ہوگا؟ کامران نے سوچا۔ کیا اس کی لاش بھی نانکاری کی طرح بے شمار تیروں کا ہدف بن جائے گی؟ کامران فطرتاً ایک بہادر نوجوان تھا لیکن اس صورتحال نے اسے بھی ہراساں کر دیا تھا۔ وہ گھبرا کر جادوگروں کی طرف دیکھنے لگا' جن کی آنکھیں بند تھیں اور ہونٹ تیزی سے گردش کر رہے تھے۔

❊❊❊

سردار نرسنگا کی محفل کیف ونشاط پر گہرا سکوت طاری تھا۔ جس شراب نے کچھ دیر پہلے منتشر دماغوں کو سکون بخشا تھا' اب وہی دماغ آندھیوں کی زد میں تھے اور ہر شخص اپنی جگہ لرز رہا تھا کہ پتا نہیں کب جادوگروں کے ہونٹوں کو جنبش ہو اور وہ نرسنگا کی نظروں میں مجرم قرار پائے۔

ساتوں جادوگر اپنے خیالات میں ڈوبے ہوئے تھے اور نرسنگا کی مجلس میں شریک ہر فرد اپنے آپ کو مجرم سمجھ رہا تھا۔ یکا یک جادوگروں کے ہونٹ کانپنے لگے۔ تمام ساحر بیک زبان کہہ رہے تھے۔

''نہیں سردار! اس محفل میں تیرا کوئی دشمن نہیں۔ یہ سب تیرے وفادار ہیں' آخری سانس تک تیری عظمتوں کے گیت گانے والے۔ جہاں تیرا پسینہ گرے گا یہ لوگ وہاں اپنا خون بہا دیں گے۔''

جادوگر خاموش ہوئے تو محفل کا رنگ ہی بدل گیا۔ رکی ہوئی سانسیں بحال ہوگئیں اور چہروں کی گمشدہ تازگی لوٹ آئی۔ خون اپنی اصلی حالت میں گردش کرنے لگا اور مرجھائے ہوئے ہونٹ مسکرانے لگے۔

''ایک بار پھر سوچ لو کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟'' سردار نرسنگا نے تیز آواز میں جادوگروں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''ہندوستان کے عظیم ساحرو! میں تمہارا بہت احترام کرتا ہوں۔ تم بخوبی جانتے ہو کہ میں نے تمہارے علم کے خلاف کبھی کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ تم نے مجھے روکا تو میں رک گیا اور اپنا بڑے سے بڑا فائدہ بھی تمہارے فیصلے پر قربان کر دیا۔''

''سردار نرسنگا بھی خوب جانتا ہے کہ ہمارے علم نے اسے کبھی دھوکہ نہیں دیا۔'' جادوگر پرجوش لہجے میں بول رہے تھے۔ ''ہم نے کبھی کوئی غلط پیش گوئی نہیں کی۔ اس جنگل میں رہنے والے ایک ایک شخص کو معلوم ہے کہ ہم نے تیری حکومت کو برقرار رکھنے کیلئے کتنی ریاضت کی ہے...... اور کتنے طوفانوں کا سفر دشمنوں کی طرف موڑا ہے۔ دیوتا جو کچھ کہتے ہیں وہ ہم تیرے روبرو بیان کر دیتے ہیں...... اس وقت بھی دیوتاؤں کی یہی سرگوشیاں جاری ہیں۔ آکاش پر رہنے والوں نے ہمیں بتایا ہے کہ یہاں تیرا کوئی بدخواہ موجود نہیں۔ ہمارا گیان سچا ہے نرسنگا! اس پر شک نہ کر کہ بدگمانی انسان کو گنہگار بنا دیتی ہے۔ ہم دیوار کے پیچھے دیکھنے میں کبھی غلطی نہیں کرتے۔''

نرسنگا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی سرخ آنکھیں اپنے بائیں جانب بیٹھے ہوئے شجاع الدین کامران پر مرکوز تھیں' نرسنگا کے دوسرے خدمت گار بھی سانسیں روکے ہوئے کامران کو دیکھ رہے تھے۔ یکا یک سردار نے اپنی گردن کا زاویہ بدلا اور جادوگروں سے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

''تم سچ کہتے ہو گیانیو! میں نے تم پر کبھی شک نہیں کیا' مگر تمہارا سردار جس انداز کی زندگی بسر کر رہا ہے' اس میں اپنے سائے پر بھی شک کرنا ضروری ہے۔'' نرسنگا کے لہجے میں بڑی تلخی پوشیدہ تھی...... ''نا لکاری کی حرکت نے میرے اعتبار میں شگاف ڈال دیا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ یہ شگاف بڑھتا چلا جائے...... اور پھر وہ سے بھی آجائے کہ میں

وشواس کے شبد کو آگ لگا دوں اور مجھے اپنے ایک ایک ساتھی سے نفرت ہو جائے۔"

"نہیں نرسنگا! ایسا کبھی نہیں ہوگا۔" تمام ساحروں نے بآواز بلند کہا...... "نا لکاری جیسے کتے چیختے چیختے مر بھی جائیں تو شیر کی نیند میں خلل نہیں پڑ سکتا۔ تو اس جنگل کا ایسا حکمران ہے کہ تیرے اقتدار کو کبھی کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوگا۔ موسم آتے جاتے رہیں گے اور گرد و نواح کی فضائیں ایک ہی نعرے سے گونجتی رہیں گی...... "جے نرسنگا۔"

جیسے ہی جادوگروں کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے تمام خدمت گاروں نے بھی مخصوص نعرہ بلند کیا اور سردار نرسنگا کے سامنے سجدے میں چلے گئے۔

نرسنگا کے ہونٹوں کی گمشدہ مسکراہٹ لوٹ آئی...... "گیان امر ہے......" وہ بے اختیار ہو کر چیخا۔ "گیان امر ہے......" نرسنگا نے ستائشی نظروں سے جادوگروں کی طرف دیکھا اور اپنے خدمت گاروں کو حکم دیتے ہوئے کہا۔ "میرے گیانیوں کا منہ سونے چاندی سے بھر دو......"

"نہیں سردار! ہمیں تیری محبت کے سوا کچھ نہیں چاہئے۔" یہ کہہ کر ساتوں جادوگر اٹھ کھڑے ہوئے۔ نشے کی زیادتی سے ان کے قدم لڑکھڑا رہے تھے...... "دیوتا تیرے اقتدار کو یہاں تک وسعت دیں کہ تو سارے ہندوستان پر چھا جائے......"

جادوگر ڈگمگاتے قدموں سے باہر کمرے میں چلے گئے۔

پھر نرسنگا نے شجاع الدین کامران کی طرف دیکھا...... "اب تم اپنے عشرت کدے کی طرف لوٹ جاؤ چھوٹے ٹھاکر کہ شام ہونے والی ہے......"

"سردار! تو نے میرا پورا دن تباہ کر دیا۔" کامران کے لہجے میں بیزاری تھی۔

"نہیں ٹھاکر! مستقبل کے فیصلے ایک دن میں نہیں ہوتے......" نرسنگا مسکرایا...... "آنے والی صبح بہت زیادہ روشن ہوگی۔ بس اب جاؤ یہ کہہ کر نرسنگا اپنے خدمت گار کھیما سے مخاطب ہوا...... "ٹھاکر کو بڑے مندر تک پہنچا دے۔"

شجاع الدین کامران اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر تمام خدمت گاروں نے حیرت سے وہ منظر دیکھا کہ ان کا سردار ایک اجنبی نوجوان کو جھونپڑی کے دروازے تک رخصت کرنے کیلئے آیا۔ نرسنگا اس وقت تک کھڑا رہا جب تک شجاع الدین کامران اور کھیما اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئے۔

پھر اچانک ایک خدمت گار نے سردار سے پوچھا...... "کیا تیرے غلام چھوٹے ٹھاکر پر اعتبار کر سکتے ہیں؟"

نرسنگا قہقہہ مار کر ہنسا...... "کیا تم اپنے سردار کو احمق سمجھتے ہو؟"

ندامت سے خدمت گاروں کے سر جھک گئے۔

"میں نے تم سب کے سامنے ان لوگوں سے چھوٹے ٹھاکر کے بارے میں پوچھا تھا جن کا علم کبھی دھوکہ نہیں کھاتا۔" نرسنگا نے یکا یک سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا...... "مجھے تم پر نہیں، ٹھاکر پر شک تھا...... مگر گیانیوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ اس کے دل میں میری طرف سے کوئی میل نہیں ہے۔ اس کا ذہن صاف ہے......"

"نرسنگا سچ کہتا ہے۔" خدمت گاروں نے گردنیں جھکائے ہوئے کہا۔

"ویسے تمہارے سردار کی نظریں کبھی دھوکہ نہیں کھاتیں۔" نرسنگا نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا...... "وہ ایک بہادر نوجوان ہے۔ صاف اور کھرا...... اس میں کہیں کوئی لچک نہیں......"

***

شجاع الدین کامران اسی پر پیچ راستے سے گزر کر بڑے مندر پہنچا تو کرشن راؤ پجاری رام سروپ کے کمرے میں اس کا منتظر تھا' ٹھاکر نے مکمل منافقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا......"جنگل کی آزاد فضا میں جا کر تو نے کیا محسوس کیا کامران؟"

"آج میں بہت خوش ہوں ٹھاکر!" کامران نے بھی مصلحت کی ہواؤں کی طرف اپنا رخ کر لیا......"پوری زندگی میں یہ میری خوشی کا پہلا دن تھا۔" کامران نے کسی اور زاویے سے حقیقت بیان کی تھی' مگر لفظوں کے ابہام نے کرشن راؤ کو فریب میں مبتلا کر دیا۔

"سردار نرسنگا نے تیری خاطر و مدارت کی؟" بوڑھے راجپوت نے سوال کیا۔

کامران نے تمام تفصیلات بیان کر دیں' مگر ناخوشگوار واقعات کو چھپا لیا۔

کچھ دیر کیلئے کرشن راؤ کے چہرے میں تناؤ پیدا ہو گیا اور جھریاں کسی قدر کم نظر آنے لگیں......"تجھے ٹھاکر کی طاقت کا اندازہ ہوا؟"

"خوب!" کامران نے زندہ دلی کے ساتھ جواب دیا......"اس جنگل میں ہر طرف ٹھاکر ہی کا راج ہے۔ کامران نے سر سے پاؤں تک مصلحت کی چادر اوڑھ لی تھی اور وہ ایک مخصوص نقاب کے پیچھے سے بول رہا تھا۔

"میرا راج تیرا راج ہے۔" کرشن راؤ پہلے سے زیادہ وارفتہ نظر آنے لگا تھا......"ایک قائم خان کیا؟ کل تیرا ہر دشمن راکھ کا ایک ڈھیر نظر آئے گا اور تیرے غصے کی آگ بھڑکتی ہی رہے گی......" کرشن راؤ بڑی ذہانت سے شجاع الدین کامران کو تباہی کے راستے پر لے جانے کی کوشش کر رہا تھا......"بیٹے! اب تو اپنے کمرے میں جا کر آرام کر۔ میں بھی تھک گیا ہوں۔ بس تیرے ہی انتظار میں بیٹھا تھا......"

کامران جانے کیلئے مڑا تو کرشن راؤ نے اسے دوبارہ مخاطب کیا۔

"کیا نرسنگا نے تجھے شمشیر زنی کی مشق کرائی؟"

"کل سے میری تربیت کا آغاز ہوگا......" کامران نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا......" آج سردار نے میرے سامنے اپنے ہتھیاروں کی نمائش کی تھی۔ میں نے انہیں چھونا چاہا' مگر نرسنگا ٹال گیا......"

"کوئی بات نہیں۔ دھیرج رکھ کر' دھیرے دھیرے ہتھیار چلانا بھی سیکھ جائے گا۔" کرشن راؤ مسکرانے لگا۔

کامران مڑا اور پجاری رام سروپ کی نگرانی میں پیچیدہ راستہ طے کرنے لگا۔

اب کرشن راؤ تنہا تھا اور اس کا جھلسا ہوا چہرہ ایک ناقابل بیان خوشی کی حرارت سے روشن تھا۔ کامران کی غیر حاضری میں ٹھاکر نے دیوداسی شکنتلا کو اپنے کمرے میں طلب کیا تھا اور اس سے گزرنے والی رات کی کیفیت کے بارے میں پوچھا تھا۔

شکنتلا جان بوجھ کر جھوٹ بولتی رہی تھی اور اس نے ٹھاکر کو یقین دلا دیا تھا کہ کامران اپنی دنیا سے مکمل طور پر باغی ہو چکا ہے۔ ابھی اسے عورت اور شراب سے کوئی دلچسپی نہیں' مگر وہ دن بہت قریب ہے جب اس کے قدم لڑکھڑا جائیں گے اور وہ اوندھے منہ زمین پر گر جائے گا۔

کرشن راؤ شکنتلا کی زبانی یہ انکشاف سن کر بہت خوش ہوا تھا اور اس سے وحشیانہ انداز میں کہا تھا۔

"دیوداسی" تو بڑی گیانی عورت ہے۔ حالات کی آگ نے کامران کے دماغ کو کھوکھلا کر کے رکھ دیا ہے۔ اب اس تپتے ہوئے لوہے پر اسے الفاظ کی ضرب لگا۔ پھر سے ہندو دھرم کی طرف موڑ دے۔ اگر تیری فتنہ گری کے سبب کامران اپنے خاندانی راستے پر لوٹ [illegible] در کی جانب منہ کیا۔ گردن میں

''جنیو'' (مذہبی ڈوری) پہن کر ماتھے پر تلک (قشقہ) سجالیا اور اس کا اٹھا ہوا سر دیوتاؤں کے قدموں میں جھک گیا تو میں تیرے پیروں کی زنجیریں کاٹ کر تجھے آزاد کردوں گا۔''

''ایسا ہی ہوگا مہاراج!'' شکنتلا اسے مطمئن کرکے واپس چلی گئی تھی۔

اب کرشن راؤ نے شجاع الدین کامران کے چہرے پر نرمی کے آثار دیکھے تو اسے اپنے خوابوں کی تعبیر سامنے نظر آنے لگی۔

''سعد یہ خانم میں تجھ پر تیرے خدا کی زمین تنگ کردوں گا۔''

یہ کہہ کر کرشن راؤ مندر سے نکلا اور اپنے گھر کی طرف چلا گیا۔

❊❊❊

دیوداسی شکنتلا رات کا کھانا لے کر آئی تو کامران نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ شکنتلا کی شوخی رخصت ہو چکی تھی اور وہ بہت زیادہ اداس نظر آرہی تھی' اس نے خاموشی سے کھانا رکھا اور باہر چلی گئی۔ کامران کو شکنتلا کی یہ ادا بڑی عجیب سی لگی تھی۔

کھانے کے دوران وہ شکنتلا کے غیر معمولی سکون کے بارے میں سوچتا رہا۔ جو عورت کل رات تک اس سے التجا کر رہی تھی کہ وہ سردار نرسنگا کے قریب بھی نہ جائے' آج اسی کی زبان پر مہر خاموشی تھی۔ دیوداسی نے رسماً بھی نہیں پوچھا کہ آج اس نے سارا دن کہاں گزارا ہے۔ شکنتلا کا یہ طرز عمل کامران کیلئے بہت زیادہ حیرت انگیز تھا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ آخر دیوداسی میں اتنی بڑی تبدیلی کس طرح نمایاں ہوئی؟ کامران نے اس کے متعلق جتنا بھی سوچا وہ اسی قدر الجھتا چلا گیا۔

ناگہاں کامران کو اپنے جارحانہ سلوک کا احساس ہوا۔ کل رات اس نے شکنتلا کو بری طرح جھڑک دیا تھا۔ اس تکلیف دہ سلوک کے بعد کوئی اجنبی عورت کس طرح اس کے قریب آسکتی تھی۔ کامران بے چین سا نظر آنے لگا۔

پھر جب شکنتلا کھانے کے برتن اٹھا کر واپس جانے لگی تو غیر ارادی طور پر کامران نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''تم نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ میں دن بھر کہاں رہا؟'' خلاف توقع کامران کے لہجے میں نرمی تھی اور خود اسے بھی اپنے بدلتے ہوئے انداز پر بڑا تعجب ہوا تھا۔

شکنتلا ٹھہر گئی اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی اجنبی مرد نے پیچھے سے اس کا دامن پکڑ لیا ہو۔

''میں ایسے سوال دریافت کرنے کا حق نہیں رکھتی۔'' شکنتلا نے سرسری لہجے میں جواب دیا۔ اس کی آواز سے کسی خاص تاثر کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔

''کل رات تمہیں یہ کہنے کا حق کس نے دیا تھا کہ میں سردار نرسنگا کے قریب بھی نہ جاؤں۔'' کامران نے اسی کے الفاظ سے دیوداسی کی گرفت کرتے ہوئے کہا۔

''وہ کچھ نہیں تھا ٹھاکر! بس کچھ دیر کیلئے جیون کی ندیا میں ایک باڑھ آئی تھی' گزر گئی۔'' اچانک شکنتلا کے سینے میں خلش' درد جاگ اٹھی تھی' مگر اس نے فوراً ہی درد کے سفینے کو دل میں گہرائی میں ڈبو دیا۔ آخر انسانی زبان ہے ٹھاکر! لڑکھڑا بھی جاتی ہے۔ ہونٹوں کی ایک لغزش کا ذکر ہی کیا۔

''تم مجھے ٹھاکر کہہ کر نہ پکارا کرو دیوداسی!'' کامران نے یہ لفظ کرشن راؤ' نرسنگا' رام سروپ' برج موہن اور دوسرے ہندوؤں کی زبان سے [illegible] گئے تھے۔ خود شکنتلا بھی بارہا اسے اسی

لقب سے پکار رہی تھی، مگر اس وقت وہ احتجاجاً چیخ اٹھا تھا۔
''کیوں؟'' شکنتلا غیر متوقع طور پر مسکرانے لگی۔ ''پھر کس نام سے پکاروں؟''
''میرا نام شجاع الدین کامران ہے۔'' اس نے پرزور لہجے میں کہا۔ ''ٹھاکر کے لفظ سے ہندو مذہب کی بو آتی ہے۔''
''اگر یہ خطاب اتنا ہی ناگوار ہے تو پھر ایک مسلمان زادہ ہندوؤں کی عبادت گاہ میں کیا کرنے آیا ہے؟''
دیوداسی کا سوال اس قدر قاتل تھا کہ شجاع الدین کامران تڑپ اٹھا۔ اسے اپنی شہ رگ کٹتی ہوئی محسوس ہوئی۔
''جس شخص کو ٹھاکر کے لفظ سے اتنی نفرت ہے' وہ سردار نرسنگا سے ملنے کیوں گیا تھا؟ کیا نرسنگا مسلمان ہے؟''
شکنتلا نے دوسرا سوال کیا' جو پہلے سوال کی طرح سفاک تھا۔
کامران دیوداسی کے اس حربے کو برداشت نہ کرسکا۔ ''میں وہاں جانے کیلئے مجبور ہوں کہ نرسنگا سے ملے بغیر میں انتقام نہیں لے سکتا'' کامران کی آواز کسی چیخ سے مشابہ تھی۔ وہ اپنی آوز پر قابو نہ رکھ سکا۔
''کیا کسی ہندو سے انتقام لینا ہے؟'' اگرچہ دیوداسی صورتحال سے پوری طرح باخبر تھی' لیکن وہ قصداً کامران کو چھیڑ رہی تھی کہ شاید اس طرح تکلف کی دیوار گر جائے اور وہ ایک جذباتی نوجوان کو وادی مرگ کی طرف جانے سے روک سکے۔
''نہیں! کوئی ہندو نہیں! میرا حقیقی ماموں قائم خان راجپوت ہے۔'' شجاع الدین کامران مکمل طور پر مشتعل ہوچکا تھا۔
''بڑی عجیب بات ہے۔'' شکنتلا کی مسکراہٹ پہلے سے زیادہ گہری ہوگئی تھی۔'' میں نے آج تک نہیں سنا کہ ایک مسلمان نے دوسرے مسلمان کو شکست دینے کیلئے کسی ہندو سے مدد لی ہو۔'' یہ کہتے کہتے دیوداسی بہت زیادہ سنجیدہ نظر آنے لگی تھی۔ ''جو طریقہ تم نے اختیار کیا ہے وہ تو ہندوؤں کا پیشہ ہے۔''
پہلے میں نے اپنوں ہی سے انصاف مانگا تھا' مگر جب ان کے دروازے بند ہوگئے تو میری نظریں غیر کے جھروکوں پر جم گئیں۔'' شجاع الدین کامران بہت زیادہ جذباتی ہو رہا تھا۔
''اگر غیرت مند ہو تو اپنے دشمن سے تنہا لڑو۔ بھیک میں مانگے ہوئے بازو اور قرض لی ہوئی شمشیریں کبھی کام نہیں آتیں۔'' شکنتلا نے بہت سوچ سمجھ کر کامران کے جذبات پر ضرب لگائی کہ شاید یہ طعنہ زنی اسے سیدھے راستے پر لے جائے۔
''قائم خان کی دیواریں بہت اونچی ہیں۔ میری پہنچ سے بہت دور۔'' کامران درد کی شدت سے کراہنے لگا۔ مجھے اس کی دیواروں تک پہنچنے کیلئے کمند چاہئے۔ وہ مسلح پہریداروں کے نرغے میں رہتا ہے' مجھے اس کے حصار کو توڑنے کیلئے طاقتور ساتھی چاہئیں۔ اگر میں تنہا اس کی عالیشان حویلی میں داخل ہوسکتا تو خدا کی قسم! کبھی کرشن راؤ کے مندر میں قدم نہ رکھتا۔''
''وہ طاقتور ساتھی کہاں سے آئیں گے؟'' شکنتلا نے ایک اور سوال کیا۔
''ٹھاکر کرشن راؤ اور سردار نرسنگا فراہم کریں گے۔'' کامران نے پورے یقین کے ساتھ کہا۔
''کیا ان سے تمہارا کوئی رشتہ ہے؟'' شکنتلا بڑی احتیاط سے جلتے ہوئے انگاروں کو کرید رہی تھی۔
''رشتہ نہیں' یہ ایک تجارت ہے۔'' دیوداسی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ضرورت مندوں کو نقصان کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا' آج کی تجارت تو سود خوروں کا کھیل ہے' بڑے گھاٹے میں رہو گے ٹھاکر! جان تک ہار جاؤ گے۔

چپ چاپ لوٹ جاؤ۔ جب طاقت حاصل ہوجائے تو انتقام کا شوق بھی پورا کر لینا۔'' شکنتلا نے مضحکہ اڑانے والا انداز اختیار کر لیا تھا کہ شاید کامران کے دل پر چوٹ پڑے اور وہ جوش غضب میں اپنے گھر کی طرف لوٹ جائے۔

مگر اس جذباتی نوجوان پر دیوداسی کی باتوں کا الٹا اثر ہوا۔ شدت غضب نے اس کے حواس چھین لئے اور وہ آتش فشاں کے لاوے کی طرح ابل پڑا۔

''شکنتلا! میرے زخموں پر مزید نشتر نہ چھیر کہ میں تیرے اندازے سے بھی زیادہ جراحتوں کا شکار ہوں۔ مجھ پر اتنی طعنہ زنی نہ کر کہ میں پاگل ہوجاؤں اور دہلی کا ہر بچہ اپنے ہاتھوں میں پتھر اٹھا لے۔'' شجاع الدین کامران ہذیانی انداز میں بول رہا تھا...... ''کل ٹھاکر سے ملاقات ہونے دے' پھر میں تیرا آزار بھی ہمیشہ کیلئے ختم ہوجائے گا۔ میں کرشن راؤ سے کہہ دوں گا کہ میرے لئے کسی مرد خدمت گار کو بھیج دے...... اور اگر اس کے یہاں عورتوں کے سوا کوئی ملازم ہی نہیں ہے تو پھر کسی ایسی دیوداسی کو مقرر کر دے جو اندھی اور گونگی ہو۔''

شکنتلا کامران کی وحشیانہ کیفیت دیکھ کر لرز گئی۔ اس نے دوبارہ برتن سمیٹے اور تیز قدموں سے باہر نکل گئی۔

❋❋❋

دیوداسی کے جاتے ہی کامران کے اعصاب آہستہ آہستہ سکون پانے لگے۔ جذبات کا ابال بھی رفتہ رفتہ ختم ہوگیا اور اب وہ صاف ذہن سے سوچنے کے قابل ہوگیا تھا۔ یہ دوسرا موقع تھا جب اس نے شکنتلا کی ہمدردانہ گفتگو کے جواب میں انتہائی جارحیت کا رویہ اختیار کیا تھا۔ اسے اپنے اس سلوک پر ہلکی سی ندامت بھی تھی' مگر وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی شخص اسے یہاں سے واپس جانے کیلئے مشورہ دے' پھر ایک اجنبی عورت تو اس کی حقدار ہو ہی نہیں سکتی تھی کہ وہ اس کے جلتے ہوئے ارادوں پر اپنی نازک باتوں کا پانی ڈال کر انہیں بجھانے کی کوشش کرے۔ شجاع الدین کامران کچھ دیر تک اپنے خیالات سے الجھتا رہا اور پھر بستر پر دراز ہوگیا۔ مندر سے جنگل تک کے طویل سفر نے اسے تھکا دیا تھا' اس لئے وہ جلد از جلد خوابوں کے جزیرے میں چلا جانا چاہتا تھا۔

لیٹے لیٹے اچانک اس کی نظروں کے سامنے وہ تاریک جنگل ابھر آیا جہاں سردار نرسنگا کی حکمرانی تھی۔ اپنے علاقے میں نرسنگا کسی سلطان سے بھی زیادہ طاقتور نظر آتا تھا کہ لوگ خوف و دہشت سے اس کے آگے سجدہ ریز ہوجاتے تھے۔ پھر کامران کے خیالات نے ایک اور کروٹ لی۔ پاگل عورت کی دردناک حالت کو یاد کر کے ایک لمحے کیلئے کامران لرز سا گیا۔ کیا واقعتاً وہ عورت نرسنگا کی بیوی تھی جسے سردار نے ٹھکرا دیا تھا۔

پھر امرپالی کا دلکش سراپا اس کے تصورات کے پردے پر ابھر آیا۔ امرپالی کا حسن دلکش بھی تھا اور دلفریب بھی۔ پاگل عورت اور امرپالی میں کوئی مناسبت ہی نہیں تھی۔ شاید اسی وجہ سے نرسنگا نے پاگل عورت کی طرف سے منہ پھیر لیا تھا...... کامران کے خیالات منتشر ہونے لگے...... ''کیا نرسنگا عورتوں کا کھلاڑی ہے جو اپنی خواہشوں کی سیج پر نت نئے جسم سجاتا رہتا ہے؟ وہ عورت کسی صدمے سے خود پاگل ہوگئی یا نرسنگا کے جبر وتشدد نے اسے دیوانہ کر دیا؟'' بیک وقت کئی سوال پوری شدت کے ساتھ کامران کے ذہن میں گردش کر رہے تھے۔ ابھی وہ ان سوالوں کا جواب تلاش کرنے بھی نہیں پایا تھا کہ اس کی آنکھوں کے سامنے ناکاری کی تیروں سے چھدی ہوئی لاش گھوم گئی...... اور اس لاش کے ساتھ ہی اسے نرسنگا کے الفاظ یاد آگئے کہ جنگل سے فرار کا راستہ غار کی طرف جاتا ہے۔

''پھر کیا ہوگا؟'' شجاع الدین کامران اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس خیال نے اسے وحشت میں مبتلا کر دیا تھا۔ قائم خان راجپوت سے انتقام لینے کے بعد کیا وہ اپنی دنیا میں واپس لوٹ سکے گا؟ یہ سوال بہت فکرانگیز تھا' مگر کچھ دیر وہ مطمئن نظر آنے لگا۔

"میں کوئی نا نکاری نہیں کہ سردار نرسنگا کے راستے کی رکاوٹ بن جاؤں اور پھر میرے مردہ جسم کو بھی کسی درخت سے لٹکا دیا جائے......" شجاع الدین کامران نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ "میں سردار نرسنگا کا وفادار رہوں گا اور اپنے کام سے کام رکھوں گا' پھر مجھے کیا خطرات درپیش ہو سکتے ہیں؟ کچھ بھی نہیں۔ کامران خود ہی سوال کر رہا تھا اور خود ہی جواب دے رہا تھا...... "زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ مجھے کرشن راؤ کے کاروبار کی ذمہ داری برداشت کرنی ہوگی۔ پھر کوئی مناسب موقع دیکھ کر اس سے بھی پیچھا چھڑا لوں گا۔

کامران کی سادہ لوحی نے اپنے مسائل کا آسان حل تلاش کر لیا تھا۔ وہ دوبارہ بستر پر دراز ہو گیا اور خیالات کی دنیا میں قائم خان راجپوت کو اپنے قدموں پر جھکتا ہوا محسوس کرنے لگا۔ قائم خان کا تکلیف دہ خیال ابھرا تو کامران کے دل و دماغ جل اٹھے...... مگر ایک خیال سے ایک دوسرے خیال کی کونپل پھوٹی...... پھر یہ نرم و نازک اور سنہری کونپل بڑھتے بڑھتے ایک سرسبز شاخ بن گئی۔ ایسی شاخ جو رنگ رنگ پھولوں کے بوجھ سے لچک رہی تھی اور جن پھولوں کی خوشبو سے کامران کی روح تک مہکنے لگی تھی۔ یہ یاسمین خان کا تصور تھا جس نے درد کے صحرا میں یادوں کے پھول کھلائے تھے...... اور ان پھولوں سے ٹپکتی ہوئی شبنم نے آرزوؤں کے شعلہ سوزاں کو اس حد تک سرد کر دیا تھا کہ بس دھیمی دھیمی آنچ باقی رہ گئی تھی...... اور وہ آنچ بڑی خوشگوار تھی جس میں کامران جل جانا چاہتا تھا۔

اچانک اس کے خیالات کی دنیا زیر و زبر ہو کر رہ گئی' تصورات کے نہاں خانے میں جہاں یاسمین محوخرام تھی' اسی مقام سے ایک اور پیکر ابھرا۔ یہ سعدیہ خانم تھی جس کا پورا جسم زخموں سے بھرا ہوا تھا اور آنکھوں سے موج خوں بہہ رہی تھی۔ کامران وحشت زدہ انداز میں ایک بار پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کامران کی سماعتیں چیخوں کے شور سے گونجنے لگیں...... "مجھے چھوڑ کر نہ جائیے!" یہ سعدیہ خانم کی آخری فریاد تھی جسے کامران نے سننے سے انکار کر دیا تھا۔ خیالات کا سارا کاروبار درہم برہم ہو گیا۔

"کیا تیری بوڑھی ماں پھر کسی سود خور کی ملازمت کر رہی ہوگی؟" کامران نے اپنے آپ سے پوچھا۔

وہ اس سے آگے نہ سوچ سکا۔ سینے میں درد کی ایک تیز لہر اٹھی۔ کامران نے اسی وقت کرشن راؤ کے زندان سے نکل جانا چاہا' مگر حصار بہت مضبوط تھا۔ پھر اسے اہل خاندان کا سلوک یاد آیا۔ محلے والوں کی طعنہ زنی کے تیز نشتر اپنے جسم پر محسوس ہوئے اور پھر بیشمار آوازیں اس کا تعاقب کرنے لگیں۔

"وہ جا رہا ہے غدار باپ کا ناکارہ بیٹا! معاشرے کا ناسور...... ایک سزا یافتہ مجرم۔"

یاسمین خانم کے جانفزا تصور نے جس آگ کو بجھانے کی کوشش کی تھی وہ دوبارہ بھڑک اٹھی۔ کامران دیوانہ وار کمرے میں ٹہلنے لگا۔

"ماں! تمہیں صبر کرنا ہوگا۔" کامران اپنی ماں سے غائبانہ مخاطب تھا...... "جس طرح آپ نے شوہر کی موت کو برداشت کیا ہے' اسی طرح بیٹے کی لاش پر بھی ماتم کرنا ہوگا۔ رائے نعیم الدین ذیشان نے بھی اس لئے موت قبول کی تھی کہ وہ سر جھکا کر مجرمانہ زندگی گزارنا نہیں چاہتے تھے...... اور شجاع الدین کامران نے بھی وقت کے عذابوں کو اس لئے گلے لگا لیا ہے کہ تمہاری آنکھوں کا پانی اس کے بدن کے داغوں کو نہیں دھو سکا۔ اب خون کا غسل ہی ان دھبوں کو صاف کر سکے گا۔

کامران نے خود ہی اپنی واپسی کا دروازہ بند کر دیا تھا...... مگر وہ سعدیہ خانم کو کسی کی مزدوری کرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ پھر اس کا کیا حل ہے؟ کامران نے اپنے آپ سے پوچھا...... "ماں اس کی حاصل کردہ رقم کو قبول نہیں کریں گی اور وہ انہیں اپنی آمدنی کا ذریعہ [illegible]

کامران کے پاس اس مسئلے کا کوئی حل موجود نہیں تھا۔ وہ تقریباً آدھی رات تک کمرے میں ٹہلتا رہا...... اور پھر اچانک اس کے تاریک ذہن میں ایک برق سی لہرائی۔

''اگر کمال الدین احمد میری بات مان گیا تو بڑی آسانی سے یہ الجھن دور ہو جائے گی۔'' کامران نے زیرلب کہا اور پھر اس کی آواز تیز ہو گئی...... ''وہ مانے گا کیسے نہیں؟ دوستی کے بلند و بانگ دعوے کرتا ہے۔ پھر انکار کی کیا گنجائش ہے؟''

''خون کا رنگ بدل چکا' عزیز اجنبی ہو گئے' کمال الدین احمد کا کیا اعتبار؟'' تجربات نے اسے ماضی کا آئینہ دکھانے کی کوشش کی۔

''قید خانے میں اس نے کہا تھا کہ اگر وقت پڑا تو وہ میری بے گناہی پر گواہی دے گا۔ یہ آخری شخص ہے' اسے بھی آزمالے کامران! ایک معمولی کام ہے۔ تو اس سے جان کا نذرانہ تو طلب نہیں کر رہا ہے۔''

اس کے ساتھ ہی کامران کے ذہن کا وہ بوجھ اتر گیا جس نے اسے تھکا ڈالا تھا۔

''اب میں پورے اطمینان سے اپنی جنگ لڑ سکوں گا۔'' کامران نے پتھر کی دیوار پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ''میں کیا' دنیا کا کوئی شخص بھی دو محاذوں پر نہیں لڑ سکتا۔ اگر میں بھوک سے نڈھال اپنی ماں کی طرف بار بار دیکھتا رہا تو دشمن عقب سے مجھ پر وار کر دیں گے۔ میری نظروں کو ایک ہی نقطے پر مرکوز رہنا چاہئے۔ اگر کمال الدین احمد راضی ہو گیا تو پھر میں ایک محاذ کی طرف سے مطمئن ہو جاؤں گا۔ اس کے بعد......''

کامران بہت زیادہ پرجوش نظر آنے لگا...... ''میں آ رہا ہوں قائم خان! میں کچھ دن اور...... اپنی دیواریں مزید بلند کر لے کہ میری دسترس سے قلعے کی فصیل بھی محفوظ نہیں رہ سکے گی۔''

ابھی کمرے میں شجاع الدین کامران کے الفاظ کی گونج باقی تھی کہ سامنے کی دیوار میں شگاف نمایاں ہو گیا۔ کامران سنبھل گیا۔ چند لمحوں بعد اس خفیہ راستے سے دیوداسی شکنتلا نمودار ہوئی۔

وہ کامران کو اس حالت میں دیکھ کر گھبرا سی گئی۔ ''آپ ابھی تک نہیں سوئے شجاع الدین کامران!'' شکنتلا کا لہجہ یکسر بدلا ہوا تھا۔

کامران نے چونک کر دیوداسی کی طرف دیکھا اور انتہائی نرم لہجے میں کہنے لگا۔ ''تمہاری زبان سے اپنا اصلی نام سن کر مجھے خوشی کا احساس ہوا۔ مگر تم اس وقت یہاں کیوں آئی ہو؟'' کامران نے دیوداسی کے سوال کا جواب دینے کے بجائے خود ہی ایک سوال کر ڈالا۔

''آپ کی خوشی کیلئے'' شکنتلا کی آواز سے تھکن اور اداسی کا اظہار ہو رہا تھا۔ ''میں یہ کہنے آئی ہوں کہ آئندہ آپ کے کسی کام میں مداخلت نہیں کروں گی۔ مجھے احساس ہے کہ میں اپنی حدود سے آگے بڑھ گئی تھی۔ اگر ہو سکے تو میری اس غلطی کو معاف کر دیں۔ مگر ٹھاکر سے کہہ کر کسی نئی دیوداسی کو طلب نہ کریں۔ جب تک بھی ممکن ہوگا میں چپ چاپ آپ کی خدمت کرتی رہوں گی۔''

کامران نے غور سے شکنتلا کی طرف دیکھا۔ وہ ایک خوبصورت لڑکی تھی' لیکن اس کے حسن کو گردشِ وقت نے دھندلا دیا تھا۔ دیوداسی کی آنکھوں میں افسردگی کا سمندر اتر آیا تھا' مگر وہ مجبور لڑکی اسے بھی پینے کی کوشش کر رہی تھی۔

''آخر کیوں......؟''

شجاع الدین کامران نے مصنوعی غصے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''میں اپنی مرضی کا مالک ہوں' جسے چاہوں طلب کروں اور جسے چاہوں ٹھکرا دوں

''میں جانتی ہوں۔'' شکنتلا کا چہرہ بجھتا جا رہا تھا اور آواز بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

''پھر تمہاری یہ احمقانہ خواہش کیوں ہے؟'' کامران نے ایک نئے انداز سے دیوداسی کے جذبات پر ضرب لگائی۔

''میں آپ کو تباہی کے راستے پر جاتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔'' شکنتلا نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ ''دوسری دیوداسی آپ کیلئے امرت نہیں زہر لے کر آئے گی۔''

''اگر میں تیری باتیں ٹھاکر کو نقل کر دوں۔'' کامران نے ایک اور ضرب لگائی۔ ''کرشن راؤ کو بتا دوں کہ اس کے تہہ خانے میں اسی کے خلاف سازشیں پرورش پا رہی ہیں۔''

ایک لمحے کیلئے شکنتلا کے چہرے پر وحشت کی پرچھائیاں ناچنے لگیں، مگر فوراً ہی اس کا لہجہ بدل گیا۔ ''میں اپنا انجام جانتی ہوں شجاع الدین کامران!'' اچانک شکنتلا کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ پتھر کے ہو گئے تھے۔ ''آپ ٹھاکر سے جو کچھ کہنا چاہتے ہیں، کہہ ڈالیں۔ میں اپنا فرض پورا کر چکی۔ اب اگر موت بھی آئی تو وہ بہت پرسکون ہوگی۔ میں نے سکون کی منزل پالی۔ اس کے بعد آئے جو عذاب آئے۔'' یہ کہہ کر شکنتلا بے نیازانہ انداز میں واپس چلی گئی۔ اس نے ایک بار بھی مڑ کر نہیں دیکھا۔

آج شکنتلا کی باتیں سن کر کامران کے جذبات نہیں بھڑکے تھے۔ دیوداسی کے طرز عمل نے اسے ایک نئے انداز سے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا اور پھر اسی سوچ میں ڈوبے ڈوبے کامران سو گیا۔

دوسری صبح بھی اس کی آنکھ دیر سے کھلی۔ پجاری رام سروپ کے کمرے میں کھیما اس کا منتظر تھا۔ آخر اسی پر پیچ راستے سے گزر کر کامران سردار نرسنگا کے کمرے میں پہنچ گیا۔ سردار نرسنگا اسے دیکھ کر خوش نظر آنے لگا۔ پھر نرسنگا نے اپنے تمام خدمت گاروں کو حکم دیتے ہوئے کہا۔

''چھوٹے ٹھاکر کیلئے کوئی پابندی نہیں، وہ جب چاہیں بلا اجازت سردار کے کمرے میں داخل ہو سکتا ہے۔''

نرسنگا کے حکم پر خدمت گاروں نے سر جھکا دیئے اور نرسنگا کامران کو لے کر جنگل کی طرف چلا گیا، جہاں بہت سے نوجوان مختلف مشقوں میں مشغول تھے۔

نرسنگا نے اپنے ہاتھ سے کامران کو ایک تلوار دی اور خود شمشیر زندگی کے ابتدائی پینترے سکھانے لگا۔ تمام نوجوان اپنے سردار کے گرد سمٹ آئے تھے، پھر نرسنگا کے کہنے پر کامران نے ہوا میں پہلا تیر چھوڑا۔ اس خوشی کے موقع پر وحشیوں کی چیخوں سے پورا جنگل گونج اٹھا۔

پھر کامران نے نرسنگا سے واپس جانے کی اجازت طلب کی۔ وہ جلد از جلد بڑے مندر پہنچ کر کرشن راؤ سے رابطہ قائم کرنا چاہتا تھا۔ کامران بہت تیز رفتاری کے ساتھ چل رہا تھا۔ نرسنگا کا خدمت گار کھیما کامران کی عجلت پر حیران تھا، مگر وہ اس سے کوئی سوال نہیں کر سکتا تھا۔

پھر جب کامران مندر پہنچا تو کرشن راؤ پجاری رام سروپ کے کمرے میں موجود تھا۔

''ٹھاکر! میں تجھ سے ایک خاص معاملے پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔'' کامران نے بے ترتیب سانسوں کے ساتھ کہا۔

''دم لے بیٹے کہ ایسی بھی کیا جلدی ہے؟''

کرشن راؤ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''نہیں ٹھاکر! میرے پاس وقت نہیں ہے۔'' کامران نے تیز لہجے میں کہا۔ ''تجھے کیا پتا کہ میں دو راتوں سے سو

نہیں سکا ہوں۔"

"تو پھر اپنے دل کا بوجھ اتار دے۔" بوڑھا راجپوت سنبھل گیا۔

"میں تنہائی چاہتا ہوں۔"

کامران نے پجاری رام سروپ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

تنہائی ملتے ہی کامران نے ٹھاکر کو اپنا منصوبہ تفصیل سے بتاتے ہوئے کہا۔"میرا ایک دوست ہانسی میں رہتا ہے۔ اگر میں اس کے ذریعے تھوڑی تھوڑی رقم اپنی ماں کو بھیج دوں تو میرے ذہن سے یہ پہاڑ جیسا بوجھ اتر جائے گا۔"

"کیا اس کام کیلئے تجھے ہر ماہ ہانسی جانا ہوگا؟"

کرشن راؤ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"نہیں! میں ایک ہی بار اسے اتنی رقم دے دوں گا جو کئی سالوں کیلئے کافی ہوگی۔" کامران نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔"میں اپنی ماں کو خوب جانتا ہوں۔ وہ یکمشت اتنی رقم قبول نہیں کریں گی۔ اس طرح انہیں میرے دوست پر شک ہو جائے گا۔"

ٹھاکر کرشن راؤ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ وہ ظاہری طور پر کچھ پریشان سا نظر آرہا تھا۔

بوڑھے راجپوت کی مسلسل خاموشی نے کامران کو جھنجلاہٹ میں مبتلا کر دیا۔

"کہیں تجھے مجھ پر تو شک نہیں ٹھاکر؟"

کامران کا لہجہ تلخ تھا۔

"نہیں!"

کرشن راؤ نے چونکتے ہوئے کہا۔"میں یہ سوچ رہا ہوں بیٹے کہ تو اتنا طویل سفر کس طرح طے کرے گا؟ ہانسی تو یہاں سے بہت دور ہے۔"

"میں پیدل ہی چلا جاؤں گا ٹھاکر! دنیا کا کوئی فاصلہ میرے تیز رفتار قدموں کے آگے نہیں ٹھہر سکتا۔" کامران بہت زیادہ جذباتی ہو رہا تھا۔

"اب اس کا ایک ہی حل ہے کہ تجھے میرا کوئی خدمت گار گھوڑے پر بٹھا کر لے جائے اور پھر تو شام تک واپس لوٹ آئے۔ تیرا اس طرح سنسان راستوں پر مارے مارے پھرنا اچھا نہیں ہے۔" کرشن راؤ نے کہا اور کامران مطمئن نظر آنے لگا۔

وہ رات کامران نے بڑی بے چینی کے عالم میں گزاری۔ صبح ہوتے ہی کرشن راؤ نے کامران کو چاندی کے سکوں سے بھری ہوئی تھیلی دیتے ہوئے کہا۔"اگر یہ کم ہے تو ایسی کئی تھیلیاں تجھ پر قربان کی جاسکتی ہیں۔" ٹھاکر کا لہجہ مکمل منافقت کی عکاسی کر رہا تھا۔

"نہیں! یہ ان جیسی قناعت پسند عورت کیلئے کافی ہے۔" کامران نے کہا۔"خدا کرے کہ وہ چند سکے ہی قبول کرلیں۔"

کرشن راؤ خاموش کھڑا رہا۔

پھر وہ دونوں مندر سے نکلے۔ باہر میدان میں ایک گھوڑا تھا۔

"میرا یہ برق رفتار گھوڑا تجھے بہت جلد ہانسی پہنچا دے گا۔" کرشن راؤ نے گھوڑے کی طرف اشارہ کیا جس کی

لگامیں راماراؤ کے ہاتھوں میں تھیں۔

ٹھاکر نے رات ہی میں راماراؤ کو ہدایت کردی تھی کہ وہ شجاع الدین کامران کی حرکات وسکنات پر گہری نظر رکھے۔ یہ ایک بوڑھے شاطر کی احتیاطی تدبیر تھی۔ ورنہ کامران کے تو وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ وہ کرشن راؤ کے خلاف کوئی سازش کرے گا۔

الغرض گردوپیش کی فضا سے بے نیاز کامران اس شخص کے ساتھ گھوڑے پر بیٹھ گیا جس سے اسے شدید نفرت تھی۔ راماراؤ نے گھوڑے کو ایڑ دی اور وہ اسپ تازی ہوا سے باتیں کرنے لگا۔

کامران کے تصورات میں بار بار کمال الدین احمد کا چہرہ ابھر رہا تھا۔ کمال احمد ایک ذہین اور باکردار نوجوان تھا' جو ہانسی کے ایک مکتب میں اپنی مذہبی تعلیم مکمل کررہا تھا۔ یہ درس گاہ چشتیہ سلسلے کے مشہور بزرگ شیخ جمال الدین ہانسویؒ کی خانقاہ سے منسلک تھی۔ جہاں پہنچ کر معرفت کے پیاسے اپنی پیاس بجھاتے تھے' مگر کامران کا مقصد کچھ اور تھا۔

❊❊❊

راما راؤ بڑی چابک دستی کے ساتھ گھوڑا دوڑا رہا تھا۔ وہ کرشن راؤ کی ہدایت کے مطابق جلد از جلد یہ طویل فاصلہ طے کر کے دہلی واپس لوٹ جانا چاہتا تھا۔ شجاع الدین کامران کا ایک ہاتھ راما راؤ کی کمر کے گرد لپٹا ہوا تھا۔ اس وقت اسے شدت سے اپنی محرومیوں اور کمزوریوں کا احساس ہو رہا تھا۔

''یہ کوئی زندگی ہے کہ گھوڑے کی سواری میں بھی ایک انسان دوسرے انسان کا محتاج ہو۔'' شجاع الدین کامران نے دل ہی دل میں کہا اور پھر خود ہی جواب دینے لگا۔ ''اب وقت آ گیا ہے کہ تیری ساری محرومیوں کا ازالہ ہو جائے۔ کل تیرے ہاتھوں میں بھی شمشیر آب دار ہو گی اور تیری رانوں کے نیچے بھی گھوڑے کی پسلیاں ٹوٹ رہی ہوں گی۔ پھر تجھے دیکھنے والے طاقتور کہہ کر پکاریں گے اور قائم خان راجپوت ......'' کامران کا ذہن منتشر ہونے لگا' مگر اس نے فوراً ہی اپنے خیالات کا رخ ہانسی کی طرف موڑ دیا جہاں اس کا دوست کمال الدین احمد رہتا تھا اور آج اسے اسی دوست کی مدد درکار تھی۔

راستے کا غبار ان دونوں کے چہروں کو دھندلا کرتا رہا' مگر گھوڑے کی رفتار میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ دہلی سے ہانسی کا فاصلہ ساٹھ (60) میل کے قریب تھا۔ ایک ماہر شہسوار ہونے کے سبب راما راؤ نے دوپہر کے وقت کامران کو ہانسی پہنچا دیا۔ راستے میں دو تین جگہ ٹھہر کر اس مدرسے کا پتہ دریافت کیا جس میں کمال الدین احمد تعلیم حاصل کر رہا تھا۔

پھر اس وقت راما راؤ حیران رہ گیا جب گھوڑے کے بڑھتے ہوئے قدم اچانک رک گئے۔ راما راؤ نے کئی بار ایڑ لگائی مگر گھوڑا ہر مرتبہ الف ہو گیا۔ یہاں تک کہ راما راؤ اور کامران کو گھوڑے کی پشت سے نیچے اترنا پڑا۔ راما راؤ پیچ و تاب کھانے لگا۔ آج تک ایسا نہیں ہوا تھا کہ گھوڑے نے کسی بھی حالت میں سرکشی اختیار کی ہو۔ وہ اپنے مالک کے اشاروں کو پہچانتا تھا' مگر آج چابک کی مسلسل ضربیں کھا کر بھی اس نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا تھا۔

''چھوٹے ٹھاکر! میں گھوڑے کی اس حرکت پر حیران ہوں۔'' راما راؤ نے جھنجلاتے ہوئے کہا۔ ''جانور کا بھی کوئی اعتبار نہیں۔ کون جانے تمہارا دوست یہاں سے کتنی دور رہتا ہے؟'' راما راؤ نے اپنی شکست تسلیم کر لی تھی اور نافرمان گھوڑے کو مارنا چھوڑ دیا تھا۔ ''اب یہ سفر کس طرح طے ہو گا؟ ایک اجنبی علاقے میں ہم لوگ زیادہ دیر ٹھہر بھی تو نہیں سکتے۔''

ابھی شجاع الدین کامران اس بگڑی ہوئی صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ قریب سے ایک بوڑھا شخص گزرا جو اپنی ظاہری شکل و صورت سے مسلمان نظر آ رہا تھا۔ کامران نے اس بوڑھے کو سلام کیا اور کمال الدین احمد کا پتہ دریافت کرنے لگا۔

بوڑھے نے مطلوبہ نوجوان سے لاعلمی کا اظہار کیا' مگر اتنا ضرور بتا دیا کہ قریب ہی ایک مکتب ہے جہاں کچھ لوگ مذہبی تعلیم حاصل کرتے ہیں اور مدرسے سے ملحق حضرت شیخ جمال الدین ہانسوی رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ ہے۔

شجاع الدین کامران کے بجھے ہوئے چہرے پر رونق سی آ گئی۔ وہ اپنی منزل کے نزدیک پہنچ چکا تھا۔
"چلو! ہم وہاں تک پیدل ہی چلتے ہیں۔" راما راؤ نے مطمئن لہجے میں کہا اور گھوڑے کی لگام پکڑ کر کھینچنے لگا۔
گھوڑے نے وہی غیر متوقع حرکت کی اور اگلی دونوں ٹانگوں پر کھڑے ہو کر چیخنے لگا۔ راما راؤ بہت زیادہ پریشان نظر آ رہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر بے زبان جانور پر تشدد کرنے کی کوشش کی، مگر کامران نے اسے روکتے ہوئے کہا۔
"اسے زیادہ مت ستاؤ۔ اگر یہ تنگ آ کر کسی طرف بھاگ نکلا اور اجنبی جنگل میں روپوش ہو گیا تو پھر ہمیں ناقابل بیان دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔" شجاع الدین کامران نے راما راؤ کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ "یہاں سے تھوڑا ہی فاصلہ تو ہے میں تیز قدموں سے چلا جاؤں گا۔"
راما راؤ کچھ دیر تک غضب ناک نظروں سے گھوڑے کو دیکھتا رہا۔ پھر کامران کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔
"میں اس درخت کے نیچے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ تم وہاں زیادہ وقت برباد نہ کرنا ہمیں ٹھاکر کے حکم کے مطابق ہر حال میں شام ہونے سے پہلے اپنے گھر کی طرف لوٹ جانا ہے۔"
کامران نے اثبات میں سر کو جنبش دی اور آگے بڑھ گیا۔ راما راؤ گھوڑے کی لگام پکڑ کر پیچھے کی طرف لوٹا تو کچھ دیر کیلئے باغی ہو جانے والے جانور نے سر جھکا دیا اور حسب عادت اپنے مالک کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ راما راؤ ایک بار پھر چونک اٹھا۔ اس نے دوبارہ آگے بڑھنے کی کوشش کی مگر گھوڑے نے اس کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ راما راؤ پر حیرتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ یہ بڑی عجیب بات تھی کہ گھوڑا آگے بڑھنے سے انکار کر دیتا تھا' لیکن پیچھے لوٹنے میں اسے کوئی عار نہیں تھا۔

✻✻✻

کامران مدرسے میں پہنچ کر اپنے بچپن کے دوست کمال الدین سے ملا۔
"کامران! میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم میرے پاس بھی آ سکتے ہو۔" کمال احمد پر شدید حیرت کا غلبہ تھا۔
"کمال! میرے پاس وضاحتوں کا وقت نہیں۔" کامران نے تیز لہجے میں کہا۔ "میں اس یقین کے ساتھ یہاں آیا ہوں کہ تم مجھے نامراد نہیں لوٹاؤ گے۔ تمہیں اپنے وہ الفاظ تو یاد ہیں؟" کامران نے قصداً اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔
"میں نے کیا کہا تھا؟" کمال الدین احمد گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ وہ فوری طور پر کامران کی بات سمجھنے سے قاصر رہا تھا۔
"جب تم قید خانے میں مجھ سے ملنے آئے تھے اس وقت تم نے کہا تھا کہ اگر کبھی تمہاری گواہی کی ضرورت پیش آئی تو تم گریز اختیار نہیں کرو گے۔" کامران نے اپنے دوست کو دو سال پرانی باتیں یاد دلاتے ہوئے کہا۔
"ہاں! مجھے اپنا کہا ہوا ایک ایک حرف یاد ہے۔" کمال الدین احمد نے کسی جھجک کے بغیر جواب دیا۔ کامران! یہ کوئی خودستائی کا انداز نہیں مگر میری زبان وہی الفاظ ادا کرتی ہے جو میرے عمل کے تابع ہوں میں آج بھی کہتا ہوں کہ تم نے چوری نہیں کی۔ تم بالکل بے قصور تھے۔ اگر آج عدالت کو میری شہادت کی ضرورت ہے تو میں تمہارے ساتھ چلنے کیلئے تیار ہوں۔" کمال احمد کا لہجہ پرعزم تھا اور اس کے چہرے پر جذبات کا ہلکا سا عکس روشن تھا۔
"نہیں! عدالت کو کسی شے کی ضرورت نہیں۔" کامران کے ہونٹوں سے تلخیوں کا زہر ٹپکنے لگا۔ "اسے صرف میری ضرورت تھی۔ وہ پوری ہو گئی۔ میں تمہیں قانون کے سامنے لے جانے کے لئے نہیں' اپنی ایک امانت سپرد کرنے

آیا ہوں۔"

اتنا کہہ کر شجاع الدین کامران نے چاندی کے سکوں سے بھری ہوئی تھیلی کمال احمد کی طرف بڑھا دی۔

"یہ کیا ہے؟" کمال احمد نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

"یہ چند سکے ہیں جو میں نے اپنی محنت سے حاصل کئے ہیں مگر والدہ کو میری باتوں پر اعتبار نہیں آتا۔" شجاع الدین کامران نے اختصار سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "وہ ان سکوں کو قبول کرنے کے لئے آمادہ نہیں۔ گھر کی یہ حالت ہے کہ ایک وقت کی روٹی بھی میسر نہیں۔ اگر یہ رقم ان تک نہیں پہنچی تو وہ مزدوری کے لئے گھر سے نکل کھڑی ہوں گی اور میں اسے برداشت نہیں کر سکتا کہ اس عمر میں انہیں دوسروں کی غلامی کرنی پڑے۔"

"جب بیٹے ہوتے ہوئے تم انہیں آمادہ نہیں کر سکے تو پھر میری کیا حیثیت ہے؟" کمال احمد نے عذر پیش کرتے ہوئے کہا۔

"میں ان کے نزدیک ایک نافرمان اور سرکش بیٹا ہوں' مگر تم ایک لائق اعتبار نوجوان ہو۔" کامران نے جواباً کہا۔ "وہ تم پر بہت زیادہ اعتبار کرتی ہیں۔ اگر تم انہیں مجبور کرو گے تو وہ مجبور ہو جائیں گی۔"

کمال احمد شدید ذہنی کشمکش میں مبتلا تھا۔ اس نے اس ناخوشگوار واقعہ کی تفصیلات معلوم کیں۔ کامران نے اسے سب کچھ بتا دیا مگر یہ راز پوشیدہ رکھا کہ اتنی بڑی رقم کہاں سے حاصل کی گئی ہے؟

آخر بہت غور و فکر کے بعد کمال احمد نے کہا۔ "اگر میں یہ رقم تمہاری والدہ کو اپنی طرف سے پیش کروں گا تو ان کی غیرت اسے قبول نہیں کرے گی۔"

"تم میرا نام لے کر انہیں آمادہ کرنے کی کوشش کرو گے۔" کامران نے سمجھایا۔ "اس طرح ان کا ذاتی وقار مجروح نہیں ہو گا۔"

"پھر وہی سوال اٹھے گا کہ تم نے اتنے سکے کہاں سے حاصل کیے؟" کمال احمد نے جرح کرتے ہوئے کہا۔

"تم انہیں دس دس پانچ پانچ سکے کر کے ہر ماہ پہنچاؤ گے۔" کامران نے تجویز پیش کی۔ "اس طرح انہیں شک نہیں ہو گا۔"

"مگر تمہارا حوالہ آتے ہی وہ بھڑک اٹھیں گی۔" کمال احمد نے کہا۔ "پھر اس حادثے کا بھی ذکر آئے گا جس کے سبب وہ تم سے ناراض ہو گئی ہیں۔"

"تم کہہ دینا کہ کامران اپنے گناہوں سے تائب ہو گیا ہے۔ اب وہ جنگلوں میں مزدوری کرتا ہے اور چند سکے جمع کر کے ان کی خدمت میں بھیجتا ہے۔"

"کیا واقعی اسی طرح ہے؟" کمال احمد نے ایک بار پھر چونک کر اپنے دوست کی طرف دیکھا۔ "وہ یہ سوال نہیں کریں گی کہ کامران ان سے ملنے کیوں نہیں آتا؟"

"کہہ دینا کہ اسے ایک چور کی حیثیت سے دنیا کے سامنے آتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے۔" کامران نے پرجوش لہجے میں کہا۔ "تم ان کو مطمئن کر دینا کہ ان کا بیٹا بہت جلد ایک بڑا آدمی بن کر لوٹے گا' پھر کسی قائم خان کی جرأت نہیں ہو گی کہ وہ رائے نعیم الدین ذیشان کے فرزند کو زنداں کے اندھیروں میں دھکیل دے۔" یہ کہتے کہتے کامران کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا تھا۔ "اور ان سے یہ بھی کہہ دینا کہ جس نے جیسی فصل بوئی ہے وہ عنقریب اسے کاٹ لے گا۔"

"کیا تم ابھی تک انتقام کے حصار سے باہر نہیں نکلے ہو شجاع الدین؟" کمال احمد نے افسردہ لہجے میں کہا۔

''خدا کے لئے واپس لوٹ جاؤ یہ شکستہ کھنڈر کے در و دیوار تمہارے منتظر ہیں۔''

''یہ تیرا مسئلہ نہیں ہے کمال احمد۔'' کامران یکا یک مشتعل ہو گیا۔ ''دوستی کی قبا پہن کر بزدلانہ نصیحتیں کرتا ہے۔''

''میں تیرا ہمدرد ہوں۔'' کمال احمد سنبھل گیا۔ ''ان لوگوں سے پنجہ کشی نہ کر جن کے ہاتھ اقتدار کے فولاد سے ڈھالے گئے ہیں۔ ابھی انسان میں اتنی ہمت پیدا نہیں ہوئی ہے کہ وہ سچائی کا سامنا کر سکے اور دوسروں کے حقوق انہیں لوٹا سکے۔''

''بس! تیری دوستی بھی دیکھ لی۔'' کامران مزید بھڑک گیا۔ ''تو نے مجھے بہت مایوس کیا کمال احمد! تجھے کیا خبر کہ میں کیسے پرہول راستے سے گزر کر یہاں تک پہنچا ہوں۔ کاش! میں لوگوں کو ان کے چہروں کے بجائے دلوں کے ذریعے پہچاننے کی کوشش کرتا۔ تم سب میرے حسن ظن کے قائل ہو۔ ہر قدم پر اپنی مجبوریوں کا ماتم کرنے بیٹھ جاتے ہو۔ پھر تمہاری مجبوریاں اس حد تک پہنچ جاتی ہیں کہ تم نہ کسی بھوکے کو کھانا کھلا سکتے ہو اور نہ کسی بیمار کی عیادت کر سکتے ہو۔ خدا تمہاری مجبوریوں میں اتنا اضافہ کر دے کہ تمہیں اپنے سوا کوئی رشتہ یاد نہ رہے۔'' یہ کہہ کر شجاع الدین کامران نے کمال احمد کے ہاتھ سے تھیلی چھیننے کی کوشش کی۔ ''خدا مجھے معاف کرے کہ میں نے ہاتھ بھی پھیلایا تو کہاں پھیلایا؟''

یکا یک کمال احمد کے تیور بدل گئے۔ اس نے شجاع الدین کامران کے ہاتھ کو جھٹک دیا۔

''مجھے ایسی گالیاں نہ دو کہ تم جن کا مفہوم بھی نہیں جانتے۔'' کمال احمد ایک نرم گفتار نوجوان تھا' مگر آج اس کے لہجے سے بھی شرارے ٹپک رہے تھے۔ ''میں اپنی مجبوریوں کا ماتم نہیں کرتا' تمہاری حماقتوں پر روتا ہوں۔ مجھے والدہ محترمہ نے سب کچھ بتا دیا ہے۔ تم ایسے خواب دیکھتے ہو جن کی کوئی تعبیر نہیں۔''

''کمال الدین احمد! میں تجھ سے الجھنا نہیں چاہتا۔'' کامران کا لہجہ بدستور شعلہ بار تھا۔ ''مجھے واپس جانے دے کاش! میرے پاؤں کٹ جاتے اور میں تیرے کوچے کا راستہ بھول جاتا۔''

''ہاں! تم واپس چلے جاؤ۔'' کمال احمد کی آواز بھی اس کی عادت کے خلاف معمول سے زیادہ تیز تھی۔ ''میں تمہاری یہ امانت والدہ تک پہنچا دوں گا۔ جس قدر جھوٹ مجھ سے بولا جائے گا اس کے مظاہرے میں کوئی کوتاہی نہیں کروں گا۔ تم پورے اطمینان کے ساتھ اپنی منزل کی طرف جاؤ وہ منزل جس کا علم تمہارے سوا کسی کو نہیں۔''

شجاع الدین کامران کے جلتے ہوئے جذبات سرد پڑ گئے۔ ''میں تمہارا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔ میرا دل چاہتا ہے کہ اپنا درد تمہارے سامنے بیان کر دوں مگر تمہاری نصیحتوں سے ڈر لگتا ہے۔ میں تمہیں بے اعتبار نہیں سمجھتا' لیکن میرے مسائل اتنے سنگین ہیں کہ ان کی ضرب سے کبھی کبھی چیخنے لگتا ہوں۔ میری اس چیخ کو مشکوک نظروں سے نہ دیکھنا اور میرے اس گناہ کو معاف کر دینا کہ میں نے تمہیں جھوٹ بولنے کے لئے اکسایا اور کمال احمد! تم اپنے اس جھوٹ پر شرمندہ بھی نہ ہونا کہ تمہارے اس فعل سے ایک بوڑھی عورت کا بھلا ہو جائے گا۔ میں کچھ دیر اور ٹھہر جاتا مگر مدرسے سے باہر ایک اور شخص میرا انتظار کر رہا ہے۔'' کامران کا لہجہ پرسوز ہوا تو اس کی آنکھیں بھی بھیگنے لگیں۔

''تو کس کے ساتھ آیا ہے کامران؟'' کمال الدین احمد نے پوچھا۔

''وہ ایک راجپوت ہے راما راؤ! میں اسی کے ساتھ یہاں تک آیا ہوں۔'' کامران نے جواباً کہا۔ ''اگر میں شہسواری جانتا ہوتا تو اکیلا آتا اور شاید ایک دو راتیں تیرے پاس ٹھہر جاتا۔'' یہ کہہ کر کامران نے وہ عجیب و غریب واقعہ بھی کمال احمد کو سنا دیا جب گھوڑے نے انتہائی کوشش کے باوجود آگے بڑھنے سے انکار کر دیا تھا۔

کمال احمد گہری سوچ میں ڈوب گیا پھر بہت تھکے ہوئے لہجے میں کہنے لگا۔ "یہ کوئی اچھی علامت نہیں کامران
راما راؤ یقیناً کوئی خبیث فطرت انسان ہے ورنہ ایک جانور اس کی خباثت پر اس طرح گواہی نہیں دیتا۔"

"میں تمہاری بات نہیں سمجھا۔" شجاع الدین کامران بھی حیرت زدہ نظر آنے لگا تھا۔

"یہاں حضرت شیخ جمال الدین ہانسوی رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ میں بہت سے ضرورت مند ہندو بھی آتے ہیں مگر انہیں
کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔" کمال احمد نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "حضرت شیخ ان کے حق میں دعائے خیر
کرتے ہیں اور وہ اپنی دلی مرادیں حاصل کر کے لوٹ جاتے ہیں لیکن راما راؤ کے گھوڑے کی یہ سرکشی بے سبب نہیں۔
اس جانور کی لگام ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں تھی جس کے ارادے نیک نظر نہیں آتے۔ وہ حیوان بھی اس راز سے
باخبر ہے کہ یہ حضرت شیخ کے احترام کی حدود میں ہے۔ اس دائرے میں کوئی مفسد داخل نہیں ہو سکتا۔ میرا ناقص عقل
یہی کہتا ہے۔ شجاع الدین کامران کہ وہ تیرا ساتھی کوئی اچھا انسان نہیں۔ گھوڑے کے اس اشارے کو سمجھنے کی کوشش کر
اور راما راؤ کا ساتھ چھوڑ دے۔ میں تجھ سے یہ نہیں پوچھوں گا کہ تو راما راؤ کے اتنے قریب کیوں چلا گیا ہے اور یہ
چاندی کے سکے کہاں سے آئے ہیں؟ لیکن مجھے اتنا یقین ہو چلا ہے کہ تیرا منتخب راستہ سکون کی منزل کی طرف نہیں
جائے گا۔ اگر تجھے میری نصیحت گراں نہ گزرے تو ایک بار ان بے سروپا باتوں پر غور ضرور کرنا۔ شاید تیرے لئے فلاح
کا کوئی پہلو نکل آئے۔"

"میں نے بہت سوچا کمال الدین احمد! بے شمار راتیں اسی سوچ میں گزار دیں مگر بہت دیر ہو گئی۔ میں جا رہا
ہوں۔ خدا حافظ میرے دوست! ایک بار ضرور آؤں گا یہ معلوم کرنے کے لئے کہ والدہ محترمہ نے تیری بات مان لی یا
تجھے بھی جھڑک دیا؟"

"تو ان کی طرف سے مطمئن ہو جا کہ میں انہیں کسی نہ کسی طرح راضی کر لوں گا۔ مجھے بس تیری فکر ہے اپنے
بارے میں سوچ۔" کمال الدین احمد کی آواز میں بھی آنسوؤں کی نمی محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ آنسو جو ابھی پلکوں پر نہیں
آئے تھے۔

شجاع الدین کامران تیزی سے پلٹا اور مدرسے سے نکل کر بھاگتا ہوا اس طرف بڑھا جہاں ایک درخت کے
نیچے راما راؤ بیٹھا ہوا وحشت زدہ ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

پھر وہ دونوں گھوڑے پر سوار ہو کر دہلی کی طرف روانہ ہو گئے۔ گھوڑا اسی برق رفتاری کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

"چھوٹے ٹھاکر! میں اب تک گھوڑے کی اس حرکت کا کوئی جواز تلاش نہ کر سکا' کیا یہ وہی گھوڑا ہے جو اپنی پیٹھ
پر زخم کھانے کے باوجود ایک قدم آگے نہیں بڑھ رہا تھا؟" راستے میں راما راؤ نے کامران کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"جانور ہے' کون جانے کہ کس وقت کیا حرکت کر بیٹھے؟" کامران نے راما راؤ کو ٹالنے کی کوشش کی۔ مگر اس
کے کانوں میں کمال الدین کے الفاظ گونجتے رہے۔ راما راؤ تو پہلے بھی اس کا دوست نہیں تھا مگر اس واقعے کے بعد
کامران کا ذہن اس کی طرف سے کچھ اور بھی غبار آلود ہو گیا۔

❋❋❋

جب راما راؤ مندر پہنچا تو سورج غروب ہو چکا تھا اور کرشن راؤ بے چینی کے ساتھ دروازے پر ٹہل رہا تھا۔

"راما! سب خیریت تو ہے؟" بوڑھے راجپوت نے وحشت زدہ لہجے میں پوچھا۔

"ہاں! سب کشل (عافیت) ہے۔" راما راؤ نے گھوڑے سے اتر کر ٹھاکر کے قدموں پر جھکتے ہوئے کہا۔

"پائے لاگوں ٹھاکر۔" یہ راجپوتوں کا مخصوص سلام تھا۔ "جن کے سروں پر تیرا سایہ رہتا ہے ان کا کوئی کچھ نہیں

بگاڑ سکتا۔" راما راؤ کا لہجہ حد سے زیادہ خوشامدانہ تھا۔

"اور تم میرے بیٹے؟" بوڑھے منافق نے راما راؤ کی جھوٹی عقیدت کا کوئی جواب نہیں دیا اور وہ کامران سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ "سارا کام تمہاری مرضی کے مطابق ہو گیا؟"

"ہاں ٹھاکر! میرے دوست نے وعدہ تو کر لیا ہے مگر کامیابی کا انحصار تو والدہ کی مرضی پر ہے۔" کامران نے آہستہ سے کہا۔ اس کا ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔ بار بار اس کے خیالوں میں گھوڑے کی سرکشی کا منظر ابھر آتا تھا اور پھر کانوں میں کمال الدین احمد کے الفاظ گونجنے لگتے تھے۔

کرشن راؤ نے کامران کی اس غائب دماغی کو جسمانی تھکن سمجھا۔ "بس اب تو آرام کرو۔" ٹھاکر نے انتہائی محبت آمیز لہجے میں کہا۔ "تمہارے چہرے سے معلوم ہو رہا ہے کہ سوا سو میل کے اس سفر نے تمہیں تھکا ڈالا ہے۔"

کامران چپ چاپ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا اور بوڑھا ٹھاکر اپنے خدمت گار سے پوچھنے لگا۔

"راما! اس کی نقل و حرکت مشکوک تو نہیں تھی؟"

"نہیں ٹھاکر!" راما راؤ نے قہقہہ مارتے ہوئے کہا۔ "وہ ایک احمق اور جذباتی لڑکا ہے۔ عشق کے اندھے کو لب و رخسار اور زلفوں کے سوا کیا نظر آئے گا؟ وہ تو تیرا ایک معصوم شکار ہے۔ جہاں چاہے ذبح کر دے۔ تیری چالیں تو وہ ہیں کہ انسان اپنے ہی ہاتھوں سے اپنا گلا کاٹ دے۔ اس پاگل کا ذکر چھوڑ دے۔ ٹھاکر! شروع میں مجھے شک سا ہوا تھا کہ کہیں وہ ہمارے گرد تو کوئی جال نہیں پھیلا رہا ہے؟ مگر اب اندازہ ہوتا ہے کہ تیرا انتخاب غلط نہیں ہوتا۔"

راما راؤ کی باتیں سن کر ٹھاکر بھی ہنس پڑا۔ "ہاں راما! تیرے ٹھاکر کے اندازے کبھی غلط نہیں ہوتے۔ ابھی کچھ دیر پہلے میں نے شکنتلا سے پوچھا تھا۔ وہ بھی یہی کہہ رہی تھی کہ کامران ایک جذباتی اور احمق لڑکا ہے۔ حسن پرستی اس کا مزاج ہے۔ وہ بہت جلد دیوداسی کی اداؤں کا شکار ہو جائے گا۔ پھر اسے شراب کی عادت بھی پڑ جائے گی۔ ایک بار قدم ڈگمگا گئے تو اس وقت تک لڑکھڑاتا ہی رہے گا جب تک زمین پر اوندھے منہ نہ گر جائے۔ میرا انتقام بہت خوفناک ہوتا ہے۔ راما سنا ہے قائم خان کا اثر و رسوخ بڑھتا جا رہا ہے۔ کہنے والے مجھ سے کہتے ہیں کہ وہ دربار سلطانی میں عنقریب کوئی اہم عہدہ حاصل کر لے گا۔ قائم خان ایک شاطر و عیار انسان ہے۔ جب وہ ذاتی مفاد کے لئے اپنے خونی رشتوں کی بھینٹ دے سکتا ہے تو پھر ہم بھی اس کی سیاست سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ میں چاہتا ہوں کہ جلد از جلد کامران کو اس کے گھر تک پہنچا دوں تاکہ وہ اپنے ماموں کا کام تمام کر دے۔"

"کیا قائم خان ہماری سرگرمیوں سے واقف ہے؟" راما راؤ نے گھبرا کر پوچھا۔

"ابھی تک تو نہیں مگر ایسے ہوشیار انسان کا زیادہ دن زندہ رہنا بھی خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔" کرشن راؤ نے سرد لہجے میں کہا۔ "چانکیہ کی سیاست تو یہی کہتی ہے کہ شک کے بیج کو زمین پکڑنے سے پہلے ہی مسل ڈالو۔ اسے پھوٹنے کی مہلت دینا بڑا بھاری پاپ ہے۔"

راما راؤ نے سر جھکا دیا پھر وہ ٹھاکر کے ساتھ اٹھ کر اس کی حویلی چلا گیا۔

***

اس رات شکنتلا کھانے کے برتن لے کر واپس جانے لگی تو شجاع الدین کامران نے کہا۔ "جب تمہیں اپنی پوجا پاٹ سے فرصت مل جائے تو میرے پاس آنا۔"

دیوداسی کے قدم رک گئے۔ اس نے پلٹ کر حیرت زدہ نظروں سے کامران کی طرف دیکھا۔ "کیوں؟" بہت مختصر سوال تھا۔

''اب میں ٹھاکر سے نئی دیوداسی طلب نہیں کروں گا۔'' کامران نے اپنائیت کے لہجے میں کہا۔
شکنتلا چپ چاپ کھڑی رہی۔ اس کی حیرت میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔
''آج میں تمہارے ہاتھوں سے شراب پینا چاہتا ہوں۔'' کامران نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ''جب رات آدھی سے زیادہ ڈھل جائے تو میرے پاس اس طرح آنا کہ تمہارے ایک ہاتھ میں شراب سے بھری ہوئی صراحی ہو اور دوسرے ہاتھ میں منقش چاندی کا پیالہ...... پھر تمہارے گلے کا جادو ہو اور میں خوابوں کے اس جزیرے میں سو جاؤں جہاں حسن کی شبنم ہو اور نشے کی پھوار ہو۔ اب میں زندگی کے صحرا میں بھاگتے بھاگتے تھک گیا ہوں۔ دیوداسی! میرے سینے میں جھانک کر دیکھ! دل جلتے جلتے خاک ہو چکا ہے اور روح جھلس کر رہ گئی ہے۔''
شکنتلا کو سکتہ سا ہو گیا تھا اور اس کے چہرے کی سرخی زردی میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی۔
''بس اب جاؤ میں تمہارا انتظار کروں گا......'' شجاع الدین کامران نے کہا اور اپنے بستر کی طرف بڑھ گیا۔
شکنتلا کچھ دیر تک کسی مجسمے کی مانند کھڑی رہی۔
''اگر تم وقت پر نہیں آئیں تو میں دوسری دیوداسی کو طلب کر لوں گا۔'' میں آج کی رات رائیگاں نہیں جانے دوں گا۔ ٹھاکر بھی تو یہی چاہتا ہے۔''
شکنتلا نے کامران کی طرف ایسی اداس نظروں سے دیکھا جن میں ساری دنیا کا درد سمٹ آیا تھا۔ پھر وہ اس قدر آہستہ قدموں سے واپس چلی گئی کہ اس کی رفتار پر کسی مریض کا گمان ہوتا تھا۔
شکنتلا کے جاتے ہی کامران نے اپنے تصورات کا پرانا کاروبار سجا لیا۔ وہ خیالوں میں کمال احمد کو سعدیہ خانم کے پاس جاتے اور پھر ماں کو اپنے بھیجے ہوئے سکے قبول کرتے دیکھ رہا تھا۔
''کاش! ایسا ہو جائے۔ میرے دل کا سب سے بڑا بوجھ اتر جائے گا۔ پھر میں ساری دنیا سے بے نیاز ہو جاؤں گا۔'' کامران اپنے آپ سے مخاطب تھا۔ ''موت بھی آئے گی تو سکون کے ساتھ آئے گی۔ پھر قائم خان راجپوت ہو گا اور میں...... ایک بار حالات کے پنجرے سے نکل جاؤں پھر دیکھوں گا کہ میرے بازوؤں میں کتنی طاقت ہے اور قائم خان کے بازو کتنے مضبوط ہیں۔ ظالم مجھے قید کر کے کہتے ہیں کہ میں اپنی پرواز کا امتحان دوں...... یہ کیسا کاروبار ستم ہے اور کیسی سفاکی ہے۔'' کامران کی رگوں میں خون جلنے لگا تھا۔ اچانک اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش ہونے لگی۔
''اے خدا! مجھے نامرادی کی موت نہ دے۔ بس ایک بار صرف ایک بار قائم خان کے جسم پر مجھے قدرت دے دے۔''
آج کامران پہلی بار تنہائی میں رویا تھا۔ بہت دیر تک جذبات کی گھٹا برستی رہی۔ پھر اسے کسی قدر سکون ہو گیا مگر یہ سکون بہت عارضی تھا۔ نفرتوں کی آندھی تھمی تو اندیشوں کا طوفان آ گیا۔ کامران بستر سے اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اسے کمال الدین احمد کے الفاظ پریشان کر رہے تھے اور خیالوں میں بار بار راما راؤ کا ہیولا ابھر رہا تھا۔ راما راؤ کے ہیولے سے ایک اور ہیولا ابھرا وہ بوڑھے ٹھاکر کرشن راؤ کا چہرہ تھا۔
''جب راما راؤ کو ایک جانور نے حضرت شیخ جمال الدین ہانسوی رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ کی حدود میں لے جانے سے انکار کر دیا تو کرشن راؤ کون ہے اور وہ مجھ سے کیا چاہتا ہے؟'' کامران نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ ''دیوداسی شکنتلا مجھے سردار نرسنگا کے قریب جانے سے روکتی ہے۔ آخر یہ سب کچھ کیا ہے؟''
شجاع الدین کامران کے ذہن میں بیک وقت کئی سوال ابھرے تھے اور پھر وہ آپس میں الجھ کر رہ گئے تھے۔

کیا یہ لوگ میری زندگی سے کوئی خوفناک کھیل کھیلنا چاہتے ہیں؟'' کامران نے سوچا اور شکنتلا کا انتظار کرنے لگا۔ آج دیوداسی سے کچھ رازداری کی باتیں کرنا چاہتا تھا...... مگر شکنتلا بھی تو کرشن راؤ کی خادمہ ہے' مذہباً ایک ہندو عورت ہے۔ پھر وہ اپنے من کے بھید کس طرح کھولے گی؟ کامران کچھ اور الجھ گیا۔

''کرشن راؤ نہیں تو کم سے کم نرسنگا ضرور بے نقاب ہو جائے گا......'' کامران نے نئے زاویے سے سوچا...... ''اگر نرسنگا کی اصلی شخصیت ظاہر جائے تو پھر کرشن راؤ بھی پردے میں نہیں رہ سکے گا۔''

کامران کی بے چینی بڑھ گئی اور وہ بار بار اس خفیہ راستے کی طرف دیکھنے لگا جس سے گزر کر شکنتلا آتی تھی۔

ہانسی سے لوٹنے کے بعد کامران کے اندر ایک عجیب انقلاب آ گیا تھا۔ کل رات تک وہ شکنتلا کی صورت تک دیکھنے کا روادار نہیں تھا' مگر آج دیوداسی کے قدموں کی آہٹ پر کان اس طرح لگے ہوئے تھے جیسے اسے دیوداسی کے سوا کسی دوسرے کا انتظار ہی نہ ہو۔

اس کشمکش میں آدھی رات گزر گئی مگر دیوداسی ابھی تک نہیں آئی تھی۔ کامران پیچ و تاب کھانے لگا لیکن کچھ دیر بعد ہی سنبھل گیا۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ شکنتلا اس کی لونڈی نہیں ہے کہ وہ آنکھ کے ایک اشارے پر اپنا سب کچھ قربان کر دے۔ کامران نے جذبات پر قابو پا لیا تھا اور اب وہ بظاہر پرسکون نظر آ رہا تھا۔

یکایک سامنے کی دیوار میں ایک شگاف پیدا ہوا اور شکنتلا شراب نوشی کا سامان اٹھائے ہوئے کامران کے قریب آ گئی۔ دیوداسی کے چہرے کی تمام شادابی رخصت ہو چکی تھی اور وہ زرد پتوں سے بھری ہوئی ایک خشک سی شاخ نظر آ رہی تھی۔ کامران خاموش بیٹھا رہا۔ شکنتلا نظریں جھکائے ہوئے پیالے میں شراب ڈالتی رہی۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

''کیا تم پہلی بار کسی کو اپنے ہاتھ سے شراب پلا رہی ہو؟'' کامران نے شوخ لہجے میں دیوداسی سے پوچھا۔

''شراب ہی پلاتی رہی ہوں۔'' اس کے سوا میرا یہاں کام ہی کیا ہے؟'' شکنتلا نے کہا۔ اس کی آواز گہری اداسیوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔

''تم دیوداسی ہو یا شراب پلانے والی ایک بازاری عورت؟'' کامران نے دوسرا سوال کیا۔ ''یہ مندر ہے یا کوئی شراب خانہ؟''

''اپنے کام سے کام رکھیں اور مجھے ایسے سوالوں کا جواب دینے کیلئے پابند نہ کریں کہ میرے ہونٹ ہی جل جائیں۔'' شکنتلا کچھ اور شکستہ نظر آنے لگی تھی۔

کامران شراب سے لبریز پیالہ اٹھا کر منہ تک لے گیا مگر اس کی نظریں مسلسل شکنتلا کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ دیوداسی کے بدن کا خون کچھ اور نچوڑ لیا گیا تھا۔ زردی اب کفن کی سفیدی میں تبدیل ہو گئی تھی۔ ''اگر میں یہ شراب پی لوں تو تمہیں خوشی ہو گی؟'' کامران کا سوال بڑا عجیب تھا۔

''نہیں۔'' بے اختیار شکنتلا کے منہ سے نکل گیا۔ وہ اپنے اوپر قابو رکھنے میں ناکام ہو گئی تھی۔

''آخر کیوں......؟'' کامران کے لہجے میں پہلے سے زیادہ شوخی نظر آ رہی تھی۔ ''سردار نرسنگا کے قریب نہ جاؤں' شراب نہ پیوں اور کسی دوسری دیوداسی کو طلب نہ کروں۔ میرے لئے تمہارا نصیحت نامہ اس قدر طویل کیوں ہے؟''

''میں نہیں چاہتی کہ تم میری نظروں کے سامنے گناہوں کی دلدل میں اتر کر ہلاک ہو جاؤ......'' شکنتلا کی

جاؤ۔" یہ کہہ کر شکنتلا تیزی سے اٹھی اور واپس جانے لگی۔ اس کی آنکھیں کسی پیمانے کی طرح چھلک اٹھی تھیں۔
"رک جاؤ دیوداسی!" بات بگڑ چکی تھی۔ کامران نے شکنتلا کو روکنے کیلئے تحکم آمیز لہجے میں کہا۔
وہ ٹھہر گئی۔ اتنی دیر میں اس کی آنکھیں آبشار بن چکی تھیں۔
"آج تمہیں بتانا ہوگا کہ تم ایسا کیوں چاہتی ہو؟" کامران کی آواز میں جھنجھلاہٹ تھی۔ "تم ہندو ہوتے ہوئے ایک مسلمان کو بچانے کی کوشش کر رہی ہو۔ یہ سراسر بغاوت ہے اور تم جانتی ہو کہ بغاوت کا انجام کیا ہوتا ہے؟"
"ہاں! میں اپنے انجام سے باخبر ہوں۔" شکنتلا نے آنچل سے آنسو خشک کرتے ہوئے کہا۔ "صبح ٹھاکر کو بتا دینا کہ اس کی دیوداسی باغی ہو گئی ہے......" یہ کہہ کر شکنتلا واپس جانے لگی۔
کامران چند لمحوں کیلئے سناٹے میں آ گیا۔ پھر اس نے شراب کا بھرا ہوا پیالہ زمین پر پٹخ دیا اور ٹھوکر مار کر صراحی الٹ دی۔ پورا کمرہ شور سے گونج اٹھا۔
شکنتلا مڑی اب اس کے ہونٹوں پر ایک آسودہ سی مسکراہٹ تھی۔ اس نے بڑی عجیب نظروں سے کامران کی طرف دیکھا اور تیزی کے ساتھ دیوار کے شگاف میں داخل ہو گئی۔
کامران کا منصوبہ تکمیل تک نہ پہنچ سکا اور اب شکنتلا اس کیلئے ایک نیا مسئلہ بن گئی تھی۔

❁❁❁

دوسرے دن کامران جنگل پہنچا تو سردار نرسنگا نے اس سے غیر حاضری کا سبب دریافت کیا۔ کامران نے پہلے تو کوئی بہانہ تراشنے کے بارے میں سوچا' مگر پھر سب کچھ صاف صاف بتا دیا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر جھوٹ بولنے کی کوشش کی تو کرشن راؤ نرسنگا کے سامنے حقیقت ظاہر کر دے گا اور اس طرح اسے ندامت اٹھانی پڑے گی۔
نرسنگا کامران کی صاف گوئی سے متاثر ہوا اور بڑے حسرت زدہ لہجے میں کہنے لگا۔ "ہمارا اس دنیا میں کوئی نہیں چھوٹے ٹھاکر! نہ ماں' نہ باپ......" پھر اس نے فوراً ہی اپنے چہرے پر چھائی ہوئی مایوسیوں کی دھند کو ہٹا دیا اور کامران کی طرف متوجہ ہو گیا۔
شمشیر زنی اور تیر اندازی کی مشق شروع ہوئی۔ کامران نے بڑی چابک دستی کا مظاہرہ کیا۔ نرسنگا نے اسے تعریفی نظروں سے دیکھا۔ "ٹھاکر! تیرے اندر چیتے کی سی پھرتی اور شیر کی سی طاقت ہے۔"
"میں تیرا شاگرد ہوں سردار! تو نے میرے بازوؤں کو تراشا ہے ورنہ کل تک تو میرے ہاتھوں سے تلوار سنبھلی بھی نہیں تھی۔" کامران نے مصلحت سے کام لیتے ہوئے کہا۔ کمال الدین احمد کے ایک جملے نے اسے ہوشیار کر دیا تھا۔
کامران جلد از جلد ان مراحل سے گزر جانا چاہتا تھا۔ وہ دن دن بھر آرام کئے بغیر مختلف ہتھیار چلانے کی مشق کرتا رہتا۔ ابھی اس نے مکمل طور پر تو شہسواری کا فن نہیں سیکھا تھا مگر اس قابل ہو گیا تھا کہ کسی کی مدد کے بغیر گھوڑا دوڑا سکے۔ اس دوران اس نے شکنتلا سے نرسنگا یا کرشن راؤ کے بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی' لیکن دیوداسی کی آنکھوں میں اسے ہمیشہ ایک شکایت موجزن نظر آتی تھی۔ ایسے موقع پر کامران نگاہیں جھکا لیتا تھا۔
آخر ایک دن شکنتلا کے ہونٹ لرزنے لگے۔ "تم ابھی تک اپنے گھر واپس نہیں گئے؟" دیوداسی کے لہجے میں ایسی اپنائیت تھی کہ کامران چونک اٹھا۔
"میرا کوئی گھر نہیں ہے......" اس کے جواب میں وہی بیزاری تھی۔
"مجھے تو یہ بھی معلوم ہے کہ اس گھر میں تمہاری ماں بھی رہتی ہیں۔" شکنتلا کی آواز میں ایک عجیب سا درد تھا۔
"جب تمہیں سب کچھ معلوم ہے تو پھر مجھ سے کیا پوچھ رہی ہو؟" کامران نے اسے ٹالنے کیلئے کہا۔

"میں تمہاری زبان سے سننا چاہتی ہوں کہ اپنے گھر کب جاؤ گے؟" شکنتلا نے بے تکلفانہ کہا۔
"جب جاؤں گا تو تمہیں بتا کر جاؤں گا۔" کامران کے لہجے کی تلخی بھی ختم ہو گئی تھی۔
"کیا اس وقت تم یہاں سے نکل سکو گے؟" یہ کہتے کہتے شکنتلا لرز گئی۔
"مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔ میں کرشن راؤ یا نرسنگا کا غلام نہیں ہوں ......" یکایک کامران کی آواز میں وہی نگاریاں سی بھر گئی تھیں۔
شکنتلا خاموشی سے چلی گئی۔ وہ جانتی تھی کہ جب کامران بھڑک اٹھتا ہے تو اسے دامن کی ہوا اور آنکھوں کے نی سے نہیں بجھایا جا سکتا۔

❊❊❊

کوئی پندرہ دن بعد کامران ٹھاکر سے اجازت لے کر ہانسی پہنچا۔ اس بار اس نے تنہا گھوڑے کی پشت پر طویل فر اختیار کیا تھا۔ کمال الدین احمد سے ملنے تک اس کے ذہن میں ایک حشر سا برپا تھا اگر ماں نے انکار کر دیا تو کیا ہو ا؟ پھر جب کمال احمد کی زبانی معلوم ہوا کہ سعدیہ خانم نے اس کے بھیجے ہوئے سکے قبول کر لئے تو وہ جوش جذبات ں اپنے دوست سے لپٹ گیا اور بار بار کمال کے ہاتھوں کو بوسے دینے لگا۔
کامران زار و قطار روتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "کمال! تو نے دوستی کا حق ادا کر دیا۔ میں جانتا ہوں کہ تجھے وہاں یسا اذیت ناک مرحلہ درپیش ہوگا۔ تو نے کس کس انداز سے جھوٹ بولا ہوگا۔ مجھے سب خبر ہے میں تیرے آگے سر ھکاتا ہوں کہ تو نے میری خاطر اپنی روش بدل ڈالی۔"
"اسے بھول جا کہ میں نے تیرے لئے کیا کیا؟" کمال احمد بھی کامران کی یہ کیفیت دیکھ کر رونے لگا تھا۔ "اس قت کو یاد کر جب والدہ محترمہ نے مجھ سے پوچھا کہ کامران کیوں نہیں آیا؟"
کامران ساکت ہو کر کمال احمد کا منہ دیکھنے لگا۔
"میں نے کہا کہ وہ بڑا آدمی ہو کر آئے گا تو ان کی حالت غیر ہو گئی۔ کہنے لگیں کہ کیا اب وہ میری نظروں میں وٹا آدمی ہے؟ اگر خدا نے اسے شہنشاہ بھی بنا دیا تو کیا ماں کی محبت کا انداز بدل جائے گا؟"
کامران کی آنکھوں سے اشکوں کا سیلاب امڈ پڑا۔
"وہ کسی طرح یہ بات ماننے کیلئے تیار نہیں تھیں کہ تو نے چاندی کے یہ چند سکے اپنی محنت سے کمائے ہیں۔" ال احمد کی آواز لرز رہی تھی۔ "پھر میں نے قسم کھا کر کہا کہ کامران نے اپنی اصلاح کر لی ہے اور اب وہ پسینہ بہا رہا ہے خدا مجھے معاف کرے کامران! خدا مجھے معاف کرے۔ میں اس جھوٹی قسم کا عذاب بھی برداشت کر لوں گا اگر تو ھے راستے پر لوٹ آئے۔"
"میں غلط راستے پر نہیں ہوں کمال الدین احمد۔" کامران کی آواز بلند تھی، مگر آنسوؤں کی نمی سے بوجھل ہو چلی ی۔ "اپنا حق مانگتے مانگتے میری زبان پتھر کی ہو گئی مگر مجھے انصاف نہیں ملا۔ قاضی عماد کے ہاتھوں میں لرزنے والی ان نے قائم خان راجپوت کا ساتھ دیا۔ وہ سرمائے اور اقتدار کی طرف جھک گئی اب میں اپنے ہاتھوں سے اس کا ازن درست کروں گا۔"
جواب میں کمال الدین کچھ اور کہنا چاہتا تھا مگر شجاع الدین کامران نے منہ پھیر لیا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا مدرسے سے باہر نکل آیا۔

❊❊❊

اسی رات کامران نے شکنتلا کو اپنی زندگی کی سب سے اہم خبر سناتے ہوئے کہا۔ ''آج میں بہت خوش ہوں۔''
دیوداسی کے زرد چہرے پر شفق کے نئے رنگ نظر آنے لگے۔ پھر یہ رنگ اس وقت بجھ گئے جب کامران نے اپنے خوفناک ارادوں کا اظہار کیا...... ''میرے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ ختم ہوگئی۔ اب میرے جذبوں کے طوفان کو کوئی نہیں روک سکے گا۔''
شکنتلا نے ایک بار پھر سمجھانے کی کوشش کی مگر کامران کے تیور بگڑ گئے۔ ''تیری زبان سے اداسیوں میں ڈوبے ہوئے بزدلی کے یہ گیت اچھے نہیں لگتے۔ کوئی ایسا راگ چھیڑ دیوداسی کہ جسم کے اندر کا لاوا شریانیں توڑ کر باہر آ جائے۔ پھر میں اپنے دشمنوں کو جلا ڈالوں......اور ضرورت پڑے تو خود بھی جل جاؤں۔''
''کیا تمہیں موت کی دعا دوں؟'' شکنتلا رونے لگی۔
''ہاں! جوانی کی موت بھی بہت خوبصورت ہوتی ہے۔ ایسی کوئی دعا دے کہ جنازہ اٹھے تو لوگ چیخ اٹھیں...... وہ آرہی ہے ایک جوانمرگ کی لاش۔''
شکنتلا بے اختیار ہوگئی اور اس نے وارفتگی کے عالم میں کامران کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔
کامران نے کسی وحشی کی طرح شکنتلا کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔ ''میرے اتنے قریب مت آ دیوداسی کہ تو بھی جل جائے۔''
وقت تیزی سے گزرتا رہا۔ ایک دن نرسنگا نے کامران سے کہا۔ ''چھوٹے ٹھاکر آج رات تم مندر نہیں جاؤ گے۔''
کامران نے حیرت سے سردار کی طرف دیکھا۔
''آج رات بہت دلچسپ تماشا ہوگا۔'' نرسنگا نے اس طرح وضاحت کی کہ کامران کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔ اور جب رات آئی تو جنگلیوں کی ایک ٹولی سردار کے سامنے سر جھکا کر کھڑی ہوگئی۔ وہ سب لوگ مسلح تھے۔
''چھوٹے ٹھاکر کو اپنے ساتھ لے جا کر اندھیروں کا جشن دکھاؤ۔'' نرسنگا نے اپنے غلاموں کو حکم دیتے ہوئے کہا۔ ''لیکن خبردار کہ ٹھاکر کے جسم پر کوئی خراش تک نہ آئے۔''
وحشیوں نے ''جے نرسنگا'' کا نعرہ بلند کیا اور کامران کو لے کر جنگل کی حدود سے نکل گئے۔ چاروں طرف گہری تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ کامران خاموشی کے ساتھ چلتا رہا۔ وہ جنگلیوں کے کسی دلچسپ تماشے کا منتظر تھا، مگر جب حقیقت ظاہر ہوئی تو اس کا پورا جسم خوف و دہشت سے کانپنے لگا۔
تمام جنگلی دہلی کے مضافاتی علاقے کے قریب ٹھہر گئے تھے۔ اچانک کامران نے گھنٹیوں کی آوازیں سنیں اور پھر بہت سے ہیولے متحرک نظر آنے لگے۔ نرسنگا کے وحشی اس طرح مستعد نظر آنے لگے جیسے کوئی درندہ اپنے شکار پر جھپٹنے والا ہو۔ وہ ایک تجارتی قافلہ تھا جو شہر کی طرف جا رہا تھا۔ اونٹوں اور بیلوں کے گلے میں پڑی ہوئی گھنٹیاں ایک مخصوص ترنم پیدا کر رہی تھیں مگر اچانک یہ مسحور کن آوازیں شور و فغاں میں تبدیل ہوگئیں۔
نرسنگا کے غلاموں نے قافلے والوں پر حملہ کر دیا تھا۔ ''چھوٹے ٹھاکر! آپ اپنی جگہ سے جنبش نہ کیجئے گا۔''
کامران اندھیرے میں کھڑا کانپتا رہا اور نرسنگا کے آدمی دیوانہ وار حملے کرتے رہے۔ یہ ان بے خبر انسانوں کا قافلہ تھا جو زیادہ فائدے کی امید میں دہلی کی طرف آئے تھے مگر تقدیر نے انہیں گھاٹے کا سودا کرنے پر مجبور کر دیا۔ یہاں تک کہ انہیں رہزنوں کے بازار میں اپنی جانیں فروخت کر دینا پڑیں۔ زمین کے ایک مختصر سے ٹکڑے پر قیامت [illegible] کو جدھر موقع ملا فرار ہو گئے۔ تجارتی

قافلے کے بیشتر افراد مارے گئے۔ باقی زمین پر پڑے سسک رہے تھے۔ نرسنگا کے بھی دو تین آدمی ہلاک ہو گئے۔ انہیں فوراً ہی تیل چھڑک کر جلا دیا گیا۔ پھر مشعلوں کی روشنی میں تاجروں کا سارا سامان لوٹ کر جنگلیوں کی ٹولی اپنے مرکز کی طرف واپس لوٹنے لگی۔

کامران نے اپنی زندگی میں پہلی بار قتل و غارت کے یہ ہولناک منظر دیکھے تھے۔ جب وہ رات گئے سردار نرسنگا کے سامنے آیا تو اس کے چہرے کی رنگت اڑی ہوئی تھی۔

نرسنگا نے کامران کی یہ حالت دیکھی تو قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ ''تماشا پسند آیا چھوٹے ٹھاکر؟''

''نرسنگا! تو نے انسانوں کو قتل ہوتے دیکھا ہے' ان کی چیخیں سنی ہیں؟'' کامران کی آواز لرز رہی تھی۔

''یہ تو میرا پیشہ ہے ٹھاکر! ان ہی لاشوں کا خون پی کر جوان ہوا ہوں اور یہی چیخیں مجھے کیف و نشاط کے نغمے سناتی ہیں۔'' نرسنگا کے ہونٹوں پر ایک سفاک مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔

کامران کے خون کی گردش تیز ہو گئی۔ نرسنگا اپنے سامنے پڑے ہوئے سونے چاندی کے سکوں اور زیورات کے ڈھیر کو اتنے اطمینان سے دیکھ رہا تھا' جیسے یہ ساری دولت اسے انعام میں دی گئی ہو۔

ابھی کامران کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ امر پالی نرسنگا کی خواب گاہ میں داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھوں میں شراب سے لبریز ایک بلوریں جام تھا جسے اس نے ادائے خاص کے ساتھ اپنے شوہر کو پیش کیا۔ نرسنگا نے کسی جانور کی طرح پیالے کو منہ لگا دیا۔

کامران کو محسوس ہوا جیسے ساری دنیا انسانی خون کا سمندر بن گئی ہے اور نرسنگا اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اس سمندر میں تیر رہا ہے۔

شراب پینے کے بعد نرسنگا نے لوٹے ہوئے مال میں سے ایک قیمتی ہار اٹھا کر امر پالی کی طرف دیکھا۔ امر پالی کامران کی موجودگی کا احساس کئے بغیر نرسنگا کے قریب ہو گئی۔ سردار نے جھومتے ہوئے وہ ہار امر پالی کو پہنا دیا۔

''جنگل کی رانی کیلئے سردار نرسنگا کی جانب سے ایک حقیر سا تحفہ۔''

امر پالی رقص کے سے انداز میں لہرائی اور پھر نرسنگا کے قدموں پر جھک گئی۔ ''اپنے دیوتا کے حضور ایک کنیز کا عاجزانہ سلام۔''

نرسنگا نے مخمور نگاہوں سے امر پالی کو دیکھا اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

پھر امر پالی اس طرح چلی گئی جیسے بادِ صبا کا کوئی جھونکا گزر گیا ہو۔

کامران زمانے کے انقلاب پر سوچنے لگا۔ کس کا ہار تھا اور کس کی گردن کی زینت بنا؟

''کیا سوچ رہے ہو ٹھاکر؟'' نرسنگا کی آواز سے سرشاری جھلک رہی تھی۔

''تو نے مجھے یہ تماشا کیوں دکھایا نرسنگا؟'' کامران کے لہجے کا درد کچھ اور گہرا ہو گیا تھا۔

''اس لئے کہ تیرے کان ان چیخوں کے عادی ہو جائیں۔ ابھی تو بڑا شور اٹھے گا' بڑے خوں رنگ تماشے ہوں گے یہ تو کچھ بھی نہیں تھا۔'' نرسنگا پتھر سے بھی زیادہ بے حس نظر آ رہا تھا۔

''بس! میں دیکھ چکا تیرے تماشے۔'' کامران شدید طیش کے عالم میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میں اس درندگی میں تیرا شریک نہیں بن سکتا۔ میں واپس جا رہا ہوں۔''

''کہاں جائے گا ٹھاکر؟ کیا تجھے نانکاری کا حشر یاد نہیں؟'' یہ کہتے کہتے نرسنگا کی آنکھوں سے خون ٹپکنے لگا۔

❋❋❋

شجاع الدین کامران خاموش کھڑا رہا۔ بات اچانک بگڑ گئی اور نرسنگا مشتعل ہو گیا۔ ''کیا تیرے خیال میں یہاں تمہارا اپنی مرضی سے واپس لوٹ جانا کوئی کھیل ہے؟'' نرسنگا کی آواز سے نفرت وقہر کا اظہار ہو رہا تھا۔

''میں اندھیرے میں تھا نرسنگا!'' بالآخر کامران کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔ ''میں نے تیرے چہرے کا یہ زاویہ پہلے نہ دیکھا تھا۔''

''اب تو پہچان لیا کہ میں کون ہوں؟'' نرسنگا کے لہجے میں بدستور شعلے برس رہے تھے۔ ''اس تعارف کے بعد بھی جانا چاہتا ہے؟ موت کی دیوی کی قسم! تیرا حشر ناکاری سے زیادہ لرزہ خیز ہوگا۔''

''مجھے بزدلوں کی طرح دھمکیاں نہ دے نرسنگا! میں تیرا احترام کرتا ہوں۔'' شجاع الدین کامران کی آواز بھی پہلے سے بہت زیادہ تیز تھی۔

نرسنگا ایک لمحے کے لئے چونک اٹھا۔ ''کیا یہی تیرا احترام ہے تو مجھے دشمنوں کی نظر سے دیکھ رہا ہے اور باغیوں کے لہجہ میں گفتگو کر رہا ہے؟''

''تیری بینائی کمزور ہے نرسنگا۔'' کامران کا لہجہ کچھ اور سخت ہو گیا تھا۔ ''آگ کا کھیل کھیلتے کھیلتے تیری پتلیاں سکڑ گئی ہیں اور اب تیری یہ حالت ہو گئی ہے کہ تو دوست اور دشمن میں تمیز بھی نہیں کر سکتا۔''

''کیسے دوست اور کیسے دشمن؟'' نرسنگا بھڑک اٹھا۔ ''میں تم سب کو جانتا ہوں' آج میرے ہاتھ سے تلوار چھوٹ گئی تو ہر شے دشمنی کا لبادہ اوڑھ لے گی۔ پھر یہی دوست تڑپ تڑپ کر مر جانے کا انتظار کریں گے اور جب میرے ہاتھ تھم جائیں گے تو یہی جاں نثار میری لاش پر رقص کریں گے۔''

''رقص کرنے والوں میں ان لوگوں کا شمار کر جن سے تیری پرانی شناسائی ہے۔'' کامران بھی موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دے رہا تھا۔ میری بات نہ کر کہ میں تو تیرے دیار میں اجنبی ہوں۔ چند دنوں کا ساتھ ہے مگر پھر بھی تیری وفاداری کا دم بھرتا ہوں۔''

''یہ تیرے دل کی آواز نہیں ہے چھوٹے ٹھاکر!'' نرسنگا کی زبان سے اب بھی انگارے برس رہے تھے۔ ''تو اپنے انجام سے ڈر گیا ہے اس لئے میری خوشامد پر اتر آیا ہے۔''

''تو خوب جانتا ہے کہ میں بزدلوں کی اولاد نہیں ہوں۔'' کامران کی آواز کچھ اور اونچی ہو گئی تھی۔ ''لیکن تجھے یہ خبر نہیں کہ میرے بزرگ کون تھے؟ اگر خوشامد میرا مذہب ہوتا تو میں اس تاریک جنگل میں ٹھوکریں کھانے کے بجائے دربار شاہی سے وابستہ ہوتا یا پھر کم سے کم شاندار حویلی میرے رہنے کا ٹھکانہ ہوتی۔ کاش نرسنگا! تو نے میرے باپ کو دیکھا ہوتا کہ اس نے کس طرح سلطان وقت کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تھا اور پھر وہ کس طرح مقتل تک پہنچا تھا۔ دیکھنے والے بتاتے ہیں کہ میرے والد رائے نعیم الدین ذیشان نے جس طرح موت کو گلے لگایا ہے اس پر

شجاعت و مردانگی کی تاریخ ہمیشہ ناز کرے گی۔"

"تو میرے سامنے اپنی خاندانی عظمتوں کے حوالے کیوں پیش کر رہا ہے؟" سردار نرسنگا کا لہجہ غضب ناک تو نہیں تھا لیکن چہرے پر بیزاری کے آثار صاف نمایاں تھے۔

"اس لئے کہ تو نے مجھے بزدلی اور خوشامد کا طعنہ دیا ہے۔" شجاع الدین کامران نے چیختے ہوئے کہا۔ "آئندہ مجھے ایسی گالی نہ دینا سردار کہ میرے دل سے تیرا احترام ختم ہو جائے اور سب کے سامنے بغاوت پر آمادہ ہو جاؤں۔" بڑی خوفناک دھمکی تھی۔ کامران کا خیال تھا کہ ان الفاظ کی گرمی سے نرسنگا کے دل و دماغ جل اٹھیں گے مگر حیرت انگیز طور پر وہ خاموش بیٹھا رہا۔

"میں اپنے انجام سے نہیں ڈرتا کہ میرے لئے سانسوں کے کاروبار میں زیادہ کشش نہیں ہے۔" کامران کے لہجے میں وہی آگ تھی۔ "میں اپنی زندگی قتل و غارت کے ساہوکاروں کے پاس رہن رکھ آیا ہوں نرسنگا! اگر تجھے بھی تشدد کا شوق ہے تو مجھے نانکاری کی طرح درخت پر لٹکا دے۔ پھر میرے جسم کو تیروں سے چھلنی کر دے۔ اس کے بعد تجھے اندازہ ہو جائے گا کہ میں کس انداز کا سچ بولنے والا ہوں؟"

نرسنگا بدستور چپ بیٹھا رہا' مگر اس کی آنکھوں کی سرخی بتا رہی تھی کہ سینے کی گہرائیوں میں قہر و غضب کی آگ بھڑک رہی ہے۔

"سردار! کیا تو نے ان مظلوموں کی چیخیں سنی ہیں جن کے بدن کا گوشت تیرے کارندے نوچ نوچ کر کھا جاتے ہیں؟"

اس بار بھی نرسنگا کے ہونٹوں کو جنبش نہیں ہوئی۔ بس اس کی آنکھوں کا رنگ کچھ اور سرخ ہو گیا۔

"خدا کے لئے نرسنگا اپنے سر سے طاقت کے اس نشے کو اتار دے۔ اگر تجھے قدرت کے نادیدہ ہاتھوں سے ڈر نہیں لگتا تو ایک بار کسی شمشان میں جا کر دیکھ کہ وہاں کیسے کیسے زور آور انسانوں کی خاک تک باقی نہیں ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ ستمگروں کے قافلے کدھر سے آئے تھے اور کدھر چلے گئے؟ موت کی اس آندھی میں تیری حیثیت تو ایک تنکے سے بھی کم ہے۔ پھر تو کس بات پر اترا رہا ہے؟ اپنے اوپر رحم کر نرسنگا کہ رسی کھنچنے والی ہے۔"

نرسنگا کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ وہ کسی زخمی درندے کی طرح دہاڑا۔ "میرے سامنے سے چلا جا ٹھاکر!" نرسنگا دیوانہ سا ہو گیا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے بال پکڑ لئے۔ لٹیروں کے سردار پر ہذیانی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ "نرسنگا نے تجھے بہت برداشت کر لیا۔ کالی کی قسم! آج تک سردار سے کوئی اس لہجے میں مخاطب نہیں ہوا۔"

"میں جا رہا ہوں نرسنگا' مگر تو بھی خوب سمجھ لے کہ اب کبھی مجھے کسی ایسے جشن میں شریک نہ کرنا۔" شجاع الدین کامران نے اسی سخت لہجے میں جواب دیا اور بے نیازی کے ساتھ چلتا ہوا نرسنگا کے کمرے سے نکل کر چلا گیا۔

کامران کے لئے وہ رات بڑے اضطراب کی رات تھی۔ دیوداسی شکنتلا کھانا لے کر آئی تو اس نے پرتکلف غذاؤں کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ وہ...... شدید بے چینی کے عالم میں ادھر ادھر ٹہل رہا تھا۔ شکنتلا اس کی یہ حالت دیکھ کر گھبرا گئی۔

"رائے شجاع الدین! کیا تم کھانا نہیں کھاؤ گے؟" دیوداسی کے لہجے میں وہی اپنائیت تھی۔

"نہیں! آج کوئی چیز اچھی نہیں لگ رہی ہے۔" کامران نے اسی طرح منہ پھیرے ہوئے جواب دیا۔ "جی چاہتا ہے کہ آج اپنا ہی گوشت کھا لوں اور اپنا ہی خون پی جاؤں۔"

شکنتلا لرز کر رہ گئی۔ اس نے کامران کی زبان سے اب تک ایسی مایوس کن باتیں نہیں سنی تھیں۔

''کیا ہوا......؟ کچھ مجھے بھی تو بتاؤ۔'' شکنتلا کامران کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں خوف کے سائے کانپ رہے تھے۔

''تم نے ٹھیک کہا تھا دیوداسی!'' کامران نے پہلی بار شکنتلا کو لہجہ بدل کر مخاطب کیا تھا۔ ''مجھے نرسنگا کے قریب نہیں جانا چاہئے تھا۔''

''میں نے تو پہلے ہی دن اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر تمہیں روکنے کی کوشش کی تھی۔'' شکنتلا کی آواز میں انتہائی کرب کے ساتھ جھنجھلاہٹ بھی شامل تھی۔

''آج تمہیں میرے مشوروں کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔''

کامران ایک مرتبہ پھر اپنے خول میں واپس لوٹ گیا۔ ''مجھے یقین تھا کہ تمہارے پاس بھی طعنہ زنی کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ معاف کرنا زبان لڑکھڑا گئی۔ آئندہ اتنی احتیاط رکھوں گا کہ تمہیں کوئی مشورہ دینے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔'' اگرچہ کامران کا لہجہ سپاٹ تھا' لیکن شکنتلا نے ہر لفظ میں چھپی ہوئی بے پناہ تلخی کو فوری طور پر محسوس کر لیا تھا۔

''پرماتما کی قسم! کامران! تم نے مجھے غلط سمجھا۔'' دیوداسی کا انداز یکسر بدل گیا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ التجا کر رہی ہو۔ ''میں تمہیں اس لئے طعنے نہیں دیتی کہ خودغرض لوگوں کی طرح میرے نفس کی بھی تسکین ہو جائے۔ مجھے مکمل طور پر تو نہیں مگر کچھ اندازہ ضرور ہے کہ تم نے کوئی گہرا زخم کھایا ہے۔ میں اس زخم کو اس لئے کریدتی ہوں کہ تم سوزش سے بے قرار ہو جاؤ اور پھر اس نرک (دوزخ) کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دو۔''

کامران نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بے تعلقی کے انداز میں کھڑا دوسری طرف دیکھتا رہا۔

شکنتلا نے بھی زاویہ بدل دیا۔ اب وہ کامران کے روبرو تھی اور وارفتگی کے انداز میں کہہ رہی تھی۔ ''رائے! مجھے بتاؤ کہ تمہارے ساتھ جنگل میں کیا حادثہ پیش آیا۔ تم نرسنگا کے بارے میں کیا کہنا چاہتے تھے؟''

''کچھ نہیں۔'' کامران پلٹا۔ ''اس بات کو یہیں ختم کر دو دیوداسی۔ میں غلطی پر تھا۔ نہ جانے وہ کیسی لہر تھی جو مجھے ڈبو کر چلی گئی۔ اب میں تم سے کچھ نہیں پوچھوں گا۔''

''تمہیں پوچھنا ہوگا۔'' شکنتلا بچوں کی طرح مچل گئی۔ ''اگر مجھ سے نہیں کہو گے تو پھر پتھروں کی اس بستی میں کب تک سر ٹکراؤ گے۔ یہاں تمہاری سننے والا کون ہے؟'' دیوداسی نے آج تکلف کی تمام دیواریں گرا دی تھیں۔

کامران کے تیور اچانک بدل گئے۔ ''ہوش کی باتیں کرو شکنتلا! میں تمہیں پہچانتا تک نہیں کہ تم کون ہو؟ پھر مجھ سے یہ قربت کا اظہار کیوں؟ میرا تم سے کوئی رشتہ نہیں تم صرف کرشن راؤ کی ایک ادنیٰ ملازمہ ہو۔ اپنی حدود سے آگے نہ بڑھو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہاری یہ حیثیت بھی ختم ہو جائے۔ واپس جاؤ اسی وقت چلی جاؤ ورنہ ٹھاکر کا یہ تہہ خانہ میری آواز کی گرج سے گونج اٹھے گا۔ پھر ہو سکتا ہے کہ مندر کے لوگ بھی اس تماشے کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔''

کامران کی جنونی کیفیت نے کچھ دیر کے لئے شکنتلا کو پتھر کے مجسمے میں تبدیل کر دیا تھا۔ پھر وہ بڑی مشکل سے اپنی اصل حالت کی طرف لوٹی۔ ''مجھے اعتراف ہے رائے شجاع الدین کامران کہ میں ٹھاکر کرشن راؤ کی ایک حقیر ترین لونڈی ہوں اور میں اپنی حیثیت کے اس دائرے سے نکلنا بھی نہیں چاہتی' مگر تم مجھے صرف اتنا بتا دو کہ تم سے نرسنگا نے کیا کہا تھا؟''

''دیوداسی! مجھے اتنا پریشان نہ کر کہ میرے صبر کا پیمانہ چھلک جائے۔'' کامران کا لہجہ کچھ اور شعلہ بار ہو گیا تھا۔

''میں دیوانگی کے دروازے تک پہنچ [illegible] مرے لباس کی دھجیاں بکھر جائیں

گی۔ میں تجھے کچھ نہیں کہہ سکتا کہ آخر تو ایک عورت ہے' مگر اپنے گریبان پر تو میرا زور چلتا ہے۔ میں اپنے سر کو تو دیوار زنداں سے ٹکرا سکتا ہوں۔"

"رائے! آج کی رات خاموش نہ رہو۔ تمہیں تمہاری ماں کی قسم! آج مجھ سے سب کچھ کہہ ڈالو پھر میں اپنے ہونٹوں کو سی لوں گی اور میری خاموشی کی داستان مکمل ہو جائے گی۔"

شجاع الدین کامران اس انگارے کی طرح بجھ گیا جس پر اچانک کسی نے پانی ڈال دیا ہو۔ شکنتلا نے اس کے سرکش ارادوں کو زنجیر پہنا دی تھی۔

ماں کا ذکر آیا تو کامران کی نظروں کے سامنے سے ایک لمحے میں کئی زمانے گزر گئے۔ پھر اسے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ وہ گھبرا کر آگے بڑھا اور اس نے دیوار سے سر ٹیک دیا۔

شکنتلا کی خوشی ناقابل بیان تھی۔ وہ ایک ایسے طوفان کو روکنے میں کامیاب ہو گئی تھی جس کی باغیانہ رفتار کا اسے اندازہ ہی نہیں تھا۔ دیوداسی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کامران کے قریب پہنچ گئی۔

"تو نے مجھے کس ذات کی قسم دیدی شکنتلا؟" کامران کی آواز میں ان آنسوؤں کی نمی تھی جو ابھی پلکوں تک نہیں آئے تھے۔ "تو نے یہ کیا کیا دیوداسی؟"

"رائے! مجھے معاف کر دو۔ آج کے بعد میں تم سے کچھ نہیں کہوں گی۔" شکنتلا کو اپنے آپ پر اختیار نہیں رہا تھا۔ وہ روئی تو اس طرح جیسے شدید حبس کے بعد بادل کا کوئی ٹکڑا برس پڑا ہو۔

پھر بہت دیر بعد یہ ماتمی سی فضا اعتدال پر آئی۔

"دیوداسی! میں نے بچپن سے لے کر آج تک نفرتوں کے سوا کچھ نہیں دیکھا۔" آخر کامران کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی اور اس نے اپنی محرومیوں کی طویل داستان کا ایک ایک ورق الٹ دیا۔ بس یاسمین خانم کا ذکر نہیں کیا۔

اس دوران شکنتلا روتی ہی رہی۔

"میں اپنے دل کا درد کسی سے بیان نہیں کرتا۔" کامران کا لہجہ سوگوار تھا۔ "جس قدر عقل مجھے دی گئی ہے اسی کے مطابق کام کر رہا ہوں۔ انجام کی پروا نہیں کہ موت ایک عام سی چیز ہے۔ آئے دن لوگ مرتے رہتے ہیں۔ میں دنیا سے رخصت ہو گیا تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

"اور ماں کا کیا ہوگا جس کی آنکھیں تمہارے انتظار میں پتھرا چکی ہوں گی....." شکنتلا نے پوچھا۔ "کیا تم اس پر ایک اور موت مسلط کرنا چاہتے ہو؟"

"نہیں! میں انہیں نئی زندگی دینا چاہتا ہوں۔" کامران نے پر جوش لہجے میں کہا۔

"یہ زندگی دینے کے انداز ہیں؟" شکنتلا بہت محتاط انداز میں بول رہی تھی۔

"میں اس داغ کو دھو ڈالوں گا جو قائم خان راجپوت اور قاضی عماد نے میری شخصیت پر لگایا ہے۔" یکا یک کامران کی آنکھوں میں نفرتوں کی چنگاریاں پھوٹنے لگی تھیں۔ "اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ قائم خان اور قاضی عماد اپنے جرم کا اعتراف کر لیں۔"

"اگر یہ اتنا آسان ہوتا تو تمہارے دو سال قید خانے کے اندھیروں میں کیوں گزرتے؟" شکنتلا ایک ذہین اور تعلیم یافتہ عورت تھی۔ کئی سال تک ہزاروں عورتوں کو مذہب کا درس دیتے دیتے اس کی تقریر کی صلاحیتوں میں بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا۔ آج وہ اپنی اسی خوبی کے ذریعے کامران کو لاجواب کرنا چاہتی تھی تاکہ اس کے ذہن سے انتقام کا غبار دھل جائے۔

''جب تک کہ مجھے موت نہ آ جائے اس وقت تک میں اپنے منصوبے کی کامیابی پر یقین رکھتا ہوں۔'' کامران نے شکنتلا کے دلائل کو اس طرح جھٹلا دیا جیسے وہ گیانی عورت کے بجائے ان پڑھ لڑکی ہو۔

''آخر وہ تمہارا منصوبہ کیا ہے؟'' شکنتلا نے بڑی ہوشیاری سے کامران کو اپنی راہ پر لانے کی کوشش کی۔

''بس اس سے آگے کچھ نہیں۔ یہاں پہنچ کر میرے اور تمہارے درمیان ایک ایسی خلیج حائل ہو جاتی ہے جسے کبھی اور کسی حالت میں عبور نہیں کیا جا سکتا۔'' کامران نے تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میرے اس منصوبے کے بارے میں کچھ پوچھنا بھی نہیں کہ وہ میری ذات کا خلوت کدہ ہے اور میں اپنی تنہائی میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔''

کامران کے اس قدر جارحانہ جواب سے شکنتلا کی خوش گمانیاں ریزہ ریزہ ہو گئیں' مگر اس نے حوصلہ نہیں ہارا۔

''کیا تم اپنے اس مخصوص منصوبے کو تکمیل تک پہنچانے میں کامیاب ہو جاؤ گے؟''

''میں تمہارے اس سوال کا جواب پہلے ہی دے چکا ہوں۔'' کامران کے چہرے پر بیزاری کے ہلکے ہلکے سائے لرزنے لگے تھے۔

شکنتلا مایوس ہو گئی۔ کامران اس کے سامنے بے نقاب ہوتے ہوتے رہ گیا۔

کچھ دیر تک کمرے کی فضا پر گہرا سکوت طاری رہا۔ پھر شکنتلا نے سردار نرسنگا کا ذکر چھیڑ دیا۔

''اس بات کو جانے دو دیوداسی!'' کامران کی آواز تھکی تھکی سی تھی۔ ''میں خود اپنے مسائل کا حل تلاش کر لوں گا۔''

''پھر مجھ سے نرسنگا کا ذکر کیوں کیا تھا؟'' شکنتلا ایک بار پھر گھبرا گئی۔ کامران اپنی ذات کے کھینچے ہوئے حصار میں واپس لوٹ جانا چاہتا تھا اور شکنتلا کی خواہش تھی کہ کسی طرح وہ اس دائرے کو توڑ کر باہر نکل آئے۔

''بس! وہ میری زبان کی لغزش تھی......'' کامران کے لہجے کی شکستگی بڑھتی جا رہی تھی۔ ''پتا نہیں تمہیں کچھ دیر کے لئے کیا سمجھ بیٹھا تھا۔ ایک سوال ذہن میں ابھرا تو تمہارے سامنے کسی تکلف کے بغیر کہہ ڈالا۔ اس امید میں کہ تم اپنوں کی طرح جواب دو گی...... مگر وہ میری خود فریبی تھی۔ چار دنوں کی مجبورانہ رفاقت سے کوئی اپنا نہیں ہو جاتا۔ پھر تمہارے اور میرے عقائد میں بھی زمین و آسمان کا فرق ہے۔ تم ایک ہندو لڑکی ہو جو دن رات بتوں کے قدموں پر اپنے سجدوں کے نشان ثبت کرتی رہتی ہے......اور میں ایک مسلمان ہوں جس کا خدا نادیدہ بھی ہے اور لاشریک بھی...... پھر تم مجھ سے کوئی رشتہ کس طرح قائم کر سکتی ہو۔''

''یہ رشتہ تو تمہارے آنے سے پہلے ہی قائم ہو چکا تھا رائے شجاع الدین کامران!'' شکنتلا کی آنکھوں میں شبنم کے قطرے لرزنے لگے۔ ''پھر جب تمہیں قریب سے دیکھا تو یہ رشتہ اس قدر مضبوط ہوا کہ ''امر'' ہو گیا۔ اب دنیا کا کوئی حادثہ اس رشتے کو توڑ نہیں سکتا۔''

کامران پر شدید حیرت طاری تھی۔ ''میں تمہاری بات کا مفہوم نہیں سمجھا۔''

''ایک دن سب کچھ سمجھ جاؤ گے۔'' شکنتلا نے آنسوؤں کے سمندر کو پی لیا تھا' لیکن اس کی آواز اب بھی لرز رہی تھی۔ ''فی الحال اتنا سمجھ لو کہ میں ہندو نہیں ہوں۔ میری بے چین روح برسوں سے زندگی کے برزخ میں بھٹک رہی ہے۔ میں نہیں جانتی کہ میری منزل کہاں ہے مگر میں بت پرست نہیں ہوں۔ نظام جبر میں سانس لینے کو میری مجبوری سمجھو۔''

کامران بھی فرط حیرت سے کچھ دیر کے لئے پتھر کے ایک مجسمے میں ڈھل گیا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے ہونٹ کانپنے لگے۔ ''تم ہندو نہیں ہو؟ مجھے بتاؤ کہ آخر تمہارا عقیدہ کیا ہے؟''

''ابھی اس کا وقت نہیں آیا......'' شکنتلا کا لہجہ بدستور سوگوارانہ تھا۔ ''تم نے چند دنوں کی رفاقت کو اپنائیت کے دائرے سے خارج کر دیا ہے کہ یہ کوئی ہوشمندی کی بات نہیں......'' شکنتلا ایک گیانی عورت کے انداز میں گفتگو کر رہی تھی۔ ''تم نے اپنا بننے کے لئے ماہ و سال کی شرط لگا دی ہے' مگر ان لوگوں کو کیا کہو گے جو صدیوں تک ایک ساتھ رہتے ہیں مگر پھر بھی اپنے نہیں ہوتے۔ کرشن راؤ اور میرے بزرگوں کے مذہب میں سیکڑوں سال کی رفاقت تھی لیکن تھا کر میرا اپنا نہیں بلکہ غیروں سے بدتر ہے' آخر تم اس رشتے کو کس نام سے پکارو گے؟''

شجاع الدین کامران پتھر کی مورت بن کر رہ گیا تھا۔

''شاید تم اس رشتے کو تسلیم نہیں کرو گے' مگر میں بہرحال تمہاری ہوں......'' شکنتلا نے آج سب کچھ کہہ ڈالا تھا۔ ''میں تم پر اس لئے اعتراض نہیں کرتی کہ اس طرح مجھے کوئی خوشی حاصل ہوتی ہے' تمہاری تکلیفوں کا خیال کر کے لہجہ بدل جاتا ہے اور تم سمجھ لیتے ہو کہ میں تمہارا مذاق اڑا رہی ہوں۔ رائے! تمہیں کیا خبر کہ میں کیا چاہتی ہوں۔ بس! تم اس خارزار سے نکل جاؤ۔ اگر تمہارے بدن پر ایک بھی خراش آئی تو میری روح تک زخمی ہو جائے گی۔ پھر زندہ رہنے کی وہ حسرت بھی دم توڑ دے گی جسے نفرتوں کے شمشان میں نہ جانے کس کس طرح بچا کر رکھا ہے۔''

''مجھے معاف کر دو دیوداسی!'' بالآخر کامران پگھل گیا۔ ''میری سماعتیں اس قدر مجروح ہو گئی ہیں کہ میں تمہاری زبان سے کوئی تلخ بات نہیں سن سکتا۔ میں جب تک بھی یہاں ہوں مجھ سے شیریں لہجے میں بات کیا کرو۔ میرا رشتوں سے اعتبار اٹھ گیا ہے' جب بھی کوئی نصیحت کرتا ہے تو میں بھڑک اٹھتا ہوں' مجھے تقریر کی نہیں' عمل کی ضرورت ہے۔ میں سر سے پاؤں تک زخمی ہوں۔ مجھ پر الفاظ کے نشتر نہ کھینچو۔ میرے نزدیک آؤ تو مرہم بدست آؤ۔ اگر لوگ یہ نہیں کر سکتے تو پھر مجھے تنہا چھوڑ دیں۔''

''میں نے تمہیں پہلے روز بھی تنہا نہیں چھوڑا۔'' شکنتلا کے ہونٹوں پر شکایت مچل گئی۔ ''تم نے غور سے دیکھا؟ میرے ہاتھ میں جلتا ہوا نشتر تھا یا انسانیت کا ٹھنڈا مرہم؟ مجھے بتاؤ رائے شجاع الدین مجھے بتاؤ۔''

''میری آنکھوں کے سامنے حادثات کا بہت کثیف غبار تھا شکنتلا! میں تمہیں پہچان نہیں سکا......'' کامران کے لہجے میں ندامت کا احساس ہو رہا تھا۔

''پہچانے تو اب بھی نہیں ہو۔'' شکنتلا نے کہا۔ ''اگر پہچان لیتے تو نرسنگا کے بارے میں خاموشی اختیار نہ کرتے۔''

دیوداسی کی شکایت آمیز گفتگو سن کر کامران گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اب اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ اپنے چند رازوں میں شکنتلا کو بھی شریک کر لے۔

''چلو یوں ہی سہی۔'' کامران نے اس طرح کھوئے ہوئے لہجے میں کہا جیسے خود تو مندر کے کمرے میں موجود ہو اور اس کے خیالات کہیں دور بھٹک رہے ہوں۔ ''مجھے بتاؤ کہ سردار نرسنگا کون ہے؟ میں نے کل رات اس کا جو روپ دیکھا ہے' وہ بڑا بھیانک ہے۔''

شکنتلا نے بے اختیار آنکھیں بند کر لیں۔ ''ایشور کی کرپا ہے تم نے خود نرسنگا کو بے نقاب دیکھ لیا۔ وہ درندوں سے بھی زیادہ بے رحم اور راکشسوں سے بھی زیادہ سفاک ہے۔ اس میں شیطان کی روح حلول کر گئی ہے۔'' یہ کہہ کر شکنتلا نے آنکھیں کھول دیں۔ ''تمہیں معلوم ہے شجاع الدین کامران کہ سیکڑوں معصوم لڑکیاں اس کی ہوس کا نشانہ بن چکی ہیں......اور بے شمار انسان اس کی ایک جنبش چشم پر موت کا لقمہ بنا دیئے گئے۔ اس کے بعد تم اندازہ کر سکتے ہو کہ بیواؤں اور یتیموں کی تعداد کیا ہو گی۔''

''ہاں! کل رات مجھے بھی اس نے ایک خوں رنگ منظر دکھایا تھا......'' کامران نے مختصراً تشدد کی اس واردات کا ذکر کر دیا جس میں تاجروں کا ایک قافلہ اپنے جان و مال دونوں سے محروم ہو گیا تھا۔

''پھر بھی تم اس کے ساتھ رہنے پر مجبور ہو۔'' شکنتلا کے لہجے میں کرب بھی پوشیدہ تھا اور طنز بھی۔

''خدا گواہ ہے کہ میں اس کے ظلم و ستم میں ذرہ برابر بھی شریک نہیں ہوں۔'' کامران وحشت زدہ نظر آنے لگا تھا۔ ''میں نے واضح طور پر کہہ دیا ہے کہ اگر آئندہ اس نے مجھے قتل و غارت کے کھیل میں تماشائی بنانے کی کوشش کی تو میں واپس چلا جاؤں گا۔''

''پھر نرسنگا نے کیا جواب دیا؟'' شکنتلا نے گھبرا کر پوچھا۔

کامران الجھ کر رہ گیا۔ وہ شکنتلا کو نرسنگا کی خوفناک دھمکی کے بارے میں کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے کوئی مناسب جواب تلاش کرنے لگا۔

کامران کو چپ دیکھ کر شکنتلا کی پریشانی میں مزید اضافہ ہو گیا۔ ''رائے! ایشور کے لئے تم خاموش نہ رہو۔ یہ وقت تکلف اور مصلحت کا نہیں۔ اگرچہ میں تمہیں اس جنگل کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتی، لیکن میں نرسنگا کی فطرت سے خوب واقف ہوں۔ صاف صاف بتا دو کہ اس نے تم سے کیا کہا تھا؟''

کامران نے کچھ دیر تک سوچنے کے بعد نالکاری کے لرزہ خیز انجام کا ذکر کیا اور پھر نرسنگا کے وہ الفاظ دہرا دیئے جن سے موت کی بو آتی تھی۔

''اے پرمیشور! اے پرمیشور!'' شکنتلا چیخ اٹھی۔ پھر اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا لیا۔

''بہت دیر کر دی تم نے رائے! بہت دیر کر دی۔'' دیوداسی رونے لگی۔ ''کاش! تم اسی وقت اپنی دنیا میں لوٹ جاتے جب پہلی بار میں نے تمہیں چلے جانے کا اشارہ کیا تھا۔''

''کیسی دیر؟ تم کیا کہہ رہی ہو شکنتلا؟'' کامران نے گھبرا کر پوچھا۔

''اب تم کہاں جاؤ گے رائے؟'' شکنتلا کی آواز بھی آنسوؤں کے اثر سے بھیگ گئی تھی۔

''کیوں؟ کیا میرے جانے پر کوئی پابندی ہے؟'' کامران نے سخت لہجے میں کہا۔

''پابندی لگ چکی رائے شجاع الدین کامران!'' شکنتلا شدید اضطراب میں کھڑی ہو گئی۔ ''تمہارے آزاد قدموں کو زنجیر پہنائی جا چکی۔ اب تم نرسنگا کے قیدی ہو، محض ایک مجبور قیدی...... جو اپنی مرضی سے نہ جی سکتا ہے اور نہ مر سکتا ہے۔''

''تمہاری سوچ صرف ایک غلام عورت کی سوچ ہے شکنتلا!'' کامران بگڑ گیا۔ ''مجھے کوئی زنجیر نہیں پہنا سکتا۔ میں جب چاہوں اس زنداں کی دیواریں توڑ کر باہر جا سکتا ہوں۔''

''ایسا سوچنا بھی نہیں۔'' شکنتلا لرز اٹھی۔ ''بے شک! تم یہاں سے نکلنے کی کوشش کر سکتے ہو، مگر تمہیں اندازہ نہیں کہ اس تہہ خانے کے ہر دروازے پر کیسا سخت پہرہ ہے؟ بالفرض یہاں سے نکل بھی گئے تو دہلی کے ہر گلی کوچے میں تمہیں کرشن راؤ کے خنجر بدست ملازم نظر آئیں گے۔ تم بہت تنہا ہو رائے شجاع الدین! کہاں تک مقابلہ کرو گے؟''

''سرفروش تمہاری طرح نہیں سوچتے۔'' کامران کی گردن میں خم نمایاں ہو گیا تھا۔ کاندھوں پر ایک بوجھ ہے، جہاں چاہیں گے اتار دیں گے۔''

''اور اس بوڑھی عورت کا کیا ہو گا جس نے تمہارے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ دیکھنے کیلئے کتنے سال گریہ وزاری کی ہے؟ ان دنوں کا شمار تو [illegible] ہوئے ہیں...... اور ان راتوں کا

حساب تو لگاؤ جس میں ویران سناٹوں اور دردناک اندھیروں کے سوا کچھ نہیں ہے۔'' شکنتلا نے بڑی ہوشیاری سے کامران کی رگ احساس پر لفظوں کا نشتر رکھ دیا تھا۔ ''رائے زادے! تنہا جان کو لٹا دینا بہت آسان ہے۔ پہلے دوسروں کا قرض ادا کر دو' اس کے بعد تم اپنی مرضی کے مالک ہو۔''

''پھر؟'' کامران کی آنکھوں کے سامنے ایک بڑا سوالیہ نشان ابھر آیا۔

''اگر تم انتقام سے باز آ جاؤ تو شاید کوئی صورت نکل آئے۔'' شکنتلا کے لہجے میں بڑی حسرت تھی۔

''یہ تو ایسا ہی ہے جیسے سورج مشرق کے بجائے مغرب سے طلوع ہونے لگے۔'' کامران کے اندر کا وحشی پھر جاگ اٹھا تھا۔ ''میں اور انتقام سے توبہ کرلوں...... یہ پاگل پن کی باتیں ہیں شکنتلا۔''

''ایک بار سینے کا غبار دھو کر تو دیکھو۔'' شکنتلا نے انتہائی محبت سے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''پھر تم اپنے آپ کو پھول سے بھی زیادہ ہلکا محسوس کرنے لگو گے۔''

''تم بھی انصاف طلبی کو انتقام سمجھتی ہو۔'' کامران کا لہجہ اچانک تلخ ہو گیا تھا۔ ''میں اپنے چہرے کی کالک دھونا چاہتا ہوں اور تم مجھے اسی حالت میں دربدر پھرنے کی تلقین کرتی ہو۔ یہ کیسی ہمدردی ہے؟''

''نہیں کامران! میں تمہیں غلط نہیں سمجھتی۔'' شکنتلا نے بگڑی ہوئی صورت حال کو سنوارنے کی کوشش کی۔ ''تم حق پر ہو۔ میں یہ نہیں کہتی کہ تم اپنے حق سے دستبردار ہو جاؤ مگر میری یہ التجا ضرور ہے کہ کچھ دن کسی گوشے میں بیٹھ کر اچھے وقت کا انتظار کرلو۔''

''کیسا وقت......؟'' کامران کی تلخی برقرار تھی۔

''وہ وقت جب ایک ایک ظالم اپنے اپنے اعمال نامے کے ساتھ عدالت میں کھڑا ہوگا اور پھر کسی ستمگر کے لئے کوئی راہ فرار باقی نہیں رہے گی۔'' یہ کہتے کہتے شکنتلا کا چہرہ اس آگ سے جل اٹھا جو اس کے اندر برسوں سے بھڑک رہی تھی۔

''اس وقت کا انتظار کرتے کرتے میں یہاں تک آ پہنچا۔'' ایک بار پھر کامران کا لہجہ نفرتوں میں ڈوب گیا تھا۔ ''وہ وقت کبھی نہیں آئے گا دیوداسی! یہ زمین اسی طرح ناانصافیوں سے بھری رہے گی اور عدالتیں کبھی قائم نہیں ہوں گی۔''

''تم ایک مسلمان ہو کر ایسی مایوسی کی باتیں کرتے ہو۔'' شکنتلا نے کہا۔ ''میں نے پتھروں کے ہجوم میں ساری زندگی بسر کی ہے' مگر مجھے پھر بھی یقین تھا کہ ان پتھروں کو توڑنے والے ہاتھ ایک دن ضرور بلند ہوں گے......اور پھر وہ دن آ گیا۔ تمہارے مذہب کے لوگوں نے ہندوستان پر یلغار کی ...... یہاں تک کہ اس زمین کے مالک غلام بنا لئے گئے۔ سردار نرسنگا اور ٹھاکر کرشن راؤ کتنے بھی آزاد ہوں لیکن ان کی حیثیت غلاموں سے زیادہ نہیں۔ تم تو باہر کی دنیا کے رہنے والے ہو۔ تمہیں خوب اندازہ ہوگا کہ وقت کی عدالت قائم ہوئی اور ایک ایک جفا کار کو اپنے مظالم کا حساب دینا پڑا۔ کیا تم اس انقلاب کو ایک کھیل سمجھتے ہو رائے زادے؟ یہ کھیل نہیں' ایشور کا فیصلہ ہے اور یہ فیصلہ اس وقت نازل ہوتا ہے جب دھرتی کی گود پاپوں سے بھر جاتی ہے۔ کرشن راؤ اور سردار نرسنگا تو حقیر کیڑے ہیں' بھیڑ اور بکریاں ہیں جب ہندوستان کا شیر' راجپوتوں کی آن' سمراٹ پرتھوی راج چوہان باقی نہیں رہا تو پھر یہ پیچھے سے چھپ کر وار کرنے والے لٹیرے کب تک اپنے آپ کو بچائیں گے۔ میں یہی چاہتی ہوں کہ کامران کہ تم کچھ دن ٹھہر کر آسمان کے فیصلے کا انتظار کرلو۔''

''پھر کیا ہوگا؟'' کامران کے اشتعال میں کسی حد تک کمی آ گئی تھی۔

''جب انصاف کی شمشیر ان درندوں کے حلقوم کاٹ دے گی تو تم بھی ان کے پنجوں سے آزاد ہو جاؤ گے۔'' شکنتلا نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے حیرت ہے کہ تمہاری حکومت ان لٹیروں کی طرف ابھی تک متوجہ کیوں نہیں ہوئی؟''

کامران دہلی کی سیاسی فضا کے بارے میں کیا جواب دیتا؟ اسے تو قاضی عماد' قائم خان راجپوت اور یاسمین خانم کے سوا کچھ یاد ہی نہیں تھا۔

''خیر! وہ وقت ضرور آئے گا جب یہ سارے لٹیرے اپنے بھیانک انجام کو پہنچ جائیں گے۔'' کامران کو خاموش پا کر شکنتلا نے کہا۔ ''اس سے پہلے یہ تمہیں چین سے جینے نہیں دیں گے...... میں ان کی خون آشام فطرت سے خوب واقف ہوں۔ یہ تمہیں ناقابل بیان آزار پہنچائیں گے۔''

''آخر کیوں......؟'' شجاع الدین کامران نے ایک طفلانہ سا سوال کیا۔

''اس لئے کہ تم ان کے ٹھکانوں کو پہچانتے ہو۔'' شکنتلا نے جھنجھلا کر کہا۔ ''تم اس راز سے واقف ہو کہ تاریک جنگل میں کس قسم کا کاروبار ہوتا ہے؟ وہ ایسی حماقت کبھی نہیں کریں گے کہ تم یہاں سے نکل کر چلے جاؤ اور پھر حکومت کے کسی عہدیدار کو نرسنگا کی سرگرمیوں کے بارے میں سب کچھ بتا دو۔ تمہاری اس خبر رسانی سے ان کی جانوں کے لالے پڑ جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ نرسنگا نے تمہیں خوفناک ترین دھمکی دی ہے۔ اب تم اسی صورت میں زندہ رہ سکتے ہو کہ خود بھی درندگی کا لباس پہن کر ان کی صفوں میں شامل ہو جاؤ۔''

''میں نے نرسنگا کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا ہے۔'' کامران کی آواز سے سرکشی کا رنگ نمایاں تھا۔

''تمہارے ذاتی فیصلے سے کچھ نہیں ہوتا۔'' کامران کی سادگی نے شکنتلا کو الجھا کر رکھ دیا تھا۔ ''فیصلہ ان کا ہوتا ہے جن کے ہاتھوں میں طاقت ہوتی ہے۔ وہ تمہیں ایک بار جرائم میں ملوث کرنا چاہتے ہیں۔ پھر تم خود ہی ان کی پناہ ڈھونڈنے پر مجبور ہو جاؤ گے۔'' آخر دیوداسی نے مبہم الفاظ میں کرشن راؤ کے منصوبے کو ظاہر کر دیا۔ وہ اپنے دل سے مجبور تھی۔ اس لئے زندگی کی پروا کئے بغیر بے نقاب ہو گئی۔ شکنتلا کو کامران کی جذباتی طبیعت کا اندازہ تھا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ سرکش نوجوان اس کے الفاظ کو کرشن راؤ یا نرسنگا کے سامنے دہرا بھی سکتا ہے۔ مگر اب اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا کہ خوفناک حقیقتوں کو بیان کر کے کامران کے بڑھتے ہوئے قدموں کو روک دیا جائے۔

یہ انکشاف سن کر رائے شجاع الدین کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔

''تمہارے نزدیک یہ بچوں کا کوئی کھیل ہے؟'' شکنتلا نے کامران کی الجھن سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ ''کبھی تم نے کرشن راؤ کی مہربانیوں کی وجہ جاننے کی کوشش کی؟ چاندی کے سکوں سے بھری ہوئی تھیلی' یہ جانشینی کا اعلان' یہ خاطر مدارات' کیا یہ سب کچھ بے سبب ہے؟'' شکنتلا کی آواز بہت زیادہ تیز ہو گئی تھی۔ ''آخر تم سے اس کا کیا رشتہ ہے؟ میں پوچھتی ہوں رائے زادے! تم سے پوچھتی ہوں' میرے سوال کا جواب دو۔'' شکنتلا کامران کے قریب آ گئی تھی اور اس کی آنکھوں میں عجیب سے رنگ کروٹیں لے رہے تھے۔

کامران سراسیمہ سا نظر آنے لگا تھا۔ اس کے پاس شکنتلا کے اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

''کرشن راؤ دہلی کا سب سے بڑا سود خور ہے۔ شجاع الدین کامران!'' شکنتلا جذبات سے بے قابو ہو گئی تھی۔ ''وہ کبھی گھاٹے کا سودا نہیں کرتا۔ ایشور کے لئے یہاں سے چلے جاؤ۔ اپنی ماں کو ساتھ لے کر بہت دور چلے جاؤ۔ ہندوستان کے کسی ایسے گمنام گوشے میں روپوش ہو جاؤ جہاں ٹھاکر کے پالے ہوئے بھیڑیے تم تک نہ پہنچ سکیں۔ یہ دن صبر و ضبط کے ساتھ گزار دو پھر جب انصاف کے تیز ہتھیاڑوں سے یہ بھیڑیئے ذبح کر دیئے جائیں' اس وقت تم اپنی

کمین گاہ سے باہر نکل آنا۔ اگر اس عرصے میں تم قاضی عماد اور قائم خان کو معاف نہ کر سکو تو پھر ان سے انتقام لے لینا۔ اپنے آپ کو دو طاقتور محاذوں پر نہ الجھاؤ۔ ایک محاذ پر جنگ کرنا تمہارے لئے نسبتاً آسان ہوگا۔"

کامران کچھ دیر خاموش کھڑا رہا۔ پھر خلاف معمول بہت آہستہ لہجے میں کہنے لگا۔ "شکنتلا! اس میں کوئی شک نہیں کہ تمہاری باتوں نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ میں کچھ دن انتظار کر لیتا مگر میرے پاس وقت نہیں ہے۔"

"میں تمہاری بات سمجھنے سے قاصر ہوں۔" شکنتلا شدید اضطراب میں مبتلا تھی۔

"کئی سال تک میں اپنے مرحوم باپ کو خواب میں دیکھا کرتا تھا۔" کامران نے اپنی داستان درد کا ایک نیا ورق الٹتے ہوئے کہا۔ "اور اب یہ حال ہے کہ روزانہ ہی اپنی لاش کو ایک درخت پر لٹکا ہوا دیکھتا ہوں۔ پرندے میرا جسم نوچ نوچ کر کھا جاتے ہیں اور جب میرے بدن کی ہڈیاں نمایاں ہونے لگتی ہیں تو خوف و دہشت سے آنکھ کھل جاتی ہے۔ میں یہ خواب ایک تسلسل کے ساتھ دیکھتا ہوں۔ پہلے میرا خیال تھا کہ یہ خواب ذہنی پریشانی کا اثر ہے لیکن اب یقین ہو چلا ہے کہ میری زندگی بہت کم ہے۔ میں عنقریب قتل کر دیا جاؤں گا۔"

"بس چپ ہو جاؤ۔" شکنتلا نے بے قرار ہو کر کہا۔

اس بار کامران نے وحشت کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اس نے آہستہ سے شکنتلا کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا۔ "جب تم اتنے قریب آ گئی ہو تو پھر میرے جذبات کو بھی سمجھنے کی کوشش کرو۔ اگر آسمان پر میری موت کا فیصلہ ہو چکا ہے تو دنیا پرستوں کی طرح مایوس نہ کرو۔ مجھے حوصلہ دو کہ میری جان پر اپنے بزرگوں کا بہت بڑا قرض ہے۔ میں دنیا سے اس طرح جانا نہیں چاہتا کہ لوگ میرے سیاہ اعمال کو میرے باپ کے نام سے منسوب کر دیں۔ یہ بڑی شرمناک موت ہوگی۔ خدا مجھے اس موت سے محفوظ رکھے۔"

"وہ تمہاری پریشان خیالی کا نتیجہ ہے کامران! اس خواب کی کوئی حیثیت نہیں۔" شکنتلا نے ایک بار پھر لفظوں سے بہلانا چاہا۔

"تمہیں کیا خبر دیوداسی کہ مجھ پر کیا گزر رہی ہے؟" کامران بہت تھکا ہوا نظر آ رہا تھا۔ "اگر وہ خیال پریشان ہوتا تو اس طرح میرا تعاقب نہ کرتا۔"

"کیا تمہیں یقین ہے کہ تمہارے ہاتھ قاضی عماد اور قائم خان کے گریبان تک پہنچ جائیں گے؟" شکنتلا نے ایک اور منطق تراش لی۔ "اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ ٹھاکر کرشن راؤ اور سردار نرسنگا تمہیں قائم خان کی حویلی تک جانے کی اجازت دے دیں گے۔"

"ضمانت تو کسی بھی بات کی نہیں۔" کامران نے خوف ناک حقیقتوں کا اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

"پھر تم نے کس بنیاد پر یہ بازی کھیلی تھی۔ نادان جواری!" شکنتلا رونے لگی۔ "تم یہاں کیوں آئے تھے؟ میں نامراد کس کس غم کو برداشت کروں گی؟"

"میرے بارے میں زیادہ نہ سوچا کرو شکنتلا! میں تو اندھیروں کے قافلے کا ایک ایسا مسافر ہوں جس کی کوئی منزل نہیں۔ مجھے چھوڑ کر چلی جاؤ۔" کامران بھی اچانک مایوسی کا شکار نظر آنے لگا تھا۔ "کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہاری ان رفاقتوں کی خبر ٹھاکر کو ہو جائے اور پھر تم بھی میری طرح معتوب قرار پاؤ۔"

"اس کا وقت گزر چکا رائے زادہ!" شکنتلا نے بے اختیار ہو کر کہا۔ "تم اپنے آپ پر قابو رکھو اور مجھے سوچنے دو عیاروں کا یہ جال مردانگی سے نہیں، فریب سے ٹوٹے گا۔ میں ابھی تمہاری طرف سے مایوس نہیں ہوں، لیکن ایک وعدہ کرو کہ تم مجھ سے کوئی بات نہیں چھپاؤ گے۔"

❋❋❋

کامران حسب معمول نرسنگا کے آدمیوں کی نگرانی میں جنگل جاتا رہا۔ دن بھر وہ شمشیر زنی، نیزا بازی، تیر اندازی اور شہسواری کی مشق کرتا اور شام ہونے سے پہلے بڑے مندر لوٹ آتا۔ شکنتلا کی ہدایت کے بعد اس نے اپنے گردوپیش کی فضا کا جائزہ لینا شروع کر دیا تھا۔ اب کامران کو محسوس ہو رہا تھا کہ ہر وقت کچھ لوگوں کی نظریں اس کا تعاقب کرتی رہتی ہیں۔ اس عرصے میں کرشن راؤ نے اسے ایک بار بھی طلب نہیں کیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے اچانک وہ سب لوگ اس سے بے نیاز ہو گئے ہوں۔ شکنتلا ہر رات کسی نئے واقعے کے بارے میں پوچھتی، مگر کامران کے پاس خاموشی کے سوا کوئی جواب نہ ہوتا۔ وہ دیوداسی کو بس اتنا ہی بتا سکا کہ اس دن کی تلخ کلامی کے بعد سے آج تک سردار نرسنگا اس کے سامنے نہیں آیا ہے۔ شکنتلا کے لئے یہ بات غیر معمولی تھی، مگر وہ بھی نرسنگا کی پراسرار روپوشی کا کوئی معقول سبب تلاش نہ کر سکی۔

اسی کشمکش کے دوران ایک روز کامران کو ماں کی یاد ستانے لگی تو وہ خود چل کر کرشن راؤ کے پاس پہنچا۔

''ٹھاکر! میں ایک دن کے لئے ہانسی جانا چاہتا ہوں۔''

''کیوں......؟'' کرشن راؤ کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

''میں اپنے دوست سے اپنی والدہ کی خیریت معلوم کرنا چاہتا ہوں۔'' کامران بہت زیادہ مضطرب نظر آ رہا تھا۔

''تمہاری ماں بالکل ٹھیک ہے۔ میرے آدمی روزانہ اس کے بارے میں مجھے اطلاع دیتے رہتے ہیں۔'' کرشن راؤ نے انتہائی سرد لہجے میں کہا۔ ''اب تم یہاں سے نکل کر سیدھے قائم خان کی حویلی تک جاؤ گے۔ اس کے علاوہ تمہیں کہیں جانے کی اجازت نہیں ہو گی۔''

''وہ دن کب آئے گا؟'' کامران نے پرجوش لہجے میں پوچھا۔

''ابھی تمہیں طویل انتظار کرنا ہو گا۔'' کرشن راؤ نے بیزاری سے کہا۔ ''ابھی تمہارے بازو بہت کمزور ہیں۔ شیر کا شکار کھیلنے کے لئے پہلے طاقت تو حاصل کر لو۔''

کامران کرشن راؤ کی چال سمجھ گیا تھا۔ اس نے ٹھاکر کو جواب دینا چاہا، مگر فوراً ہی شکنتلا کی ہدایت یاد آ گئی۔

پھر جب رات کے وقت کامران نے شکنتلا کو یہ واقعہ سنایا تو وہ چونک اٹھی۔ ''مجھے یقین تھا کہ ٹھاکر یہی جواب دے گا۔ اب تم اندازہ کر سکتے ہو کہ تمہاری واپسی کے تمام راستے بند ہو چکے ہیں۔''

کامران پیچ و تاب کھانے لگا تو شکنتلا نے اسے پرسکون رہنے کی ہدایت کی۔ ''کچھ دن کے لئے اپنے خون سے حرارت کو نکال پھینکو۔''

❋❋❋

پھر ایک روز وہ واقعہ بھی پیش آ گیا جس نے کامران کے دل و دماغ کو زیر و زبر کر کے رکھ دیا۔ کامران حسب معمول جنگل پہنچا تو نرسنگا کے ایک محافظ نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

''ٹھاکر! تمہیں سردار نے اپنی خوابگاہ میں بلایا ہے۔''

کامران فوراً ہی نرسنگا کے مخصوص کمرے کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے بھر وہ یہی سوچتا رہا کہ شاید سردار اس سے اپنے جارحانہ سلوک کی معذرت کرنا چاہتا ہے، مگر خیالات کا یہ طلسم اس وقت بکھر گیا جب نرسنگا کے بجائے اس کی خوبصورت ترین بیوی امرپالی خواب گاہ میں داخل ہوئی اور اس نے مسکراتے ہوئے دروازہ بند کر دیا۔

کامران دنیا کی فریب کاریوں سے واقف نہیں تھا اس لئے امر پالی کے طرز عمل کو احتیاط اور راز داری سمجھ کر نظر انداز کر گیا۔

پھر امر پالی اس مسند پر بیٹھ گئی جو سردار نرسنگا کے لئے مخصوص تھا۔

کامران بڑی حیرت سے اپنے سردار کی بیوی کو دیکھ رہا تھا۔

''بیٹھ جاؤ ٹھاکر!'' امر پالی نے دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''سردار کہاں ہے؟'' کامران نے تلخ لہجے میں کہا۔

''اس درندے کا ذکر چھوڑو......'' امر پالی کی آواز سے یکایک شعلے برسنے لگے تھے۔''اس جنگل کی ملکہ میں ہوں اور اسی ملکہ کے حکم سے تمہیں یہاں تک لایا گیا ہے۔''

''میں غیر عورتوں سے بات کرنا پسند نہیں کرتا۔'' کامران کے لہجے سے شدید نفرت کا اظہار ہو رہا تھا۔

''میں غیر نہیں ہوں ٹھاکر! تمہاری اپنی ہوں۔ میری آنکھوں کی طرف دیکھو جہاں تمہارے انتظار کے چراغ جل رہے ہیں۔'' امر پالی کی آواز جوش جذبات سے لڑکھڑا رہی تھی۔''ان چراغوں کو بجھنے سے بچا لو۔ میں تمہاری تاریک زندگی کو اجالوں سے بھر دوں گی۔''

کامران کا پورا جسم کانپنے لگا۔ اس نے اپنی پوری زندگی میں ایسی بے حیا عورت نہیں دیکھی تھی۔ وہ تیزی سے مڑا اور دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔

''کہاں جا رہے ہو ٹھاکر! باہر تمہاری موت کھڑی ہے۔'' امر پالی کا کھنکتا ہوا قہقہہ ابھرا۔''میرے ہونٹوں کی ایک جنبش تمہارے جسم کو کئی ٹکڑوں میں تقسیم کر دے گی۔''

****

کامران بڑے سے بڑے جابرانہ حکم کو بھی خاطر میں نہیں لاتا تھا' مگر ایک عورت کی تنبیہ نے اس کے قدموں کو جکڑ لیا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ امر پالی کی طرف بڑھنے لگا۔ امر پالی کے ہونٹوں پر ایک تو بہ شکن مسکراہٹ تھی۔ وہی مسکراہٹ جسے ایک بے راہ عورت زندگی کی جنگ میں مرد کو تسخیر کرنے کیلئے اپنے آخری ہتھیار کے طور پر استعمال کرتی ہے۔ امر پالی نے کامران کی واپسی کو اپنی فتح سے تعبیر کیا تھا۔ جیسے جیسے وہ سرکش نوجوان اس کے قریب آتا جا رہا تھا۔ امر پالی کی مسکراہٹ زیادہ فتنہ انگیز ہوتی جا رہی تھی۔ پھر جب کامران دو ہاتھ کے فاصلے پر ٹھہر گیا تو امر پالی کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔ وہ ہونٹ جن پر یاقوت کے ترشے ہوئے ٹکڑوں کا گمان ہوتا تھا۔

''بیٹھ جاؤ چھوٹے ٹھاکر!'' امر پالی کے لہجے میں سرشاری ناقابل بیان تھی۔ ''تنہائی کے اس موسم کو عقل کے شور و غل سے برباد نہ کرو۔ اپنے دل کی طرف دیکھو اور جذبوں کی زبان سنو۔ اس کے سوا ہر شے کو فراموش کر دو۔''

''میں اپنے دل اور دماغ کو خوب پہچانتا ہوں کہ ان کے تقاضے کیا ہیں؟ تم اپنی بات کرو کہ مجھے اس قدر فریب کاری کے ساتھ کیوں بلایا گیا ہے؟'' اس شبنم ریز فضا میں بھی شجاع الدین کامران کے لہجے سے آگ برس رہی تھی۔

''اگر تم پہلی ملاقات میں میری نظروں کی زبان سمجھ لیتے تو مجھے تمہارے گرد یہ جال پھیلانا نہ پڑتا۔'' کمرے میں امر پالی کا قہقہہ اس طرح بکھر گیا جیسے کیف و مستی کی بارش ہو رہی ہو۔ ''جسے تم فریب سمجھتے ہو ٹھاکر' وہ تو حسن کی ایک ادا ہے۔ عشق کا ایک والہانہ اظہار ہے۔ وصال کا ایک مطالبہ ہے جو کسی قانون کا پابند نہیں ہوتا۔''

امر پالی کا ہر لفظ کامران کو ایک پتھر کی چٹان محسوس ہو رہا تھا۔ وہ چٹان جو اس کے اعصاب کو ریزہ ریزہ کر دینا چاہتی تھی۔ ''میں ایسے کسی قانون کو تسلیم نہیں کرتا۔ اگر تمہارا یہ جذباتی قانون میرے راستے میں آیا تو میں اسے پامال کرتا ہوا گزر جاؤں گا۔'' کامران کا لہجہ مکمل طور پر باغیانہ تھا۔

''تم ایسا نہیں کر سکو گے ٹھاکر۔'' اچانک امر پالی کا انداز بھی بدل گیا تھا۔ اس کے شراب برسانے والے ہونٹ اب آگ برسانے لگے تھے۔ ''میری ایک چیخ تمہاری زندگی کا خاتمہ کر دے گی۔'' امر پالی نے کامران کو ایک بار پھر وہی دھمکی دی تھی' جسے سن کر رائے زادہ کانپنے لگا تھا۔ اس سے پہلے کہ غصے کی شدت کامران کو جذبات کے سیلاب میں بہا کر لے جاتی۔ اسے دیوداسی شکنتلا کی ہدایت یاد آ گئی۔ وقت نے کامران کو اپنی زندگی کے سب سے بھیانک موڑ پر لا کر کھڑا کر دیا تھا۔ قدموں کی ایک ہلکی سی لغزش بھی اسے عبرتناک انجام سے دوچار کر سکتی تھی۔ مجبوراً کامران کو سنبھل جانا پڑا۔

''آخر تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟'' ایک اہم فیصلہ کرنے کے باوجود کامران کی آواز میں جھنجھلاہٹ تھی۔

''میری آنکھوں میں غور سے دیکھو ٹھاکر!'' امر پالی نے وارفتہ ہو کر کہا۔

''دیکھ رہا ہوں۔'' کامران کے لہجے میں بیزاری تھی۔

''اس طرح نہ دیکھو کہ تمہاری آنکھ کسی بھیڑیے کی آنکھ نظر آنے لگے۔'' امر پالی نے محبوبانہ انداز میں شکایت کی۔

کامران کو ایک بار پھر اپنی طبیعت پر جبر کرنا پڑا۔ امر پالی مسلسل بہکتی جا رہی تھی۔ اس کے لڑکھڑانے کا یہ انداز کامران کو کسی خوف ناک منزل کا پتہ دے رہا تھا۔

''تمہیں میری آنکھوں میں کیا نظر آ رہا ہے ٹھاکر؟'' امر پالی پر بے اختیاری کی کیفیت طاری ہوتی جا رہی تھی۔

''میں نہیں جانتا' کچھ بھی نہیں جانتا۔'' کامران نے احمقانہ انداز میں کہا۔

''یہی تو مشکل ہے کہ تم حرص و ہوس کے بازار میں نکل آئے ہو مگر خریداروں کی زبان نہیں جانتے......'' امر پالی نے اس طرح کہا کہ اس کے لہجے سے ہلکے ہلکے غصے کا اظہار ہو رہا تھا۔ ''کبھی تم نے اس حقیقت کو محسوس کیا کہ میں کون ہوں اور وقت نے مجھے کس درندے کی ملکیت بنا دیا ہے؟''

شجاع الدین کامران خاموش کھڑا رہا۔

''میں پونم کا چاند ہوں جسے جبر کے گرہن نے کھا لیا۔''

امر پالی اپنے شوہر کے مظالم بیان کر رہی تھی۔ ''میں ایک غنچہ نو شگفتہ ہوں جسے قہر کی ہواؤں نے جلا ڈالا۔ میں کامناؤں کی ندی کا ایک الہڑ دھارا ہوں جو ایک پتھر سے ٹکراتے ٹکراتے خاموش ہو گیا۔ میں ایک خوش نوا بلبل ہوں جس کے پیروں کی دلکشی اور گیتوں کی مدھرتا کو پنجرے کی تیلیوں نے چھین لیا۔ کیا تمہیں اس کا احساس نہیں ہوتا ٹھاکر؟''

شجاع الدین کامران سناٹے میں آ گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ ہوش ربا حسن رکھنے والی عورت اندر سے اتنی زخمی بھی ہو سکتی ہے؟ ایک لمحے کیلئے رائے زادہ کے آہنی ارادوں میں شگاف پڑنے لگے' مگر دوسری ہی ساعت میں ہوش و خرد کے ہاتھوں نے اس کا دامن پکڑ لیا۔

''میں تمہارے اور سردار کے درمیان قائم ہونے والے رشتے کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' کامران کے لہجے کی تلخی دوبارہ لوٹ آئی تھی۔ ''میں نرسنگا کا احترام کرتا ہوں اور اس کے حوالے سے تم بھی میرے لئے قابل احترام ہو۔''

''نہیں ٹھاکر! مجھے احترام کی نظر سے نہ دیکھو کہ تمہارا یہ جذبہ میری امنگوں کا قاتل ہے۔'' امر پالی بے قرار ہو کر کھڑی ہو گئی۔ ''اس جنگل میں بسنے والے ہزاروں انسان روزانہ میرے قدموں کے نشانات کو اپنے سجدوں سے مٹا دیتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر احترام کا مظاہرہ اور کیا ہو گا؟ مجھے لوگوں کے اس عمل سے کوئی خوشی نہیں ہوتی۔ احترام یقیناً ایک لفظ ہے مگر تم نے اسے صحیح جگہ استعمال نہیں کیا۔ تم حکم کی منزل میں ہو اور احترام کی باتیں کر رہے ہو۔ مجھے حکم دو کہ میں تم پر اپنی ایک ایک خوشی لٹا دوں۔ اگر تمہیں احترام ہی کرنا ہے تو میری خواہشات کا احترام کرو۔'' یہ کہتے کہتے امر پالی کامران کے قریب آ گئی اور اس نے بے تکلفانہ انداز میں رائے زادہ کا بازو پکڑ کر مسند کی طرف کھینچا۔

کامران امر پالی کی اس اضطراری حرکت سے پریشان نظر آنے لگا تھا' مگر اس نے مصلحتاً اپنے بازو کو ان ہاتھوں سے چھڑانے کی کوشش نہیں کی' جن پر ریشم یا برگ گل کا گمان ہوتا تھا۔

کامران مجبوراً امر پالی کے پاس بیٹھ گیا۔ ''تمہارا سردار نرسنگا جس کے منہ سے ہمیشہ انسانی خون کی بو آتی ہے وہ میرے عنبر آفریں بدن کا مالک کس طرح ہو سکتا ہے؟ مگر ساری دنیا جانتی ہے کہ ایسا ہی ہے۔ ایسا ہو رہا ہے اور ایسا ہوتا رہے گا۔ یہاں تک کہ ایک دن اسی جنگل میں میری چتا جلا دی جائے گی اور میں اپنی بے شمار ناآسودہ حسرتوں کے

ساتھ ہوا میں بکھر جاؤں گی۔'' امر پالی نے ایک بار پھر پوری شدت کے ساتھ اپنی تشنہ آرزوؤں کا مرثیہ پڑھنا شروع کر دیا۔''مجھے راکھ ہونے سے بچالو ٹھاکر کہ اب محرومیوں کی آگ میں جلا نہیں جاتا۔'' امر پالی کی خوبصورت آنکھیں جو تمناؤں کا مستقبل نظر آتی تھیں' اچانک ان میں امیدوں کے کئی چراغ جل اٹھے تھے۔''مجھے وہاں لے چلو ٹھاکر جہاں ابھیلاشا (آرزو) کی کھیتی لہلہاتی ہے۔ جہاں من کے جھرنے پریت کی تال پر گنگناتے ہیں' جہاں سپنوں کی پھواریں جلترنگ بجاتی ہیں' جہاں پریم ہی پوجا ہے اور پریم ہی ایشور ہے۔ جہاں من کی کومل دھرتی پر چیت اور بیساکھ کی تیز دوپ نہیں اترتی۔ جہاں پروائی کے ہچکولوں میں مرلی کی تانیں گونجتی ہوں اور جہاں چاروں''اور'' ساون ہی ساون ہو۔''

امر پالی نے اپنی محرومی اور بے کسی کا نقشہ کچھ اس انداز سے کھینچا تھا کہ شجاع الدین کامران مبہوت ہو کر رہ گیا۔

''کیا سوچ رہے ہو ٹھاکر؟'' امر پالی نے اسے چھیڑا۔

''تقدیر کے لکھے کو کوئی نہیں مٹا سکتا۔'' کامران بہت محتاط لہجے میں بولا۔

''اپنی بزدلی کو قسمت کا نام نہ دو ٹھاکر۔'' امر پالی بھڑک اٹھی۔''میری طرف ہاتھ بڑھاؤ میں تمہیں اس طرح دریا کے پار لے چلوں گی کہ طوفان منہ دیکھتے رہ جائیں گے۔''

شجاع الدین کامران امر پالی کے جال میں بری طرح الجھ گیا تھا۔ اگر میں تمہاری بات مان لوں تو یہ دنیا کی سب سے بڑی بددیانتی ہوگی۔ سب سے سنگین خیانت ہوگی۔ میں کچھ بھی سہی مگر کسی کی آبرو پر بری نظر نہیں ڈالتا۔ تم سردار نرسنگا کی آبرو ہو اور نرسنگا میرے لئے استاد کا درجہ رکھتا ہے۔''

''درندوں کی بستی میں اخلاق اور فرض کی باتیں کرتے ہو ٹھاکر؟'' امر پالی کسی زخمی ناگن کی طرح پیچ و تاب کھانے لگی۔ جن کی پیاس انسانی خون سے بجھتی ہو اور جن کی بھوک آدم زادوں کے گوشت سے مٹتی ہو ان کے درمیان رہ کر ایفائے عہد اور دیانت داری کے راگ الاپتے ہو؟'' جوش جذبات سے امر پالی کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

''کچھ بھی ہو' میں اپنے آپ سے مجبور ہوں۔'' کامران نے امر پالی کی بات ماننے سے صریحاً انکار کر دیا تھا۔ مجھے تم سے ہمدردی ضرور ہے' مگر تمہارے دکھوں کا علاج میرے پاس نہیں۔''

''تم غلط کہتے ہو ٹھاکر!'' امر پالی چیخ کر بولی۔''تم ہی میری اس بیماری کا علاج کرو گے کیا تمہیں سردار نرسنگا سے ڈر لگتا ہے؟'' یکایک امر پالی نے ایک اور زاویہ بدلا۔

''سردار نرسنگا سے نہیں میں اپنے آپ سے ڈرتا ہوں۔'' شجاع الدین کامران اداس نظر آنے لگا۔ تم نہیں جانتیں کہ میں کتنا غم زدہ ہوں۔ مجھے معاف کر دو امر پالی! میں اس قدر پستی میں نہیں اتر سکتا کہ پھر پہچانا ہی نہ جاؤں۔''

''تم امر پالی کو نہیں جانتے ٹھاکر کہ وہ جو کچھ چاہتی ہے حاصل کر لیتی ہے۔'' نرسنگا کی بیوی کی آنکھوں میں بڑے خوفناک عزائم کروٹیں لے رہے تھے۔

کامران کے جی میں آیا کہ وہ اس فاحشہ عورت کے سامنے کسی آتش فشاں کی طرح پھوٹ پڑے' مگر اسے اپنے جذبوں کی آگ کو برداشت کرنا پڑا۔ وہ اندر ہی اندر جھلستا رہا۔

''ٹھاکر! موت کے اس جنگل سے نکل جانے کی تیاریاں کر لو۔'' امر پالی کا لہجہ کسی آمر سے مشابہ تھا۔ ابھی چڑھتا ہوا چاند ہے جب اماؤس ... میں ڈوب جائے گا اس وقت میں تمہیں

سردار نرسنگا کی سلطنت سے بہت دور لے جاؤں گی۔ میں یہاں کے ایسے کئی خفیہ راستوں سے واقف ہوں جنہیں میرے اور نرسنگا کے سوا کوئی تیسرا نہیں جانتا۔"

شجاع الدین اس طرح کھڑا ہو گیا جیسے وقت سے پہلے اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا ہو اور وہ بینائی سے محروم ہو کر درندوں کی بستی میں بھٹک رہا ہو۔

"بس اب جاؤ ٹھاکر! میں اس دن تمہارا انتظار کروں گی۔" امر پالی کے لہجے کی سرمستی دوبارہ لوٹ آئی تھی۔ "اگر تم نے مجھ سے کوئی چھل کیا تو زندہ نہیں رہنے دوں گی۔ میری محبت بھی اتنی عجیب ہے کہ راستہ چلتے بھکاری کو تاج کی طرح اٹھا کر اپنے سر پر رکھ لوں اور نفرت بھی اتنی عجیب ہے کہ شاہ تمام عمر اپنے ماتھے رگڑتے رہیں اور میں ان کا ایک سجدہ بھی قبول نہ کروں...... جاؤ! تمہیں امر پالی نے سرفراز کر دیا۔"

بڑی سیاہ کار فضا تھی اور بڑا ذلت آمیز ماحول تھا۔ کامران کے وحشی دل نے کئی بار اسے بغاوت پر اکسایا مگر وہ کسی ناپاک جانور کی موت مرنا نہیں چاہتا تھا۔ امر پالی کے تیور بتا رہے تھے کہ اگر کامران نے اپنے لہجے میں احتجاج کیا اور جنگل کے باسیوں کو ان کی ملکہ کی شرمناک داستان سنائی تو کوئی بھی اس کی زبان پر اعتبار نہیں کرے گا۔ اس کے برعکس امر پالی کے ہونٹوں کو ایک بار جنبش ہو گی اور اس کا پورا جسم تیروں اور نیزوں سے چھید ڈالا جائے گا۔ یہ ایک پاگل کتے کی موت ہو گی اور کامران ایسی موت مرنا نہیں چاہتا تھا۔

کیسی مجبوری تھی؟ کامران پسینے میں نہا گیا اور جب وہ امر پالی کی خواب گاہ سے باہر آیا تو اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ راستے میں نرسنگا کے کئی محافظوں نے روک کر اس سے پوچھا۔

"ٹھاکر آپ تو بہت زیادہ بیمار نظر آ رہے ہیں۔"

کامران نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس وہ ان مسلح محافظوں سے اتنا ہی کہہ سکا سردار کہاں ہے؟"

محافظوں نے لاعلمی کا اظہار کیا اور پھر وہ اپنی لاش کو گھسیٹتا ہوا بڑے مندر تک پہنچا۔

پجاری رام سروپ کے کمرے میں ٹھاکر کرشن راؤ موجود تھا۔ بوڑھے راجپوت کی عیار نظروں سے کامران کی حالت پوشیدہ نہ رہ سکی۔ کرشن راؤ نے اس کی مزاج پرسی کی مگر وہ یہ کہہ کر اپنے کمرے میں چلا گیا کہ جنگل کے ناساز گار موسم نے اسے شدید تھکن میں مبتلا کر دیا ہے۔ کرشن راؤ کو کامران کی صحت یا بیماری سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ تو منافقت کی ایک پرانی رسم ادا کر رہا تھا۔

جب دیوداسی شکنتلا کو خبر ملی کہ آج شجاع الدین کامران وقت سے بہت پہلے مندر لوٹ آیا ہے تو وہ گھبرا گئی اور دیوانہ وار بھاگتی ہوئی کمرے میں چلی آئی۔

کامران اپنے بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ شکنتلا نے قریب آ کر دیکھا کامران کی آنکھیں بند تھیں اور چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ شکنتلا نے بے قرار ہو کر اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ پیشانی تیز بخار سے جل رہی تھی۔ کامران نے چونک کر آنکھیں کھول دیں، مگر جب شکنتلا کو نظروں کے سامنے پایا تو پلکیں بند کر لیں۔

"رائے زادہ! تمہیں تو بخار ہے۔" شکنتلا کی آواز لرز رہی تھی۔ "کہیں جنگل میں کوئی زہریلا کانٹا تو نہیں چبھ گیا۔"

کامران نے سر کے اشارے سے نفی میں جواب دیا۔

"کہیں شمشیر زنی کی مشق میں کوئی زخم تو نہیں آ گیا۔" شکنتلا نے دوسرا سوال کیا۔

کامران اس بار بھی خاموش رہا۔ صرف گردن کی جنبش سے کام لیتے ہوئے اس نے شکنتلا کو سمجھانے کی کوشش

کی کہ ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا ہے۔
"پھر یہ بخار کیسا ہے؟" دم بہ دم شکنتلا کی آواز کی لرزش بڑھتی جارہی تھی۔
"یہ وہ بخار نہیں ہے جس کا شکار عام لوگ ہوتے ہیں۔" آخر کامران کو بولنا پڑا۔"میرا دل جل رہا ہے شکنتلا! یہ اسی آگ کی تپش ہے جسے تمہارے ہاتھ محسوس کررہے ہیں۔"
"تم کیا کہہ رہے ہو ٹھاکر؟" شکنتلا کی وحشت میں کچھ اور اضافہ ہوگیا تھا۔"مجھے بتاؤ! ایشور کیلئے مجھے بتاؤ۔"
"تم اس وقت چلی جاؤ دیوداسی! کرشن راؤ پجاری رام سروپ کے کمرے میں موجود ہے...... ممکن ہے کہ وہ ادھر چلا آئے اور پھر تمہیں میرے اتنے قریب دیکھ کر تمہاری طرف سے مشکوک ہوجائے۔" شجاع الدین کامران اچانک خوف زدہ نظر آنے لگا تھا۔"میں نہیں چاہتا کہ تم میری وجہ سے پنڈتوں اور ٹھاکروں کے غضب کا نشانہ بن جاؤ۔"
"اب مجھے کسی کی کوئی پروا نہیں ہے۔" شکنتلا ایک بدلی ہوئی عورت نظر آرہی تھی۔"اب کوئی پنڈت یا ٹھاکر کسی بھی لباس میں آئے' مجھے ڈر نہیں لگتا...... میں سب کو پہچانتی ہوں...... ہاں جب تک تم نہیں آئے تھے تو اپنے سائے سے بھی ڈرتی تھی...... اب میں ہر فکر سے بے نیاز اور ہر دہشت سے دور ہوں...... موت کی پرچھائیاں بھی مجھے ڈرا نہیں سکتیں۔"
"میں سمجھتا ہوں شکنتلا! خوب سمجھتا ہوں مگر اس وقت تمہارا چلا جانا ہی بہتر ہے۔" کامران نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔"تم رات کے پچھلے پہر میرے پاس آنا...... جب یہ بھیڑیے سو جائیں اور ان کا بنایا ہوا قانون اونگھنے لگے۔"
"مگر تمہاری یہ حالت؟" شکنتلا شدید الجھن کا شکار نظر آرہی تھی۔
"یہ جذبات کی عارضی گھٹن ہے۔" کامران نے دیوداسی کو سمجھانا چاہا۔"ایک غیر متوقع حادثے نے مجھے بہت صدمہ پہنچایا ہے' مگر یہ طوفان عارضی ہے...... جلد ہی اس کی تند و تیز لہریں دم توڑ دیں گی...... پھر میں تمہیں سب کچھ بتادوں گا۔"
شکنتلا کھڑی ہوگئی۔ کچھ دیر تک سوچتی رہی اور پھر تیز قدموں سے باہر چلی گئی۔ کامران مطمئن ہوگیا۔ مگر اس وقت چونک اٹھا جب شکنتلا دوبارہ کمرے میں داخل ہوئی۔
"اسے پی لو۔" قریب پہنچ کر شکنتلا نے کسی مشروب سے بھرا ہوا پیالہ کامران کی طرف بڑھایا۔"یہ عرق گلاب ہے...... اسے پینے کے بعد تمہارا ذہن پرسکون ہوجائے گا اور جذباتی گھٹن سے نجات مل جائے گی۔"
کامران نے جبر کرکے عرق گلاب سے بھرا ہوا پیالہ منہ سے لگالیا اور ہاتھ کے اشارے سے شکنتلا کو چلے جانے کیلئے کہا۔
دیوداسی چلی گئی۔ مگر اس طرح کہ بارہا مڑ کر کامران کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں خوف و دہشت کی گہری پرچھائیاں لرز رہی تھیں۔

✻✻✻

پھر جب شام کو دیوداسی کھانا لے کر آئی تو شجاع الدین کامران کی طبیعت کسی حد تک سنبھل چکی تھی۔ اس نے اپنے مشتعل جذبات پر قابو پالیا تھا' مگر امرپالی کے خوف سے ابھی تک نجات نہیں مل سکی تھی۔
"رائے زادہ! مجھے بتاؤ کہ تمہاری حالت اچانک کیوں بگڑ گئی تھی؟" کھانے کے دوران شکنتلا نے پوچھا۔
"ابھی مجھے پوری طرح سنبھل جانے دو۔" شجاع الدین کامران نے سر جھکائے ہوئے جواب دیا۔"ابھی تک

میں یہ طے نہیں کر پایا ہوں کہ وہ بات مجھے تم سے کہنی چاہئے یا نہیں۔"
"کیا ابھی تک میں بیگانگی کی منزل میں ہوں۔" شکنتلا نے کرب ناک لہجے میں کہا۔ "کیا ابھی تک میں اس قابل نہیں ہوئی کہ تمہاری رازدار بن سکوں؟" یہ کہتے کہتے شکنتلا کا سرخ وسفید چہرہ دھواں ہو گیا تھا۔
"نہیں یہ بات نہیں دیوداسی! تم میری مکمل رازدار ہو مگر میں تمہیں اپنی ذات کے حوالے سے زیادہ پریشان کرنا نہیں چاہتا۔" کامران کی آواز سے افسردگی جھلک رہی تھی۔
"پھر وہ بات مجھ سے کہہ کیوں نہیں دیتے جس نے تمہارے دل و دماغ کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیا ہے۔" شکنتلا کے لہجے میں شدید جھنجھلاہٹ تھی۔ "تم میری پریشانیوں کا ذکر بار بار کیوں کرتے ہو؟ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ میں موت و زیست کے تصور سے بھی بے نیاز ہو چکی ہوں۔ میری زندگی موت ہے......اور موت زندگی......پھر کس پریشانی کی بات کرتے ہو؟"
"یہ پریشانی کچھ اور ہے۔" کامران نے شکنتلا کے مطالبے کو مسترد کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے سوچنے دو......جب میں مکمل طور پر مطمئن ہو جاؤں گا تو اپنی زندگی کا سب سے خوفناک راز بھی تم سے کہہ ڈالوں گا۔"
"تمہیں یہ اطمینان کس وقت حاصل ہو گا؟ جب میں دنیا سے گزر جاؤں گی۔" شکنتلا بہت زیادہ جذباتی نظر آنے لگی تھی۔
"صبر کرو شکنتلا؟" کامران نے دیوداسی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ "تمہاری یہ بدحواسیاں مجھ سے میرے باقی ہوش وحواس بھی چھین لیں گی۔"
شکنتلا انتہائی جبر کے عالم میں واپس چلی گئی۔
کامران کمرے میں ٹہلنے لگا۔ وقت نے اس کے ساتھ عجیب وغریب مذاق کئے تھے اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری تھا......پہلے اس نے شکنتلا کی تنبیہ کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی مگر اب اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ حالات کی زنجیروں نے جسم کے ساتھ ساتھ اس کے دل و دماغ کو بھی جکڑ لیا ہے۔ امرپالی کا اٹھایا ہوا فتنہ ایک ناقابل فہم فتنہ تھا......وہ اس فتنے کو کس طرح دبائے گا؟ اگر امرپالی کی بات مان لیتا ہے تو ساری عمر اپنے ضمیر سے بھی شرمندہ رہے گا اور زندگی کی ایک ایک سانس خوف و دہشت کی حالت میں بسر ہو گی......وہ ایک مفرور مجرم کی طرح بھاگتا ہی رہے گا۔ پھر یاسمین خانم کا کیا ہو گا؟ قاضی عماد اور قائم خان راجپوت کی سازشوں کا جواب کون دے گا؟ رائے نعیم الدین ذیشان کی نسل پر لگائے گئے داغوں کو کون دھوئے گا؟
اور اگر وہ امرپالی کے شیطانی منصوبے سے بغاوت کا اعلان کرتا ہے تو پھر سردار نرسنگا کے یہاں اس کی کیا حیثیت ہو گی؟ وہ ایک شوہر کے انداز میں سوچتے ہوئے صرف اپنی بیوی کی حمایت کرے گا......پھر؟ کامران کی نظروں کے سامنے کئی سوالیہ نشانات ابھر آئے......ہر سوال کا ایک ہی جواب تھا......لرزہ خیز اور دردناک موت......موت اور صرف موت؟
کامران نصف شب تک کمرے میں ٹہلتا رہا......پھر انتظار اور بے چینی کا یہ طوفان ٹھہر گیا......بالآخر اس نے ایک فیصلہ کر لیا اور بستر پر دراز ہو گیا......اب وہ پرسکون نظر آ رہا تھا۔
یکایک کامران کے ہونٹوں پر ایک افسردہ سی مسکراہٹ ابھر آئی۔ وہ غائبانہ طور پر سعدیہ خانم سے مخاطب تھا۔
"ماں! اپنی محبت سے مجبور تھیں......صرف میری زندگی کی خاطر مجھے سر جھکا کر جینے پر مجبور کر رہی تھیں......یہ بھی آپ کی شفقت کا ایک انداز تھا' مگر میں نہیں چاہتا تھا کہ آپ ایک نکمے' ناکارہ اور مجرم بیٹے کی ماں کہلائیں

......اس لئے اپنے کردار کو نافرمانی کے داغ سے سیاہ کر کے کرشن راؤ کے پاس چلا آیا......وہ کرشن راؤ جس نے آپ کی بہت دل آزاری کی ہے......اس قصاب سے میری مصالحت ہو ہی نہیں سکتی......میں اس سے ایک ایک جرم کا حساب لیتا مگر وقت نے میرے ہاتھ کاٹ دیئے......ماں! مجھے معاف کر دینا کہ آپ بڑی معاف کرنے والی ہیں......میں نے اپنی اصلاح کی بہت کوشش کی' مگر واقعتاً آپ کا بیٹا بہت ناکارہ تھا۔''

پھر وہ تصورات کی دنیا میں اپنے باپ رائے نعیم الدین ذیشان سے مخاطب ہوا۔''بابا! میں نے آپ کے خون میں نہائے ہوئے جسم کو فراموش نہیں کیا ہے......میری زندگی کا کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرا کہ خون کے دریا نے میرا تعاقب نہ کیا ہو......وہ خون میرا اپنا خون ہے......اگرچہ آپ کا قاتل سلطان معزالدین بہرام شاہ میری دسترس سے بہت دور تھا لیکن میں نے اسے کبھی معاف نہیں کیا......یہاں تک کہ وہ زمین کے نیچے چلا گیا......اگر وہ زندہ ہوتا اور میں کسی طرح اس تک پہنچ سکتا تو سر دربار اس کا گریبان پکڑ کر آپ کے خون کا حساب طلب کرتا' لیکن آج وہ میری پہنچ سے بہت دور ہے۔ بابا! مجھے معاف کر دینا کہ میں خاندان کی اس عظمت کو برقرار نہ رکھ سکا جسے آپ نے اپنے لہو سے سرخرو کیا تھا۔'' یہ کہتے کہتے شجاع الدین کامران کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ بہت دیر تک روتا رہا۔

پھر اس کی نظروں کے سامنے یاسمین خانم کا دلکش اور معصوم چہرہ ابھر آیا۔ کامران کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔''یاسمین! تم نہیں جانتیں کہ میں نے تم تک پہنچنے کیلئے کیسے کیسے خارزاروں میں قدم رکھ دیئے ہیں......پھر بھی تم سے دور ہوں اور شاید یہ جدائی میرا مقدر بن گئی ہے......اگر وقت مجھے مہلت دیتا تو شاید میں تمہارے گرد کھینچے ہوئے آمریت کے حصار کو توڑ دیتا' لیکن اب میرے اختیار میں کچھ نہیں......میں تمہارے بچپن کے خوابوں کو جوانی کی تعبیر نہیں دے سکا......دنیا والے مجھے کبھی معاف نہیں کریں گے۔ وہ ایک ہی بات کہیں گے کہ میں ایک شکست خوردہ انسان تھا' جو اپنی ناکامیوں کا جنازہ اٹھائے ہوئے دنیا سے گزر گیا......مگر تم میری مجبوریوں کو میری شخصیت کا حوالہ نہ سمجھ لینا......اگر میں اس راستے میں قتل کر دیا جاؤں تو ایک بار میری قبر پر ضرور آنا اور بلند آواز میں گواہی دینا کہ میں کیسا جانباز تھا جو تنہا ستمگروں کی پوری جماعت سے برسرپیکار رہا اور اس شان سے لڑا کہ مرتے مرتے بھی اپنی شکست تسلیم نہیں کی......میں دنیا کی پروا نہیں کرتا......اگر سارا عالم بھی خلاف ہو جائے تو مجھے کوئی غم نہیں ہوگا......بس تم میرے جذبوں کی سچائی پر شہادت دینا......پھر میری روح پرسکون ہو جائے گی۔''

کامران بہت غم زدہ نظر آ رہا تھا۔ یاسمین خانم سے مستقل جدائی کے خیال نے اسے اس قدر تھکا دیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو ایک مفلوج انسان سمجھنے لگا تھا۔

اچانک کامران کو محسوس ہوا کہ اس کے وجود کی راکھ میں شعلے سے بھڑکنے لگے ہیں۔ یاسمین خانم کی یادوں کی ہوا چلی تو بہت گرد و غبار اڑا اور اسی غبار کے سینے سے قائم خان راجپوت اور قاضی عماد الدین کے ہیولے ابھرنے لگے۔ پھر جب کامران کے ذہن کی سطح پر یہ دونوں چہرے صاف ہو گئے تو وہ ہذیانی انداز میں چیخ اٹھا۔

''شاید میں تم سے اپنا حساب طلب نہ کر سکوں' مگر میرا خدا تمہیں سلامتی کے ساتھ دنیا سے رخصت نہیں ہونے دے گا۔ شجاع الدین کامران نہ سہی تو میرا کوئی اور ہم نوا آئے گا......اس کے ہاتھ بہت دراز ہوں گے اور وہ تمہاری دستار فضیلت کی دھجیاں اڑا دے گا۔''

ابھی خیالی طور پر کامران اپنے دشمنوں سے الجھا ہوا تھا کہ کمرے میں ہلکی سی آواز ہوئی۔ کامران نے چونک کر دیکھا۔ دیوار میں شگاف نمودار ہو گیا اور شکنتلا اس خفیہ راستے سے گزر کر کامران کی طرف آ رہی تھی۔

''کیا تم کسی فیصلے پر پہنچ گئے؟'' شکنتلا کی آواز میں بڑا درد شامل تھا۔''اور کیا میں اس قابل ہوں کہ تمہارے

وں میں شرکت کر سکوں۔" شکنتلا کی زبان سے ادا ہونے والے چند الفاظ میں شکایت کا ایک دفتر پوشیدہ تھا۔
"بیٹھ جاؤ....." کامران نے خلاف معمول مسکراتے ہوئے کہا۔ "اب تم غیر نہیں ہو دیوداسی! میں تمہیں اپنے ہر از میں شریک کر سکتا ہوں......اگر تم غیر ہوتیں تو نفرتوں کے مظاہرے کے بعد مجھے چھوڑ کر چلی جاتیں..... لیکن تم تو وت کی اس وادی میں ہر قدم پر میرے ساتھ ہو..... ماں کے بعد تم سے زیادہ قریب کون ہو سکتا ہے؟ کوئی بھی نہیں۔"
شکنتلا جذبات سے وارفتہ ہو کر رونے لگی۔
"یہ رونے کا وقت نہیں دیوداسی!" کامران مضطرب ہو کر شکنتلا کے آنسو خشک کرنے لگا' مگر اس کے بڑھتے وئے ہاتھ اچانک رک گئے۔ یاسمین خانم کے تصور نے کامران کو ایسا کرنے سے باز رکھا تھا۔ "مجھے بہت خوشی ہوتی شکنتلا اگر میں تمہارے آنسو اپنے دامن میں جذب کر لیتا......لیکن یہ دامن کسی اور کیلئے ہے۔" کامران کے ہونٹوں سے آہ سرد نکل گئی۔
"میں جانتی ہوں......ان آنسوؤں کے مقدر میں کوئی دوسرا دامن نہیں ہے۔" شکنتلا کے آنسوؤں کی روانی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا۔ "ایک اپنا ہی دامن تھا جو پارہ پارہ ہو چکا ٹھاکر!"
"یہ فریاد و فغاں کا موسم نہیں شکنتلا!" کامران نے افسردہ لہجے میں کہا۔ "ہم سب کے دامن دریدہ ہیں ...میری طرف دیکھو کہ یہ میری زندگی کی آخری رات ہے......اور میں ایک امانت تمہارے سپرد کرنا چاہتا ہوں ...اگر کبھی جبر و تشدد کے زنداں سے باہر نکل سکو تو یہ امانت ان لوگوں تک پہنچا دینا جو میری زندگی کی دعائیں کر رہے وں گے۔"
شکنتلا کا چہرہ فق ہو گیا۔ "تم کیسی بدشگونی کی باتیں کر رہے ہو ٹھاکر!"
"مجھے لفظوں کے پیچ و خم میں نہ الجھاؤ دیوداسی!" کامران نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔ "میں شگون اور توہمات کی حدوں سے گزر کر حقائق کے شعلہ زار میں کھڑا جل رہا ہوں ......بس چند گھنٹوں کا مہمان ہوں ......کل صبح نکلنے والا ورج دنیا کو روشن کرے گا اور میں بجھا دیا جاؤں گا۔"
"آخر تم اپنی زندگی سے اس قدر مایوس کیوں ہو؟" شکنتلا بدحواس نظر آ رہی تھی۔ "کیا کرشن راؤ نے کچھ کہا؟"
"پہلے تم اس امانت کے بارے میں اچھی طرح سمجھ لو جسے میں تمہیں سونپنا چاہتا ہوں۔" کامران نے شکنتلا کے وال کا جواب دیئے بغیر کہا۔
شکنتلا لرزتے جسم کے ساتھ ہمہ تن گوش ہو گئی۔ کامران اسے اپنی زندگی کے تمام حادثات کی تفصیل سنا چکا تھا بس ایک یاسمین خانم کا ذکر باقی تھا......سو وہ بھی زبان پر آ گیا۔ "یہ میرے بچپن کی محبت ہے شکنتلا! جسے میں کبھی موش نہیں کر سکتا۔"
"کیا وہ بھی تمہیں اسی قدر چاہتی ہے؟" شکنتلا نے اس طرح پوچھا جیسے اس کا دل ڈوبا جا رہا ہو۔
"مجھ سے بھی زیادہ۔" کامران نے پرجوش لہجے میں کہا۔ "اس کی محبت میں سمندروں جیسی گہرائی ہے۔ وہ ی طرح چیختی نہیں۔ یاسمین خانم کے باپ نے میری غربت و نامرادی کے سبب یہ رشتہ توڑ دیا اور پھر مجھے اس کے ستے سے ہٹانے کے لئے زمانے بھر میں رسوا کر دیا۔ میری قبا پر ایسا داغ لگایا جسے طاقت کے سوا کسی چیز سے صاف ں کیا جا سکتا تھا۔ مجبوراً مجھے کرشن راؤ کے دروازے تک آنا پڑا۔ میں سمجھتا تھا کہ میرا منصوبہ کامیاب ہو جائے گا' ں گردش وقت نے مجھے اس قابل نہیں چھوڑا۔ اگر تم اس قید ستم سے آزاد ہو جاؤ تو یاسمین خانم سے کہہ دینا کہ رائے الدین کامران مارا گیا مگر مرتے مرتے بھی اس کے ہونٹ ایک ہی نام سے آشنا تھے اور وہ نام بچپن کی محبت کا

تھا۔ جس کی خاطر اس نے اپنی زندگی قربان کر دی۔ پھر تم میری ماں کے حضور پہنچ کر عرض کرنا کہ وہ اپنے گناہ گار بیٹے کو معاف کر دیں۔ کیا تم اس امانت کا بار گراں اٹھا سکو گی؟''

''اگر میرے پیروں کی زنجیریں کٹ گئیں۔'' شکنتلا کی آواز کانپ رہی تھی۔

''خدا وہ وقت لائے جب ٹھاکر کے زنداں کی اینٹ سے اینٹ بج جائے اور تم آزاد فضا میں سانس لے سکو۔'' دل کی تپش سے کامران کے ہونٹ جل اٹھے تھے۔ ''اور اگر ایسا نہ ہو سکے تو پھر تم پر کوئی قرض نہیں۔ میں نے تمہیں معاف کیا۔''

کچھ دیر تک کمرے پر موت کا سا سناٹا طاری رہا۔ شکنتلا کسی پتھر کے مجسمے کی طرح ایک ہی زاویے سے کامران کو دیکھے جا رہی تھی۔

بالآخر کامران نے اسے امر پالی کی شیطانی حرکت کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔

شکنتلا کا چہرہ پہلے کسی خزاں رسیدہ پتے کی مانند زرد ہو گیا اور پھر کفن کی طرح سفید پڑ گیا۔

''اب کیا ہو گا ٹھاکر؟'' شکنتلا کے ہونٹوں کو بمشکل جنبش ہوئی۔ اس کی آواز کسی ایسے مریض کی آواز سے مشابہ تھی جو آخری ہچکیاں لے رہا ہو۔

''کچھ نہیں ہو گا۔'' کامران نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں سردار نرسنگا کے اعتماد کو دھوکا نہیں دوں گا۔ میرا مذہب بدعہدی نہیں سکھاتا۔ میں جس باپ کے خون کی فصل ہوں وہ بہت معتبر خون تھا۔''

''تمہیں معلوم ہے کہ نرسنگا ایک قزاق ہے جو دن رات موت کا کاروبار کرتا ہے۔'' شدید اذیت کے باوجود شکنتلا خاموش نہ رہ سکی۔ ''تم ایک قاتل کے سامنے سچ بول کر کیا حاصل کر سکو گے؟ وہاں تمہاری صداقت پر کون ایمان لائے گا؟''

''کسی کے ایمان لانے نہ لانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا' مگر میں ذلت و رسوائی کی یہ زندگی کس طرح قبول کر سکتا ہوں؟'' کامران کی وہی باغیانہ ادا لوٹ آئی تھی۔

''کیا اس فتنے کو ٹالا نہیں جا سکتا؟'' شکنتلا نے بڑی حسرت زدہ آواز میں کہا۔

''میرا ذہن تو سوچتے سوچتے شل ہو گیا۔ تم بھی اپنے دماغ کو جلا ڈالو مگر اس کا کوئی حل تلاش نہ کر سکو گی۔''

شکنتلا نے کئی تجاویز پیش کیں' مگر پھر خود ہی شرمندہ نظر آنے لگی۔ ''ایشور! میری مدد کر! جگ کے پالن ہارا میری پرارتھنا سن لے۔'' جب نجات کا کوئی راستہ نظر نہ آیا تو شکنتلا رونے لگی۔ ''میں نے تجھ سے اپنے لئے جو کچھ مانگا ہے وہ سب کامران کو دے دے۔ میرا داتا! اس کو بچا لے کہ جھوٹوں کی بستی میں ایک سچا انسان مارا جا رہا ہے۔ اگر تو کسی دوسری بھینٹ سے خوش نہیں ہوتا تو میرا بلیدان سویکار کر لے۔'' شکنتلا نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے تھے اور آنکھیں بند کر لی تھیں۔

کامران نے اپنی ماں اور مجذوب بابا کے بعد محبت کی ایسی بے ساختہ ادا کہیں نہیں دیکھی تھی۔ شکنتلا کی گریہ و زاری نے اسے پگھلا کر رکھ دیا تھا۔ ''شکنتلا! تمہاری دعائیں پہاڑوں کو پگھلا سکتی ہیں مگر پتھر کے دیوتاؤں کی آنکھ کو نم نہیں کر سکتیں۔''

''میں پتھر کی کسی مورت کے سامنے دامن نہیں پھیلاتی۔ میں تو اس خدا سے مانگتی ہوں جو مسلمانوں کا خدا ہے۔''

کامران حیرت زدہ رہ گیا۔ اسے اپنی سماعت پر شک ہونے لگا تھا۔ ''تم کیا کہہ رہی ہو شکنتلا؟ مجھے یقین نہیں

آتا کہ تم اپنے باپ دادا کی رسموں سے بغاوت بھی کر سکتی ہو؟''
''کیوں؟ کیا مجھے اس کا حق حاصل نہیں؟'' شکنتلا کا لہجہ بڑا کربناک تھا۔ ''تم بھی تو پتھروں کے باغی ہو۔ تمہارے باپ دادا نے بھی تو دیوتاؤں کے وجود سے انکار کیا تھا۔ پھر میرے انکار کو حیرت اور شبہے کی نظر سے کیوں دیکھتے ہو؟'' شکنتلا نے بیک وقت کئی سوال کر ڈالے تھے۔

کامران کے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔

''میں نے ایک گیانی عورت کی حیثیت سے اس زنداں میں بیٹھ کر تمہارے مذہب کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ برسوں کرشن راؤ اور دوسرے پجاریوں سے بحث کی ہے کہ حملہ آور مسلمان کیا پیغام لے کر آئے ہیں؟ اور ہندوؤں کی قطاریں کی قطاریں مندروں سے نکل کر مسجدوں کی طرف کیوں بڑھی چلی جا رہی ہیں؟ کرشن راؤ اپنی فطری نفرت کے سبب مجھے مکمل جواب نہ دے سکا' مگر پھر بھی میں نے اتنا سمجھ لیا کہ مسلمانوں کا خدا پوجے جانے کے قابل ہے۔''

شکنتلا کے اس انکشاف نے کامران کو بدحواس کر دیا تھا۔ ''میں انتظار کر رہی تھی کہ کب اس زنداں کی دیواریں گریں اور مجھے روشنی نظر آئے۔ پھر میں اس روشنی میں اپنی منزل تلاش کر سکوں۔ شاید میری یہ خواہش پتھر کی دیواروں سے ٹکرا کر دم توڑ دیتی کہ ایک دن تم یہاں آ پہنچے۔ میں نے تمہیں ان درندوں سے بچانا چاہا۔ تم سے قربت کا سبب وہی روشنی تھی جس نے میری سیاہ راتوں میں چراغ جلائے ہیں۔ جب تم اپنی ضد پر قائم رہے تو میں نے صبر کر لیا کہ ابھی میرے انتظار کے دن ختم نہیں ہوئے ہیں۔ تمہاری سلامتی کیلئے دعائیں کرتی رہی' مگر آج تم بھی مجھے چھوڑ کر جا رہے ہو۔'' کامران لرز اٹھا۔

''مجھے لے جایا جا رہا ہے شکنتلا! میں بہت مجبور ہوں۔''

''پھر مجھے اس روشنی کا سراغ دیتے جاؤ جس کے سہارے زندگی کے اندھیروں سے جنگ کر سکوں۔'' شکنتلا کا لہجہ بہت شکستہ تھا۔

کامران نے پہلی بار دیوداسی کے سامنے ''اللہ'' کا نام لیا۔ پھر شہادت اور رسالت کا مفہوم سمجھایا۔ اسلام کی بنیادی تعلیم کی وضاحت کی اور شرمسار سا نظر آنے لگا۔ ''میں اس سے زیادہ نہیں جانتا شکنتلا کہ میری تعلیم نامکمل رہ گئی۔''

''میری تکمیل کیلئے یہی چند الفاظ کافی ہیں ..... اللہ تمہاری حفاظت کرے۔'' شکنتلا کی آواز ڈوبنے لگی تھی۔

''ہاں! اگر میں لوٹ آیا اور قسمت نے یاوری کی تو کرشن راؤ کے بت کدے کو مسمار کر ڈالوں گا۔'' کامران کے لہجے سے چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔ ''اگر میں واپس نہ آ سکوں تو اسی صنم خانے میں مر جانا۔ میرے استاد مولانا شمس الدین کہا کرتے تھے کہ اگر ایک سچا مسلمان بھی کافروں کی زمین میں دفن ہو جائے تو خدا اس پورے علاقے کو اہل ایمان سے آباد کر دیتا ہے۔''

شکنتلا سر جھکائے بیٹھی رہی' مگر اس کے آنسوؤں کا آبشار جاری رہا۔

''اب تم جاؤ میں اپنے خدا کے حضور آخری سجدہ ادا کر لوں۔'' کامران نے کہا۔ ''اس سے پہلے کہ موت کے ہاتھ مجھے چھولیں میں بتوں کے درمیان اپنے سجدوں کے نشانات چھوڑ جانا چاہتا ہوں۔''

شکنتلا حیرت سے کامران کی طرف دیکھنے لگی۔ پھر وہ اٹھا اور کمرے کے ایک گوشے میں وضو کرنے لگا۔ شکنتلا اس کی ایک ایک حرکت کا بغور جائزہ لے رہی تھی۔ وضو سے فارغ ہو کر کامران نماز پڑھنے کیلئے کھڑا ہو گیا۔ بندگی کا یہ انداز بڑا عجیب تھا۔ مسلمانوں کے سجدہ کرنے اور بتوں کے قدموں پر سر رگڑنے والوں کی عبادت میں بڑا فرق تھا۔

پھر اس نے دعا کیلئے ہاتھ اٹھا دیئے۔ ''اے خدا! اپنے گناہ گار بندے کامران کو معاف فرما کہ تیرے کچھ نام لیواؤں نے اسے یہاں تک پہنچا دیا۔''

شکنتلا آج کی رات ایک لمحے کیلئے بھی جدا ہونا نہیں چاہتی تھی مگر کامران نے اسے چلے جانے پر مجبور کر دیا۔ وہ رخصت ہوئی تو اس طرح کہ اس کا دامن آنسوؤں سے تر تھا۔

شکنتلا کے چلے جانے کے بعد کامران ایک لمحے کیلئے بھی نہیں سو سکا۔ سورج نکلنے تک وہ ایک ہی دعا کرتا رہا۔

''اے خدا! مجھے اتنی مہلت دے کہ میں اپنی جان ناتواں کے کچھ قرض اتار سکوں۔''

***

کامران کی زندگی کی یہ صبح موت کی شام میں بھی تبدیل ہو سکتی تھی' مگر وہ بے خوف وخطر انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ جنگل کی طرف جا رہا تھا۔ سردار نرسنگا کا آ[illegible]ن کھیم جس کی نگ[illegible] میں کامران مندر تک اور پھر مند[illegible] سے جنگل تک آیا کرتا تھا' آج اس کی اضطراری حرکت پر حیران نظر آ رہا تھ[illegible] وہ کچھ [illegible]پوچھنے کی جرأت نہ کر سکا۔

جنگل پہنچ کر کامران اس میدان کی طرف چلا گیا جہاں وہ [illegible]سواری اور شمشیر زنی کی مشق کرتا تھا۔ اس کے ساتھیوں نے معمول کے مطابق والہانہ استقبال کیا' مگر کامران کے انداز میں گرمجوشی کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہ سرد مہری کے ساتھ نوجوان قزاقوں کی صفوں سے گزرتا ہوا اپنے ہتھیاروں کے ذخیرے تک پہنچا اور تلوار لے کر جنگل کی طرف واپس پلٹ پڑا۔ لوگ اسے حیرت سے دیکھتے رہ گئے۔

کامران کے قدم نرسنگا کے محفوظ تہہ خانے کی جانب بڑھ رہے تھے۔ پھر جب وہ قریب پہنچا تو مسلح محافظ چونک اٹھے۔ انہوں نے کامران کو آج تک اس حالت میں شمشیر بدست نہیں دیکھا تھا۔

''سردار سے کہو کہ ٹھاکر اس سے ملنا چاہتا ہے۔'' کامران نے ایک محافظ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

اگرچہ نرسنگا نے اسے اجازت دے دی تھی کہ وہ بے روک ٹوک اندر آ سکتا ہے مگر آج اس کا بدلا ہوا انداز دیکھ کر ایک محافظ اپنے سردار کو مطلع کرنے کیلئے چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد نرسنگا باہر آیا تو کامران کی صورت دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

''کیا بات ہے ٹھاکر؟'' نرسنگا کے لہجے سے تشویش کا اظہار ہو رہا تھا۔

''سردار! میں تجھ سے تنہائی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔'' کامران نے بلند آواز میں کہا۔

''اندر آؤ ٹھاکر۔'' نرسنگا نے اپنی خواب گاہ کی طرف اشارہ کیا۔

''نہیں سردار! وہ جگہ مناسب نہیں ہے۔'' کامران نے اندر جانے سے انکار کر دیا۔ ''آج میں بہت زیادہ تنہائی چاہتا ہوں۔''

نرسنگا نے آگے بڑھ کر کامران کا بازو پکڑ لیا او[ر] درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف بڑھنے لگا۔ مسلح محافظ بھی اپنے اپنے ہتھیاروں پر گرفت مضبوط کئے ہوئے آگے بڑھے۔ نرسنگا نے انہیں قہر آلود نظروں سے دیکھا۔

''کیا تم لوگ تنہائی کا مفہوم نہیں سمجھتے۔''

محافظوں کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے اور نرسنگا کامران کو لے کر جنگل کے اس حصے کی طرف چلا گیا جہاں دن میں بھی گہری تاریکی چھائی رہتی تھی۔

***

''آخر کیا کہنا چاہتے ہو ٹھاکر؟'' سردار نرسنگا بری طرح جھنجھلایا ہوا تھا۔
''سردار! کیا تجھے یقین ہے کہ یہاں کوئی دوسرا ہماری باتیں نہیں سنے گا؟'' درختوں کے ایک تاریک جھنڈ میں پہنچنے کے بعد شجاع الدین کامران نے کہا۔
''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تجھے اتنی راز داری کی ضرورت کیوں پیش آ رہی ہے؟'' سردار نرسنگا کے لہجے سے تلخی کا اظہار ہونے لگا تھا۔
''وہ بہت نازک باتیں ہیں سردار! بہت نازک اور بہت سنگین۔'' کامران کی آواز سے گمبھیرتا جھلک رہی تھی۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی پرندہ بھی میری گفتگو سن سکے۔''
یکایک نرسنگا کی سرخ آنکھیں کشادہ ہو گئیں، گھنیری بھنویں کھنچ گئیں اور چوڑے ماتھے پر کئی بل پڑ گئے۔ پھر چیخ کر بولا۔ ''یہاں جو شخص بھی موجود ہے اسے معلوم ہونا چاہئے کہ اس کا سردار تنہائی چاہتا ہے۔ وہ سو سو ہاتھ تک دور چلا جائے۔''
اس کے بعد سردار نرسنگا اپنے حکم کا ردعمل تلاش کرنے لگا۔ پھر جب کوئی آہٹ یا آواز سنائی نہیں دی تو وہ کامران سے مخاطب ہوا۔ ''تم نے دیکھا ٹھاکر! اگر یہاں کوئی ہوتا تو اب تک مجھے سجدہ کرنے کے بعد بہت دور جا چکا ہوتا۔''
''ٹھیک ہے سردار! میں ایسی ہی تنہائی چاہتا تھا۔'' شجاع الدین کامران نے کہا۔ اس کا چہرہ پتھر کی طرح سخت نظر آ رہا تھا۔ ''میں تیری امانت تجھے واپس کرنے آیا ہوں نرسنگا۔'' یہ کہہ کر کامران نے اپنی تلوار نرسنگا کے قدموں میں ڈال دی۔ ''تو نے میرے ہاتھوں میں طاقت کا یہ نشان دیا تھا مگر میرے ہاتھ بہت کمزور تھے نرسنگا۔ اس امانت کا بوجھ نہ اٹھا سکے۔'' کامران بہت زیادہ جذباتی ہو گیا تھا۔
''صاف بات کر ٹھاکر! میں لفظوں کا الجھاؤ پسند نہیں کرتا۔'' سردار نرسنگا بھی اچانک بہت سنجیدہ نظر آنے لگا تھا۔
''یا تو مجھے میری دنیا میں واپس جانے دے یا پھر اسی تلوار سے میری گردن قلم کر دے۔'' کامران کے لہجے میں وہی راجپوتی آن بان تھی۔
''ٹھاکر! تجھے کیا ہو گیا ہے؟'' نرسنگا بھڑک اٹھا۔ ''کیا میرے کسی آدمی نے کچھ کہہ دیا۔''
''تجھے کیا پتا سردار کہ کس نے کیا کہہ دیا؟'' شدت جذبات سے کامران کی آواز لرز رہی تھی۔ ''کاش! کہنے والے کی زبان گل گئی ہوتی اور سننے والے کے کان پھٹ گئے ہوتے۔ زندگی رہتی نہ رہتی مگر کم سے کم انسانوں کا اعتبار تو رہ جاتا سردار! ہم جانوروں سے بھی بدتر ہیں۔''
نرسنگا حیرت سے کامران کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ''بس اب کہہ ڈال ٹھاکر کہ میں زیادہ دیر تک اس الجھاؤ کو

برداشت نہیں کر سکتا۔ تو خوب جانتا ہے کہ میں انسانی جانوں کی تجارت کرتا ہوں' لفظوں کی نہیں۔ مجھے تیری طرح گھما پھرا کر بات کرنی نہیں آتی۔ میری قوت برداشت کا امتحان نہ لے۔ اگر میں نے اپنا دھیرج کھو دیا تو سارے جنگل کو آگ لگ جائے گی۔''

شجاع الدین کچھ دیر تک خاموش کھڑا رہا۔ وہ ایک بھیانک انکشاف کرنے کے لئے مناسب الفاظ ڈھونڈ رہا تھا' مگر جب وہ عاجز آ گیا تو اس نے راستہ بدلنے کی کوشش کی۔

''یہی بہتر ہے سردار کہ مجھے یہاں سے چلا جانے دے۔'' کامران اچانک بہت زیادہ شکستہ نظر آنے لگا تھا۔ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے تیری حکومت میں آگ لگ جائے اور تیرے سکون کی دنیا میں ہر طرف خونخوار شعلے بھڑک اٹھیں۔ میری خاموش رخصت ہی اس خوفناک وباء کا علاج ہے۔''

''بات تو نے چھیڑی ہے ٹھاکر! اور تو ہی اسے ختم کرے گا۔'' اب نرسنگا بھی غضب ناک نظر آ رہا تھا۔ ''نرسنگا کی مرضی کے بغیر یہاں سے کوئی پرندہ بھی کوچ نہیں کر سکتا۔ یہ تو تیرے سردار کی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ تجھے اپنی حدود میں دیکھنا پسند کرتا ہے یا پھر تجھے یہاں سے نکل جانے کا حکم دیتا ہے۔''

شجاع الدین کامران مجبور ہو گیا تھا۔ آخر اس نے زبان کھولی' مگر اس طرح کہ سر جھکا ہوا تھا اور آواز میں گہری لرزش تھی۔

''سردار! یہ تیری زندگی کا سب سے بڑا حادثہ ہے تو دوسروں کے جان و مال پر شب خون مارتا ہے اور وقت تیرا اعتبار لوٹ رہا ہے۔'' شجاع الدین کامران آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ ''تیری بیوی شریک سفر نہیں' تیرے یقین کی رہزن ہے۔'' بالآخر کامران نے وہ بات کہہ دی تھی جسے سن کر نرسنگا کو پاگل ہو جانا چاہئے تھا۔ سردار کسی آہنی چٹان کی طرح خاموش کھڑا تھا۔

''میں اس راز کو فاش کئے بغیر یہاں سے چلا جانا چاہتا تھا' مگر تو نے مجھے مجبور کر دیا نرسنگا!'' کامران کا لہجہ بہت اداس تھا۔ ''افسوس! تو جس عورت پر اعتبار کرتا ہے وہ سراپا بے وفا ہے۔ دغا اور فریب کا مجسمہ ہے۔ عیاری و غداری کا زہریلا پیکر ہے۔ اس نے مجھے گناہ پر ورغلایا ہے۔ وہ ''اماوس'' کی راتوں میں میرے ساتھ فرار ہو جانا چاہتی ہے۔ وہ تجھ سے بیزار ہے اور نئے ساتھی کی تلاش میں ہے۔ تو تو آخر میرا استاد ہے نرسنگا! میں تیرے اعتماد کو کس طرح دھوکا دے سکتا ہوں۔'' یہ کہتے کہتے کامران کی آواز کانپنے لگی تھی۔ ''سردار! میں نے ساری رات آنکھوں میں کاٹ دی ہے۔ میرا خون جل رہا ہے اور دل و دماغ میں آگ لگی ہوئی ہے۔ نرسنگا! میں تو ایک عام آدمی سے بھی بے وفائی نہیں کر سکتا تیری بیوی کو کس طرح ہوسناک نظروں سے دیکھوں؟ امر پالی نے مجھے دھمکی دی ہے کہ اس کی ایک چیخ میرے جسم کو کئی ٹکڑوں میں تقسیم کر دے گی۔ اس سے پہلے کہ سارا جنگل تیری بیوی کی چیخ سنے تو میرا فیصلہ کر دے۔ یا تو مجھے یہاں سے چلا جانے دے یا میرے ٹکڑے کر کے اسی جگہ دبا دے۔ پھر کسی کو پتا نہیں چلے گا کہ کس نے کس سے بیوفائی کی؟''

سردار نرسنگا کچھ دیر تک حیرت و سکوت کے عالم میں کھڑا رہا۔ پھر اس کے چہرے پر وحشت سی برسنے لگی۔

''ٹھاکر! تو اس الزام تراشی کا انجام جانتا ہے؟'' نرسنگا کے لہجے میں بھیڑیے کی سی غراہٹ تھی۔

''حقیقت کو الزام سمجھتا ہے نرسنگا؟'' شجاع الدین کامران کے بھی تیور بدل گئے تھے۔

''پھر تیری سچائی پر کون گواہی دے گا؟'' نرسنگا کے لفظوں سے پگھلا ہوا لاوا ٹپک رہا تھا۔

''امر پالی سے پوچھ جسے تو دیوی سمجھ کر پوجتا ہے۔'' شجاع الدین کامران نے بھی موت کی آنکھوں میں آنکھیں

ڈال دی تھیں۔

اچانک نرسنگا زمین کی طرف جھکا اور اپنے پیروں کے نزدیک پڑی ہوئی تلوار اٹھالی۔ ''اب یہ تلوار ہی انصاف کرے گی۔ امر پالی مجرم ہے تو میں اپنے ہاتھ سے اس کے خون کا ایک ایک قطرہ بہا دوں گا۔'' سردار نرسنگا پاگل ہو گیا تھا۔ ''میں اس کا گوشت کاٹ کر کتوں کے آگے ڈال دوں گا اور اس کے خوبصورت چہرے کو اتنا بگاڑ دوں گا کہ لوگ اپنی بیویوں کے پاس جاتے ہوئے ڈریں گے۔ پھر اس جنگل کے ایک ایک بسنے والے کو معلوم ہو جائے گا کہ نرسنگا کا انتقام کس قدر بھیانک ہوتا ہے۔'' سردار کی سانسیں بے ربط ہو گئی تھیں اور وہ کسی بھینسے کی طرح ہانپ رہا تھا اور اگر ٹھاکر تو نے غلط بیانی سے کام لیا ہے تو پھر میں تیری لاش اس عورت کے سامنے پھینک آؤں گا جو اپنے شوہر کی موت کا ماتم کرتے کرتے جوانی سے بڑھاپے کی منزل تک آ پہنچی ہے۔ نرسنگا کو لوگ جانتے نہیں کہ وہ کیسا سفاک اور کیسا بے رحم ہے۔''

''سردار! میں تجھے خوب پہچانتا ہوں۔'' ہر طرف موت کے سائے منڈلا رہے تھے مگر شجاع الدین کامران کے چہرے پر خوف و دہشت کا ہلکا سا عکس بھی نہیں تھا۔ ''میں نے ایک ایک حرف سچ کہا ہے پھر بھی امر پالی کی گمراہیوں کی داستان مہذب انداز میں بیان کی ہے۔ اگر میں تیری بیوی کے لہجے کی صحیح عکاسی کر دیتا تو بے وفائی کے اس افسانے کو سن کر تیرا دل پھٹ جاتا نرسنگا۔''

''آ میرے ساتھ۔'' نرسنگا نے زمین پر تھوک دیا اور اپنی خواب گاہ کی طرف پلٹ پڑا۔ شجاع الدین کامران بھی کسی ہچکچاہٹ کے بغیر اس کے ساتھ چل پڑا۔ وہ بہت پہلے اپنے انجام سے آگاہ ہو چکا تھا۔

مسلح محافظوں نے جب اس طرح اپنے سردار کو آتے ہوئے دیکھا تو وہ لرز اٹھے۔ انہوں نے نرسنگا کے جلال سے ڈرتے ہوئے اپنے گھٹنے زمین پر ٹیک دیئے اور گردنیں جھکا دیں۔

نرسنگا محافظوں کے درمیان سے گزرتا ہوا اپنے تہہ خانے میں داخل ہو گیا۔ منتروں کا جاپ کرتے ہوئے جادوگروں نے اپنے سردار کو قہر کی حالت میں دیکھا تو گھبرا کر کھڑے ہو گئے۔ پھر سارا کمرہ ''جے نرسنگا'' کے نعروں سے گونج اٹھا۔

نرسنگا نے بھی سر کی جنبش سے ساحروں کی عقیدت کا جواب دیا مگر اس کا چہرہ بدستور غصے کی آگ سے جل رہا تھا۔

پھر نرسنگا اپنے مخصوص کمرے میں داخل ہو گیا۔ کامران بھی ایک ایک قدم پر بے مثال استقامت کا مظاہرہ کر رہا تھا نہ اس کے پیروں میں لغزش تھی اور نہ جسم پر رعشہ' نہ چہرے پر خوف کا کوئی سایہ اور نہ آنکھوں میں دہشت کا کوئی رنگ۔ نرسنگا نے کئی بار مڑ کر اسے دیکھا تھا' مگر کامران کے استقلال میں کسی موڑ پر کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔

خواب گاہ میں داخل ہوتے ہی نرسنگا نے تلوار پھینک دی اور اپنی مسند پر دراز ہو گیا۔ کامران نے محسوس کیا کہ اچانک اس کی حالت میں تبدیلی آ گئی ہے۔ غصے کے سبب تانبے جیسے چہرے پر چھائی ہوئی سیاہی غائب ہو چکی تھی اور وہ بہت زیادہ پرسکون نظر آنے لگا تھا۔ کامران نے اس تبدیلی کو بڑی حیرت سے دیکھا۔

''بیٹھ جا ٹھاکر بیٹھ جا۔ موت کی وادی سے گزر کر آیا ہے۔ تھک گیا ہوگا۔'' نرسنگا نے نہایت اطمینان سے کہا۔

''میں تیری اداؤں کو سمجھنے سے قاصر ہوں نرسنگا۔'' کامران حیرت سے اس درندے کی طرف دیکھ رہا تھا جو کچھ دیر پہلے اپنے شکار پر جھپٹ پڑنے کیلئے بے قرار تھا اور اب اس طرح بے نیاز نظر آ رہا تھا جیسے اسے اپنی خوراک کی کوئی فکر ہی نہ ہو۔

''ہاں ٹھاکر! تو نے سچ کہا۔ میں بھی اپنی اداؤں کو نہیں پہچانتا۔'' نرسنگا کے لہجے سے اداسی جھلک رہی تھی۔
''میں نے اپنی زندگی میں ہزاروں انسان دیکھے مگر وہ سب کے سب آدمی کے خول میں چوپائے تھے۔ بس ایک تیری موہنی سی شکل ہے جسے دیکھ کر نہ جانے کیوں پیار آنے لگا ہے۔ آج میں تیرے پرکھوں کی مہانتا (عظمت) کا قائل ہو گیا۔ یقیناً وہ بہت سچے لوگ ہوں گے۔'' یہ کہہ کر اس نے زور سے امر پالی کو آواز دی اور کامران کو ہاتھ کے اشارے سے بیٹھ جانے کیلئے کہا۔

کامران کی حیرت اتنی بڑھ چکی تھی کہ وہ اس منظر کو کسی خواب کا حصہ سمجھنے لگا تھا۔
نرسنگا کی آواز سنتے ہی امر پالی خواب گاہ میں چلی آئی۔ شجاع الدین کامران کو دیکھ کر ایک لمحے کیلئے جھجکی پھر بے تکلفانہ انداز میں چلتی ہوئی مسند کی طرف بڑھی اور نرسنگا کے قریب بیٹھ گئی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک خفیف سا تبسم نمایاں تھا۔

شجاع الدین کامران مزید حیرت میں ڈوب گیا۔ سردار نرسنگا کا اطمینان اور امر پالی کی مسکراہٹ! یہ دونوں علامتیں اس کے لئے نا قابل فہم تھیں۔ ابھی وہ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ نرسنگا امر پالی سے مخاطب ہو کر بول اٹھا۔
''تمہیں شکست ہوگئی امر پالی!'' نرسنگا کے لہجے میں فاتحانہ غرور کی جھلک تھی۔ ''میں نے تم سے کہا تھا کہ ابھی دنیا میں کچھ مرد باقی ہیں جن پر عورت کی قاتل اداؤں کا کوئی حربہ کامیاب نہیں ہوسکتا۔''
نرسنگا کی بات سن کر امر پالی نے شجاع الدین کامران کو غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں دھواں سا بھر گیا تھا۔ پھر اس دھویں سے ہلکی ہلکی نمی جھلکنے لگی۔
کامران وحشت زدہ نظر آنے لگا۔ کبھی وہ نرسنگا کا منہ دیکھتا اور کبھی امر پالی کے اداس چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔

''یہ سب کیا ہے سردار؟ یہ سب کیا ہے؟'' کامران صورت حال کو سمجھنے سے قاصر رہا تو گھبرا کر چیخ اٹھا۔
''بیٹھ جاؤ ٹھاکر! ایک طوفان آیا تھا' گزر گیا۔'' اب کی بار نرسنگا کے بجائے امر پالی کامران سے مخاطب ہوئی۔
کامران کے جسم کو ذرا بھی جنبش نہیں ہوئی۔ وہ بدستور اپنی جگہ کھڑا رہا۔
مجبوراً نرسنگا اٹھا اور ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی سند تک لے آیا۔
''ٹھاکر! سچی بات تو یہ ہے کہ میں اپنے معاملات میں کسی پر اعتبار نہیں کرتا۔'' نرسنگا آج عجیب انداز میں گفتگو کر رہا تھا۔ ''بس یہ ایک امر پالی ہے جو میرے ہر غم میں شریک رہتی ہے۔ سیکڑوں بلاخیز طوفانوں سے گزر کر میں نے اسے حاصل کیا ہے۔ اس کے علاوہ میں ساری دنیا کو دھوکے باز سمجھتا ہوں۔ مگر آج تجھے دیکھ کر اپنا فیصلہ بدل دینا پڑا۔''

کامران کی حیرت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ وہ اسی طرح بے شمار اندیشوں میں گھرا ہوا دونوں میاں بیوی کے چہرے دیکھ رہا تھا۔ کبھی اس کی نظریں نرسنگا پر جم جاتی تھیں اور کبھی امر پالی کی دلکش صورت اس کی نگاہوں کا مرکز بن جاتی تھی۔
''جب ٹھاکر کرشن راؤ نے تجھے میرے حوالے کیا تھا اس وقت میری نظروں میں تیری کوئی حیثیت نہیں تھی۔'' نرسنگا اپنے دل کی باتیں کہہ رہا تھا۔ ''میں نے ایسے بہت سے نوجوان دیکھے ہیں جو دل کے ہاتھوں شکست کھا کر تباہی کے راستوں پر مڑ جاتے ہیں۔ میں نے تجھے بھی ایک ایسا ہی گمراہ نوجوان سمجھا تھا' جو وقتی طور پر انتقام کا جذبہ رکھتا ہے مگر آزمائش کے وقت پیٹھ دکھا دیتا ہے۔ پھر تو میرے قریب آیا تو میں نے تجھے عام نوجوانوں سے مختلف پایا۔ تیری

آواز میں طوفانوں جیسی گرج تھی اور آنکھوں میں جوالامکھی جیسی آگ تھی۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ میں نے تجھے اپنے کاروبار میں شریک کر کے بہت بڑی غلطی کی ہے۔'' سردار نرسنگا کسی ہچکچاہٹ کے بغیر اپنے دلی جذبات کا اظہار کر رہا تھا۔ پھر میں نے اپنے جادوگروں کے گیان کا سہارا لیا۔ ان کا علم کبھی غلطی نہیں کرتا۔ تجھے یاد ہوگا کہ انہوں نے تیرے سامنے کہا تھا کہ میری مخصوص نشست گاہ میں میرا کوئی دشمن موجود نہیں۔ مجھے تیرے سوا کسی دوسرے پر شک نہیں تھا۔

جادوگروں نے واضح طور پر اعلان کر دیا تھا کہ تو میرا مخلص ساتھی ہے' لیکن کوئی نادیدہ طاقت میرے کانوں میں کہتی تھی کہ یہ مسلمان زادہ کسی وقت بھی دھوکا دے سکتا ہے اور پھر ایک دن جب میرے آدمی تیرے سامنے ایک تجارتی قافلے کو لوٹ رہے تھے اس وقت تو نے یہاں سے چلے جانے کی دھمکی دی تھی۔ میرے شک میں مزید اضافہ ہوگیا۔ آخر میں نے امر پالی کے مشورے سے یہ ناٹک رچایا۔''

''مگر سردار! یہ بڑا خوفناک کھیل تھا۔'' شجاع الدین کامران کی آواز میں شدید غصہ بھی تھا اور شکایت بھی۔

''ہاں ٹھاکر! یہ کھیل بہت خوفناک تھا' مگر کسی اجنبی انسان کی آزمائش کے لئے بہت ضروری تھا۔'' سردار نرسنگا اچانک جذباتی نظر آنے لگا تھا۔ ''میں نے اس امتحان میں اپنی عزت و آبرو کو بھی داؤ پر لگا دیا تھا۔ امر پالی اس شرمناک کھیل کیلئے آمادہ نہیں تھی' مگر میں نے اسے مجبور کیا کہ وہ اپنی زبان سے غلیظ کلمات ادا کرے اور پھر تیرے چہرے پر ان کا ردعمل دیکھے۔''

''پھر امر پالی نے مجھے کیسا پایا؟'' کامران کے لہجے سے اس کا خاندانی وقار جھلک رہا تھا۔

'امر پالی کہتی ہے کہ اس نے آج تک مجھ جیسا بہادر اور وفادار مرد نہیں دیکھا۔'' نرسنگا کی آواز میں احساس فخر بھی تھا اور ایک عجیب سی حسرت بھی۔ ''امر پالی کے اعتراف کے بعد تو میں بھی تجھ سے چھوٹا نظر آنے لگا ہوں ٹھاکر۔''

شجاع الدین کامران نے امر پالی کی طرف دیکھا۔ اس کی خوبصورت آنکھوں میں آنسوؤں کے قطرے جھلک رہے تھے۔

''نہیں سردار! تو ایک طاقتور انسان ہے۔ میرا اور تیرا کیا مقابلہ؟'' کامران نے نرسنگا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ ''میں ایک بھٹکا ہوا نوجوان جو اپنے دشمنوں کی گالی کا جواب بھی نہیں دے سکتا۔''

''ایسا مت کہہ ٹھاکر! آج کے بعد تو کمزور نہیں رہا۔'' نرسنگا یکایک پر جوش ہو گیا تھا۔ ''اب تو کرشن راؤ کا بھیجا ہوا ایک کمزور نوجوان نہیں' سردار نرسنگا کا ساتھی ہے۔ وہ نرسنگا جس کے نام سے بڑے بڑے اقتدار والے کانپتے ہیں۔ اب میں تجھے اپنی شمشیر زنی کے تمام جوہر منتقل کر دوں گا اور تیرے بازوؤں میں ایسی بجلیاں بھر دوں گا جو پلک جھپکتے ہی قائم خان کی حویلی کو جلا ڈالیں گی۔'' نرسنگا بڑے بڑے دعوے کر رہا تھا۔ ''میں تیرا مقروض ہوں ٹھاکر! تو نے مجھ پر بڑا احسان کیا ہے۔ میں تیرے اس قرض کو بہت جلد اتار دوں گا۔ کرشن راؤ تجھے صرف باتوں سے بہلانے کی کوشش کر رہا تھا' مگر نرسنگا جھوٹ نہیں بولتا۔ اب میرا دل تیری طرف سے صاف ہے۔ میں قائم خان راجپوت کو تیرے قدموں پر جھکا کر چھوڑوں گا۔''

''شکریہ نرسنگا! تیرا بہت بہت شکریہ!'' یہ کہتے ہوئے کامران اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میں رات بھر سو نہیں سکا ہوں۔ میرے دل پر بڑا بوجھ تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے ایک مسلمان کو غیروں کے سامنے رسوا ہونے سے بچا لیا۔''

''اب تو چین سے سو جا کہ ٹھاکر! نرسنگا تیرے لئے جاگتا رہے گا۔'' کامران کے ساتھ سردار اور امر پالی بھی کھڑے ہو گئے۔ ''بہت جلد تیری زندگی [illegible]

گے۔''

''مگر سردار! یہ قتل و غارت چھوڑ دے۔'' کامران نے چلتے چلتے کہا۔ ''میں اس دن سے ڈرتا ہوں کہ کہیں قزاق اجل تیری سانسوں کا سرمایہ نہ لوٹ لے۔ اس لئے ایسے کاروبار سے باز آ۔ یہ ہلاکتوں کی تجارت ہے نرسنگا۔''

''بس ٹھاکر! مجھے تیری یہی بات بری لگتی ہے۔'' نرسنگا نے بگڑ کر کہا' مگر اس کے غصے میں نفرت نہیں تھی۔ ''میں وہاں پہنچ چکا ہوں جہاں سے واپسی ممکن نہیں۔ نصیحتیں مت کر کہ مجھے ایسے الفاظ انگارے محسوس ہوتے ہیں تو اپنے راستے پر سفر کر اور مجھے میرے راستے پر جانے دے۔''

کامران کے چہرے پر ناگواری کا ایک ہلکا سا رنگ ابھر کر ڈوب گیا۔ پھر جیسے ہی وہ جانے کے لئے مڑا نرسنگا نے اسے آواز دی۔ کامران رک کر سردار کی طرف دیکھنے لگا۔ نرسنگا نے کمرے کے فرش پر پڑی ہوئی تلوار اٹھائی اور کامران کی طرف بڑھا دی۔

''میں اپنی یہ امانت تجھے دوسری بار سونپ رہا ہوں۔'' نرسنگا نے اثر انگیز لہجے میں کہا۔ ''اب اسے اپنے پاس ہی رکھنا۔ اگر کرشن راؤ پوچھے تو کہہ دینا کہ سردار نے اجازت دیدی ہے۔''

پھر نرسنگا کامران کو چھوڑنے کیلئے تہہ خانے کے دروازے تک آیا۔ مسلح محافظوں نے اپنے سردار کے چہرے پر اطمینان کی لہریں موجزن دیکھیں تو ان کے سیاہ چہرے بھی خوشی سے چمکنے لگے۔

کامران تلوار لئے ہوئے اس جگہ پہنچا جہاں دیگر ہتھیاروں کا ذخیرہ تھا۔ کامران نے اپنی شمشیر بھی وہیں رکھ دی اور بڑے مندر کی طرف روانہ ہو گیا۔ نرسنگا کی اجازت کے باوجود وہ کرشن راؤ کے سامنے خالی ہاتھ جانا چاہتا تھا۔

****

کامران مندر پہنچا تو کرشن راؤ پجاری رام سروپ کے کمرے میں موجود تھا۔ بوڑھا راجپوت کامران کے پریشان چہرے کو دیکھ کر مسکرایا۔ رائے نعیم الدین کے بیٹے نے ٹھاکر کی اس زہریلی مسکراہٹ کو محسوس کر لیا تھا' مگر وہ آنکھ بچا کر گزر جانا چاہتا تھا۔ کامران کو کچھ اس لئے بھی جلدی تھی کہ وہ دیوداسی شکنتلا کو انتہائی اذیت ناک فضا میں چھوڑ کر جنگل کی طرف گیا تھا۔ اس لئے اب اس کی خواہش تھی کہ وہ کسی بھی طرح شکنتلا تک پہنچ جائے اور ایک شکستہ حال عورت کو غم کی اس نئی قید سے نجات دلا دے۔

''کیا بات ہے رائے زادہ!'' کرشن راؤ نے اسے روکتے ہوئے کہا۔ ''آج کل جنگل میں تمہارا جی نہیں لگ رہا ہے؟ دن کے اجالے میں اس طرح لوٹ آنا کچھ عجیب سا لگ رہا ہے۔'' بوڑھا راجپوت بڑے سرد لہجے میں طنز کر رہا تھا۔

کامران کے سینے میں آگ سی لگ گئی تھی' مگر اس نے بوڑھے ٹھاکر کے اس وار کو ہنس کر برداشت کیا۔ ''رات ماں کی یاد آ گئی تھی اس لئے سو نہیں سکا۔''

''ابھی تمہیں کچھ دن اور ان یادوں کا زہر برداشت کرنا ہو گا۔'' کرشن راؤ نے منافقانہ سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہارے ہی بھلے کے لئے کہہ رہا ہوں۔ قسمت تم پر مہربان ہے ورنہ بہت سے لوگ اسی ارمان میں مر گئے کہ انہیں سردار نرسنگا جیسے جنگجو کی صحبت میسر آ جائے۔ وہ بڑا ماہر شمشیر زن ہے۔ اس سے جو کچھ سیکھنا ہے' جلد سیکھ لو۔ پارے کی طرح نرسنگا کے مزاج کا بھی کچھ پتا نہیں چلتا۔''

''سیکھ رہا ہوں ٹھاکر!'' کامران نے بات ٹالنے کی کوشش کی۔

کرشن راؤ کی عیار نظروں نے کامران کے چہرے کے پیچھے چھپی ہوئی بیزاری کو محسوس کر لیا تھا۔ ''تمہاری ماں

آج کل بہت پریشان رہتی ہے۔" کرشن راؤ نے زاویہ بدل کر کامران کو اذیت پہنچانے کی کوشش کی۔"کل ہی میں نے اپنے آدمیوں کو اس کی خیریت دریافت کرنے کے لیئے بھیجا تھا۔"

"ٹھاکر! کیا تمہارے آدمیوں نے ماں سے میرے متعلق کچھ کہا تھا۔" کامران نے کرشن راؤ کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔"انہوں نے کیا جواب دیا؟" ایک بچھڑے ہوئے بیٹے کی بے قراری نا قابل بیان تھی۔

"کیا تو مجھے اس قدر احمق سمجھتا ہے؟" کرشن راؤ نے قدرے ناگوار لہجے میں کہا۔"اگر میرے آدمی تیرے حوالے سے بات کرتے تو وہ غم زدہ عورت ان سے الجھ جاتی اور پھر نیا ہنگامہ کھڑا ہو جاتا۔"

"پھر تم نے کس طرح ان کی خیریت دریافت کی تھی؟" کامران کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔

"میرے آدمیوں نے قریب سے جا کر اسے دیکھا تھا۔" کرشن راؤ نے مطمئن انداز میں کہا۔"وہ ٹھیک ہے' چلتی پھرتی ہے' کھاتی پیتی ہے' اسے کوئی بیماری لاحق نہیں۔"

کرشن راؤ کے لہجے میں ایسی نشتریت پوشیدہ تھی کہ شجاع الدین کامران کے دل و جگر کٹ کر رہ گئے۔ ابھی وہ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ کرشن راؤ کی آواز دوبارہ ابھری۔"مگر میرے آدمی یہ بھی کہہ رہے تھے کہ وہ روتی بہت ہے۔"

چند لمحوں کے لیئے کامران کے سینے میں سانس گھٹ کر رہ گئی۔ اس نے پوری قوت سے کرشن راؤ کے جان لیوا وار کو برداشت کیا۔

"اگر تجھے اپنی ماں کے آنسوؤں کو روکنا ہے تو جلد از جلد اپنے بازوؤں میں طاقت پیدا کر۔" کرشن راؤ نے ایک بار پھر تند و تیز لہجے میں کہا۔"وقت تیزی سے گزرتا جا رہا ہے اور تو نے ابھی تک اپنے آپ کو وقت کے ساتھ ہم آہنگ نہیں کیا ہے۔ کامران! ایک ایک لمحے کو غنیمت سمجھ۔ اگر تیرا بوڑھا ٹھاکر دنیا سے اٹھ گیا تو پھر تجھے یہاں پوچھنے والا کوئی نہیں ہوگا۔"

کامران نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خاموشی کے ساتھ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

کامران کے جاتے ہی کرشن راؤ کے چہرے پر شیطانی خباثت کے بادل برسنے لگے۔ اس نے پجاری رام سروپ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔"سردار نرسنگا نے مجھے اطلاع دی ہے کہ یہ اچھوت زادہ ابھی تک قتل و غارت کے کھیل میں شریک نہیں ہو سکا ہے۔" اعلیٰ نسل کے ہندو' برہمن اور راجپوت ابھی تک مسلمانوں کو اچھوت کہہ کر پکارتے تھے۔ کرشن راؤ نے بھی تنہائی پاتے ہی اپنے دل کا تمام زہر ہونٹوں سے ٹپکا دیا تھا۔"وہ یہاں اس طرح زندگی بسر کر رہا ہے جیسے کسی مملکت کا حکمراں ہو۔"

"اگر ٹھاکر اس نے آپ کی بات نہیں مانی؟" پجاری رام سروپ نے سرد لہجے میں سوال کیا۔

"اسی دن اس کا قصہ پاک ہو جائے گا۔" غصے سے بوڑھے راجپوت کا جسم کانپنے لگا تھا۔"کیا یہ دولت اس کے باپ نے چھوڑی ہے جو بے دریغ خرچ کی جا رہی ہے۔ پجاری! تو تو جانتا ہے کہ تیرا ٹھاکر کبھی گھاٹے کا سودا نہیں کرتا۔"

رام سروپ نے اطاعت کے انداز میں سر جھکا دیا۔

"وہ یہاں سے اس وقت تک باہر نہیں جا سکتا جب تک دو چار انسانوں کو قتل نہ کر دے۔" کرشن راؤ کے بدن کا لرزہ کچھ اور بڑھ گیا تھا۔"دو چار دن کا لڑکا نرسنگا جیسے جہاندیدہ شخص کو بیوقوف بنا رہا ہے۔ رام سروپ! یہ بات میرے لیئے بہت تکلیف دہ ہے۔ میں اس صورت حال کو زیادہ دن برداشت نہیں کر سکتا۔"

"سچ کہا ٹھاکر!" رام سروپ کا لہجہ غلا[illegible]

''اس اچھوت کی وجہ سے ہماری عبادت گاہ بھی ناپاک ہو رہی ہے۔'' پجاری نے نئے انداز سے زہر اگلا۔
''ہاں رام سروپ! میں خوب جانتا ہوں۔'' شدت غضب سے کرشن راؤ کی آواز کانپ رہی تھی۔ ''بس کچھ دن اور انتظار کر لے۔ عنقریب میں اس غلاظت کو صاف کر دوں گا۔''

❊❊❊

شجاع الدین کامران اپنے کمرے میں پہنچ کر بستر پر دراز ہو گیا۔ وہ شدید تھکن کے باعث سو جانا چاہتا تھا' مگر اچانک اسے شکنتلا کی بے قراریوں کا خیال آ گیا۔ کامران تیزی سے اٹھا اور اپنے کمرے سے نکل کر دیوداسی کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ پھر اس نے باہر ٹھہر کر دروازے پر دستک دی۔ اندر سے کوئی آواز نہیں آئی۔ کامران کے ہاتھوں کو دوبارہ جنبش ہوئی۔ اس مرتبہ دستک کی آواز تیز تھی۔ شکنتلا جو اپنے کمرے کے ایک گوشے میں بیٹھی کامران کے لئے دعائیں کر رہی تھی' اس ناوقت مداخلت پر برہم ہو گئی۔ اس نے سوچا کہ شاید بڑے پجاری نے طلب کیا ہو گا۔ اس خیال کے آتے ہی وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور بڑی ناگواری کے عالم میں اپنے بہتے ہوئے آنسوؤں کو خشک کرتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھنے لگی' پھر جب اس نے کواڑ کھولے تو کامران کو دیکھ کر چیخ اٹھی۔

''رائے زادہ تم؟''

کامران نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔ شکنتلا کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ شاید وہ بھی رات بھر نہیں سوئی تھی۔ دیوداسی کی یہ حالت دیکھ کر کامران کا دل تڑپ اٹھا۔ ''ہاں شکنتلا! میں باعافیت واپس آ گیا ہوں۔ ابھی شام ہونے میں بہت دیر تھی۔ اس لئے تمہیں مطلع کرنے چلا آیا۔ مجھ سے تمہارا یہ اضطراب دیکھا نہیں جاتا۔ تم اپنے آنسو خشک کر ڈالو۔ طوفان گزر گیا۔''

شکنتلا نے بیک وقت غم اور خوشی کی کیفیت سے دوچار ہوتے ہوئے دروازے سے سر ٹیک دیا۔ ''اب کوئی دوسرا طوفان تو نہیں آئے گا؟'' شکنتلا کی آواز بھی آنسوؤں کے اثر سے بھیگ گئی تھی۔

''دوسرے طوفان کے خوف سے خوشی کے ان لمحوں کو اپنے آپ پر کیوں حرام کریں۔'' کامران نے کہا۔ ''اپنے آپ پر قابو رکھو۔ ٹھاکر کرشن راؤ پجاری رام سروپ کے کمرے میں موجود ہے۔ وہ تمہاری یہ حالت دیکھ کر کسی شبے کا شکار بھی ہو سکتا ہے۔ بس اب میں جا رہا ہوں۔'' یہ کہہ کر کامران پلٹ آیا۔

اس نے شکنتلا کی مدھم سی آواز سنی۔ ''رائے زادہ! خدا تمہاری حفاظت کرے۔''

❊❊❊

رات کے پچھلے پہر دیوداسی کامران کے کمرے میں دوبارہ داخل ہوئی۔ کامران اسے تمام واقعات سناتا رہا۔ اس دوران شکنتلا خاموش بیٹھی رہی۔ اس کی خوبصورت پیشانی پر لکیریں ابھرا ابھر کر مٹتی رہیں۔ پھر جب کامران چپ ہو گیا تو اس نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

''نرسنگا کچھ بھی کہے وہ اعتبار کے قابل نہیں۔ قزاقوں کا وعدہ ہی کیا؟ ظلم ان کا مذہب ..... تشدد ان کا مسلک ..... رہزنی ان کا پیشہ ..... قتل ان کی رسمیں ..... بدعہدی ان کا رواج۔''

''کچھ بھی سہی مگر اس واقعہ کے بعد نرسنگا کے رویے میں بڑی تبدیلی آئی ہے۔'' کامران نے جواباً کہا۔ ''میں اسے اپنا دوست نہیں سمجھتا' لیکن حالات کے اس مقتل میں نرسنگا کی عارضی رفاقت بھی ضروری ہے۔ اگر میں سردار کے وجود کو یکسر نظر انداز کر دوں تو پھر کرشن راؤ میرے جسم کے ساتھ روح تک کو جکڑ لے گا۔'' یہ کہہ کر کامران نے شکنتلا کو کرشن راؤ سے ملاقات کا حال بھی

دیوداسی گھبرا گئی۔ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر فوراً ہی اپنے ہونٹوں کو چبانے لگی۔ جیسے کوئی بات کہتے کہتے جبراً خاموش ہو گئی ہو۔ کامران نے شکنتلا کی اس کیفیت کو محسوس کر لیا۔ دیوداسی کے چہرے پر شدید ذہنی کشمکش کا رنگ نمایاں تھا۔

”تم کچھ کہنا چاہتی ہو؟“ کامران نے شکنتلا کا جھکا ہوا سر دیکھ کر کہا۔

”نہیں۔“ دیوداسی کا جواب مختصر تھا' مگر وہ اپنی آواز کی تھرتھراہٹ کو پوشیدہ رکھنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔

”تم کسی مصلحت یا الجھن کا شکار ہو دیوداسی۔“ کامران نے کہا۔

”تم اپنی زبان سے دیوداسی کیوں کہتے ہو؟“ شکنتلا نے بات کا رخ موڑنے کے لئے کہا۔ ”دیوداسی تو بہت پہلے مر چکی تھی۔ کل رات میں نے اسے اپنے ہاتھوں سے دفن کر دیا۔ پھر میرے ماضی کا وہ حوالہ کیوں؟“

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دیوداسی ایک خوبصورت لفظ ہے۔ اس سے عورت کا احترام ظاہر ہوتا ہے۔“ کامران نے سادگی سے کہا۔

”دیوداسی؟“ یکایک شکنتلا کے ہونٹ جل اٹھے۔ پہلے چہرہ سرخ ہوا اور پھر مسخ نظر آنے لگا۔ کامران! تم نے اس خوبصورت لفظ کا گھناؤنا پس منظر نہیں دیکھا۔ ہندو مذہب میں عورت کا احترام؟ ذرا ان ہنگاموں سے نجات مل جائے پھر تمہیں اس لفظ کا مفہوم بتاؤں گی۔“ شکنتلا کی آنکھوں سے چنگاریاں برسنے لگی تھیں۔

کامران نے بگڑی ہوئی صورت حال کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ ”یہ فضول بحث ناحق درمیان میں آ گئی۔ تم مجھے وہ بات بتاؤ جو تمہاری زبان تک آتے آتے دم توڑ دیتی ہے۔“

”کچھ نہیں ٹھاکر! کچھ نہیں۔“ شکنتلا کے چہرے پر خوف کے سائے لرزنے لگے۔ پھر ناگہاں وہ رونے لگی۔ شکنتلا کی مجبوری ناقابل بیان تھی۔

”تم مجھے اب بھی غیر سمجھتی ہو۔“ کامران کے ہونٹوں پر حرف شکایت ابھر آیا۔

”خدا کے لئے میری مجبوریوں سے میرے جذبات کا اندازہ نہ کرو۔“ شکنتلا کے اشکوں کی روانی تیز ہو گئی۔

”میں زیادہ دن کا مہمان نہیں ہوں شکنتلا!“ کامران بھی اداس ہو گیا تھا۔ ”اس سے پہلے کہ میں تم سے بچھڑ جاؤں' اپنے دل کا ایک ایک بوجھ اتار دو۔ پھر نہ کوئی سننے والا ہو گا اور نہ کوئی دامن آگے بڑھانے والا۔ مندر کی یہ سنگلاخ زمین تمہارے آنسوؤں کو جذب نہیں کر سکے گی۔“

”مت کرو بچھڑنے کی باتیں۔“ شکنتلا کے چہرے پر نیا رنگ آ گیا۔ ”کوئی کسی سے ملا ہی کب ہے جو بچھڑ جائے گا۔“

”یہ بھی بہت ہے شکنتلا! اس ایک لمحے کی بھی قدر کرو۔“ کامران نے دیوداسی کے دل پر رنج والم کے چھائے ہوئے غبار کو دھونے کی کوشش کی۔

”اگر مجھے یقین ہو جائے کہ میری باتیں سن کر تم اپنے دشمنوں سے الجھ نہیں جاؤ گے تو پھر میں ایک ایک راز فاش کر دوں گی۔“ شکنتلا نے جواباً کہا۔

”تمہارا یہ خوف میرا قاتل بھی ہو سکتا ہے۔“ کامران کے ایک ایک لفظ میں شکایتوں کا طوفان چھپا ہوا تھا۔

”تمہاری یہ محتاط محبت مجھے کسی نئے حادثے سے بھی دوچار کر سکتی ہے۔ جب زندگی کے ہر موڑ پر ایک نیا محاذ جنگ کھل جائے تو پھر مصلحت اور رازداری کچھ کام نہیں آتی۔ ہم مسلمان ہیں اور ہمارے عقیدے کے مطابق موت کا ایک وقت مقرر ہے۔ وقت سے پہلے [illegible] بھی۔ تمہیں یقین آ جانا چاہئے

کہ میں نے اپنے آپ کو بڑی حد تک بدل ڈالا ہے' کوئی شرمناک مشورہ قبول نہیں کروں گا اور اصولوں پر کسی قسم کی سودے بازی نہیں ہوگی۔ اس کے علاوہ جو چاہو کہہ ڈالو۔ پورے تحمل سے سنوں گا اور اس پر عمل بھی کروں گا کہ آخر تم میری اپنی ہو۔''

ایسی خوفناک اور تاریک فضا کے درمیان بھی شکنتلا کی آنکھوں میں امیدوں کے چراغ جل اٹھے۔ پھر وہ آہستہ آہستہ کہنے لگی۔

''کرشن راؤ تمہاری ماں سے اپنی بے عزتی کا انتقام لینا چاہتا ہے۔'' انجام کار ایک بھیانک راز دل کی گہرائیوں سے نکل کر شکنتلا کے ہونٹوں تک آ گیا اور پھر اس نے بوڑھے ٹھاکر کے منصوبے کی ساری تفصیلات کامران کو منتقل کر دیں۔

شکنتلا کا خیال تھا کہ شجاع الدین کامران یہ خوفناک انکشاف سن کر بھڑک اٹھے گا' مگر وہ خلاف معمول خاموش بیٹھا رہا۔ پھر شکنتلا نے دیکھا کہ اس کے چہرے کا رنگ بدلتا جا رہا ہے۔ دیوداسی سہم گئی۔

اچانک کامران کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔ ''مجھے کرشن راؤ کی خباثتوں کا اندازہ تھا' مگر میں یہ نہیں سوچ سکتا تھا کہ وہ میرے ہتھیار سے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی خواہش رکھتا ہے۔''

''وہ یہی چاہتا ہے۔'' شکنتلا نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ''تم مارے گئے تو تمہاری ماں ساری عمر بیٹے کی موت کا ماتم کریں گی۔ قائم خان قتل ہو گیا تو حکومت تمہیں پھانسی پر چڑھا دے گی۔ اس طرح بھی کرشن راؤ کی جیت ہوگی اور اگر قانون کے ہاتھوں سے بچ گئے تو ٹھاکر تمہیں مسلمان قوم کے خلاف آلہ کار بنائے گا۔''

اپنے اور قائم خان کے مارے جانے کے امکانات کو میں نے نظر انداز نہیں کیا تھا' لیکن کرشن راؤ کے منصوبے کا یہ پہلو میری نظروں سے اوجھل تھا۔ اب کامران کے چہرے پر جذبوں کی آگ پوری طرح روشن ہو چکی تھی۔

''رائے زادہ! تم اپنے عہد سے منحرف ہو رہے ہو۔'' شکنتلا نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔ ''تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ جذباتی روش اختیار نہیں کرو گے۔''

''نہیں شکنتلا! ابھی جذبوں کی آزمائش کا وقت نہیں آیا ہے۔'' کامران کے الفاظ میں وہی تپش تھی۔

''اور اگر وہ وقت آیا؟'' شکنتلا دہشت زدہ نظر آنے لگی تھی۔

''خدا کی قسم! اگر وہ وقت آیا تو کرشن راؤ کو اس کے پورے منصوبے کے ساتھ اسی مندر میں دفن کر دوں گا۔''

❊❊❊

آنے والا دن کامران کیلئے ایک نئی تبدیلی لے کر آیا۔ نرسنگا اس پر بہت زیادہ مہربان نظر آ رہا تھا۔ نرسنگا نے ایک نئے انداز سے اس کی جنگی تربیت شروع کر دی تھی۔ تقریباً تین ماہ بعد کامران اپنے بازوؤں میں نئی طاقت محسوس کر رہا تھا۔ شہسواری اور تیر اندازی کے مقابلوں میں وہ نرسنگا کے تمام ماہرین کو شکست دے چکا تھا بس اب شمشیر زنی کا مقابلہ باقی تھا۔

ایک دن نرسنگا نے اپنے محافظ خاص شاپارا کو طلب کیا اور دیگر پہرے داروں کے سامنے کامران کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''شاپارا! میں چاہتا ہوں کہ تو ٹھاکر کی تلوار توڑ دے مگر خیال رکھنا کہ اس کے جسم پر کوئی خراش نہ آئے۔''

پھر نرسنگا شجاع الدین کامران سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''ٹھاکر! یہ میرا سب سے پرانا ساتھی ہے کہ تو اس کی تلوار کے ٹکڑے کر دے۔''

پھر کامران اور شاپارا میں مقابلہ شروع ہو گیا۔ لوہے سے لوہا ٹکرایا تو فضا میں چنگاریاں رقص کرنے لگیں اور ہر طرف موت کے ساز کی جھنکار سنائی دے رہی تھی۔ یہ مقابلہ بہت دیر جاری رہا۔ دونوں کے جسم پسینے سے شرابور تھے۔ اس دوران شاپارا اور کامران کی کئی تلواریں ٹوٹیں۔ شرط یہ تھی کہ تلوار ٹوٹے بغیر کسی ایک فریق کے ہاتھ سے نکل جائے۔ آخر ایک طویل کشمکش کے بعد کامران شاپارا پر غالب آ گیا۔ شاپارا کی تلوار ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری تھی۔ ایک دائرے میں کھڑے ہوئے محافظوں کے منہ سے ہلکی ہلکی چیخیں نکل گئیں۔ وہ لوگ اپنے ساتھی کی شکست پر بہت اداس نظر آ رہے تھے مگر نرسنگا اور امر پالی کے چہروں پر خوشی کا گہرا رنگ تھا۔

''شاباش! ٹھاکر! تو نے نرسنگا کی شاگردی کا حق ادا کر دیا۔'' سردار نے چیخ کر کہا۔ ''اور شاپارا! تجھ پر بھی آفرین ہے کہ تو خوب لڑا۔ دونوں میں سے نہ کوئی ہارا' نہ کوئی جیتا کہ تم دونوں نرسنگا کے بازو ہو۔''

اس کے بعد نرسنگا نے تلوار طلب کی اور کامران کی طرف بڑھا دی۔ ''ٹھاکر! تیرا آخری مقابلہ مجھ سے ہو گا۔''

کامران چند لمحوں تک حیرت سے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے جھک کر اپنی تلوار نرسنگا کے قدموں پر رکھ دی۔ ''سردار مجھے بار بار مت آزما۔'' کامران جذباتی ہو گیا تھا۔ ''تو میرا استاد ہے۔ میں تجھ سے مقابلے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔''

''نرسنگا نے اپنے دونوں ہاتھ کامران کے شانوں پر رکھ دیئے۔ ''ٹھاکر! دنیا میں کوئی شخص اس طرح اپنا ہنر دوسروں کو نہیں سکھاتا' مگر دیوی گواہ ہے کہ میں نے تجھے اپنا سب کچھ دے دیا۔''

''میں تیرا شکر گزار ہوں نرسنگا۔'' کامران کے لہجے سے شدید جذباتی کیفیت کا اظہار ہو رہا تھا۔

''کل چاند کی آخری رات ہے۔'' نرسنگا خلاف توقع ایک عجیب بات کہہ رہا تھا۔ ''اس اندھیرے سے فائدہ اٹھا اور اپنے دشمنوں سے بھرپور انتقام لے لے۔''

کامران کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

''اب تیرے ہاتھوں میں اتنی طاقت آ گئی ہے کہ قائم خان کا سر آسانی سے اپنے قدموں میں جھکا سکتا ہے۔'' نرسنگا نے کامران کی حیرت دور کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر قائم خان کے آدمیوں نے تیرا راستہ روکا تو میرے بھیڑیے قریب ہی موجود ہوں گے۔ وہ اسے اس طرح پھاڑ ڈالیں گے کہ پہچانا نہیں جائے گا۔''

❋❋❋

پھر جب ایک سرشاری کے عالم میں کامران بڑے مندر پہنچا اور اس نے کرشن راؤ کو نرسنگا کے فیصلے سے آگاہ کیا تو بوڑھا ٹھاکر غصے سے پاگل ہو گیا۔

''نرسنگا کون ہوتا ہے تجھے اجازت دینے والا؟'' کرشن راؤ کے منہ سے کف اڑ رہا تھا۔ ''تو میرے حکم کا پابند ہے اور میرا تازہ حکم یہ ہے کہ جب تک تیرے ہاتھ کم سے کم سات انسانوں کے قتل سے رنگین نہیں ہو جائیں گے اس وقت تک تو مندر سے باہر نہیں جا سکتا۔''

❋❋❋

شجاع الدین کامران حیرت سے کرشن راؤ کا منہ دیکھنے لگا۔
''یہ کیسے ممکن ہے ٹھاکر؟'' کامران کے ہونٹوں سے الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہو رہے تھے۔ ''میں اور بے گناہ انسانوں کا قتل کروں؟ یہ کیسا مطالبہ ہے ٹھاکر؟''
''نرسنگا نے تجھ سے کہا تھا کہ تو اس کے کاروبار میں شریک ہو جا' مگر تو نے انکار کر دیا۔ یہ ایک بڑی بغاوت ہے جسے برداشت نہیں کیا جا سکتا۔'' کرشن راؤ غضب ناک لہجے میں بول رہا تھا۔
''میں نے نرسنگا سے کہہ دیا تھا کہ میں اس کی ظالمانہ تجارت میں شریک نہیں ہو سکتا۔'' شجاع الدین کامران بھی کرشن راؤ سے سخت لہجے میں بات کرنا چاہتا تھا' مگر اس نے مصلحت سے کام لیا اور اپنی آواز کو زیادہ بلند نہیں ہونے دیا۔ ''نرسنگا نے دوسری بار مجھے اپنے غیر انسانی کاروبار میں شریک ہونے کی دعوت نہیں دی۔ اس نے میرا مطالبہ تسلیم کر لیا ہے۔''
''نرسنگا کون ہوتا ہے تیرا مطالبہ تسلیم کرنے والا۔'' کرشن راؤ کا غصہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔
شجاع الدین کامران ایک بار پھر حیرت سے بوڑھے ٹھاکر کی طرف دیکھنے لگا۔
''اور پھر ایک غلام کا مطالبہ ہی کیا؟'' آخر کرشن راؤ کے سینے میں دبی ہوئی نفرتیں اس کی زبان تک آ گئیں۔
''غلام؟'' کامران نے پوری طاقت سے چیختے ہوئے کہا۔ ''میں اور تیرا غلام؟ کیا تو پاگل ہو گیا ہے ٹھاکر؟ میں نے کب تیری غلامی کی دستاویز پر دستخط کیے ہیں؟'' کامران کا پورا وجود غصے کی آگ سے جل اٹھا تھا۔
''میں تجھے ہمیشہ کے لیے خرید چکا ہوں' رائے نعیم الدین ذیشان کے غیرت مند بیٹے!'' شدت غضب سے کرشن راؤ کانپنے لگا تھا۔ ''میں نے بہت پہلے تیری قیمت ادا کر دی ہے۔ اب میں تیرے جسم اور تیری خواہشات پر پورا اختیار رکھتا ہوں۔ مجھے حق ہے کہ تجھے جس طرح چاہوں استعمال کروں۔'' بوڑھا ٹھاکر آپے سے باہر ہو گیا تھا اور شجاع الدین کامران جیسے سرکش نوجوان سے ایک آقا کے لہجے میں بات کر رہا تھا۔
''اپنی آواز نیچی رکھ ٹھاکر!'' کامران کی آنکھوں میں خون اترنے لگا تھا۔ ''میں اپنے اندر ایسی غیر انسانی آواز کو برداشت کرنے کی طاقت نہیں رکھتا ......اور تو ایک بار اپنے الفاظ پر بھی ٹھنڈے دل سے غور کر لے۔ میرے اور تیرے درمیان برابری کا رشتہ ہے۔ اگر آئندہ تو نے میری غلامی اور اپنی آقائیت کا حوالہ دیا تو پھر حالات اس حد تک بگڑ جائیں گے کہ پھر کبھی ان کی اصلاح نہیں ہو سکے گی۔ میں کل ہر صورت میں قائم خان راجپوت اور قاضی عماد الدین سے ملنے جاؤں گا۔ میرے بڑھتے ہوئے قدموں کو دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔'' یہ کہہ کر شجاع الدین کامران اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

❊❊❊

بوڑھے کرشن راؤ پر دحشت طاری تھی۔ وہ بار بار اپنے بال نوچ رہا تھا۔ پجاری رام سروپ نے ٹھاکر کی یہ حالت دیکھ کر دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

''مہاراج! آپ اتنے پریشان کیوں ہوتے ہیں؟'' رام سروپ کسی بدترین غلام کے لہجے میں بات کر رہا تھا۔ ''اگر حکم دیں تو تو اس ملیچھ کا قصہ ہی پاک کر ڈالیں۔ ہم سے یہ برداشت نہیں ہوتا کہ ایک اچھوت نوجوان ہندو دھرم کے رکھشک سے اس انداز میں مخاطب ہو۔ بھگوان کی سوگند ٹھاکر! یہ آپ کی نہیں دیوتاؤں کی توہین ہے۔''

کرشن راؤ جو آنکھیں بند کئے رام سروپ کے تخت پر پڑا ہانپ رہا تھا' یکا یک اٹھ کر بیٹھ گیا۔ یہ کام میرے نزدیک بہت سہل ہے کہ اس کی گردن کو جسم سے جدا کر دوں' مگر اس طرح میرے انتقام کی آگ نہیں بجھے گی۔ میں اسے ایک مجرم کی حیثیت سے زندہ رکھنا چاہتا ہوں۔ یہاں تک کہ وہ ایک دن میرے قدموں پر اپنا سر جھکا دے اور مجھ سے رو رو کر زندگی کی بھیک مانگے۔''

''ایسے کوئی آثار نظر نہیں آتے ٹھاکر!'' پجاری رام سروپ نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ بہت سر پھرا نوجوان ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ وہ جھک کر آپ کے چرن چھو لے۔''

''یہ کیسے ممکن ہے پجاری؟'' کرشن راؤ کی دونوں مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں اور اس کے چہرے پر نیلی رگوں کا ایک جال سا پھیلا ہوا نظر آ رہا تھا۔ ''تیرے ٹھاکر کو اس کے ارادوں میں کبھی شکست نہیں ہوئی۔ وہ جس طرح چاہتا ہے اپنی بات منوا لیتا ہے۔ اس حرام زادے کو بھی کرشن راؤ کی مرضی کے مطابق جینا ہوگا ورنہ زندگی اس سے اس طرح روٹھ جائے گی جس طرح ایک بھکاری سے قسمت خفا ہو جاتی ہے۔'' کرشن راؤ اعصابی طور پر اس قدر منتشر ہو چکا تھا کہ اس کی زبان بھی بے قابو ہو گئی تھی اور وہ براہ راست گالیوں پر اتر آیا تھا۔

پجاری رام سروپ گھبرا گیا۔ اس نے ایک بار پھر دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ''ٹھاکر! آپ اپنے ذہن پر اتنا بوجھ نہ ڈالیں۔ اس وقت آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔''

کرشن راؤ پجاری کا اشارہ سمجھ گیا تھا۔ وہ کانپتے جسم کے ساتھ اٹھا اور لرزتے قدموں سے تہہ خانے کے ایک مخصوص کمرے میں چلا گیا۔ رام سروپ نے فوری طور پر اسے شراب سے لبریز پیالہ پیش کیا جسے ٹھاکر کسی پیاسے جانور کی طرح پی گیا۔ پھر جب شراب آہستہ آہستہ کرشن راؤ پر اثر انداز ہونے لگی اور اس کے چہرے کا تناؤ کم ہوتا چلا گیا تو پجاری رام سروپ نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

''ٹھاکر! اس چھوت زادے کی یہ اکڑ بے سبب نہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے اسے سردار نرسنگا کی قربت حاصل ہو گئی ہے ورنہ وہ آپ سے اس زبان میں بات نہیں کرتا۔'' پجاری رام سروپ نے ایک نیا اندیشہ ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

''تیرا خیال غلط ہے پجاری!'' کرشن راؤ نے رام سروپ کی قیاس آرائی کو جھٹلاتے ہوئے کہا۔ ''نرسنگا کو ایک مسلمان سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ وہ تو ایک مکمل لیٹرا ہے۔ قزاقی اور قتل و غارت کے سوا اس کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آتی۔''

''آپ دنیا کے بارے میں زیادہ جانتے ہیں ٹھاکر!'' پجاری رام سروپ نے ایک غلام کے انداز میں سر جھکا دیا۔ ''میں تو مندر کی گھنٹیاں بجانے والا ایک ادنیٰ سا پجاری ہوں۔ بس میرے پریشان دماغ میں ایک خیال ابھرا تھا۔''

''نہیں! یہ ممکن نہیں۔'' کرشن راؤ نے شراب کے نشے میں جھومتے ہوئے کہا۔ ''بالفرض اگر یہ حادثہ ہو بھی گیا ہے تو نرسنگا تیرے ٹھاکر کے حکم سے [illegible]''

پجاری رام سروپ خاموش ہو گیا۔

پھر کچھ دیر بعد کرشن رائے نے پجاری کو حکم دیتے ہوئے کہا۔ "اپنے تمام مسلح آدمیوں کو تہہ خانے کے ہر دروازے پر کھڑا کر دے اور انہیں بتا دے کہ وہ ملیچھ اپنے کمرے سے باہر نکلنے نہ پائے۔"

پجاری رام سروپ ٹھاکر کے حکم کی تعمیل میں کھڑا ہو گیا۔ "اور راما راؤ کو میرے پاس بھیج دے۔" کرشن راؤ نے لہراتے ہوئے کہا۔ "راما کے آتے ہی سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

"راما اس وقت کہاں ہے ٹھاکر؟" رام سروپ نے بہت عاجزانہ لہجے میں پوچھا۔

"وہ حویلی میں موجود ہو گا۔ اپنے کسی آدمی کو بھیج دے۔" یہ کہہ کر کرشن راؤ ریشمی بستر پر دراز ہو گیا۔

***

شجاع الدین کامران کی عجیب کیفیت تھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے دشمن سامنے ہوں، مگر وہ ان سے انتقام لینے پر قادر نہ ہو۔ نرسنگا نے ایک طویل عرصے تک بڑی جانفشانی کے ساتھ اس کی تربیت کی تھی، مگر کرشن راؤ کی نئی بندش نے پورے منصوبے کو درہم برہم کر کے رکھ دیا تھا۔ کامران وقت کی اس نئی کروٹ کے بارے میں سلگتے ہوئے ذہن کے ساتھ سوچ رہا تھا۔

"نرسنگا نے اس کے کمزور ہاتھوں کو طاقت بخشی تھی اور ٹھاکر نے یک بیک ان ہی ہاتھوں کو کاٹ کر پھینک دیا تھا یا زنجیر پہنا دی تھی۔"

"یہ کیسا مذاق ہے؟" کامران نے اپنے آپ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "کیا یہ نرسنگا اور کرشن راؤ کی سازباز ہے کہ ایک آزادانہ حملے کی اجازت دیتا ہے اور دوسرا راستہ روک دیتا ہے؟ اگر یہ دونوں کی سیاست گری ہے تو پھر کیا میں حالات کے ہاتھوں کا کھلونا بن کر رہ جاؤں گا؟"

اسی کشمکش میں وقت گزرتا رہا اور رات سر پر آ گئی۔ پھر جب حسب معمول دیوداسی شکنتلا کامران کے لئے کھانا لے کر آئی تو صورت حال یکسر بدلی ہوئی تھی۔ تہہ خانے کی طویل راہداری میں قدم قدم پر مسلح آدمی نظر آ رہے تھے۔ کرشن راؤ کا خاص خدمت گار راما راؤ کامران کے کمرے کے عین سامنے پہرہ دے رہا تھا۔

شکنتلا کو دیکھتے ہی راما راؤ سخت لہجے میں بولا۔ "دیوداسی! اس اچھوت کے سامنے کھانا ڈال کر فوراً واپس چلی آنا کہ اب تیرے لئے ٹھاکر کا یہی حکم ہے۔"

شکنتلا لرز کر رہ گئی۔ کسی انجانے خطرے کے خوف سے اس کا دل دھڑکنے لگا تھا، مگر وہ ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر سنبھل گئی اور سوالیہ نظروں سے راما راؤ کی طرف دیکھنے لگی۔

"اب وہ چھوٹا ٹھاکر نہیں، ایک لعنت زدہ انسان ہے۔" راما راؤ نے انتہائی تحقیر آمیز لہجے میں کہا۔ "بڑے ٹھاکر نہیں چاہتے کہ تجھ جیسی اعلیٰ نسل عورت اس ملیچھ کو کھانا پہنچائے۔ بس یہ آخری رات ہے۔ کل اسے اچھوتوں کی بستی میں منتقل کر دیا جائے گا۔ پھر وہ انسانوں کے ہاتھوں کا بنایا ہوا کھانا نہیں، کتوں کے آگے کی بچی ہوئی غذا کھایا کرے گا۔"

شکنتلا نے سر جھکا دیا۔ "جیسا ٹھاکر کا حکم۔" یہ کہہ کر وہ آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی کامران کے کمرے میں داخل ہو گئی۔

شجاع الدین کامران دنیا و مافیہا سے بے خبر، دونوں ہاتھ پشت پر باندھے ادھر سے ادھر ٹہل رہا تھا۔ شکنتلا نے فرش پر کھانا رکھ کر دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ کامران کے انہماک میں کوئی خلل واقع نہیں ہوا تھا۔ اسے خبر بھی نہ ہو

سکی کہ شکنتلا اس سے چند قدم کے فاصلے پر اداس کھڑی ہے۔

''ٹھاکر!'' بالآخر شکنتلا نے اسے پکارا۔

کامران نے چونک کر دیوداسی کی طرف دیکھا۔ پھر ایک بے جان مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''مجھے تو تمہارے پیروں کی چاپ تک سنائی نہیں دی اور تم اتنے قریب آ گئیں۔'' کامران نے سوچے بغیر کہہ دیا تھا' مگر اس کی زبان سے ادا ہونے والے چند الفاظ نے شکنتلا کے جذبات کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیا۔

''یہ قربت بھی آج ختم ہو جائے گی۔'' شکنتلا کی آواز لرز رہی تھی۔

''کیا ہو گیا دیوداسی؟'' کامران نے گھبرا کر پوچھا۔

''تمہارے کمرے کے باہر راما راؤ پہرہ دے رہا ہے۔'' شکنتلا نے جواباً کہا۔ ''مجھے زیادہ دیر ٹھہرنے کی اجازت نہیں۔ میں نصف شب کے بعد اسی خفیہ راستے سے آؤں گی۔ تم جاگتے رہنا۔ شاید یہ ہماری رفاقت کی آخری رات ہو۔ تم میرا انتظار کرنا۔''

''تم مت آنا شکنتلا! مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔'' کامران ایک لمحے میں سب کچھ سمجھ چکا تھا۔ اس نے شکنتلا کو اپنی بدبختیوں کے سائے سے بچانے کی کوشش کی۔ مگر دیوداسی کوئی جواب دیئے بغیر تیزی سے دروازہ کھول کر چلی گئی۔

راما راؤ مستعد کھڑا تھا۔ شکنتلا کو دیکھتے ہی کہنے لگا۔

''دیوداسی تو نے دیر کر دی۔'' راما راؤ کے چہرے پر شک کی پرچھائیاں لرز رہی تھیں۔ ''شاید تو نے اس کے ساتھ جانوروں جیسا سلوک نہیں کیا۔''

''نہیں راما! یہ بات نہیں۔'' شکنتلا نے اپنے ہونٹوں پر جبری مسکراہٹ سجالی۔ ''کئی ماہ سے میرا یہ معمول ہے کہ جب وہ کھانا کھا لیتا ہے تو میں برتن اٹھا کر کمرے سے باہر آتی ہوں۔ آج جب میں خلاف عادت واپس آنے لگی تو چھوٹے ٹھاکر نے مجھے روکا۔ پھر میں......''

راما راؤ نے انتہائی جارحانہ انداز میں مداخلت کی۔ ''اس بدذات کو ''چھوٹے ٹھاکر'' نہیں' اچھوت کہو۔ ملیچھ اور ناپاک کہہ کر پکارو۔''

''پھر وہ اچھوت......'' راما راؤ کے جابرانہ حکم کے بعد شکنتلا نے بظاہر منافقت تو اختیار کر لی کہ وقت کا تقاضا یہی تھا' مگر اس کے اندر کوئی چیز ٹوٹ کر بکھر گئی۔ ''مجھ سے کہنے لگا کہ میں اتنی جلد کیوں واپس جا رہی ہوں۔ میں نے اسے ٹالنے کے لئے کہہ دیا کہ آج مجھے ایک ضروری کام ہے۔'' یہ کہہ کر دیوداسی شکنتلا نے بڑی بیبا کی کے ساتھ راما راؤ کی طرف دیکھا۔ ''میں نے مصلحتاً جھوٹ بولا کہ کہیں اس کے کانوں میں ٹھاکر کے نئے منصوبے کی بھنک نہ پڑ جائے۔''

''تو نے ٹھیک کیا دیوداسی!'' راما راؤ کے ہونٹوں پر ایک خبیث سی مسکراہٹ ابھر آئی۔

''اور کوئی حکم؟'' شکنتلا نے اپنے آپ پر جبر کرتے ہوئے کہا۔

''آئندہ اس وقت تک اس کے کمرے میں نہ جانا جب تک تجھے ٹھاکر دوسرا حکم نہ دیں۔'' راما راؤ نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''شکنتلا نے مصلحتاً سر جھکا دیا اور آہستہ قدموں سے اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ اگرچہ اس کے سینے میں ایک حشر سا برپا تھا' لیکن وہ راما راؤ کے سامنے

❋❋❋

آدھی رات کے قریب شکنتلا اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر راہداری کے موڑ تک آئی۔ اس کا خیال تھا کہ راما راؤ اور دوسرے مسلح محافظ شجاع الدین کے کمرے کے سامنے موجود ہوں گے' مگر پوری راہداری خالی پڑی تھی اور راما راؤ بھی غائب تھا۔ شکنتلا نے اطمینان کی سانس لی اور اپنے کمرے میں پلٹ آئی۔ پھر وہ اسی خفیہ راستے سے کامران کے پاس پہنچی۔

''جیسے ہی دیوار میں شگاف نمایاں ہوا اور کمرے میں ہلکی سی گونج سنائی دی' کامران اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''شکنتلا! تم؟'' کامران کے لہجے میں ناگواری کا رنگ شامل تھا۔ کیا میں نے تمہیں یہاں آنے کے لئے منع نہیں کیا تھا؟'' یہ کہتے کہتے کامران کی آواز سے غصہ بھی جھلکنے لگا تھا۔

شکنتلا کوئی جواب دیئے بغیر آگے بڑھتی رہی۔ پھر جب وہ کامران کے قریب پہنچ کر فرش پر بیٹھ گئی تو اس کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔ ''رائے زادہ؟ تمہارا حکم اپنی جگہ اور میرا فرض اپنی جگہ۔''

''کیا تم اس طرح نافرمانی کے گناہ کی مرتکب نہیں ہوئی ہو؟'' کامران کے لہجے کی تلخی برقرار تھی۔

''بے شک! یہ گناہ مجھ سے سرزد ہو گیا۔ میں کسی وقت تم سے معافی بھی مانگ لوں گی' مگر یہ سچ ہے کہ میرے پاس گناہ گار بن جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔'' شکنتلا کی آواز سے گہری اداسی جھلک رہی تھی۔

اس کے بعد دیوداسی نے کامران سے اچانک اس صورت حال کے بدل جانے کا سبب دریافت کیا۔

کامران خاموش بیٹھا رہا' پھر شکنتلا کے اصرار پر اس نے سارا واقعہ سناتے ہوئے کہا۔ ''نرسنگا چاہتا ہے کہ میں اپنے دشمنوں سے انتقام لوں اور ٹھاکر کا حکم ہے کہ میں انسانی خون سے اپنا دامن رنگین کئے بغیر اس قید خانے سے باہر نہیں جا سکتا۔''

شکنتلا لرزہ کر رہ گئی۔ ٹھاکر کی عیاریاں رنگ لا رہی تھیں اور وہ اپنے منصوبے پر بڑی سفاکی کے ساتھ عمل کر رہا تھا۔ دیوداسی کے چہرے پر کسی قبرستان جیسی ویرانی بسر رہی تھی۔

''ٹھاکر! میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ کرشن راؤ نقصان کی چیزوں کا کاروبار نہیں کرتا۔'' شکنتلا بے اختیار ہو کر رونے لگی۔ ''وہ پرانا سودخور ہے۔ تم سے اپنی ایک ایک عنایت کا حساب طلب کرے گا۔ کاش! تم یہاں نہ آتے یا پھر میری بات مان کر پہلے ہی فریب و جبر کے اس زنداں سے نکل جاتے۔''

''شکنتلا! یہ گزرے زمانوں پر ماتم کرنے کا وقت نہیں ہے۔'' کامران ایک بار پھر بگڑ گیا۔ ''میں نے تمہیں اس لئے منع کیا تھا کہ آج کی رات تم میرے پاس نہ آنا۔ مجھے معلوم ہے کہ تم عورتوں کے پاس طعنہ زنی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔''

''خدا کی قسم کامران! آج کی رات میں تم پر طعنہ زن نہیں۔'' شکنتلا نے بے قرار ہو کر پلنگ سے اپنا سر ٹیک دیا۔ یہاں تک کہ اس کا سر کامران کے پیروں سے ٹکرانے لگا۔ شکنتلا کی محبت کا یہ عجیب انداز تھا۔ اس وقت وہ ''دیوداسی'' کے بجائے کامران کی کنیز نظر آ رہی تھی۔ ''اگر آج کی رات میں تم تک نہ پہنچتی تو ساری عمر اپنے آپ سے شرمندہ رہتی۔'' شکنتلا فرط الم سے سسکنے لگی۔

کامران کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ ''معاف کرنا شکنتلا! حالات نے مجھے بہت ناگوار اور تلخ بنا دیا ہے۔''

''رائے زادہ! مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں۔'' شکنتلا نے گھبرا کر کامران کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں

''مگر میں تجھے کچھ نہیں دے سکتا دیوداسی؟'' یہ کہتے کہتے کامران کا چہرہ دھواں ہو گیا اور اس دھوئیں سے یاسمین خانم کا حسین و پروقار چہرہ ابھرنے لگا۔

''میں نے تم سے کچھ طلب بھی تو نہیں کیا' سوائے اس کے کہ تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو اور عزت مندانہ زندگی بسر کرو۔'' شکنتلا نے اپنے آنچل سے آنسو خشک کرتے ہوئے کہا۔ ''کل صبح ہوتے ہی تم مجھ سے ہمیشہ کے لئے جدا کر دیئے جاؤ گے۔''

کامران نے ان الفاظ کو اتنی حیرت سے سنا جیسے کمرے میں زلزلہ آ گیا ہو۔ چند لمحوں تک تو وہ سکتے کے عالم میں بیٹھا رہا۔ پھر شکنتلا سے اس طرح مخاطب ہوا جیسے اسے اپنی زبان پر مکمل قابو حاصل نہ ہو۔ ''یہ بات تم کس طرح کہہ سکتی ہو؟''

شکنتلا نے راما راؤ سے ہونے والی گفتگو کا ایک ایک لفظ بیان کر دیا۔

''پھر بھی تم یہاں چلی آئیں؟' کامران کے ہونٹ پھر سلگ اٹھے تھے۔ ''اگر اس وقت راما راؤ یا خود ٹھاکر یہاں چلا آئے تو جانتی ہو کہ اس کا کیا انجام ہو گا؟''

''راما راؤ کو اس راستے کا پتا نہیں۔'' شکنتلا نے اپنے دل کی خلش کو ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ''صرف ٹھاکر جانتا ہے کہ میرے اور اس کمرے کے درمیان ایک خفیہ راستہ بھی موجود ہے۔''

''بالفرض اگر ٹھاکر یہاں پہنچ گیا؟'' کامران نے اسی تلخی کے ساتھ سوال کیا۔

''تو کوئی فرق نہیں پڑے گا رائے زادہ!'' شکنتلا نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''کچھ دن پہلے تک مجھے اپنے کاندھوں پر یہ سر ایک بار گراں محسوس ہوتا تھا' مگر آج اس سر کو اس کی منزل مل گئی ہے۔ تمہارے قدموں کو چھو لیا' سر کی قیمت ادا ہو گئی۔ اب اگر یہ کٹ بھی جائے تو کوئی غم نہیں ہو گا۔''

شجاع الدین کامران نئے کرب کا شکار ہو گیا تھا۔ شکنتلا کی اس والہانہ محبت نے اس کے مجبور قدموں میں ایک اور زنجیر ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ وہ اڑی ہوئی رنگت اور خوف زدہ آنکھوں کے ساتھ دیوار کے اس شگاف کی طرف دیکھ رہا تھا جس سے گزر کر شکنتلا نے مقتل کی طرف آئی تھی۔

شکنتلا کامران کو خاموش پا کر دوبارہ بول اٹھی۔ ''ٹھاکر! یہ رات خیالوں کی دنیا میں گم ہو جانے کی رات نہیں۔''

کامران چونک کر شکنتلا کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں کسی بجھے ہوئے چراغ جیسی روشنی تھی۔ ''پھر تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟'' کامران کی آواز بہت تھکی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ ''میں اپنے نفس کی خاطر کسی بے گناہ کو قتل نہیں کر سکتا۔ ٹھاکر کا یہ مطالبہ ایک غیر انسانی مطالبہ ہے۔ مجھے یہ منظور ہے کہ میں ساری عمر انتقام کی آگ میں جلتا رہوں مگر یہ گوارا نہیں کہ اپنی پیاس بجھانے کے لئے انسانی خون کے دریا بہا دوں۔''

''ٹھاکر تم سے بھی چاہتا ہے۔'' بالآخر شکنتلا نے کرشن راؤ کا آخری راز بھی فاش کر دیا۔

''پہلے وہ تمہیں ایک جفا پیشہ قزاق بنائے گا' پھر تمہارے ہی ہاتھوں سے وہ قائم خان راجپوت اور دوسرے مسلمانوں کا قتل کرائے گا۔ اس کے بعد تم اس کے اشاروں پر رقص کرو گے۔ ایک مجرم کی حیثیت سے تمہاری ساری زندگی روپوشی کی حالت میں بسر ہو گی۔ یہ ہے کرشن راؤ کا منصوبہ جس کے ذریعے وہ تمہاری ماں سے انتقام لینا چاہتا ہے۔''

شجاع الدین کامران سناٹے میں آ گیا۔ وہ کرشن راؤ کی اس فریب کاری کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

''کل کسی وقت وہ تمہیں کسی دوسری جگہ منتقل کر دے گا۔'' شکنتلا نے مزید انکشاف کرتے ہوئے کہا۔ ''راما راؤ نے مجھے یہی بتایا ہے۔ پھر وہ تمہارے ساتھ اس وقت تک وحشیانہ سلوک کرتا رہے گا جب تک تم اس کے مطالبات کے آگے سر نہیں جھکا دو گے۔''

کامران کے اعصاب پر شکنتلا کا ہر لفظ ایک آہنی ضرب تھا' مگر اس نے بے مثال قوت برداشت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا نرسنگا کا وعدہ بھی محض ایک فریب ہے؟''

''بظاہر ستمگروں کے قبیلے مختلف ہیں' مگر ان کا مذہب ایک ہے۔ وہی سفاکی' وہی قتل و غارت' وہی جھوٹ اور وہی منافقت۔'' دیوداسی عالمانہ لہجے میں بول رہی تھی۔

''بے شک! نرسنگا ایک طاقتور انسان ہے' مگر وہ ایک مسلمان کے لئے ٹھاکر کرشن راؤ سے دشمنی مول نہیں لے گا۔ دونوں ایک دوسرے کی ضرورت ہیں اور یہی ضرورت انہیں اس قدر قریب لے آئی ہے۔'' یہ کہہ کر شکنتلا ایک لمحے کے لئے خاموش ہو گئی اور پھر کامران کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ایک عجیب سے لہجے میں بولی۔ ''آخر نرسنگا سے تمہارا کیا رشتہ ہے جو اس کی ہر بات کو پتھر کی لکیر سمجھتے ہو؟''

شجاع الدین کامران شکنتلا کے اس سوال پر حیرت زدہ رہ گیا۔ پھر اس کی نگاہوں میں سردار نرسنگا کا چہرہ ابھر آیا۔ نرسنگا پیشہ ور قزاق بھی تھا اور قاتل بھی۔ مگر گزشتہ دنوں پیش آنے والے کچھ واقعات نے اس کی نظروں میں ایک رہزن کا اعتبار قائم کر دیا تھا۔ کامران کے نزدیک یہ اس کی بڑی فتح تھی' لیکن جب شکنتلا نے نرسنگا اور اس کے رشتے کے بارے میں سوال کیا تو وہ کوئی جواب نہ دے سکا۔ اب کامران کو اپنی حیثیت کا اندازہ ہو چکا تھا۔ وہ وقت کی بساط پر شعبدہ بازوں کے ہاتھوں کا ایک کمزور مہرہ تھا۔ اپنی شکست کے احساس سے کامران کے چہرے پر گہری دھند چھا گئی۔

شکنتلا نے کامران کی اس حالت کو محسوس کر لیا اور اسے خوبصورت الفاظ میں تسلیاں دینے لگی۔ ''وہ دن ضرور آئے گا ٹھاکر! جب زنداں کی ایک ایک دیوار گر جائے گی۔ زنجیروں کے حلقے پگھل جائیں گے اور پتھروں کے ڈھیر کو تیز ہوا میں روئی کے گالوں کی طرح اڑا دیں گے۔ ہر رات کا انجام روشن و تابناک صبح ہے اور ہر غم کا اختتام لذت آمیز خوشی ہے' زہر کا صلہ کیف ہے اور تلخیوں کا بدلہ نشاط ہے۔''

کامران نے شکنتلا کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خاموشی سے اٹھا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ شکنتلا مضطرب ہو کر کھڑی ہو گئی۔ دیوداسی کو امید تھی کہ وہ اس کی طرف متوجہ ہو جائے گا' مگر جب کامران اپنے گرد و پیش سے بے نیاز ہو کر سر جھکائے ٹہلتا رہا تو شکنتلا نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

''رائے زادہ! تم میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتے؟''

کامران ٹھہر گیا۔ پھر بڑے گمبھیر لہجے میں بولا۔ ''مجھے سوچنے دو شکنتلا! یہ رات واقعی بہت سنگین ہے۔ میں فرصت کے ان چند لمحوں کو ضائع کرنا نہیں چاہتا۔''

''آخر کیا سوچ رہے ہو ٹھاکر؟ مجھے بھی تو بتاؤ؟'' شکنتلا کے لہجے میں ایک بار پھر وہی خوف و ہراس شامل ہو گیا تھا۔

کامران دوبارہ بستر پر بیٹھ گیا۔ شکنتلا نے اسی طرح کامران کے پیروں کے نزدیک فرش پر بیٹھنے کی کوشش کی مگر اس بار کامران نے اسے روکتے ہوئے کہا۔ ''تم میرے قریب بیٹھو! تمہارا درجہ مجھ سے زیادہ بلند ہے۔''

''نہیں ٹھاکر! مجھے تمہارے سامنے اس طرح بیٹھتے ہوئے بہت سکون ملتا ہے۔'' یکایک شکنتلا کی آنکھیں چھلکنے

لگی تھیں۔

''اور مجھے اس طرح سکون ملتا ہے کہ تم میرے روبرو بیٹھو' مجھ سے زیادہ بلند مقام پر نہیں تو کم سے کم برابر کی سطح پر آجاؤ۔'' یہ میری شدید خواہش ہے۔ کامران نے ضد کی اور شکنتلا کو پلنگ پر بیٹھ جانا پڑا۔

کچھ دیر تک کمرے کی فضا پر گہرا سکوت مسلط رہا۔ پھر کامران آہستہ آہستہ بولنے لگا۔ ''شکنتلا! میں نے حالات کی مسلسل کروٹوں کے بعد ایک ہی نتیجہ اخذ کیا ہے کہ میں اپنی زندگی کی بازی ہار چکا ہوں۔ وہ میری حماقت تھی کہ میں نے سردار نرسنگا اور ٹھاکر کرشن راؤ کو بیوقوف سمجھ لیا تھا۔ اب میں اپنی نادانیوں کا ماتم کرنا نہیں چاہتا۔ میں نے اپنے جذبہ انتقام کو تسکین پہنچانے کے لئے بڑی ہولناک تجارت کی تھی۔ مجھے اس تجارت میں خسارہ ہوگیا۔ ایسا خسارہ کہ اصل تک ڈوب جانے کی نوبت آگئی ہے۔ اس سے پہلے کہ میری سانسیں ڈوب جائیں میں تمہیں ایک امانت منتقل کر رہا ہوں۔ اگر کبھی وقت سازگار ہو اور تم نفرتوں کے اس اندھیرے سے نکل کر اجالوں میں پہنچ جاؤ تو ایک بار یاسمین خانم سے ضرور ملنا۔'' یہ کہہ کر کامران نے شکنتلا کو اپنے ماموں کی حویلی کا پتا سمجھایا۔ پھر دوبارہ انتہائی حسرت زدہ لہجے میں کہنے لگا۔ ''تم نے میرے شب و روز بھی دیکھے ہیں اور میری بے قراریوں کا مشاہدہ بھی کیا ہے۔ میں یاسمین خانم کے فراق میں کس طرح جلا ہوں' اس کا تمہیں کچھ تو اندازہ ہوگا۔ امانت داروں کی طرح میرے جلنے کی ایک ایک کیفیت' ایک ایک ادا اسے بتا دینا۔ شاید تم اپنی آنکھوں سے میرے بجھنے کا منظر نہ دیکھ سکو۔ مگر قیاس کر لینا کہ ٹھاکر کرشن راؤ اور نرسنگا نے مجھے کس طرح بجھایا ہوگا؟ یاسمین کو یہ بھی بتا دینا کہ میری راکھ کوئی عام راکھ نہیں ہوگی۔ اگر اس کی آنکھیں تلاش کریں تو ہر ذرے میں سے عشق کا آتش فشاں نظر آئے گا۔''

شکنتلا نے بڑی مشکل سے اس صورت حال پر قابو پانے کی کوشش کی مگر آنکھوں نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔ جذبوں کا غبار آنسوؤں کی شکل میں برسنے لگا۔ ''ایسا ہی ہوگا ٹھاکر! میں امانت دار ہوں۔ میں تمہاری امانت اس طرح یاسمین کو منتقل کروں گی جس طرح تم نے اپنا راز میرے حوالے کیا ہے۔ ایک ایک لفظ پوری صداقت کے ساتھ کہوں گی اور اسے یہ بھی بتاؤں گی کہ اہل وفا ایسے ہوتے ہیں۔''

یکایک کامران کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھر آئی۔ مگر وہ ایک ایسی مسکراہٹ تھی جس کا ہر زاویہ زخمی تھا۔ ''اب میں مطمئن ہوں شکنتلا!'' کامران نے پرعزم لہجے میں کہا۔ اگرچہ یہ میری محرومیوں کا ازالہ تو نہیں' لیکن اب مجھے یقین آگیا ہے کہ انسان کو اس زندگی میں سب کچھ حاصل نہیں ہو جاتا۔ اب میں اپنی آسودگی کے لئے نیا راستہ تلاش کروں گا۔

نیا راستہ ایک ذومعنی لفظ تھا۔ شکنتلا الجھ کر رہ گئی۔ ''وہ کونسا راستہ ہے ٹھاکر؟'' شکنتلا نے بے قرار ہو کر پوچھا۔ دیوداسی سمجھ بیٹھی تھی کہ شاید کامران حالات سے گھبرا کر ٹھاکر کرشن راؤ کی شرط مان لے گا اور کشت و خون کے اس وحشیانہ کاروبار میں شریک ہو جائے گا۔ اپنے اس اندیشے کو دور کرنے کے لئے اس نے کامران سے ''نئے راستے'' کی وضاحت چاہی تھی۔

''وہ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے میری ایک خواہش پوری کر دو۔'' کامران نے جذباتی لہجے میں کہا۔ ''اسے تم میری آخری خواہش بھی سمجھ سکتی ہو۔''

''بتاؤ ٹھاکر! تمہاری ہر خواہش میرے لئے حکم کا درجہ رکھتی ہے۔'' شکنتلا کی آواز لرز رہی تھی۔

''حکم نہیں! خواہش' صرف خواہش' صرف ایک آرزو' ایک تمنا۔'' اس طویل رفاقت کے دوران پہلی بار کامران کے لہجے نے ایک نیا رنگ اختیار کیا [illegible] خواہش کو کسی اور وقت کے لئے

اٹھا رکھتا' مگر اب جبکہ موت کا سایہ میرے قریب ہی کہیں منڈلا رہا ہے' میں اپنی ذات پر اپنے جذبوں کا قرض باقی رکھنا نہیں چاہتا۔"

شکنتلا ہمہ تن گوش تھی اور کامران کی آخری خواہش جاننے کے لئے مضطرب نظر آ رہی تھی۔

"مجھے اتنا بتا دو کہ تم کون ہو؟ تمہارے ماں باپ کہاں ہیں؟ تم کرشن راؤ کے مندر میں دیوداسی کے درجے تک کس طرح پہنچیں؟ وہ کونسی محرومی تھی جس کے زیر اثر تم کسی مسلمان کا انتظار کر رہی تھیں اور تمہیں ہندوؤں کے درمیان رہتے ہوئے بھی ان سے اتنی نفرت کیوں ہے؟"

شکنتلا بدحواس نظر آنے لگی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایسے سنگین حالات میں کامران اس سے اتنے نازک سوالات کرے گا کہ جن کا جواب دینے کے لئے پہاڑ کا سینہ اور فولاد کا دل درکار تھا۔

شکنتلا نے مناسب انداز میں ٹالنے کی کوشش کی' مگر کامران اصرار کرتا رہا۔ "میرے پاس وقت نہیں ہے۔ میری اس مجبوری سے فائدہ مت اٹھاؤ شکنتلا۔ میں تمہاری محبتوں کا قرض ادا نہیں کر رہا ہوں' چند ساعتیں جو بچ گئی ہیں انہیں تمہاری غمگساری میں خرچ کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے کچھ نہ کچھ تو اندازہ ہے کہ تم میری طرح زمانہ گزیدہ ہو مگر اس طرح مجھے تسکین نہیں ہو گی۔"

بالآخر شکنتلا نے وہ فسانۂ الم چھیڑ دیا جس کا ورق ورق خوں رنگ تھا' ہر باب ایک مرثیہ اور ہر لفظ ایک نوحہ۔

"میں چودہ پندرہ سال کی ایک راجپوت لڑکی تھی جس کے ماں باپ کو قزاقوں نے قتل کر دیا اور مجھے کرشن راؤ کے حوالے کر کے تاریکیوں میں گم ہو گئے۔"

"کیا وہ نرسنگا کے آدمی تھے؟" کامران وحشت زدہ ہو کر درمیان ہی میں بول اٹھا۔

"نہیں! ان لٹیروں کا نرسنگا سے کوئی تعلق نہیں۔" شکنتلا نے گھبرا کر کہا۔ وہ کامران کو کس طرح بتاتی کہ نرسنگا کے آدمیوں نے نہیں' خود نرسنگا نے اس کے ماں باپ کو قتل کیا تھا۔ پھر اسے اپنی ہوس کا نشانہ بنا کر بڑے مندر میں کرشن راؤ کے پاس چھوڑ گیا۔ شکنتلا نے کامران کے سامنے مصلحتاً نرسنگا کا نام نہیں لیا تھا۔ اسے خوف تھا کہ کہیں کامران مشتعل نہ ہو جائے اور پھر جوش جذبات میں اس سے الجھ پڑے۔ اس طرح کامران کی زندگی کو ایک اور خطرہ لاحق ہو سکتا تھا۔ شکنتلا نے جھوٹ بول کر اپنی حد تک اس خطرے کو ٹالنے کی کوشش کی تھی۔

"پھر کرشن راؤ نے تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا؟" کامران نے شکنتلا کو خاموش پا کر سوال کیا۔

"کرشن راؤ نے مجھے مذہبی تعلیم دلائی اور پھر مجھے دیوداسی بنا دیا۔" شکنتلا بڑی ہمت سے حقائق کے اس زہر کو پینے کی کوشش کر رہی تھی۔

"دیوداسی کسے کہتے ہیں؟" اچانک کامران نے ایک سوال کر دیا۔

"وہ جو دیوتاؤں کی کنیز ہو اور پجاریوں کی خدمت کرے۔" شکنتلا اس اذیت ناک صورت حال سے خاموشی کے ساتھ گزر جانا چاہتی تھی۔ اس لئے اس نے کرشن راؤ کی سفاکیوں پر پردہ ڈال دیا۔

"میں نے تمہیں پہلے دن کرشن راؤ کے سامنے ناچتے ہوئے دیکھا تھا۔ کیا دیوداسیاں رقص بھی کرتی ہیں؟" کامران نے حیران ہو کر پوچھا۔

"رقص پھر رقص ہے دیوداسیاں تو اس سے بھی غلیظ کام کرتی ہیں۔" انتہائی کوشش کے باوجود شکنتلا کی زبان لڑکھڑا گئی' مگر اس نے فوراً ہی بات بدلنے کی کوشش کی۔ "میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہندو مذہب میں رقص اور

کامران نے شکنتلا کی اس دلیل کو قبول نہیں کیا۔ ”میں جانتا ہوں کہ دیوداسی کسے کہتے ہیں اور کرشن راؤ نے تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا؟“

”ٹھا کر! میرے ماضی کو دفن کر دو۔ میں نے بھی اسے مٹی کے ڈھیر کے نیچے دبا دیا ہے۔“ شکنتلا رونے لگی۔

”میری چتا کی راکھ کو جمع نہ کرو اس سے ایک بہت بدصورت عورت جنم لے گی۔ سر سے پاؤں تک گناہوں کی کیچڑ میں لتھڑی ہوئی ایک مجبور عورت۔ خدا کے لئے کامران! قبر کھود کر میری لاش باہر نہ نکالو کہ اس کے بعد تمہیں مجھ سے نفرت ہو جائے گی۔“

”میں تیری نہیں، کرشن راؤ کی اصلی شکل دیکھنا چاہتا ہوں۔“ شدت جذبات سے کامران کا چہرہ جلنے لگا۔ خدا کا واسطہ نہ دے شکنتلا کہ آج کی رات مجھ پر بہت بھاری ہے۔“

”کچھ نہیں! بس وہ مجھے اپنے سامنے نچا کر ذلیل کرتا ہے۔“ شکنتلا نے ایک بار پھر جھوٹ بول کر کامران کے بھڑکتے ہوئے جذبات کو سرد کرنے کی کوشش کی۔

”تمہاری زبان اور چہرے میں کوئی میل نہیں۔“

کامران کی آواز یکا یک بلند ہو گئی تھی۔ ”تم اس شخص سے جھوٹ بول رہی ہو شکنتلا جس کا مذہب سچ ہے اور جو سچ کی خاطر یہاں تک آ پہنچا۔ بس اب تم جاؤ۔ میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم نے میری خواہش کا احترام کیا۔ مگر پھر بھی سچائی کچھ اور ہے۔ اگر زندہ رہا تو کسی کی مدد کے بغیر اس سچائی کو تلاش کر لوں گا۔“ کامران کے چہرے پر ساری دنیا کی نفرتیں عود کر آئی تھیں۔ ”میں نے تمہارے اعتراف کے بغیر بھی کرشن راؤ کو پہچان لیا ہے۔“ یہ کہہ کر شجاع الدین کامران نے اٹھنے کی کوشش کی۔

شکنتلا نے پوری طاقت سے اس کا دامن پکڑ لیا۔ کامران آگے بڑھا۔ یہاں تک کہ اس کے پیرہن کا ٹکڑا شکنتلا کے ہاتھوں میں آ گیا۔

”میں کرشن راؤ کی داشتہ ہوں کامران!“ بالآخر شکنتلا چیخ اٹھی۔ ”ایسی داشتہ جو ٹھکرائی جا چکی۔ اب جس کا فرض منصبی یہ ہے کہ تمہیں کھینچ کر گناہوں کی دلدل میں اتار دوں۔ کرشن راؤ نے مجھے یہی ذمے داری سونپی تھی۔“ یہ کہہ کر شکنتلا نے کامران کے پیرہن کے اس ٹکڑے کو آنکھوں سے لگا لیا اور سسک سسک کر رونے لگی۔

کامران پلٹ آیا اور اس نے آگے بڑھ کر شکنتلا کے سر پر دونوں ہاتھ رکھ دیئے۔ پھر ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ”کرشن راؤ! میرے مذہب کا دشمن! میری ماں کے جذبوں کا قاتل ...... تیری آبرو کا رہزن ...... اب اس کا قتل مجھ پر واجب ہو گیا ہے...... یہی وہ نیا راستہ ہے جسے میں اختیار کرنے جا رہا ہوں۔“

❊❊❊

شکنتلا کے بہتے ہوئے آنسو تھم گئے اور اس کی خوبصورت آنکھیں پتھرا کر رہ گئیں۔ خوف و دہشت کی زیادتی سے وہ پتھر کے ایک مجسمے میں تبدیل ہو گئی تھی۔ شکنتلا کے ہاتھوں میں شجاع الدین کامران کے پیرہن کا ٹکڑا تھا اور وہ سکتے کی سی کیفیت میں رائے زادہ کو دیکھے جا رہی تھی۔

''اب میرے گناہوں کا کفارہ اسی طرح ادا ہو سکتا ہے کہ میں کرشن راؤ کے بوڑھے مگر ناپاک جسم کو ٹکڑوں میں تبدیل کر دوں۔'' کامران کے لہجے میں ساری دنیا کی نفرتیں سمٹ آئی تھیں۔

''نہیں ٹھاکر! خدا کے لئے نہیں۔'' شکنتلا دوبارہ چیخ اٹھی۔ ''مجھے اندازہ تھا کہ تم اس صدمے کو برداشت نہ کر سکو گے اور پہلے سے زیادہ مشتعل ہو جاؤ گے۔''

''سوال میرے اشتعال کا نہیں۔ اصول اور قانون کا ہے۔'' حیرت انگیز طور پر کامران کے لہجے میں ٹھہراؤ آ گیا تھا۔ ''میں کرشن راؤ سے اپنی ماں کی توہین کا انتقام لینا چاہتا تھا' مگر وہ انتقام اسی حد تک ہوتا کہ اس نے جو کچھ بویا تھا' وہی کاٹ لیتا۔ میں اس کی گردن میں طوق رسوائی ڈال دیتا اور پھر اسے کسی کتے کی طرح دہلی کی گلیوں میں کھینچتا پھرتا۔ پھر جب تم نے بتایا کہ وہ میرے مذہب کا دشمن ہے اور مجھے مسلمانوں کے خلاف استعمال کرنا چاہتا ہے' تو اس کا قتل فرض ہو گیا۔'' شجاع الدین کامران شکنتلا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بول رہا تھا۔ ''اور پھر جب مجھ پر یہ راز فاش ہوا کہ وہ تمہاری آبرو کا لٹیرا ہے تو پھر اس کا ایک اور قتل مجھ پر واجب ہو گیا میں اسے دوبار ہلاک کرنا چاہتا ہوں۔''

''تم اسے دوبار کس طرح قتل کرو گے ٹھاکر؟'' شکنتلا تیز آندھی میں کسی کمزور شاخ کی طرح کانپ رہی تھی۔

''میں جانتا ہوں کہ اگر کسی انسان پر ایک بار موت نازل ہو جائے تو وہ دوبارہ زندہ نہیں ہوتا...... لیکن میں نے طے کیا ہے کہ اپنے دل کو سکون پہنچانے کے لئے کرشن راؤ کو رک رک کر قتل کروں گا۔ اس کے جسم کو کئی مرحلوں میں اپنی شمشیر کا ہدف بناؤں گا۔ یہاں تک کہ وہ سسک سسک کر دم توڑ دے گا۔ یہی اس کی دہری موت ہو گی اور یہی اس کا دہرا قتل ہو گا۔ بس اسی طرح میں اپنی قسم پوری کر سکتا ہوں۔''

''بے شک! وہ میرا گناہ گار ہے' لیکن کیا تم میری خاطر اسے معاف نہیں کر سکتے۔'' شکنتلا نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے اور فرش کی طرف جھکنے لگی۔

کامران نے اس کے دونوں بازو پکڑ کر کھڑا کیا اور پوری طاقت سے شکنتلا کے جڑے ہوئے ہاتھوں کو الگ کر دیا۔ ''اب تم مسلمان ہو' پھر اپنے ہی ہم جنس کے سامنے ہاتھ جوڑنے اور پیروں کو چھونے کی یہ کافرانہ عادت کیوں؟''

کامران کے لہجے میں غصہ بھی تھا اور شدید احتجاج بھی۔

''سر اٹھا کر کیسے چلوں ٹھاکر کہ بچپن سے جھکنا ہی سیکھا ہے۔'' شکنتلا کی زبان سے ادا ہونے والا ایک ایک لفظ

گردشِ وقت کا مرثیہ تھا۔ ”برسوں کی عادت ہے، جاتے جاتے جائے گی۔“

”اس شرمناک عادت کو اس ایک لمحے میں ختم ہونا چاہیئے تھا جب تم نے خدائے واحد کی کبریائی کا اقرار کیا تھا۔ مجھے تعجب ہے کہ تم اب تک اپنی اس روش پر قائم ہو۔“ کامران نے بڑے دلگرفتہ انداز میں شکایت کی۔ ”میری طرف دیکھو کہ موت کے منہ میں کھڑا ہوں، مگر نرسنگا اور کرشن راؤ سے جھک کر بات نہیں کرتا۔ ہوسکتا ہے کل صبح قتل کر دیا جاؤں لیکن میرے قدم کانپتے ہیں اور نہ آنکھوں کی پتلیاں ...... نہ کسی سے رحم کی بھیک مانگتا ہوں اور نہ کسی کی حقیر بات سنتا ہوں۔ اس اعتماد کے ساتھ جی رہا ہوں کہ یہ دنیا میری زندگی کی ایک ساعت بھی کم نہیں کر سکتی۔ میرے خدا نے بس مجھے یہی ایک یقین بخشا ہے کہ جانوں کا مالک بھی وہی ہے اور جہانوں کا بھی وہی۔ کیا نرسنگا اور کیا کرشن راؤ' یہ تو اس کی سلطنت میں ایک بھکاری سے بھی زیادہ حقیر ہیں۔ پھر تم کسی کے آگے کیوں خم ہوتی ہو؟ سیدھی کھڑی ہو جاؤ اور سر اٹھا کر چلو۔ جھکتے وہ ہیں جن کا خدا نہیں ہوتا۔“

شکنتلا کس طرح بتاتی کہ وہ کامران کے قدموں سے لپٹ کر اسے روکنا چاہتی تھی۔

”اگر میں تمہارے جرم میں کرشن راؤ کو معاف بھی کر دوں تو اس سے کچھ حاصل نہیں ہوا۔“ شکنتلا کو خاموش پا کر کامران نے کہا۔ ”اگر وہ تمہارے جرم سے چھوٹے گا تو میں اسے اپنی ماں کی دل آزاریوں کے جرم میں پکڑلوں گا ......اور اگر ماں بھی اسے معاف کر دیں گی تو میں اسلام دشمنی میں اس کی گرفت کروں گا۔“

”خدا بھی تو اسے معاف کر سکتا ہے۔“ شکنتلا نے کامران کو باز رکھنے کے لئے ایک عجیب سی دلیل کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔

”خدا بت پرستوں اور ظالموں کو معاف نہیں کرتا۔“ کامران نے تیز لہجے میں جواب دیا۔

”پھر مجھے وہ طریقہ بتا دو کہ میں تمہارے بڑھتے ہوئے قدموں کو روک سکوں۔“ شکنتلا اپنی بے کسی پر رونے لگی۔

”آخر تم میرے آزاد قدموں کو اپنے وعدوں اور قسموں کی زنجیر کیوں پہنانا چاہتی ہو؟“ کامران دوبارہ بھڑک اٹھا۔

”اس لئے کہ میں تمہیں زندہ دیکھنا چاہتی ہوں۔“ شکنتلا کے اشکوں کی روانی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا۔

”میری ماں کی خواہش بھی تو یہی ہے کہ میں اپنے چہرے پر جرم کی سیاہی کے ساتھ سانس لیتا رہوں۔“ شدت غضب سے کامران کی آنکھیں جلنے لگی تھیں۔ ”اور اب تم بھی مجھ سے اسی مجرمانہ زندگی کا مطالبہ کر رہی ہو۔“

”کیا کرشن راؤ کو قتل کر دینے سے تمہارا جرم مٹ جائے گا؟“ شکنتلا نے بڑے کرب کے ساتھ پوچھا۔

”یقیناً ایسا ہی ہوگا۔“ کامران نے اپنے ہاتھ کو فضا میں لہراتے ہوئے کہا۔ ”جب میرے ہاتھ کرشن راؤ کے خون سے رنگین ہوں گے اور مجھے شاہ کی عدالت میں پابہ زنجیر لایا جائے گا تو میں احساس فخر کے ساتھ کہوں گا کہ سلطان یہ میں ہوں رائے شجاع الدین کامران' شہیدوں اور غازیوں کی اولاد جسے قاضی عماد الدین اور قائم خان راجپوت کی سازشوں نے مجرم ٹھہرایا' مگر آج اسی کی شمشیر آب دار نے ایک بڑے دشمن اسلام کو خاک و خون میں ملا دیا۔ پھر دنیا کو میری بے گناہی کا یقین آ جائے گا۔“

شکنتلا کی مجبوریاں نا قابل بیان تھیں۔ کامران نے اپنے راستے پر جانے کے لئے ایک اور دلیل تراش لی تھی۔

”مگر تم کرشن راؤ تک کس طرح پہنچو گے؟“ شکنتلا نے کامران کو روکنے کی ایک اور نا کام کوشش کی۔

”میں اس سے جھوٹ بولوں گا۔“ ... لئے مصنوعی طور پر اس کی

پیشکش قبول کرلوں گا۔ پھر جب وہ فریب میں مبتلا ہو کر میرے قریب آجائے گا تو میں اس کا کام تمام کردوں گا۔"

"کیا اس کے بعد تم کرشن راؤ کے آدمیوں سے محفوظ رہ سکو گے؟" شکنتلا کے لہجے میں اس غصے کی جھلک تھی جو شدید محبت کا دوسرا عکس ہوتا ہے۔

"ہاں! میں اپنے انجام سے بے خبر ہوں۔" کامران کی آواز سے گہری طمانیت کا اظہار ہو رہا تھا۔ "شاید اس کے پالے ہوئے بھیڑیے میرے جسم کو اس طرح نوچ ڈالیں کہ میں پہچانا بھی نہ جاؤں۔"

"کیا یہ موت ایک احمق انسان کی موت نہیں ہوگی؟" شکنتلا نے ایک نئے زاویے سے کامران کو قائل کرنا چاہا۔ "جب تم دربار شاہی تک پہنچ ہی نہ سکو گے تو پھر کونسی عدالت کو بتاؤ گے کہ تم بے قصور ہو اور اپنی ناکردہ گناہی کا داغ دھونے کے لئے تم نے یہ کارنامہ انجام دیا ہے۔"

کامران کے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ بے چارگی کے عالم میں شکنتلا کا منہ دیکھنے لگا۔

"پھر تم ہی بتاؤ کہ میں کیا کروں؟" کامران شدید مایوسی کی کیفیت سے دوچار تھا اور بار بار اپنے ہاتھ مل رہا تھا۔

"تم عارضی طور پر کرشن راؤ کی پیشکش قبول کرلو۔" شکنتلا نے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

"تمہارا مطلب ہے کہ بے گناہ انسانوں کا قتل عام کروں؟" کامران نے جھنجھلا کر پوچھا۔

"کشت و خون کے کھیل میں شریک نہ ہو' مگر موقع ملتے ہی یہاں سے فرار ہو جاؤ۔" شکنتلا نے اپنے مشورے کی وضاحت کی۔

"فرار کے لئے کشادہ راستے تو کجا' اگر ایک سوراخ بھی کھلا ہوتا تو میں اب تک بہت دور جا چکا ہوتا۔" کامران اپنے آپ سے بیزار نظر آ رہا تھا۔

"کرشن راؤ تمہیں قزاقی کیلئے استعمال کرنا چاہتا ہے۔" شکنتلا کا بے قرار ذہن بہت تیزی سے اس سنگین مسئلے کا حل تلاش کر رہا تھا۔ "تم کچھ دن کے لئے اس کے آلۂ کار بن جاؤ۔ لوگوں کو لوٹنے کے بجائے صرف تماشائی کی حیثیت سے قتل و غارت کے اس بازار میں کھڑے رہو۔"

"کیا وہ عیار ٹھاکر مجھے محض ایک تماشائی بن جانے دے گا؟" کامران بیچ میں بول اٹھا۔

"شروع میں تم اپنی نومشقی کا عذر پیش کر سکتے ہو۔" شکنتلا نے بڑی ذہانت سے کامران کی دلیل کو مسترد کر دیا۔ ٹھاکر تمہارے اس عذر کو تسلیم کرلے گا کہ تم ابھی غارت گری کے کاروبار سے ناآشنا ہو۔ یہ بہانہ سازی تمہیں اتنی مہلت فراہم کر دے گی کہ تم ان لٹیروں کے نرغے سے نکل جاؤ۔"

"پھر میں کیا کروں گا؟" کامران نے ایک اور سوال کیا۔

"تم اپنے سلطان کے دربار میں رسائی حاصل کر کے اسے کرشن راؤ اور نرسنگا کی زیر زمین سازشوں کی خبر دو۔ یہ کسی اکیلے شخص کا کام نہیں۔ حکومت ہی اس فتنے کو کچل سکتی ہے۔" شکنتلا کامران کو ایک نیا راستہ دکھا رہی تھی۔ "اگر تمہاری اطلاع پر حکومت کسی کارروائی کے لئے آمادہ ہو گئی تو شاید تمہیں بھی کوئی اعزاز حاصل ہو جائے اور اس طرح تمہارے ماموں کا منصوبہ اسی کے منہ پر الٹ جائے۔"

کامران کے دماغ میں ایک برق سی لہرائی' مگر فوراً ہی بجھ گئی۔ "میں سلطان کے دربار تک کس طرح پہنچوں گا؟" کامران نے انتہائی تاسف کے ساتھ کہا۔ "میں تو کسی امیر کے دروازے تک بھی نہیں جا سکتا......اور اگر کسی طرح رسائی حاصل کر بھی لوں تو میری سنے گا کون؟ میں تو سب کی نظروں میں ایک مجرم ہوں۔"

شکنتلا کے چہرے پر بھی عکس ملال ابھر آیا اور وہ گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ وہ کامران کو جبر کے اس زنداں سے نکالنے کے لئے کوئی اور راستہ تلاش کر رہی تھی۔

"کیا میری حکومت میواتی لٹیروں کی اس غارت گری سے واقف نہیں؟" کامران اچانک بول اٹھا۔ "دہلی اور اس کے گردونواح میں رہنے والا ایک ایک فرد جانتا ہے کہ موت کے یہ تاجر کیسے بھیانک کاروبار میں مصروف ہیں اس آگہی کے باوجود حکومت ان قزاقوں کے خلاف اب تک کوئی قدم نہ اٹھا سکی۔ ایسا لگتا ہے کہ سلطان بھی سو رہا ہے اور اس کے کارندے بھی۔ جب کسی ملک کا حکمران سو جائے تو پھر زمین نرسنگا اور کرشن راؤ ہی پیدا کرتی ہے۔" یہ کہتے کہتے کامران کو محسوس ہوا جیسے اس کا پورا جسم کسی نادیدہ آگ میں جل اٹھا ہو۔

"تمہارے اس دوست کا کیا نام ہے جو ہانسی میں رہتا ہے؟" شکنتلا نے کامراں کی مایوسیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"کمال الدین احمد!" کامران نے چونک کر کہا۔ "تمہیں اس کا خیال کیسے آ گیا؟"

"وہ تو ایک معتبر انسان ہے۔ دہلی کے امیراس کا تو اعتبار کریں گے؟" شکنتلا نے پرجوش لہجے میں کہا۔ "تم کسی طرح فرار ہو کر کمال الدین احمد تک پہنچ جاؤ اور اس کے سامنے کرشن راؤ کے منصوبے کو بے نقاب کر دو۔"

"نہیں یہ ممکن نہیں۔" کامران نے کسی جھجک کے بغیر انکار کر دیا۔ "اگر کمال احمد وہاں پہنچ بھی گیا تو سو طرح کے سوالات اٹھ کھڑے ہوں گے۔ میں اپنے مسائل کی آگ میں کسی دوسرے کو ایندھن نہیں بناؤں گا۔"

"پھر کیا کرو گے؟" شکنتلا کے اعصاب شکستہ ہو گئے اور وہ ہذیانی انداز میں چیخنے لگی۔ "میں نے جس کے سہارے جینا چاہا' اسے قتل کر دیا گیا۔ تمہیں بھی اندھیروں کے یہ عفریت کھا جائیں گے؟ کیا روشنی کی یہ آخری لکیر بھی مٹ جائے گی؟ اے خدا! ہمارے عقائد کے شیشوں کو پتھروں کی اس بارش سے بچا لے کہ ہم بہت کمزور ہیں۔"

شجاع الدین کامران بدحواس ہو کر آگے بڑھا اور اس نے بے اختیار اپنا ہاتھ شکنتلا کے ہونٹوں پر رکھ دیا۔

"اپنے آپ کو سنبھالو شکنتلا کہ ہم دشمنوں کے حصار میں ہیں۔ یہ ہمارا گھر نہیں کہ جس طرح چاہیں ماتم کریں۔"

شکنتلا ... کو اپنے قریب پا یا تو اور بھی وارفتہ ہو گئی۔ نہ جانے دو دو اسی کیسے کیسے آزار لاحق تھے' مسیحا آیا تو اس کے سینے پر سر رکھ کر بہت دیر تک روتی رہی۔ برسوں سے دل پر ایک گھٹا سی چھائی تھی۔ چارہ گری کا موسم آیا تو اس طرح ٹوٹ کر برسی کہ جل تھل ایک ہو گئے۔ کامران کا سینہ اس کے اشکوں سے بھیگ گیا جنہیں چھپائے چھپائے ایک معصوم و شاداب لڑکی گناہوں کا ریگستان بن گئی تھی۔

رات کا نڈھال کارواں صبح کی منزل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ شب گزیدہ لوگ روشنی ... پر جشن مناتے ہیں مگر شکنتلا دعا کر ... مانگ رہی تھی کہ یہ اندھیرا کبھی ختم نہ ہو۔

کامران نئی صبح کے تصور سے خود بھی ہراساں تھا' لیکن وہ اپنی پریشانی کا اظہار کر کے ایک بے سہارا لڑکی کو مزید شکستہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ "میری کوشش یہی ہو گی کہ کرشن راؤ سے مصالحت کی کوئی صورت نکل آئے۔" شکنتلا کی خاطر کامران نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا جھوٹ بولا تھا۔

"ہاں ٹھاکر! میں بھی یہی چاہتی ہوں۔" شکنتلا کسی بچے کی طرح مچل اٹھی۔

"تم کب تک مجھے ٹھاکر ٹھاکر پکارتی رہو گی۔" کامران نے اس کے طرز تخاطب پر اعتراض کرتے ہوئے کہا۔

"تم نے مجھے دیوتا کا صحیح مفہوم بتایا تو میں نے اس لفظ کو اپنے ذہن سے کھرچ ڈالا ... میں ... ٹھاکر ہوں اور کرشن راؤ بھی ... آخر دونوں میں ...

''الفاظ سے کچھ نہیں ہوتا۔'' شکنتلا نے جبراً مسکرانے کی کوشش کی۔ ''ٹھاکر آقا کو بھی کہتے ہیں اور میں اسی نسبت سے تمہیں ٹھاکر کہہ کر پکارتی ہوں۔'' یہ کہتے کہتے شکنتلا کے پورے چہرے پر شرم و حیاء کی سرخی اس طرح پھیل گئی جیسے شام کے وقت آسمان کے کناروں پر شفق نمودار ہو جائے۔

''میں تمہارا آقا نہیں' ساتھی ہوں ...... مگر ایسا ساتھی جو تمہیں دکھوں کے منجدھار میں تنہا چھوڑے جا رہا ہے۔'' شکنتلا کے تعلق سے پہلی بار کامران کو اپنی آنکھوں کے گوشوں میں نمی سی محسوس ہوئی۔

''نہیں! اب میں تنہا نہیں ہوں ......'' شکنتلا اس طرح اٹھ کھڑی ہوئی جیسے کوئی جنازہ اٹھایا جا رہا ہو۔ ''تمہارے دم سے یادوں کی ایک دنیا آباد رہے گی اور جہاں یادوں کا اتنا ہجوم ہو وہاں کوئی تنہا کیسے رہ سکتا ہے؟''

شکنتلا چلی گئی اور کامران حالات کی نئی ستم ظریفی کے بارے میں سوچنے لگا۔

پریشان خیالات کی ایک یلغار تھی' جو کامران کو ایک تنکے کی مانند مختلف سمتوں میں اڑائے جا رہی تھی۔ کبھی سعدیہ خانم کا اداس پیکر نظر آتا۔ بوڑھی عورت بیٹے کے انتظار میں تھک کر دروازے پر سو جاتی ہے ...... کبھی قاضی عماد الدین کی عدالت ابھر آتی جس کے در و دیوار بے شمار بندگان خدا کے خون سے سرخ تھے ...... کبھی قائم خان راجپوت کی حویلی میں قہقہوں کا شور گونجنے لگتا ...... کبھی لب بستہ یاسمین خانم اداس آنکھوں کی زبان سے سوال کرتی ...... ''کامران! تم کب لوٹ کر آؤ گے؟'' کبھی وہ نامراد شکنتلا یاد آ جاتی جو ابھی ابھی اس کے پہلو سے اٹھ کر گئی تھی اور جس نے ایک ایسے مرد سے محبت کی تھی جو کسی دوسری عورت کے فراق میں بچپن سے جل رہا تھا۔

''افسوس؟'' شکنتلا تو ملی بھی تو کس مقام پر؟'' کامران کے ہونٹوں سے آہ سرد نکل گئی اور اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں کے سامنے کرشن راؤ کا پورا نظام جبر روشن ہو گیا' جس میں صرف زنجیریں تھیں' پتھر تھے' زہریلی ناگنیں تھیں' آدم خور اژدھے تھے' بھیڑیے تھے' شکاری کتے تھے اور مجبور انسانوں کی بے اثر چیخیں تھیں۔ کامران سونا نہیں چاہتا تھا' مگر شدید تھکن نے اس کی پلکیں جھپکا دیں۔ وہ فرش ہی پر سو گیا۔

❋❋❋

پھر جب سورج کئی ہاتھ بلند ہو گیا تو دروازے پر تیز دستک ہوئی۔ کامران بے خبر سو رہا تھا۔ اندر سے کوئی جواب نہ آیا تو باہر والوں نے اپنے ہاتھوں کو پوری طاقت سے استعمال کیا۔ یہاں تک کہ شجاع الدین کامران جاگنے پر مجبور ہو گیا۔ پھر اس نے دروازہ کھولا تو ٹھاکر کا خادم خاص راما راؤ کئی مسلح آدمیوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ کامران کو راما راؤ کی آمد پر کوئی حیرت نہیں ہوئی تھی۔ شکنتلا نے گزشتہ رات ہی اسے کرشن راؤ کے نئے منصوبے سے آگاہ کر دیا تھا۔

''کیسے آئے راما راؤ؟'' کامران نے انتہائی قوت برداشت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''باہر نکل! تجھے ٹھاکر نے طلب کیا ہے۔'' راما راؤ کے لہجے سے بے ہودگی ٹپک رہی تھی جیسے وہ رائے شجاع الدین کامران سے نہیں' کسی زر خرید غلام سے مخاطب ہو۔

''تم چلو! میں کچھ دیر بعد آتا ہوں۔'' کامران نے راما راؤ کی گرم گفتاری کے باوجود صبر و ضبط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔

''ابھی اور اسی وقت۔'' راما راؤ کی آنکھوں سے انگارے برسنے لگے۔

''میں تیرے ٹھاکر کا غلام نہیں ہوں کہ سانس لینے کیلئے بھی اس کی اجازت طلب کروں۔'' انتہائی قوت برداشت کا مظاہرہ کرتے کرتے اچانک کامران کے اعصاب جواب دے گئے اور زبان مصلحت کا بند توڑ کر سیلاب کے پانی کی طرح بے قابو ہو گئی۔

کامران یہ کہہ کر پلٹ جانا چاہتا تھا کہ یکا یک راما راؤ کا ہاتھ اس کے گریبان کی طرف بڑھا۔ کامران نے پیچھے ہٹنے کی کوشش کی' مگر راما راؤ نے اس کا گریبان پکڑ کر پوری طاقت سے آگے کی جانب جھٹکا دیا۔ کامران نے اپنے دونوں پاؤں چوکھٹ کی ابھری ہوئی لکڑیوں میں پھنسا کر سنبھلنا چاہا' لیکن راما راؤ خود بھی ایک توانا انسان تھا اور اس نے بے خبری کے عالم میں اپنے دشمن پر حملہ کیا تھا' اس لئے کامران لڑکھڑا گیا۔ اس کشمکش میں گریبان چاک ہوا تو دامن تک چلا گیا۔ قدموں کا توازن کھونے کے بعد بھی کامران نے راما راؤ کی کلائی پکڑ لی اور اپنے پیرہن کو مزید دھجیاں ہونے سے بچایا' لیکن دوسرے مسلح محافظ نے اپنی نیام کمر سے کھول کر کامران کے سر پر ماری۔ ضرب بہت شدید تھی رائے زادہ کی آنکھوں کے سامنے چنگاریاں سی ابھریں اور پھر دوسرے ہی لمحے سیاہ دھبے لہرانے لگے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے راما راؤ نے بھی اپنی نیام کھول لی اور کامران کے سر پر دوسری ضرب لگائی۔ قدموں کا توازن کچھ اور بگڑ گیا۔ راما راؤ کے ساتھی نے تیسری ضرب لگائی۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرے کی تہہ میں اس قدر اضافہ ہو گیا کہ کامران کو اپنی بینائی زائل ہوتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ وہ لڑکھڑا کر فرش پر گرنے ہی والا تھا کہ اس نے محض اندازے سے راما راؤ کے اس ساتھی کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے جو مسلسل کامران کے سر پر ضربیں لگا رہا تھا۔ مسلح راجپوت نے کامران کی گرفت سے آزاد ہونے کی کوشش کی' مگر رائے زادہ کی پکڑ بہت زیادہ مضبوط تھی۔ راما راؤ کے دوسرے ماتحتوں نے اپنے ساتھی کو آزاد کرانے کی کوشش کی' لیکن کامران نے اسے نہیں چھوڑا۔ یہاں تک کہ اس کشمکش میں دونوں فرش پر گر گئے۔ کامران نے انتہائی تکلیف کے باوجود اپنے دونوں ہاتھ مسلح راجپوت کی گردن میں پیوست کر دیئے۔ جب ہاتھوں کا دباؤ حد سے زیادہ بڑھ گیا تو وہ راجپوت کسی ذبح ہونے والے جانور کی طرح چیخنے لگا۔

"راما! بھگوان کیلئے میری سہایتا کر کہ یہ ملیچھ مجھے مار ڈالے گا۔"

راما راؤ نے اپنے ساتھی کی اس چیخ کے ساتھ ہی آگے بڑھ کر کامران کے زوردار ٹھوکر لگائی' مگر رائے زادہ کی گرفت کمزور نہیں ہوئی۔ اس نے چیخ کر کہا۔

"راما! تو راجپوتوں کے نام پر ایک بدنما داغ ہے۔ تو نے اور تیرے ساتھیوں نے جس بزدلی کے ساتھ مجھ پر حملہ کیا ہے اس طرح تو گھٹیا نسل کا کوئی کتا بھی کسی کے نہیں کاٹے گا تو اور تیرا آقا گلیوں میں گھومنے والے کتوں سے بھی بدتر ہیں۔ میرے ہاتھ میں تلوار دے کر مجھے للکارا ہوتا۔ پھر اس مندر کے در و دیوار پر یہ راز کھل جاتا کہ تم لوگ کتنے بڑے بہادر ہو۔ بے شک! مجھے مار ڈالو مگر میں تمہارے اس سورما کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ یہ میرے ہاتھوں میں تڑپ تڑپ کر جان دے دے گا اور پھر تمہیں یقین آ جائے گا کہ میرے ہاتھ "یم راج" (فرشتہ اجل) کے ہاتھوں سے کم طاقت نہیں رکھتے۔"

راما راؤ اور اس کے ساتھی بدحواس ہو گئے۔ انفرادی شجاعت کا مظاہرہ کرنے کے بجائے وہ سب کے سب اجتماعی انداز میں کامران پر حملہ آور ہوئے۔ نیاموں کی کئی شدید ضربیں رائے زادہ کے سر پر لگائی گئیں۔ یہاں تک کہ ایک بے دست و پا انسان اپنے ہوش کھو بیٹھا۔ کامران کی انگلیوں کی گرفت کمزور ہوتی چلی گئی اور پھر اس کا جسم ایک طرف ڈھلک گیا۔

مسلح راجپوت کی آنکھیں حلقوں سے باہر نکل آئی تھیں اور اس کا چہرہ نیلا پڑ گیا تھا۔ کچھ دیر بعد خون کی گردش بحال ہوئی تو وہ اٹھ کر کھڑا ہوا اور بے ہوش کامران کے جسم پر ٹھوکریں مارنے لگا۔

اس دوران شور و غل سن کر تمام دیوداسیاں اپنے اپنے کمروں سے باہر نکل آئی تھیں' مگر خوف و دہشت نے انہیں

آگے بڑھنے سے روک دیا تھا۔ پھر بھی شکنتلا دیوانہ وار دوڑتی ہوئی کامران تک پہنچ گئی۔

''اسے کیوں مارا ہے؟ کیا تجھے معلوم نہیں کہ یہ چھوٹا ٹھاکر ہے' مہاراج کا جانشین!'' شکنتلا نے بے ہوش کامران کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو اپنے خون میں نہایا ہوا زمین پر پڑا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ حالات اس قدر تیزی سے کروٹ لیں گے اور کامران اتنی جلدی کرشن راؤ کے تشدد کا شکار ہو جائے گا۔

''یہ مہاراج کا جانشین نہیں' ایک اچھوت تھا' جو اپنی زبان اور ہاتھوں سے ٹھاکر کے تلوؤں کو ناپاک کرنا چاہتا تھا۔ مجبوراً اس کی زبان بھی بند کر دی گئی اور ہاتھ بھی توڑ دیئے گئے؟'' راما راؤ نے اپنی نفرت کا اظہار کرنے کیلئے کئی بار جھک کر کامران کے منہ پر تھوکا اور اس کے بے ہوش جسم پر اپنی ٹھوکروں کی طاقت آزمائی۔

شکنتلا کے دل و جاں پر قیامت سی گزر رہی تھی۔ اگرچہ وقت نے اسے بھیڑیوں کے نرغے میں لاکھڑا کیا تھا' لیکن پھر بھی وہ اپنی زبان پر قابو نہ رکھ سکی۔ ''مہاراج نے تو مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ کل تک ان کا حکم تھا کہ میں چھوٹے ٹھاکر کو دنیا کی ہر آسائش فراہم کروں۔ پھر ایک رات میں یہ سب کچھ کیا ہو گیا؟'' شکنتلا نے بڑے کرب ناک لہجے میں کہا۔

''تیری حیثیت ہی کیا ہے ویشیا!'' راما راؤ کسی درندے کی طرح دہاڑا۔' تو کون ہے فاحشہ کہ ٹھاکر پہلے تجھے خبردار کرتے' پھر اپنا حکم جاری کرتے۔'' یہ کہہ کر راما راؤ نے پوری طاقت کے ساتھ شکنتلا کو دھکا دیا۔ ایک کمزور سے جسم کی لڑکی طاقت کے اس مظاہرے کو برداشت نہ کر سکی۔ وہ سامنے کی دیوار سے ٹکرائی اور پھر فرش پر گر گئی۔ چند لمحوں میں شکنتلا کے ماتھے پر بھی زخموں کی فصل اگ آئی تھی۔ نسوانی چیخ ابھری مگر خوف و دہشت کی فضا میں دب کر رہ گئی۔

راما راؤ کسی بھیڑیے کی طرح دیوداسی پر جھپٹا اور اسے زمین سے کھینچ کر اٹھاتے ہوئے بولا۔ ''مجھے اس بات کا لحاظ ہے کہ تو ٹھاکر کی داشتہ ہے ورنہ اب تک تیرا یہ دریدہ جسم پہچانا نہیں جاتا۔ اپنے ہونٹ بھی سی لے اور کمرے کے کواڑ بھی بند کر لے۔ اگر تو نے اپنی زبان کو جنبش دی تو ٹھاکر کے پالے ہوئے بھیڑیوں کا شمار کر لے کہ وہ تعداد میں کتنے ہیں اور ان کی پسندیدہ غذا انسانی گوشت کے سوا کچھ نہیں۔'' راما راؤ بے حیائی پر اتر آیا تھا اور ایک مجبور لڑکی کو شرمناک انداز میں دھمکیاں دے رہا تھا۔

شکنتلا کیا جواب دیتی؟ خاموشی سے لڑکھڑاتی ہوئی چلی گئی۔ اس نے ایک بار بھی مڑ کر نہیں دیکھا کہ کامران کس حالت میں ہے اور اس پر کیا گزر رہی ہے؟ راما راؤ نے شکنتلا کی زبان کے ساتھ اس کی آنکھوں پر بھی پابندی عائد کر دی تھی۔

❋❋❋

شکنتلا کے جانے کے بعد راما راؤ نے تمام دیوداسیوں کو طلب کیا۔ مذہب کے نام پر وحشت و درندگی کا شکار ہونے والی ساری لڑکیاں لرزتے جسموں اور جھکی ہوئی آنکھوں کے ساتھ راما راؤ کے سامنے کھڑی تھیں۔

''تمہاری آنکھوں نے یہاں کچھ دیر پہلے کیا دیکھا اور تمہارے کانوں نے کیا سنا؟'' راما راؤ نے دیوداسیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز میں بھیڑیوں جیسی غراہٹ تھی۔

''جو کچھ آپ نے دیکھا اور جو کچھ آپ کے کانوں نے سنا۔'' تمام لڑکیاں بیک زبان بولیں۔

''اگر ٹھاکر تم سے پوچھیں تو کہہ دینا کہ اس ملیچھ نے مہاراج کو ان کے ماں باپ کے حوالے سے ننگی گالیاں دی تھیں۔'' راما راؤ نے کامران کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

دیوداسیوں نے لونڈیوں کے انداز میں سر جھکا دیئے۔ ان کے جسموں کی لرزش صاف نمایاں تھی۔

''اور یہ بھی کہہ دینا کہ مہاراج کے اس خدمت گار نے آخر وقت تک چھوٹے ٹھاکر کو سمجھانے کی کوشش کی' مگر وہ نہیں مانا۔'' راما راؤ نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''ایسا ہی ہوگا مہاراج!'' دیوداسیاں دہشت کے سبب راما راؤ کو بھی ''مہاراج'' کہہ کر پکارنے لگی تھیں۔

''اگر ایسا نہیں ہوا؟'' راما راؤ نے خونخوار نظروں سے لڑکیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

تمام دیوداسیاں گھبرا کر اس طرح زمین پر جھک گئیں جیسے وہ اپنے کسی دیوتا کو سجدہ کر رہی ہوں۔

راما راؤ کے سیاہ ہونٹوں پر ایک سفاک مسکراہٹ ابھر آئی۔ ''کھڑی ہو جاؤ مجھے تمہارے سجدوں کی ضرورت نہیں' اس اقرار کی ضرورت ہے جو تم ٹھاکر کے سامنے کرو گی۔ اگر مہاراج کے روبرو تمہارے ہونٹوں کا زاویہ بگڑ گیا تو میں تمہاری تقدیریں خراب کر دوں گا۔ بس اب جاؤ اور شکنتلا کے سر سے بہتے ہوئے خون کو یاد رکھو کہ اس کا اور تمہارا خون مختلف نہیں ہے۔''

دیوداسیاں تیزی سے مڑیں اور بھاگتے ہوئے اپنے کمروں کی طرف جانے لگیں۔ بدحواسی میں کچھ لڑکیاں گر پڑیں اور پھر اس طرح اٹھ کر بھاگنے لگیں جیسے موت ان کے تعاقب میں ہو۔

دیوداسیوں کی اس بے کسی پر راما راؤ نے ایک ہذیانی قہقہہ لگایا اور اپنے ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگا۔ ''اس ملیچھ کو اٹھاؤ اور ٹھاکر کے سامنے چلو۔''

''مگر راما ٹھاکر نے ہمیں یہ حکم تو نہیں دیا تھا۔'' ایک راجپوت نے فکر انگیز لہجے میں کہا۔ ''اگر ٹھاکر نے باز پرس کی تو ہم کیا جواب دیں گے؟''

''میں تم لوگوں کے خلاف کھلنے والی ہر زبان کاٹ چکا ہوں۔'' راما راؤ نے انتہائی رعونت کے ساتھ کہا۔ ''میں ٹھاکر کا مزاج شناس ہوں جب تم اپنی وفاداریوں کی داستان پوری رنگ آمیزی کے ساتھ بیان کرو گے تو مہاراج سزا کے بجائے تمہیں بیش بہا انعام سے نوازیں گے۔''

کرشن راؤ کے تمام خدمت گاروں کے ہونٹوں پر ایک آسودہ سی مسکراہٹ ابھر آئی۔ پھر وہ کامران کے بے ہوش جسم کو اٹھانے کیلئے خم ہوئے لیکن ایک راجپوت جھجک کر سیدھا ہو گیا۔

''راما! اس ملیچھ کا خون ہمارے جسموں کو ناپاک کر دے گا۔''

''کچھ دیر کے لئے اس غلاظت کو برداشت کر لو۔'' راما راؤ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ جمنا میں سات غوطے لگا لینا۔ دیوتا ہمیں دوبارہ پاک کر دیں گے کہ ہم نے یہ خون ان ہی کیلئے تو بہایا ہے۔''

راما راؤ کے اس بھاشن کے بعد درندے مطمئن ہو گئے اور کامران کو اٹھا کر طویل راہداری طے کرتے ہوئے پجاری رام سروپ کے کمرے میں پہنچے جہاں کرشن راؤ ان کا انتظار کر رہا تھا۔

کرشن راؤ گھبرا کر کھڑا ہو گیا اور چیختے ہوئے کہنے لگا۔ ''راما! یہ کیا ہے؟''

پجاری رام سروپ بھی دہشت زدہ نظر آنے لگا۔ اس کی نظریں کامران کے خون پر جمی ہوئی تھیں جو قطرہ قطرہ ٹپک رہا تھا۔ ''اسے باہر لے چلو! اس نے تو بھگوان کے گھر کو ہی ناپاک کر ڈالا۔''

راما راؤ اور اس کے ساتھی کامران کو لئے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے اور مندر کے سامنے ایک درخت کے نیچے ڈال دیا۔ کرشن راؤ اور پجاری رام سروپ بھی ان لوگوں کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔

راما راؤ اور اس کے ساتھی اونچی آواز [illegible] افسانہ کرشن راؤ کو سنا رہے

تھے اور بوڑھا ٹھاکر شدت غضب سے کانپ رہا تھا۔
جب درندوں کی زبانیں خاموش ہو گئیں تو کرشن راؤ نے آگے بڑھ کر کامران کے ایک ٹھوکر ماری اور اپنے خدمت گار کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تو نے ٹھیک کیا راما! میں ہمیشہ تیری وفاداریوں پر ناز کرتا رہا ہوں۔ تو میرا سچا پیروکار ہے۔''
''ٹھاکر! میں تیری عزت کی خاطر چپ رہا ورنہ دیوداسی شکنتلا کو بھی اسی حالت میں تیرے سامنے لاتا۔'' راما راؤ نے ٹھاکر کے بوڑھے اعصاب پر ایک اور ضرب لگائی۔
''اس نے کیا کیا؟'' کرشن راؤ دوبارہ بھڑک اٹھا۔
''وہ تیرے حکم کے خلاف اس ملیچھ کی حمایت کر رہی تھی۔'' راما راؤ نے ایک نئے انداز سے ٹھاکر کے کانوں میں زہر گھول دیا تھا۔
''اس ویشیا کو بھی مندر سے باہر نکال دے یا اپنے پاس رکھ لے۔ تیرے ٹھاکر کو سوکھے ہوئے پھول پسند نہیں۔'' کرشن راؤ کی درندگی اپنے عروج پر تھی۔
راما فوراً کرشن راؤ کے قدموں میں جھک گیا۔ ''پائے لاگوں ٹھاکر! تو اپنے غلاموں پر بڑا مہربان ہے۔'' راما راؤ کی ایک دیرینہ خواہش پوری ہو چکی تھی۔ اس کی ہوسناک نظریں دن رات شکنتلا کے تعاقب میں رہتی تھیں' مگر راما راؤ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ ٹھاکر سے شکنتلا کو مانگ لیتا۔ کرشن راؤ جب کسی دیوداسی سے اکتا جاتا تو وہ اسے راما یا بڑے پجاری کے تصرف میں دے دیتا لیکن شکنتلا ابھی کم حیثیت لوگوں میں تقسیم نہیں ہو سکی تھی۔ آخر راما کی خوش قسمتی کے سبب آج وہ بھی دن آ گیا تھا۔ ٹھاکر نے دیوداسی کی قسمت کا فیصلہ کر دیا اور راما راؤ اس کے قدموں پر سر رکھ کر گڑگڑانے لگا۔
''پجاری!'' کرشن راؤ نے اچانک رام سروپ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''پورے مندر کو غسل دے دے میں نے اپنے پرکھوں سے سنا ہے کہ دیوتاؤں کے استھان پر کسی ملیچھ کا خون گرنا کوئی اچھا شگون نہیں ہے۔''
ٹھاکر کا حکم سنتے ہی رام سروپ اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔
''اسے شودروں کی بستی میں لے جا اور کچھ دن نرسنگا کا انتظار کر لے۔'' کرشن راؤ نے بے رحم لہجے میں کہا۔
''نرسنگا کا انتظار کیوں؟'' راما راؤ نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ''کیا ٹھاکر' جنگلی سردار کی مرضی کا پابند ہے؟''
''تیرا ٹھاکر کسی کا پابند نہیں۔'' کرشن راؤ نے چیخ کر کہا' مگر اس کے چہرے پر ہلکی سی گھبراہٹ کا رنگ نمایاں تھا۔ ''پھر بھی ہمیں کچھ دن انتظار کرنا ہو گا۔ آخر نرسنگا نے کئی ماہ تک اس کی جنگی تربیت کی ہے ہو سکتا ہے کہ وہ کوئی سوال کر بیٹھے۔ اگر نرسنگا نے اس کی گمشدگی کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا تو ہماری منزل آسان ہو جائے گی میں ابھی کوئی ہنگامہ کھڑا کرنا نہیں چاہتا۔''
''پھر اسے قتل کر کے لاش کو اس کے دروازے پر پھینک آنا تاکہ وہ مغرور عورت اپنے بیٹے کا اندوہناک انجام دیکھ سکے۔'' کرشن راؤ کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ ''میں تو ہندو دھرم کے اس باغی سے طویل اور مسلسل انتقام چاہتا تھا' مگر شاید دیوتاؤں کو یہی منظور تھا کہ اس کی سزا مختصر ہو جائے۔ پھر بھی میں خوش ہوں کہ بھگوان نے اپنے نام لیوا کو مایوس نہیں کیا۔''

❋❋❋

ٹھاکر کا حکم سن کر راما راؤ نے ایک پرشور نعرہ بلند کیا...... "جے کالی ماتا کی......" آج بہت دن بعد ایک دوروئی (باغی) کو ماتا کے چرنوں پر بھینٹ چڑھایا جائے گا۔ یہ ایک اچھا شگون ہے ٹھاکر! بہت ہی اچھا...... مگر اس نیک کام میں اتنی دیر کیوں؟ نرسنگا کا انتظار کس لئے؟ وہ لٹیرا بھی آخر تیرا داس ہے۔" راما راؤ نے خوشامدانہ انداز میں کہا۔

"میں جانتا ہوں کہ نرسنگا بھی میرے حکم کے دائرے سے باہر نہیں جا سکتا' مگر مجھے راج نیتی (سیاست) سے کام لینا ہوگا۔" کرشن راؤ کے لہجے سے کسی قدر تشویش کا اظہار ہو رہا تھا۔

"کیسی راج نیتی ٹھاکر؟" راما راؤ نے چونک کر پوچھا۔

"یہی کہ کامران اور نرسنگا کے درمیان بھی کوئی تعلق پیدا ہو سکتا ہے۔" کرشن راؤ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "نرسنگا نے اسے اپنے حکم سے باہر جانے کی اجازت دے دی تھی اور وہ خود بھی بہت پراعتماد لہجے میں بول رہا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے میری حیثیت کو نظر انداز کر دیا تھا۔" کرشن راؤ نے شجاع الدین کامران کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "پجاری رام سروپ کا کہنا ہے کہ اس کی یہ سرکشی نرسنگا کے تعاون کے بغیر نہیں ہو سکتی' اگر یہ سچ ہے تو مجھے ہر حال میں پجاری کے سوال کا جواب تلاش کرنا ہوگا۔ آخر دونوں کے درمیان یہ کیسا تعاون ہے اور کیسا گٹھ جوڑ ہے؟ مجھے اس طرف بھی دیکھنا ہوگا راما۔"

"کیا نرسنگا پاگل ہو گیا ہے جو تجھ جیسے معزز اور شکتی شالی انسان کو چھوڑ کر ایک آوارہ لڑکے کی طرف ہاتھ بڑھائے گا؟" راما راؤ کی آواز اونچی تھی' مگر ٹھاکر کے لئے اس آواز میں ایک خاص عقیدت کا رنگ موجود تھا۔ "کیا نرسنگا تیری ناراضگی کا متحمل ہو سکتا ہے......اور کیا تیری رضا کے بغیر اس میواتی لٹیرے کا وجود برقرار رہ سکتا ہے؟ راما راؤ ایک نہایت عیار انسان تھا' وہ ٹھاکر کے حلقے میں تین آدمیوں سے بہت زیادہ حسد رکھتا تھا۔ ایک دیوداسی شکنتلا سے جسے وہ اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کے لئے برسوں سے بے چین تھا' مگر کرشن راؤ کی بے پناہ عنایات کے سبب وہ لڑکی اس کی دست درازیوں سے محفوظ رہی تھی۔ آج وقت بدلا تو راما راؤ شکنتلا کو دیوداسی کے درجے سے نیچے گرانے میں کامیاب ہو گیا۔ اب شکنتلا اس کی ملکیت تھی۔

دوسرا شجاع الدین کامران تھا' جس کے قدم چھونے کے لئے ٹھاکر نے اسے مجبور کر دیا تھا۔ راما راؤ نے وقتی طور پر کرشن راؤ کی سیاست و مصلحت کے آگے سر جھکا دیا تھا' لیکن اس نے ایک لمحے کے لئے بھی اپنی اس ذلت کو فراموش نہیں کیا تھا۔ بالآخر وہ کامران کو اس کے انجام تک پہنچانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ راما راؤ نے بڑی ذہانت سے کامران کے گرد اپنی سازش کا جال پھیلایا تھا اور ٹھاکر کے دل میں اس کی طرف سے نفرت کی ایسی فصل بو دی تھی کہ جسے کاٹتے کاٹتے رائے زادہ کے ہاتھ تھک جاتے اور وہ کھیتی اسی طرح لہلہاتی رہتی۔

تیسرا سردار نرسنگا تھا' جس کی شکل دیکھتے ہی راما راؤ کا خون کھول اٹھتا تھا۔ قزاقوں کے سردار سے کرشن راؤ بھی گھبراتا تھا......اور یہ بات راما راؤ کے سینے میں کسی کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی۔ اس نے کئی بار چاہا کہ نرسنگا کا اقتدار ختم

ہو جائے مگر وقت کا ہر گزرتا ہوا لمحہ سردار کی طاقت میں اضافہ کر رہا تھا۔ راما راؤ کی سب سے بڑی خواہش تھی کہ کسی طرح ٹھاکر اور نرسنگا ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو جائیں' پھر یہ دشمنی نرسنگا کی آتش غضب کو یہاں تک بھڑکا دے کہ نفرتوں کے شعلوں میں ٹھاکر کرشن راؤ جل کر خاک ہو جائے۔ بوڑھے راجپوت کے مرتے ہی سارا اقتدار راما راؤ کو منتقل ہو جائے گا۔ ٹھاکر کے بعد وہی اس گروہ کا سب سے طاقتور مہرہ تھا۔ راما ایک طویل عرصے سے کرشن راؤ کے مرنے کا انتظار کر رہا تھا' مگر موت کے خونی ہاتھ اس بوڑھے کی گردن سے ابھی بہت دور تھے۔ آج جب راما راؤ نے سازش کی ایک چنگاری کو رقص کرتے دیکھا تو اس کی فطرت کی سزا کی بھی پوری تو انائی کے ساتھ ناچنے لگی' پھر اس نے کمزور سی چنگاری کو ایک شعلہ سوزاں بنا دینا چاہا۔

"ٹھاکر! آج تجھے یہ بھی سوچنا ہوگا کہ اس جنگلی لٹیرے کی کیا حیثیت ہے؟" راما راؤ نے ایک نئے زاویے سے بوڑھے راجپوت کے جذبات کو بھڑکانے کی کوشش کی۔ "اگر وہ تیرے سامنے اس ملیچھ لڑکے کی حمایت کرتا ہے تو پھر اچھی طرح سمجھ لے کہ تیری خدائی کمزور پڑتی جا رہی ہے۔" راما راؤ نے ٹھاکر کے اعصاب پر بڑی شدید ضرب لگائی تھی' مگر وہ زمانہ شناس سودخور اس وار کو بڑے سلیقے سے برداشت کر گیا۔

"میں نرسنگا سے بے خبر نہیں ہوں۔" کرشن راؤ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اور ایک نرسنگا ہی پر کیا منحصر ہے راما! میں تو تیرے سوا ہر جاندار کو شک کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔"

ٹھاکر نے جوابی منافقت کا مظاہرہ کیا تو راما راؤ تلملا کر رہ گیا۔

"یہ بعد کی سوچنے کی باتیں ہیں۔" ٹھاکر نے لہجہ بدل کر کہا۔ "پہلے اسے شودروں کی بستی میں پہنچا دے۔" کرشن راؤ نے شجاع الدین کامران کی طرف اشارہ کیا...... "پھر نرسنگا کیا ساری دنیا کو دیکھیں گے۔" کہنے کو ٹھاکر بڑے بڑے دعوے کر رہا تھا' مگر اس کے چہرے پر اب بھی خوف کی ہلکی ہلکی پرچھائیاں لرز رہی تھیں اور اس خوف کی بنیاد سردار نرسنگا کی سفاک شخصیت تھی۔

❊❊❊

جب راما راؤ اپنے مسلح ساتھیوں کے ہمراہ شودروں کی بستی میں پہنچا تو وہاں ایک ہنگامہ سا برپا ہو گیا۔ برہمنی نظام کے ستائے ہوئے انسان کیڑے مکوڑوں کی طرح ادھر ادھر گردش کر رہے تھے۔ راجپوتوں کے ہتھیار بند گروہ کو اپنی طرف آتے دیکھ کر ہر شخص اپنی جگہ سہم گیا تھا۔ یہ ان جانوروں کی آبادی تھی جو انسانی چہروں کے ساتھ حیوانوں سے بدتر زندگی بسر کرتے تھے اور پھر زرد پتوں اور ٹوٹی ہوئی شاخوں کی طرح گل سڑ کے مٹی میں مل جاتے تھے۔

راما راؤ اور اس کے مسلح ساتھیوں کو دیکھ کر بستی والوں نے اس طرح اپنے سر زمین پر رکھ دیئے جیسے دیوتاؤں کا قافلہ دھرتی پر اتر آیا ہو۔ بوڑھے' جوان' بچے سب کے سب سجدے کی حالت میں پڑے تھے اور ان کے سر اور چہرے خاک سے آلودہ ہو رہے تھے۔

"بس! اے نامرادو! اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ۔" راما راؤ نے شودروں کو بڑے تحقیر آمیز لہجے میں پکارا۔ یہ جانور نما مخلوق اپنے جابر آقا کی آواز سن کر لرزتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔

"اس طرف غور سے دیکھو۔" راما راؤ نے شجاع الدین کامران کے خون میں نہائے ہوئے جسم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس کی جنبش لب کے ساتھ ہی شودروں کی نظریں اٹھیں اور کامران کے تن داغ داغ پر جم کر رہ گئیں۔ راما راؤ کے ساتھیوں نے بڑی بے رحمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کامران کو زمین پر ڈال دیا تھا۔ یہ ہولناک منظر دیکھ کر شودر لرزنے لگے۔

ایک بوڑھا اچھوت جو اس بستی میں سب سے زیادہ عمر رسیدہ تھا' کانپتے قدموں سے آگے بڑھا اور اس نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے راما راؤ سے پوچھا۔

''پربھو (مالک)! یہ کون مظلوم ہے؟'' بوڑھے شودر کی زبان لڑکھڑا گئی۔

''مظلوم نہیں' اس زمین کا سب سے بڑا ظالم۔'' راما راؤ نے غضب ناک لہجے میں کہا۔ ''یہ دیوتاؤں کا باغی ہے اور اس نے اپنے باپ دادا کا دھرم ملیچھوں (مسلمانوں) کے ہاتھ بیچ ڈالا ہے۔''

بوڑھے شودر کے جسم کا لرزہ کچھ اور بڑھ گیا تھا۔

''یہ بڑے ٹھاکر مہاراج کرشن راؤ کا ایک لعنت زدہ مجرم ہے' تم سے بھی زیادہ اچھوت اور تم سے بھی زیادہ ناپاک۔'' راما راؤ کے لہجے سے نفرتوں کی آگ برس رہی تھی۔ ''تمہارے ان داتا کا حکم ہے کہ اس کی نگرانی کرنا' اگر اسے ہوش آ جائے اور یہ تم سے مدد طلب کرے تو اس کے منہ میں پانی کے چند قطرے ٹپکا دینا۔'' راما راؤ کسی درندے کے انداز میں دھاڑ رہا تھا۔ ''ٹھاکر نے اس پر اناج کا ایک ایک دانہ حرام کر دیا ہے اگر کسی نے اس کے زخم پر مرہم لگانے کی کوشش کی تو یاد رکھو کہ پوری بستی کو آگ لگا دی جائے گی اور اس آگ کا ایندھن صرف تمہارے جسم ہوں گے۔''

''نہیں پربھو ایسا نہیں ہو سکتا۔'' پوری بستی فریادوں سے گونجنے لگی۔ ''کس میں اتنی جرأت ہے کہ ٹھاکر کے حکم سے منہ موڑ سکے۔''

''میرے کچھ آدمی تمہاری بستی کا پہرہ دیں گے تاکہ کوئی دشمن یہاں داخل نہ ہو سکے۔'' راما راؤ نے دوسرا حکم دیتے ہوئے کہا۔ ''جب تک میرے آدمی یہاں موجود ہیں ان کی خدمت اس طرح کرنا جیسے تم اپنے بھگوان کی پوجا کرتے ہو۔ ان کی ہر آسائش کا خیال رکھنا۔'' راما راؤ نے مبہم لہجے میں ایک مخصوص اشارہ کیا تھا جسے سنتے ہی چند لمحوں کے لئے تمام شودروں کے چہرے فق ہو گئے' مگر پھر فوراً ہی ان سب کی گردنیں جھک گئیں۔ بستی کے سارے مرد بار بار ایک ہی جملے کی تکرار کر رہے تھے۔

''ایسا ہی ہو گا پربھو (مالک)! ایسا ہی ہو گا۔''

پھر راما راؤ نے بوڑھے شودر کو ایک اور جابرانہ حکم دیا...... ''اب میں شام تک باغ میں آرام کروں گا۔ میری خدمت کے لئے کسی داسی کو بھیج دے...... مگر ایسی داسی جس پر کسی دوسرے مرد کا سایہ بھی نہ پڑا ہو۔''

راما راؤ کا حکم سن کر شودر عورتوں اور مردوں کی سانسیں رک گئیں۔

ہندوؤں کا یہ پرانا کھیل تھا کہ نیچ ذات کی تمام لڑکیاں ان کی ملکیت شمار ہوتی تھیں۔ ہندوستان کے بہت سے علاقوں میں یہ وحشیانہ رسم جاری تھی کہ شودر لڑکی اپنے شوہر کے گھر جانے سے پہلے ایک رات کسی سردار کے گھر گزارتی تھی۔ آج اس بستی میں کسی ''اچھوت کنیا'' کا بیاہ تو نہیں تھا' لیکن یہاں داخل ہوتے ہی راما راؤ کی خباثت جاگ اٹھی تھی۔ کرشن راؤ بھی کبھی کبھی اس بستی میں اپنی شیطانی خواہشات کی تکمیل کے لئے آتا تھا۔ ٹھاکر نے دریا کے کنارے باغ میں ایک مختصر سی پختہ عمارت تعمیر کرائی تھی۔ وہ برسات کے موسم میں ''ساونی'' منانے کے لئے اس باغ میں آتا۔ عام طور پر تین چار دن اور کبھی کبھی ایک ہفتے تک یہاں ایک جشن کا سا سماں رہتا۔ جی بھر کے شراب پی جاتی اور قرب و جوار کی بستیوں کے شودر اپنی اپنی جوان لڑکیاں لے کر ٹھاکر کی مضافاتی حویلی میں داخل ہوتے۔ کرشن راؤ ان میں سے سب سے خوبصورت لڑکی کا انتخاب کر لیتا اور پھر دریا کے کنارے' گھنے درختوں کے سائے میں محفل نشاط آراستہ ہو جاتی۔ خباثتوں کے اس میلے میں شودر لڑکیاں ہوس کے دیوتاؤں کی بھینٹ چڑھ جاتیں۔ اعلیٰ نسل کے لوگوں کی اس درندگی پر نہ دھرتی کی کوکھ میں شگاف پڑتا' نہ کسی گیانی کے سینے میں ہلچل مچتی' نہ کسی یوگی کی آنکھ سے

پانی کی کوئی بوند ٹپکتی اور نہ آکاش کے "رنگ" منچ پر براجمان سیکڑوں دیوتاؤں کے "عجیب الخلقت" جسموں میں بھاؤنا (احساس) کی اگنی بھڑکتی۔ شاید دیوتاؤں کی یہ خاموشی اس لئے تھی کہ وہ خود بھی اعلیٰ نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ غرض برہمنوں کے بنائے ہوئے مذبح خانوں میں شودر لڑکیاں ہر سال قتل ہوتی رہتیں اور اونچے خاندانوں کے مرد جمنا کے پانی میں نہا کر اپنے پاپوں کی گٹھڑی دھوتے رہتے۔

کرشن راؤ پہلے تو ہر سال پابندی کے ساتھ اپنی اس تفریح گاہ میں انسانی جسموں کا چراغاں کرتا تھا...... مگر پچھلے چند برسوں سے وہ محض بڑے مندر کے تہہ خانے تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ بڑھاپے نے اس کے کھوکھلے جسم کو تیزی سے چاٹنا شروع کر دیا۔ اس لئے صرف دیوداسیاں ہی ٹھاکر کی رنگ رلیوں میں شریک رہتی تھیں یا کبھی کبھی سردار نرسنگا بوڑھے راجپوت کو خوش کرنے کیلئے اپنا مارا ہوا شکار تحفے کے طور پر بھیج دیا کرتا تھا۔

ٹھاکر کی اس بے رغبتی کا دوسرا سبب وہ سیاسی فضا تھی جس نے ہندوؤں کے ہاتھ سے اقتدار چھین لیا تھا...... اور اب ہندوستان کے ایک ایک گوشے میں زندگی کی نئی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ یہ آوازیں اس قدر جانفزا تھیں کہ جنھیں سن کر صرف پسماندہ قومیں ہی نہیں اونچی ذات کے لوگ بھی اپنے دروازے کھول کر مکانوں سے نکل کھڑے ہوئے تھے۔ ان حالات میں کرشن راؤ کے لئے مناسب نہیں تھا کہ شودروں کی بستی میں داخل ہو کر ہوس پرستی کی قدیم رسموں کو دوبارہ زندہ کرے۔ ٹھاکر کی اس غیر حاضری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے راما راؤ شودروں کی بستی میں چلا آتا تھا اور ہر سال کے سال باغ کے درمیان بنی ہوئی قتل گاہ میں اچھوت کنیاؤں کا خون بہنے لگتا تھا۔

آج بھی جب راما راؤ اچھوتوں کے اس آفت زدہ گلشن میں آیا تو شگفتہ کلیوں کے دل لرزنے لگے۔ ان کی آنکھوں سے "ساون بھادوں" کی جھڑی لگ گئی ...... مگر چمن کے مالی مجبور تھے۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں سے سینچے ہوئے پودوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔ ادھ کھلی کلیوں کو شاخوں سے نوچ لیا اور پھر اس گلچیں کے پیروں میں لے جا کر ڈال دیا جو طاقت اور اختیار کا نمائندہ تھا۔

راما راؤ نے شودر لڑکی روپا کی فریاد اور منت وزاری کو شراب کے پیالے میں ڈبو دیا تھا اور اب وہ ٹھاکر کی مسند پر لیٹ کر خود کو کرشن راؤ کا جانشین سمجھ رہا تھا۔ پھر یکایک اس کے خیالوں میں دیوداسی شکنتلا کا چہرہ ابھر آیا۔ راما راؤ دہرے نشے کی کیفیت سے سرشار نظر آ رہا تھا۔ جس طرح روپا اس کے قدموں سے لپٹی ہوئی چیخ رہی تھی اسی طرح شکنتلا بھی عنقریب اس سے رحم کی بھیک مانگے گی۔

❋❋❋

پجاری رام سروپ کی ہدایت پر بڑے مندر کو غسل دیا جا رہا تھا۔ جہاں شجاع الدین کامران کا خون ٹپکا تھا اس جگہ کو بہت اہتمام سے صاف کیا جا رہا تھا۔ اس کام میں تمام دیوداسیاں اور چھوٹے پجاری شریک تھے۔ دعاؤں کے شور میں ایک مسلمان کے لہو کے دھبے دھوئے جا رہے تھے۔ دیوداسیاں بڑے اثر انگیز لہجے میں گا رہی تھیں۔

"ایشور! ہمارے اس پاپ کو چھما کر دے کہ ہم تیرے وشرام استھان (قیام کی جگہ) کی سرکشا (حفاظت) نہ کر سکے۔"

پجاریوں کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور ان کی زبانوں پر یہ بھجن جاری تھا۔

"ماتا! تو بڑی دیالو ہے اپنے بالکوں اور بالیکاؤں کو پاپی سنسار کے موہ سے مکتی دے۔"

بڑا عجیب منظر تھا۔ صدیوں سے بھگوان کے پجاریوں کا خون بہانے والے بے شمار گناہوں کو پتھروں پر بھینٹ چڑھا دینے والے ایک مسلمان کے خون کے چند قطرے دیکھ کر بدحواس ہو گئے تھے اور انہیں محسوس ہو رہا تھا جیسے ان

کے سروں پر آسمان ٹوٹ پڑے گا اور دیوتا ناراض ہو کر زمین کو زیروزبر کر دیں گے۔
پھر جب مندر کو سات بار غسل دے دیا گیا تو مندر کے طویل و عریض کمرے میں تمام پجاری جمع ہوئے۔ منچ کے درمیان میں ٹھاکر کرشن راؤ کو بٹھایا گیا۔ اس کے بائیں ہاتھ پر پجاری رام سروپ کی نشست تھی۔ منچ کے نیچے اگلی قطار میں خوبصورت دیوداسیاں زرد کپڑوں میں ملبوس دوزانوں بیٹھی تھیں۔ دیوداسیوں کے عقب میں کچھ فاصلے پر عام پجاریوں کی صفیں تھیں...... اور سب سے آخر میں دیوتاؤں کے وہ پرستار تھے جن کا مندر کی انتظامیہ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ دیوداسی شکنتلا کو اس ہنگامی عبادت میں شامل ہونے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔
یکایک فضا میں گھنٹیوں کا مسحور کن شور بلند ہوا' پھر دیوداسیوں کی جادو بھری آوازیں گونجنے لگیں۔
ابھی یہ بھجن پورے زوروشور کے ساتھ جاری تھے کہ کمرے میں کرشن راؤ کے محافظ دستے کا ایک راجپوت داخل ہوا۔ کرشن راؤ آنکھیں بند کئے جھوم رہا تھا۔ مگر پجاری رام سروپ کی بے چین نظریں مستقل ادھر ادھر گردش کر رہی تھیں۔ اس نے جیسے ہی بدحواس راجپوت کو دروازے میں کھڑے دیکھا۔ وہ کچھ اور مضطرب نظر آنے لگا۔ طویل و عریض کمرہ پجاریوں سے بھر گیا تھا۔ اس لئے آنے والا آسانی کے ساتھ "منچ" تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اب ایک ہی صورت باقی تھی کہ وہ پوجا میں مشغول لوگوں کو پھلانگتا ہوا ٹھاکر کے قریب جانے کی کوشش کرے' لیکن اس کا یہ فعل انتہائی بے ادبی میں شمار ہوتا۔ مجبوراً وہ دروازے میں کھڑا حسرت زدہ نگاہوں سے کرشن راؤ کی طرف دیکھتا رہا۔ پجاری رام سروپ کسی حد تک صورت حال کی نزاکت کو سمجھ گیا تھا۔ نتیجتاً اس نے جھک کر کرشن راؤ سے سرگوشی میں کچھ کہا۔
ٹھاکر نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں اور دروازے میں کھڑے ہوئے اپنے محافظ کی طرف دیکھا۔ محافظ نے بے اختیار دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ پھر ایک ہاتھ سے اشارہ کیا کہ وہ ٹھاکر کے پاس آنا چاہتا ہے۔ کرشن راؤ شدید اضطراب میں مبتلا ہو کر منچ پر کھڑا ہو گیا۔ دیوداسیوں اور پجاریوں نے ٹھاکر کو اس حالت میں دیکھا تو وہ ایک لمحہ کے لئے خاموش ہو گئے' پھر ایک ایک کر کے اٹھنے لگے۔
"تم اپنا بھجن جاری رکھو۔" کرشن راؤ نے اونچی آواز میں کہا۔ "میں ایک ضروری کام سے باہر جا رہا ہوں۔" یہ کہہ کر ٹھاکر نے پجاری رام سروپ کی طرف دیکھا اور "منچ" سے نیچے اتر آیا۔ پھر وہ تیز قدموں سے دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ رام سروپ اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔
تہ خانے کے اس طویل و عریض کمرے کی فضا "ہرے کرشنا ہرے راما کی آوازوں سے گونج رہی تھی اور کرشن راؤ پجاریوں کی قطاروں کے درمیان سے گزرتا ہوا اپنے محافظ تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر جیسے ہی ٹھاکر اس بدحواس محافظ کے نزدیک آیا وہ گھبرا کر زمین کی طرف جھک گیا۔
"پائے لاگوں ٹھاکر!" ٹھاکر نے ہندوؤں کی رسم کے مطابق اپنی عقیدت اور احترام کا مظاہرہ کیا۔
"کیا کہنا چاہتا ہے؟" کرشن راؤ کی آواز حد سے زیادہ غضب ناک تھی۔ "بدبخت! تو نے یہ بھی نہیں سوچا کہ تیرے اس طرح یہاں آنے سے میری پوجا میں خلل پڑ جائے گا اور اس جگہ دیوتاؤں کی جو برکتیں نازل ہو رہی ہیں وہ تیری مداخلت کے سبب رک جائیں گی۔' نفرت و قہر کے باعث کرشن راؤ کی زبان سے چنگاریاں جھڑ رہی تھیں۔
"میں مجبور تھا ٹھاکر!" محافظ نے سیدھے ہوتے ہوئے کہا۔ اس کے پورے جسم پر ہلکا ہلکا لرزہ طاری تھا۔ "میرے آدمی نے اطلاع دی ہے کہ سردار نرسنگا پچاس ساٹھ جوگیوں کے ہمراہ مندر کی طرف آ رہا ہے۔ اس صورت میں میرے لئے ضروری ہو گیا تھا کہ میں آپ کو خبردار کرتا۔"
یہ بڑی حیران کن اطلاع تھی جسے سن کر کرشن راؤ کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ اسے تو یہ امید تھی کہ نرسنگا کسی

وقت بھی آ سکتا ہے اور وہ موقع بہ موقع آتا ہی رہتا ہے مگر نرسنگا کے آنے کا یہ انداز خلاف توقع تھا۔ ٹھاکر پریشان نظر آنے لگا۔ پھر اس نے محافظ کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

''تو باہر جا کر دیکھ کہ نرسنگا کے ہمراہ وہ جوگی کون ہیں؟'' محافظ تیزی سے پلٹا اور تہ خانے کی طویل راہداری سے گزرتا ہوا مندر سے نکل گیا۔

ٹھاکر کرشن راؤ اور پجاری رام سروپ انتہائی سراسیمگی کے عالم میں راستہ طے کر رہے تھے۔ ''میری سمجھ میں نہیں آ رہا پجاری کہ نرسنگا نے یہ حرکت کیوں کی ہے؟'' ٹھاکر نے چلتے چلتے رام سروپ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''نرسنگا جب بھی مندر آیا ہے اس کے ہمراہ تین چار مسلح محافظوں سے زیادہ آدمی نہیں ہوئے۔ پھر جوگیوں کی یہ فوج کیسی ہے؟'' کرشن راؤ کے لہجے میں اضطراب پوشیدہ تھا۔

''ہو سکتا ہے کہ کچھ لٹیروں کا قتل و غارت سے جی اچاٹ ہو گیا ہو اور وہ بھگوان کے چرنوں میں ''شانتی'' تلاش کرنے آ رہے ہوں۔'' پجاری رام سروپ نے جوگیوں کی آمد کا جواز پیش کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں! رام سروپ ہرگز نہیں!'' کرشن راؤ بھڑک اٹھا۔ ''لٹیرے اور بھگوان کے چرنوں میں شانتی؟ کیسی انہونی بات ہے اور تو نے کیسا مضحکہ خیز جواب دیا ہے؟ ایسی بات تو کوئی پاگل بھی نہیں کرے گا۔ یقیناً اس کی کوئی خاص وجہ ہے۔''

پجاری رام سروپ نے سر جھکا دیا۔

کرشن راؤ تیز قدموں سے چل رہا تھا۔ ''مجھے گھٹن محسوس ہو رہی ہے پجاری! شاید کوئی طوفان آنے والا ہے۔''

''طوفان مہاراج کا کیا بگاڑے گا؟'' رام سروپ نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔ ''ٹھاکر کی اپنی شخصیت سے ٹکرا کر واپس چلا جائے گا یا پھر ان قدموں میں سسک سسک کر دم توڑ دے گا جو پہاڑوں سے زیادہ مضبوط ہیں۔''

''پجاری!'' کرشن راؤ نے چیختے ہوئے کہا۔ ''تجھے تو سر جھکانے کی عادت پڑ گئی ہے۔ ہر وقت وفادار جانور کی طرح مالک کے تلوے چاٹتا رہتا ہے۔ کبھی آگے بڑھ کر ان ہواؤں کا بھی مقابلہ کیا کہ جو تیرے ٹھاکر کی طرف مست ہاتھیوں کی طرح بڑھتی ہی رہتی ہیں۔''

''تیرے داس اس قابل کہاں ہیں ٹھاکر؟'' پجاری رام سروپ گداگروں کے انداز میں خوشامد کرنے لگا۔

کرشن راؤ نے رام سروپ کی اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور تیزی سے گزرتا ہوا پجاری کے کمرے میں پہنچ گیا۔ ''رام سروپ! میرا دل گھبرا رہا ہے۔ نرسنگا کے آنے سے پہلے شراب کا انتظام کر کہ کسی طرح اعصاب کی شکست و ریخت ختم ہو جائے۔''

پجاری رام سروپ نے فوراً ہی ٹھاکر کے حکم پر عمل کیا اور تہ خانے سے بہت زیادہ پرانی شراب برآمد کر کے کرشن راؤ کے سامنے رکھ دی۔ ٹھاکر کسی پیاسے بیل کی طرح ایک ہی گھونٹ میں نصف صراحی پی گیا اور پھر اپنی دھوتی سے ہونٹ خشک کر کے اس بری خبر کا انتظار کرنے لگا جس کی آہٹ اسے قریب محسوس ہو رہی تھی۔

کچھ دیر بعد ہی ٹھاکر کا محافظ بھاگتا ہوا آیا اور منتشر سانسوں کے درمیان اپنے چشم دید واقعہ کی تفصیلات بیان کرنے لگا۔ ''نرسنگا بہت مطمئن ہے اور اس کے ساتھی جوگی بھی خوش نظر آ رہے ہیں۔''

ٹھاکر کرشن راؤ نے اطمینان کا سانس لیا۔ ''تو باہر دروازے پر نرسنگا کا انتظار کر اسے بتا دے کہ میں یہاں پجاری رام سروپ کے کمرے میں موجود ہوں۔''

محافظ جیسے ہی باہر نکلا رام سروپ۔ [illegible] یوں کا سامنا کون کر سکتا ہے؟

پتھر بھی آئے گا تو موم کی طرح بہہ جائے گا۔ میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ نرسنگا کے ساتھی تیری چھایا میں شرن (پناہ) لینے آ رہے ہیں۔"

ابھی کرشن راؤ کوئی جواب دینے نہیں پایا تھا کہ پجاری کے کمرے کا دروازہ کھلا اور نرسنگا ایک عجیب شان کے ساتھ داخل ہوا۔ اس نے اپنا دایاں ہاتھ فضا میں بلند کیا اور گرجدار آواز کے ساتھ کہا۔

"ٹھاکر کرشن راؤ کی جے!"

جواب میں بوڑھے راجپوت نے دعائیں دیں۔ "سردار نرسنگا پر ہمیشہ دیوی دیوتاؤں کا سایہ رہے اور وہ اتنی کامیابیاں حاصل کرے کہ ایک دن اس کے گھوڑے کے سم مسلمانوں کی لاشوں کو روند ڈالیں۔" پہلی بار کرشن راؤ نے لہجہ بدل کر بات کی تھی۔

نرسنگا خاموشی سے ٹھاکر کے سامنے بیٹھ گیا۔ کرشن راؤ کی نظریں نرسنگا کی تلوار پر مرکوز تھیں۔ بالآخر ٹھاکر اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا اور بے اختیار بول اٹھا۔

"نرسنگا! یہ بھگوان کا گھر ہے یہاں آنے والے تیر و تفنگ اور شمشیر و سناں کے ہمراہ نہیں گیندے اور گلاب کے پھول لے کر آتے ہیں۔"

سردار نرسنگا کرشن راؤ کے اس انداز تخاطب پر چونک اٹھا۔ "شاید تجھے یاد نہیں رہا ٹھاکر! میں تو ہمیشہ اسی طرح آیا ہوں۔ میرا تو عقیدہ ہے کہ جسم پر ہتھیار سجا کر بھی دیوتاؤں کی پوجا کی جا سکتی ہے۔" سردار نرسنگا بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بول رہا تھا۔ "یہی تلوار میری سب سے معتبر ساتھی ہے۔ میں اس کے سوا کسی پر اعتبار نہیں کرتا۔ یہ اسی وقت ساتھ چھوڑے گی جب میرے بازو کٹ جائیں گے۔"

ٹھاکر کو اپنی احمقانہ حرکت پر ندامت سی محسوس ہونے لگی۔ نرسنگا کبھی خالی ہاتھ مندر نہیں آیا تھا' مگر ٹھاکر کی دہشت نے اس کے ذہن سے گزشتہ یادوں کے نقوش مٹا دیئے تھے اور وہ بدحواسی کے عالم میں نرسنگا سے ایک مہمل سا سوال کر بیٹھا تھا۔

"آج دن کے اجالے میں کیسے آنا ہوا نرسنگا؟" ٹھاکر نے اپنی خفت مٹانے کے لئے کہا۔ ادھر تو تیرا گزر ہمیشہ رات کے اندھیرے میں ہوتا ہے۔"

"تو نے ٹھیک کہا ٹھاکر!" نرسنگا اپنے سر کو جنبش دیتے ہوئے بولا۔ "آج چھوٹے ٹھاکر کی وجہ سے مجھے دن کی روشنی میں نکلنا پڑا۔"

کرشن راؤ کے اندیشے درست ثابت ہوئے' مگر اس نے اپنی پریشانی کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔ "چھوٹے ٹھاکر کی اتنی اہمیت ہو گئی کہ تو نے اپنا برسوں پرانا قانون ہی بدل ڈالا۔" کرشن راؤ کے لہجے سے شدید طنز کا اظہار ہو رہا تھا۔

"ہاں ٹھاکر! اس لڑکے نے تو نرسنگا کو بے مول خرید لیا۔" یہ کہتے کہتے نرسنگا کی سرخ آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک ابھر آئی تھی۔ "میں اسے قائم خان راجپوت کے سامنے سرخرو دیکھنا چاہتا ہوں۔ تو نے تو مجھ سے صرف اتنا ہی کہا تھا کہ میں اسے شمشیر زنی اور شہسواری سکھا دوں' مگر میں نے اس لڑکے پر اپنا سارا ہنر قربان کر دیا۔ اب اس کے بازوؤں میں ایسی بجلیاں بھر گئی ہیں کہ قائم خان جیسے سیکڑوں راجپوتوں کو جلا ڈالیں گی۔" نرسنگا بڑی وارفتگی کی حالت میں بول رہا تھا۔ پھر اچانک وہ بولتے بولتے رک گیا اور کرشن راؤ کے چہرے کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔ "کیا کامران نے تجھے کچھ نہیں بتایا ٹھاکر؟ میں نے تو کوئی تین ماہ سے اسے تربیت دینے کے لئے اپنے سارے کام ترک کر دیئے ہیں۔"

"نہیں! اس نے کچھ نہیں بتایا۔" گھبراہٹ میں کرشن راؤ کی سانسوں کا زیر و بم بڑھ گیا تھا' مگر وہ پھر بھی بڑی بے حسی کے ساتھ جھوٹ بولنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"حیرت ہے۔" نرسنگا کی پیشانی پر کئی اور لکیریں نمایاں ہو گئی تھیں اور وہ اپنی گھنی مونچھوں کو بل دے رہا تھا۔

"تجھے اس منصوبے کی خبر نہ ہو۔ یہ میرے لئے بڑی ناقابل یقین بات ہے ٹھاکر! آج رات تو اسے قاسم خان سے بدلہ لینے کے لئے شہر کی طرف جانا تھا۔" نرسنگا کی حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔

"آج اماوس کی رات ہے۔ میں نے گہری تاریکی سے فائدہ اٹھانے کے لئے آج کی رات کا انتخاب کیا تھا۔"

ابھی نرسنگا کی گفتگو جاری تھی کہ کرشن راؤ درمیان میں بول اٹھا۔ "میں اس کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔"

نرسنگا نے ایک بار پھر حیرت زدہ نظروں سے ٹھاکر کی طرف دیکھا۔ "کامران سے ہر بات طے ہو چکی تھی۔ اگرچہ آج صبح سے میری طبیعت میں گرانی ہے لیکن پھر بھی مجھے صرف اس لڑکے کی خاطر یہاں تک آنا پڑا۔ وہ بہت جذباتی نوجوان ہے۔ اگر جوش میں ہوش کھو بیٹھا تو معاملہ الٹ بھی سکتا ہے۔ اس خیال سے میں اپنے پچاس بہترین جانبازوں کو ساتھ لے کر آیا ہوں۔ وہ مندر کے صحن میں اس طرح بیٹھے ہیں کہ ان کے جسموں پر گیروے رنگ کے کپڑے ہیں۔ شہر کے لوگ انہیں سنیاسی یا سادھو سمجھیں گے' مگر ان کے لبادوں کے نیچے چمکتی ہوئی شمشیریں موجود ہیں۔ بالفرض چھوٹا ٹھاکر کسی مصیبت میں پھنس گیا تو یہ میرے وفادار غلام اس کی ڈھال بن جائیں گے۔"

نرسنگا کی باتیں سن کر کرشن راؤ اور پجاری رام سروپ کی آنکھیں حلقوں سے باہر نکل آئی تھیں۔

"مگر وہ لڑکا ہے کہاں؟ بلاؤ اسے؟" نرسنگا نے بیزاری کے لہجے میں کہا۔ "میں یہاں مر رہا ہوں اور وہ پڑا سو رہا ہے؟ کیا زندہ رہنے کے یہ طریقے ہیں؟"

"کیسے بلاؤں نرسنگا؟ کامران تو رات سے غائب ہے۔" کرشن راؤ نے ایک اور جھوٹ بولا' مگر اس کی آواز لرز رہی تھی۔

"چھوٹا ٹھاکر غائب ہے؟" نرسنگا اس طرح بولا کہ اس کی آواز پر چیخ کا گمان ہو رہا تھا۔ "وہ کہاں چلا گیا؟"

"میں کچھ نہیں جانتا سردار!" کرشن راؤ کے لہجے کی لرزش صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔

"کیا وہ اپنی مرضی میں اس قدر آزاد ہے کہ تیری اجازت کے بغیر جہاں چاہے چلا جائے؟" نرسنگا کے لہجے کی سختی بڑھتی جا رہی تھی۔ "جسے ہر وقت تیرے آدمی شکرے اور باز کی آنکھوں سے دیکھتے رہتے ہیں اور جس کے پنجرے کو لوہے کی تیلیوں سے اس طرح کس دیا گیا ہے کہ وہ سانس تک نہ لے سکے پھر اس کا اڑ جانا اور فضا میں غائب ہو جانا' میری سمجھ میں نہیں آتا' ٹھاکر تو جھوٹ بول رہا ہے۔" نرسنگا بے قابو ہو گیا۔

"سردار! تو ایک مسلمان کے لئے مجھے جھوٹا کہہ رہا ہے۔" کرشن راؤ نے بھی چیخنے کی کوشش کی تھی' مگر خوف کی زیادتی کے سبب اس کی آواز گھٹ کر رہ گئی تھی۔ "کل رات وہ یہاں سے فرار ہو گیا۔ میں نے اس پر اپنی دولت لٹائی' تیری خوشامد کی مگر وہ غداروں کی اولاد تھا۔ مجھے ڈس کر چلا گیا۔"

"کیسا ٹھاکر ہے کہ مسلسل بہانے تراش رہا ہے۔" نرسنگا کا چہرہ جلنے لگا تھا۔ "زمین بھی اپنی جگہ قائم ہے اور آسمان بھی ...... پھر وہ لڑکا کس طرح فرار ہو سکتا ہے اگر یہ دونوں اپنے محور سے ہٹ جائیں تو میں سمجھ لوں گا کہ رائے زادہ فرار ہو گیا۔ اس کے جسم کے ٹکڑے تو ہو سکتے ہیں مگر وہ منہ چھپا کر بھاگ نہیں سکتا۔" جوش غضب میں نرسنگا کے منہ سے کف اڑنے لگا تھا۔ "اور جب منزل تک پہنچنے میں صرف چند گھنٹوں کا وقفہ رہ گیا تو وہ اس طرح چلا گیا؟ نہیں ٹھاکر! یہ نہیں ہو سکتا۔ ایسا جھو[illegible] گلے میں اٹک جائے اور سننے والا اسے نگل نہ سکے۔ مجھے صاف

صاف بتا کہ شجاع الدین کامران کہاں ہے؟"

"اپنے لہجے کو سنبھال نرسنگا!" کرشن راؤ نے برہمی کا مظاہرہ کرنا چاہا' مگر اپنی آواز کی تھرتھراہٹ پر قابو نہ پا سکا۔ "میں ٹھاکر کرشن راؤ ہوں' راجپوتوں کی آن' اعلیٰ نسل ہندوؤں کی آبرو۔"

"میں تجھے خوب جانتا ہوں ٹھاکر! مگر پہلے میرے سوال کا جواب دے۔" نرسنگا نے ٹھاکر کی شخصیت کو جھٹلا دیا تھا۔ "مجھے کامران کا پتہ چاہئے۔"

"ٹھاکر اپنی زبان نہیں بدلتے۔" کرشن راؤ کا جسم کچھ اور کانپنے لگا تھا۔ "میں کہہ چکا ہوں کہ کل رات وہ مندر سے فرار ہو گیا۔"

نرسنگا کے بدن میں آگ سی لگ گئی اور وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا ایک ہاتھ تلوار کے دستے پر تھا۔ "میں جا رہا ہوں ٹھاکر! مجھے زیادہ انتظار کی عادت نہیں۔ جنگل پہنچنے کے بعد نصف گھنٹے یا زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹہ...... میں کامران کو اپنی آرام گاہ میں صحیح وسلامت دیکھنا چاہتا ہوں...... اور اس طرح کہ تو خود اسے لے کر وہاں آئے گا۔" یہ کہتے ہی نرسنگا پلٹ پڑا اور اس نے پوری طاقت سے دروازے پر ٹھوکر ماری۔ یہاں تک کہ دونوں پٹ کھل کر دوبارہ بند ہو گئے۔

پجاری رام سروپ پر موت کی سی دہشت طاری تھی۔ اس نے دوڑ کر نرسنگا کے پاؤں پکڑ لئے' لیکن میواتی لٹیروں کا سردار اپنے ہوش وحواس کھو چکا تھا۔ اس نے دوسری ٹھوکر رام سروپ کے سر پر ماری اور وہ عیار پجاری چیخ کر منچ (مسند) کے کنارے سے جا ٹکرایا۔

پھر جیسے ہی نرسنگا دروازہ کھول کر باہر نکلا' ٹھاکر کرشن راؤ چیختا ہوا دوڑا۔ "ٹھہر جا نرسنگا میں ابھی کامران کو بلاتا ہوں۔ وہ یہاں سے کچھ فاصلے پر شودروں کی بستی میں چلا گیا ہے۔"

نرسنگا نے خونخوار نظروں سے کرشن راؤ کی طرف دیکھا اور پاؤں زمین پر مارتا ہوا پلٹ آیا۔

کرشن راؤ نے پجاری رام سروپ کے ذریعے اپنے اس محافظ کو اندر طلب کیا جو دروازے پر کھڑا پہرہ دے رہا تھا۔ "راما راؤ سے کہو کہ وہ چھوٹے ٹھاکر کو لے کر فوراً مندر پہنچ جائے۔"

محافظ کانپتے جسم کے ساتھ مڑا اور ایک گھوڑے پر بیٹھ کر شودروں کی بستی کی طرف چلا گیا۔ راما راؤ اور اس کے ساتھی شراب میں بدمست پڑے تھے۔ انہیں اپنے ہوش وحواس درست کرنے میں بہت دیر لگ گئی۔ شدت انتظار سے گھبرا کر نرسنگا کئی بار باہر جا چکا تھا۔ اس دوران اس نے اپنی تلوار نیام سے کھینچ لی تھی اور بڑی بے قراری کے عالم میں ٹہل رہا تھا۔ اپنے سردار کی یہ حالت دیکھ کر سادھونما لٹیرے بھی دروازے پر آ کر کھڑے ہو گئے تھے اور ان سب کے ہاتھ تلواروں کے قبضوں پر سختی کے ساتھ جمے ہوئے تھے۔

پھر جب شجاع الدین کامران کو ایک بیل گاڑی میں ڈال کر لایا گیا تو نرسنگا کے منہ سے ایک دردناک چیخ نکل گئی۔ آہنی اعصاب رکھنے والا ایک لٹیرا کامران کو اس حالت میں دیکھ کر بدحواس نظر آنے لگا۔ اس نے قریب کھڑے ہوئے راما راؤ اور دوسرے مسلح راجپوتوں کو دیکھا۔ کیف ومستی کے باعث وہ سب کے سب جھوم رہے تھے اور ان کے ہونٹوں پر ایک بے رحم مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔

نرسنگا آہستہ آہستہ کامران پر جھکا' اس کے ہونٹ لرز رہے تھے۔

"ماں! تم کہاں ہو؟ میرے پاس آؤ۔ بہت سے ہاتھ مجھے قتل کرنے کے لئے بڑھ رہے ہیں' میرے پورے جسم میں آگ لگی ہوئی ہے' ان زخموں پر [illegible] میں بہت تنہا ہوں ماں! مجھے چھوڑ کر

نہ جاؤ......'' کامران بے ہوشی کے عالم میں اپنی ماں کو پکار رہا تھا۔
نرسنگا سیدھا ہوا اور ٹھاکر کرشن راؤ کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔ ''یہ اپنی ماں کو پکار رہا ہے۔''
کرشن راؤ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اپنے لرزتے ہوئے جسم کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔
''اسے اس حالت تک کس نے پہنچایا ہے؟'' فرطِ غضب سے نرسنگا کی آنکھیں ابل پڑی تھیں۔
''میں نے۔'' راما راؤ اپنے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے اونچی آواز میں بولا۔ ''یہ ٹھاکر کو گالیاں بک رہا تھا اور ہم اپنے سردار کی توہین برداشت نہیں کر سکتے۔''
نرسنگا نے پلٹ کر راما راؤ کی طرف دیکھا۔ ابھی وہ جواب میں کچھ کہنے نہیں پایا تھا کہ ٹھاکر بول اٹھا۔ ''صرف مجھے ہی نہیں' یہ بدذات تیرے دیوی دیوتاؤں کو بھی گالیاں بک رہا تھا۔ اگر تو میری جگہ ہوتا نرسنگا تو اب تک اس کی بوٹیاں نوچ کر کتوں کے آگے ڈال چکا ہوتا۔'' کرشن راؤ نے سردار پر بڑی کاری ضرب لگائی تھی' مگر نرسنگا اس کے فریب میں نہیں آیا۔
''تو اپنا اعتبار کھو چکا ہے ٹھاکر!'' نرسنگا نے چیختے ہوئے کہا؟ کتنے جھوٹ بولے گا؟ میں تیری کسی بات پر یقین نہیں کروں گا۔''
''مندر کی دیوداسیوں سے پوچھ لے' پجاریوں سے دریافت کر لے۔ سب کے سب ایک ہی بات کہیں گے۔''
ٹھاکر نے اپنی بے گناہی کا یقین دلانے کے لئے ایک کمزور سی دلیل پیش کی۔
''یہ تو تیری رعایا ہیں ٹھاکر! ان کی مفلوج زبانوں میں اتنی طاقت کہاں کہ تیرے پڑھائے ہوئے سبق کے خلاف اپنے ہونٹوں کو جنبش دے سکیں۔'' نرسنگا نے کرشن راؤ کو جھڑک دیا۔ ''میں چھوٹے ٹھاکر کو اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔ جب یہ ہوش میں آ جائے گا تو پھر اس کی گواہی پر اپنا فیصلہ سناؤں گا۔''
''کیسا فیصلہ......؟'' ٹھاکر کے بجائے راما راؤ نے تن کر پوچھا۔
سردار نرسنگا نے بڑی مشکل سے راما راؤ کی اس بے ہودگی کو برداشت کیا اور ٹھاکر کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ''وہ بڑا سخت فیصلہ ہوگا ٹھاکر! میں تیرے آدمیوں سے کامران کے ایک ایک زخم کا حساب لوں گا۔''
''اس بات کو یہیں ختم کر دے نرسنگا!'' یک بیک کرشن راؤ نے خوشامدانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔
''نہیں ٹھاکر! اب یہ بات اتنی آسانی سے ختم نہیں ہوگی۔ نرسنگا اپنے آدمیوں کو تنہا نہیں چھوڑتا۔'' یہ کہہ کر میواتی لٹیروں کا سردار گاڑی میں بیٹھ گیا اور اس نے بیلوں کا رخ جنگل کی طرف موڑ دیا۔
شراب کے اثر سے جھومتے ہوئے راما راؤ اور اس کے ساتھیوں نے اپنی تلواریں بے نیاز کرنی چاہیں مگر اس سے پہلے ہی نرسنگا کے لائے ہوئے ساٹھ ہونما لٹیروں کی شمشیریں ہوا میں لہرانے لگی تھیں۔ کرشن راؤ نے آگے بڑھ کر اپنے محافظ خدمت گاروں کو ڈانٹا مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ اس نے بیل گاڑی پر کھڑے ہو کر چیختے ہوئے کہا۔
''ٹھاکر! مجھے تیرا یہ سلوک ہمیشہ یاد رہے گا۔''
راما راؤ اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ جواباً اس نے بھی چیخ کر کہا۔ ''سردار! ہمیں دھمکیاں دینے سے پہلے اپنے گریبان میں بھی جھانک لے کہ تو نے ایک اچھوت کی خاطر ٹھاکروں کی پگڑی اچھالی ہے۔''
نرسنگا نے راما راؤ کی اس تلخ کلامی کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے ہاتھ تیزی سے گردش کر رہے تھے اور تڑاتا بیل ہوا میں اڑنے لگے تھے۔ ان کے گلے میں بندھے ہوئے گھنگھرو اس طرح بج رہے تھے جیسے موت رقص کر رہی ہو۔

نرسنگا شجاع الدین کامران کو لے کر چلا گیا اور راما راؤ نشے میں کھڑا جھومتا رہا۔ ٹھاکر بار بار اپنے اس وفادار خادم کو دیکھتا اور خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتا۔ کرشن راؤ سب کے سامنے راما راؤ کو سخت لہجے میں تنبیہ بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ بالآخر اس کا دایاں بازو تھا اور اپنا ایک بڑا حلقہ اثر بھی رکھتا تھا۔ تاہم ٹھاکر خاموش نہ رہ سکا اور دبے دبے تلخ لہجے میں کہنے لگا۔

''راما! تو نے تو صورت حال کو بگاڑ کر رکھ دیا۔''

''میں کیا کرتا ٹھاکر؟ میں کیا کرتا؟'' راما راؤ کی ٹانگوں کے ساتھ اس کی زبان بھی لڑکھڑا رہی تھی۔

''تو خاموش رہ سکتا تھا۔'' کرشن راؤ بڑے کرب سے دوچار تھا۔ ''اگر تو کچھ دیر اپنے ہونٹوں کو بند رکھتا تو میں اس طوفان کو گزارنے کے لئے کوئی راستہ ضرور بنا لیتا۔''

''کیسا طوفان ٹھاکر؟'' راما راؤ ایک بار پھر ڈگمگایا۔ ''تو نرسنگا کی بات کر رہا ہے؟ وہ تو پانی کی ایک پھوار تھی' برستی ہوئی گزر گئی۔'' میواتی لٹیروں کے سردار کے لئے راما راؤ کے لہجے میں شدید نفرت پوشیدہ تھی۔

''نہیں راما! وہ پھوار نہیں' پانی کی ایک تند و سرکش باڑھ ہے جو بڑی بڑی چٹانوں کو بہا کر لے جاتی ہے۔ ابھی تو نرسنگا کو جانتا نہیں۔ اگر کسی سے اس کا بیر پڑ جائے تو پھر ایک ہی وقت میں وہ سانپ بھی ہے اور بچھو بھی۔ اس کا کاٹا پہلے بہت چیختا ہے اور پھر چیختے چیختے موت کی گود میں چلا جاتا ہے۔'' کرشن راؤ بہت زیادہ پریشان نظر آ رہا تھا۔

''تیرے منہ سے ایسی باتیں اچھی نہیں لگتیں ٹھاکر!'' راما راؤ نے لہراتے ہوئے کہا۔ ''وہ سانپ ہو یا بچھو! تیرے داس ہر زہریلے کیڑے کو مسلنے کی طاقت رکھتے ہیں۔'' راما راؤ بظاہر نشے میں تھا' مگر اپنے مطلب کی بات کہنے میں اسے کوئی دشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔

کرشن راؤ نے اسے غور سے دیکھا اور پھر اپنے دوسرے خدمت گاروں کو مخاطب کر کے بولا۔ ''راما کو آرام کی ضرورت ہے۔ اسے یہاں سے لے جاؤ۔'' ٹھاکر کے لہجے سے ناگواری کا اظہار ہو رہا تھا۔

''نہیں ٹھاکر! میں پوری طرح ہوش میں بھی ہوں اور تندرست و توانا بھی۔'' راما راؤ نے بھڑک کر کہا۔ ''میرے دماغ میں نہ خلل پیدا ہوا ہے اور نہ جسم میں تھکن کے آثار۔ میں تیرے دشمنوں کو معاف نہیں کر سکتا۔ اگر تو ہمیں اجازت دیدے تو تیرے غلام اس لٹیرے نرسنگا کی لمبی زبان کاٹ دیں اور اٹھا ہوا سر اس طرح زمین پر جھکا دیں کہ پورا چہرہ کیچڑ سے آلودہ ہو جائے۔'' راما راؤ گہرے نشے کے باوجود کسی سیاہ بادل کی مانند گرج رہا تھا۔

''بھگوان کے لئے تو اس وقت یہاں سے چلا جا۔'' کرشن راؤ نے شدید جھنجلاہٹ کے عالم میں کہا۔ ''شراب تیرے سر چڑھ کر بول رہی ہے۔''

''میں کہاں جاؤں ٹھاکر؟'' راما راؤ نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں سوال کیا۔ ''حویلی جاؤں یا دیوداسی شکنتلا کے

کمرے میں؟"

"جہاں تیرا جی چاہے۔" کرشن راؤ کے لئے اس کا وجود نا قابل برداشت ہوتا جا رہا تھا۔ "مگر ایک بات سن لے کہ میں کل صبح تجھے پورے ہوش و حواس میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ یہ بدمستیوں کا وقت نہیں۔ اگر آئندہ تو نے بہکی بہکی باتیں کیں تو......" کرشن راؤ نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی اور راما ڈگمگاتے قدموں سے مندر کے اس حصے میں چلا گیا جو پراسرار اور زمین دوز تہہ خانوں پر مشتمل تھا۔

اس کے بعد کرشن راؤ پجاری رام سروپ کے بند کمرے میں مستقبل کی منصوبہ بندی کرتا رہا۔

❋❋❋

جب نرسنگا خون میں نہائے ہوئے بے ہوش کامران کو لے کر جنگل پہنچا تو لٹیروں کی بستی میں طوفان سا آ گیا۔ ہزاروں قزاق اپنے سردار کے گرد جمع ہو گئے اور چیخ چیخ کر کہنے لگے۔

"نرسنگا! ہمیں حکم دے کہ ہم چھوٹے ٹھاکر پر اٹھنے والے ہاتھوں کو کاٹ دیں۔"

نرسنگا نے انہیں صبر و ضبط کی تلقین کرتے ہوئے کہا۔ "ابھی میں تمہیں کچھ نہیں بتا سکتا کہ یہ گھر کا معاملہ ہے۔ پہلے چھوٹا ٹھاکر ہوش میں آ جائے۔ پھر میں فیصلہ کروں گا کہ اس کے خون کا حساب کس طرح لیا جائے۔ تم لوگ اپنے اپنے ٹھکانوں پر جاؤ اور دیوی کی پناہ مانگو۔ دیوتاؤں سے دعا کرو کہ وہ چھوٹے ٹھاکر کو صحت بخش دیں۔"

لٹیروں کا ہجوم چیختا ہوا واپس چلا گیا۔ وہ لوگ اپنی زبان میں آسمان کی طرف منہ کر کے مخصوص مذہبی کلمات کا ورد کر رہے تھے۔

اس دوران نرسنگا کا معالج خاص گوتم داس سردار کی خواب گاہ میں پہنچ چکا تھا۔ امرپالی شجاع الدین کامران کی یہ حالت دیکھ کر بدحواس ہو گئی تھی اور بار بار اپنے شوہر کو مخاطب کر کے کہہ رہی تھی۔

"سردار! اسے کیا ہو گیا؟" امرپالی کی آواز کانپ رہی تھی اور اس کی خوبصورت آنکھیں چھلک اٹھی تھیں۔ "سردار! تیرے ہوتے ہوئے کس درندے نے اس کے جسم کو بھنبھوڑا ہے؟ کیا یہ دیوتاؤں جیسا معصوم نوجوان موت کی خوراک بن جائے گا؟"

سردار نرسنگا کی نظریں وید گوتم داس پر مرکوز تھیں جو بڑی توجہ سے شجاع الدین کامران کی نبض دیکھ رہا تھا۔

"میں وہاں موجود نہیں تھا امرپالی! میری غیر حاضری سے کچھ بھیڑیوں نے ٹھاکر کو نوچ ڈالا۔" نرسنگا نے امرپالی کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔

"کیا تو اب اتنا کمزور ہو گیا ہے سردار کہ لوگ تیری غیر حاضری سے فائدہ اٹھانے لگے ہیں۔' امرپالی اپنے حواس میں نہیں تھی۔ "کیا یہ تیرے خلاف بغاوت کے آثار نہیں ہیں؟"

"امرپالی! یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے۔" نرسنگا نے انتہائی قوت برداشت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "ان پریشان کن لمحوں کو گزر جانے دو۔ پھر میں تجھے سب کچھ بتا دوں گا۔"

اس عرصے میں وید گوتم داس کامران کے زخموں کا معائنہ کر چکا تھا۔ "سردار! اس کے زخم گہرے ضرور ہیں' مگر جان لیوا نہیں ہیں۔" گوتم داس کی بارعب آواز گونجی۔ وہ ستر سال کا ایک بوڑھا طبیب تھا۔ گوتم داس نے شادی نہیں کی تھی اور وہ ایک تارک الدنیا انسان تھا۔ اس نے اپنی نوجوانی جنگلوں میں بسر کی تھی۔ اسے دنیا کے ہنگاموں سے نفرت تھی اور وہ سکون دل کی تلاش میں غاروں اور ویرانوں کی خاک ڈھونڈتا تھا۔ پھر ایک دن بھٹکتے بھٹکتے گوتم داس نرسنگا کے جنگل میں آ گیا۔ نرسنگا نے اس کی بہت عزت افزائی کی۔ پھر گوتم داس یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ اسے قزاقوں کا

وحشیانہ کاروبار سخت ناپسند تھا' مگر نرسنگا نے اس کے پیروں میں زنجیریں ڈال دیں۔
آج وہی گوتم داس بے ہوش کامران کو دیکھ کر کہہ رہا تھا۔ "میں ایک بات سے پریشان ہوں سردار کہ کہیں سر کی ضربوں سے دماغ کو نقصان نہ پہنچا ہو۔"
"گوتم داس! میں کچھ نہیں جانتا۔" نرسنگا نے وحشت زدہ لہجے میں کہا۔ "میرا بھائی سمجھ لے' کچھ بھی سمجھ لے۔ اب یہ میرے جسم کا ایک حصہ ہے۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو میں ٹوٹ جاؤں گا۔" سردار بہت زیادہ جذباتی نظر آ رہا تھا۔
"وید! تو نے تو مردوں میں جان ڈال دی ہے۔ پھر اپنے منہ سے ایسے نراشا کے شبد کیوں نکال رہا ہے؟"
"میں پوری کوشش کروں گا سردار!" گوتم داس نے جھکی ہوئی نظروں کے ساتھ کہا۔ اس کی انگلیاں مسلسل کامران کی نبض پر جمی ہوئی تھیں۔ "زندگی دینے والا تو کوئی اور ہے۔ یہ ناچیز اور کمزور گوتم داس اس کے سوا کیا کر سکتا ہے کہ مستقل جاگ کر دواؤں کو آزماتا رہے۔"
نرسنگا اور امر پالی خاموش ہو گئے اور وید گوتم داس کامران کو ہوش میں لانے کی کوشش کرتا رہا۔
کامران کے حلق میں کئی جڑی بوٹیوں کا رس ٹپکایا گیا اور اس کے جسم پر وقفے وقفے سے کئی لیپ کیے گئے مگر کامران کی حالت میں کوئی تغیر نہیں آیا۔ یہاں تک کہ سورج غروب ہو گیا اور کائنات کے ذرے ذرے پر گہری تاریکی چھا گئی۔ گوتم داس نے سردار نرسنگا اور امر پالی سے آرام کرنے کیلئے کہا' مگر وہ دونوں کامران کے سرہانے بیٹھے رہے۔
"وید جی! وہ کیسے چین سے سو سکتا ہے جس کا اپنا سگا "جیون اور مرتیو" کے دوراہے پر کھڑا ہو۔" امر پالی نے کرب ناک لہجے میں کہا۔
"تمہارا سگا عزیز؟" وید گوتم داس نے حیران ہو کر کہا۔ "یہ تو مسلمان ہے۔ یہ تمہارا رشتہ دار کس طرح ہو سکتا ہے؟"
اس بار امر پالی کے بجائے نرسنگا نے جواب دیا۔ "وید! تو ان باتوں کو نہیں سمجھے گا۔ یہ غیر ہوتے ہوئے بھی اپنا ہے اور جو سگے ہیں وہ اپنے ہوتے ہوئے بھی غیر ہیں۔"
"سردار! میں اس کے علاج میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں برتوں گا۔" گوتم داس نے کہا۔ "مجھے جو کچھ......"
نرسنگا نے درمیان ہی میں وید کی بات کاٹ دی۔ "اور گوتم ایسا کرنا بھی نہیں۔ اگر مذہب کی بنیاد پر تیرے دل میں اس کے خلاف نفرت کی کوئی چنگاری پھوٹی ......اور تو نے دھرم کے بھید بھاؤ کی آڑ میں چھوت چھات کا پردرشن (مظاہرہ) کیا تو بات بہت بگڑ جائے گی۔ میں تجھے معاف نہیں کروں گا۔ گوتم! مجھے تیری باتوں سے تفریق کی بو آ رہی ہے۔ آخر تو نے اسے مسلمان ہونے کا طعنہ کیوں دیا تھا؟ اگر اس لڑکے کو کچھ ہو گیا ......" نرسنگا شدت جذبات میں بدحواس ہو گیا تھا۔
وید گوتم داس چند لمحوں تک اداس نظروں سے نرسنگا کی طرف دیکھتا رہا اور پھر فرش سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ سفید داڑھی اور سفید لباس میں گوتم داس ایک علیحدہ سا انسان نظر آ رہا تھا۔ یکایک اس کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔ "سردار! تو نے مجھے بہت مایوس کیا۔" گوتم داس کی آنکھوں میں دھواں سا بھر گیا تھا اور حلق میں کانٹے سے اٹک گئے تھے۔ "کیا تو مجھے موت کی دھمکی دے رہا تھا نرسنگا؟" اچانک گوتم داس کا لہجہ بدل گیا تھا۔
نرسنگا گوتم داس کے اس طرز تخاطب پر حیران رہ گیا۔ ایک طویل رفاقت کے دوران پہلی بار اس نے گوتم کی آنکھوں میں غصے کی لہریں دیکھی تھیں اور پہلی بار بوڑھے وید کے سفید چہرے پر نفرت کی سرخی نظر آئی تھی۔

''کیا تو سمجھتا ہے کہ میں تیری وحشیانہ طاقت ا.. درندگی کے کاروبار سے ڈر کر اس جنگل میں ٹھہرا ہوا ہوں؟'' یہ کہتے کہتے گوتم داس کی آواز لرزنے لگی۔ ''میں تو یہاں اس لئے رک گیا تھا کہ تم پر مہذب دنیا کے دروازے بند ہو چکے ہیں۔ اگر تمہاری مجبور عورتیں اور معصوم بچے بیمار پڑیں گے تو ان کا علاج کرانے تم کہاں جاؤ گے؟ میں نے تم جیسے جانوروں کی کیسی کیسی خدمت کی ہے؟ تمہارے کیسے کیسے سڑتے ہوئے زخموں کو بھرا ہے؟ اس امید پر کہ شاید ایک دن تم وقت کے آئینے میں اپنے کالے چہرے دیکھ کر ڈر جاؤ۔ پھر تمہیں شرم آئے اور تم دریا کے شفاف پانی سے اپنی سیاہ شکلوں کو دھو ڈالو۔ افسوس! میں نے اپنی زندگی کے کتنے قیمتی سال اس انتظار میں گزار دیئے کہ تم اپنے گھروں کی طرف لوٹ آؤ گے مگر آج تیری احسان فراموشی دیکھ کر احساس ہوا کہ میں پاگل ہو گیا ہوں اور پتھروں کی زبانوں سے ریشم کے گیت سننا چاہتا ہوں۔ تم جانور پیدا ہوئے تھے اور اسی حالت میں مر جاؤ گے۔ تمہیں انسانوں کے سانچے میں ڈھالنے کا خواب دیکھنے والا شاید خود بھی چوپایہ ہے۔'' گوتم داس نے شدت کرب میں اپنے بال نوچ ڈالے۔
''کاش! میں کسی دوسری بستی میں نکل گیا ہوتا۔''

''گوتم! مجھے معاف کر دے۔ میں اس لڑکے کی تکلیف دیکھ کر بدحواس ہو گیا تھا۔'' سردار نرسنگا بوڑھے وید سے معذرت کرنے لگا۔

''میں تجھے سمجھ نہیں سکا۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔''

''کیا تو سمجھتا ہے کہ میں اپنے ہنر سے غداری کروں گا؟'' گوتم داس کا لہجہ غضب ناک ہو گیا تھا۔ ''دیوتاؤں کی قسم! اگر اس لڑکے کے بجائے میرا بدترین دشمن بھی ہوتا تو میں اسے مایوس نہیں کرتا۔ اپنا عیش و آرام لٹا کر بھی اس کی تیمارداری کرتا۔ پھر جب وہ ٹھیک ہو جاتا تو اس سے کہتا کہ اگر آئندہ بھی اس کے بیمار جسم کو میری ضرورت پڑے تو بے دریغ چلا آئے۔ میں اس کا علاج کروں گا۔ جڑی بوٹیوں کا یہ گیان مجھے اس لئے نہیں دیا گیا ہے کہ میں اس سے سود کا کاروبار کروں۔ جہاں فائدہ نظر آئے وہاں کسی کتے کی طرح زمین سے منہ رگڑتا ہوا چلا جاؤں۔ میں وید ہوں نرسنگا! اول و آخر وید ہوں۔ پرماتما نے مجھے چارہ گری سکھائی ہے۔ میں مسیحا ہوں! تیری طرح احسان فراموش اور قاتل نہیں۔'' گوتم داس نے نرسنگا کی بے پناہ طاقت کو جھٹلا دیا تھا۔ ''میں اپنی مرضی سے یہاں آیا تھا۔ تو کیا' ساری دنیا بھی میرے ارادوں کو زنجیریں نہیں پہنا سکتی۔ بس! یہ لڑکا ہوش میں آ جائے پھر میں ہمیشہ کیلئے چلا جاؤں گا۔''

''گوتم! میں تجھ سے معافی مانگتا ہوں۔'' نرسنگا نے بے اختیار ہو کر دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ ''گوتم! میری طرف دیکھ کہ میں کس حالت میں تیرے سامنے کھڑا ہوں۔ اس زمین پر بسنے والے کسی شخص نے نرسنگا کو اس حالت میں نہیں دیکھا۔''

گوتم داس نے ایک نظر نرسنگا کے جڑے ہوئے ہاتھوں کو دیکھا۔ پھر سر کو ہلکی سی جنبش دی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے کا تناؤ ختم ہو گیا اور وہ فرش پر بیٹھ کر کامران کی نبض دیکھنے لگا۔

''اب اس کی نبض میں پہلے جیسا انتشار نہیں ہے۔'' گوتم داس نے کہا۔ ''اب میں بہت پرامید ہوں سردار! میرے خیال میں سر کے زخموں نے اس کے ذہن پر کوئی ناگوار اثر نہیں چھوڑا ہے۔'' گوتم داس کے لہجے کی تلخی زائل ہو چکی تھی۔

''مجھے اس کے بارے میں تفصیل سے بتا کہ یہ کون ہے اور تیرے پاس کس لئے آیا ہے؟'' اچانک بوڑھے وید نے نیا موضوع چھیڑ دیا تھا۔

سردار نرسنگا گوتم داس کے قریب [illegible] آہستہ آہستہ شجاع الدین کامران کی محرومیوں کی

داستان سنانے لگا۔ آخر میں اس نے اپنے اور امرپالی کے منصوبے کی تفصیلات بھی بتائیں جسے سن کر گوتم داس کے چہرے پر ایک عجیب سا رنگ ابھر آیا۔

***

ادھر رات کے اندھیرے میں وید گوتم داس، سردار نرسنگا اور امرپالی کامران کے ہوش میں آنے کا انتظار کر رہے تھے اور ادھر راما راؤ دیوداسی شکنتلا کے کمرے میں شراب پی رہا تھا۔ پھر جب وہ بدمست ہو گیا تو اس نے شکنتلا سے کہا۔

''آج میں نے تجھ سے دیوداسی کا منصب چھین لیا۔'' راما راؤ کے لہجے میں ایک فاتح کے غرور کی جھلک تھی۔ ''اب تو صرف میری داسی ہے۔ راما راؤ کے اشاروں پر رقص کرنے والی ایک حقیر داسی۔''

شکنتلا اس انقلاب پر حیران تھی۔ اس نے سوچا بھی نہ تھا کہ ٹھاکر اسے اس طرح راما راؤ کے حوالے کر دے گا۔

''راما! ایک مجبور لڑکی کو اتنا نہ ستا کہ تجھ پر آسمان ٹوٹ پڑے۔'' شکنتلا نے اس خوف ناک زلزلے میں بھی اپنے قدم جمانے کی کوشش کی۔

''لڑکی۔'' راما راؤ نے کسی اوباش وحشی کی طرح قہقہہ لگایا۔ ''تو صرف ویشیا ہے۔ اپنے آپ کو لڑکی کہہ کر عورت ذات کے چہرے پر کالک کیوں ملتی ہے؟ میں تیری پارسائی کی پوری تاریخ سے واقف ہوں۔ تو کچھ دن نرسنگا کی ہوس کی سیج پر چین کی نیند سوتی رہی۔ پھر برسوں تک ٹھاکر کی کرشن راؤ سے قربت کی بھیک مانگتی رہی۔ اب تجھے میری ملکیت بنا دیا گیا تو اپنی دوشیزگی کی کہانی سنا رہی ہے۔''

دیوداسی شکنتلا کے مقدر کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ اس نے دوبارہ صدائے احتجاج بلند نہیں کی۔ بس خاموشی سے اس بھیڑیے کو دیکھتی رہی جو اب تک سیکڑوں معصوم لڑکیوں کا خون پی چکا تھا۔

''تو نے میری حیثیت کو نظر انداز کیا! یہ اس کی سزا ہے۔'' راما راؤ نے انتہائی سرخوشی کے عالم میں لہراتے ہوئے کہا۔ ''اگر تو ٹھاکر کی طرح مجھے بھی اپنا آقا تسلیم کر لیتی تو شاید میں تجھے معاف کر دیتا۔ بس چند روز تک تیرا رقص دیکھتا، پھر تجھے تیری مرضی پر چھوڑ دیتا۔ مگر اب تیری بخشش کی کوئی صورت نہیں ہے۔ میں تجھے اس طرح در در پھراؤں گا کہ شودر عورتیں بھی تیرے حال پر لعنت بھیجیں گی۔''

''آج رات یہی سچ ہے راما کہ تو مجھ سے انتقام لینے میں کامیاب ہو گیا۔ مگر ابھی ایک انتقام باقی ہے، میرے خدا...... اچانک شکنتلا کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور اس نے سختی سے اپنے ہونٹوں کو دبا لیا۔ وہ دہشت زدہ انداز میں راما کو دیکھ رہی تھی۔ بے اختیاری میں زبان سے ادا ہونے والا لفظ ''خدا'' ایک خوں آشام راجپوت کو اس کی تبدیلی مذہب کا افسانہ بھی سنا سکتا تھا۔ پھر کئی راز آسانی سے کھل سکتے تھے اور شجاع الدین کامران نئے انداز سے ان ستمگروں کے تشدد کا شکار ہو سکتا تھا۔

''راما سے کون انتقام لے سکتا ہے؟ وہ تو خود مجسم انتقام ہے۔ اس زمین پر کالی اور درگا کا نمائندہ۔'' رام راؤ نشے کی زیادتی کے سبب خدا کے لفظ کا مفہوم سمجھ نہیں سکا تھا۔

پھر بہت دیر تک شکنتلا کو راما راؤ کے سامنے رقص کرنا پڑا۔ اس کے بعد وہ ایک ہوس پرست انسان کے ہاتھوں کا کھلونا بن کر رہ گئی۔ راما راؤ نے رات بھر دیوداسی کو ذلیل و رسوا کیا، مگر اس مجبور لڑکی نے کسی مرحلے پر ایک درندے سے کوئی رعایت طلب نہیں کی۔ نہ اس کے ہونٹوں سے کوئی چیخ بلند ہوئی اور نہ آنکھوں سے کوئی آنسو ٹپکا۔

بس جذبوں، تمناؤں اور خوابوں کا خو[illegible] لمحہ کر لئے

بھی شکنتلا کی نظروں سے شجاع الدین کامران کا زخمی جسم اوجھل نہیں ہوا۔

❋❋❋

کرشن راؤ بھی رات بھر اپنی حویلی میں جاگتا رہا۔ اس نے حویلی کے چاروں طرف اپنے مسلح محافظوں کی تعداد میں اضافہ کر دیا تھا۔ وہ سردار نرسنگا کے جارحانہ سلوک سے بہت زیادہ خوف زدہ نظر آ رہا تھا۔ دراصل نرسنگا ہی وہ طاقتور انسان تھا جس کے سہارے کرشن راؤ کا اقتدار قائم تھا اور ٹھاکر کی یہ عیاشانہ زندگی بھی نرسنگا کی لوٹی ہوئی دولت کی مرہون منت تھی۔ اگر نرسنگا ہاتھ روک لیتا تو ٹھاکر کے خزانے آہستہ آہستہ ختم ہو جاتے اور غلاموں کی یہ بھیڑ بھی کسی دوسرے آقا کی تلاش میں گم ہو جاتی۔ کرشن راؤ کو ایک یہ خطرہ بھی لاحق تھا کہ اگر نرسنگا کی سرکشی بڑھتے بڑھتے بغاوت کا رنگ اختیار کر گئی تو پھر حالات بہت زیادہ سنگین ہو سکتے ہیں۔ اس قسم کے اندیشوں نے کرشن راؤ کو رات بھر سونے نہیں دیا۔ وہ بند کمرے میں مسلسل شراب پیتا رہا اور سردار نرسنگا سے دوبارہ تعلقات کی بحالی کے بارے میں سوچتا رہا۔ کرشن راؤ ایک انتہائی زمانہ شناس اور عیار انسان تھا۔ ایک طرف وہ سردار نرسنگا سے خوشگوار مراسم بھی چاہتا تھا اور دوسری طرف اس کی خواہش تھی کہ لٹیروں کی جماعت ہمیشہ اس کے سامنے سر جھکائے کھڑی رہے۔ وہ نرسنگا کی دوستی پر یقین بھی رکھتا تھا اور اسے ایک بے اعتبار انسان بھی سمجھتا تھا۔ اسے راما راؤ کی ضرورت بھی تھی اور وہ اس طاقتور راجپوت کا زور توڑنا بھی چاہتا تھا۔ اسے یہ وسوسے بھی پریشان کر رہے تھے کہ اگر حکومت کو اس کے اور نرسنگا کے تعلقات کا علم ہو گیا تو پھر کیا نتائج برآمد ہوں گے اور اسلامی سلطنت کا سربراہ اس کے ساتھ کیسا سلوک کرے گا؟ آج کی رات کرشن راؤ کے ذہن پر ایسے ہی پریشان خیالات کی یلغار تھی۔ صبح کے قریب اس نے ایک نیا منصوبہ تراشا اور پھر گہری نیند سو گیا۔

وید گوتم داس' نرسنگا اور امر پالی بھی ساری رات جاگتے رہے۔ یہاں تک کہ سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی شجاع الدین کامران کو ہوش آ گیا۔ اس نے آنکھیں کھول کر گوتم داس کی طرف دیکھا۔ ایک خوبصورت چہرے والا سفید ریش اجنبی بوڑھا۔ کامران کی آنکھوں میں حیرت کی پرچھائیاں لرزنے لگیں۔ وہ اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔

''لیٹا رہ بالک!'' گوتم داس نے محبت سے اس کے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

کامران نے اپنے مسیحا کی بات نہیں مانی اور وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پھر جیسے ہی اس نے اپنے دائیں جانب سردار نرسنگا اور امر پالی کو دیکھا تو اس کی آنکھیں حیرت سے کشادہ ہو گئیں۔

''سردار میں یہاں کس طرح آیا؟''

کامران کی آواز سے لکنت ظاہر ہو رہی تھی۔

نرسنگا نے آگے بڑھ کر کامران کو دوبارہ بستر پر لٹا دیا اور پھر سارے واقعات سنانے لگا۔

''سردار! میں نے کسی کو کوئی گالی نہیں دی۔'' کامران کا چہرہ جوش و غضب سے سرخ ہو گیا تھا۔ ''میں بہت مہذب ماں باپ کا بیٹا ہوں۔ سخت طیش کی حالت میں بھی اپنی زبان کو گندے الفاظ سے آلودہ نہیں کرتا۔''

''میں جانتا ہوں ٹھاکر!'' نرسنگا نے اسے خاموش کرتے ہوئے کہا۔ ''اب اس جنگل میں تو اکیلا نہیں ہے۔ جس روز گوتم داس تجھے صحت یابی کی سند دے گا' اسی روز میں راما راؤ اور اس کے ساتھیوں سے تیرے ایک ایک زخم کا حساب طلب کروں گا۔'' نرسنگا نے بوڑھے وید کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

کامران نے گوتم داس کی طرف دیکھا اور بڑے والہانہ انداز میں بولا۔ ''بزرگ! میں آپ کا شکر گزار ہوں۔''

''نہیں بالک! میں تو ایک وید ہوں۔ بیماروں کا علاج کرنا میرا دھرم ہے۔'' گوتم داس نے انتہائی شفقت آمیز

لہجے میں کہا۔ "اگر تجھے ممنون احسان ہونا ہے تو سردار کا شکریہ ادا کر کہ وہ تجھے بھیڑیوں کے منہ سے چھین کر لایا ہے۔"
اس لڑکی کی محبت کا انداز دیکھ جو شام سے اب تک روتی رہی ہے۔" گوتم داس نے امر پالی کا نام لے کر کہا۔
کامران نے نرسنگا اور امر پالی کی طرف دیکھا۔ نرسنگا کی آنکھوں میں آنسو تو نہیں تھے، مگر چہرے پر اس غبار کے آثار موجود تھے۔ اس کے برعکس امر پالی ایک عورت تھی جس نے اپنے آنسو خشک کر لئے تھے، مگر اپنی سوجی ہوئی آنکھوں کو دوسروں کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رکھ سکتی تھی۔ قزاقوں اور غیر مذہب کے لوگوں نے کامران کو بھی رلا دیا۔ کچھ دیر کے لئے جنگل کی فضا میں ایک مسرت آمیز سوگواری رقص کرنے لگی۔

❊❊❊

سردار نرسنگا اپنی خواب گاہ سے باہر آیا اور اس نے اپنے محافظ خاص شاپارا کو طلب کیا۔ شاپارا اس وقت پہرے پر موجود نہیں تھا۔ نرسنگا نے حیرت سے یہ بات سنی اور شاپارا کی غفلت کو نظر انداز کرتے ہوئے دوسرے محافظ کو حکم دیا۔
"شاپارا کو اسی وقت میرے پاس بھیج دے۔" یہ کہہ کر نرسنگا دوبارہ اپنی خواب گاہ میں چلا گیا۔
شاپارا اپنے کچھ آدمیوں کے ساتھ غار میں موجود تھا اور بہت زیادہ خوش نظر آ رہا تھا۔
"دیوتاؤں نے اس ملیچھ سے میری شکست کا انتقام لے لیا۔" شاپارا نے اپنے وفاداروں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔
"وہ تو سب کچھ ٹھیک ہے شاپارا مگر سردار کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ ایک غیر مذہب کا آدمی تیرے مقابلے پر آئے۔" ایک خوشامدی لٹیرے نے نفرتوں کی آگ بھڑکانے کی کوشش کی۔
"میں سب کچھ جانتا ہوں کھیما!"
شاپارا نے دانت پیستے ہوئے کہا۔
"بس کچھ دنوں کی بات ہے نہ سردار رہے گا اور نہ اس کا یہ چہیتا لے پالک۔" شاپارا کی باتوں سے کھلی بغاوت کی بو آنے لگی تھی۔
کھیما وہی لٹیرا تھا جس پر نرسنگا بہت زیادہ اعتبار کرتا تھا اور اسی کی نگرانی میں کامران مندر سے جنگل تک سفر کرتا تھا۔ آج کھیما بھی حرص و ہوس سے مجبور ہو کر شاپارا کے ساتھ آملا تھا اور زیر زمین نرسنگا کے خلاف ایک سازش تیار کی جا رہی تھی۔
"اگر وہ ملیچھ بچ گیا شاپارا! تو پھر کیا ہوگا؟"
کھیما نے مضطرب لہجے میں کہا۔
"میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اس کی زندگی سے وید گوتم داس بھی مایوس نظر آ رہا تھا۔" شاپارا نے پرجوش ہو کر کہا۔ "اور اگر وہ بچ گیا تو پھر ہم اسی کو بنیاد بنا کر سردار کے خلاف ایک نیا طوفان کھڑا کر دیں گے۔ ہم اس جنگل کے رہنے والوں کو چیخ چیخ کر بتائیں گے کہ نرسنگا مسلمانوں سے مل گیا ہے اور وہ ہم سب کو گرفتار کرا کے حکومت سے انعام حاصل کرنا چاہتا ہے۔" شاپارا اب مکمل طور پر باغی نظر آنے لگا تھا۔
"تو بہت دور کی سوچتا ہے شاپارا!" کھیما نے اسے اکساتے ہوئے کہا۔
شاپارا جواب میں مزید کوئی بات کہتا کہ نرسنگا کا محافظ آ پہنچا۔

''پورے جنگل میں اعلان کر دے کہ چھوٹے ٹھاکر کی زندگی خطرے سے باہر ہے اور ہر شخص اس خوشی میں تین دن تک کالی کی پوجا کرے۔''

شاپارا کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ وہ اس خبر کو سننے کے لئے ذہنی طور پر آمادہ نہیں تھا۔ پھر بھی اس نے منافقانہ احترام کا مظاہرہ کرتے ہوئے سر جھکا دیا۔

''اور لوگوں سے یہ بھی کہہ دے کہ ان تین دنوں میں لوٹ مار کا سارا کاروبار معطل رہے گا۔''

❋❋❋

ادھر جنگل میں شجاع الدین کامران کی جان بچ جانے پر ایک عام جشن منایا جا رہا تھا اور ادھر ٹھاکر کرشن راؤ تین پنڈتوں کے ساتھ دربار شاہی کی طرف جا رہا تھا۔ اس کے پاس ایک خوان تھا جس میں کچھ سونا اور قیمتی پتھر تھے۔ سلطان ناصر الدین محمود نے فوراً کرشن راؤ اور اس کے ساتھیوں کو دربار میں حاضر ہونے کی اجازت دے دی۔

کرشن راؤ تینوں پنڈتوں کے ساتھ جن میں پجاری رام سروپ بھی شامل تھا' دربار شاہی میں داخل ہوا۔ اسی وقت غیاث الدین بلبن وزارت عظمیٰ کے عہدے پر فائز تھا اور سارا ہندوستان اسے الغ خان کے نام سے پہچانتا تھا۔ بلبن نے کرشن راؤ اور اس کے ساتھی پجاریوں کو گہری نظر سے دیکھا جو فرش پر نصف قد تک جھکے ہوئے سلطان ناصر الدین محمود کو اپنی رسم کے مطابق سلام پیش کر رہے تھے۔

پھر کرشن راؤ سیدھا ہوا اور اس نے مسلمان حکمران کی شان میں قصیدہ پڑھنا شروع کر دیا۔

''سمراٹ! اس میں کوئی شک نہیں کہ راجپوت یہ جنگ ہار گئے اور مسلمانوں کو عظیم الشان فتح حاصل ہوئی۔ ہم سے کہا گیا تھا کہ دنیا کا ہر حملہ آور شکست خوردہ قوم کے ساتھ وحشیانہ سلوک کرتا ہے مگر سلطان کی اعلیٰ ظرفی نے اس روایت کو ہمیشہ کے لئے غلط ثابت کر دیا۔ آج میں اور میرے ساتھی سر دربار اس حقیقت کا اعتراف کرنے آئے ہیں کہ ہندوستان کی سرزمین نے آپ سے بہتر حکمران نہیں دیکھا۔ آپ کے عہد حکومت میں ہندوؤں کی جانیں بھی محفوظ ہیں اور عزت و آبرو بھی۔ آپ نے اور آپ کے فوجیوں نے ان کی دولت کے ذخیروں کو آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ ان کے مندر کھلے ہوئے ہیں اور گھنٹیاں زور و شور سے بج رہی ہیں۔ ہم نے صلہ رحمی اور رواداری کی کوئی دوسری مثال نہیں دیکھی۔'' ٹھاکر کرشن بڑے والہانہ لہجے میں بول رہا تھا۔

''سلطان خوب جانتے ہیں کہ میں نسل راجپوت کا ایک باوقار نمائندہ ہوں۔ ہندوستان کا ایک ایک گوشہ راجپوتوں کی اس ادا سے واقف ہے کہ وہ اپنی گردنوں کو جھکا کر کسی سے نہیں ملتے' مگر میں آپ کی شخصیت اور منصفانہ نظام سے اس قدر متاثر ہوا ہوں کہ آج اپنی صدیوں پرانی روایات کو ترک کر رہا ہوں۔'' یہ کہہ کر کرشن راؤ نے اس طرح زمین پر سر ٹیک دیا جیسے وہ سلطان ناصر الدین محمود کو سجدہ کر رہا ہو۔

کرشن راؤ کی تقلید میں تینوں پجاری بھی زمین بوس ہو گئے۔

اس کے بعد ٹھاکر نے تخت کے قریب پہنچ کر سونے اور جواہرات سے بھرا ہوا خوان ناصر الدین محمود کو پیش کیا۔

جواباً سلطان نے اس پر ہاتھ رکھ کر کرشن راؤ کی نذر کو شرف قبولیت بخشا اور اپنے خدمت گاروں کو حکم دیا کہ ٹھاکر کے لائے ہوئے خوان کو مزید سونے اور جواہرات سے لبریز کر دیا جائے۔

''میں سلطان کے انداز کرم سے واقف ہوں۔'' کرشن راؤ نے جھک کر کہا۔ ''اگر سمراٹ مجھے اپنے وفاداروں میں شامل ہونے کی سند عطا کر دیں تو ساری دنیا کے انعامات اس نوازش کے آگے ہیچ ہوں گے۔''

میں اسے حکومت وقت کا وفادار اور خیر خواہ تسلیم کیا گیا تھا۔

کرشن راؤ نے فرمان شاہی کو کئی بار بوسے دیئے اور کئی بار آنکھوں سے لگایا اور آخری سجدہ ادا کر کے الٹے پاؤں واپس جانے لگا۔

''مگر ایک بات یاد رکھنا۔''

اچانک الغ خان (بلبن) نے اونچی آواز میں پکار کر کہا۔ اس وقت ناصر الدین محمود محض نام کا حکمران تھا اور سارے اختیارات الغ خان کی ذات میں سمٹ کر رہ گئے تھے۔

کرشن راؤ ٹھہر گیا اور اس کی سانس رک سی گئی۔

''جس کے گلے میں ایک بار ہماری وفاداریوں کا طرق پڑ جاتا ہے پھر اسے اتار کر پھینکا نہیں جا سکتا اور جو لوگ یہ مذموم حرکت کرتے ہیں ہم انہیں معاف نہیں کرتے۔ ہمارا ایک خاص مزاج ہے ہم دوستوں کے کھلے ہوئے دوست ہیں اور دشمنوں کے کھلے ہوئے دشمن۔ اس زمین پر بسنے والوں کے لئے ہماری دوستی رحمت کا کبھی نہ ختم ہونے والا سایہ ہے' اور دشمنی قہر کا ایک آتش فشاں جو ہر وقت کھولتا ہی رہتا ہے۔''

کرشن راؤ نے گہری سانس لی اور باآواز بلند کہا۔ ''یہ سلطان سے ایک راجپوت کا وچن ہے۔''

پھر وہ دربار سے نکل کر مندر کی طرف چلا گیا۔ کرشن راؤ کے چہرے پر بے پناہ خوشی رقص کر رہی تھی۔ راستے میں اس نے پجاری رام سروپ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''اب میرا منصوبہ مکمل ہو گیا۔''

❋❋❋

وقت تیزی سے گزرتا رہا۔ راما راؤ دن بھر ٹھاکر کی حویلی میں پڑا رہتا اور رات کو شراب پی کر دیوداسی شکنتلا پر تشدد کرتا۔ اس دوران نرسنگا کے کسی آدمی نے کرشن راؤ سے کوئی رابطہ قائم نہیں کیا تھا۔ یہ پراسرار خاموشی ٹھاکر کی وحشت میں اضافہ کر رہی تھی۔ اس دوران کرشن راؤ نے کئی بار اپنے آدمیوں کو جنگل کی طرف یہ پیغام دے کر بھیجا کہ ٹھاکر نے اسے مندر میں طلب کیا ہے۔ مگر ہر مرتبہ اس کے آدمی ناکام لوٹ آتے اور انہیں ایک ہی جواب ملتا کہ نرسنگا اپنی آرام گاہ پر موجود نہیں۔

کرشن راؤ اپنے عقب میں ایک نامعلوم خطرے کی آہٹ محسوس کر رہا تھا۔ بالآخر ایک دن گھبرا کر اس نے راما راؤ سے کہا۔ ''اگر نرسنگا نہیں آتا تو میں خود اس سے ملنے چلا جاتا ہوں۔''

راما راؤ مخالفت کی اس آگ کو مسلسل ہوا دے رہا تھا۔ ''ٹھاکر! خون کی ندیاں تو بہہ سکتی ہیں مگر ہم تیری توہین برداشت نہیں کر سکتے۔ اگر تو نے ایسا کیا تو پھر تیرے ساتھ رہنے کا وہ عہد ٹوٹ جائے گا۔''

کرشن راؤ شدید ذہنی کشمکش میں مبتلا تھا۔ نرسنگا کی غیر حاضری صاف بتا رہی تھی کہ اس نے گزشتہ تکلیف دہ واقعہ کو فراموش نہیں کیا ہے۔ کرشن راؤ اس مسئلے کا حل چاہتا تھا کہ کسی طرح نرسنگا کی خفگی دور ہو جائے۔ مگر راما راؤ مصالحت کی راہ میں ایک دیوار بن گیا تھا۔ کرشن راؤ ایک عجیب سی آفت ناگہانی کا شکار ہو گیا تھا۔ نہ وہ نرسنگا کی دشمنی خرید سکتا تھا اور نہ راما راؤ کو ناراض کر سکتا تھا۔ غرض اسی الجھن میں دن گزرتے رہے یہاں تک کہ شجاع الدین کامران پوری طرح صحت یاب ہو گیا۔

اور پھر ایک روز سردار نرسنگا نے اپنے ایک آدمی کو یہ پیغام دے کر ٹھاکر کرشن راؤ کے پاس بھیجا۔

''میں کل چھوٹے ٹھاکر کی صحت کا جشن منا رہا ہوں۔ یہ جنگل کی پوری تاریخ میں ایک یادگار جشن ہو گا۔ میری یہ خواہش ہے کہ بڑے ٹھاکر اس تقریب میں مہمان کی حیثیت سے شریک ہوں اور یہ میرا حکم ہے کہ راما راؤ اپنے ان

تمام ساتھیوں کے ہمراہ حاضر ہو جائے جنہوں نے چھوٹے ٹھاکر کے ساتھ وحشیانہ سلوک کیا تھا۔ میں اسی جشن کے موقع پر اس مقدمے کا فیصلہ کروں گا جو نامکمل رہ گیا تھا۔"

جیسے ہی نرسنگا کے آدمی کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے راما راؤ کسی زخمی درندے کی مانند چیختا ہوا کھڑا ہو گیا۔

"ایک لٹیرا مجھے حکم دے رہا ہے ٹھاکر!"

کرشن راؤ نے راما راؤ کو سمجھانے کی کوشش کی' مگر دوسرے راجپوت بگڑ گئے اور آج پہلی بار ٹھاکر کو احساس ہوا کہ وہ تنہا رہ گیا ہے۔

پھر راما راؤ نے اپنے مسلح آدمیوں کو حکم دیا کہ وہ نرسنگا کے بھیجے ہوئے لٹیرے کو پکڑ لیں۔ جنگلی قزاق تنہا تھا' اس نے مزاحمت کی مگر بہت جلد بے دست و پا ہو گیا۔ اس کے بعد راما راؤ کے حکم پر اس کی زبان کاٹ دی گئی۔ وہ چیختا رہا لیکن آج اس کی چیخوں کو سننے والا کوئی نہ تھا۔

پھر جب وہ لٹیرا اپنے خون میں نہایا ہوا مندر سے رخصت ہوا تو اس کے کانوں میں راما راؤ کے یہ الفاظ گونج رہے تھے۔

"اپنے سردار سے کہہ دینا کہ ٹھاکروں کے جشن منانے کا انداز لٹیروں سے مختلف ہوتا ہے۔

❋❋❋

جب نرسنگا کا آدمی اس حالت میں جنگل پہنچا تو لٹیرے اسے دیکھ کر پاگل ہو گئے۔ کسی محافظ نے نرسنگا کو بتایا تو وہ بھی گھبرا کر اپنی خواب گاہ سے نکل آیا۔

''یہ کیا ہے؟''

سردار نے زباں بریدہ شخص سے پوچھا۔ نرسنگا کی سرخ آنکھوں سے اس قدر وحشت ٹپک رہی تھی جیسے عنقریب اس کی دونوں پتلیاں حلقوں سے باہر نکل جائیں گی۔

لٹیرا اپنے سردار کے سوال کا کیا جواب دیتا۔ اس نے آگے بڑھ کر اپنی کٹی ہوئی زبان نرسنگا کے قدموں میں ڈال دی۔

''تیرا یہ حال کس نے بنایا ہے زرینا؟''

سردار نے بڑے کربناک لہجے میں دوبارہ پوچھا۔

زرینا نے اپنا منہ کھول دیا جہاں جمے ہوئے خون کے لوتھڑوں کے سوا کچھ نہیں تھا...... بڑا لرزہ خیز منظر تھا ......زرینا کی بے چارگی دیکھ کر ہر لٹیرے کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔

''مجھے بتا دے زرینا کہ وہ کون ہے؟''

نرسنگا نے بے اختیار ہو کر اس کے دونوں کاندھوں پر اپنے ہاتھوں کی گرفت مضبوط کر دی...... وہ کون بھیڑیا ہے جس نے میرے ایک شیر سے اس کی دھاڑ چھین لی؟''

نرسنگا نے زرینا کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

زرینا بالکل بے دست و پا تھا...... سردار کے بار بار پوچھنے پر جب اسے شدت سے اپنی بے کسی کا احساس ہوا تو وہ رونے لگا...... نرسنگا نے مجبور ہو کر اس کے دونوں بازو چھوڑ دیئے۔

پھر اچانک زرینا کی آنکھوں میں ایک چمک سی جاگ اٹھی...... اس نے تیزی سے اپنی تلوار کھینچی اور اس کی نوک سے زمین پر ''راما راؤ'' کا نام لکھ دیا...... خون زیادہ بہہ جانے سے نقاہت بڑھتی جا رہی تھی۔ پھر بھی زرینا نے اپنی باقی ماندہ طاقت کو سمیٹ کر زمین کے سینے پر یہ عبارت نقش کر دی۔

''راما راؤ نے کہا ہے نرسنگا کے حکم کا یہی جواب تھا۔''

نرسنگا کی قوت برداشت جواب دیتی جا رہی تھی۔ شدت غضب میں اس کی آواز کانپنے لگی۔ ''کیا راما راؤ مندر میں موجود ہے؟''

زرینا نے اثبات میں سر کو جنبش دی اور پھر زمین پر بیٹھ کر تلوار کی نوک سے کچھ لکھنے لگا۔ نرسنگا نے جھک کر دیکھا۔ زرینا لرزتے ہاتھوں سے لکھ رہا تھا۔

''سردار! تیرا یہ غلام تیری عزت پر قربان ہو گیا ...... اب میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا پھیلتا جا رہا ہے' ایسا لگتا ہے کہ یم راج (فرشتہ اجل) کی سواری ادھر آنے والی ہے' مجھے معاف کر دینا سردار کہ میں اکیلا تھا اور وہ تعداد میں بہت زیادہ تھے۔''

آخری لفظ لکھنے کے ساتھ ہی نرینا کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ گئی اور وہ زمین پر گر کر بے ہوش ہو گیا۔

نرسنگا نے فوراً ہی وید گوتم داس کو طلب کر لیا۔ بوڑھا طبیب کچھ دیر نرینا کی نبض دیکھتا رہا ...... پھر اس نے پرامید لہجے میں کہا۔

''سردار! اس کی قوت گویائی تو بحال نہیں ہو سکتی' مگر زندگی بچ جانے کے امکانات بہت روشن ہیں۔''

''ہاں گوتم! اسے ضرور بچا لے کہ یہ تیرے سردار کی خاطر اس حال کو پہنچ گیا ہے۔'' نرسنگا کے لہجے میں قہر کی آگ بھی تھی اور درد کی خلش بھی۔

وید گوتم داس چند آدمیوں کی مدد سے نرینا کو اٹھا کر اس کی جھونپڑی میں لے گیا۔

نرسنگا نے فوراً ہی اپنے دو سو آدمیوں کو طلب کیا اور پھر انہیں حکم دیتے ہوئے کہا۔

''تم لوگ پچاس پچاس کی ٹکڑیوں میں تقسیم ہو کر بڑے مندر کے گرد و نواح میں پھیل جاؤ ...... اور ان تمام راستوں کی ناکہ بندی کر دو جن سے گزر کر راما راؤ ٹھاکر کی حویلی تک پہنچتا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ راما راؤ مندر سے فرار ہو کر شہر میں داخل ہو جائے ...... اور میں یہ بھی پسند نہیں کرتا کہ مندر کی حدود میں انسانی خون کی کوئی نہر جاری ہو جائے اس لئے راما راؤ کو دیوتاؤں کے استھان سے دور رہ کر پکڑو اور پھر اسے اپنے سردار کے قدموں میں لا کر ڈال دو۔''

''سردار! اگر راما مندر سے باہر نہیں نکلا تو پھر ہمارے لئے کیا حکم ہے؟'' ایک لٹیرے نے نرسنگا سے سوال کیا۔

''میں اس کا انتظار کر رہا ہوں ......''

نرسنگا نے چیخ کر کہا۔

''تم لوگ موت کے فرشتے بن کر راما راؤ کی زندگی کے تمام راستوں پر قبضہ کر لو۔ اسے ہر حال میں یہاں پہنچنا ہے۔ اگر وہ کل چھوٹے ٹھاکر کے جشن صحت میں شریک نہ ہو سکا تو سمجھ لو کہ تمہارا سردار نرسنگا مر گیا۔''

''یہ کیسے ممکن ہے ان داتا؟''

جنگل میں بیک وقت بے شمار آوازیں گونج اٹھیں۔

''ہم راما راؤ کو پاتال میں بھی چھپنے نہیں دیں گے' پوری دھرتی ہماری شکارگاہ بن جائے گی' یہاں تک کہ ہم اس چوہے کو ڈھونڈ نکالیں گے۔''

پھر ان دو سو لٹیروں نے اپنے گھوڑوں کی لگامیں کھینچیں اور راما راؤ کا محاصرہ کرنے کے لئے بڑے مندر کی طرف روانہ ہو گئے۔

اس کے بعد نرسنگا نے اپنے تمام لٹیروں کو جمع کر لیا' پھر بلند آواز میں انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''ساتھیو! گردش وقت نے تمہارے سردار کو زندگی کے ایک خوفناک موڑ پر لا کھڑا کر دیا ہے ......'' نرسنگا کے لہجے میں غیر معمولی گرج تھی۔ ''ہو سکتا ہے آج کی رات ہمارے اقتدار کی آخری رات ہو' حکومت ہمارے قتل و غارت کے کاروبار سے بے خبر نہیں' مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں راما راؤ نے گھبرا کر سرکار کی سرپرستی حاصل نہ کر لی ہو۔''

''آخر سردار کہنا کیا چاہتے ہیں؟''

ایک نوجوان قزاق نے سوال کیا۔

''اس طرح راماراؤ کی طاقت میں اضافہ ہوسکتا ہے۔'' نرسنگا نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم اپنی جانوں پر کھیل کر ٹھاکر کو اس بات کا خراج ادا کرتے ہیں کہ وہ ہندو دھرم کا نگہبان ہے...... مگر تم میں سے یہ راز کوئی نہیں جانتا کہ ٹھاکر ہماری لوٹی ہوئی دولت کو کس طرح برباد کر رہا ہے؟ اس نے ہمارے کمائے ہوئے دھن پر سیکڑوں کتے پال رکھے ہیں...... اور اب وہ کتے اس قدر ناشکرے ہو گئے ہیں کہ اپنے مالک کو کاٹنے کی کوشش کر رہے ہیں' ان ہی کتوں میں سے ایک کتا راماراؤ ہے جس نے نرینا کی کٹی ہوئی زبان کے ذریعے جنگل والوں کو پیغام بھیجا ہے کہ ان کے سردار کا جسم بھی کتوں کے نوکیلے دانتوں سے محفوظ نہیں ہے۔''

''ہم ایسے تمام دانتوں کو توڑ دیں گے۔''

پورا جنگل لاتعداد آوازوں کے شور سے لرز اٹھا۔

''سردار! ہم تیرے شکرگزار ہیں کہ تو نے ہم لاوارث اور بھٹکے ہوئے لوگوں کو ایک مرکز پر جمع کیا...... اگر تو ایسا نہ کرتا تو یہ ٹھاکر اور برہمن ہمارے ہاتھوں میں بھیک کے پیالے دے کر مندروں کے راستے میں بٹھا دیتے...... اور پھر جب یہ اعلیٰ نسل کے پجاری اپنے گھروں کو واپس جاتے تو ''دان'' کے نام پر روٹی کے چند بچے ہوئے ٹکڑے ہمارے پیالوں میں ڈال دیتے' تو ہمارا نجات دہندہ ہے نرسنگا! تو نے ہمارے ہاتھوں کو ''منش جاتی'' کے آگے پھیلنے کی ذلت سے بچایا...... اور ہمیں جینے کا ہنر سکھایا' سردار! ہمارے سر تیرے آگے ہمیشہ جھکے رہیں گے...... مگر جب کوئی بدذات تیری طرف تحقیر آمیز نظروں سے دیکھے گا تو پھر ہم کھلے عام انسانی بستیوں میں خون کا سیلاب لے آئیں گے' چاہے راماراؤ حکومت کی مدد بھی حاصل کر لے' ہم نے تیرے ساتھ جینے اور مرنے کی قسم کھائی ہے۔ ہمیں آزما کر دیکھ لے نرسنگا کہ ہم تیرے کیسے جاں نثار غلام ہیں؟''

جیسے ہی وہ نوجوان خاموش ہوا جنگل میں آوازوں کا زلزلہ سا آ گیا۔ تمام لٹیرے وارفتہ ہو کر پوری شدت سے چیخ رہے تھے۔

''سردار! تیری رسوائی کے بعد ہم لوگوں کے لئے یہ زندگی ایک گندی گالی ہے...... ہمیں حکم دے تو ہم تیرے ایک اشارے پر ٹھاکر کی حویلی کو شمشان گھاٹ میں بدل ڈالیں' ہمارے ٹکڑوں پر پلنے والا یہ کتا دوبارہ نہیں غرائے گا۔''

' نرسنگا نے پہلی بار اپنے ساتھیوں کو اس قدر جذباتی رنگ میں دیکھا تھا۔ وفاداری کا یہ انداز دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ہلکا ہلکا پانی اتر آیا۔ پھر اس نے اونچی آواز میں کہا۔

''تم نے اپنے سردار کو جو عزت بخشی ہے اسے نرسنگا آخری سانس تک نہیں بھول سکتا۔''

اس کے بعد نرسنگا نے اپنے ایک لاکھ ساتھیوں میں سے بہترین شمشیرزنوں کا انتخاب شروع کر دیا۔ جب منتخب لٹیروں کی تعداد ایک ہزار تک پہنچ گئی تو اس نے باقی لوگوں کو ان کے ٹھکانوں پر واپس لوٹ جانے کا حکم دے دیا۔

پھر نرسنگا نے ان ایک ہزار جانبازوں کو اپنا منصوبہ سمجھایا۔

''تم لوگ اندھیرا پھیلتے ہی بڑے مندر کے چاروں طرف جمع ہو جاؤ گے...... پھر تین آدمی اندر داخل ہو کر ٹھاکر سے مطالبہ کریں گے کہ وہ راماراؤ اور اس کے ساتھیوں کو تمہارے حوالے کر دے جنہوں نے کامران کے جسم پر مشق ستم کی تھی...... پھر اگر ٹھاکر خوش اسلوبی کے ساتھ تمہارا مطالبہ مان لے تو ان کتوں کو لے کر سیدھے جنگل چلے آنا...... اور اگر راماراؤ مزاحمت کرے تو پہلے اسے سمجھانے کی کوشش کرنا' مندر سے باہر لا کر اپنی طاقت کا مظاہرہ کرا

دینا...... پھر بھی وہ نہ مانے تو مجبوراً تلواریں بے نیام کر لینا' یہاں تک کہ راما راؤ اور اس کے ساتھی زخمی ہو کر زمین پر گر جائیں۔"

یہ کہہ کر نرسنگا اپنی خواب گاہ میں لوٹ آیا۔ شجاع الدین کامران بھی اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ "سردار! مجھ پر جو گزرنا تھی سو گزر گئی۔" کامران نے کشت و خون کی آندھی روکنے کے لئے نرسنگا کو سمجھانا چاہا...... "میں ایک غیر مذہب کا نمائندہ ہوں' میری خاطر تم آپس کے رشتوں کو تقسیم نہ کرو۔"

"نہیں ٹھاکر! بات مذہب کی نہیں اصول اور قانون کی ہے۔" نرسنگا کا لہجہ شرربار تھا۔

"وہ دھرم کا چودھری ہم لٹیروں کو قابل نفرت سمجھتا ہے جب کہ میرے آدمیوں نے اس کی تجوریوں کو منہ تک بھر دیا ہے' پھر یہ احسان فراموشی کیوں؟ میں نے تجھے باہر جانے کی اجازت دی تھی' کرشن راؤ کون ہوتا ہے کہ تیرے پیروں میں زنجیر ڈال سکے...... راما راؤ کا ایک گناہ یہ ہے کہ اس نے تجھے موت کے تاریک غار تک پہنچانے کی بھرپور کوشش کی تھی' وہ ابھی اپنے پہلے گناہ کا کفارہ ادا کرنے نہیں پایا تھا کہ اس سے دوسرا گناہ سرزد ہو گیا' یہ زرینا کی نہیں میری زبان کاٹی گئی ہے ٹھاکر! نرسنگا کی زبان!" سردار کے منہ سے چنگاریاں جھڑ رہی تھیں۔

"فضا تیرے خلاف ہے نرسنگا!"

شجاع الدین کامران اپنے ہمدرد اور محسن کو آفت ناگہانی سے بچانا چاہتا تھا۔

"کیا ایک ہی چوٹ نے تجھے کایر (بزدل) بنا دیا؟ نرسنگا نے تمسخر آمیز لہجے میں کہا۔

"یہ تو کہہ رہا ہے ٹھاکر!"

"میرے مشورے کو بزدلی سے تعبیر نہ کر سردار!" کامران نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے تیری پرسکون زندگی میں ہلچل مچ جائے...... اور پھر تیرے ساتھی تجھ پر انگلیاں اٹھائیں کہ تو نے ایک غیر کی خاطر اپنے ہم مذہبوں کو موت کی آگ کا ایندھن بنا دیا۔"

"ٹھاکر! ہماری زندگی کی عکاسی کے لئے ہلچل کا لفظ بہت حقیر ہے' ہم انقلاب کی پیداوار ہیں اور ہمارے روز و شب کا ہر لمحہ طوفانوں کی آغوش میں بسر ہوتا ہے۔ ہم سکون اور ٹھہراؤ سے ناآشنا ہیں۔ آندھی کی طرح آئے ہیں اور بھونچال کی طرح چلے جائیں گے۔ ہماری پروا نہ کر کہ ہمیں تہذیب و تمدن کے نرم گہواروں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ ہم پھولوں کی سیج کو بھی جلتی ہوئی ارتھی سمجھتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ کل ہمارے جسم بھی بے حس و حرکت ہو جائیں گے ......اور کون جانے کہ ہم خانہ خرابوں کی قسمت میں مقدس آگ ہے بھی یا نہیں' کسے پتا کہ ہماری راکھ کو جمنا کا پوتر جل سویکار بھی کرے گا یا نہیں؟ مگر یہ ایک کامنا (خواہش) ضرور ہے کہ جب سنسار سے جائیں تو یہ سورج دیوتا کی اولاد راجپوت۔ اور یہ برہما کی سنتان برہمن ہمارے ناموں کے ساتھ کم ہمتی کے افسانے منسوب نہ کریں۔ راما راؤ کو آنا ہی ہو گا چاہے اس کشاکش میں مجھے موت ہی کیوں نہ جائے' تیرے بدن پر لاتعداد زخموں کے ابھرے ہوئے نشانات اور زرینا کی کٹی ہوئی زبان کا حساب اسے دینا ہی پڑے گا۔"

شجاع الدین کامران نے اپنے الفاظ واپس لے لئے۔ "اب میں کچھ نہیں کہوں گا نرسنگا کہ مجھے تیری عزت کا بڑا لحاظ ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میری شمولیت سے تیری طاقت میں کوئی اضافہ نہیں ہو گا مگر پھر بھی......" کامران نے اپنی بات نامکمل چھوڑ دی۔

اس قدر دہشت خیز فضا میں بھی نرسنگا کے ہونٹوں پر ایک بے نیازی سی مسکراہٹ ابھر آئی۔ "تو صرف تماشا دیکھے گا ٹھاکر! ابھی تیرے بازوؤں کی طاقت آزمانے کا وقت نہیں آیا۔"

***

نرسنگا کے بھیجے ہوئے دو سو سوار بڑے مندر کے اطراف میں پھیل گئے تھے۔ پچاس پچاس لٹیروں کے دستے ایک ایک میل کے فاصلے پر مخصوص دائرے میں گردش کر رہے تھے اور اس طرح نرسنگا کے آدمیوں نے راما راؤ کے تمام راستے بند کر دیئے تھے۔ لٹیروں کو انتظار تھا کہ کب راما راؤ مندر سے نکل کر ٹھاکر کی حویلی کی طرف بڑھے اور پھر وہ اسے گرفتار کر کے اپنے سردار کی نظروں میں سرخرو ہو جائیں...... مگر ان کا یہ انتظار طویل سے طویل تر ہوتا چلا گیا اور حویلی کی طرف جانے والی پگڈنڈیاں سنسان سی پڑی رہیں۔ دراصل نرسنگا اور اس کے بھیجے ہوئے لٹیروں کو یہ راز معلوم نہیں تھا کہ آج کل راما راؤ کی راتیں مندر کے زمین دوز تہہ خانے میں بسر ہوتی تھیں۔ جب سے ٹھاکر نے دیوداسی شکنتلا کو اس کی ملکیت میں دے دیا تھا وہ اپنی راتیں مندر کی حدود میں بسر کرتا تھا اور ایک مجبور لڑکی کو ذلیل اور رسوا کرنے کے لئے نئے نئے حربے آزماتا تھا۔

نرینا کی زبان کاٹنے کے بعد وہ شراب پی کر شکنتلا کے کمرے میں چلا گیا تھا۔ ٹھاکر کرشن راؤ اور پجاری رام سروپ کے ہوش اڑ گئے تھے۔ وہ دونوں سر جوڑے بگڑے ہوئے حالات کے بھنور سے نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پجاری رام سروپ لرزتی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا۔

”ٹھاکر! میرے کان کسی خوفناک گڑگڑاہٹ کی آواز سن رہے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے دھرتی کا سینہ پھٹ جائے گا۔“

”بدبخت! اپنی زبان پر قابو رکھ۔“ ٹھاکر کرشن راؤ نے غضب ناک لہجے میں کہا۔ وہ بھی اپنے اعصاب کو پرسکون رکھنے کے لئے مسلسل شراب پی رہا تھا۔ ”نرسنگا بھی تیرے ٹھاکر کا غلام ہے‘ فضا کتنی بھی ناسازگار ہو جائے مگر وہ میری ناراضگی مول نہیں لے سکتا۔ میں مانتا ہوں کہ راما نے زیادتی سے کام لیا ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ نرسنگا میرے خدمت گاروں پر حکم چلانے لگے اور میں اس کی گستاخیوں کو نظر انداز کر دوں۔“ ٹھاکر سرمستی میں جھول رہا تھا۔

”پھر اس جھگڑے کا کیا انجام ہوگا ٹھاکر؟“

پجاری رام سروپ پر بدستور وحشت مسلط تھی۔

”کیسا جھگڑا......؟“

ایک لمحے کے لئے کرشن راؤ چونک اٹھا اور پھر فوراً ہی سنبھل کر بولا۔ ”اگر نرسنگا مجھ سے بات کرے گا تو میں صاف کہہ دوں گا کہ اس کے آدمی نے راما سے ایک آقا کے لہجے میں بات کی تھی‘ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے انجام کو پہنچ گیا۔“ ٹھاکر کرشن راؤ پجاری رام سروپ کے سامنے جھوٹ بولنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”مگر یہ راما کا بڑا وحشیانہ عمل تھا ٹھاکر!“ رام سروپ اب بھی اندر ہی اندر کانپ رہا تھا۔ ”اگر وہ چاہتا تو نرسنگا سے اختلاف کی یہ صورت پیدا ہی نہیں ہوتی۔“ رام سروپ کو اپنے انجام کی فکر ستا رہی تھی اور وہ نرسنگا کی ممکنہ نفرت سے خوف زدہ نظر آ رہا تھا۔

راما راؤ کی اس غیر دانشمندانہ حرکت کا ذکر سن کر بوڑھے ٹھاکر کے سینے میں بھی ایک سرد سی لہر اٹھی اور اس کی روح پر ہلکا سا لرزہ طاری کرتی ہوئی گزر گئی۔ کرشن راؤ نرسنگا کے بجائے اپنے پرانے خدمتگار راما سے خوف زدہ تھا۔ اس کی سود خور نظریں کئی دنوں سے دیکھ رہی تھیں کہ بیشتر راجپوت راما راؤ کے ہر فیصلے کی تائید کر رہے تھے اور ٹھاکر کے احکامات کو جھٹلایا جا رہا تھا۔ اگرچہ ابھی کھلی بغاوت کے آثار نہیں تھے‘ لیکن کرشن راؤ کے لمبے کان کسی انقلاب کی

دبی دبی سرگوشیاں سن رہے تھے۔ وہ راما راؤ کو اس کے دائرے میں واپس لانا چاہتا تھا' مگر تیزی سے گزرتے ہوئے وقت اور بڑھاپے نے اس کام کو مشکل تر بنا دیا تھا۔ جب پجاری رام سروپ نے راما راؤ کی غیر ذمہ داری کا حوالہ دیا تو ٹھاکر پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ کرشن راؤ فطری طور پر ایک انتہائی سرد مزاج اور کینہ پرور انسان تھا۔ انتہائی تحقیر آمیز کلمات سن کر بھی وہ غصے سے مغلوب نہیں ہوتا تھا' بلکہ اپنے ہونٹوں پر ایک ریاکار مسکراہٹ سجائے رہتا تھا اور روح کی گہرائیوں میں اپنے دشمن کے خلاف ایسی ہولناک سازش کا منصوبہ ترتیب دیتا رہتا تھا جس کی خبر اس کے چہرے اور زبان کو بھی نہیں ہوتی تھی۔ بوڑھا ٹھاکر راما راؤ سے بھی نجات حاصل کرنے کی تدبیریں سوچ رہا تھا' مگر صورت حال اس کی گرفت میں نہیں آ رہی تھی۔

''راما راؤ نے جو کچھ کیا ٹھیک کیا۔''

کرشن راؤ نے بڑے حوصلے کے ساتھ جھوٹ بولا۔ ''میں اپنے وفاداروں کی توہین برداشت نہیں کرتا' نرسنگا کو اپنا انداز بدلنا ہوگا۔ آخر راما' راما ہے' میرا دایاں بازو' راجپوتوں کی مان مریادا کا بوجھ اٹھانے والا۔'' یہ کہہ کر کرشن راؤ نے پجاری رائے سروپ کے چہرے پر اپنی باتوں کا ردعمل تلاش کرنا چاہا۔

''میں خود بھی راما راؤ کی شکل میں ہندو دھرم کا مستقبل تلاش کرتا ہوں' ٹھاکر! مگر نرسنگا بھی آخر نرسنگا ہے' بھگوان کرے کہ وہ اپنی نندا (ذلت) کو کسی پرکار سہن کر جائے۔'' رام سروپ کے لہجے میں اب بھی پہلی جیسی لرزش تھی۔

''تیرا خیال ہے کہ وہ اپنے لٹیرے کی زبان کے لئے مجھ سے راما راؤ کا سر طلب کرے گا؟'' ٹھاکر اچانک مشتعل ہو گیا تھا۔ ''کیا ایک لٹیرے ... اتنی ... ات ہو سکتی ہے کہ وہ مہاراج کرشن راؤ کے دروازے پر دستک دے سکے؟''

''میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا ٹھاکر! مگر میری اتنی پرارتھنا ضرور ہے کہ کسی طرح اس طوفان کا رخ دوسری طرف موڑ دے۔'' پجاری رام سروپ نے گھبرا کر دونوں ہاتھ جوڑ دیئے تھے۔

''پجاری! تجھے بھیک کے ٹکڑوں نے کایر (بزدل) بنا دیا ہے۔'' کرشن راؤ کا لہجہ انتہائی ذلت آمیز تھا۔ ''اگر تو محنت کی روٹیاں کھاتا تو آج ایسی باتیں نہ کرتا' میں جب تک اس دھرتی پر موجود ہوں کوئی طوفان ادھر نہیں آئے گا۔ نرسنگا کی جان میری مٹھی میں ہے' جب بھی سر اٹھائے گا مسل ڈالوں گا۔''

پجاری رام سروپ پھنکار سن کر بدحواس ہو گیا تھا۔ اس نے فوراً ہی گفتگو کا موضوع بدل دیا۔

''کیا آپ کل چھوٹے ٹھاکر کے جشن صحت میں شرکت کریں گے؟''

''مت کہو اس ناپاک کو ٹھاکر!'' کرشن راؤ بھڑک اٹھا۔ ''ایک ملیچھ کا جشن صحت ہی کیا؟ عنقریب میں اس کے جنازے میں شرکت کروں گا۔'' یہ کہتے کہتے ٹھاکر کا پورا چہرہ نفرتوں کی کالک سے سیاہ ہو گیا تھا۔

پجاری رام سروپ خاموش ہو گیا۔

پھر ایک طویل وقفہ سکوت کے بعد کرشن راؤ بولا۔ ''میں نے احتیاطاً اپنے جاں نثار مسلح محافظوں کو مندر کے دروازے پر مامور کر دیا ہے' لٹیروں کا کوئی بھروسا نہیں' اگر وہ کوئی شرارت کر بیٹھیں تو انہیں نرینا کی سزا دی جا سکے۔''

''اب... میں مطمئن ہوں ٹھاکر!'' پجاری رام سروپ کے چہرے پر خوشی کی ایک تیز لہر دوڑ گئی۔ ''دراصل میں یہی کہنا چاہتا تھا کہ لٹیروں کا کوئی دھرم نہیں ہوتا...... وہ کسی وقت بھی ہمیں فریب دے سکتے ہیں۔''

''بزدل!'' کرشن راؤ ہنسا۔ ''اپنے ٹھاکر کو احمق سمجھتا ہے؟ کیا کرشن راؤ مہاراج کے منصب پر اتنی آسانی سے پہنچ سکتا ہے؟ اس اعزاز کو حاصل کرنے میں ٹھاکر کے جاگتے ہوئے ذہن کی بے پناہ قوت صرف ہوئی ہے' ایک طرف راجپوتوں اور برہمنوں کو قابو میں رکھنا...... دوسری طرف نرسنگا کو اپنے قدموں میں جھکا دینا...... اور تیسری طرف

مسلمانوں کے سلطان کو اپنی وفاداریوں کا یقین دلا دینا...... یہ اتنا آسان نہیں تھا رام سروپ! یہ کام پورے بھارت ورش میں صرف تیرا ٹھاکر ہی کرسکتا تھا۔"

پجاری رام سروپ نے جھک کر ٹھاکر کے پاؤں چھو لیئے اور بوڑھا ٹھاکر شراب کے نشے میں جھومتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

"آج کی رات میں مندر ہی میں گزاروں گا۔" یہ کہہ کر کرشن راؤ دیوداسی روپا کے کمرے کی طرف چلا گیا۔

روپا وہی مجبور و بے کس لڑکی تھی جسے کچھ دن پہلے سردار نرسنگا نے ٹھاکر کو تحفتاً پیش کیا تھا اور جس کے حسن سے متاثر ہو کر کرشن راؤ نے شکنتلا کے سارے اختیارات سلب کر لیئے تھے اور اس کی جگہ نوخیز روپا کو دیوداسی بنا دیا تھا۔

ٹھاکر کے جاتے ہی پجاری رام سروپ نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔ پھر وہ کبھی کالی کے مجسمے کو سجدہ کرتا اور کبھی درگا کے بت کے سامنے ماتھا رگڑنے لگتا...... کبھی اپنی مدد کے لیئے وشنو کو پکارتا...... کبھی شنکر کو آوازیں دیتا اور کبھی ہنومان کے آگے ہاتھ جوڑ کر گڑگڑانے لگتا۔

"اے بھگوان رام چندر جی کے داس! جس طرح تو نے سیتا کی آبرو بچانے کے لیئے راون کی لنکا میں آگ لگا دی تھی' آج اسی طرح تو اپنے حقیر ترین بھگت رام سروپ کو مصیبت سے نجات دے اور نرسنگا کے پورے جنگل کو جلا کر بھسم کر دے۔"

پجاری رام سروپ اپنے دیوتاؤں کے سامنے' کمرے کے کواڑ بند کیئے فریاد کرتا رہا...... اور نرسنگا کے ایک ہزار مسلح لٹیرے آہستہ آہستہ مندر کی طرف بڑھتے رہے' انہیں شام کے اندھیرے کا انتظار تھا...... اور پھر سورج کی آخری کرن بھی مغربی افق میں ڈوب گئی۔

❋❋❋

نرسنگا کے حکم کے مطابق تین لٹیرے مندر میں داخل ہوئے اور انہوں نے ٹھاکر کرشن راؤ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ مندر کے ایک خدمت گار نے فوراً ہی پجاری رام سروپ کو تین اجنبیوں کی آمد سے مطلع کیا۔ رام سروپ گھبرا کر اپنے کمرے سے باہر نکلا اور لٹیروں سے ان کی آمد کا سبب دریافت کرنے لگا۔ پھر جب نرسنگا کے لٹیروں نے اپنے آنے کی وجہ بیان کی تو رام سروپ پر لرزہ طاری ہو گیا۔ وہ ایک لمحہ ضائع کیئے بغیر تہہ خانے کی مختلف راہداریوں سے گزر کر ٹھاکر کرشن راؤ کے کمرے تک پہنچا جہاں بوڑھا راجپوت شراب کے نشے میں غرق دیوداسی کا رقص دیکھ رہا تھا۔ پجاری رام سروپ نے مسلسل دستکیں [illegible] ٹھاکر نے روپا کو دروازہ کھول دینے [illegible]۔ اس سے پہلے کہ کرشن [illegible] پجاری رام سروپ [illegible] سے نرسنگا کے آدمیوں کے آنے کی سنسنی خیز خبر دی۔ ٹھاکر فوراً ہی لڑکھڑاتا ہوا تہہ خانے [illegible] کر باہر آیا اور [illegible] لٹیروں سے ناخوشگوار لہجے میں گفتگو کی۔ نرسنگا کے قاصد بڑے تحمل سے ٹھاکر کی [illegible] سنتے رہے پھر ان میں سے ایک نے بلند آواز میں کہا۔

"ٹھاکر! ہم تمہارا احترام کرتے ہیں مگر راما راؤ اور اس کے ساتھی ہر حال میں ہمارے سردار کو مطلوب ہیں۔ چاہے آج رات آسمان ہی کیوں نہ ٹوٹ پڑے ہم راما راؤ کو لے کر ہی جائیں گے۔"

کرشن راؤ نے ایک بار پھر گرجنے کی کوشش کی' مگر جب وہ لٹیرے اسے مندر کے دروازے پر لے کر آئے تو ٹھاکر کا سارا نشہ ہرن ہو گیا۔ چاروں طرف برق رفتار گھوڑے ہی گھوڑے اور بے نیام شمشیریں ہی شمشیریں تھیں۔

"ٹھاکر! اگر تیرے کسی آدمی نے ہلکی سی بھی مزاحمت کی تو مندر کے باہر خون کی ندیاں بہہ جائیں گی۔ ہم اپنے سردار کے حکم سے مجبور ہیں ورنہ اس طرح تجھ سے درخواست نہیں کرتے۔ تیری عاقبت اسی میں ہے کہ راما راؤ اور اس

کے ساتھیوں کو خاموشی سے ہمارے حوالے کر دے۔"

ٹھاکر نے نشے میں غرق ہونے کے باوجود وقت کی دیوار پر لکھی ہوئی تحریر کو پڑھ لیا تھا۔ وہ تیزی سے پلٹا اور پجاری رام سروپ کو لے کر راما راؤ کے کمرے میں پہنچا۔ راما اپنے ہوش میں نہیں تھا۔ دیوداسی شکنتلا کی حالت ناقابل بیان تھی۔ ٹھاکر نے چیخ کر کہا۔

"راما! تجھے شراب و شباب سے فرصت نہیں اور باہر دروازے پر موت ہمارا انتظار کر رہی ہے۔"

راما راؤ اس قدر سرشاری کے عالم میں تھا کہ اس نے ٹھاکر کا مذاق اڑانے کی کوشش کی' مگر جب کرشن راؤ نے صورت حال کا نقشہ کھینچا تو اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا اور پھر جھومتے ہوئے کہا۔ "اب میں تیرے حکم کا بھی پابند نہیں' نرسنگا کی کیا حیثیت ہے۔" نشے کی زیادتی نے آج اس کے باغیانہ جذبات کو پوری طرح بے نقاب کر دیا تھا۔

"ٹھاکر واپس جا اور مجھے رات کی سرمستیوں سے لطف اندوز ہونے دے۔"

اس دوران راما راؤ کے وہ ساتھی بھی کمرے میں داخل ہو گئے تھے جنہوں نے شجاع الدین کامران پر بہیمانہ تشدد کیا تھا۔ وہ لوگ تہہ خانے میں راما راؤ کے قریب ہی پہرہ دے رہے تھے۔

"ٹھاکر! اب ہمارا سردار راما راؤ ہے اور وہ کسی کے حکم کا پابند نہیں۔" راما کے ایک ساتھی نے چیخ کر کہا۔

کرشن راؤ کچھ دیر تک بدحواسوں کی طرح باغی راجپوتوں کے چہرے دیکھتا رہا اور پھر لرزتے ہوئے لہجے میں کہنے لگا۔ "تم لوگ خاموشی سے نرسنگا کے پاس چلے جاؤ۔ اس طرح ایک امکان باقی رہ جاتا ہے کہ شاید مصالحت ہو جائے ورنہ سمجھ لو کہ آج کی رات انسانی خون کا سیلاب مندر میں داخل ہو جائے گا اور پوری ہندو قوم ہم پر لعنت بھیجے گی۔"

راما راؤ اور کے ساتھیوں نے ٹھاکر پر جھوٹ بولنے کا الزام لگایا' مگر جب وہ تہہ خانے سے نکل کر مندر کے دروازے پر آئے تو ہر طرف موت کے سائے لرز رہے تھے۔

"راما! اگر تو نے ہمارے ساتھ چلنے سے انکار کیا تو ہم طاقت کا استعمال کریں گے اور ہماری طاقت بے پناہ ہے۔ سردار نہیں چاہتا کہ دیوتاؤں کا استھان انسانی خون سے آلودہ ہو جائے۔" نرسنگا کے آدمیوں نے غضب ناک لہجے میں کہا۔

راما راؤ بھاگ کر دوبارہ تہہ خانے میں چھپ جانا چاہتا تھا مگر نرسنگا کے آدمیوں نے اسے فرار ہونے کا موقع نہیں دیا۔ بے اندازہ شمشیروں کی مسلسل جھنکار نے راما راؤ اور اس کے ساتھیوں کے حوصلے پست کر دیئے تھے۔ موت کا خوف اور شراب کے نشے نے ان سے مزاحمت کا جذبہ بھی چھین لیا تھا۔ یہاں تک کہ وہ سب کے سب قیدیوں کی طرح جنگل کی طرف لے جائے جا رہے تھے۔ مندر کے تمام خدمت گاروں اور دیوداسیوں پر دہشت طاری تھی۔ مگر دیوداسی شکنتلا کسی پتھر کے ستون کی مانند خاموش کھڑی اپنی آبرو کے ایک قاتل کو جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اگرچہ نرسنگا اور ٹھاکر بھی اس کی آبرو کے قاتل تھے' لیکن راما راؤ نے چند راتوں میں اس پر اتنا تشدد کیا تھا کہ شاید دحشت کے ان نشانوں کو دیکھ کر درندے بھی شرما جاتے۔ شکنتلا کا خوبصورت چہرہ نیلے اور سیاہ نشانات سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے آخری بار آسمان کی طرف دیکھا اور کسی بیمار کی طرح لڑکھڑاتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

"ٹھاکر! سردار نے کہا ہے کہ وہ کل چھوٹے ٹھاکر کے جشن صحت میں تیرا انتظار کرے گا۔" ایک لٹیرے نے چیخ کر کہا۔

"اور سردار نے یہ بھی کہا ہے کہ اسے انکار سننے کی عادت نہیں ہے۔" دوسرے لٹیرے کی آواز ابھری۔

''سردار نے یقین دلایا ہے کہ رام اور اس کے ساتھیوں کی جان کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ وہ تو بس چھوٹے ٹھاکر کے ساتھ انصاف چاہتا ہے اور یہ انصاف کل ہزاروں انسانوں کی موجودگی میں ہوگا۔'' تیسرے لٹیرے کی آواز گونجی اور پھر گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں پوری فضا میں عجیب سا شور پیدا کرنے لگی تھیں۔

نرسنگا کے لٹیروں کی فوج واپس چلی گئی تو پجاری رام سروپ نے کانپتے جسم کے ساتھ پوچھا۔''ٹھاکر اب کیا ہو گا؟''

کرشن راؤ بہت خوش تھا۔ راما راؤ کی بغاوت اس طرح راتوں رات فنا ہو جائے گی ٹھاکر نے یہ سوچا بھی نہ تھا۔ راما کی گرفتاری کو اس نے دیوتاؤں کے غیر متوقع کرم سے تعبیر کیا اور پھر اپنے جذبات کو چھپاتے ہوئے انتہائی سنجیدہ لہجے میں کہنے لگا۔''راما بہت نادان ہے' پھر بھی میں اسے بچانے کے لئے نرسنگا کے پاس جاؤں گا۔ ٹھاکر اپنے خدمت گاروں کے لئے ناپسندیدہ کوچے میں بھی قدم رکھ دیتا ہے۔'' یہ کہہ کر ٹھاکر دوبارہ اپنے کمرے میں چلا گیا اور دیوداسی روپا نے رقص شروع کر دیا۔ اب ٹھاکر کے چہرے پر بھی ایک ناقابل بیان خوشی ناچ رہی تھی۔

❊❊❊

جنگل میں ایک نشاط انگیز ہنگامہ برپا تھا۔ تمام لٹیرے اپنے سردار کو نذریں پیش کر رہے تھے اور نرسنگا جواب میں ان کے پھیلے ہوئے دامن کو چاندی کے سکوں سے بھر رہا تھا۔ یہ جنگل کا دوسرا بڑا جشن تھا۔ پہلا جشن اس وقت ہوا تھا جب نرسنگا نے امرپالی سے شادی کی تھی۔ سارے جنگلی اپنے سردار کی فتح پر بے پناہ مسرت کا اظہار کر رہے تھے۔ ڈھول کی آوازیں اس قدر پرشور تھیں کہ میلوں تک ان کی گونج سنائی دے رہی تھی۔ سہ پہر کے قریب ٹھاکر کرشن راؤ پجاری رام سروپ کے ساتھ منڈپ میں داخل ہوا۔ سردار نرسنگا نے کھڑے ہو کر اس کا استقبال کیا۔ شجاع الدین کامران کھڑا ہونا نہیں چاہتا تھا۔ مگر نرسنگا کی تقلید میں اسے بھی اپنی نشست سے اٹھنا پڑا۔ ٹھاکر نے کامران کو دیکھ کر منہ بگاڑ لیا۔ کرشن راؤ کے چہرے پر نفرت و حقارت کے گہرے سائے صاف محسوس کئے جا سکتے تھے۔ کامران کے چہرے پر بھی تناؤ کے آثار تھے' مگر اس نے کسی تلخی کا مظاہرہ نہیں کیا۔

منچ ایک اونچی جگہ پر بنایا گیا تھا' جہاں سردار نرسنگا براجمان تھا اور اس کے بائیں ہاتھ پر شجاع الدین کامران کی نشست تھی۔ ٹھاکر دائیں ہاتھ پر بیٹھا۔ اس کے فوراً بعد ہی نرسنگا کے حکم پر منچ کے نیچے کی جگہ خالی کر دی گئی اور اب وہ مقام ایک بڑا سا نیم دائرہ نظر آ رہا تھا۔

اچانک نرسنگا نے اپنے دائیں جانب جھک کر کرشن راؤ سے کہا۔''ٹھاکر! میں راما کے ساتھ پورا پورا انصاف کروں گا۔''

ٹھاکر کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔''نرسنگا! کیا تو ایک ملیچھ کے لئے میرے آدمیوں کو تماشا بنائے گا؟'' کرشن راؤ کی آواز میں بڑی تلخی تھی۔

''اور تو نے بھی تو مجھے تماشا بنا کر رکھ دیا تھا۔'' نرسنگا نے شکایت کی۔''میں لٹیرا سہی مگر دوستوں کا دوست ہوں۔ اس لڑکے کی پرورش میں نے کی ہے۔'' نرسنگا نے بائیں ہاتھ سے کامران کی طرف اشارہ کیا۔''ٹھاکر! تو نے جس بے رحمی کے ساتھ معاہدے کی خلاف ورزی کی ہے اس نے راجپوتوں کی آن بان اور ایفائے عہد کی ارتھی جلا دی ہے۔ اب نرسنگا راکھ کے ایک ڈھیر پر اعتبار نہیں کر سکتا۔ راکھ تو تیز ہوا میں اڑ جانے کے لئے ہے۔ راما راؤ کے فیصلے کے بعد ہم اپنے باہمی تعلقات کا دوبارہ جائزہ لیں گے۔''

... رہا تھا جیسے وہ کسی ریاست کا حکمران ہو اور ٹھاکر اس کی معمولی رعایا۔

بساط مکمل طور پر الٹ چکی تھی۔ ٹھاکر کرشن راؤ ٹھنڈے پسینے میں نہا گیا۔ اس پر اتنی دہشت طاری تھی کہ وہ نرسنگا کے کسی لفظ کا بھی جواب نہ دے سکا۔ بس کسی کٹھ پتلی کی طرح اپنی بے بسی کا تماشا دیکھتا رہا۔

پھر نرسنگا کے حکم پر راما راؤ اور اس کے ساتھیوں کو تلواروں کے سائے میں لایا گیا۔ راما کا برا حال تھا' وہ شدت غضب سے کانپ رہا تھا۔

''بس نرسنگا! بہت ہو چکا۔ اگر تیرے ذلت آمیز سلوک کا یہی انداز رہا تو ہندوستان کے سارے راجپوت تیرے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے۔'' راما کی زبان سے نفرتوں کی آگ برس رہی تھی۔

نرسنگا کسی راجپوت یا کسی برہمن کی تائید پر زندہ نہیں۔'' لٹیروں کے سردار نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اگر میں چاہتا تو تیرا جسم زنجیروں میں کس دیتا اور پھر چھوٹے ٹھاکر سے کہتا کہ وہ اپنے زخموں کا حساب کر لے۔ مگر نرسنگا تیری طرح بزدل نہیں۔''

یہ کہہ کر نرسنگا نے اپنی تلوار کھینچی اور شجاع الدین کامران کے حوالے کرتے ہوئے بولا۔ ''چھوٹے ٹھاکر کھڑا ہو اور میری استادی کا حق ادا کر دے۔''

کامران نے نرسنگا کے ہاتھ سے تلوار لی اور منچ سے اتر کر دائرے میں چلا گیا۔ سردار کے حکم پر دوسری تلوار راما راؤ کو دے دی گئی۔

''اب یہ دو مردوں کا مقابلہ ہوگا۔'' نرسنگا نے کھڑے ہو کر کہا۔ ''میں ایک بہادر ہوں اور میرا یہ شاگرد بھی بہادروں کی اولاد ہے۔ میں نے چھوٹے ٹھاکر کے پرانے زخموں کا قرض معاف کر دیا۔ اب نئے زخم کی فصل بوئی جائے گی۔ جس کے بازوؤں میں زیادہ طاقت ہوگی' وہی زندگی کا پھل پائے گا۔''

کامران اور راما راؤ کا مقابلہ شروع ہوا۔ چند لمحوں میں اوباش اور شرابی راما راؤ کی سانس پھول گئی۔ کامران کی چستی اور داؤ پیچ قابل دید تھے۔ اس نے جلد ہی اپنے حریف پر برتری حاصل کر لی۔ مختصر سے وقت میں کامران نے راما راؤ کے جسم پر کئی زخم لگا دیے تھے پھر ایک خوفناک وار روکتے ہوئے راما راؤ شکست کھا گیا۔ کامران نے اس کی شہ رگ کو ہدف بنا کر ایک بھرپور وار کیا۔ راما نے کامران کے وار کو روک تو لیا مگر اس کا تھکا ہوا جسم زیادہ دیر تک مدافعت نہ کر سکا۔ راما کی کلائی میں لرزہ پیدا ہوا اور کامران کی شمشیر اس کی شہ رگ میں اتر گئی۔ لمحوں کا کھیل تھا۔ راما راؤ کٹے ہوئے درخت کی طرح زمین پر گر پڑا۔ گردن سے خون کا فوارہ ابل رہا تھا۔

''کسی وید کو بلاؤ نرسنگا' ورنہ راما مر جائے گا۔'' کرشن راؤ گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔

''نہیں ٹھاکر!'' نرسنگا نے پوری طاقت سے کرشن راؤ کا بازو پکڑ کر جھٹکا دیا۔ بوڑھا راجپوت لڑکھڑایا اور منچ پر گر پڑا۔ ''اس لڑکے کو بھی کوئی طبی امداد فراہم نہیں کی گئی تھی۔'' نرسنگا نے کامران کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ اس کا خون بھی پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔ یہی انصاف ہے کہ راما کو بھی اسی حال میں تنہا چھوڑ دیا جائے۔''

راما راؤ نے چند جھٹکے لئے اور پھر اس کا جسم ساکت ہو گیا۔ بوڑھے ٹھاکر اور پجاری رام سروپ کے چہرے موت کو اتنے قریب دیکھ کر سفید پڑ گئے تھے۔

راما کے مرتے ہی شجاع الدین کامران نے نرسنگا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''سردار! اگر یہ لوگ مقابلہ کرنا چاہیں تو میں تیار ہوں' ورنہ میں نے انہیں معاف کیا۔ بنیادی مجرم راما راؤ ہی تھا' وہ اپنے انجام کو پہنچ گیا۔''

ساتوں راجپوت راما کا حشر دیکھ کر مقابلے سے دستبردار ہو گئے اور انہوں نے ہزاروں جنگلیوں کے سامنے

کامران سے اپنے جرم کی معافی مانگ لی۔

پھر نرسنگا نے نرینا کو حکم دیا کہ وہ راما راؤ کی زبان کاٹ لے۔

بڑا لرزہ خیز منظر تھا۔ نرینا نے آگے بڑھ کر راما راؤ کے دونوں جبڑے چیر دیئے اور پھر اس کی زبان کاٹ لی۔

لٹیروں کے ہجوم پر گہرا سکوت طاری تھا۔ نرینا نے راما راؤ کی خون آلود زبان اپنے دونوں ہاتھوں پر رکھی اور ہاتھوں کو آسمان کی طرف دراز کر دیا۔ وہ اپنے سردار کا شکریہ ادا کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی پورا جنگل دعاؤں کے شور سے گونج اٹھا۔ تمام لٹیرے اپنے سردار کی درازی عمر اور بلند اقبالی کیلئے دعائیں کر رہے تھے۔

پھر یہ شور ختم ہوا تو نرسنگا نے کرشن راؤ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''اپنے کتے کو اٹھا کر لے جا! اس نے سردار نرسنگا کو کاٹنے کا ناقابل معافی گناہ کیا تھا۔''

کرشن راؤ خاموش بیٹھا رہا۔ اس کا چہرہ کسی مردہ انسان کے چہرے کی مانند نظر آ رہا تھا۔

''اب میں اس عہد کی تکمیل کروں گا جو میں نے چھوٹے ٹھاکر سے کیا ہے۔'' نرسنگا نے تیز لہجے میں کہا۔

''کامران اپنے ماموں قائم خان راجپوت سے انتقام لے گا۔ اگر تو نے اس کے راستے میں کوئی رکاوٹ کھڑی کی تو پھر تیرے ہی آدمیوں کا خون تیری حویلی کو بہا کر لے جائے گا۔'' نرسنگا کا تانبے جیسا چہرہ غصے سے تمتمانے لگا اور یاد رکھ کہ ہم دونوں کے درمیان جو معاہدہ تھا وہ آج ٹوٹ گیا۔

❋❋❋

ٹھاکر کرشن راؤ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ نرسنگا اس حد تک پہنچ جائے گا اور برسوں پرانے معاہدے کو کچے دھاگے کی طرح توڑ ڈالے گا۔ اس کا خیال تھا کہ نرسنگا محض ایک لٹیرا ہے اور انسانی معاشرے میں لٹیرے کی حیثیت ایک مفرور مجرم سے زیادہ نہیں ہوتی۔ ٹھاکر ہمیشہ یہی سمجھتا رہا کہ نرسنگا کبھی اس کے چنگل سے آزاد نہیں ہو سکتا ...... لیکن آج جو کچھ ہوا وہ کرشن راؤ کے ہوش اڑا دینے کے لئے کافی تھا۔

کئی سال پہلے سردار نرسنگا اور ٹھاکر روشن راؤ کے درمیان امداد باہمی کی بنیاد پر یہ معاہدہ ہوا تھا کہ کرشن راؤ اپنی خاندانی وجاہت اور ہندو قوم میں ایک خاص مقام رکھنے کے سبب نرسنگا کی حمایت کرے گا اور اسے قانون کی گرفت سے بچانے کے لئے وقتاً فوقتاً حکومت کی سرگرمیوں کی خفیہ اطلاعات بہم پہنچاتا رہے گا۔ اس کے صلے میں نرسنگا پر لازم ہوگا کہ وہ لوٹ کے مال میں سے کچھ حصہ ٹھاکر روشن راؤ کو بطور نذر پیش کرے گا۔ معاہدے کی ایک شق یہ بھی تھی کہ آڑے وقت میں کرشن راؤ کے خدمت گار راجپوت بھی نرسنگا کی مدد کریں گے۔

نرسنگا بڑی فراخدلی اور ثابت قدمی کے ساتھ اس معاہدے پر عمل کرتا رہا۔ کرشن راؤ فطرتاً ایک اوباش بوڑھا تھا۔ اس نے مذہب کے نام پر نرسنگا کو کئی فریب دیئے۔ دھارمک شکشا (مذہبی تعلیم) کی آڑ لے کر ٹھاکر نے نرسنگا سے خوبصورت لڑکیاں طلب کیں اور اس کا یہ جواز پیش کیا کہ وہ لڑکیوں کو دیوداسی بنا کر انہیں گھر گھر بھیجے گا تاکہ ہندو قوم مسلمانوں کی ثقافت کے اثرات سے محفوظ رہے اور دیوتاؤں کی تعلیم انقلاب زمانہ کے ہاتھوں برباد ہونے سے بچ جائے' چونکہ ہندوؤں کے مذہبی نظام میں دیوداسیوں کا تصور موجود تھا اس لئے نرسنگا دھوکا کھا گیا۔ اس نے راہ زنی اور قزاقی کے دوران جو لڑکیاں حاصل کیں انہیں بڑے مندر پہنچا دیا اور پھر مطمئن ہو گیا کہ ٹھاکر کرشن راؤ ہندو دھرم کی ناقابل فراموش خدمات انجام دے رہا ہے۔

اس کے علاوہ ٹھاکر کرشن راؤ نے "دھرم کی سیوا" کے نام پر کئی بار نرسنگا سے بڑی بڑی رقمیں حاصل کیں' کبھی اس نے کہا کہ وہ مندر کی عمارت میں اضافہ کر رہا ہے' کبھی کہا کہ وہ مسافروں کے لئے سرائے بنا رہا ہے اور کبھی کہا کہ ہندوؤں کے لاوارث بچوں کے لئے "اناتھ آشرم" (یتیم خانہ) تعمیر کر رہا ہے۔ نرسنگا اپنے گناہوں کو دھونے کی غرض سے بوریاں بھر بھر کے سونے اور چاندی کے سکے دیتا رہا۔

کئی سال تک نرسنگا نے اس طرف کوئی دھیان ہی نہیں دیا۔ وہ روز و شب کے ہنگاموں میں اس طرح الجھا ہوا تھا کہ اسے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی فرصت ہی نہیں تھی۔ پھر آہستہ آہستہ اس پر یہ راز کھلنے لگا کہ ٹھاکر کرشن راؤ نے مندر سے ملحق ایک تہہ خانہ بنا لیا ہے جس میں دیوداسیوں کی ایک فوج پرورش پا رہی ہے جو رقص و سرور کے ذریعے ٹھاکر اور اس کے پروردہ راجپوتوں کا دل بہلاتی رہتی ہے۔ نرسنگا خود بھی ایک رنگین مزاج انسان تھا۔ اس نے ٹھاکر کی عیش پرستیوں کو نظر انداز کر دیا پھر ایک دن نرسنگا پر یہ راز بھی فاش ہوا کہ اس کی بخشی ہوئی دولت کو ان راجپوتوں پر بے

دریغ خرچ کیا جا رہا ہے جو قومی برتری کے احساس میں مبتلا ہیں اور میواتیوں کو ایک حقیر قوم سمجھتے ہیں۔ نرسنگا اور کرشن راؤ کے تعلقات میں یہ پہلا شگاف تھا۔

پھر اچانک شجاع الدین کامران ایک مظلوم شکار کی حیثیت سے مندر میں داخل ہوا۔ پہلے پہلے یہ وقت کا ستایا ہوا نوجوان ٹھاکر کرشن راؤ کے ہاتھوں میں موم کا ایک کھلونا تھا۔ وہ اس کے ساتھ ایک اذیت ناک کھیل کھیل رہا تھا۔ خود نرسنگا بھی کامران کی جذباتی حرکتوں سے لطف اندوز ہوتا تھا...... مگر آہستہ آہستہ یہ سفاک لٹیرا غیر محسوس طور پر کامران کے نزدیک ہوتا چلا گیا۔ امرپالی کے واقعے نے نرسنگا کو یہاں تک متاثر کیا کہ اپنی زندگی میں پہلی بار ایک غیر مسلم کے لئے اس کے دل میں محبت کا احساس جاگنے لگا...... اور اسی احساس سے مجبور ہو کر نرسنگا نے کامران کو شمشیر زنی کا ہنر سکھایا۔ پھر وہ ٹھاکر کرشن راؤ سے بے نیاز ہو کر کامران کی مدد کرنے کے لئے آمادہ ہو گیا تھا۔ اس موقع پر بوڑھے راجپوت اور اس کے خدمت گار راما راؤ نے کامران کے ساتھ جو وحشیانہ سلوک کیا اسے دیکھ کر نرسنگا کے دل و دماغ میں نفرت کے شعلے بھڑک اٹھے۔ پھر اپنے ایک ساتھی لٹیرے نرینا کا حشر دیکھ کر نرسنگا پاگل سا ہو گیا اور اس نے ٹھاکر کرشن راؤ سے برسوں پرانا معاہدہ توڑ دیا۔

بوڑھا راجپوت نرسنگا کا فیصلہ سن کر سناٹے میں آ گیا۔

''میں تجھ سے تفصیلی بات کرنا چاہتا ہوں نرسنگا۔'' کرشن راؤ نے اپنی وحشت اور غصے کو ضبط کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے اس وقت فرصت نہیں۔'' نرسنگا نے منہ پھیر کر جواب دیا اور منچ (مسند) کی سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگا۔ ''پہلے اپنے اس وفادار کتے کی لاش اٹھا کر لے جا۔'' اچانک نرسنگا درمیانی سیڑھی پر رک گیا اور راما راؤ کے بے حس و حرکت جسم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''اگر دیر کرے گا تو اس کا بدن سڑ جائے گا اور میرے جنگل کی صاف و شفاف فضا آلودہ ہو جائے گی۔'' نرسنگا کے لہجے میں بڑی آگ تھی' بڑی شدید نفرت تھی۔

''میں تجھ سے راما راؤ کے خون کا حساب نہیں مانگتا۔ اس نے جو بویا تھا وہی کاٹ لیا۔'' کرشن راؤ لہجہ بدل کر بول رہا تھا۔ ''میں ایک نافرمان شخص کی خاطر تجھ جیسے ساتھی کو قربان نہیں کر سکتا۔''

نرسنگا چند لمحوں کے لئے سوچ میں ڈوب گیا اور پھر منچ کی سیڑھی پر کھڑے کھڑے بولا۔ ''تجھے جو کچھ کہنا ہے جلدی کہہ دے۔ میں دو راتوں کا جاگا ہوا ہوں۔'' نرسنگا کے چہرے پر بیزاری کی جھلک صاف نظر آ رہی تھی۔

''وہ بہت نازک باتیں ہیں نرسنگا! مجھے اتنے لوگوں کے درمیان تماشا نہ بنا۔'' کرشن راؤ نے اتنی مدھم آواز میں کہا کہ دائرے کے باہر کھڑے ہوئے لوگ اس کا ایک لفظ بھی نہ سن سکے۔ ''مجھے تنہائی درکار ہے۔ میں تیرا زیادہ وقت برباد نہیں کروں گا۔''

نرسنگا نے دوبارہ چند لمحوں کے لئے کچھ سوچا اور پھر کرشن راؤ کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے آگے بڑھ گیا۔ شجاع الدین کامران اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ کرشن راؤ نرسنگا کے عقب میں تھا اور چلتے ہوئے اس کی کمزور ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ یکایک نرسنگا رک گیا اور راما راؤ کی لاش کو دیکھتے ہوئے بولا۔

''کیا بدنصیب تھا کہ سردار نرسنگا کی طاقت کو للکارنے چلا تھا۔''

جیسے ہی نرسنگا کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے پورے جنگل کی فضا ''جے کار'' کے شور سے گونجنے لگی۔ تمام لٹیرے چیخ چیخ کر اپنے سردار کی عظمت کے ترانے گا رہے تھے۔

ساتوں راجپوت قیدی اور پجاری رام سروپ اس طرح سہمے ہوئے کھڑے تھے جیسے موت کا گہرا سایہ ان کے سروں پر منڈلا رہا ہو۔

✲✲✲

نرسنگا اپنی خواب گاہ میں پاؤں دراز کئے بے نیازانہ انداز میں لیٹا تھا۔ شجاع الدین کامران اس کے دائیں جانب موجود تھا اور ٹھاکر کرشن راؤ سامنے خاموش بیٹھا تھا۔

''ٹھاکر! آخر تو کیا کہنا چاہتا ہے؟'' نرسنگا نے اونچی آواز میں کہا۔ ''میرا تو خیال ہے کہ اب کہنے کو کچھ بھی باقی نہیں رہا۔''

''میں اس کی موجودگی میں کچھ نہیں کہہ سکتا نرسنگا!'' کرشن راؤ نے کامران کی طرف غضب ناک نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں نے تجھ سے تنہائی مانگی تھی' مگر تو نے میری بات پر کوئی دھیان نہیں دیا۔''

''اس سے زیادہ اور کیا تنہائی ہوگی ٹھاکر؟'' نرسنگا نے بے رخی کے انداز میں کہا۔ ''یہاں میرے اور تیرے سوا اور کون ہے؟ بس یہ ایک لڑکا ہے جو مجھ سے الگ نہیں ......اور پھر اسی لڑکے کی وجہ سے سارا ہنگامہ ہوا ہے' اب میں اسے کس طرح غیر سمجھ کر اپنے آپ سے علیحدہ کردوں۔''

''نرسنگا! تو نے ایک ملیچھ پر کرشن راؤ کی دوستی کو قربان کر دیا۔'' ٹھاکر اچانک بہت زیادہ برہم نظر آنے لگا۔

''اپنی زبان کو احتیاط سے استعمال کر ٹھاکر! آئندہ میں تیری زبان سے اس لڑکے کے لئے ملیچھ کا لفظ سننا پسند نہیں کروں گا۔'' نرسنگا کا لہجہ تحکم آمیز تھا۔ ''آخر وہ شخص کس طرح ملیچھ ہوسکتا ہے جو تیرے ہی خاندان سے تعلق رکھتا ہے؟''

''اس کے باپ دادا نے اپنے پرکھوں کے دھرم سے غداری کی ہے۔'' کرشن راؤ نے انتہائی پست انداز میں طعنہ زنی کی۔

''تو اندھا ہے ٹھاکر! تو نے اسے قریب سے نہیں دیکھا۔'' نرسنگا کے لہجے میں شدید حقارت تھی۔ ''میں جانتا ہوں کہ یہ اپنا دھرم بدلنے کے بعد کچھ اور نکھر گیا ہے۔ اس کا دل کچھ اور صاف ہوگیا ہے۔ ایک تو ہے کہ باپ دادا کے مذہب کا راگ گا رہا ہے اور روز بروز تیرا دل سیاہ ہوتا جارہا ہے۔''

ٹھاکر کرشن راؤ غصے سے کانپنے لگا۔ ''نرسنگا! اس لڑکے نے تجھ پر کیا جادو کر دیا ہے کہ تو اپنے پیاروں کو بھی فراموش کر بیٹھا۔''

''میرا وقت ضائع نہ کر ٹھاکر!'' نرسنگا بیزار نظر آرہا تھا۔ ''تو نے اس لڑکے سے بدعہدی کی اور پھر اسے موت کے دروازے تک پہنچا دیا' تو کیسا راجپوت ہے کرشن راؤ؟ یہ کام تو ہماری بستی کے اچھوت بھی نہیں کرتے۔''

بوڑھا ٹھاکر ہوا کے رخ کو پہچان گیا تھا۔ اس لئے خاموش بیٹھا رہا۔ مگر پھر بھی ذلت کے احساس سے اس کا چہرہ مسخ ہوگیا تھا۔

''نرسنگا لاکھ قزاق سہی' مگر وہ کسی سے بدعہدی نہیں کرتا. . . . پران جائے پر وچن نہ جائے ......یہی اس کا دھرم ہے ٹھاکر! مگر تو کیسا اعلیٰ نسل ہندو ہے کہ تیرا کچھ پتا ہی نہیں چلتا' آنکھیں کچھ اور کہتی ہیں' من میں کچھ اور چھپائے بیٹھا ہے' اس دورنگی سے کب تک کام چلائے گا' تیری گردن ہل رہی ہے اور ٹانگیں کانپ رہی ہیں' پرلوک سدھارنے کے لئے تیار بیٹھا ہے' پھر بھی یہ چھل اور یہ کپٹ ......دیوتاؤں سے ڈر ٹھاکر۔''

''بس نرسنگا!'' ٹھاکر کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ وہ بدحواسی کے عالم میں کھڑا ہوگیا۔ ''تو برابر میرا اپماں کر رہا ہے۔''

''جھوٹ مت بول ٹھاکر!'' [illegible] ...ے کہا۔ ''اپمان تو میرا کیا گیا ہے'

ایک بار نہیں دو بار میں نے تو پرانے رشتوں کا خیال کرتے ہوئے تجھے ہزاروں انسانوں کے ہجوم میں عزت بخشی۔ میں تیرے احترام میں کھڑا ہو گیا اور تجھے اپنے برابر بٹھایا' تو بہت ناشکرا ہے ٹھاکر۔''

''اس کا مطلب ہے کہ تو مجھ سے مصالحت کی بات کرنا نہیں چاہتا۔'' اچانک ٹھاکر کرشن راؤ لہجہ بدل کر بولا اور واپس جانے کے لئے چند قدم پیچھے ہٹا۔

''ہاں! میں تجھ سے کوئی بات کرنا نہیں چاہتا۔'' نرسنگا کی بے نیازی بڑھتی جا رہی تھی۔ ''تیری ہی درخواست پر میں نے اپنی خواب گاہ کا دروازہ کھولا تھا۔ میں تو بھگوان سے چاہتا ہوں کہ تو چلا جائے اور پھر یہ دروازہ ہمیشہ کے لئے تجھ پر بند ہو جائے۔''

نرسنگا نے کرشن راؤ کے اعصاب پر ایسی کاری ضرب لگائی تھی کہ وہ لڑکھڑا گیا۔ بوڑھا ٹھاکر مصنوعی انداز میں اپنی بے پروائی کا مظاہرہ کرنا چاہتا تھا تاکہ نرسنگا ایک لٹیرا ہوتے ہوئے اس کی تنبیہ سے خوف زدہ ہو جائے اور پھر گھبرا کر مصالحت کی پیشکش کر دے .... مگر جب اس نے دیکھا کہ نرسنگا خود ہی پیچھا چھڑانے کی کوشش کر رہا ہے تو وہ دوبارہ سنبھل گیا۔

''نرسنگا! ہم دونوں کا اختلاف ہندو دھرم کے حق میں بہت نقصان دہ ثابت ہوگا۔'' کرشن راؤ نے بڑی بے حیائی کے ساتھ دوبارہ فرش پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''دھرم کی بات نہ کر ٹھاکر۔'' نرسنگا نے چیخ کر کہا۔ ''تو کتنا بڑا پاپی ہے' کچھ میں بھی جانتا ہوں۔''

کرشن راؤ نے اپنے غصے کو برداشت کرتے ہوئے ایک اور جھرجھری لی۔ اس کا بدن پسینے میں نہاتا جا رہا تھا۔

''تو کچھ بھی کہہ لے نرسنگا مگر میں تجھ سے رشتہ توڑنا نہیں چاہتا۔'' کرشن راؤ نے مایوس ہو کر اپنی عیاری کے تمام ہتھیار پھینک دیئے اور نرسنگا کے آگے سر جھکا دیا۔

''اگر تو مجھ سے تعلق برقرار رکھنا چاہتا ہے تو پھر میری شرائط غور سے سن ٹھاکر!'' نرسنگا سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور اس نے امر پالی کو آواز دے کر شراب طلب کی۔

امر پالی ایک عجیب شان سے سردار نرسنگا کی خواب گاہ میں داخل ہوئی اور شراب سے لبریز پیالہ رکھ کر واپس چلی گئی۔ نرسنگا کی یہ خاص عادت تھی کہ وہ کئی سالوں سے شراب کے معاملے میں بہت زیادہ محتاط ہو گیا تھا۔ ایک بار جادوگروں نے اسے سخت تنبیہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

''سردار! اگر تو سلامتی کے ساتھ زندہ رہنا چاہتا ہے تو شراب نوشی کے لئے اپنے سب سے زیادہ قابل اعتبار ساتھی کا انتخاب کر' ہمارا علم بتاتا ہے کہ کہیں تو بے خبری کی حالت میں کسی حادثے کا شکار ہو جائے' شراب کے ذریعے تیرے جسم میں ہلاک کر دینے والا زہر بھی اتارا جا سکتا ہے۔''

جادوگروں کی اس ہدایت کے بعد نرسنگا صرف امر پالی کی تیار کردہ شراب پیتا تھا۔ اس کی محتاط روش کا یہ عالم تھا کہ اگر وہ کرشن راؤ سے ملنے بڑے مندر جاتا اور رقص و موسیقی کی محفل میں شریک ہوتا تو اپنی شراب ساتھ لے کر جاتا۔ ٹھاکر کے بے حد اصرار پر بھی وہ اس کی اعلیٰ ترین شراب کو نہیں چھوتا۔ امر پالی اس کی ایسی جاں نثار ساتھی تھی کہ شراب تیار کرنے کے بعد پہلے خود اسے چکھتی تھی' بعد میں اپنے شوہر کو پیش کرتی تھی۔ یہ ایک انتہائی احتیاطی تدبیر تھی کہ اگر کسی دشمن نے درپردہ سازش کر کے شراب میں زہر ملا دیا ہے تو نرسنگا کے ہونٹوں تک پہنچنے سے پہلے وہ امر پالی کی زبان سے گزر کر شکم میں چلی جائے ......اور اگر کسی کو زہر کے اثرات سے مرنا ہی ہے تو نرسنگا سے پہلے امر پالی ہلاک ہو جائے۔

امر پالی کے جاتے ہی نرسنگا نے شراب کا پورا پیالہ پی لیا' پھر کرشن راؤ کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

"ٹھاکر! میری پہلی شرط یہ ہے کہ شجاع الدین کامران مندر واپس جائے گا۔"

کرشن راؤ معاہدے کی پہلی شرط سن کر چونک اٹھا' مگر زبان سے کچھ نہیں بولا۔ وقت کی گردش نے اس کی زبان پہلے ہی کاٹ دی تھی۔

"میں اس اعتماد کے ساتھ کامران کو مندر بھیجوں گا کہ وہ وہاں اکیلا ہوگا' مگر تیرے مسلح راجپوت اس کا بال بھی بیکا نہ کرسکیں گے۔" نرسنگا نے مزید کہنا شروع کیا۔ "میں تیرے غلاموں کو بتانا چاہتا ہوں کہ جب نرسنگا کسی سے عہد کرتا ہے تو اس شخص کی دنیا میں کیا قدر و قیمت ہوتی ہے؟"

"پھر کیا ہوگا؟" کرشن راؤ گھبرا کر بولا۔ اس کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔

نرسنگا نے مسکراتے ہوئے کرشن راؤ کی طرف دیکھا۔ "اس کے بعد چھوٹا ٹھاکر اپنے ماموں قائم خان راجپوت سے انتقام لینے کے لئے مندر کی حدود سے نکل جائے گا۔"

"تیری یہ شرط بہت خطرناک ہے نرسنگا۔" کرشن راؤ وحشت زدہ ہو کر بولا۔ "تو نہیں جانتا کہ اس میں کیسی کیسی ہولناکیاں پوشیدہ ہیں؟"

نرسنگا نے کرشن راؤ کی بات پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ "میں چھوٹے ٹھاکر کو اس جنگل سے بھی شہر کی طرف روانہ کرسکتا ہوں' مگر یہ میری ضد اور وقار کا معاملہ ہے' اگر اسی دن چھوٹے ٹھاکر کو جانے دیتا تو میں یہ شرط معاہدے میں ہرگز شامل نہ کرتا...... مگر تو نے اپنی طاقت کے نشے میں میرے وقار کے لباس پر کیچڑ مل دی' اس طرح میں تیری لگائی ہوئی غلاظت کو دھونا چاہتا ہوں تاکہ تو اور تیرے تمام راجپوت میری سرکشی اور ضد کے احترام میں اپنی گردنیں جھکا دیں...... اور تیری مہذب دنیا کے رہنے والے اچھی طرح سمجھ لیں کہ جب ایک لٹیرا کسی بات کا ارادہ کر لیتا ہے تو پھر اسے جھوٹوں اور بزدلوں کی فوج بھی نہیں روک سکتی۔"

یہ کہہ کر نرسنگا کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔ پھر نہایت پرجوش لہجے میں کہنے لگا۔ "اگر تو نے چھوٹے ٹھاکر کے راستے میں کوئی دیوار کھڑی کی یا قائم خان راجپوت تک کوئی خفیہ اطلاع پہنچائی تو پھر یہ کھلی ہوئی جنگ ہوگی' میں نہیں جانتا کہ اس جنگ کا کیا انجام ہوگا؟ ویسے ٹھاکر تجھے یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ نرسنگا اپنے انجام سے پوری طرح باخبر ہے' ایک لٹیرے کا انجام دردناک موت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ میں خوب جانتا ہوں کہ قانون مجھے نہیں چھوڑے گا' مگر اس حقیقت کو تو بھی جان لے کہ میں تجھے نہیں چھوڑوں گا۔ دنیا میں جس قدر لذتیں تھیں میں ان سے لطف اندوز ہو چکا' اس وقت تک میں اپنے جنگل کا بے تاج بادشاہ ہوں۔ اگر میری بادشاہت پر کوئی آنچ آئی تو میں زنجیریں پہن کر سلطان کے دربار میں نہیں جاؤں گا۔ دہلی کے سارے لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ سردار نرسنگا کا کٹا ہوا سر نیزے پر بلند ہو کر کسی بادشاہ کی بارگاہ میں جائے گا۔ میں موت سے نہیں ڈرتا کہ موت تو میری ازلی محبوبہ ہے۔ موت جب بھی آئے گی تو نرسنگا اس کا شاندار استقبال کرے گا۔"

"مگر تو مجھ سے ایسی باتیں کیوں کر رہا ہے نرسنگا!" خوف و دہشت کی زیادتی سے کرشن راؤ کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔

"اس لئے کہ آج تیری ساری غلط فہمیاں دور ہو جائیں۔" نرسنگا کی آواز میں بھیڑیوں جیسی غراہٹ تھی...... "میں نے صرف دھرم اور دیوتاؤں کے نام پر سنہری دھن سے تیرے بھنڈار بھر دیئے اور تو سمجھتا رہا کہ میں تجھ سے ڈرتا ہوں' قانون کے خوف سے تیرے پاؤں پکڑنا چاہتا ہوں کہ تو سنکٹ کے سمے مجھے بچالے گا' یہ تیرا بڑا فریب

ٹھاکر!"

"بھگوان کے لئے اپنے ذہن کو میری طرف سے صاف کر لے نرسنگا!" کرشن راؤ کا پورا جسم کانپنے لگا تھا۔

"میں نے ایسا کبھی نہیں کہا۔"

"تو جھوٹ بولتا ہے کرشن راؤ!" نرسنگا نے اپنا دایاں بازو فضا میں جھٹکتے ہوئے کہا۔ "میں نے انسانی خون کی دلدل میں ہاتھ ڈال کر جس دولت کو باہر نکالا تھا' اسے تو نے اپنی عیاشیوں پر خرچ کر ڈالا اور پھر میرے ہی فراہم کردہ رزق سے تو نے نمک حرام کتوں کے ایک کثیر خاندان کی پرورش کی' اگر میں چاہوں تو تجھ سے اپنی سابقہ بخششوں کا حساب بھی طلب کر سکتا ہوں' مگر میں نے دیوتاؤں کے نام پر ان سب کو دان کر دیا۔ آئندہ میں تجھے تانبے کا ایک ٹکہ (سکہ) بھی نہیں دوں گا۔ یہ میرے معاہدے کی دوسری شرط ہے۔"

ٹھاکر کرشن راؤ بدحواس نظر آنے لگا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کی مستقل آمدنی اس طرح اچانک ختم ہو جائے گی۔ "اپنے فیصلے میں لچک پیدا کر نرسنگا! تیرا یہ فیصلہ بہت سخت ہے۔" کرشن راؤ کا لہجہ گداگرانہ تھا۔

"نرسنگا کے فیصلے موسم کی طرح تبدیل نہیں ہوتے۔" نرسنگا نے کرشن راؤ کو جھڑک دیا۔ "ابھی میری آخری شرط باقی ہے' وہ تجھے بعد میں بتاؤں گا۔ اگر اس دوران تو نے فریب کاری سے کام نہیں لیا تو میں آخری شرط پیش کر کے تجھ سے معاہدہ کر لوں گا۔" یہ کہہ کر نرسنگا دوبارہ اپنی مخملیں مسند پر دراز ہو گیا۔

کرشن راؤ کسی انتہائی شکست خوردہ انسان کی طرح اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر جیسے ہی وہ جانے کے لئے مڑا' نرسنگا نے پکار کر کہا۔

"میری خواہش ہے کہ تو راما راؤ کی ارتھی کو راجپوتوں کے ہجوم میں آگ کے حوالے کرنا' اگر تیری قوم کے لوگ تجھ سے پوچھیں کہ راما کس طرح قتل ہوا تو کہہ دینا کہ نرسنگا کی تلوار اسے کھا گئی۔ راما نے مرنے سے پہلے مجھ کو دھمکی دی تھی کہ اگر اسے کچھ ہو گیا تو پوری راجپوت قوم میرے خلاف اٹھ کھڑی ہو گی۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ راما کے اس دعوے میں کتنی سچائی ہے اور راجپوتوں کے خون میں کتنی گرمی موجود ہے۔"

دنیا میں جس قدر ذلت ممکن تھی وہ کرشن راؤ کا مقدر بن چکی تھی۔ پھر بھی اس نے اپنے اکھڑے ہوئے قدموں کو زمین پر جمانے کی کوشش کی۔ "نرسنگا! تو نے مجھ سے رشتہ توڑ دیا مگر ہندو قوم کے دائرے سے باہر نہ جا کہ اس اختلاف کے باوجود راجپوت تیرے بھائی ہیں۔"

"اس دن راما راؤ نے ہزاروں انسانوں کی موجودگی میں اپنے بھائی کا گلا کاٹ دیا۔" نرسنگا پاگلوں کی طرح چیخنے لگا۔ "پہلے میں بھی اسی فریب میں مبتلا تھا مگر راما نے مجھے بتا دیا کہ راجپوت اور برہمن کبھی آسمان سے اتر کر زمین پر نہیں آ سکتے۔ مجھے دوبارہ فریب نہ دے کہ راجپوت راجپوت ہے اور میواتی میواتی ......ندی کے یہ دونوں کنارے اسی وقت مل سکتے ہیں جب دل کی دنیا میں جذبوں کا سیلاب آ جائے اور رسموں کی آہنی دیواریں ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائیں ......مگر یہ سیلاب کیسے آئے گا کہ تم لوگ تو پیدائشی پتھر ہو۔"

✻✻✻

ٹھاکر خاموشی سے سر جھکائے واپس چلا گیا۔ پھر اس نے نرسنگا کے آدمیوں کی مدد سے راما راؤ کی لاش اٹھائی اور بڑی رازداری کے ساتھ دریائے جمنا کے سنسان گھاٹ پر پہنچائی۔ کچھ دیر بعد راما کے جسم کو آگ لگا دی گئی۔ پانی کے شور اور سرخ لپکتے ہوئے شعلوں کے درمیان فضا بڑی ڈراؤنی ہو گئی تھی۔ اس کے بعد کرشن راؤ ان ساتوں راجپوتوں کے ہمراہ مندر پہنچا جنہیں [illegible]

''ہم نرسنگا سے انتقام لیں گے۔'' ایک راجپوت نے غضب ناک لہجے میں بولنے کی کوشش کی' مگر اس کے چہرے پر اب بھی خوف کی زردی چھائی ہوئی تھی۔

''راجپوتوں کی اس سے زیادہ توہین نہیں ہوسکتی ٹھاکر!'' دوسرے راجپوت نے اپنا ہاتھ لہراتے ہوئے کہا۔''وہ نیچ ذات کا لٹیرا تیرے معتمد ساتھی کو ایک جانور کی طرح ذبح کر ڈالے اور تو خاموشی سے تماشا دیکھتا رہے۔''

''وہ ایک حادثہ تھا' نرسنگا نے راما کو قتل نہیں کیا۔'' کرشن راؤ نے راجپوتوں کے بھڑکتے ہوئے جذبات کو ایک مضبوط دلیل کے پانی سے بجھانے کی کوشش کی۔

''مگر یہ سب کچھ نرسنگا کے اشارے سے ہوا۔'' تیسرے راجپوت نے اونچی آواز میں کہا۔''ٹھاکر اگر تو خاموش رہے گا تو میں دہلی کی ایک ایک گلی میں گھوم کر لوگوں کو بتاؤں گا کہ مٹھی بھر لٹیروں کی طاقت کے نشے میں نرسنگا نے مہان راجپوتوں کو گالی دی ہے۔ اگر دہلی کے راجپوت نرسنگا کا مقابلہ نہ کر سکے تو پھر میں اجمیر' چتوڑ اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں کی طرف نکل جاؤں گا۔ اب بھارت ورش کی دھرتی پر میواتی لٹیرے رہیں گے یا سورج دیوتا کی اولاد۔''

راجپوتوں کا ایک قبیلہ ''سورج بنسی'' تھا جس کی رعایت سے راجپوت اپنے آپ کو سورج دیوتا کی نسل کہتے تھے۔

کرشن راؤ پر ایک اور قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ نرسنگا سے انتقام لینا اتنا آسان نہ تھا۔ اگر تمام راجپوت مل کر بھی اس کی مضبوط پناہ گاہوں پر حملہ کرتے تو شاید نرسنگا کو شکست ہو جاتی لیکن اس خونی معرکے میں ہزاروں راجپوتوں کو اپنی جانوں سے ہاتھ دھونا پڑتے۔ کرشن راؤ اس حقیقت سے بھی باخبر تھا کہ اس تصادم میں دونوں طرف سے دیوتاؤں کے پرستاروں کا نقصان ہوتا اور پھر اسی انقلاب میں ہندو قوم کمزور سے کمزور تر ہوتی چلی جاتی۔ شاید کرشن راؤ کی خودغرضی اس نقصان کو بھی برداشت کر لیتی' لیکن وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر راجپوتوں نے نرسنگا سے الجھنے کی کوشش کی تو وہ اسے زندہ نہیں رہنے دے گا۔ موت کا یہی خوف کرشن راؤ کے اعصاب پر مسلط تھا اور وہ قوم پرستی کا بہانہ تراش کر اپنے آپ کو بچانا چاہتا تھا۔

راما راؤ کے ساتھی راجپوت جنہیں کامران نے معاف کر کے نئی زندگی بخشی تھی وہ اس صورت حال سے بھرپور فائدہ اٹھانے کے لئے کرشن راؤ پر دباؤ ڈال رہے تھے۔

کرشن راؤ کچھ دیر تک سوچتا رہا' پھر بہت جذباتی لہجے میں بولا۔''کیا تم سمجھتے ہو کہ مجھے راما کی موت کا غم نہیں؟ راما تمہارا ساتھی سہی مگر وہ میرے بیٹے کی مانند تھا۔ میں اس کے قاتلوں کو کس طرح معاف کر سکتا ہوں۔ مگر وہ تعداد میں زیادہ بھی ہیں اور طاقتور بھی۔ مجھے صرف چند دنوں کی مہلت دے دو۔ میں کسی ایسے منصوبے کے بغیر نرسنگا کو چھیڑنا نہیں چاہتا کہ ناکامی کی صورت میں تمہاری عورتیں بیوہ اور بچے یتیم ہو جائیں۔''

کرشن راؤ نے باغی راجپوتوں کے دلوں پر بڑا خوف ناک وار کیا تھا۔ وہ ایک ہی حربے میں خاموش ہو گئے۔

''ٹھاکر! ہم تجھے تین دن کی مہلت دیتے ہیں۔ اس دوران کوئی ایسا منصوبہ تیار کر لے کہ ہم اپنی قوم کی تحقیر اور رسوائی کا انتقام لے سکیں۔''

اس کے بعد وہ ساتوں راجپوت زمین دوز تہہ خانے میں دیوداسیوں سے دل بہلانے چلے گئے۔

باغی راجپوتوں کے جاتے ہی کرشن راؤ نے پجاری رام سروپ سے کمرے کا دروازہ بند کرنے کے لئے کہا۔ پھر ایک برہمن اور راجپوت کی سرگوشیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ رات گزرتی رہی۔ کرشن راؤ پجاری رام سروپ کے

کمرے میں بیٹھا جھومتا رہا اور ساتوں باغی راجپوت دیوداسیوں کے مرمریں ہاتھوں سے شراب پیتے رہے۔ نصف شب کے قریب رام سروپ نے ٹھاکر کو اطلاع دی کہ وہ تمام نافرمان اپنے انجام کو پہنچ گئے۔ ان کے بے جان جسم فرش پر پڑے پڑے نیلے ہو چکے ہیں۔ ٹھاکر کے اشارے پر ساتوں راجپوتوں کو شراب میں ملا کر ایک سریع الاثر زہر دے دیا گیا تھا۔

پجاری رام سروپ بار بار کرشن راؤ کے سامنے سجدے کر رہا تھا اور ٹھاکر ہر مرتبہ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر تسلیاں دے رہا تھا۔

''جب تک میں زندہ ہوں تیرے اقتدار کو کوئی خطرہ نہیں ..... راما کی خاک تو ہوا میں بکھر چکی' صبح تک ان غداروں کی راکھ بھی اڑ جائے گی۔''

''اور ان داتا اس لٹیرے نرسنگا کا کیا ہوگا؟'' رام سروپ نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

''عقل کی کاٹ تلوار کی دھار سے زیادہ تیز ہوتی ہے۔'' کرشن راؤ نے شراب کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

''دھیرج دھرج پجاری! دھیرج۔''

❋❋❋

وہ بڑا عجیب منظر تھا جب دوسرے دن سردار نرسنگا شجاع الدین کامران کے ساتھ بڑے مندر میں داخل ہوا۔ تمام لٹیروں نے اس کے اس طرح تنہا جانے پر اعتراض کیا تھا۔ مگر وہ بڑا ضدی انسان تھا۔ نرسنگا کو دیکھ کر ٹھاکر کرشن راؤ شدید سراسیمگی کا شکار ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح نرسنگا کا استقبال کرے۔ پجاری رام سروپ اسے دیکھتے ہی سجدے میں چلا گیا تھا۔

''نرسنگا! میں کھلے دل سے تیرا سواگت کرتا ہوں۔'' کرشن راؤ نے اپنے ہونٹوں پر ایک منافقانہ مسکراہٹ سجا لی۔

''میں اکیلا آیا ہوں ٹھاکر! اپنے آدمیوں کو بھیج کر تصدیق کرا لے۔'' نرسنگا نے انتہائی طنز آمیز لہجے میں کہا اور اطمینان سے ٹھاکر کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

''میں جانتا ہوں نرسنگا تو صرف اپنی طاقت پر زندہ ہے۔ تجھے کسی دوسرے سہارے کی ضرورت نہیں۔'' ٹھاکر کے لہجے پر کسی بھکاری کے لہجے کا گمان ہو رہا تھا۔

''اپنے تمام خدمت گاروں کو حکم دے کہ وہ چھوٹے ٹھاکر کا استقبال کریں۔'' نرسنگا نے تند و تیز لہجے میں کہا۔ ''میں اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھنا چاہتا ہوں۔''

نرسنگا مختلف زاویوں سے ٹھاکر کو ذلیل کر رہا تھا۔

تھوڑی سی ہی دیر میں مندر کا صحن پجاریوں اور دیوداسیوں سے بھر گیا۔ اچانک نرسنگا نے ان سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''کیا چھوٹے ٹھاکر نے تمہارے دیوی دیوتاؤں کی شان میں گستاخی کی تھی؟ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گواہی دو۔ اگر اس لڑکے نے یہ بے ہودگی کی ہے تو میں اس کی زبان بھی کاٹ دوں گا۔'' نرسنگا کا چہرہ کسی انگارے کی طرح دہک رہا تھا۔ ''تمہارے دیوتا میرے بھی دیوتا ہیں' نرسنگا کتنا بھی گناہ گار سہی مگر اپنے دیوتاؤں کی عزت پر قربان ہونے کے لئے ہر وقت سر بکف رہتا ہے۔''

بڑا سنگین مرحلہ تھا۔ ٹھاکر کے دل میں یہ وحشیانہ خواہش سر ابھارنے لگی کہ اس کے خدمت گاروں میں سے کوئی

ایک بھی کامران کے خلاف گواہی دے دے اور پھر نرسنگا کا قہر اس کے دشمن پر ٹوٹ پڑے۔ کرشن راؤ نے زرد چہرے اور رکی ہوئی سانسوں کے ساتھ قطار در قطار کھڑے ہوئے پجاریوں اور دیوداسیوں کی طرف دیکھا...... مگر وہ سب کے سب اس طرح خاموش تھے جیسے موت کے خونی ہاتھوں نے ان کی گردنوں کو اپنی گرفت میں لے لیا ہو۔

''تم لوگ جواب کیوں نہیں دیتے؟ کیا چھوٹے ٹھاکر نے میرے دیوتاؤں کی شان میں نازیبا کلمات ادا کئے ہیں؟'' نرسنگا نے اس طرح چیخ کر کہا کہ دیوداسیاں تو خوف و دہشت سے زمین پر گر پڑیں' باقی گواہوں نے ندامت سے سر جھکا لئے۔

نرسنگا کے چہرے پر خوشی کی ایک تیز لہر دوڑ گئی۔ ''میں جانتا تھا کہ یہ لڑکا میرے اعتبار کا قاتل نہیں ہو سکتا۔ یہ سچا ہے اور نرسنگا سچے لوگوں سے بہت پیار کرتا ہے۔''

''چھوٹے ٹھاکر کے احترام میں تم سب کے سب زمین بوس ہو جاؤ۔'' نرسنگا نے اپنے سامنے کھڑے ہوئے پجاریوں کو حکم دیتے ہوئے کہا۔

ابھی فضا میں نرسنگا کے الفاظ کی گونج باقی تھی کہ مجبور اور بے کس انسانوں نے خاک پر اپنے سر رکھ دیئے۔

نرسنگا مسکرایا اور اس نے شجاع الدین کامران کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''ٹھاکر! میں نے ان جھوٹے گواہوں سے تیری بے عزتی کا انتقام لے لیا' ایک نظر دیکھ تو کہ یہ تیرے آگے کس طرح جھکے ہوئے ہیں۔''

''میں تیرا شکر گزار ہوں سردار کہ تو نے مجھ لاوارث کو بڑا اعزاز بخشا۔'' کامران کی آنکھیں چھلک اٹھیں اور آواز میں ایک عجیب سی لرزش پیدا ہو گئی۔

''تیرا باپ تو اس سنسار میں دوبارہ نہیں آ سکتا' مگر اب تو بھیڑیوں کے جنگل میں اکیلا نہیں ہے' نرسنگا تیرے ساتھ ہے۔''

پھر وہ تیزی سے مڑا اور کرشن راؤ سے مخاطب ہوا۔ ''کل شام ہوتے ہی میں یہاں پہنچ جاؤں گا اور ٹھاکر کو اپنی موجودگی میں رخصت کروں گا۔ دیوتا مجھ پر اپنے کرم کا سایہ برقرار رکھیں اور ایک لٹیرا اپنا عہد نبھا سکے۔'' یہ کہہ کر نرسنگا مندر کے صدر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ وہ اکیلا آیا تھا اور تنہا واپس جا رہا تھا۔ مگر کرشن راؤ کے مسلح محافظوں میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ اس پر پشت سے ہی کوئی وار کر سکیں۔

نرسنگا کے جانے کے بعد کرشن راؤ نے شجاع الدین کامران کے سامنے عیارانہ خوشامد کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''چھوٹے ٹھاکر! گزری باتوں کو بھول جا۔ اب میں تیرے راستے کی دیوار نہیں ہوں۔ اگر تجھے دولت کی ضرورت ہے تو میں تیرے قدموں میں سونے چاندی کے ڈھیر لگا دوں گا' لیکن تو میری طرف سے نرسنگا کے دل کو صاف کر دے کہ وہ تیری بات بہت مانتا ہے۔''

''تو نے مجھے غلط سمجھا ٹھاکر!'' کامران کا لہجہ انتہائی تلخ اور نفرت آمیز تھا۔ ''پہلے تو نرسنگا کا حساب چکا دے بعد میں چپ چاپ میرا قرض ادا کر دینا۔ میں تجھ سے مندر کے ایک سنسان گوشے میں اپنا ادھار نہیں مانگوں گا۔ میری طلب کا انداز بہت سخت ہو گا ٹھاکر!'' یہ کہہ کر کامران اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

❊❊❊

وہ دیوداسی شکنتلا سے ملنے کیلئے بہت بے چین تھا۔ پھر جب کامران نے شکنتلا کو دیکھا تو کچھ دیر کیلئے اپنے حواس کھو بیٹھا۔ خوبصورت دیوداسی پہلے ہی مظلومیت کا ایک مجسمہ بن چکی تھی' مگر آج کامران نے اسے دیکھا تو یوں [illegible]

داغوں نے شکنتلا کے نقش و نگار تک بدل کر رکھ دیئے تھے۔

کامران کو اپنی نظروں کے سامنے زندہ دیکھ کر وہ راما راؤ کے مظالم کی داستان کو فراموش کر بیٹھی۔ بس اسے اپنی نامراد زندگی کا آخری باب یاد رہا کہ شجاع الدین کامران موت کے منہ سے واپس آ گیا ہے۔ شکنتلا کچھ دیر تک سکتے کے عالم میں کھڑی رہی۔ پھر دیوانہ وار کامران سے لپٹ گئی اور پھر شدت جذبات سے مغلوب ہو کر بے ہوش ہو گئی۔ شکنتلا کے لئے یہ اچانک خوشی ناقابل برداشت تھی۔ کامران اسے اٹھا کر اپنے کمرے تک لایا اور بڑے کرب و اضطراب کے ساتھ دیوداسی کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنے لگا۔

پھر بہت دیر بعد شکنتلا نے آنکھیں کھولیں اور کامران کو دیکھتے ہی چیخنے لگی۔ ''مجھ سے دور رہو ٹھاکر! اگر ان لوگوں نے تمہیں میرے ساتھ دیکھ لیا تو پھر قیامت ٹوٹ پڑے گی۔''

کامران بڑی مشکل سے اسے یقین دلانے میں کامیاب ہوا کہ حالات بدل چکے ہیں اور اب ٹھاکر کرشن راؤ بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ آہستہ آہستہ شکنتلا کی وحشت زائل ہوئی تو اس نے صورتحال کی سنگینی کو محسوس کیا اور وہ تیزی سے اٹھ کر باہر جانے لگی۔ کامران نے اسے روکنا چاہا مگر شکنتلا ایک مخصوص اشارے کے ساتھ اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

❋❋❋

تھوڑی دیر بعد وہی ہوا جس کا شکنتلا کو اندیشہ تھا۔ ٹھاکر کرشن راؤ نے اسے اپنے کمرے میں طلب کرتے ہوئے کہا۔

''میں نے چھوٹے ٹھاکر کا گناہ بخش دیا ہے اور میں ایک بار پھر اس پر مہربان ہو گیا ہوں۔'' ٹھاکر بڑی بے حسی کے ساتھ جھوٹ بول رہا تھا۔ ''مجبوراً کچھ دن تک تجھی کو ٹھاکر کے کھانے پینے کا اہتمام کرنا ہو گا۔ اس دوران اگر تیری زبان پر راما راؤ کے تشدد کا ذکر آیا تو پھر میری ناراضگی تجھے پہلے سے بھی زیادہ رسوا کر دے گی۔''

''نہیں ٹھاکر! میں تو صرف تیری داسی ہوں۔ راما نے تجھ سے جھوٹ بول کر اس بہانے مجھے برباد کر ڈالا۔ وہ ایک ہوس پرست انسان تھا۔ اس نے اپنے نفس کی خاطر میری ساری عمر کی وفاداریوں کو خاک میں ملا دیا۔'' شکنتلا نے بہت ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے کہا۔

''اس واقعہ کو بھول جا۔ میں نے راما راؤ سے کہہ دیا ہے کہ وہ آئندہ تجھے پریشان نہ کرے۔'' ٹھاکر کرشن راؤ شکنتلا کی بے خبری پر دل ہی دل میں بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ دیوداسی ابھی تک راما راؤ کو زندہ سمجھ رہی تھی۔ ٹھاکر کے دل میں مسرت کی ایک اور تیز لہر اٹھی۔ وہ اپنے آپ کو ایک کامیاب منصوبہ ساز سمجھ رہا تھا۔

❋❋❋

شکنتلا حسب معمول کھانا لے کر آئی۔ کامران نے اس کے چہرے پر ابھرے ہوئے نشانات کا سبب جاننا چاہا تو وہ خاموش بیٹھی رہی اور برتن لے کر واپس چلی گئی۔ کامران حیرت سے اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ نصف شب کے قریب وہ خفیہ راستے سے دوبارہ کامران کے کمرے میں داخل ہوئی۔ آنے سے پہلے شکنتلا نے راہداری میں دور تک گھوم کر اپنے گرد و پیش کا جائزہ لے لیا تھا۔ پھر مطمئن ہو کر وہ کامران کے پاس آئی تھی اور اس سے اس طویل غیر حاضری کا سبب پوچھ رہی تھی۔ کئی بار بے اختیار ہو کر اس نے کامران کے ان زخموں کو بھی چھو لیا تھا جن کے نشانات چہرے پر باقی رہ گئے تھے۔

کامران نے اپنی داستان درد سنائی تو شکنتلا اس قدر وارفتہ ہو گئی کہ بہت دیر تک ہچکیوں سے روتی رہی۔ پھر

جب نرسنگا کی مہربانیوں کا ذکر آیا تو شکنتلا کی حالت غیر ہو گئی اور وہ اپنی زبان پر قابو نہ رکھ سکی۔
''اس نے میرے ٹھاکر کو بچا لیا۔ اب مجھے نرسنگا سے کوئی شکایت نہیں۔''
شکنتلا کی محبت بڑی عجیب محبت تھی۔ ایک لٹیرے نے جب اس کے محبوب کی مسیحائی کی تو وہ اپنا زخم بھول گئی اور اس نے نرسنگا جیسے قاتل کو معاف کر دیا۔ کامران شکنتلا کے الفاظ پر چونک اٹھا۔ جب اس نے دیوداسی سے وضاحت چاہی تو شکنتلا نے برجستہ ایک معقول بہانہ تراشتے ہوئے کہا۔
''نرسنگا نے بے شمار عورتوں کو تباہ کیا ہے اور ایک عورت کی حیثیت سے وہ میرا بھی مجرم ہے مگر جب اس نے تمہاری خاطر کرشن راؤ کے ٹھوکر ماردی تو پھر میں نے بھی اپنا گناہ معاف کر دیا۔''
شجاع الدین کامران لفظوں کے پیچ وخم سے بہل گیا اور بہت غور سے اس عورت کے چہرے کو دیکھنے لگا جو گناہ کے حصار میں رہتے ہوئے بھی نیکی کی تلاش میں بھٹک رہی تھی۔
''مگر تیرے یہ داغ کیسے ہیں شکنتلا کہیں تو مجھ سے کچھ چھپا تو نہیں رہی ہے؟'' یکایک کامران نے چونک کر کہا۔
شکنتلا نے ایک بار پھر ٹالنے کی کوشش کی' مگر جب کامران نے اسے مجبور کر دیا تو پھر وہ رو رو کر ٹھاکر اور راما راؤ کی درندگی کا افسانہ سنانے لگی۔ کامران پر کئی بار وحشت طاری ہوئی' مگر شکنتلا نے اسے ہر مرتبہ اس کا عہد یاد دلایا کہ وہ مشتعل نہیں ہو گا۔ کامران نے بڑے کرب کے عالم میں یہ خوں چکاں حکایت سنی۔ پھر شکنتلا خاموش ہوئی تو وہ دیوانہ وار چیخ اٹھا۔
''اگر چہ میں حالات سے بے خبر تھا شکنتلا' لیکن خدا کا شکر ہے کہ میں نے راما راؤ سے تیری رسوائیوں کا بدلہ لے لیا۔''
راما راؤ کے قتل کی تفصیلات سن کر شکنتلا ایک بار پھر رونے لگی۔ ''ٹھاکر! تو کس کس سے میری موت کا انتقام لے گا۔ یہاں تو سارا شہر ہی میرا قاتل ہے۔''
''مجھے اختیار مل جائے' میں سارے شہر ہی کو پھونک ڈالوں گا۔'' کامران پر وحشت طاری تھی۔ کرشن راؤ کو بھی فی الوقت اس لئے چھوڑے جا رہا ہوں کہ کہیں میرے پیچھے وہ تجھے خودکشی پر مجبور نہ کر دے۔''
''نہیں ٹھاکر! مجھے اس وقت تک موت نہیں آئے گی' جب تک میں ظالموں کی اس جماعت کا انجام اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لوں۔'' شکنتلا نے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ جیسے اس کی نظریں پتھروں کے جگر میں شگاف ڈال کر آسمان تک پہنچنا چاہتی ہوں۔

❊❊❊

سردار نرسنگا شام ہوتے ہی اپنے ڈیڑھ سو ساتھیوں کے ہمراہ بڑے مندر پہنچ گیا۔ یہ تمام لٹیرے سادھوؤں کے بھیس میں تھے' مگر ان کی لمبی عباؤں کے نیچے برہنہ شمشیریں چھپی ہوئی تھیں۔ کامران کے آنے سے پہلے کرشن راؤ نے نرسنگا سے درخواست کی۔
''سردار! میں تجھ سے تنہائی میں چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔'' ٹھاکر کی آواز لرز رہی تھی۔
نرسنگا نے کچھ سوچا اور پجاری رام سروپ کے کمرے میں چلا گیا۔ ٹھاکر نے کانپتے ہاتھوں سے دروازہ بند کیا اور نرسنگا کے پاؤں پکڑ لئے۔
''سردار! میری زندگی اور عزت اب تیرے ہاتھوں میں ہے۔'' کرشن راؤ بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ ''مجھے

دیوتاؤں کا واسطہ میرے بڑھاپے کی لاج رکھ لے۔" یہ کہہ کر ٹھاکر نے کامران کی دھمکی کو پوری رنگ آمیزی کے ساتھ نرسنگا کے گوش گزار کر دیا۔ "تیری شہ نے اسے پاگل بنا دیا ہے۔ وہ یہاں سے نکلتے ہی مجھے مار ڈالنے کی کوشش کرے گا یا پھر سلطان کو میری اسلام دشمن سرگرمیوں کی خبریں پہنچا دے گا۔ پھر سرکاری سطح پر تفتیش ہو گی۔ میرے تمام آدمی گرفتار کر لئے جائیں گے۔ اس طرح ممکن ہے کہ کسی شخص کی زبان لڑکھڑا جائے اور وہ یہ راز فاش کر دے کہ اس تحریک کی سرپرستی سردار نرسنگا کر رہا ہے۔ یہ ہم سب کے لئے بڑا جان لیوا حادثہ ہو گا۔"

کرشن راؤ کی فریاد سن کر نرسنگا کے چہرے پر ایک عجیب سا رنگ آ گیا۔

"اب بھی وقت ہے نرسنگا! بھگوان کیلئے کامران کو باہر جانے سے روک لے۔ میرا کیا ہے؟ میں تو اپنی عمر کاٹ چکا مگر یہ طوفان پورے ہندو دھرم کو لے ڈوبے گا۔ تو اس لڑکے کو نہیں جانتا۔ وہ بڑا منتقم المزاج نوجوان ہے۔ جب اپنے ماموں سے بدلہ لینے کے لئے وہ یہاں تک آ پہنچا تو پھر مجھے کس طرح معاف کرے گا؟ اگر وہ ایک بار مندر سے نکل گیا تو اسے سلطان کے دربار تک جانے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

کرشن راؤ نے اس قدر مضبوط دلیل پیش کی تھی کہ تھوڑی دیر کیلئے نرسنگا کا یقین بھی متزلزل ہو گیا۔ "کیا تو سمجھتا ہے کہ ایسا کرنے کے بعد وہ زندہ رہ سکے گا؟" نرسنگا کے ہونٹوں سے اچانک آگ برسنے لگی تھی۔

"ہم لوگ تو حکومت کی نظروں میں آ چکے ہوں گے۔ پھر اگر اس کے جسم کے ٹکڑے بھی ہو جائیں تو کیا فرق پڑتا ہے۔" کرشن راؤ کی وحشت بدستور قائم تھی اور اس کی نظریں اپنے مستقبل پر بربادی کے گہرے سائے منڈلاتے دیکھ رہی تھیں۔

نرسنگا نے کوئی جواب نہیں دیا' مگر اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ شدید پیچ و تاب میں جلا ہے۔

اتنے میں شجاع الدین کامران بھی پہنچ گیا۔ نرسنگا کو دیکھ کر اس نے غیر معمولی خوشی کا اظہار کیا مگر نرسنگا کے چہرے پر پتھروں جیسی سختی نمایاں تھی۔ کامران نے اس تبدیلی کو فوری طور پر محسوس کرتے ہوئے کہا "سردار! تیری طبیعت تو ٹھیک ہے۔"

نرسنگا نے کامران کے سوال کو یکسر نظر انداز کر دیا اور انتہائی تند و تیز لہجے میں بولا۔ "آج سردار نرسنگا تجھ سے کیا ہوا عہد پورا کر رہا ہے۔ یہ میرے بہترین جاں نثار ہیں جو ہر وقت سائے کی طرح تیرے ساتھ رہیں گے اور تجھے قائم خان کے شر سے بچانے کی بھرپور کوشش کریں گے۔"

"میں جانتا ہوں سردار' آخر تجھے اس وضاحت کی ضرورت کیوں پیش آئی؟" کامران نے حیران ہو کر کہا۔ وہ اپنے قریب کسی خطرے کی آہٹ محسوس کر رہا تھا۔

"تجھے تیرے مقصد میں کامیابی حاصل ہو جائے یا شکست تیرا مقدر بن جائے۔ دونوں صورتوں میں تجھے لوٹ کر میرے پاس آنا ہو گا۔" نرسنگا کا لہجہ کچھ اور سخت ہو گیا تھا۔ "اگر تو نے ٹھاکر کرشن راؤ سے انتقام لینے کیلئے حکومت تک پہنچنے کی کوشش کی تو پھر میرا قہر تجھ پر عجیب انداز میں برسے گا۔ تو میرے جنگل کے اسرار سے بھی واقف ہے اور ٹھاکر کے مندر کے رازوں سے بھی۔ اگر تیری زبان کو لغزش ہوئی تو میں تجھ سے کوئی باز پرس نہیں کروں گا۔ میرے آدمی تیری بوڑھی ماں کی لاش مجھ تک پہنچا دیں گے۔ بدعہدی کی یہ سزا تیرے لئے کافی ہو گی۔"

❋❋❋

سردار نرسنگا کی یہ تنبیہ شجاع الدین کامران کے لئے ناقابل فہم تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ نرسنگا اس سے اس قدر خوفناک لہجے میں بات کرے گا۔

''سردار! مجھے اس کی شکایت نہیں کہ تیری آواز جارحانہ ہے اور چہرے پر دہشت و بربریت کا رنگ نمایاں ہے۔'' کامران نے انتہائی کرب کے ساتھ کہا۔ ''میں جانتا ہوں کہ تو سراپا آگ ہے۔ تیری ذات میں شبنم کی خنکی ڈھونڈنے والے بہت بڑے احمق ہیں۔ مگر مجھے تیری یہ ادا پسند نہیں آئی کہ تو اپنے جاں نثار پر بھی شک کرتا ہے۔ میں نے تیرا یہ روپ آج پہلی بار دیکھا ہے۔''

''اپنے آپ کو دھوکا نہ دے چھوٹے ٹھاکر! تو یہ بات بھی خوب جانتا ہے کہ نرسنگا کسی پر اعتبار نہیں کرتا۔'' سردار کے چہرے اور آواز سے بھی رعونت جھلک رہی تھی۔ ''میری دنیا کے اپنے قانون ہیں۔ میں کسی کے اصول اور ضابطے کا محتاج نہیں۔''

شجاع الدین نے مزید کچھ کہنا چاہا' مگر نرسنگا درمیان ہی میں بول اٹھا۔ ''کامیابی تیرے قدم چومے یا ناکامی تیرا مقدر بن جائے۔ تجھے ہر حال میں لوٹ کر میرے پاس آنا ہے۔ اگر تو واپس نہ آیا تو میں پہلے ہی تیرے لئے دردناک سزا کا انتخاب کر چکا ہوں۔ نرسنگا غداروں کو ایک وار میں ہلاک نہیں کرتا وہ انہیں تڑپا تڑپا کر مارتا ہے۔''

پجاری رام سروپ کے کمرے پر گہرا سکوت طاری تھا۔ کامران کی حالت ناقابل بیان تھی' مگر ٹھاکر کرشن راؤ بہت زیادہ مطمئن نظر آ رہا تھا اور اس کے ہونٹوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔

یکایک سردار نرسنگا پجاری کے کمرے سے نکل آیا۔ اس کی تقلید میں پہلے کرشن راؤ باہر نکلا اور پھر شجاع الدین کامران بھی مندر کے صحن میں آ گیا' جہاں نرسنگا کے ڈیڑھ سو قزاق سادھوؤں کے بھیس میں چپ چاپ کھڑے تھے۔

نرسنگا نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر قسمت کی خرابی کے سبب بازی الٹ جائے اور قائم خان کے آدمی چھوٹے ٹھاکر پر قابو پا لیں تو پھر اسے بے دریغ قتل کر دینا۔'' نرسنگا کا حکم بہت وحشیانہ تھا۔ ''صرف چھوٹے ٹھاکر کی بات نہیں' اگر تم میں سے بھی کوئی نامراد زخمی ہو جائے اور اس کے گرفتار ہو جانے کا اندیشہ ہو تو پھر اس پر لازم ہے کہ وہ اپنی ہی تلوار سے اپنی گردن کاٹ ڈالے۔ نرسنگا یہ بھی پسند نہیں کرتا کہ اس کا کوئی آدمی زنجیر پہن کر سر جھکائے ہوئے سلطان کی عدالت میں حاضر ہو۔''

اس کے بعد نرسنگا نے مڑ کر نہیں دیکھا اور اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ مندر کی حدود سے نکلا اور رات کے اندھیروں میں گم ہو گیا۔

کامران اب تک حیرت و سکوت کے عالم میں اپنی جگہ بے حس و حرکت کھڑا تھا۔

''چلیں چھوٹے ٹھاکر!'' ایک سادھو نما لٹیرے نے آگے بڑھ کر کہا۔ ''دیر ہو رہی ہے۔''

کامران تکلیف دہ خیالات کی دنیا سے نکل آیا اور اسے نرسنگا کی اس بے اعتباری سے شکوہ تھا' مگر صورت حال کامران کے خلاف گواہی دے رہی تھی۔ نرسنگا سے اس کا کوئی رشتہ نہیں تھا۔ نہ مذہب کا رشتہ اور نہ سماج کا رشتہ' ایک امن پسند شہری سے ایک قزاق کا رشتہ ہو بھی نہیں سکتا۔ اس خیال نے کامران کو تسلی دی اور وہ خوابوں کی بستی سے نکل کر حقیقت کے مقتل میں چلا آیا۔ کامران نے پرسکون انداز سے اس قزاق کی طرف دیکھا جو وقت گزرنے کا احساس دلا رہا تھا۔

''چلو!'' اچانک کامران مسکرانے لگا۔ ''میری تلوار کہاں ہے؟'' اس نے اپنے قریب کھڑے ہوئے قزاقوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''شاید میں اسے جنگل ہی میں بھول آیا ہوں۔ مجھے ایک بار پھر وہاں جانا ہوگا۔''

ایک لٹیرے نے اپنی زرد لمبی عبا کے نیچے سے تلوار نکالی اور اسے کامران کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''سردار! معمولی سی معمولی بات کو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔''

کامران نے چونک کر تلوار کو دیکھا۔ یہ نرسنگا کی دی ہوئی وہی تلوار تھی' جس سے اس نے راما راؤ کو قتل کیا تھا۔ شجاع الدین کامران نے خوشی سے تلوار لے لی اور اسے بغور دیکھنے لگا۔

''سردار نے چلتے وقت مجھ سے کہا تھا کہ اس تلوار کو اس وقت تک ٹوٹنا نہیں چاہئے جب تک دشمن خاک میں نہ مل جائے۔''

کامران نے لٹیرے کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ بس اس نے ایک نظر آسمان کی طرف دیکھا' جہاں گہری تاریکی میں بے شمار ستارے جھلملا رہے تھے۔ پھر وہ اپنے گردوپیش کو فراموش کر کے آگے بڑھا۔

''کامران! میرا بہترین مشورہ یہی ہے کہ اس مندر کی حدود سے باہر نہ جا......اور اگر تجھے جانا ہی ہے تو سردار کے ایک ایک حکم کی تعمیل کرنا......نہیں تو دنیا کی کوئی طاقت تیری زندگی کی ضمانت نہیں دے سکتی۔ جوانی کا جوش تجھے ورغلائے تو اپنی ماں کے بڑھاپے کا خیال کرنا۔'' ٹھاکر کرشن راؤ نے بڑی عیاری کے ساتھ سردار نرسنگا کے الفاظ دہرائے تھے۔ وہ چلتے چلتے بھی اسے آزار پہنچانا چاہتا تھا......مگر کامران نے ٹھاکر کی تنبیہ کو اس طرح جھٹلا دیا جیسے کوئی مسافر راستے کی گرد کو جھاڑ کر اپنا لباس صاف دیتا ہے۔

❊❊❊

شہر دہلی کی وہ بڑی عجیب رات تھی۔ سلطان ناصر الدین محمود اپنے مخصوص کمرے میں سجدہ ریز تھا۔ فرش پر ایک عام سی چٹائی بچھی ہوئی تھی اور ہندوستان کا والی کسی مجبور و بے کس انسان کی مانند اپنے خدا کے آگے گڑگڑا رہا تھا۔

''اے مالک ارض و سما! یہ تیرا کرم تھا کہ تو نے اپنے حقیر بندے ناصر الدین کو تاج شاہی سے سرفراز کیا۔ میرے آباؤ اجداد کے پیروں میں زنجیر غلامی تھی' مگر تیری بے مثال رحمت نے رسوائی کے اس لوہے کو پگھلا دیا۔ صحرا کی تپتی ہوئی ریت ہمارا مقدر تھی' مگر تو نے اس خطۂ زمین کو ہمارے زخم خوردہ جسموں کیلئے ریشم و گل کی سیج بنا دیا۔ ہمارے ہاتھ گداگروں کا کشکول تھے' مگر تو نے انہیں اپنی لازوال بخشش و عطا کے صدقے میں اس طرح سیم و زر سے بھر دیا کہ بے شمار خزانے ہماری ملکیت قرار پائے۔ ہمیں توفیق دے کہ ہم تیری نعمتوں کو تیرے بندوں میں پورے انصاف کے ساتھ تقسیم کر سکیں۔'' سلطان ناصر الدین محمود کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ ''اے خدا! تو اس پر قادر ہے کہ جس کے ذریعے چاہے اپنے دین کو سربلند کرے۔ ہم تیرے بہت عاجز و ناتواں بندے ہیں۔ بے شک! ہم اس لائق نہیں کہ امانت کا بارگراں اٹھا سکیں' مگر تو اپنے فضل سے ہمیں اتنی استقامت بخش دے کہ ہم تیرا پیغام بت خانہ ہند کے بعید ترین گوشوں تک پہنچا سکیں اور اے ہمارے رب ہمیں اس حالت میں دنیا سے نہ اٹھا کہ ہم

بد دیانت و خائن کہلائے جائیں اور ہمارا شمار ان لعنت زدہ انسانوں میں ہو جن پر تیرا غضب نازل ہوا۔"

قصر سفید کے دوسرے گوشے میں الغ خان (غیاث الدین بلبن) کی محفل نشاط آراستہ تھی۔ حکمرانی کے منصب پر فائز ہونے سے پہلے الغ خان انتہائی سخت گیر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عیش پرست انسان تھا۔ وہ شراب بھی پیتا تھا' مگر کسی نے اسے کم ظرفوں کے درمیان بیٹھ کر پیتے نہیں دیکھا۔ الغ خان (بلبن) کی مجلس کیف و مستی میں اعلیٰ نسل شرفاء اور خوددار لوگ شریک ہوتے تھے۔ اس رات بھی وہ قصر سفید کے ایک آراستہ کمرے میں اپنے امراء کے ساتھ شراب پی رہا تھا' مگر اس طرح کہ جام سرخ اس کے مضبوط ہاتھوں میں تھا اور ذہن مستقبل کی شاہراہ پر بہت تیزی سے سفر کر رہا تھا۔ وہ مستقبل جو سورج کی طرح روشن و تابناک تھا۔ الغ خان ایک خوش نصیب امیر تھا۔ اس نے اب تک بساط سیاست پر جس قدر چالیں چلی تھیں وہ سب کی سب کامیابی سے ہمکنار ہوئی تھیں۔ اس کے فیصلوں کو کوئی روکنے والا نہیں تھا۔ یہاں تک کہ سلطان ناصر الدین محمود کا اقتدار بھی قصر سفید کے ایک گوشے تک سمٹ کر رہ گیا تھا۔ الغ خان کی دانشمندی یہ تھی کہ سارا ہندوستان ناصر الدین محمود کو فرمانروا سمجھتا تھا' مگر جاننے والے جانتے تھے کہ پس پردہ کس کے احکام پر عملدرآمد ہوتا ہے۔ الغ خان ناصر الدین محمود کے مزاج میں اس قدر دخیل تھا کہ وہ درویش صفت سلطان اپنے وزیر اعظم کی مرضی کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

❊❊❊

دہلی کے ایک نسبتاً سنسان گوشے میں قائم خان راجپوت کی حویلی کسی پہاڑی چٹان کی طرح نظر آ رہی تھی۔

واضح رہے کہ یہ وہ قائم خان نہیں ہے جس کی نسل آج بھی "قائم خانی راجپوتوں" کے نام سے مشہور ہے۔ ایک روایت کے مطابق قائم خانی راجپوتوں کے مورث اعلیٰ زین الدین خان' ظہیر الدین خان اور ضمیر الدین خان اپنے اصلی وطن سے نکل کر راجپوتانہ کے علاقے میں چلے آئے تھے۔ یہاں ان لوگوں نے مذہب اسلام کیلئے قابل ذکر خدمات انجام دیں جن سے متاثر ہو کر اس علاقے کے مسلمان حاکم نے انہیں "قائم خان" کا خطاب دیا اور پھر "قائم خانی راجپوت" ایک مستقل قبیلے کی حیثیت اختیار کر گئے۔ تاہم اس خاندان کے کچھ لوگ اپنے آپ کو "تغلق خانی" اور "ثابت خانی" بھی کہلواتے ہیں۔ سندھ کے کچھ شہروں میں آج بھی یہ بہادر نسل اپنی خاندانی روایات کے ساتھ آباد ہے۔ قائم خانی راجپوت مارواڑی زبان بولتے ہیں۔ سلطان فیروز شاہ تغلق کے آخری زمانے میں راجپوتوں کے اس خاندان نے "قائم خان" کا لقب اختیار کیا۔ تاریخی اعتبار سے وہ لگ بھگ 775 ہجری کا زمانہ ہے۔ ہماری کہانی کا "برا آدمی" قائم خان راجپوت تقریباً 620 ہجری میں پیدا ہوا تھا۔ یہ محض اتفاق ہے کہ تاریخ میں ایک ہی نام کے دو مشہور آدمی نظر آتے ہیں پھر بھی دونوں کے درمیان ڈیڑھ سو سال سے زیادہ کا وقفہ ہے۔

قائم خان نے خوشامد اور ساست سے کامیابی کے کئی مراحل طے کر لئے تھے۔ اسے دربار شاہی میں رسائی حاصل ہو گئی تھی اور وہ بھی دوسرے درجے کے امراء میں شمار ہونے لگا تھا۔ قائم خان کی شدید خواہش تھی کہ وہ کسی نہ کسی طرح الغ خان (بلبن) کی قربت حاصل کر لے۔ اس کی عیار نظریں الغ خان کے چہرے پر مستقبل کے سلطان کا گہرا عکس دیکھ رہی تھیں۔ اس لئے وہ چاہتا تھا کہ جلد از جلد وزیر اعظم کے حلقۂ مصاحبت میں شامل ہو جائے اور پھر نئی حکومت اسے زیادہ سے زیادہ مراعات فراہم کر سکے۔ قائم خان دن رات اپنے اسی خواب کی تعبیر میں سرگرداں رہتا تھا' مگر کبھی کبھی یہ خواہش بھی پوری شدت کے ساتھ ابھرتی تھی کہ اگر یاسمین خانم ایک بیوی کی حیثیت سے الغ خان کے حرم میں داخل ہو جائے تو پھر درپردہ اس کی بیٹی ہندوستان پر حکومت کرے گی اور بیٹی کے حوالے سے وہ خود بھی ہندوستانی مخلوق کی تقدیر پر

اپنے اس منصوبے کی تکمیل کے لئے قائم خان نے یاسمین کی تربیت شروع کر دی تھی۔ وہ اکثر اپنی بیوی کی موجودگی میں بہت رازداری کے ساتھ یاسمین خانم سے کہا کرتا تھا۔

"بیٹی! میں تجھے' رضیہ سلطانہ کی طرح تخت ہندوستان پر جلوہ افروز دیکھنا چاہتا ہوں۔" یہ کہتے کہتے قائم خان کے چہرے پر کئی ناآسودہ جذبوں کا رنگ ابھر آتا تھا۔ رضیہ سلطانہ بھی ایک عورت تھی اور یاسمین خانم بھی ایک عورت ہے۔ قائم خان اپنی بیوی سے مخاطب ہو کر کہتا۔ "پھر میری بیٹی کے سر پر تاج زرنگار کیوں نہیں سجایا جا سکتا؟" اچانک قائم خان رضیہ سلطانہ سے یاسمین خانم کا مقابلہ کرنے لگتا۔ "رضیہ خوبصورت تھی تو میری بیٹی خوبصورت تر ہے' وہ بہترین شہسوار تھی تو یاسمین بھی فنون سپہ گری سے واقف ہے۔ اگر رضیہ کو آداب مجلس سے آگاہی حاصل تھی تو یاسمین بھی ایک تعلیم یافتہ خاتون ہے اور اگر وہ سلطان شمس الدین التمش کی بیٹی تھی تو یاسمین خانم بھی قائم خان کی بیٹی ہے سر بلند اور معزز راجپوتوں کی اولاد۔ رضیہ کا تعلق پھر بھی ایک غلام خاندان سے تھا' مگر یاسمین خانم کے بزرگوں نے کبھی ذلت و رسوائی کا طوق نہیں پہنا۔ اس اعتبار سے میری بیٹی کو رضیہ سلطانہ پر فوقیت حاصل ہے۔"

قائم خان جوش جذبات میں بولتا رہتا۔ یہاں تک کہ اس کی بیوی گھبرا کر درمیان میں مداخلت کرتی۔

"آہستہ بولئے اگر آپ کی یہ باتیں کسی نے سن لیں تو پھر ہماری زندگی حرام ہو جائے گی۔"

قائم خان فوراً ہی سنبھل جاتا اور بدحواس ہو کر کمرے کا جائزہ لینے لگتا کہ کہیں کسی پردے کے پیچھے کوئی شاہی مخبر موجود نہ ہو۔

یاسمین خانم نے اپنے باپ کی اس خواہش کو اتنی بار سنا تھا کہ اب وہ خود بھی نفسیاتی طور پر "ملکہ ہند" بننے کے خواب کے زیر اثر آ گئی تھی۔ اس کے خیالات کی پرواز جو کل تک اپنی حویلی کی اونچی دیواروں تک محدود تھی وہ "قصر سفید" کی بلندیوں سے گزر کر آسمان کی لامحدود وسعتوں میں داخل ہو گئی تھی۔ قائم خان نے یاسمین کی عادتوں کو اسی سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی تھی جو اس وقت دربار شاہی یا امراء کا پسندیدہ معیار تھا۔ یاسمین خانم کو عالم و فاضل استادوں کی نگرانی میں ترکی اور فارسی زبانوں کی تعلیم اس طرح دی گئی تھی کہ ایک ہندوستانی دوشیزہ روانی کے ساتھ ان دلکش اور شیریں زبانوں میں گفتگو کر سکتی تھی۔ اس نے رسم زمانہ کے خلاف صرف رضیہ سلطانہ کی تقلید میں شہسواری اور شمشیر زنی کی تھوڑی بہت تربیت بھی حاصل کی تھی۔ قائم خان اپنی بیٹی کو ہر اعتبار سے ایک مکمل عورت بنانا چاہتا تھا تاکہ الغ خان یاسمین کی شخصیت سے متاثر ہو کر اس کا رشتہ مانگ سکے۔

قائم خان کے ایما پر یاسمین شاہی حرم سرا کی تمام تقریبات میں بہت اہتمام کے ساتھ شریک ہوتی تھی۔ ناصر الدین محمود اور دیگر امراء کے خاندان کی عورتیں اسے پسندیدہ نظروں سے دیکھتیں مگر کسی نے الغ خان (بلبن) کے کان میں یاسمین خانم کے حسن کے قصیدے نہیں پڑھے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ الغ خان فطرتاً اوباش انسان نہیں تھا۔ وہ صرف شراب نوشی کی حد تک ایک مخصوص محفل کیف و نشاط میں شریک ہوتا تھا۔ حسن پرستی اس کے مزاج میں داخل نہیں تھی کہ وہ اول و آخر ایک جانباز سپاہی تھا۔

قائم خان کی کوئی تدبیر بارآور ثابت نہیں ہوئی تھی' مگر وہ پھر بھی اپنے منصوبے کی کامیابی کے سلسلے میں بہت زیادہ پرامید تھا۔ اس دوران یاسمین خانم کیلئے کچھ فوجی افسروں کے رشتے آئے تھے۔ مگر نظام مملکت میں ان لوگوں کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی۔ نتیجتاً قائم خان نے بڑے سلیقے سے انکار کر دیا تھا۔

ایک اقتدار پسند اور خودغرض باپ کی غلط تربیت نے یاسمین خان کی پوری شخصیت ہی کو بدل کر رکھ دیا تھا۔ چہرے کی دلکشی کے احساس اور ملکہ ہند بننے کے فریب کار خوابوں نے اسے اس قدر مغرور بنا دیا تھا کہ مخملیں فرش بھی

یاسمین خانم کے حنا بستہ پیروں میں کانٹوں کی طرح چبھنے لگتا تھا۔ اب وہ اپنے آپ کو زمین کے بجائے کسی دوسری دنیا کی مخلوق سمجھتی تھی۔

اس رات بھی یاسمین خانم اپنے پھولوں کے بستر پر بے چینی کے ساتھ کروٹیں بدل رہی تھی۔ بار بار اس کے خیالوں میں نادر و نایاب ہیروں سے مرصع تاج جگمگانے لگتا اور پھر اچانک ہر طرف گہری تاریکی چھا جاتی۔ ناآسودہ تمناؤں کی خلش اسے بار بار کروٹیں بدلنے پر مجبور کر رہی تھی۔

❋❋❋

اسی رات ایک شکستہ مکان کے دروازے پر ایک بوڑھی عورت راہ گزر پر نظریں جمائے خاموش بیٹھی تھی۔ اسے کسی کے آنے کا انتظار تھا۔ وہ ہر بار راستہ چلنے والوں کے قدموں کی چاپ سن کر چونک اٹھتی۔ اس کے کملائے ہوئے بوڑھے چہرے پر ایک ایسا رنگ ابھر آتا جسے خدا کے سوا دیکھنے والا کوئی نہ تھا۔ جیسے جیسے مسافروں کے قدموں کی آواز قریب ہوتی جاتی اس کے ناتواں جسم میں نئی زندگی کی لہر دوڑنے لگتی اور وہ جوش اضطراب میں اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہنے لگتی۔

''شاید وہ آ گیا ہے۔''

اور پھر جیسے جیسے وہ آواز دور ہوتی جاتی' نظروں کے ساتھ اس کا دل بھی ڈوبنے لگتا اور ایک دبی دبی کراہ اس کے ہونٹوں سے نکل جاتی۔

''اب وہ لوٹ کر نہیں آئے گا اگر اسے واپس آنا ہوتا تو میری آغوش سے اٹھ کر ہی کیوں جاتا؟''

یہ بوڑھی عورت سعدیہ خانم تھی جو شجاع الدین کامران کے جانے کے بعد مسلسل چھ ماہ سے روزانہ رات کو دروازے پر بیٹھی اپنے بیٹے کی واپسی کا انتظار کرتی رہتی تھی۔ کامران سے بچھڑنے کے بعد کسی ایک رات بھی اس کی پلک نہیں جھپکی تھی۔ گھروں میں چراغ جلنے سے فجر کی اذان تک وہ اسی طرح گزرنے والوں کے قدموں کی آوازوں کا شمار کرتی رہتی اور پھر جب دہلی کی فضاؤں میں مؤذن کی صدا گونجنے لگتی تو وہ دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا دیتی۔

''اے خدا! سارا عالم تیری کبریائی پر گواہی دیتا ہے کہ تو سب سے بڑا ہے۔ اپنی اس بڑائی کے صدقے میں مجھ حقیر کے بیٹے کو دنیا کے فتنہ و شر سے محفوظ رکھ۔''

آج کی رات بھی سعدیہ خانم دروازے پر بیٹھی اپنے بیٹے شجاع الدین کامران کا انتظار کر رہی تھی۔

❋❋❋

اور شجاع الدین کامران اپنے ڈیڑھ سو مسلح ساتھیوں کے ہمراہ اس سرنگ کے ذریعے شہر کی حدود میں داخل ہو چکا تھا جس سے گزر کر ٹھاکر کرشن راؤ اور اس کے مخصوص آدمی دہلی کے اندرونی حصے تک پہنچتے تھے۔ یہ سرنگ بڑے مندر کے زمین دوز راستے کو ایک مندر سے ملا دیتی تھی۔ یہ مندر شہر کے وسط میں بنایا گیا تھا۔ کامران کو زندگی بھر اس خفیہ راستے کی خبر نہ ہوتی' مگر کرشن راؤ سردار نرسنگا کی ضد کے آگے مجبور تھا۔ نرسنگا کے ڈیڑھ سو مسلح جاں نثار کھلے راستے سے شہر میں داخل نہیں ہو سکتے تھے۔ اگر وہ ایسا کرتے تو دہلی کے مضافاتی علاقوں کی نگرانی پر متعین سپاہی ان کی راہ کی رکاوٹ بن جاتے اور پھر نرسنگا کا منصوبہ درہم برہم ہو جاتا' بلکہ ایک یہ اندیشہ بھی لاحق تھا کہ اگر شاہی جاسوس مصنوعی سادھوؤں سے باز پرس کرتے یا ان کی تلاشی لے لیتے تو بیک وقت کئی ہنگامے کھڑے ہو جاتے۔ نرسنگا نے کرشن راؤ کو مجبور کیا کہ وہ اس کے آدمیوں کو اپنی مخصوص سرنگ سے شہر تک جانے دے۔ ٹھاکر خون کے گھونٹ پی کر

چھوٹے مندر میں داخل ہو گیا۔

پھر جب اس نے مندر سے نکل کر اندازہ کر لیا کہ شہر کے لوگ سو چکے ہیں تو وہ قزاقوں کی ایک بڑی جماعت کے ساتھ قائم خان کے مکان کی طرف روانہ ہو گیا۔ دہلی کے اندرونی علاقوں میں حفاظتی انتظامات کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ لوگ اپنے گھروں کے دروازے کھول کر بھی سو جاتے تو انہیں لٹ جانے کا خطرہ نہ ہوتا کہ ہر طرف قانون کی بالادستی تھی۔ میواتی لٹیروں کے شورش کے سبب صرف مضافاتی علاقوں میں امن و امان کا مسئلہ پیدا ہو گیا تھا ورنہ دہلی کے ایک ایک گوشے پر سکون و عافیت کی حکمرانی تھی۔ پھر بھی احتیاط کے طور پر یہ طے کر لیا گیا تھا کہ اگر راستے میں قانون کے کسی محافظ سے آمنا سامنا ہو گیا تو سارے قزاق ایک ہی زبان میں یہ نعرہ بلند کریں گے کہ آج کی رات ہندو مذہب کے مطابق ایک مقدس رات ہے اور وہ لوگ پوجا کیلئے دوسرے مندر کی طرف جا رہے ہیں۔ یہ مندر نسبتاً سب سے چھوٹا مندر تھا' جو قائم خان کے مکان سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر تعمیر کیا گیا تھا۔ اس احتیاطی تدبیر کے ساتھ کسی شخص کو بھی سادھوؤں کی ایک محترم جماعت پر شک نہ ہوتا۔

تمام قزاق اپنے دیوی دیوتاؤں کے ناموں کا جاپ کرتے ہوئے نہایت اطمینان کے ساتھ شجاع الدین کامران کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ قائم خان کا مکان قدرے سنسان علاقے میں تھا۔ اس لئے نصب شب کے وقت فضا پر گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔

قائم خان کی حویلی تک پہنچنے سے پہلے کامران کا گھر راستے میں پڑتا تھا۔ جب کامران اپنے کھنڈر کے قریب آیا تو غیر ارادی طور پر اس کے مضطرب قدم ٹھہر گئے۔ اس نے رک کر دروازے کی طرف دیکھا جہاں ایک غیر متحرک سایہ موجود تھا۔ چراغ کی بہت دھندلی روشنی میں اس نے سائے کو پہچاننے کی کوشش کی۔ وہ اس کی بوڑھی ماں سعدیہ خانم تھی' جو دروازے کی دیوار سے سر لگائے بیٹھی ہوئی تھی۔ کامران کا دل بے اختیار چاہا کہ وہ دوڑ کر ماں کے قدموں سے لپٹ جائے اور رو رو کر اپنے گناہوں کی معافی طلب کرے' مگر وہ دوڑ نہیں سکتا تھا کہ اس کے پیروں میں نرسنگا کے قاتلانہ حکم کی زنجیر تھی۔

''چھوٹے ٹھاکر! کیا بات ہے؟'' ایک قزاق نے سرگوشی میں کامران سے کہا۔ ''کیا کوئی خطرہ ہے؟''

''نہیں!'' کامران نے آہستہ سے کہا اور آگے بڑھ گیا۔ خطرہ کسی لٹیرے کو نہیں' خود اس کی زندگی کو لاحق تھا۔

❀❀❀

پھر وہ منزل بھی آ گئی جہاں تک پہنچنے کیلئے کامران نے اپنے بدترین دشمنوں کے آگے ہاتھ پھیلا دیئے تھے۔ قائم خان کی حویلی اس کی نظروں کے سامنے تھی۔ وہ حویلی جہاں یاسمین خانم کے ساتھ اس کا معصوم بچپن گزرا تھا۔ کامران کو کئی کہانیاں یاد سی آ کے رہ گئیں' مگر اس نے کچھ دیر کیلئے ہر نقش کو کھرچ ڈالا۔ وہ بظاہر کوچہ جاناں میں کھڑا تھا' مگر محبوب کی اسی گلی میں اس کی قبر بھی بن سکتی تھی۔

''یہی ہے میرے ماموں قائم خان کی حویلی۔'' کامران نے رک کر اپنے ایک ساتھی سے کہا۔

تمام لٹیرے سنبھل گئے اور پھر آہستہ آہستہ قزاقوں نے پوری حویلی کو محاصرے میں لے لیا۔

کامران نے آگے بڑھ کر بلند و بالا آہنی دروازے پر دستک دی۔ پچاس ساٹھ سادھو اس کے قریب موجود تھے۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور ایک دراز قامت راجپوت محافظ باہر آیا۔ اس نے پہلے شجاع الدین کامران کی طرف دیکھا جو سیاہ دستار اور سیاہ کپڑوں میں ملبوس تھا۔

''نوجوان! تو کون ہے اور آدھی رات کے وقت یہاں کیوں آیا ہے؟'' راجپوت محافظ نے تند و تیز لہجے میں

پوچھا۔
کامران نے اپنے ساتھیوں کی طرف اشارہ کیا۔ راجپوت محافظ نے دروازے کے سامنے انگنت سائے دیکھے وہ صورت حال کو سمجھنے سے قاصر تھا کہ ایک لٹیرے نے اونچی آواز میں کہا۔
''ہم سادھوسنت ہیں اور تیرے آقا سے ملنے آئے ہیں۔''
''وہ اس وقت کسی سے نہیں ملتے۔'' قائم خان کے محافظ کی آواز سے شدید غصے کا اظہار ہو رہا تھا۔
''ہم مندر کی تعمیر کیلئے دان لینے آئے ہیں۔'' دوسرے لٹیرے نے کہا۔
''دن کے اجالے میں آنا۔'' ابھی محافظ کی بات مکمل ہونے نہیں پائی تھی کہ ایک لٹیرے کے ہاتھ کو جنبش ہوئی اور محافظ کی گردن پر ریشمی پھندا پڑ گیا۔ دوسرے ہی لمحے قائم خان کا محافظ زمین پر پڑا تھا۔ اس نے چیخنے کی کوشش کی' مگر دوسرے قزاق نے آگے بڑھ کر اس کی گردن پر پاؤں رکھ دیا۔ اب وہ ایک بے دست و پا انسان تھا' جو اپنی مرضی سے حرکت کر سکتا تھا اور نہ چیخ سکتا تھا۔ چند قزاقوں نے اسے اٹھا کر حویلی کے اندر ایک گوشے میں ڈال دیا اور ایک لٹیرا اپنی شمشیر بے نیام کے ساتھ پہرہ دینے لگا۔
باقی قزاق شجاع الدین کامران کی رہنمائی میں آگے بڑھے۔ اس وقت حویلی میں دس مسلح محافظ موجود تھے۔ ان لوگوں نے اجنبیوں کی ایک فوج کو آتے دیکھا تو چیختے ہوئے آگے بڑھے۔ نرسنگا کے آدمی کمند ڈالنے میں ایک خاص مہارت رکھتے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے قائم خان کے تمام محافظ ریشمی پھندوں کا شکار ہو گئے۔ ان کی چیخیں سن کر یاسمین خان' اس کی ماں اور قائم خان بیدار ہو گئے تھے۔ ابھی وہ صورت حال کو سمجھنے بھی نہیں پائے تھے کہ شجاع الدین کامران تنہا قائم خان کے کمرے کی طرف بڑھا۔ اس نے اپنے قزاق ساتھیوں کو باہر رک جانے کا حکم دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ یہ جنگلی لٹیرے پردہ دار خواتین کا تماشا دیکھیں۔
قائم خان شراب کا عادی تھا۔ اس رات بھی معمول کے مطابق وہ شراب پی کر سویا تھا۔ مسلسل شور کی آوازیں سن کر وہ بستر سے تو اتر آیا تھا' مگر نشے کے باعث فرش پر کھڑا ہوا ادھر ادھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا اور یاسمین کی ماں چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی۔
''باہر نکل کر دیکھئے کہ حویلی کے صحن میں یہ کیسا ہنگامہ برپا ہے؟ کچھ دیر پہلے تمام محافظ چیخ چیخ کر خبردار کر رہے تھے کہ ہمارے محل میں ڈاکو داخل ہو گئے ہیں۔ اب محافظوں کی آوازیں بھی سنائی نہیں دے رہی ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ لٹیروں نے انہیں قتل کر دیا ہو۔'' یاسمین خانم اور اس کی ماں کے چہرے پر موت کی زردی چھائی جا رہی تھی۔
اس بھیانک انکشاف کے بعد قائم خان کا سارا نشہ زائل ہو گیا تھا۔ وہ سہمی ہوئی آواز میں اپنی بیوی سے کہنے لگا۔
''تم ایسی تباہ کن حالت میں مجھ سے باہر جانے کیلئے کہہ رہی ہو؟ فوراً دروازہ بند کر دو اور تہہ خانے میں چلی جاؤ کہ اب وہی ہمارے لئے محفوظ ترین پناہ گاہ ہے۔''
یاسمین کی ماں دروازہ بند کرنے کیلئے تیزی سے پلٹی۔ شجاع الدین کامران دروازے کی اوٹ میں کھڑا تھا اور اندر ہونے والی گفتگو کا ایک ایک لفظ سن رہا تھا۔ قائم خان کی بیوی ابھی کمرے کے وسط میں تھی کہ کامران دروازے پر نمودار ہوا۔
سیاہ کپڑوں میں ملبوس ایک شمشیر بکف نوجوان کو دیکھ کر یاسمین خانم اور اس کی ماں دہشت سے چیخنے لگیں۔
''یاسمین! یہ میں ہوں شجاع الدین کامران!'' آنے والے نے ایک عجیب سے لہجے میں کہا۔ ''اس میں کوئی

شک نہیں کہ حویلی کے تمام محافظوں کو بے دست و پا کیا جا چکا ہے اور باہر قزاقوں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے' مگر وہ سب کے سب لٹیرے میرے حکم کے پابند ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی اندر داخل ہونے کی جرأت نہیں کر سکتا۔" یہ کہہ کر کامران اپنے ماموں قائم خان کی طرف بڑھا۔ "آج رات کوئی دروازہ بند نہیں ہو سکتا قائم خان۔" کامران کے لہجے میں نفرتوں کی بھڑکتی ہوئی آگ تھی۔ "اگر تیرے اور میرے درمیان سات آہنی دروازے بھی حائل ہو جائیں تو میری ایک ہی ٹھوکر انہیں ریزہ ریزہ کر ڈالے گی۔ آج کی رات صرف اس لئے آئی ہے کہ اگر میں فولاد کو بھی چھولوں تو وہ میرے بدن کی حرارت سے پگھل کر پانی ہو جائے۔"

یاسمین خانم تو شدید حیرت کے عالم میں کامران کو دیکھے جا رہی تھی' مگر اس کی ماں سنبھل چکی تھی۔ "آخر تو یہاں کس لئے آیا ہے نامراد؟" یاسمین کی ماں کا لہجہ بڑا تحقیر آمیز تھا۔ شرفاء کے گھر میں داخل ہونے کا یہ طریقہ ہے؟"

"یہ بات قائم خان سے پوچھو کہ شرافت کے قبیلے سے کس کا رشتہ ہے اور ذلالت و کمینگی کے خاندان سے کون تعلق رکھتا ہے؟" کامران نے یاسمین کی ماں کی طرف دیکھے بغیر کہا اور آہستہ آہستہ قائم خان کے قریب پہنچ گیا۔

یاسمین کی بدمزاج ماں بڑے قہرناک انداز میں کامران پر جھپٹی۔ "بے غیرت! تجھے یہ ہمت کیسے ہوئی کہ ہماری اجازت کے بغیر حویلی میں داخل ہوا؟"

"آج کی رات' اجازت طلبی کی رات نہیں۔" کامران نے یاسمین کی ماں کو اپنے آپ سے الگ کرتے ہوئے کہا۔ "آج کی رات اونچی دیواروں کو مسمار کر کے گزر جانے کی رات ہے اور آپ یہ بات بھی اچھی طرح سن لیں۔" کامران نے اپنی ممانی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "آج کی رات ان زبانوں کو کاٹ کر پھینک دینے کی بھی رات ہے جو دولت و اقتدار کے نشے میں انسانی رشتوں کا احترام نہیں کرتیں۔"

"ہم سے تیرا کوئی رشتہ نہیں۔" یاسمین کی ماں ہذیانی انداز میں چیخی۔

"براہ کرم آپ اپنے کمرے میں تشریف لے جائیں۔" کامران نے اس سنگدل عورت کی بے ہودگیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا' جو بچپن سے لے کر آج تک اسے خون کے آنسو رلاتی رہی تھی۔ "میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ اگر آپ نے میرے مشورے پر عمل نہیں کیا تو اس حویلی کا ایک ایک گوشہ ان سفاک انسانوں سے بھرا ہوا ہے جو صرف موت کا کاروبار کرتے ہیں۔ انہیں میری ایک آواز کا انتظار ہے پھر آپ کا یہ عالی شان محل بھی ان ستمگروں کے وجود سے بھر جائے گا جو تشدد کے سوا کوئی دوسری زبان نہیں جانتے۔"

یاسمین خانم کی ماں سہم گئی۔

"جن نگہبانوں کی تلواروں پر آپ کو ناز تھا وہ ٹوٹ چکیں۔" کامران نے ایک بار پھر اپنی ممانی کو مخاطب کیا۔ "میں نہیں چاہتا کہ وقت کے تقاضوں سے مجبور ہو کر اپنے آدمیوں کو اس کمرے میں طلب کر لوں۔ بے شک! آپ نے مجھ سے تمام رشتے توڑ دیئے مگر آپ پھر بھی میرے خاندان کی آبرو ہیں' میں پسند نہیں کرتا کہ میری آبرو نامحرم مردوں کی نگاہوں کا ہدف بن جائے۔ اس لئے آپ خاموشی سے اپنے کمرے میں چلی جائیں۔ مجھے آپ کے شوہر سے اپنے ماضی کا حساب کرنا ہے۔"

"کیسا حساب؟" اس بار یاسمین خوف زدہ لہجے میں بولی۔

"ان دو سالوں کا حساب جو میں نے ایک مجرم کی حیثیت سے قید خانے میں گزارے۔" کامران نے یاسمین کی وجہ سے قصداً دھیمے لہجے میں کہا۔

"تمہاری سزا کا میرے باپ سے کیا تعلق ہے؟" یاسمین کی آواز اب بھی لرز رہی تھی۔

''میرا مقدمہ تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا۔'' کامران نے ایک نظر یاسمین خانم کو دیکھا اور پھر نگاہیں چراتے ہوئے بولا۔ ''میں تمہیں بعد میں سب کچھ سمجھا دوں گا۔''

''اگر ان کی طرف سے تمہارا کوئی حساب باقی تھا تو پھر اس طرح یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی؟'' یاسمین نے کامران کو لاجواب کرنے کی کوشش کی۔

''جب انسان پر اخلاق اور نیکی کے تمام راستے بند کر دیئے جاتے ہیں تو پھر وہ بدی کے چور دروازوں سے داخل ہو جاتا ہے۔ میرے ساتھ ان بڑے لوگوں نے یہی سلوک روا رکھا تھا۔ تمہارے معصوم اور گہرے خوابوں کو کیا پتا کہ یہاں کیا قیامت گزر گئی اور کوئی آوارہ شب کتنی راتوں سے جاگ رہا ہے؟ ابھی تم کچھ نہیں سمجھ سکو گی۔ اگر وقت نے کسی جگہ بیٹھنے دیا تو اپنا فسانہ خونچکاں سناؤں گا۔ فی الحال تم مطمئن رہو کہ قائم خان میرے ماموں بھی ہیں اور تمہارے باپ بھی۔ ویسے یہ میری عادت نہیں کہ کسی ناکردہ گناہ کو آزار پہنچاؤں۔ میری حساب طلبی کا طریقہ زیادہ جارحانہ نہیں ہوتا۔ میں اپنے اکثر زخموں کو فراموش کر دیتا ہوں' مگر ایک زخم ایسا ہے جس نے مجھے نہیں' میرے قبر میں سوئے ہوئے باپ کو دوبارہ قتل کر ڈالا ہے۔ آج میں اسی زخم کا حساب طلب کرنے آیا ہوں۔''

یاسمین خانم کچھ اور کہنا چاہتی تھی مگر قائم خان نے لرزتی ہوئی آواز میں اپنی بیٹی اور بیوی کو ہدایت کی۔ ''تم دونوں اپنے اپنے کمروں میں چلی جاؤ۔''

پھر جب قائم خان تنہا رہ گیا تو شجاع الدین کامران نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''ایک سادے کاغذ پر یہ تحریر لکھ دو کہ رائے نعیم الدین ذیشان کا بیٹا شجاع الدین کامران بے قصور ہے۔ اس سے کبھی چوری جیسا قبیح فعل سرزد نہیں ہوا۔ میں نے قاضی عماد کی سازش سے ایک جھوٹا مقدمہ ترتیب دیا اور پھر ایک بے گناہ نوجوان کو قید خانے کے اندھیروں میں پہنچا دیا۔ آخر میں اپنی مہر ثبت کر دو تاکہ سرکاری عدالت کو مزید کسی ثبوت کی ضرورت محسوس نہ ہو۔''

قائم خان پاگلوں کی طرح کامران کو دیکھنے لگا۔ ''یہ کیسے ممکن ہے میرے بچے!'' اچانک قائم خان کا لہجہ بدل گیا تھا مگر اس کی آواز میں غیر معمولی لکنت تھی۔ ''تجھے کسی نے میرے خلاف ورغلایا ہے ورنہ میں اس قدر رکیک حرکت کس طرح کر سکتا ہوں؟ آخر تو میری بیوہ بہن کی نشانی ہے۔ مرحوم بہنوئی کی یادگار ہے۔ وہ بہنوئی جو ایک غیرت مند اور بہادر انسان تھا۔'' قائم خان نے ہوا کا رخ پہچانتے ہی رائے نعیم الدین ذیشان کی تعریفیں کر دی تھیں۔ یہ ایک جذباتی حربہ تھا' جسکے ذریعے وہ کامران کے اشتعال کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ ''خدا سے ڈر میرے بیٹے خدا سے ڈر! آخر تیرے دل میں یہ خیال ہی کیوں پیدا ہوا؟ تو نے مجھے بڑا آزار پہنچایا ہے کامران! کیا میں اتنی پستی میں بھی گر سکتا ہوں؟'' قائم خان بڑے منافقانہ لہجے میں فریاد کر رہا تھا۔

''تجھے خدا سے ڈرنا چاہئے قائم خان!'' کامران نے بھی مجبوراً ماموں کے احترام کو بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ ''مگر تیری اس بدنصیبی کو کیا کہا جائے کہ اب خدا سے ڈرنے کا وقت بھی گزر گیا۔ تیرے لئے توبہ کے سارے دروازے بند ہو چکے ہیں بس ایک دروازہ کھلا ہے کہ تو اپنے جرم کا اعتراف کر لے۔ شاید یہی اعتراف تیرے گناہ کا کفارہ بن جائے۔''

قائم خان کی عیار عقل نے بڑی کروٹیں بدلیں' بڑے حیلے تراشے مگر کامران نے اپنی بے گناہی کا اقرار نامہ لکھنے پر مجبور کر دیا۔ پھر جب قائم خان کاغذ پر اپنی انگوٹھی کی مہر ثبت کر رہا تھا اس کے ہاتھ کسی رعشے کے مریض کی طرح کانپ رہے تھے۔

''اب تجھے میرے ساتھ چلنا ہوگا۔'' کامران نے دستخط شدہ کاغذ کو اپنے پیرہن کی جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔
''تو مجھے کہاں لے جائے گا۔'' قائم خان کی آواز ڈوبنے لگی تھی۔
''اس عورت کے پاس جسے تو نے ناقابل شمار اذیتیں پہنچائی ہیں۔'' کامران کا لہجہ آگ برسا رہا تھا۔ ''وہ عورت جو تیری بیوہ بہن ہے اور جس نے غیروں کی مزدوریاں کر کے اپنے شب و روز بسر کئے ہیں۔ تجھے اس عورت سے بھی اپنے جرائم کی معافی مانگنا ہوگی جس نے کبھی اپنے حقوق کیلئے آواز بلند نہیں کی۔ جب تک وہ عورت تجھے معاف نہیں کر دے گی اس وقت تک تیرے لئے اس زمین پر کوئی پناہ نہیں ہوگی۔''

❊❊❊

قائم خان کامران کے اس مطالبے پر پہلے تو حیران رہ گیا' پھر اس کی آنکھوں میں خوف و دہشت کے سائے لرزنے لگے۔

''میں سعدیہ کے سامنے نہیں جاؤں گا۔'' قائم خان کے لہجے میں بے کسی کی جھلک بھی تھی اور احتجاج کا عکس بھی۔

''نہیں قائم خان! آج کی رات صرف میری رات ہے۔'' کامران کے گھٹے ہوئے جذبات ہر قید سے آزاد ہو گئے تھے۔ ''آج تو میرے ہاتھوں کا کھلونا ہے۔ آج جو میں چاہوں گا' وہی ہوگا۔ ممکن ہے کل صبح نکلنے والا سورج تجھے دوبارہ بااختیار بنا دے' مگر اس وقت میں اندھیروں کا حکمران ہوں بلاتاخیر میری خواہش کے آگے سر جھکا دے ورنہ ہوسکتا ہے کہ میرے دل و دماغ پر بھی سیاہی چھا جائے اور میں اپنے خاندان کی ایک ایک روایت کو پامال کر ڈالوں۔'' شجاع الدین کامران کا انداز گفتگو بڑا وحشیانہ تھا۔

قائم خان سہم گیا۔ اسے کامران کی پتلیوں میں دیوانگی رقص کرتی نظر آرہی تھی۔

پھر جب کامران' قائم خان کو ایک مجبور قیدی کی طرح کمرے سے باہر لے جانے لگا تو یاسمین خانم اور اس کی ماں چیختی ہوئی سامنے آگئیں۔

''نامراد! تو اپنے حقیقی ماموں کے ساتھ یہ کیسا سلوک کر رہا ہے؟'' قائم خان کی بیوی اس قدر سنگین فضا میں بھی اپنی زبان پر قابو نہ رکھ سکی اور کامران کیلئے اس کے ہونٹوں سے نفرت و حقارت کا زہر ٹپکنے لگا۔

''میں عورتوں سے بدکلامی کر کے اپنی نسل کو رسوا کرنا نہیں چاہتا۔'' کامران کا لہجہ بظاہر بہت مہذبانہ تھا مگر پھر بھی اس میں شدید حقارت پوشیدہ تھی۔

''کامران! یہ سب کچھ کیا ہے؟'' یاسمین خانم بھی خاموش نہ رہ سکی۔ ''تم نے تو مجھ سے کہا تھا کہ بابا جان کو کوئی ضرر نہیں پہنچے گا۔''

''اس شخص کے جرائم ناقابل شمار ہیں یاسمین! مگر میں نے صرف تمہاری خاطر اس داستان ستم کے سارے اوراق نوچ ڈالے جسے قائم خان کی بے رحم انگلیوں نے میرے خون سے تحریر کیا ہے۔ پھر بھی اذیتوں سے بھرا ہوا ایک باب باقی رہ گیا ہے۔ میں اس باب کو بند کرنے کا اختیار نہیں رکھتا۔''

کامران کی آواز بہت شکستہ ہو رہی تھی۔ ''غور سے دیکھ لو کہ اس کے بدن پر ہلکی سی خراش بھی نہیں۔ یہ اسی حال میں کچھ دیر بعد واپس لوٹ آئے گا۔ تمہیں میری بات پر اعتبار کرنا چاہیے۔''

یاسمین خانم کی ماں نے ایک بار پھر چیخنے کی کوشش کی' مگر کامران کے درشت لہجے نے اسے خاموش کر دیا۔

''میرے آدمی باہر موجود ہیں۔ ایسی کوئی حماقت نہ کر بیٹھنا کہ وہ ایک عورت کو روکنے کیلئے تشدد پر اتر آئیں۔''

کامران نے جابرانہ حکم کے انداز میں کہا اور قائم خان کو لے کر باہر نکل گیا۔

***

وہ لمحے بڑے جانگداز تھے' جب سعدیہ خانم نے بیٹے کو نظروں کے سامنے پایا کچھ دیر کیلئے بوڑھی ماں کو اپنی نبض رکتی سی محسوس ہونے لگی' آنکھیں پتھرا سی گئیں اور ہونٹ کانپ کر رہ گئے۔

پھر ایک لڑکھڑاتی ہوئی' نیم جاں سی آواز ابھری۔ "یہ تو ہے کامران؟" مسلسل چھ ماہ سے آتشیں فراق میں جلنے والی ماں کی زبان سے چند الفاظ کیا ادا ہوئے کہ سارے عالم کی فضا غموں کے دھویں سے بھر گئی۔

"ہاں! مادر گرامی! یہ میں ہوں' آپ کا بیٹا شجاع الدین کامران!"

"تو مجھے چھوڑ کر کہاں چلا گیا تھا بیٹے؟" سعدیہ خانم نے اپنے لرزتے ہوئے بازوؤں کو پھیلا دیا۔

کامران چند قدم آگے بڑھا اور اس آغوش محبت میں سما گیا جو اس زمین پر بے قرار جذبوں کیلئے سب سے زیادہ مضبوط سائبان ہے اور جس کا کوئی دوسرا نعم البدل موجود نہیں۔

"میں اپنے بزرگوں کی عظمت گمشدہ کو ڈھونڈنے گیا تھا۔" شجاع الدین کامران ماں کے سینے پر سر رکھ کر رونے لگا۔ "میرے بزرگوں کی وہ عظمت جس کے بارے میں کہا جاتا تھا' کہ میں نے اسے کھو دیا۔"

"نہیں میرے بیٹے!" سعدیہ خانم اچانک خوشی کے سیلاب سے گزری تو اس کے قدموں کا توازن برقرار نہ رہ سکا۔ کامران نے ماں کو لڑکھڑاتے دیکھا تو سہارا دے کر فرش پر بٹھا دیا اور خود بھی اس طرح جھک گیا کہ پورے جسم کا بوجھ اس کے دونوں گھٹنوں پر تھا۔

"میں نے تو کبھی نہیں کہا کہ تو اپنے بزرگوں کے عزت وجلال کو خاک میں ملا دینے والا ہے۔" سعدیہ خانم کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔

"ایک آپ کے نہ کہنے سے کیا ہوتا ہے مادر محترم!" کامران بہت زیادہ جذباتی نظر آ رہا تھا۔ میں نے دہلی کی گلیوں میں بکھری ہوئی خاک کے ذروں کی چیخیں سنی ہیں۔ وہ بے جان سنگریزے پکار پکار کر کہا کرتے تھے کہ میں ایک چور ہوں اور میں نے رائے نعیم الدین ذیشان کی دستار کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے انہیں شاہراہ عام پر ڈال دیا ہے کہ لوگ ادھر آئیں اور میرے آباؤ اجداد کی فضیلت کو روندتے ہوئے گزر جائیں۔"

سعدیہ خانم نے اپنے بیٹے کی بات کا جواب دینے کے بجائے اپنے سامنے کی طرف چونک کر دیکھا۔ قائم خان سر جھکائے کھڑا تھا۔ "یہ کون ہے کامران؟" سعدیہ خانم نے پوچھا۔ "یہ میرا دوست ہے کمال الدین احمد؟"

"میں تو اپنی خوشی کے ہنگامے میں اسے بھول ہی گئی تھی۔ بڑی محبت کرنے والا لڑکا ہے۔ خدا اس کی عمر دراز کرے۔" اندھیرا ہونے کے سبب سعدیہ خانم اپنے بڑے بھائی کو نہیں پہچان سکی تھی۔

"یہ میرا دوست کمال الدین احمد نہیں' آپ کے محترم بھائی قائم خان راجپوت ہیں۔" کامران نے انتہائی تحقیر آمیز لہجے میں کہا۔

"بھائی صاحب؟" سعدیہ خانم کھڑی ہو گئی۔ "یہ یہاں کس لئے آئے ہیں؟"

"اپنے گناہوں کی معافی مانگنے۔" شجاع الدین کامران نے ماموں کی شخصیت کو مزید روشن کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے اس انقلاب پر اعتبار نہیں آئے گا بیٹے!" سعدیہ خانم نے منہ پھیرتے ہوئے کہا۔ "ابھی تو یہ نیلا آسمان اپنے نادیدہ ستونوں پر کھڑا ہے اور زمین اسی انداز سے اپنے محور پر گھوم رہی ہے' پھر قائم خان کو کیا مجبوری تھی کہ وہ بیوہ بہن کے دروازے پر چلے آئے۔ ابھی تو نظام ارض وسماں زیر وزبر نہیں ہوا ہے' اور ابھی قبروں نے اپنے مردے بھی

نہیں اگلے ہیں...... اور ابھی انسانوں کے ہاتھوں میں ان کے اعمال نامے بھی نہیں دیئے گئے ہیں۔ پھر قائم خان پر ایسی کیا افتاد پڑی ہے کہ انہیں اپنے گناہوں کا احساس ہونے لگا ہے۔ کامران! انہیں رخصت کردے اور صاف صاف کہہ دے کہ اس دنیا میں میرا کوئی گنہگار نہیں ہے۔'' یہ کہہ کر سعدیہ خانم گھر کے اندر چلی گئی۔

''اب مجھے جانے دے بیٹے!'' قائم خان بھکاریوں کی طرح گڑگڑایا۔ ''تیری ماں میری صورت دیکھنے کی بھی روادار نہیں' پھر میں کس سے اپنے گناہوں کی معافی مانگوں؟'' قائم خان نے بڑی عیاری کے ساتھ ایک نیا بہانہ تراشا۔

''اندر چل! بات ابھی ختم نہیں ہوئی۔'' اب کامران کا لہجہ مکمل طور پر گستاخانہ ہوگیا تھا۔ ''اپنی فطرتی کمینگی کو میری ماں کی اعلیٰ ظرفی کے سائے میں چھپانے کی کوشش نہ کر کہ آج کی رات تجھ پر بہت بھاری ہے۔'' کامران نے اپنی شمشیر قائم خان کی پشت پر رکھ دی۔

قائم خان سر جھکائے اندر داخل ہوگیا۔

سعدیہ خانم نے چراغ کی روشنی میں دیکھا کہ اس کا بیٹا شمشیر بکف تھا اور اس کا مجرم بھائی چہرے کی اڑی ہوئی رنگت کے ساتھ کھڑا لرز رہا تھا۔

''یہ سب کچھ کیا ہے بیٹے؟'' سعدیہ خانم نے گھبرا کر پوچھا۔

''یہ میری شمشیر ہے مادر گرامی!'' شجاع الدین نے بے نیاز تلوار کو لہراتے ہوئے کہا۔ ''یہ اسی شمشیر کی آب و تاب ہے جس نے قائم خان کو یہاں تک آنے پر مجبور کردیا ہے۔''

''بیٹے! اس تلوار کو پھینک دے۔'' سعدیہ خانم وحشت زدہ سی نظر آنے لگی تھی۔ ''مجھے اس سے بہت ڈر لگتا ہے۔'' چند لمحوں کیلئے سعدیہ خانم کے تصورات میں وہ اذیت ناک منظر ابھرا جب کامران کا باپ ایک دن اپنے ہی خون میں نہا گیا تھا۔ یہی وہ نفسیاتی کمزوری تھی جس کے زیر اثر سعدیہ خانم تلوار کے نام سے بھی ڈرتی تھی۔ آج جب اس کے بیٹے کے ہاتھ میں شمشیر آبدار دیکھی تو ایک بار پھر اس پر وحشت کا غلبہ ہوگیا۔

''میں جانتا ہوں ماں کہ آپ میرے ہاتھ میں قلم دیکھنا چاہتی تھیں مگر میں اسے پسند نہیں کرتا۔'' کامران کا لہجہ تلخیوں سے بھرا ہوا تھا۔

''ایسا مت سوچ بیٹے کہ قلم آخر قلم ہے۔ ابھی تجھے اس کی طاقت کا اندازہ نہیں۔'' سعدیہ خانم نے بیٹے کی سرکشی کو زائل کرنے کیلئے بہت نرم لہجہ اختیار کیا۔ اسے خدشہ تھا کہ تند خو کامران کہیں اس کے کسی لفظ سے ناراض ہو کر واپس نہ لوٹ جائے اور پھر وہ کھنڈر کے دروازے پر بیٹھ کر جدائی کی آگ میں جلنے لگے۔

''میں نے قلم کی طاقت بھی دیکھی ہے ماں!'' کامران کا انداز بدستور باغیانہ تھا۔ ''قاضی عمادالدین کے قلم کی ایک جنبش نے آپ کے بے قصور بیٹے کے پورے چہرے کو سیاہ کرکے اسے پس دیوار زنداں بھیج دیا تھا۔ اس نے ایک معصوم نوجوان کی قباء پر رسوائیوں کی ایسی عبارت تحریر کردی تھی جسے نہ کسی بیوہ کی التجائیں دھو سکیں اور نہ کسی یتیم کی فریادیں دھو سکیں۔ وہ لکڑی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا یقیناً بہت طاقتور تھا' مگر میں نے لوہے کی تاثیر کو بھی آزما کر دیکھا ہے۔'' شجاع الدین کامران آج عجیب انداز میں گفتگو کر رہا تھا۔ ''آپ حقیقت کیوں نہیں سمجھتیں کہ قلم کو بھی فولاد کے ٹکڑے کی مدد سے تراشا جاتا ہے۔ یہ اسی شمشیر کا کمال ہے کہ جب قائم خان کو اپنی گردن پر دھاردار لوہے کی سختی کا احساس ہوا تو وہ آپ کے قدم چھونے کیلئے دوڑا چلا آیا۔ اس نے اپنے جرم کا بھی اعتراف کرلیا اور قاضی عمادالدین کی شرکت میں گواہی پیش کردی۔ پھر ... ... تسلیم نہ کروں۔''

سعدیہ خانم مجبوراً خاموش ہوگئی۔ وہ بحث کر کے بیٹے کے جذبات کو مزید مشتعل کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اپنے ماموں کو عزت و احترام سے رخصت کردے کہ مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں ہے۔

''نہیں ماں! یہ شخص آج تیرے قدموں پر سر رکھے گا ورنہ اپنے گھر کو واپس نہیں جائے گا۔'' شجاع الدین کامران کسی کم عمر بچے کی طرح مچل گیا۔

''بیٹے! یہ بڑا گناہ ہے۔ تیرا مذہب اس ناروا فعل کی اجازت نہیں دیتا۔'' سعدیہ خانم نے ایک نامعلوم خوف سے لرزتے ہوئے کہا۔ اسے کامران کی آنکھوں میں انتقام کے شعلوں کے بجائے دہکتا ہوا آتش فشاں نظر آرہا تھا۔

''مجھے سب پتا ہے ماں! مگر میں آج پورے ہوش و حواس کے ساتھ یہ گناہ کرنا چاہتا ہوں۔'' کامران نے ماں کو جواب دیا اور پھر فوراً ہی قائم خان سے مخاطب ہوگیا۔ ''میں تجھے خوب جانتا ہوں قائم خان! تو صرف نام کا مسلمان ہے۔ تیری فطرت کے نہاں خانوں میں ابھی تک ہزاروں بت چھپے ہوئے بیٹھے ہیں تو دولت و طاقت کا پجاری ہے۔ اس لئے میں تجھے حکم دیتا ہوں کہ میری ماں کے پیروں پر اپنا سر رکھ دے۔''

''تم اپنے بیٹے کی گستاخیاں دیکھ رہی ہو سعدیہ؟'' قائم خان بالآخر چیخ اٹھا۔ ''میں تو محض اس لئے چلا آیا تھا کہ شاید ٹوٹے ہوئے رشتے دوبارہ جڑ جائیں۔'' قائم خان نے اسی ریاکاری اور منافقت کا مظاہرہ کیا جو آہستہ آہستہ اس کے خون میں شامل ہوگئی تھی۔

''بھائی صاحب! آپ ان رشتوں کا حوالہ نہ دیں جو برسوں پہلے توڑے جاچکے۔'' سعدیہ خانم شدید کربناک لہجے میں بولی۔ ''براہ کرم یہاں سے چلے جائیں۔ مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے۔''

قائم خان بڑی بے حسی کے ساتھ واپس جانے کیلئے مڑا۔

''مگر مجھے آپ سے بہت سی شکایتیں ہیں' میرے محترم ماموں!'' شجاع الدین کامران لہجہ بدل کر بولا اور اس نے تلوار سے قائم خان کا راستہ روک دیا۔

''بیٹے! میں نے انہیں معاف کردیا۔'' سعدیہ خانم نے گھبرا کر کہا۔

''میں جانتا ہوں کہ آپ تو اپنے قاتلوں کو بھی معاف کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔'' کامران پہلے سے زیادہ سرکش نظر آنے لگا تھا۔

''پھر بھائی صاحب کو جانے کیوں نہیں دیتا؟'' سعدیہ نے قدرے تیز آواز میں کہا۔

''میں مغرور شخص کو آپ کے سامنے زمین بوس دیکھنا چاہتا ہوں۔'' کامران کا لہجہ نفرت و انتقام کی آگ سے بھرا تھا۔ ''میری تسکین اسی طرح ہوگی ورنہ آپ کی معافی کو قابل قبول نہیں سمجھا جائے گا۔''

''اب تو میری نافرمانی کے جرم کا مرتکب ہو رہا ہے۔'' سعدیہ خانم نے ناراضگی کے انداز میں کہا۔ ''خدا کیلئے میری مزید دل آزاری نہ کر کامران!''

''مادر محترم آج کی رات نافرمانیوں کی رات ہے۔''

کامران کی آواز کچھ اور بلند ہوگئی تھی۔ ''آج میں اس گناہ کو علی الاعلان کرنا چاہتا ہوں۔ بے شک! آپ مجھے نافرمان کہہ سکتی ہیں مگر میں اپنے اس جرم پر ہمیشہ نازاں رہوں گا۔ خدا دیکھ رہا ہے کہ میں کس انداز کی نافرمانی کر رہا ہوں۔ جیسے ہی قائم خان کا سر زمین پر ٹکے گا' میرے مضطرب دل کو قرار آجائے گا۔ وہ دل ناآسودہ جو برسوں سے خون ہو کر میری آنکھوں میں اتر آنا چاہتا ہے۔ آخر میرے جسم پر میرے دل بے قرار کا بھی حق ہے۔ آج رات میں اسی حق کی ادائیگی چاہتا ہوں۔ آپ [illegible] مجرم ہے۔ تنہا آپ کے معاف

کر دینے سے اس کے گناہ نہیں دھلیں گے۔" یہ کہہ کر کامران نے ماموں کے حلقوم پر اپنی تلوار کا دباؤ بڑھا دیا۔
"جھک جا قائم خان کہ اسی میں تیری عافیت ہے۔ جلدی کر کہ ابھی میرے ذمے کچھ اور فرائض بھی باقی ہیں۔"
نجات کے سارے راستے بند ہو چکے تھے۔ قائم خان کو فوراً سعدیہ خانم کے قدموں پر اپنا سر رکھ دینا پڑا۔
سعدیہ خانم گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی تھی جیسے وہ انسانی سر نہ ہو کوئی زہریلا کیڑا ہو۔
"کامران! مجھے اس سے کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ بس اب انہیں جانے دے۔ تیری ضد پوری ہو گئی۔" سعدیہ خانم فریاد کے انداز میں چیخ رہی تھی۔
"آج میں بہت خوش ہوں کہ میری زندگی کا سب سے کیف آور لمحہ ہے۔" شجاع الدین کامران قہقہہ زن ہوا۔
"اب اگر میں قبر میں بھی اتار دیا جاؤں تو قیامت تک میرے جسم پر سرشاری کی ایک ناقابل بیان کیفیت طاری رہے گی اور اگر شدید محرومیوں کے عالم میں بھی زندہ رہوں تو یہ تصور مجھے مرنے نہیں دے گا کہ میں نے اپنی ماں کی آرزوؤں کے قاتل کو سر جھکانے پر مجبور کر دیا۔" یہ کہہ کر ایک لمحے کیلئے کامران خاموش ہو گیا اور بہت غور سے قائم خان کو دیکھنے لگا جو لمبی لمبی سانسیں لے رہا تھا۔ جیسے مسلسل ضربات نے کسی اژدھے کو نیم جانی کی کیفیت سے دوچار کر دیا ہو۔
"اب با آواز بلند اعتراف کر کہ تو نے قاضی عماد الدین کی سازش سے میرے معصوم لڑکپن کو زنداں کے حوالے کیا' میرا لباس صاف و شفاف تھا مگر تو نے اس پر سیاہی مل دی۔ شجاع الدین کامران نے نیا حکم جاری کر دیا۔
قائم خان لرزتی ہوئی آواز میں کامران کے حکم نامے کے ایک ایک حرف کی تجدید کر رہا تھا۔
اعتراف گناہ ختم ہوا تو کامران نے قائم خان کو کھڑا ہونے کی اجازت دے دی۔
سعدیہ خانم کی حالت غیر ہو گئی تھی وہ اپنے بیٹے کی اس جذباتی حرکت کا انجام بھی جانتی تھی۔ اسے پتا تھا کہ قائم خان جیسے زمانہ ساز انسان پر کامران کی اس انتقامی کارروائی کا کیا ردعمل مرتب ہوگا اور آئندہ زندگی میں اس احمق لڑکے کو کس کس طرح سازشوں کا شکار بنایا جائے گا؟
یکایک کامران نے اپنے پیرہن کی جیب میں ہاتھ ڈال کر قائم خان کا دستخط شدہ کاغذ نکالا اور اسے سعدیہ خان کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "یہ ہے میری بے گناہی کا ناقابل تردید ثبوت! اسے اپنے پاس محفوظ رکھیں۔ یہ کاغذ کا ٹکڑا آپ کے خاندان کی کھوئی ہوئی عزت دوبارہ بحال کر دے گا۔"
"اسے اپنے پاس کیوں نہیں رکھتا کہ جوان اور توانا لوگ نگہبانی کیلئے زیادہ موزوں ہوتے ہیں۔" سعدیہ خانم نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "آخر یہ کیسا کاغذ ہے۔"
اچانک کامران کو سردار نرسنگا کے الفاظ یاد آ گئے۔ جذبات سے تمتماتا ہوا اس کا چہرہ چند ساعتوں کیلئے دھواں ہو گیا' مگر اس نے فوراً ہی اپنے جذبات پر قابو پا لیا۔ "یہ اس سازش کا اعتراف ہے جو کچھ سال پہلے میرے خلاف کی گئی تھی۔" کامران نے سعدیہ خانم کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ "اس سازش کا بنیادی مجرم آپ کا بھائی قائم خان ہے۔ یہ کاغذ آپ کے بیٹے کو سلطان کی عدالت میں بے قصور ثابت کر دے گا اور پھر میں دہلی کی گلیوں میں آزادانہ سر اٹھا کر گھوم سکوں گا۔ اس کے بعد کوئی انگلی آپ کی طرف نہیں اٹھے گی۔ لوگ کہا کریں گے کہ وہ جا رہی ہے ایک بہادر بیٹے کی ماں جس نے تنہا کرسی اقتدار سے جنگ کی اور اس کے چاروں پایوں کو ہلاک کر کے رکھ دیا۔ میں اس دستاویز کو اپنے پاس رکھ لیتا مگر مجھے ایک ضروری کام سے باہر جانا ہے۔ اگر میں..."
سعدیہ خانم نے جوش جذبات میں شجاع الدین کامران کی بات قطع کر دی۔ "بیٹے! تو کہاں جانا چاہتا ہے؟ کیا

مجھے پھر انتظار کی آگ میں جلنے کیلئے اکیلا چھوڑ جائے گا؟"

"مجھے ایک بہت ضروری کام ہے۔" کامران نے سردار نرسنگا کے الفاظ کی بازگشت سے پیچھا چھڑاتے ہوئے کہا۔ "آپ پریشان نہ ہوں۔ میں بہت جلد واپس آجاؤں گا' پھر بھی اگر مجھے لوٹنے میں دیر ہوجائے تو آپ بے جھجک سلطان کے دربار میں چلی جائیں اور اپنے بیٹے کا مقدمہ دوبارہ پیش کردیں۔ اس کام میں تاخیر نہ کرنا کہ وقت کی کروٹیں بڑی عجیب ہیں۔"

سعدیہ خانم نے کانپتے ہاتھوں سے کاغذ لے لیا۔

"میں آپ کے محترم بھائی کو بحفاظت ان کی حویلی تک چھوڑنے جارہا ہوں۔" یہ کہہ کر کامران دروازے کی طرف بڑھا۔ اس کے آگے آگے قائم خان سر جھکائے چل رہا تھا۔ یکایک کامران مڑا۔ "میں اندازاً آٹھ دس دن میں واپس آجاؤں گا۔"

❊❊❊

قائم خان دوبارہ اپنی حویلی میں پہنچ چکا تھا۔ یاسمین خانم اور اس کی ماں کے اداس چہروں پر طمانیت و آسودگی جھلکنے لگی تھی۔

"میں نے تمہارے باپ کو معاف کردیا یاسمین!" کامران انتہائی جذباتی لہجے میں کہہ رہا تھا۔ آج کی رات ان کی زندگی میری تلوار کے رحم و کرم پر تھی۔ اگر میں چاہتا تو زندگی اور موت کے درمیان کا فرق مٹ بھی سکتا تھا' مگر تمہارے تصور نے مجھے ہر قسم کی جارحیت سے باز رکھا۔ میں نے تم سے کیا ہوا عہد نبھا دیا۔ تم چاہو تو اپنے باپ سے پوچھ سکتی ہو کہ ان کے جسم پر تشدد کا کوئی ہلکا سا نشان بھی موجود نہیں ہے۔ تمہیں کچھ تو یاد ہوگا کہ تمہارے باپ نے مجھے کس کس طرح رلایا ہے؟ مجھے آج بھی اپنے رخساروں پر ان طمانچوں کی سوزش محسوس ہوتی ہے جو تمہارے ماں باپ نے ایک یتیم بچے کو تحفتاً پیش کیے تھے۔ میں ان زخموں کو نہیں بھولا ہوں جو میرے جسم پر صرف اس لئے سجائے گئے تھے کہ میں تم سے ملنا چاہتا تھا۔ تمہیں یاد تو ہوگا کہ میرے اور تمہارے درمیان طے شدہ رشتوں کو کس بے دردی کے ساتھ توڑا گیا تھا۔ میں نے تم سے تمہارے ماں باپ کی ان سفاکیوں کا شکوہ کرنا چاہا تو میرے پاؤں کاٹ دیئے گئے کہ میں حویلی کا رخ نہ کرسکوں۔ تم نہیں جانتیں کہ میں نے اپنے شکستہ پیروں کو کتنی محنت کے بعد دوبارہ جوڑا تھا۔ پھر مجھے ایک چور ثابت کرکے زنداں کے اندھیروں میں پھنکوا دیا گیا۔ میں قید خانے کی اونچی دیواریں نہیں توڑ سکتا تھا۔ مجبوراً مجھے سزا کاٹنی پڑی اور پھر میں ایک معتبر مجرم قرار دیا گیا۔ یہ سب تمہارے عظیم باپ قائم خان راجپوت کی مہربانیاں تھیں۔ میں نے شاہی فوج میں شامل ہونے کی کوشش کی کہ اس طرح ملک کی سرحدوں پر دشمنوں کے لشکر سے الجھ جاؤں اور خون بہا کر اپنی شخصیت پر لگائے گئے سیاہ داغوں کو دھوسکوں' مگر تمہارے باپ نے میری شریفانہ زندگی کا وہ راستہ بھی بند کردیا۔ پھر میں معزز اور محترم اور سادہ لوگوں کے قافلے سے بچھڑ گیا۔ میں نے اپنی جان پر کھیل کر طاقت حاصل کی اور وہی طاقت آج مجھے تیرے در تک پہنچانے کا ذریعہ بنی ہے۔ تیری یہ حویلی میرے معصوم خوابوں اور بے لوث رشتوں کا مقتل ہے۔ مگر میں پھر بھی اس کے در و دیوار سے نفرت نہیں کرسکتا کہ آخر یہ میری خواب گاہ ناز ہے۔" کامران اس قدر جذباتی ہوگیا تھا کہ اس کی آنکھوں میں اشکوں کی نمی سی جھلکنے لگی تھی۔

یاسمین خاموش کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ کسی پتھر کے بت سے مشابہ تھا۔

"میں نے قائم خان کے دیگر جرائم بیان نہیں کئے ہیں کہ اس مختصر سے وقت میں ان کا شمار ممکن نہیں۔" کامران نے دوبارہ اپنی داستان درد کا آغاز کردیا۔ "میں قائم خان کو مسلسل اذیت و کرب کی حالت میں رکھتا' مگر میں نے

صرف تیری خاطر اسے کوئی آزار نہیں پہنچایا۔"

اب یاسمین خانم چپ نہ رہ سکی۔ "میری خاطر کیوں؟" اس کے لہجے سے شدید ناگواری کا اظہار ہو رہا تھا۔

"اس لئے کہ تجھ سے میرا اٹوٹ رشتہ ہے۔" کامران اپنی وارفتگی کے سبب یاسمین خان کے بگڑے ہوئے تیوروں کو محسوس نہیں کر سکا تھا۔

"کیسا رشتہ؟" یاسمین کی آواز یک بیک تیز ہو گئی۔

کامران یاسمین خانم کے انداز سوال پر چونک اٹھا۔ چند لمحوں تک وہ کچھ بول ہی نہیں سکا' پھر پوری طاقت کے ساتھ اپنے آپ کو سمیٹ کر کہنے لگا۔ "وہی محبت کا رشتہ جس سے ہم دونوں بندھے ہوئے ہیں۔" یہ کہتے کہتے شجاع الدین کامران کی زبان لڑکھڑانے لگی تھی۔ اہل دل کیلئے محبت کا اقرار اتنا آسان نہیں ہوتا۔ کامران بھی اسی کیفیت سے دوچار تھا۔

"وہی محبت جس کا اقرار تو نے بھی کیا ہے۔"

"کیسی محبت اور کیسا اقرار؟" یاسمین خانم برہم ہو گئی۔

"وہ محبت جس کا رشتہ بچپن کی رفاقت نے جوڑا تھا۔" اب کامران کی آواز لکنت کا شکار ہونے لگی تھی۔

"وہ رشتہ بہت دن پہلے توڑ دیا گیا۔" یاسمین خانم نے مکمل باغیانہ روش اختیار کر لی تھی۔

"میں جانتا ہوں کہ وہ رشتہ تیری مرضی سے نہیں توڑا گیا۔" شجاع الدین کامران ایک حادثاتی شکست کی طرف بڑھتے ہوئے سنبھلنے کی کوشش کرنے لگا۔ "جب اس نسبت کو قطع کیا گیا تو وہ تیری معصومیت اور بے خبری کے دن تھے۔"

"کچھ بھی سہی مگر میرے ماں باپ کا فیصلہ درست تھا۔" یاسمین خانم کے لہجے میں بڑی جارحیت تھی۔ "اس نسبت اور رشتے کو ٹوٹ ہی جانا چاہئے تھا۔"

"یہ تم کہہ رہی ہو یاسمین؟" شجاع الدین کامران کو سکتہ سا ہو گیا تھا۔

"ہاں! یہ میرے الفاظ ہیں۔" یاسمین خانم اس قدر مشتعل ہو گئی تھی کہ اس کے شاداب چہرے پر خون سا جھلکنے لگا تھا۔ "پورے ہوش و حواس کے ساتھ سن لو کہ میرے اور تمہارے درمیان کوئی رشتہ موجود نہیں ہے۔ تم نسبت کی بات کرتے ہو' اگر میرے ماں باپ مجھے تمہارے ساتھ رشتہ ازدواج میں بھی منسلک کر دیتے تو میں اس بندھن کو قبول نہ کرتی۔"

ہزاروں زخم کھا کر بھی ثابت قدم رہنے والا کامران صنف نازک کے اس حملے کو برداشت نہ کر سکا۔ اس کے چٹانوں جیسے پاؤں کانپنے لگے' پھر وہ تمہاری آنکھوں میں کیا تھا یاسمین؟" کامران کی زبان کسی ناتواں مریض کے جسم کی طرح لرزنے لگی۔

"وہ محض ایک ہمدردی کا جذبہ تھا جسے کبھی کبھی میری آنکھیں بیان کر دیا کرتی تھیں۔" تصورات کی دنیا میں کامران نے یاسمین کے جن ہونٹوں سے شبنم کے برسنے کا منظر دیکھا تھا اب ان ہی لبوں سے پگھلی ہوئی آگ کی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔ "مجھے تجھ سے ہمدردی تھی کامران تو ایک یتیم اور زمانے بھر کا ٹھکرایا ہوا بچہ تھا......" یاسمین خانم نے بھی فرق مراتب کو مٹا ڈالا تھا اور وہ انتہائی گستاخانہ لہجے میں کامران کو مخاطب کر رہی تھی۔ "بدقسمتی سے میرے اور تیرے درمیان ایک خاندانی رشتہ بھی تھا۔ اسی رشتے کی آبرو رکھنے کیلئے میں تجھے اپنائیت کی نظروں سے دیکھتی تھی۔ مگر تیری فطری کمینگی نے جذبوں کے تقدس کو ہوس کا رنگ دے ڈالا۔ تو ایک حریص اور احسان فراموش انسان ہے۔ مجھے

حاصل کر کے میری عظیم الشان حویلی سے اپنے شکستہ کھنڈر کا تعلق جوڑنا چاہتا ہے۔ کبھی تو نے اپنی حیثیت پر غور نہیں کیا۔ ایک معمولی سپاہی کا بیٹا جسے غداری کے جرم میں ذبح کر دیا گیا' میرا ہمسفر بننے کا آرزو مند ہے۔ تو اس معاشرے کیلئے غلاظت کا ایک بوجھ ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ تو جلد از جلد میری حویلی کو کثافت کے اس ڈھیر سے پاک کر دے۔" یاسمین خانم کی رگوں میں دوڑنے والا خون آنچ دینے لگا تھا۔

شجاع الدین کامران کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا۔ وہ بمشکل سنبھلا اور پھر بڑے شکستہ لہجے میں کہنے لگا......" یاسمین! تو راجپوتوں کی اس رسم سے خوب واقف ہے کہ وہ ایسی نسبتوں کو ٹوٹنے نہیں دیتے جب کوئی جے چند کسی سنجوگتا کی راہ میں حائل ہوتا ہے تو پرتھوی راج ایک مانگ کو سوئمبر کی بھری جلسہ گاہ سے جبراً اٹھا کر لے جاتا ہے۔" کامران نے مجبوراً یاسمین خانم کو راجپوتوں کی تاریخ کے ایک یادگار واقعہ کا حوالہ دیا۔

"میں سنجوگتا نہیں' یاسمین خانم بنت قائم خان ہوں۔" یاسمین کی نفرت اپنی آخری حدوں کو چھو رہی تھی۔ سنجوگتا اجمیر کے حکمران کے ساتھ اس لئے چلی گئی تھی کہ وہ خود بھی سمراٹ پرتھوی راج چوہان کو پسند کرتی تھی اور مجھے تجھ سے نفرت ہے۔ شدید نفرت...... ناقابل بیان نفرت۔"

شجاع الدین کامران چند لمحوں تک پتھرائی ہوئی آنکھوں سے یاسمین خانم کی طرف دیکھتا رہا' پھر اس کے چہرے پر ایک عجیب سا رنگ ابھر آیا..... "تو صرف مجھے ایک بے گھر' مفلس اور یتیم بچہ سمجھتی تھی یاسمین؟" اب کامران کے لہجے میں اذیت و کرب کی شدت کے بجائے ایک ٹھہراؤ سا تھا۔

"وہ میرے بچپن کا ذکر ہے۔" یاسمین کے ہونٹوں سے برسنے والے شعلوں میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا۔ "اب میں اپنے ہوش کے عالم میں تجھے دنیا کا سب سے زیادہ لعنت زدہ انسان سمجھتی ہوں۔"

کامران نے یاسمین خان کے اس انتہائی ذلت آمیز فقرے کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ پورے اطمینان کے ساتھ چلتا ہوا کمرے کے وسط میں پہنچا اور اس سنگی ستون کو غور سے دیکھنے لگا جس پر بہترین نقش و نگار بنائے گئے تھے۔

کچھ دیر تک کامران پر مکمل سکوت کی سی کیفیت طاری رہی' پھر اس کا ہاتھ فضا میں بلند ہوا اور سنگی ستون اس کی شمشیر کا ہدف بن گیا۔ کامران دیوانہ وار پتھر پر ضربیں لگا رہا تھا۔ یہاں تک کہ تلوار ٹوٹ گئی۔ قائم خان' یاسمین خانم اور اس کی ماں پر وحشت سی طاری ہو گئی تھی اور انہیں یقین آ گیا تھا کہ شجاع الدین کامران اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا ہے۔

کامران نے اپنی ٹوٹی ہوئی تلوار کو ایک نظر دیکھا اور اسے حویلی کے قیمتی قالین پر پھینک دیا۔

"اب اس کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ جس کی محبت نے شمشیر زنی کا فن سکھایا تھا' جب وہی اجنبی نکلا تو پھر فولاد و آہن کے اس ٹکڑے سے کیا رشتہ؟" شجاع الدین کامران نے خود کلامی کے انداز میں کہا اور پھر اپنے ماموں سے مخاطب ہو کر بولا۔ "تو جیت گیا قائم خان! نیلگوں آسمان کے فیصلوں میں ہم خاکی انسان ذرا بھی مداخلت نہیں کر سکتے۔"

الفاظ کی گونج ختم ہو گئی اور شجاع الدین کامران تھکے ہوئے قدموں کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گیا۔

❋❋❋

سردار نرسنگا کے آدمی شدید اضطراب کے عالم میں ادھر ادھر ٹہل رہے تھے۔ انہیں خطرہ لاحق تھا کہ کہیں صبح کے آثار نمودار نہ ہو جائیں اور پھر بیدار ہونے والے لوگ قزاقوں کو پہچان کر نیا ہنگامہ کھڑا کر دیں۔

جیسے ہی کامران باہر آیا' ایک قزاق نے آگے بڑھ کر تیز سرگوشی میں کہا۔ ''چھوٹے ٹھاکر! کام پورا ہو گیا؟''

''ہاں!'' کامران نے یک لفظی جواب دے کر قزاق کو ٹالنے کی کوشش کی۔ اس کی آواز بجھی بجھی تھی' مگر وہ اپنی دلی کیفیت کو نرسنگا کے آدمیوں سے چھپانا چاہتا تھا۔

''اب ہمیں کیا کرنا ہوگا؟'' اسی قزاق نے دوبارہ شجاع الدین کامران سے پوچھا۔

''تم لوگ جنگل کی طرف چلے جاؤ گے اور میں بڑے مندر کی جانب لوٹ جاؤں گا'' کامران نے اپنے لہجے کی سختی کو برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ ''سردار سے کہہ دینا کہ میں کل کسی وقت اس کے پاس آ کر تفصیلی حالات سے آگاہ کروں گا۔''

تمام قزاق اپنی اس کامیابی پر بے حد خوش تھے اور دبی دبی آوازوں میں اپنے سردار کی ''جے کار'' کر رہے تھے۔

''ہمیں یقین تھا کہ ہم لوگ جدھر بھی رخ کریں گے' کامیابی ہمارے قدم چومے گی۔ یہ سردار نرسنگا کی بلند اقبالی کا اثر ہے کہ وہ کسی معرکے میں شکست سے دوچار نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ اس کے غلاموں کو بھی ناکامی کا منہ دیکھنا نہیں پڑتا۔ وہ فتح کا ایک سیلاب ہے کہ جدھر سے گزرتا ہے' اپنے دشمنوں کو بہا کر لے جاتا ہے۔ چھوٹے ٹھاکر! تم نے دیکھا کہ ہمارے آدمیوں کے خون کا ایک قطرہ بھی نہیں ٹپکا اور اتنا بڑا مسئلہ کس قدر آسانی سے حل ہو گیا۔ کہنے والے تو یہاں تک کہہ رہے تھے کہ سردار نے اپنے بہترین جاں نثاروں کو موت کے منہ میں جھونک دیا ہے۔ قائم خان راجپوت کی حویلی کی طرف جانے والوں میں سے کوئی ایک بھی زندہ لوٹ کر نہیں آئے گا۔''

کامران نے قزاقوں کے اس جشن نشاط پر اپنے کسی تاثر کا اظہار نہیں کیا۔ وہ چپ چاپ اپنے راستے پر چلتا رہا۔ کامران کو احساس تھا کہ یہ خوفناک مرحلہ کسی غارت گری کے بغیر گزر گیا۔ لوگوں کی سوچ درست تھی کہ اگر اس معرکے میں خون کے دریا بھی بہہ گئے تو اسے ایک معمولی تباہی سمجھا جائے گا لیکن اب کسی قزاق کے جسم پر ہلکی سی خراش بھی نہیں آئی تو نرسنگا کے آدمیوں نے اسے اپنے سردار کی بلند اقبالی سے تعبیر کیا۔ اب کامران ان وحشیوں سے کیا کہتا کہ اس جنگ میں اسے بدترین شکست کا منہ دیکھنا پڑا ہے۔ سب کے بدن سلامت تھے' مگر خود اس کے اپنے خون کا ایک ایک قطرہ قائم خان کی حویلی کے در و دیوار میں جذب ہو گیا ہے۔

الغرض رات کے اندھیرے میں یہ پراسرار سفر جاری رہا۔ تمام قزاق اپنی زندگی کی بازیابی کا جشن مناتے ہوئے جنگل کی طرف چلے گئے اور شجاع الدین کامران وعدے کے مطابق اکیلا بڑے مندر میں داخل ہو گیا۔

✽✽✽

وہ رات کا آخری پہر تھا۔ مندر کے بیشتر پجاری گہری نیند میں ڈوبے ہوئے تھے' مگر ٹھاکر کرشن راؤ اور رام سروپ شدید بے چینی کی کیفیت میں جاگ رہے تھے۔ جب ان دونوں نے کامران کو مندر کے دروازے میں داخل ہوتے دیکھا تو گھبرا کر کمرے سے باہر نکل آئے۔

''تو آ گیا ہے میرے بیٹے؟'' کرشن کا لہجہ بڑا منافقانہ تھا' مگر ظاہری طور پر اس میں بہت اپنائیت تھی۔ ''میں جانتا تھا کہ تو میرے پاس لوٹ کر ضرور آئے گا۔ باہر کی دنیا بڑی سنگدل اور سفاک ہے۔ وہاں ہر آنکھ میں تیرے لئے نفرتوں کے تیر ہیں' ہر ہاتھ میں زہر آلود خنجر ہیں اور ہر دماغ میں تباہی کے منصوبے ہیں۔ مگر اس مندر میں تیری بے چین آتما کو شانتی دینے کیلئے سریلی گھنٹیوں کا شور ہے' دیوداسیوں کے من موہ لینے والے بھجن ہیں اور پجاریوں کے سکھ کی نیند سلا دینے والے کیرتن ہیں۔''

''ہاں ٹھاکر! میں لوٹ آیا ہوں۔'' شجاع الدین کامران نے کرشن راؤ سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ اگرچہ اس وقت کمرے میں نیم تاریکی کی سی کیفیت تھی اور کامران کی شکستگی کے آثار کو سمجھنا بہت مشکل تھا' لیکن پھر بھی وہ اپنی ظاہری حالت کو کرشن راؤ کی نظروں میں تماشا بنانا نہیں چاہتا تھا۔

بوڑھا ٹھاکر ایک جہاندیدہ انسان تھا۔ اس نے کامران کے گریز کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کی۔ ''تیرے دوسرے ساتھی کہاں ہیں؟''

''وہ اپنے اپنے ٹھکانوں کی طرف لوٹ گئے۔'' شجاع الدین کامران پر ایک ایک لمحہ گراں گزر رہا تھا اور ٹھاکر کرشن راؤ اسے بڑی ہوشیاری سے اپنے دام میں الجھا رہا تھا۔

''کسی کو کوئی نقصان تو نہیں پہنچا؟'' کرشن راؤ نے ایک اور سوال کیا۔ ''میرا مطلب ہے کہ یہ خوفناک مرحلہ بخیر و عافیت گزر گیا؟'' بوڑھا ٹھاکر بڑی احتیاط سے کامران کو کرید رہا تھا۔

کامران خاموش رہا۔ وہ صرف دیوداسی شکنتلا سے ملنے کیلئے بڑے مندر آیا تھا اور کرشن راؤ اس کے جذبوں سے ایک اذیت ناک کھیل کھیل رہا تھا۔

''تو نے اپنا مقصد حاصل کر لیا؟'' بوڑھے ٹھاکر کے سوالات کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ ''مجھے یقین ہے کہ تو اپنے سب سے بڑے دشمن قائم خان سے مکمل انتقام لے چکا ہوگا۔'' دراصل کرشن راؤ کامران کی زبان سے حالات کی پوری تفصیل سننا چاہتا تھا۔ ''مجھے کچھ تو بتا کہ تو نے قائم خان جیسے بااثر انسان پر کس طرح قابو پایا؟ کہیں اس نے تیرے ساتھیوں کو پہچان تو نہیں لیا کہ وہ سادھوؤں کے لباس میں سردار نرسنگا کے آدمی تھے؟'' آہستہ آہستہ کرشن راؤ کی عیاریاں ظاہر ہوتی جا رہی تھیں۔

''نہیں ٹھاکر!'' کامران نے جھنجلا کر کہا۔ ''میرا منصوبہ اتنا کمزور نہیں تھا کہ قائم خان سردار کے آدمیوں کو پہچان لیتا۔ اسے تو گمان بھی نہیں گزرا کہ سادھوؤں کی وہ جماعت نرسنگا کے گروہ سے تعلق رکھتی ہے۔'' کامران نے پورے ہوش و حواس کے ساتھ جواب دیا۔

''میں اس بات کو مان لیتا ہوں کہ تو نے بڑی احتیاط اور ہوشیاری سے کام لیا مگر پھر بھی ایک خطرے کی موجودگی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔'' کرشن راؤ نے اپنی عادت کے مطابق نئی چال چلی۔

''کیسا خطرہ؟'' کامران نے چونک کر پوچھا۔

''نرسنگا کے آدمیوں کو جوگیوں کے لباس میں دیکھ کر قائم خان نے یہ اندازہ تو کر لیا ہوگا کہ اس کی حویلی پر حملہ

کرنے والے ہندو قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔" ٹھاکر کرشن راؤ نے انتہائی فریب کاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کامران پر ایک اور نفسیاتی وار کیا۔ "تیرا منصوبہ کتنا بھی مکمل سہی مگر تو اپنے ساتھیوں کے لباس کو نہیں چھپا سکتا تھا۔ قائم خان نے سمجھ لیا ہوگا کہ حملہ آور مسلمان نہیں تھے۔ یہ بڑی فساد برپا کردینے والی بات ہے کہ تیرے ذاتی انتقام کی وجہ سے پوری ہندو قوم بدنام ہو جائے۔"

شجاع الدین کامران حیرت سے کرشن راؤ کا منہ دیکھنے لگا۔ اس کے پاس ٹھاکر کے اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

"قائم خان سلطان ناصر الدین محمود کے دربار میں شکایت کرسکتا ہے کہ کل رات اس کے مکان پر سینکڑوں ہندوؤں نے حملہ کیا تھا۔ اس طرح چند لٹیروں کی وجہ سے ہماری پوری قوم پر حرف آسکتا ہے۔ قائم خان یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ مندروں میں پوجا پاٹ کے بجائے مسلمانوں کے خلاف جنگ کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ اس طرح پجاریوں کے ساتھ عبادت گاہوں کا تقدس بھی بدنام ہوسکتا ہے۔" ٹھاکر کرشن راؤ ایک لمحے کیلئے خاموش ہوا اور پھر اپنی جھکی ہوئی مونچھوں کو بل دیتے ہوئے بولا۔ "اگر ایسا ہوا تو یہ بات غیرت مند ہندوؤں کیلئے ناقابل برداشت ہوگی۔ میں سردار نرسنگا سے کہوں گا کہ اس نے کھلے عام اپنے آدمیوں کو بھیج کر عقلمندی کا ثبوت نہیں دیا۔ وہ لٹیرے تو جنگلوں میں روپوش ہو جائیں گے، مگر پوری ہندو قوم شاہی عتاب کا نشانہ بن جائے گی۔" کرشن راؤ اونچی آواز میں بول رہا تھا۔

شجاع الدین کامران نے ٹھاکر کی بات کاٹ دی۔

"یہ سب تیرا واہمہ ہے ٹھاکر!" کامران نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "ہم نے ایسا کوئی نشان راستے میں نہیں چھوڑا ہے کہ جس کا تعاقب کرتے کرتے قائم خان ہندوؤں کی عبادت گاہوں تک پہنچ جائے۔"

"میرا ذہن کسی اندیشے میں مبتلا نہیں، میں زندہ حقائق پر غور کر رہا ہوں۔" کرشن راؤ کی آواز بدستور بلند تھی۔

"تیری ایک لغزش میری پوری قوم کو تباہ کرسکتی ہے۔"

"تو مسلسل بہک رہا ہے ٹھاکر!" کامران نے ناگوار لہجے میں کہا۔ "میری طرف سے تیرا دل ابھی تک صاف نہیں ہوا ہے، اس لئے میرے خلاف نئے نئے بہانے تراش رہا ہے۔ میں بہت تھک گیا ہوں۔ مجھے زیادہ پریشان نہ کر۔ اگر تجھے اس مسئلے کو ابھارنا ہی ہے تو پھر جا سردار نرسنگا کے پاس اور اس کے سامنے ماتم کر۔" کامران بے نیازی کے ساتھ مڑا اور اپنے کمرے کی طرف جانے لگا۔

کامران کے جاتے ہی ٹھاکر کرشن راؤ نے چین کی سانس لی اور پجاری رام سروپ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"اب میں مطمئن ہوں رام سروپ!"

"وہ کس طرح ٹھاکر؟" پجاری نے گھبرا کر پوچھا۔ "کیا تمام خطرات ٹل گئے؟"

"ہاں!" کرشن راؤ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ وہ ملیچھ اپنے ماموں سے انتقام لینے میں کامیاب نہیں ہوسکا ہے۔ اس کے چہرے سے شکست کے آثار صاف نظر آرہے تھے۔"

"تو پھر وہ ناکامی کی حالت میں واپس کیوں لوٹ آیا؟" پجاری رام سروپ نے اپنی عیار عقل کی روشنی میں نیا سوال کیا۔

"وہ آنے کیلئے مجبور تھا۔" کرشن راؤ کے غلیظ ہونٹوں پر اب بھی ایک سفاک مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔ "نرسنگا کا قاتلانہ حکم اس کی واپسی کیلئے کافی تھا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو پھر کن آنکھوں سے اپنی ماں کی لاش کا نظارہ کرتا۔ مجبوراً اسے ناکامی کی حالت میں واپس آنا پڑا

''تو ٹھاکر آپ کا مطلب ہے کہ وہ ملیچھ قائم خان کے حصار کو توڑ کر حویلی کے اندر داخل نہیں ہو سکا۔'' پجاری رام سروپ نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''یقیناً!'' ٹھاکر کرشن راؤ نے پرجوش لہجے میں کہا۔ ''لٹیروں کی ایک بڑی جماعت بھی اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکی۔ آخر قائم خان ایک ذہین اور زمانہ شناس انسان ہے۔ وہ اپنے دشمن سے ایک لمحے کیلئے بھی بے خبر نہیں رہ سکتا۔ اس کے دفاعی انتظامات بہت سخت ہیں۔'' کرشن راؤ نے اس طرح کہا جیسے وہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔

''ٹھاکر! یہ بھی تو ممکن تھا کہ وہ اپنے منصوبے کو تکمیل تک پہنچانے کیلئے کسی دوسری رات کا انتظار کر لیتا۔'' پجاری رام سروپ کا ذہن ابھی تک مکمل طور پر وسوسوں کی قید سے آزاد نہیں تھا۔

''اب ایسی کوئی رات اس کی زندگی میں دوبارہ نہیں آئے گی۔'' ٹھاکر نے مسند پر دراز ہوتے ہوئے کہا اور ہاتھ کے اشارے سے رام سروپ کو بیٹھ جانے کیلئے کہا۔ اس کو آزادی بس ایک رات کیلئے بخشی گئی تھی۔ چند لمحوں بعد کی دی ہوئی مہلت ختم ہو جائے گی۔''

''ٹھاکر! ایسا بھی تو ہو سکتا ہے۔'' پجاری رام سروپ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''کہیں ایسا تو نہیں کہ چھوٹے ٹھاکر نے قائم خان کو قتل کر دیا ہو اور اس کشمکش میں نرسنگا کے بھی کچھ آدمی ہلاک ہو گئے ہوں۔'' رام سروپ نے ایک بے بنیاد اندیشے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''لگتا ہے کہ تو نے آج معمول سے زیادہ بھنگ پی لی ہے۔'' ٹھاکر کرشن راؤ نے پجاری کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔ ''اگر ایسا ہوتا تو اس کے لباس پر خون کی کوئی چھینٹ نظر آتی۔ کہیں قتل و غارت کا بازار اس طرح گرم ہوتا ہے کہ انسانوں کے لباس صاف و شفاف رہیں اور ان کے جسموں کو کسی زخم کی ہلکی سی خراش تک دکھائی نہ دے۔''

پجاری رام سروپ نے شرمندہ ہو کر سر جھکا لیا اور کرشن راؤ زمین دوز تہہ خانے کی طویل راہداری سے گزر کر رات کے آخری لمحات بسر کرنے کیلئے نوخیز دیوداسی روپا کے کمرے میں چلا گیا۔

✻✻✻

شجاع الدین کامران بڑی شکستہ حالت میں شکنتلا کے پاس پہنچا۔ دیوداسی نے پہلی ہی دستک میں دروازہ کھول دیا۔ شکنتلا اس رات ایک لمحے کیلئے بھی نہیں سوئی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر کامران کی کامیابی کیلئے بیشمار دعائیں تھیں۔ جیسے ہی دروازے پر دستک ہوئی شکنتلا بے قرار ہو کر باہر نکل آئی اور پھر کامران کو اپنے سامنے پا کر چیخ اٹھی۔

''یہ تم ہو ٹھاکر؟''

''ہاں شکنتلا! یہ میں ہوں شجاع الدین کامران' جس کے مقدر میں شکست و بربادی کے سوا کچھ نہیں۔'' کامران کے قدم غیر متوازن ہوئے جا رہے تھے۔ اس نے دروازے پر ہاتھ رکھ کر سنبھلنے کی کوشش کی۔

''اندر آجاؤ ٹھاکر!'' دیوداسی شکنتلا نے بے احتیاط ہو کر اسے اندر کھینچتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں اس طرح میرے کمرے کے سامنے کھڑا دیکھ کر کئی فتنے جنم لے لیں گے۔''

شجاع الدین کامران لڑکھڑاتے قدموں سے آگے بڑھا۔ ''نہیں شکنتلا! آج کے بعد کوئی فتنہ پیدا نہیں ہوگا۔ میری زندگی کی یہ وہ مبارک رات ہے کہ جس کے اندھیروں میں سارے ہنگامے' سارے فتنے ایک ایک کر کے فنا ہو گئے۔ کل ایک نئی صبح طلوع ہوگی۔ ایسی صبح کہ جس کے دامن میں امن ہی امن ہے' شکنتلا! شانتی ہی شانتی ہے۔''

کامران کے ہونٹوں سے اس کی ناآسودہ حسرتوں کا خون ٹپک رہا تھا۔ اگر وہاں کوئی اجنبی شخص موجود ہوتا تو کامران کی گفتگو سے یہی مفہوم اخذ کرتا کہ یہ نوجوان [illegible] کر رہا تھا' وہ پوری توانائی اور

تابنا کی کے ساتھ رونما ہو چکا ہے۔ مگر شکنتلا جانتی تھی کہ شجاع الدین کامران اس وقت کیسے ناقابل بیان کرب سے دو چار ہے۔

دیوداسی نے تیزی کے ساتھ دروازہ بند کیا۔ اس مختصر سے وقفے میں کامران شکنتلا کے بستر پر بیٹھ چکا تھا۔

دیوداسی نے چراغ کی روشنی میں دیکھا۔ کامران کا سرخ و سفید چہرہ شدت غم سے سیاہ ہو گیا تھا۔

"ٹھاکر! تم اپنے کمرے میں چلو۔" شکنتلا نے کامران کو سہارا دے کر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"کیا تمہیں بھی یہاں میری موجودگی سے ڈر لگتا ہے؟" خلاف معمول کامران کا لہجہ تلخ تھا۔

"مجھ سے ایسی باتیں نہ کرو ٹھاکر کہ میں اپنے آپ سے نفرت کرنے لگوں۔" شکنتلا کے سینے میں درد کی ایک تیز لہر اٹھی۔" میں اپنے انجام سے خوفزدہ نہیں تمہاری طرف سے فکر مند رہتی ہوں کہ اگر کرشن راؤ کے کسی مخبر نے تمہیں میرے کمرے میں دیکھ لیا تو نیا ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوگا۔"

"میں کہہ چکا ہوں شکنتلا کہ اب کوئی ہنگامہ سر نہیں اٹھائے گا۔" کامران کو اپنی تلخ کلامی کا احساس ہو گیا تھا۔ اس لئے لہجہ بدل کر بولا۔" سارے ہنگامے بے کسی کی موت مر چکے' اب ہر طرف سکون ہی سکون ہے۔"

"تم غلط کہہ رہے ہو ٹھاکر!" شکنتلا اچانک رونے لگی۔" اگر سکون ہوتا تو تمہارے چہرے پر شادابیاں رقص کر رہی ہوتیں۔"

میرے چہرے کا ذکر چھوڑو کہ وہ بدنصیبوں کی آگ میں کوئلہ کا ڈھیر بن چکا۔" کامران نے اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجالی۔" میرے پاس وقت کم ہے۔ میں تم سے ملنے کیلئے آیا ہوں۔ اگر تمہاری یادیں دامن گیر نہ ہوتیں تو تم سے ملے بغیر چلا گیا ہوتا۔"

میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔" یہ کہہ کر شکنتلا کمرے کے ایک گوشے کی طرف بڑھی۔ پھر دیکھتے ہی وہ ایک خفیہ راستہ نمودار ہو گیا' جس سے گزر کر شکنتلا اپنی خواب گاہ میں داخل ہوئی تھی۔

کامران نے چپ چاپ دیوداسی کی تقلید کی اور وہ اپنے آپے میں آ گیا۔

"شکنتلا! میں اپنی زندگی کی سب سے اہم بازی جیت کر بھی ہار گیا۔" کامران نے اس رات کی الم انگیز روداد شکنتلا کو بتاتے ہوئے کہا۔" اب کسی سے کیا شکوہ کہ جس کی خاطر میں نے عذاب جھیلے اسی نے پہچاننے سے انکار کر دیا۔" یہ کہتے ہوئے شجاع الدین کامران کی آنکھیں چھلک اٹھیں۔ یاسمین کو مجھ سے محبت نہیں' ہمدردی تھی۔ وہ ہمدردی جو ایک لاوارث اور اپاہج انسان سے کی جاتی ہے۔ کیا میں نے اسی کیلئے اپنی زندگی کو حادثات کے دوزخ میں جھونک دیا تھا؟ کیا میں نے یہی جانگداز لمحات دیکھنے کیلئے اپنی ماں کو فراق میں جلایا تھا؟ میں کیسا سفاک انسان ہوں شکنتلا کہ کسی ایک انسان کو بھی سکون کی چند سانسیں فراہم نہ کر سکا۔ جدھر گیا' اذیت ناک مسائل کی قطار کھڑی کر دی اور جس سے ملا رنج والم کی سوغات بخش دی۔ یاسمین نے مجھ سے یہ بھی کہا تھا کہ میں اس زمین کا ناقابل برداشت حصہ ہوں۔ کیا میں اتنا برا ہوں کہ میری ذات میں کوئی ایک بھی خوبی موجود نہیں؟"

یاسمین بھی جھوٹ بولتی ہے...... اور دنیا والے بھی غلط کہتے ہیں۔" شکنتلا کی زبان سے آگ برسنے لگی تھی۔ وہ سب کے سب زمانہ ساز اور اچھے وقت کے ساتھی ہیں...... مگر تمہیں کیا ہو گیا ہے ٹھاکر کہ اپنی لالہ و گل جیسی شخصیت کو پتھروں سے ٹکرا کر ریزہ ریزہ کر دینا چاہتے ہو۔ تم جانتے ہو کہ فولاد موم نہیں ہو سکتا اور کسی پتھر میں جونک بھی نہیں لگ سکتی۔ پھر کیوں اس قدر خوفناک تجربے کر رہے ہو۔ یہ جنون ہے' وحشت ہے' دیوانگی ہے۔ خدا کیلئے ایک نظر ان کی طرف بھی دیکھو جو تیرا راہ گزر تمہارے...... اور اب جن کی آنکھیں بجھنے ہی

والی ہیں۔ تم اپنی دنیا میں واپس لوٹ جاؤ اور کچھ چراغوں کو بچالو جن کی لو بہت دیر سے تھرتھرا رہی ہے۔ زندگی ایک عورت کے اقرار یا انکار کا نام نہیں۔ یہ نعمت خسارے کے تصور سے بہت زیادہ بلند ہے۔"

"میں بہت تھک گیا ہوں شکنتلا! تم میری بے خواب زندگی کا شمار بھی نہیں کر سکتیں۔" کامران کسی بچے کی طرح رو رہا تھا۔

"میرے پاس آؤ ٹھاکر! میں تمہیں سلا دوں۔" شکنتلا وارفتہ ہو کر آگے بڑھی۔

کامران گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ "میرے قریب نہ آؤ...... یہ بدعہدی ہے۔ میں تو ایک کا ہو چکا۔"

شکنتلا سناٹے میں آ گئی' پھر چند لمحوں میں اس کا پورا بدن عرق ندامت سے نہا گیا۔ "میرا یہ مقصد نہیں تھا ٹھاکر!" دیوداسی کی آواز لڑکھڑانے لگی۔

"میں تمہارا بہت احترام کرتا ہوں شکنتلا!" کامران نے پرسوز لہجے میں کہا...... "مجھے تمہاری قربانیوں کا احساس ہے...... مگر......" کامران کی زبان لکنت کا شکار ہو گئی اور لفظ ٹوٹ کر بکھر گئے۔

"تم ٹھیک کہتے ہو ٹھاکر!" شکنتلا مایوسیوں کا ایک شکستہ مجسمہ نظر آ رہی تھی۔ "پھر بھی تم نے میرا احترام تو کیا جیسے پتھر کے بتوں کا احترام کیا جاتا ہے۔"

"میں اپنے آپ سے مجبور ہوں شکنتلا۔" کامران کی آواز میں اب بھی ہلکی ہلکی لرزش موجود تھی۔ "مجھے اعتراف ہے کہ میری زندگی ایک عورت کے اقرار و انکار میں سمٹ کر رہ گئی۔ میں نے خدا کی اس عظیم نعمت کو نیم باز آنکھوں اور گداز ہونٹوں کی ایک جنبش پر قربان کر دیا۔ یقیناً میرا گناہ معافی کے قابل نہیں' مگر میں کیا کروں؟ مجھے کوئی دوسرا راستہ نظر نہیں آتا۔ میری آنکھوں کی بینائی زائل ہو چکی ہے۔"

میری فکر چھوڑ دو ٹھاکر! میں تو ایک دریدہ بدن عورت ہوں۔ مجھے کسی شریف اور پاکباز مرد کی رفاقت کا حق حاصل نہیں' مگر تم اپنی دنیا میں چلے جاؤ اور اس ناتواں عورت کو سسک سسک کر مرنے سے بچالو جو قبر کے کنارے بیٹھی ہے اور جو تمہاری جنم داتا ہے۔ یاسمین خانم اور سعدیہ خانم دونوں عورتیں ہیں' ایک نے تم پر عذاب ناک موت نازل کی ہے اور دوسری نے تمہیں جنم دیا ہے۔ موت اور زندگی دینے والوں کے ساتھ ایسا سلوک روا نہیں رکھا جاتا۔

"میں تم سے یہی کہنے آیا ہوں شکنتلا! شجاع الدین کامران نے اپنے آپ پر جبر کیا اور آنسوؤں کے سمندر کو پی گیا۔ "مجھے یقین ہے کہ ایک دن یہ جور و جفا کا زندان ضرور ٹوٹے گا اور تم آزادی کا اجالا دیکھو گی۔ اگر تمہاری زندگی میں وہ لمحہ آ جائے تو میری ماں کے پاس جانا اور انہیں میری روپوشی کا راز بتا دینا۔ میں نرسنگا کے پاس واپس جا رہا ہوں۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو وہ میری ماں کو قتل کر دیتا۔ نرسنگا کی یہی شرط تھی۔

شکنتلا کے دل و دماغ ایک بار پھر شدید زلزلے کی زد میں آ گئے۔ دیوداسی کچھ کہنا چاہتی تھی مگر کامران تیزی کے ساتھ باہر نکل گیا۔ رخصت کے بعد بہت دیر تک دیوداسی کو کامران کے الفاظ کی بازگشت سنائی دیتی رہی۔ کمرے سے نکلتے ہی اس نے کہا تھا۔

"شکنتلا! اپنا دروازہ بند کر لینا۔ میں لوٹ کر نہیں آؤں گا۔"

❋❋❋

شجاع الدین کامران تہ خانے کی راہ داری سے گزر کر پجاری رام سروپ کے کمرے میں پہنچا۔ ٹھاکر کرشن راؤ غائب تھا اور رام سروپ صبح کی پوجا کی تیاریاں کر رہا تھا۔ کامران نے ایک لمحہ ٹھہرے بغیر رام سروپ سے کہا۔

"ٹھاکر سے کہہ دینا میں سردار نرسنگا کے پاس جا رہا ہوں۔"

پجاری رام سروپ نے مزید کچھ پوچھنا چاہا مگر کامران نے مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔
پھر جب وہ جنگل پہنچا تو سورج کی تیز روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔
نرسنگا نے فوراً ہی کامران کو اپنی خلوت گاہ میں بلا لیا۔
"آؤ ٹھاکر! تجھے یہ فتح مبارک ہو۔" نرسنگا شکار کئے ہوئے ہرن کا گوشت کھا رہا تھا اور قریب ہی شراب سے بھری ہوئی صراحی رکھی تھی۔ امر پالی بھی اس وقت وہاں موجود تھی اور اس کی آنکھوں میں ایک مسرت بھری چمک تیرتی نظر آ رہی تھی۔
"ہاں سردار! تجھے بھی یہ فتح مبارک ہو کہ تیری ہی وجہ سے مجھے یہ دن دیکھنا نصیب ہوا۔" کامران نے اپنے لہجے کو اعتدال میں رکھنے کی بھرپور کوشش کی تھی' مگر وہ جذبوں کی شکستگی کو نرسنگا سے پوشیدہ رکھنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔
"یہ کیسی ناتواں زبان میں بات کر رہا ہے ٹھاکر!" سردار نرسنگا نے ہرن کی ایک کمزور سی ہڈی کو چباتے ہوئے کہا۔ "فتح حاصل کرنے والے ایسے جھکے ہوئے لہجے میں بات نہیں کرتے' میرے آدمیوں نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے کہ تیرے خونیں پنجوں کو دیکھ کر قائم خان کس طرح بکری بن گیا تھا؟"
پھر جب کامران نے اپنی شکست کا المناک افسانہ سنایا تو سردار نرسنگا کسی شیر کی طرح دھاڑنے لگا۔
"تو نے میری ساری محنت پر پانی پھیر دیا ٹھاکر! اگر اس لڑکی نے تجھ سے کیا ہوا عہد توڑ دیا تھا تو پھر تو اسے یہاں اٹھا کر کیوں نہیں لے آیا۔ تو خوب جانتا ہے کہ نرسنگا کے مذہب میں وعدہ شکن لوگوں کیلئے معافی کی کوئی گنجائش نہیں۔"
"نہیں سردار! اس نے اپنا عہد نہیں توڑا۔" کامران کی آواز بجھی بجھی تھی۔ "وہ میری نظر کا فریب تھا کہ میں نے اس کی سادہ سی باتوں کو محبت کا اقرار سمجھ لیا۔"
"کچھ بھی ہو۔ اس لڑکی کو یہاں آنا چاہئے۔" نرسنگا کے لہجے کی گرج میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ "اب وہ تیری پریمیکا (محبوبہ) نہیں' داسی بن کر رہے گی۔ یہی نرسنگا کا فیصلہ ہے۔ تیرا سردار اپنی پسندیدہ چیز کو دوسروں کی ہوس کار نظروں کا نشانہ بننے کیلئے کبھی نہیں چھوڑتا۔ اس بے وفا لڑکی کو بھی اس جنگل میں آنا پڑے گا۔ یہ کہہ کر سردار نرسنگا نے اپنے مسلح محافظوں کو بلانا چاہا' مگر شجاع الدین کامران نے شدید اضطراب میں مبتلا ہو کر دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔
"میں تجھ سے التجا کرتا ہوں سردار تو اپنا فیصلہ واپس لے لے۔ میں نے اس لڑکی کو معاف کر دیا' تو بھی اپنے دیوتاؤں کی خاطر اسے معاف کر دے۔" زندگی میں پہلی بار شجاع الدین کامران کے لہجے پر کسی بھکاری کے لہجے کا گمان ہو رہا تھا۔
"تو نے مجھے بڑی سخت قسم دے دی ٹھاکر! مگر مجھے اتنا تو بتا دے کہ آخر تو اس بے رحم دنیا میں کس طرح زندگی بسر کرے گا؟"
"میں اپنا سب کچھ ہار گیا سردار!" نرسنگا کو بدلا ہوا دیکھ کر کامران کی جان میں جان آئی۔ "تو بھی مجھے ایک لاش سمجھ لے کہ اب میں زندہ ہی کہاں ہوں؟"
"تو نے ایک بے وفا لڑکی پر اتنی قیمتی زندگی نچھاور کر دی۔" نرسنگا نے غضب ناک لہجے میں کہا۔ "تو نے تو میرے سارے اندازوں کو جھٹلا دیا۔ اگر تجھے کسی پازیب پر سر رکھ کر ہی مرنا تھا تو پھر تلوار ہاتھ میں کیوں لی تھی؟ تو تو بڑا نکما نکلا ٹھاکر! تو نے میرے ہنر کو بھی رسوا کر ڈالا۔"
"ہاں سردار! میں دنیا کا سب سے ناکارہ انسان ہوں۔ مجھے معاف کر دے اور یہاں سے چلا جانے دے۔"

کامران درخواست گزاری کے انداز میں بول رہا تھا۔
یہاں سے نکل کر کہاں جائے گا۔ نرسنگا بھڑک اٹھا۔
''جنگل جنگل' صحرا صحرا گھومتا پھروں گا۔ یہاں تک کہ ایک دن مجھے موت آجائے گی۔'' اب جنگجو کامران مکمل طور پر ایک شکستہ دل عاشق کے پیکر میں ڈھل چکا تھا۔
''میں نے تجھ سے پہلے کہہ دیا تھا کہ اس جنگل میں داخل ہونے کے بعد واپسی کے تمام دروازے بند ہوجاتے ہیں۔ نرسنگا کا لہجہ شرربار تھا۔'' اگر تو کسی کام کے قابل نہیں رہا تو پھر ان درختوں سے سر ٹکرا اور پرندوں کو اپنے عشق کی ناکامی کی داستان سنا۔ میرا یہ طریقہ نہیں کہ میں آنکھیں بند کر کے کسی کو معتبر سمجھ لوں۔''
''سردار نرسنگا اپنے فیصلے پر قائم تھا۔''
امر پالی نے کامران کی حالت زار دیکھ کر درمیان میں مداخلت کی۔'' سردار! اسے جانے دے۔ اپنے عذابوں میں گرفتار یہ نوجوان تیرے اعتبار کو دھوکہ دینے کے قابل ہی کہاں رہا؟''
اگرچہ نرسنگا امر پالی کے خوفناک ترین مطالبے کو بھی مسترد نہیں کرتا تھا' مگر کامران کی رہائی کی بات سن کر اس نے اپنی محبوب کو بھی جھڑک دیا۔
''امر پالی! تو مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہے مگر نرسنگا اپنے کاروبار میں کسی کی مداخلت گوارا نہیں کرتا۔ میرے پیشے کی کتاب میں اعتبار نام کا کوئی لفظ موجود نہیں۔ اس لئے مجھ سے ایسا کوئی مطالبہ نہ کر کہ میں تیرا دل بھی توڑ دوں۔''
امر پالی خاموش ہوگئی اور شجاع الدین کامران پر مہذب دنیا میں واپسی کے تمام دروازے بند ہوگئے۔

❋❋❋

قائم خان کے مسلح مخبر کئی روز سے دن رات سعدیہ خانم کے مکان کے قریب پہرہ دے رہے تھے' پھر جب کامران لوٹ کر نہیں آیا تو ان لوگوں نے اپنے آقا کو خبردار کر دیا۔
قائم خان انتہائی بدحواسی کے عالم میں قاضی عماد کے گھر پہنچا اور اسے اس سنگین حادثے کی اطلاع دی۔
چند لمحوں کیلئے قاضی عماد اپنے ہوش کھو بیٹھا' پھر اس نے اپنی دستار اتار کر مسند پر رکھتے ہوئے کہا۔
''قائم خان! اس دستاویز کو ہر قیمت پر حاصل کرلو ورنہ ہم پوری دہلی میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔''
قائم خان اور قاضی عماد میں بہت دیر تک سرگوشیاں ہوتی رہیں۔
اور پھر اسی رات قائم خان اپنے مسلح محافظوں کے ساتھ سعدیہ خانم کے مکان کی طرف بڑھ رہا تھا۔

❋❋❋

آدھی رات کے قریب قائم خان اپنے مسلح خدمت گاروں کے ساتھ سعدیہ خانم کے کھنڈر تک پہنچا۔ قائم خان نے بڑی احتیاط اور ہوشیاری کے ساتھ منصوبہ بندی کی تھی۔ پہلے اس نے اپنے مخبروں کو بھیج کر یہ راز معلوم کر لیا تھا کہ سعدیہ خانم اپنے مکان میں تنہا ہے اور شجاع الدین کامران ابھی تک واپس نہیں لوٹا ہے۔ مکمل طور پر صورتحال کا جائزہ لینے کے بعد قائم خان نے ان دونوں راستوں کی ناکہ بندی کر دی جن سے گزر کر گلی کے اندر داخل ہوا جا سکتا تھا۔ دور دور پہرہ دینے والے محافظوں کو تنبیہ کر دی گئی تھی کہ اگر حملہ آور ہزاروں کی تعداد میں ہوں تو کوئی شخص اپنا مورچہ تبدیل نہیں کرے گا چاہے اس کشمکش میں اس کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔ قائم خان نے اپنے تمام خدمت گاروں کو بہترین ہتھیار فراہم کئے تھے ہر ایک محافظ شمشیر و سناں کے علاوہ تیر و کمان سے بھی مسلح کر دیا گیا تھا۔ یہ احتیاطی تدبیر محض اس لئے تھی کہ اگر حملہ آور زیادہ تعداد میں ہوں تو انہیں سعدیہ خانم کے مکان تک پہنچنے سے پہلے ہی زہریلے تیروں کا نشانہ بنا کر ہلاک کر دیا جائے۔ قائم خان کی دور اندیشیوں نے اسے مختلف وسوسوں میں مبتلا کر دیا تھا ورنہ سعدیہ خانم کے مکان کی طرف جانے والا راستہ سرشام ہی سنسان ہو جاتا تھا۔

اپنے جرائم کی دستاویز کو مٹانے کیلئے قاضی عماد بھی قائم خان کے ساتھ بھرپور تعاون کر رہا تھا' اس نے اپنے کئی معتبر اور جاں باز خدمت گاروں کو قائم خان کے پاس بھجوا دیا تھا۔ اس طرح اگر کوئی اجنبی شخص ان مسلح آدمیوں کا اجتماع دیکھ لیتا تو اسے یہی گمان ہوتا کہ یہ کوئی مختصر سا فوجی محاذ ہے۔ جہاں دشمن پر یلغار کی تیاریاں کی جا رہی ہیں۔

اپنے گرد و پیش سے پوری طرح باخبر ہونے کے بعد قائم خان اپنے محافظوں کے نرغے میں آگے بڑھا اور سعدیہ خانم کے مکان تک پہنچ گیا۔

سعدیہ خانم حسب دستور اپنے بیٹے کے انتظار میں دروازے سے سر ٹیکے تصویر یاس بنی بیٹھی تھی جیسے ہی بوڑھی عورت نے تیز قدموں کی چاپ سنی وہ چونک کر بولی۔ ''کون؟ شجاع الدین کامران؟''

''نہیں! میں ہوں قائم خان۔'' سعدیہ خانم کے بھائی نے قریب پہنچ کر کہا۔ ''میں تمہارے لئے کامران کا پیغام لے کر آیا ہوں۔ ایک بہت ہی خفیہ پیغام! آؤ اندر چلو!''

سعدیہ خانم گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ ''بھائی صاحب آپ؟'' قائم خان کو اپنے روبرو دیکھ کر سعدیہ خانم شدید حیرت میں مبتلا ہو گئی تھی۔

''ہاں! مجھے کامران نے تمہارے پاس بھیجا ہے۔ اندر چلو۔'' قائم خان نے جھوٹ اور عیاری سے کام لیتے ہوئے کہا۔ دراصل وہ اپنی بہن کو اس لئے اندر لے جانا چاہتا تھا کہ کہیں سعدیہ خانم کے منہ سے کوئی چیخ نہ نکل جائے اور پھر قرب و جوار کے لوگ جاگ جائیں۔

''یہ کون لوگ ہیں؟'' سعدیہ خانم نے ان نقاب پوشوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا' جو قائم خان سے چند

قدم کے فاصلے پر مستعد کھڑے تھے۔

''یہ کامران کے آدمی ہیں جو آدمی رات کے وقت میرے پاس اس کا پیغام لے کر آئے ہیں۔'' قائم خان نے اپنی مجبور بہن کو ایک اور جھوٹ بول کر مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

سعدیہ خانم ابھی تک صورتحال کو سمجھنے سے قاصر تھی' مگر یہ سوچ کر اندر چلی گئی کہ وہ نامحرم مردوں کا سامنا نہیں کر سکتی تھی۔ کمرے میں جاتے ہی قائم خان نے دروازہ بند کر دیا اور انتہائی غضب ناک لہجے میں بہن سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

''سعدیہ! پورے ہوش وحواس کے ساتھ میری بات سن لے۔'' قائم خان کے تیور اچانک بدل گئے تھے اور اب وہ کسی کمزور سے جانور کے سامنے ایک بے رحم قصاب نظر آ رہا تھا۔ ''تیرے بیٹے کامران نے مجھے جس طرح ذلیل ورسوا کرنے کی کوشش کی ہے' وہ ناقابل معافی جرم ہے۔ اس نے بے شمار قزاقوں کے ذریعے مجھے مجبور کر دیا تھا کہ میں ایک کاغذ پر اپنا گناہ تحریر کر دوں۔ میں نے جان بچانے کیلئے اس وقت ایک بے بنیاد اور جھوٹی عبارت لکھ کر اس کے سپرد کر دی تھی' مگر آج میں ہر خوف سے آزاد ہوں اور تجھ سے وہ کاغذ طلب کرنے آیا ہوں جسے تو عنقریب دربار سلطانی میں پیش کرنے والی ہے۔''

سعدیہ خانم ایک لمحے میں حقیقت حال سے واقف ہو چکی تھی۔ ''آخر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں بھائی صاحب؟'' سعدیہ خانم کا لہجہ شائستہ بھی تھا اور خوف ودہشت سے بے نیاز بھی۔

''میں تجھے بتانے آیا ہوں کہ وہ رات تیرے بیٹے کی رات تھی جب اس نے میری شہ رگ پر خنجر رکھ کر مجھ سے اس گناہ کا اقرار کرا لیا تھا جس کے بارے میں میں نے سوچا تک نہیں۔'' قائم خان پوری بے حسی کے ساتھ جھوٹ بول رہا تھا۔ ''وہ رات گزرنے کیلئے تھی' سو گزر گئی...... مگر آج کی رات تجھ پر بہت بھاری ہے سعدیہ! میں اسے گزرنے نہیں دوں گا۔'' قائم خان نے نخوت وغرور کی آخری حدوں کو چھو لیا تھا۔ ''میرے ہاتھوں میں بے پناہ طاقت ہے۔ میں انہیں اس طرح استعمال کروں گا کہ وقت کی رفتار رک جائے گی۔''

اس قدر سنگین فضا میں سعدیہ خانم مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔ ''یہ آپ کی بڑی بھیانک خوش فہمی ہے بھائی صاحب! وقت صرف خدا کے حکم کا نام ہے اور اپنے حکم کو وہ خود ہی روک سکتا ہے۔''

قائم خان اپنی بہن کا یہ اطمینان دیکھ کر پاگل سا ہو گیا۔ ''آج رات میری تلوار تیری شہ رگ پر ہو گی اور تجھے اس وقت تک خوف مرگ سے نجات نہیں ملے گی جب تک میں اپنا تحریر کردہ وہ کاغذ حاصل نہیں کر لوں گا۔'' قائم خان نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر بڑے سفاکانہ انداز میں سعدیہ خانم کو تنبیہ کی۔

سعدیہ خانم کے ہونٹوں کی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہو گئی۔ ''اپنی شمشیر کو نیام میں کر لو قائم خان! تم اس عورت کو موت کی دھمکیاں دے رہے ہو جو مسلسل پچیس سال سے مستقل اس انتظار میں کھڑی ہے کہ کب قضا آئے اور وہ آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لے۔''

قائم خان ایک لمحے کیلئے جھجک گیا' مگر فوراً ہی درندگی کے مظاہرے پر اتر آیا۔ اس کا ہاتھ بلند ہوا اور سعدیہ خانم کے رخسار پر گہرا نشان چھوڑ گیا۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ نحیف وناتواں عورت لڑکھڑائی اور پھر دیوار سے اس طرح ٹکرا گئی کہ اس کے سر سے خون جاری ہو گیا۔

''قائم خان! اگر میرے جسم کے ٹکڑے بھی ہو جائیں تو میں وہ کاغذ تیرے حوالے نہیں کروں گی۔'' سعدیہ خانم نے اٹھنے کی کوشش کی۔ وہ کاغذ میرے بیٹے کی بے گناہی کی دستاویز ہے۔

"میں تجھے بھی مٹا دوں گا سعدیہ! اور اس دستاویز کو بھی......" قائم خان نے ایک بار پھر اپنی طاقت کا بھرپور مظاہرہ کیا اور سعدیہ خانم کے سر پر ایک اور زخم ابھر آیا۔ "خون کے رشتے نے میرے ہاتھوں میں زنجیریں ڈال دی ہیں ورنہ اب تک تیری سانسوں کا کھیل ختم ہو چکا ہوتا۔"

سعدیہ خانم نے اپنے چہرے کا خون صاف کیا' کچھ دیر تک رنگین ہاتھوں کو غور سے دیکھتی رہی اور پھر بڑے کرب ناک لہجے میں بولی۔

"میرے خون کا ایک ایک قطرہ بہا دے' مگر تجھے مایوسی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔"

قائم خان پر جنون طاری ہو گیا۔ اس نے کاغذ حاصل کرنے کیلئے سعدیہ خانم کے کمزور جسم کو کئی بار تشدد کا نشانہ بنایا' یہاں تک کہ اس کی بیوہ بہن بے ہوش ہو گئی۔ حواس کھونے سے پہلے تک سعدیہ خانم چند مخصوص الفاظ کی گردان کرتی رہی۔

"ایسا نہیں ہو سکتا قائم خان! میں اپنے بیٹے کو زندگی بھر کیلئے رسوائیوں کے حوالے نہیں کر سکتی۔"

قائم خان نے ایک نظر سعدیہ خانم کو دیکھا جو بے ہوش ہو چکی تھی' پھر اپنے آدمیوں سے مخاطب ہو کر بولا۔

"وقت بہت کم ہے۔ گھر کا ایک ایک گوشہ دیکھ ڈالو۔"

مسلح محافظوں نے مختصر سے سامان کی تلاشی لی' مگر وہاں مطلوبہ کاغذ موجود نہیں تھا۔

قائم خان نے بدحواس ہو کر اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ مکان کا فرش کھود ڈالیں...... مگر جب اسے بتایا گیا کہ فرش پر ایسا کوئی نشان موجود نہیں جس سے کسی چیز کے زیر زمین چھپانے کا اندازہ کیا جا سکے تو وہ مزید حواس باختہ ہو گیا۔ اس نے وحشت کے عالم میں کھانے اور پینے کے برتنوں کو بھی دیکھ ڈالا۔

وقت گزرتا جا رہا تھا اور رات کی سیاہی آہستہ آہستہ ہلکی ہوتی جا رہی تھی۔

قائم خان کے آدمی بھوکے درندوں کی طرح اپنے شکار کو ڈھونڈ رہے تھے۔ آخر انہیں پتھروں کے ڈھیر کے نیچے کپڑے کا ایک بڑا سا رومال نظر آیا۔ یہ پتھر اسی وقت سے ایک طرف پڑے ہوئے تھے' جب رائے نعیم الدین ذیشان کا مکان مسمار کیا گیا تھا۔ گردش ماہ و سال نے پتھروں پر کائی کی اتنی موٹی تہہ جما دی تھی کہ ان کی طرف سے کسی کا دھیان بھی نہیں جا سکتا تھا۔ سعدیہ خانم نے کامران کے دیئے ہوئے کاغذ کو ایک کپڑے میں لپیٹ کر ان ہی پتھروں کے نیچے دبا دیا تھا۔

جب قائم خان نے گھبرا کر رومال کو کھولا تو فرط مسرت سے اس کی دبی دبی چیخ نکل گئی۔ مطلوبہ کاغذ رومال میں لپٹا ہوا تھا۔

"اب میرے جرم کا کوئی نشان باقی نہیں رہے گا۔"

قائم خان نے خود کلامی کے انداز میں کہا اور باہر کی طرف جانے لگا۔ اسی وقت سعدیہ خانم کے ہونٹوں سے ایک کراہ نکلی...... اور اسی وقت سناٹے میں مؤذن کی آواز ابھری" ...... اللہ اکبر......"

"خدا کا شکر ہے کہ تمام کام وقت پر ہو گئے۔ قائم خان اپنے آدمیوں سے مخاطب ہوا۔" اس سے پہلے کہ لوگ بیدار ہو کر مکانوں سے نکل آئیں' ہمیں اپنے قدموں کی رفتار بڑھا دینی چاہئے۔

❋❋❋

قائم خان اور سعدیہ خانم کے مکانوں میں زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ قائم خان فتح کے نشے میں ڈوبا ہوا تیز رفتاری کے ساتھ اپنے گھر پہنچا۔ یاسمین خان اور اس کی ماں شدید بے چینی کے عالم میں قائم خان کا انتظار کر رہی تھیں۔

شوہر کو دیکھتے ہی یاسمین خانم کی ماں نے اضطراری لہجے میں کہا..... ''خدا کیلئے مجھے بتایئے کہ آپ کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا؟''

''سب کچھ میری مرضی کے مطابق ہوگیا۔'' قائم خان کی آواز پرمسرت جوش سے لبریز تھی۔ ''میں وہاں سے کامیاب لوٹا ہوں خانم!''

قائم خان کی بیوی نے آنکھیں بند کرلیں۔ اس کے ہونٹ لرز رہے تھے اور وہ اپنے شوہر کی کامیابی پر خدا کا شکر ادا کر رہی تھی۔

پھر جب یہ ہیجان انگیز لمحات گزر گئے تو یاسمین خانم کی ماں نے قائم خان سے واقعہ کی تفصیل دریافت کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ کو ان قزاقوں سے تو سابقہ نہیں پڑا' جو اس رات فرشتہ اجل بن کر حویلی میں آئے تھے؟''

قائم خان کچھ دیر خاموش رہا۔ وہ اپنے اعصاب کو سکون پہنچانے کیلئے شربت نیلوفر سے بھرا ہوا پیالہ پی رہا تھا۔ یاسمین خانم کی ماں مسلسل شوہر کے چہرے کو دیکھے جا رہی تھی۔ آخر قائم خان نے پرسکون لہجے میں بیوی کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

''میں اب تک نہیں سمجھ سکا کہ وہ سادھو نما قزاق کون تھے اور کامران سے ان کا کیا تعلق ہے؟'' اچانک قائم خان کے ماتھے پر کئی شکنیں ابھر آئیں۔ ''میں ان ہی نامعلوم لٹیروں کی وجہ سے پریشان ہوں۔'' یہ کہہ کر قائم خان نے اپنی بیوی کو پورا واقعہ سنا دیا۔

''آپ کو پورا یقین ہے کہ سعدیہ ابھی تک زندہ ہوگی؟'' قائم خان کی بیوی نے پوچھا۔

''بظاہر کوئی ضرب اتنی شدید نہیں تھی کہ اس کی موت واقع ہوجائے۔'' قائم خان نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''اگر اس کا زخمی ہوجانا بھی میرے لئے بڑی پریشانیوں کا سبب بن سکتا ہے۔''

''وہ کس طرح؟'' یاسمین خانم کی ماں نے گھبرا کر پوچھا۔

''جب کامران کو اپنی ماں کی اس حالت کا علم ہوگا تو دوبارہ اس کے جذبات مشتعل ہوسکتے ہیں۔'' اب قائم خان کے چہرے سے اضطراب جھلکنے لگا تھا۔ ''مجھے اندازہ ہوگیا ہے کہ وہ اپنی ماں کے سلسلے میں کس قدر حساس ہے؟''

''وہ نامراد لڑکا ہمارا کیا بگاڑ سکتا ہے؟'' یاسمین خانم کی ماں نے انتہائی تیز لہجے میں کہا۔

''اب وہ تنہا نہیں ہے خانم!'' قائم خان کی آواز سے خفگی کا اظہار ہونے لگا تھا۔ ''میری نظر میں کامران کی کوئی اہمیت نہیں' مگر میں حیران ہوں کہ اس کے اتنے حمایتی کہاں سے آگئے؟ وہ اپنے ان ہی ساتھیوں کے ہمراہ دوبارہ بھی پلٹ کر آسکتا ہے۔ اگر ایسا ہوا تو یہ ایک مشکل صورتحال ہوگی۔''

پھر اس کا کیا تدارک ہوسکتا ہے؟'' وہ مغرور و متکبر بھی خوفزدہ نظر آنے لگی تھی۔

''فی الوقت میں قاضی عماد کے پاس جا رہا ہوں۔'' قائم خان نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''میں نے حویلی کے محافظوں کی نفری بڑھا دی ہے لیکن حفاظتی انتظامات ابھی کافی نہیں مجھے کچھ اور سوچنا پڑے گا۔''

یہ کہہ کر قائم خان حویلی سے نکل گیا' مگر وہ تنہا نہیں تھا۔ اس کے آس پاس کئی طاقتور اور مسلح محافظ موجود تھے۔

❋❋❋

قاضی عماد بہت پریشان نظر آرہے تھے۔ عدالت جانے کا وقت ہوچکا تھا اور ابھی تک قائم خان نے انہیں کوئی مثبت اطلاع نہیں دی تھی۔ پھر جیسے جیسے قاضی عماد کے ملازم نے انہیں قائم خان کے آنے کی خبر دی' وہ بے قرار ہوکر مردانہ نشست گاہ میں داخل ہوگئے اور کسی وحشت زدہ انسان کی مانند اٹھنے لگے۔

کیا ہوا قائم خان؟'' قاضی عماد کی آواز میں ہلکا سا ارتعاش تھا۔
قائم خان نے آبنوس کی منقش کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔''خدا نے ہماری پردہ پوشی کرلی قاضی صاحب! ورنہ یہ چہرے تو سیاہ ہوچکے تھے۔بس سربازاران کا تماشا باقی رہ گیا تھا۔
قاضی عماد کانپ کر رہ گئے اور پھر لرزتے ہاتھوں سے اس کاغذ کو دیکھنے لگے جس پر قائم خان نے اپنے جرم کا اقرار نامہ تحریر کیا تھا۔
''بے شک! خدا اپنے بندوں کے عیب چھپانے والا ہے۔'' قاضی عماد کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ پھر انہوں نے تیزی سے آگے بڑھ کر اپنے جرم کی دستاویز کو آگ میں ڈال دیا۔ کچھ دیر تک کاغذ جلتا رہا۔قاضی عماد کو قائم خان بہت غور سے راکھ کے اس مختصر سے ڈھیر کو دیکھتے رہے جس پر کچھ نقوش ابھر آئے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ وہ نقوش بھی غائب ہوگئے۔
قائم خان نے ایک گہری سانس لی اور بہت تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔
''ہمارا جرم آتش دان کے سینے میں اس طرح دفن ہوگیا ہے کہ اب اسے دنیا کا کوئی منصف بھی تلاش نہیں کرسکتا۔''
یک بیک قائم خان کے ہونٹوں پر ایک آسودہ مسکراہٹ ابھر آئی تھی۔
قاضی عماد چند لمحوں تک کسی مجسمے کی طرح ساکت کھڑے رہے' پھر کسی درماندہ انسان کی مانند قائم خان کے برابر کی نشست پر بیٹھتے ہوئے بولے۔''ہاں! ہم نے اپنے جرم کا نشان مٹا دیا ہے۔اب اسے کسی انسان کی آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔'' قاضی عماد کی آواز بہت دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی' مگر ایک آنکھ ایسی بھی ہے قائم خان کہ اس کی گرفت سے حقیر ترین ذرہ بھی محفوظ نہیں رہ سکتا۔
''کیسی آنکھ؟'' قاضی عماد نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔''وہ آنکھ جو ہر وقت روشن اور بیدار رہتی ہے' جسے کبھی ہلکی سی اونگھ نہیں آسکتی۔''
''قاضی! آج تمہیں یہ کیا ہوگیا ہے؟'' قائم خان بدحواس نظر آنے لگا۔'' تمہاری بہکی بہکی باتیں میری سمجھ میں نہیں آرہی ہیں۔''
قاضی عماد نے چھت میں آویزاں قیمتی فانوس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔''خدا نے مجھے اپنی بیشمار نعمتوں سے نوازا' مگر میں نے کبھی اس کا شکر ادا نہیں کیا اور گمراہی کے راستے پر چل نکلا۔روپہلی اور طلائی سکے میرا مذہب بن کر رہ گئے۔ پہلے میں نے اس بیوہ عورت کے ساتھ بدسلوکی کی اور پھر اس کے یتیم بچے کو بے گناہ ہوتے ہوئے بھی مجرموں کی صف میں کھڑا کردیا۔کل رات کچھ دیر کیلئے میری آنکھ لگ گئی تھی۔ میں نے ایک اجنبی شخص کو خواب میں دیکھا۔ اس کا پورا جسم خون میں ڈوبا ہوا تھا۔ اجنبی نے آگے بڑھ کر میرا دامن پکڑ لیا اور چیخ چیخ کر کہنے لگا۔ میں رائے نعیم الدین ہوں' شجاع الدین کامران کا باپ۔ قاضی! تو خدا سے نہیں ڈرتا۔عنقریب آخرت کی عدالت آراستہ ہونے والی ہے۔ پھر میرے ہاتھوں میں تیرا گریبان ہوگا اور میں منصف حقیقی سے انصاف طلب کروں گا کہ میری بیوی اور بچے کو آخر کس گناہ کی سزا دی گئی تھی۔'' قاضی عماد کے پورے بدن پر لرزہ طاری تھا۔''قائم خان! پھر میری آنکھ کھل گئی۔ میں ایک لمحے کیلئے بھی سو نہیں سکا ہوں۔رات بھر خدا سے یہی دعا کرتا رہا کہ مجھے اس دنیا میں رسوائی سے بچا لے۔ اگر میرے جرم کا نشان مٹ جائے تو میں لوگوں کے ساتھ پورا پورا انصاف کروں گا۔ خدا نے میری دعا سن لی اور وہ کاغذ آسانی کے ساتھ تمہارے ہاتھ آگیا۔اب میں تمہیں بھی یہی نصیحت کرتا ہوں کہ گناہ کے کوچے سے باہر نکل

آؤ اور نیکیوں کا راستہ تلاش کرو۔ فراخدلی کے ساتھ اس مظلوم نوجوان کو معاف کردو اور اپنی بیوہ بہن کی یہاں تک دلجوئی کرو کہ وہ ماضی کی دل آزاریوں کو بھول جائے۔"

قاضی عماد کی گفتگو سن کر قائم خان حیران رہ گیا۔

"قاضی! یہ تم کہہ رہے ہو؟" قائم خان کے لہجے میں بڑی تلخی پوشیدہ تھی۔

"ہاں! یہ میرے الفاظ ہیں قائم خان!" قاضی عماد نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "اب میں خدا کی بخشی ہوئی نعمتوں کا شکر ادا کرنا چاہتا ہوں اور تمہیں بھی دعوت دیتا ہوں کہ سیدھے راستے کی طرف لوٹ آؤ۔ عمر بہت بے وفا شے ہے قائم خان! کون جانے کہ کہاں ٹھوکر لگے اور شیشہ جاں چور چور ہو جائے اور پھر ہمیں توبہ کی مہلت بھی نہ مل سکے۔"

"میری توبہ کیلئے ابھی بہت وقت پڑا ہے قاضی!" قائم خان نے تحقیر آمیز لہجے میں کہا۔ "ایسا لگتا ہے کہ تمہاری نیت میں خرابی پیدا ہو گئی ہے۔ میں بہت دیر سے تمہارا یہ خشک اور طویل وعظ سن رہا ہوں۔ مجھے ان بے اثر تقریروں کی نہیں، تمہارے تعاون کی ضرورت ہے۔" قائم خان اس طرح گفتگو کر رہا تھا جیسے وہ قاضی عماد کو حکم دے رہا ہو۔

"اب تم مجھ سے کس قسم کا تعاون چاہتے ہو؟" قاضی عماد نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"جب تک وہ لڑکا اپنے انجام کو نہیں پہنچ جاتا، تمہیں اسی راستے پر میرے شانہ بشانہ چلنا ہوگا۔" قائم خان نے اونچی آواز میں کہا۔

"نہیں قائم خان! اب میں بدی کے راستے پر تمہارا ہم سفر نہیں ہو سکتا۔" قاضی عماد کا لہجہ بھی سخت ہو گیا تھا۔

"میں نے اپنے ماضی کو فراموش کر دیا ہے، تم بھی گزرے زمانے کے نقوش کو اپنے ذہن سے کھرچ ڈالو۔ بس اسی صورت میں میری تمہاری دوستی قائم رہ سکتی ہے۔"

نہیں قاضی!" قائم خان برہم ہو گیا۔ "میں تمہیں راستہ بدلنے نہیں دوں گا۔"

قاضی عماد ایک سرد مزاج انسان تھے، مگر قائم خان کی مسلسل دھمکیوں نے انہیں بھی مشتعل کر دیا۔ "تم ایک گمراہ کن خوش فہمی کا شکار ہو قائم خان! سلطان کے دربار میں رسائی کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ تم انسانوں اور جانوروں میں فرق کرنا چھوڑ دو۔ میں کوئی وفادار گھوڑا نہیں کہ تمہارے اشاروں پر سر جھکا کر چلوں گا اور نہ میں تمہارا زر خرید غلام ہوں کہ جنبش لب کے ساتھ ہی سجدہ ریز ہو جاؤں گا۔ اپنی طاقت کا اس قدر غلط اندازہ نہ کرو کہ لوگ تمہیں پاگل قرار دے دیں اور پھر تم ایک عبرتناک تماشا بن کر رہ جاؤ۔"

قائم خان غصے سے مغلوب ہو کر کھڑا ہو گیا۔

"قاضی عماد! پورے ہوش و حواس کے ساتھ سن لو کہ تمہیں شجاع الدین کامران کے خلاف مکمل گواہی دینی ہوگی۔" قائم خان کا چہرہ جوش غضب سے تمتما رہا تھا۔

"تمہیں سلطان ناصر الدین کے سامنے کہنا ہوگا کہ اس بدکردار لڑکے کی وجہ سے ہم دونوں کی زندگی اجیرن ہو گئی ہے۔ وہ کسی وقت بھی اپنے ساتھی قزاقوں کی مدد سے ہمیں جانی و مالی نقصان پہنچا سکتا ہے...... اور تمہیں سلطان کے روبرو یہ بھی کہنا ہوگا کہ شجاع الدین کامران شورش پسند ہندوؤں سے مل کر دار الحکومت میں انتشار پھیلانا چاہتا ہے اور تمہیں فرمانروائے ہند کے سامنے طاقتور دلائل کے ساتھ یہ بھی ثابت کرنا ہوگا کہ غدار باپ کا بیٹا فتنہ گروں کے اشتراک سے سلطان کا تختہ الٹنا چاہتا ہے۔" قائم خان کے لہجے سے آمریت جھلک رہی تھی اور وہ قاضی عماد سے

ملازموں جیسا سلوک کر رہا تھا۔

"خدا سے ڈرو قائم خان!" قاضی عماد نے اپنے لہجے کی شائستگی برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ "میں اب اس مظلوم عورت کو زیادہ دکھ نہیں پہنچا سکتا۔"

"اور تمہیں سلطان کو اس بات کیلئے بھی آمادہ کرنا ہوگا کہ وہ شجاع الدین کامران کی گرفتاری کے احکامات جاری کر دیں اور اس کے ساتھ ہی تمام مندروں کی تلاشی لی جائے۔"

"میں خوب جانتا ہوں کہ دہلی میں کہیں شور اور بغاوت کے آثار موجود نہیں ہیں۔ پھر خراج گزار کے خلاف یہ قدم کس طرح اٹھایا جا سکتا ہے۔" قاضی عماد نے اپنے خود غرض اور سفاک دوست کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"پھر میری حویلی پر حملہ کرنے والے وہ سینکڑوں سادھو کہاں سے آئے تھے؟" قائم خان نے چیختے ہوئے کہا۔

"یقیناً مندروں میں زیر زمین کوئی سازش پرورش پا رہی ہے۔"

"تم خود سلطان کے سامنے عرض حال کیوں نہیں کرتے؟" قاضی عماد نے بحث کی۔

"میں اس کام میں تمہیں اپنا شریک بنانا چاہتا ہوں۔" قائم خان نے اپنی فطری عیاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"تو پھر تم مجھ سے ہمیشہ کیلئے مایوس ہو جاؤ قائم خان" قاضی عماد نے اپنے دیرینہ دوست کا مطالبہ ماننے سے صاف انکار کر دیا۔" اب میں اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کی تمہاری بیوہ بہن اور یتیم بھانجے کے ساتھ انصاف کروں گا۔ چاہے حقیقت کے اس اظہار کے بعد میرے چہرے پر سیاہی مل دی جائے اور میری دستار فضیلت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ہوا میں بکھر جائے۔"

قائم خان کسی خون آشام درندے کی طرح نظر آنے لگا۔ "قاضی! اگر تو نے ایسا کیا تو وہ تیری زندگی کا سیاہ ترین دن ہوگا۔" یہ کہہ کر قائم خان واپس جانے کیلئے مڑا۔

"میں اس دنیا کے شب و روز سے نہیں ڈرتا قائم خان۔ قاضی عماد نے پرسکون لہجے میں کہا۔ "اب مجھے صرف حساب کی فکر ہے۔ اگر تو اپنی طاقت کا استعمال کر سکتا ہے تو وہ شوق بھی پورا کر لے۔ انشاء اللہ تجھے میرے قدموں میں لرزش نظر نہیں آئے گی۔"

قائم خان مزید کچھ کہے بغیر قاضی عماد کے مکان سے نکل کر چلا گیا۔

❋❋❋

قائم خان کے جاتے ہی قاضی عماد زنان خانے میں آئے اور کچھ دیر تک اپنی بیوی کو پچھلے واقعات کی تفصیل بتاتے رہے۔ پھر اپنی شریک حیات سے یہ کہہ کر چلے گئے۔

"میں اس مظلوم عورت کی دیکھ بھال کرنے کیلئے جا رہا ہوں جسے انتہائی زخمی حالت میں قائم خان اکیلا چھوڑ آیا ہے۔"

قاضی عماد کی نیک سیرت بیوی شوہر کے اس فیصلے سے مطمئن نظر آ رہی تھی۔

جب قاضی عماد اپنی سواری میں بیٹھ کر سعدیہ خانم کے مکان پر پہنچے تو وہ بے کس و تنہا عورت خون میں نہائی ہوئی بے ہوش پڑی تھی۔ قاضی عماد سعدیہ خانم کی حالت زار دیکھ کر اشکبار ہو گئے۔ پھر تیزی سے زمین پر جھکے اور اپنے دو خدمت گاروں کی مدد سے سعدیہ خانم کو اٹھا کر سواری تک لائے۔

قاضی عماد نے بڑے کرب کے عالم میں اپنے مکان تک کا فاصلہ طے کیا۔ سعدیہ خانم کو زنان خانے کے اندر

پہنچایا اور خود ہی اپنے طبیب دوست کو لینے کیلئے روانہ ہو گئے۔

حکیم اسحاق نے سعدیہ خانم کی نبض کی رفتار دیکھتے ہوئے اطمینان کا اظہار کیا۔ زخموں پر مرہم رکھا اور کچھ تیز اثر دوائیں زخمی عورت کے حلق سے نیچے اتار دیں۔

سعدیہ خانم دوپہر تک ہوش میں آ گئی۔ اپنے آپ کو ایک اجنبی جگہ پا کر وہ شدید حیرت میں مبتلا ہو گئی تھی۔ قاضی عماد نے اس دن عدالت سے رخصت طلب کر لی تھی اور وہ مسلسل سعدیہ خانم کے سرہانے کھڑے ہوئے اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کر رہے تھے۔

ہوش میں آنے اور قاضی عماد کو اپنے سامنے دیکھ کر سعدیہ خانم کے چہرے کا رنگ بدل گیا' وہ اسی وقت بستر سے اٹھ جانا چاہتی تھی مگر قاضی عماد نے سعدیہ خانم کو صورتحال سے آگاہ کیا اور اپنے سابقہ گناہ کی معافی طلب کرتے ہوئے اسے یقین دلایا کہ وہ بہت جلد کامران کو بے قصور ثابت کرنے کی کوشش کریں گے۔

سعدیہ خانم نے بڑے جانگداز لہجے میں قاضی عماد کو اپنے غموں کی داستان سنائی اور ان کے اس بدلے ہوئے طرز عمل کیلئے شکریہ ادا کیا۔

قاضی عماد آنسو خشک کرتے ہوئے مردانہ کمرے میں چلے گئے۔

پھر انہوں نے کچھ سوچ کر قلم اٹھایا اور کاغذ پر مندرجہ ذیل عبارت تحریر کرنے لگے۔

''سلطان معظم کے نام!

میں فرمانروائے ہند کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ شجاع الدین کامران پسر رائے نعیم الدین ذیشان انصاف کی نظر میں یکسر بے گناہ ہے۔ میں نے چند جھوٹی شہادتوں کی بنیاد پر غلط فیصلہ دیا اور ایک معصوم نوجوان کو معاشرے کی نگاہ میں سزا یافتہ مجرم بنا دیا۔ یہ چند سطریں اس لئے سپرد قلم کر رہا ہوں کہ انسانی زندگی کا کوئی اعتبار نہیں۔ اگر میں عدالت عالیہ تک نہ پہنچ سکوں تو میری تحریر کو زندہ گواہی سمجھ کر سلطان محتشم اس نوجوان کے ساتھ انصاف فرما دیں جو مجھ ناقص اور گنہگار کی غلطی کے سبب در در بھٹک رہا ہے۔

بندہ عاجز قاضی عماد

اس کے بعد انہوں نے کاغذ پر اپنی مہر ثبت کی اور بیوی کو طلب کرتے ہوئے کہا۔

''اگر میں اس دنیا میں نہ رہوں تو تم پر لازم ہے کہ سلطان کی بارگاہ میں حاضر ہو کر اس مظلوم نوجوان کیلئے انصاف طلب کرو۔ یہی میری پہلی اور آخری وصیت ہے۔''

''قاضی عماد کی بیوی شوہر کی تحریر پڑھ کر وحشت زدہ ہو گئیں' مگر قاضی عماد نے انہیں یہ کہہ کر مطمئن کر دیا کہ یہ محض ایک احتیاطی تدبیر ہے۔

✽✽✽

قائم خان کے مخبر اسے قاضی عماد کے بارے میں مسلسل خبریں دے رہے تھے کہ وہ کس طرح سعدیہ خانم کے مکان تک آئے اور زخمی عورت کو اٹھا کر اپنے ہمراہ لے گئے۔

پھر اسی رات قائم خان کے آدمیوں نے قاضی عماد کو قتل کر دیا۔

کامران کی بے گناہی کی ایک معتبر شہادت مٹا دی گئی۔

✽✽✽

جب قائم خان کے آدمیوں نے اسے قاضی عماد کے قتل کی خبر دی اس وقت وہ امیر طغرل بیگ کے ساتھ اپنی مردانہ نشست گاہ میں بیٹھا شراب پی رہا تھا۔ قائم خان نے طغرل بیگ سے معذرت کی اور لڑکھڑاتے قدموں سے اٹھ کر حویلی کے باغیچے میں چلا آیا۔

''تم پر کسی کو شک تو نہیں ہوا'' قائم خان کی آواز میں گہرا ارتعاش تھا۔

''یہ کیسے ممکن ہے سردار!'' ایک خادم نے پرجوش لہجے میں کہا۔ ''ہم سب کے سب سادھوؤں کے بھیس میں قاضی عماد کے گھر تک پہنچے تھے۔ اگر کسی نے ہمیں وہاں داخل ہوتے دیکھا بھی ہوگا یا کوئی شخص ہمارے خلاف گواہی بھی دے گا تو وہ عدالت کو اس سے زیادہ کیا بتائے گا کہ حملہ آور ہندوؤں کی قبا پہنے ہوئے تھے اور وہ شکل وصورت کے اعتبار سے مندر کے پجاری نظر آ رہے تھے۔''

''قاضی عماد کے ملازمین کہاں تھے؟'' قائم خان نے گھبرا کر دوسرا سوال کیا۔

''اس وقت صرف دو ملازم موجود تھے جو ہمیں دیکھتے ہی خوف زدہ ہو گئے تھے اور ہم سے اپنی زندگی کی امان مانگ رہے تھے۔'' قائم خان کے دوسرے خدمت گار نے جواب دیا۔

''ان ملازمین کی آنکھوں میں تو تمہارے چہروں کا عکس محفوظ نہیں ہو گیا ہے؟'' قائم خان کی وحشت بدستور قائم تھی۔

''ہمارے چہرے سیاہ نقابوں میں پوشیدہ تھے۔'' چوتھے خدمت گار نے وضاحت کی۔

''تم نے قاضی عماد کو کس طرح قتل کیا؟'' قائم خان ایک ایک بات کی تفصیل دریافت کر رہا تھا۔

''ہم نے پہلے اس کے ملازمین پر غلبہ حاصل کیا۔ پھر صدر دروازہ کھلوانے کے بعد اندر داخل ہوئے۔ اس وقت قاضی عماد اپنے کمرے میں موجود تھا اور دونوں ہاتھ اٹھائے ہوئے دعا مانگ رہا تھا۔ ہم تیزی سے اس پر جھپٹے۔ قاضی نے چیخ کر کہا۔ ''قائم خان! میں جانتا تھا کہ تو اپنی خباثت و کمینگی سے باز نہیں آئے گا۔'' قاضی عماد چاہتا تھا کہ وہ اپنے اہل خانہ کو حملہ آوروں کے نام بتا دے' مگر ہم نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ پھر جب ہم قاضی عماد کو قتل کر کے کمرے سے نکل رہے تھے تو اس کی بیوی نے راہداری میں ہمیں روکنے کی کوشش کی' مگر ایک کمزور عورت اس طوفان کا مقابلہ کس طرح کر سکتی تھی جو قائم خان کی حویلی سے اٹھا تھا اور قاضی عدالت کی شمع حیات گل کر کے بے نیازانہ گزر گیا تھا۔'' خدمت گاروں نے خوشامدانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔

قائم خان اپنی اس تعریف سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوا۔ اس کا بے قرار ذہن تیزی سے گردش کرتے ہوئے حالات کے مختلف زاویوں پر غور کر رہا تھا۔ ''قاضی کی بیوی کے کانوں تک تو میرا نام نہیں پہنچا؟'' قائم خان نے بدحواس ہو کر پوچھا۔

''نہیں حضور!'' ایک خدمت گار نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ''ہم نے دوسری بار اس کی زبان کو جنبش نہیں ہونے دی۔ پہلی بار وہ چیخا ضرور تھا مگر اس کی آواز زیادہ بلند نہیں تھی۔''

قائم خان کچھ دیر تک باغیچے میں ٹہلتا رہا۔ پھر اپنے خدمت گاروں کو حویلی کی حفاظت کا حکم دے کر امیر طغرل بیگ کے پاس چلا گیا۔

❋❋❋

طغرل بیگ قالین پر بیٹھا ہوا نشے میں جھوم رہا تھا۔ قائم خان کو آتا دیکھ کر لڑکھڑاتی آواز میں بولا۔

''تم کہاں چلے گئے تھے قائم خان! آج کی محفل زیادہ لذت انگیز نہیں تھی۔ کبھی کبھی تمہارا انتخاب بہت زیادہ غلط ثابت ہوتا ہے۔''

''میں سمجھا نہیں امیر! صاف صاف بات کرو۔'' قائم خان نے جھجکتے ہوئے کہا۔ وہ ہمیشہ طغرل بیگ سے خائف رہتا تھا۔ طغرل بیگ' غیاث الدین بلبن کا محبوب غلام تھا اور غیاث الدین بلبن در پردہ ہندوستان پر حکومت کر رہا تھا۔ اسی رشتے اور حوالے سے طغرل بیگ بھی اپنے آپ کو بساط سیاست کا طاقتور ترین مہرہ سمجھتا تھا۔ طغرل بیگ سے دربار کے دوسرے امراء بھی اکثر خوف زدہ رہتے تھے کہ کب اس غلام زادے کے تیور بدل جائیں اور ایک ذی حیثیت انسان غیاث الدین بلبن کی نظروں میں معتوب ٹھہرے۔ قائم خان نے بھی وقت کی ہواؤں کا رخ پہچان کر طغرل بیگ سے دوستانہ مراسم بڑھا لئے تھے۔

طغرل بیگ فطرتاً ایک کم ظرف انسان تھا۔ اس کی نظروں میں دوستی کی اعلیٰ قدریں بے حقیقت تھیں۔ وہ تو محض نفس کا بندہ تھا اور خود قائم خان بھی ایک زمانہ ساز و عیار شخص تھا۔ اس لئے دو حیلہ گروں میں مصلحتوں اور ضرورتوں کی بنیاد پر منافقانہ دوستی کا رشتہ استوار ہو گیا تھا۔

قائم خان دربار شاہی میں اگلی قطار تک پہنچنے کیلئے ''وسیلہ'' تلاش کر رہا تھا۔ اگرچہ قائم خان کو ایوان سلطنت میں رسائی حاصل ہو گئی تھی' لیکن ابھی تک اسے پچھلی صفوں میں بیٹھنے کے لائق سمجھا گیا تھا۔ پھر جب اس کی نظر طغرل بیگ پر پڑی تو سیاست کے کئی گہرے راز کھل گئے۔ قائم خان نے چند ملاقاتوں ہی میں طغرل بیگ کی اوباش فطرت کو پڑھ لیا۔ پہلے لذیذ کھانوں اور پرانی شراب کی دعوتوں کا سلسلہ شروع ہوا پھر رقص و سرور کی محفلیں آراستہ ہونے لگیں۔ قائم خان نے دوسرے امراء کی طرح اپنی حویلی کو خوبصورت عورتوں کا حرم تو نہیں بنایا تھا' لیکن جنس پرستی اس کے خون میں شامل تھی۔ وہ بھی دوسرے سرداروں کی مانند حسین چہروں کا دیوانہ تھا۔ یاسمین خانم کی ماں اپنی نسلی روایات سے باخبر تھی کہ جب راجپوت سمراٹ اور مہاراجہ سیکڑوں عورتوں کو داشتہ بنا سکتے تھے تو پھر قائم خان بھی اپنی پگڑی کو اونچا رکھنے کے لئے اس قسم کی حرکتیں کر سکتا تھا۔ مسلمان ہونے کے بعد اس خاندان سے یہ قبیح رسم تو مٹ گئی تھی' مگر قائم خان نے شراب نوشی اور رقص و سرور کی محفلوں سے توبہ نہیں کی تھی۔ یاسمین خانم کی ماں شوہر کی اس روش سے مطمئن تھی کہ قائم خان نے حویلی کے ایک حصے کو ''راجہ اندر کا اکھاڑہ'' ضرور بنا دیا تھا لیکن کوئی دوسری عورت بیوی کی حیثیت سے ابھی تک گھر میں داخل نہیں ہوئی تھی۔

قائم خان کی اسی ہوس کوشی نے غیاث الدین بلبن کے غلام طغرل بیگ سے دوستی کا رشتہ جوڑنے میں اہم کردار ادا کیا۔ قائم خان اپنے سیاسی مفادات حاصل کرنے کیلئے کم و بیش روزانہ ہی کیف و نشاط کی محفل سجاتا اور اس محفل میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے طغرل بیگ رات بھر ہنگامے برپا کرتا۔

کی وہ لڑکی رقص و موسیقی کے فن میں کمال رکھتی تھی' مگر طغرل بیگ جیسے ہوس پرست انسان کیلئے اس لڑکی میں کوئی کشش نہیں تھی۔ اس لئے جب قائم خان اپنے آدمیوں سے قاضی عماد کے قتل کی تفصیلات معلوم کر کے واپس لوٹا تو طغرل بیگ نے اس کے انتخاب کو ناپسندیدہ قرار دیتے ہوئے کہا۔

''کیا بات ہے قائم خان کہ تو دوستوں کے معیار کو بھولتا جا رہا ہے؟ آخر یہ کیسی رقاصہ تھی کہ چہرے پر نہ کوئی آب' نہ بدن میں لوچ......اور یہ کیسی مطربہ تھی کہ لے میں نہ کوئی سوز اور نہ آواز میں کھنک۔''

قائم خان نے اس موقع کو غنیمت جانا اور بڑی ہوشیاری کے ساتھ اپنے دل کی بات کہہ ڈالی۔

''امیر! میں کیا عرض کروں کہ حالات پر میرا کوئی اختیار نہیں۔'' قائم خان کی آواز سے گہرا درد جھلک رہا تھا جیسے وہ اس بستی کا مظلوم ترین انسان ہو۔ ''اگر مجھے ذاتی غموں سے نجات مل جائے تو پھر امیر کی زبان پر کبھی کوئی حرف شکایت نہ آئے۔'' اگرچہ طغرل بیگ غلام زادہ تھا' لیکن قائم خان اپنا مقصد حاصل کرنے کیلئے خوشامدانہ طور پر اسے بار بار ''امیر'' کہہ کر مخاطب کر رہا تھا۔

''آخر وہ کونسا غم ہے جو تجھے اس قدر ستاتا رہتا ہے؟'' نشے کی زیادتی سے طغرل بیگ کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔ ''دنیا کی ساری آسائشیں اس حویلی میں موجود ہیں۔ تجھے دربار شاہی میں داخل ہونے کی تمنا تھی وہ بھی پوری کر دی گئی۔ پھر وہ کیسی خلش ہے جو تیرے دل کو بے قرار رکھتی ہے؟'' طغرل بیگ کے لہجے میں منافقانہ ہمدردی کا اظہار ہو رہا تھا۔

''امیر! میں اپنے اس کرب کو کسی سے بیان نہیں کر سکتا۔'' قائم خان کی عیاریوں نے ایک نئے انداز سے کروٹ لی۔ ''بہت غور و فکر کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اذیتوں کی اس آگ میں زندگی بھر تنہا جلنا ہوگا۔'' قائم خان کی آواز اس قدر رقت انگیز تھی جیسے مزید پرسش حال پر اسکی آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش شروع ہو جائے گی۔

''کیا اب تک میں تیری الجھنوں میں برابر کا شریک نہیں رہا۔'' طغرل بیگ کی آواز اچانک بہت تیز ہو گئی تھی۔ وہ قائم خان سے بہت تند و تیز لہجے میں شکایت کر رہا تھا۔

''مجھے آپ کی مسلسل عنایتوں کا اعتراف ہے امیر!'' قائم خان نے گھبرا کر کہا۔

''پھر اپنے دل کا راز میرے سامنے کیوں نہیں اگل دیتا۔'' طغرل بیگ نے سرشاری کے عالم میں اپنے دونوں ہاتھوں کو لہراتے ہوئے کہا۔ ''اپنے دل کی بات مجھ سے کہہ دے کہ ابھی اقتدار کی ہوائیں میرے اشارے پر چل رہی ہیں۔ میں ایک لمحے میں تیرے غموں کا مداوا کر دوں گا۔ مجھے غور سے دیکھ قائم خان کہ میں اس دور کا مسیحا ہوں۔'' طغرل بیگ غیاث الدین بلبن کی غلامی پر اس قدر نازاں تھا جیسے وہ خود مملکت ہند کا وزیر اعظم ہو اور اسی کی جنبش چشم پر سلطان ناصر الدین محمود رقص کر رہا ہو۔

قائم خان طے کر چکا تھا کہ آج وہ طغرل بیگ کی سرمستی سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے گا۔ پھر جب وہ جذباتی لمحہ آ گیا تو قائم خان نے مطلب براری کیلئے ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کی۔

''امیر! شاید آپ نہیں جانتے کہ میرا ایک حقیقی بھانجا شجاع الدین کامران ہے۔'' قائم خان نے اپنے گھر کا راز ایک ایسے شخص کے سامنے ظاہر کر دیا جو فطرتاً بہت ذلیل تھا۔ طغرل بیگ نے اپنے سر کو اس طرح جنبش دی کہ وہ قائم خان کے مسئلے کو پورے ہوش و حواس کے ساتھ سن رہا ہے۔

قائم خان کرب ناک لہجے میں شجاع الدین کامران کی پوری تاریخ مسخ کر کے طغرل بیگ کو سناتا رہا اور آخر

"اب آپ ہی بتائیں امیر کہ میں اپنی بیٹی یاسمین خانم کا ہاتھ اس نکمے اور آوارہ نوجوان کے ہاتھ میں کس طرح دیدوں؟ وہ بدکار لڑکا ایک غیرت مند باپ کی مجبوریوں سے بڑا اذیت ناک کھیل کھیل رہا ہے۔ مجھے بتاؤ کہ میں کدھر جاؤں اپنی بیٹی کو حالات کے جہنم میں جھونک کر ایک بے حیا تماشائی بن جاؤں یا شجاع الدین کامران کو قتل کر کے خود تختہ دار تک پہنچ جاؤں؟" قائم خان نے اندازہ کر لیا تھا کہ طغرل بیگ انتہائی سرمستی کے عالم میں قالین پر بیٹھا جھوم رہا تھا۔ اس کے ہوش وحواس میں اتنی توانائی نہیں رہی تھی کہ وہ جھوٹ اور سچ میں تمیز کر سکے۔ قائم خان نے طغرل بیگ کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھایا اور اپنی بے چارگی کا مرثیہ پڑھنے لگا۔

"اگر کامران کے سلسلے میں اپنی طاقت استعمال کرتا ہوں تو بیوہ بہن طعنہ زنی کرتی ہے۔ خودغرض دنیا انگلیاں اٹھاتی ہے اور اگر اپنی رسوائیوں سے ڈر کر حالات کے آگے سر جھکاتا ہوں تو اپنی معصوم بچی کا سیاہ مستقبل نوحہ کناں نظر آتا ہے۔ امیر! میں کیا کروں؟ آخر مجھے اس عذاب سے کب نجات ملے گی؟ میں نہیں چاہتا کہ میری چار دیواری کی بات باہر چلی جائے مگر آج دل میں ناقابل بیان درد محسوس ہو رہا ہے۔ اسی درد کی شدت نے مجھے آپ کے سامنے چیخنے پر مجبور کر دیا۔" یہ کہتے کہتے قائم خان کی آواز بیٹھ گئی اور اس نے اپنے اضطراب کا مظاہرہ کرنے کیلئے دونوں ہاتھوں سے بالوں کو جکڑ لیا۔

"نہیں قائم خان! ہمت کیوں ہارتا ہے؟" طغرل بیگ بے قرار ہو گیا اور اس نے اپنے دونوں ہاتھ قائم خان کے کاندھوں پر رکھ دیئے۔ "جہنم کا ایندھن تیری بیٹی نہیں' وہ ناہنجار لڑکا بنے گا۔ مجھے بتا کہ تیرا بھانجا اس وقت کہاں ہے؟ اپنے آقا کے اقتدار کی قسم! اسے صبح کا سورج دیکھنا نصیب نہیں ہوگا۔ صرف شجاع الدین کامران کے گھر کی نشاندہی کر دے۔ ابھی کچھ دیر بعد اس کی لاش تیرے سامنے پڑی ہوگی۔" طغرل بیگ غرور وتکبر کی ساری حدیں عبور کر گیا تھا اور وہ اسی زبان میں گفتگو کر رہا تھا جو ہمیشہ سے جفا کاروں اور ستمگروں کی زبان رہی ہے۔

"نہیں امیر! میں اس کا قتل نہیں چاہتا۔" قائم خان نے بدحواس ہو کر کہا۔ "اس طرح تو دنیا یہی کہے گی کہ قائم خان نے اپنے تعلقات کا سہارا لے کر یتیم بھانجے کو راستے سے ہٹا دیا۔ مجھ سے یہ ذلت گوارا نہیں ہوگی۔"

"آخر تو کیا چاہتا ہے قائم خان!" طغرل بیگ نے جھنجلا کر کہا۔ "ہمارے سامنے اپنے غموں کا ماتم بھی کرتا ہے اور جب ہم مسیحائی کیلئے اپنا ہاتھ بڑھاتے ہیں تو خود پیچھے ہٹ جاتا ہے۔"

طغرل بیگ جذبات کے گرداب میں الجھ چکا تھا۔ قائم خان نے بڑی عیاری سے اپنے دل کی بات کہہ ڈالی۔

"امیر! میں چاہتا ہوں کہ یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے اور میرا دامن بھی تہمتوں کے غبار سے صاف رہے۔"

"پھر تو ہی بتا کہ ہم کیا کریں؟" طغرل بیگ نے بمشکل اپنی آنکھیں کھولتے ہوئے کہا۔

"شجاع الدین کامران ہندو شورش پسندوں سے جا ملا ہے۔" قائم خان نے بڑی احتیاط سے اپنا منصوبہ پیش کرتے ہوئے کہا۔ دہلی کے قزاق اور لٹیرے اس کے ہم نوا ہیں۔ میرے پاس خدمت گاروں کی اتنی بڑی فوج نہیں کہ میں اس کی یورشوں کا مقابلہ کر سکوں۔ اس لئے برداشت کیا۔"

ابھی قائم خان اپنی بات مکمل کرنے بھی نہیں پایا تھا کہ طغرل بیگ درمیان میں بول اٹھا۔

"ہم کل ہی تیری حویلی پر فوج کا ایک دستہ تعینات کر دیں گے۔ پھر دیکھیں گے کہ وہ کتنا بڑا لشکر لے کر تیرے مقابلے کیلئے آتا ہے۔"

قائم خان کی ایک خواہش پوری ہو چکی تھی۔ وہ ہر وقت اس بات سے خائف رہتا کہ کب شجاع الدین کامران ان نامعلوم سادھوؤں کے ساتھ [illegible] کا چراغ بجھا دے [illegible] حاصل

کرنے کے سلسلے میں سعدیہ خانم کے زخمی ہونے کے بعد قائم خان کے خدشات بہت زیادہ بڑھ گئے تھے۔ اس لئے وہ چاہتا تھا کہ کامران کے متوقع حملے سے مکمل طور پر محفوظ ہو جائے۔ اس وقت طغرل بیگ نے فوجی دستے کی بات کی تو وہ مطمئن ہو گیا۔

''مگر یہ میرے مسئلے کا مستقل حل نہیں ہے امیر!'' قائم خان کے عیار ذہن نے ایک اور کروٹ لی۔ ''یہ تو ایک عارضی انتظام ہے جس کیلئے میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں۔''

''آخر تیرے ذہن میں بھی کوئی حل ہے قائم خان!'' طغرل بیگ نے تلخ لہجے میں کہا۔

قائم خان نے مصنوعی سکوت اختیار کر لیا جیسے اس کا ذہن کوئی قابل عمل تدبیر سوچ رہا ہو۔

طغرل بیگ اکتاہٹ کا شکار ہونے لگا۔ ''تو خوب غور کر لے مگر مجھے پیاسا کیوں مار رہا ہے؟''

قائم خان نے بہت تیزی سے ایک جام لبریز کیا اور طغرل بیگ کی طرف بڑھا دیا۔

طغرل بیگ گھونٹ گھونٹ کر کے پینے لگا۔

پھر ایک طویل وقفہ سکوت کے بعد قائم خان کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔

''امیر میں چاہتا ہوں کہ شجاع الدین کامران ایک طویل عرصے کیلئے پس دیوار زندان چلا جائے۔'' قائم خان نے بڑے سفاکانہ انداز میں اپنے حقیقی بھانجے کی تباہی کیلئے ایک تجویز پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ کے نزدیک یہ محض بچوں کا کھیل ہے کہ اسے مختلف جرائم میں ملوث کر دیا جائے۔''

طغرل بیگ نے دھندلی آنکھوں سے قائم خان کی طرف دیکھا۔

''ہم اسے عمر بھر کیلئے قید میں ڈال دیں گے کل دربار میں ہمیں یاد دلانا۔ تجھے سارے عذابوں سے نجات مل جائے گی۔''

''مگر امیر! وہ تو بہت دن سے روپوش ہے۔'' قائم خان نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ''میرے آدمی اب تک اسے تلاش کرنے میں ناکام رہے ہیں۔''

''اگر وہ سرزمین ہند کے کسی گوشے میں موجود ہے تو پھر ہمارے مخبر اسے ڈھونڈ لیں گے۔'' یہ کہہ کر طغرل بیگ لڑکھڑاتے قدموں سے اٹھا اور اپنی سواری میں بیٹھ کر شاہی محل کی طرف چلا گیا۔ طغرل بیگ کے جانے کے بعد قائم خان نے اپنی بیوی سے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

''اب میرے راستے میں کوئی کانٹا باقی نہیں رہا۔ قاضی عماد کئی دن سے کھٹک رہا تھا میں نے اسے اس طرح نکال پھینکا کہ اب اس کی لاش پر ماتم کرنے والا بھی نہیں ہوگا۔''

یاسمین خانم کی ماں حیرت و مسرت سے شوہر کی گفتگو سن رہی تھی۔

پھر جب قائم خان نے طغرل بیگ سے ہونے والی گفتگو کی تفصیلات اپنی بیوی کو بتائیں تو اس سنگدل عورت کے ہونٹوں پر ایک بے رحم مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔

❋❋❋

قاضی عماد کے یہاں ایک حشر سا برپا تھا۔ تمام رشتے دار اور دوست تعزیت کیلئے جمع ہوئے تھے اور مرحوم کی صفات بیان کر کے ایک بیوہ عورت کے غموں کو بانٹنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔

قاضی عماد کی بیوہ ایک بلند حوصلہ نیک سیرت خاتون تھی۔ اس نے بڑی بہادری سے اس زخم کی خلش کو برداشت کیا۔

اس موقع پر سعدیہ خانم کا برا حال تھا۔ وہ بار بار قاضی عماد کی بیوی سے کہہ رہی تھی۔
''یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا ہے۔ مجھے چلا جانے دو کہ نحوست و بربادی میرے قدموں سے لپٹی ہوئی ہے۔ میں جہاں بھی جاتی ہوں آفات و مصائب اس جگہ کو گھیر لیتے ہیں۔ شوہر کے گھر گئی انہیں قتل کر دیا گیا۔ قاضی صاحب نے میرے غموں کا ازالہ کرنا چاہا تو تم نے بیوگی کا لباس پہن لیا۔ بی بی! مجھے مت روکو کہ میں بدنصیب ہی اس ہنستے بستے گھر کو ماتم کدہ بنانے کی ذمہ دار ہوں۔'' سعدیہ خانم بڑے دردناک لہجے میں گریہ وزاری کر رہی تھی۔
قاضی عماد کی بیوی نے اپنے آنسوؤں کو فراموش کر دیا اور سعدیہ خانم کے اشکوں کو روکنے کیلئے اپنا دامن آگے بڑھا دیا۔
''کسی مسلمان کے قدم نحس نہیں ہوتے۔ مشیت الٰہی بس یونہی تھی۔ کوئی ذی روح اس دنیا میں نہ ایک لمحہ زیادہ بسر کر سکتا ہے اور نہ کسی کی ایک سانس کم کی جا سکتی ہے۔ میرا اور قاضی صاحب کا اتنا ہی ساتھ تھا۔ خدا بچھڑنے والے کی مغفرت کرے۔ میں خوش ہوں کہ اس نے جانے سے پہلے انصاف کا حق ادا کر دیا۔ مجھے اللہ کی ذات پر یقین ہے کہ وہ اپنی لازوال اور بے پناہ رحمت سے میرے شوہر کی قبر کو روشن کر دے گا۔ میں تمہیں اس وقت تک نہیں جانے دوں گی جب تک تمہارے بیٹے کو اس معاشرے میں بے گناہی اور شرافت کی سند نہیں مل جاتی۔'' یہ کہتے کہتے قاضی عماد کی بیوہ اچانک اداس نظر آنے لگی۔ ابھی اسے چار ماہ سے زیادہ کا عرصہ عدت کی حالت میں گزارنا تھا۔

***

قاضی عماد کی موت سے پورا شہر سوگوار تھا۔ بڑے بڑے امراء ان کی میت میں شریک ہوئے تھے۔ خود سلطان ناصر الدین محمود اور غیاث الدین بلبن بھی تعزیت کیلئے قاضی عماد کی بیوہ کے پاس آئے تھے۔
سلطان نے غمزدہ عورت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔ ''تم نے قاتلوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے تو ان کی نشاندہی کرو، عدالت تمہاری تالیف قلب کیلئے فوری انصاف فراہم کرے گی۔''
قاضی عماد کی بیوہ اس سے زیادہ کچھ نہیں بتا سکی کہ اس کے شوہر کے قاتل سادھوؤں کے لباس میں ملبوس تھے اور اپنے چہروں پر سیاہ نقاب ڈالے ہوئے تھے۔
سلطان ناصر الدین محمود بہت دیر تک گہری سوچ میں ڈوبا رہا۔ پھر اس نے قاضی عماد کی بیوہ سے کہا۔
''تمہارے شوہر کی کسی سے رنجش تھی یا تمہیں کسی پر شک ہے؟''
قاضی عماد کی بیوی نے صریحاً انکار کر دیا۔ ''سلطان! میں کسی پر تہمت نہیں تراش سکتی۔ جو کچھ ان آنکھوں نے دیکھا اسے بے کم و کاست بیان کر دیا۔''
سلطان ناصر الدین محمود نے غیاث الدین بلبن کی طرف دیکھا۔ ''وہ سادھو کون تھے؟ اس کی تحقیق کی جائے۔ آج تک دہلی میں ایسا کوئی دردناک واقعہ رونما نہیں ہوا کہ ایک امن پسند اور معزز شخص کو اس طرح شہری حدود میں قتل کر دیا جائے۔''
''سلطان! میں خود اس کی تحقیق کراؤں گا۔ قاضی عماد کا قتل کوئی معمولی حادثہ نہیں۔'' غیاث الدین بلبن نے ادب سے کہا۔
اور اس کے ساتھ ہی سلطان ناصر الدین محمود جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔
یکایک قاضی عماد کی بیوہ کو کوئی بھولی ہوئی بات یاد آ گئی۔ ''سلطان معظم! بس چند لمحے مزید قیام کی زحمت فرمائیں کہ ایک اور مظلوم شخص آپ سے انصاف کا طالب ہے۔'' یہ کہہ کر قاضی عماد کی بیوہ اندر چلی گئی اور تھوڑی دیر

میں وہ کاغذ لے کر حاضر ہوئی جس پر شجاع الدین کامران کی بے گناہی کی مہر ثبت تھی۔

اس موقع پر سعدیہ خانم نے بھی سلطان ناصر الدین محمود کے روبرو جانے کی کوشش کی' مگر کمزوری اور نقاہت کے باعث وہ بستر سے نہ اٹھ سکی۔ قاضی عماد کی بیوہ نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''خدا کا شکر ہے کہ اس نے خود سلطان کو دادرسی کیلئے ہمارے گھر بھیج دیا۔ تم مطمئن رہو کہ اب تمہارے بیٹے کو انصاف مل جائے گا۔''

پھر جب سلطان ناصر الدین محمود نے قاضی عماد کی تحریر پڑھی تو اس کا نورانی چہرہ ایک لمحے کیلئے دھواں ہو کر رہ گیا۔

''میں اپنے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔'' ناصر الدین محمود کا لہجہ شدید اذیت و کرب میں ڈوبا ہوا تھا۔

''الغ خان! یہ کیا ہو رہا ہے؟'' سلطان نے اپنے وزیر اعظم غیاث الدین بلبن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ کیسی ناانصافیاں ہیں جو میرے نامہ اعمال میں لکھی جا رہی ہیں۔''

بلبن نے سر جھکائے ہوئے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ وہ قاضی عماد کی تحریر دیکھنا چاہتا تھا۔

سلطان ناصر الدین محمود نے وہ کاغذ بلبن کے حوالے کر دیا۔

بلبن کچھ دیر تک قاضی عماد کی تحریر پڑھتا رہا۔ پھر بہت آہستہ لہجے میں بولا۔

''سلطان معظم! یہ کوئی اہم مقدمہ نہیں' چند جھوٹی شہادتوں کی بنیاد پر قاضی عماد سے غلطی ہو گئی۔''

''نہیں الغ خان!'' سلطان ناصر الدین محمود نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''قاضی عماد کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کوئی عام مقدمہ نہیں۔ اس کے پس پردہ کسی کی محرومیوں کی ایک طویل داستان ہے۔ اگر قاضی عماد زندہ ہوتے تو وہ یقیناً اپنی زبان سے کچھ اور انکشاف کرتے' لیکن گردش تقدیر کے سبب کرسی انصاف پر بیٹھنے والا زیر خاک سو رہا ہے۔ ہم بظاہر اس نوجوان کے بارے میں کچھ نہیں جانتے کہ ہمارے دور حکومت میں اس پر کیا گزری ہے؟ مگر قاضی عماد کی تحریر کردہ عبارت سے اتنا اندازہ ضرور کر سکتے ہیں کہ صورت حال معمولی نوعیت کی ہرگز نہیں ہے۔'' سلطان ناصر الدین محمود نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''قاضی عماد شاید اپنی زندگی سے مایوس ہو چکے تھے اسی لئے انہوں نے احتیاطی تدبیر کے طور پر اپنی گواہی قلم بند کر دی۔'' یہ کہہ کر سلطان چند لمحوں کیلئے خاموش ہو گیا۔

ایک دوست کی حیثیت سے قائم خان بھی قاضی عماد کی عیادت کیلئے ان کے مکان پر گیا تھا۔ اس کے بہتے ہوئے آنسو منافقت کی ایک بدترین کہانی سنا رہے تھے۔ وہ قاضی عماد کی بیوہ کے غم میں شریک ہونے کے لئے نہیں' محض حالات کا جائزہ لینے وہاں پہنچا تھا۔ جب سلطان کے سامنے قاضی عماد کی آخری تحریر پیش کی گئی تو قائم خان کو اپنی سانسیں رکتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔

اور جب سلطان ناصر الدین محمود نے غیاث الدین بلبن سے یہ کہا کہ قاضی عماد اس تحریر کے فوراً بعد ہی قتل کر دیئے گئے تو قائم خان کو اپنی موت سامنے نظر آنے لگی۔

قاضی عماد کا قتل بے سبب نہیں ہے الغ خان!'' سلطان کی آواز معمول سے زیادہ بلند ہو گئی تھی۔ ''اس مقدمے سے ان کی موت کا گہرا تعلق ہے۔''

''سلطان ذی وقار! اگر ایسا ہے تو آپ کے جاں نثار عدالت عالیہ کے نظام کو رسوا نہیں ہونے دیں گے۔'' غیاث الدین بلبن نے پرجوش لہجے میں کہا۔ ''بہت جلد قاضی عماد کے قاتل آپ کے روبرو حاضر کر دیئے جائیں گے۔''

ناصر الدین محمود نے الغ خان کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اب وہ قاضی عماد کی بیوہ سے مخاطب تھا۔

"خاتون! ہم تمہارے معزز شوہر کی زندگی تو نہیں لوٹا سکتے مگر یقین دلاتے ہیں کہ انسانی حیثیت کے مطابق انصاف ضرور کریں گے۔ خدا ہمارے نفس کو شیطانی قوتوں کے غلبے سے محفوظ رکھے اور میزان کے قیام میں ہماری مدد کرے۔"

"خدا ہمارے سروں پر سالہا سال سلطان کا سایہ قائم رکھے کہ آپ کو دیکھ کر تو اہل درد کے سینوں میں زندہ رہنے کی خواہش ابھرتی ہے۔" قاضی عماد کی بیوہ نے اس پرسش حال پر زار و قطار روتے ہوئے کہا۔ "سلطان میں اپنے شوہر کے قاتلوں کو نہیں پہچانتی۔ اس لئے عدالتی کارروائیوں میں تاخیر ہو سکتی ہے اور یہ تاخیر عین انصاف کے مطابق ہو گی کہ کہیں کوئی بے گناہ اپنی زندگی سے ہاتھ نہ دھو بیٹھے۔"

سلطان ناصر الدین محمود حیرت سے اس چلمن کی طرف دیکھنے لگا جس کے پیچھے کھڑی قاضی عماد کی بیوہ بارگاہ شاہی میں فریاد کر رہی تھی۔ "خاتون! آخر تم کہنا کیا چاہتی ہو؟"

"سلطان والا حشم! میری خواہش ہے کہ پہلے اس بیوہ کے بیٹے کا فیصلہ کر دیا جائے جو قاضی صاحب کی کوتاہی کا شکار ہو کر در بدر مارا پھر رہا ہے۔" قاضی عماد کی بیوہ نے لرزتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"وہ نوجوان کہاں ہے؟" سلطان نے دریافت کیا۔ "ہم اس کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کا ازالہ کریں گے۔"

"وہ رسوائیوں کے خوف سے کہیں روپوش ہو گیا ہے۔" قاضی عماد کی بیوہ نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"اس تک ہمارا پیغام پہنچا دو کہ اب کسی بے گناہ کو منہ چھپانے کی ضرورت نہیں ہے۔" سلطان ناصر الدین محمود کی پرجلال آواز گونجی۔ "ہر مظلوم کیلئے ہمارا دربار اور محل کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ ہم راتوں کو بھی اس انتظار میں جاگتے رہتے ہیں کہ کب کسی دکھے دل کی صدا ابھرے اور ہم اپنی حرم سرا سے باہر آ کر اس کی پکار سنیں۔ پھر جو کچھ ہمارے پاس ہو ہم اس کے دامن میں ڈال دیں۔ یہاں تک کہ وہ غمزدہ چہرہ اطمینان و آسودگی کی مسکراہٹ سے شاداب نظر آنے لگا۔ سلطان ناصر الدین محمود کی زبان سے ادا ہونے والا ایک ایک لفظ قائم خان کو اپنے لئے پیغام اجل محسوس ہو رہا تھا۔

"اس نوجوان سے بھی کہہ دو کہ وہ ہمارے قائم کردہ نظام سے خوش گمانی رکھے۔" سلطان ناصر الدین کے لہجے میں جلالِ شاہی بھی تھا اور اسلامی انکساری بھی۔ "اگر ہماری عدالت نے کسی غلط فہمی کی بنیاد پر اسے کوئی آزار پہنچایا ہے تو ہم بذات خود اس کی تلافی کریں گے۔ وہ ایک بار ہمارے حضور آئے' پھر دیکھے کہ ہم کس طرح ایفائے عہد کرتے ہیں۔" یہ کہہ کر سلطان ناصر الدین محمود اپنے وزیروں کے ہمراہ واپس چلا گیا۔

قاضی عماد کی بیوہ سوگوار ہوتے ہوئے بھی خوش تھی۔ جب اس نے سعدیہ خانم کو یہ خوشخبری سنائی تو ایک غمزدہ ماں اشکبار ہو گئی۔

"میرے ساتھ تو انصاف ہو گیا' مگر تمہارے شوہر کے قاتل کہاں روپوش ہیں؟" سعدیہ خانم نے روتے ہوئے کہا۔

"میرا ذکر چھوڑو سعدیہ کہ میں نے اپنا مقدمہ اللہ کی عدالت میں پیش کر دیا ہے۔" قاضی عماد کی بیوہ نے اس قدر بلند حوصلگی کا مظاہرہ کیا کہ سعدیہ خانم حیرت سے اس کا منہ دیکھتی رہ گئی۔

❋❋❋

حسب معمول قائم خان نے اپنی بزم کیف و نشاط آراستہ کی اور بڑی بے چینی کے ساتھ طغرل کا انتظار کرنے لگا

پھر جب غیاث الدین بلبن کا غلام میر مجلس کی حیثیت سے نمودار ہوا تو قائم خان نے انتہائی دہشت کے عالم میں اسے سارا واقعہ سناتے ہوئے کہا۔

''اب کیا ہوگا امیر؟'' قائم خان کی آواز کانپ رہی تھی۔ ''اگر شجاع الدین کامران سلطان کے روبرو حاضر ہو گیا تو ساری بساط ہی الٹ جائے گی۔''

''کچھ نہیں ہوگا قائم خان! طغرل نے شاہوں جیسی بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا تجھے صرف ایک ہی کام سونپا گیا ہے کہ ساغر و مینا کا رقص جاری رہے۔ شجاع الدین کامران کے مقدر کا فیصلہ سلطان ناصر الدین محمود نہیں' ہم خود کریں گے۔ اسے انصاف تو اس وقت حاصل ہوگا جب وہ سلطان کے دربار میں حاضر ہو سکے۔ تو کیوں گھبراتا ہے قائم خان! ہم اس کے قدموں کا رخ بارگاہ شاہی کے بجائے زندان کی طرف موڑ دیں گے۔'' یہ کہہ کر طغرل نے جام سرخ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

قائم خان اپنے مہمان کی تواضع میں بہت زیادہ پرجوش نظر آ رہا تھا۔

''آج ہم نے تیری حویلی کے گرد سپاہیوں کی ایک دیوار بنانے کا حکم صادر کر دیا ہے تو اس بدنصیب نوجوان کو تلاش کرنے کی کوشش کر' ہم اس کی بربادیوں کی داستان کا آخری باب اپنے ہاتھوں سے لکھیں گے۔'' غیاث الدین بلبن کے غلام نے جھومتے ہوئے کہا اور اس رقاصہ کو دیکھنے لگا جس کے دلکش خدوخال ایک ہوس پرست امیر پر سحر طاری کر رہے تھے۔

قائم خان نے فکر فرد کو اپنے ذہن سے نکال پھینکا تھا اور اب وہ خود بھی کیف و نشاط کے ہنگاموں میں شریک ہو گیا تھا۔

❊❊❊

کئی ماہ گزر چکے تھے اور سعدیہ خانم شجاع الدین کامران کا انتظار کرتے کرتے تھک گئی تھی۔ ہر شام چراغوں کے ساتھ اس کی آرزوئیں بھی جل اٹھتی تھیں اور پھر صبح ہوتے ہوتے ایک ایک تمنا پروانوں کی راکھ کی طرح ہوا میں بکھر جاتی تھی یا بجھنے والے چراغوں کے دھوئیں کی مانند فضا میں تحلیل ہو جاتی۔

شجاع الدین کامران کس طرح ان فاصلوں کو ختم کرتا کہ وہ تو حالات کے عجیب و غریب زندان میں قید تھا۔ دن بھر جنگل کے درختوں سے سر ٹکراتا پھرتا اور جب رات کا اندھیرا پھیل جاتا تو تھک ہار کر سردار نرسنگا کی خواب گاہ کے برابر والے کمرے میں آ کر سو جاتا۔

اس دوران امر پالی نے کامران کو بہت سمجھایا کہ زندگی اتنی ارزاں نہیں کہ اسے ایک عورت کے نام پر مٹی کا ڈھیر بنا دیا جائے۔

کامران بڑے شکستہ لہجے میں جواب دیتا۔ ''امر پالی تجھے کیا پتا کہ آتش فراق کیا شے ہے اور میں کس اذیت کے ساتھ جل رہا ہوں؟ تو اپنے محبوب کے قریب ہے' خدا تجھے بچھڑنے کے عذاب سے محفوظ رکھے کہ جدائی کا ایک لمحہ بھی صدیوں کے قہر سے زیادہ ہوتا ہے۔''

امر پالی بھی اداس ہو جاتی' مگر اس کے پاس کامران کے زخموں کے لئے کوئی مرہم نہ تھا۔

پھر ایک دن پورا جنگل لرز اٹھا۔ نرسنگا کے نائب شاپارا نے کھیما اور دوسرے لٹیروں کے ساتھ مل کر اپنے سردار کے خلاف بغاوت کر دی۔

❊❊❊

نرسنگا کا نائب بہت دن سے سرداری کے خواب دیکھ رہا تھا مگر تنہا اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ کھل کر بغاوت کرسکے۔ وہ بہت خفیہ انداز میں پہلے اپنے ہمراز بنانا چاہتا تھا' پھر نرسنگا کی اجتماعی طاقت کو منتشر کرکے اس خواب کی تعبیر دیکھنے کا آرزومند تھا جو اس کے سینے کی گہرائیوں سے نکل کر کبھی کبھی جاگتی آنکھوں میں جھلکنے لگتا تھا۔ شاپارا اکثر تنہائی میں اپنے منصوبے کے پیچ وخم پر غور کرتا رہتا تھا' مگر تقدیر ابھی تک اس سے گریزاں نظر آرہی تھی۔

پھر ایک دن سردار نرسنگا نے شجاع الدین کامران کو اس کے مقابل لاکھڑا کیا اور اس معرکے کے نتیجے میں شاپارا کو شکست ہوگئی۔ یہی وہ مرحلہ تھا جب ایک باغی لٹیرے کو فضا سازگار دکھائی دینے لگی۔ اس نے اپنی شکست کو بنیاد بنا کر سب سے پہلے کھیما سے سرگوشیوں میں کہا۔

''سردار کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ اپنے ایک وفادار کو اس طرح غیروں سے ذلیل کرائے......'' شاپارا بڑے کرب ناک لہجے میں شکایت کررہا تھا...... ''ہر مشکل اور جان لیوا معرکے میں اپنا سینہ سپر کیا ہے اور سردار کے اعتماد کی آبرو برقرار رکھی ہے۔ پھر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ ایک لڑکا اچانک جنگل میں داخل ہو اور نرسنگا کے جاں نثاروں پر چھا جائے۔''

کھیما بہت غور سے شاپارا کی باتیں سن رہا تھا۔

''سردار اپنے وفاداروں کو ایک ایسے لڑکے سے ذلیل کرا رہا ہے جس کی خدمات بھی محض چند روزہ ہیں اور جو عقائد کے اعتبار سے بھی ہمارے دیوی دیوتاؤں کا دشمن ہے' پھر ہم جیسے وفاپرست اور اپنی جانوں کی بازیاں لگا دینے والے کہاں جائیں گے؟'' شاپارا نے کھیما سے سوال کیا۔

کھیما نے اپنے ساتھی کی اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا' مگر اس کے ذہن میں مختلف وسوسے ابھرنے لگے۔

شاپارا کچھ دیر تک اسی قسم کی باتیں کرتا رہا۔ یہاں تک کہ سردار نرسنگا کے کئی قریبی ساتھی بھی آزادی اور حکومت کے خواب دیکھنے لگے۔ پھر شاپارا نے ان ہی باغی لٹیروں کی مدد سے ایک منصوبہ ترتیب دیا کہ جب نرسنگا کے خاص آدمی کسی قافلے کو لوٹنے کیلئے چلے جائیں اور سردار کی خواب گاہ پر مسلح محافظوں کی تعداد برائے نام رہ جائے تو پچھلی رات کے سناٹے میں پہلے جادوگروں کو قتل کردیا جائے' پھر دوسرے کمرے میں داخل ہوکر شجاع الدین کامران سے نجات حاصل کی جائے۔ اس کے بعد نرسنگا اور امرپالی کو جو عام طور پر رات کو شراب کے نشے میں بدمست رہتے ہیں' ٹھکانے لگا دیا جائے۔

آخر کچھ دن انتظار کرنے کے بعد وہ رات بھی آگئی جو اس جنگل کی تاریخ میں ایک بہت بھیانک رات شمار کی جاتی ہے۔ نرسنگا کے بیشتر محافظ ایک اہم ترین قافلے کو لوٹنے کے سلسلے میں شہری حدود کی طرف چلے گئے تھے' ان منتخب لٹیروں میں شاپارا اور کھیما کے نام بھی شامل تھے' مگر ان دونوں نے سردار نرسنگا کے سامنے حاضر ہوکر بیماری کا

بہانہ تراش لیا تھا۔ نرسنگا نے اپنے ان فریب کار ساتھیوں کی معذرت پر ذرا بھی شک نہیں کیا اور انہیں اجازت دے دی کہ وہ آرام کریں اور جنگل کے اندرونی نظام پر گہری نظر رکھیں۔

شاپارا اور کھیما بہت خوش تھے کہ آج کی رات کا ہر لمحہ ان کی مرضی کے مطابق گردش کر رہا تھا۔

اسی رات شاپارا نے اپنے گھر میں رقص و موسیقی اور شراب کی ایک خاص محفل کا اہتمام کیا تھا۔ آدھی رات کے قریب وہ خود سردار نرسنگا کی خواب گاہ تک پہنچا۔ اس نے دیکھا کہ آج صرف دو مسلح محافظ پہرہ دے رہے تھے...... اور ان دونوں کا بھی یہ حال تھا کہ آنکھیں نیند کے بوجھ سے بند ہوئی جا رہی تھیں۔ پچھلے پہر کی ٹھنڈی ہوا انہیں موج سرور میں ڈبوئے دے رہی تھی۔ شاپارا کو اپنے نزدیک پا کر وہ دونوں چونک اٹھے۔

''کیا بات ہے شاپارا؟ اس وقت تو یہاں کیسے؟'' نرسنگا کے ایک محافظ نے گھبرا کر پوچھا۔

''کوئی خاص بات نہیں' آج طبیعت بہت بوجھل ہے' کسی طرح نیند نہیں آ رہی تھی تو میں اپنے جھونپڑے میں جنگل کی ایک تتلی اور کوئل کو لے آیا کہ اس کے رنگوں سے میرے گھر کا اندھیرا دور ہو جائے گا اور اس کی کوک سے یہ بجھی بجھی طبیعت بھی بہل جائے گی۔''

''تو بڑا خوش نصیب ہے شاپارا!'' نرسنگا کے دوسرے محافظ نے حسرت زدہ لہجے میں کہا...... ''ایک ہم ہیں کہ رات کے سناٹوں سے اکیلے سر پھوڑ رہے ہیں۔''

''میں اسی لئے چلا آیا کہ دوستوں کو بھی اس رنگین محفل میں شریک کر لوں۔'' شاپارا نے بڑی عیاری سے نرسنگا کے محافظوں کی طرف جال پھینکا۔

''مگر ہم کس طرح تیری رنگین محفل میں شریک ہو سکتے ہیں۔'' دونوں محافظ بیک زبان بولے...... ''پھر یہاں پہرا کون دے گا؟''

شاپارا نے ہلکا سا قہقہہ لگایا...... ''تو کیا تمہاری تلواریں سردار کی حفاظت کرتی ہیں؟''

دونوں محافظ چونک کر شاپارا کا منہ دیکھنے لگے۔

''یہ سردار کی ذاتی اقبال مندی ہے کہ اس کا نام سن کر ہی دشمنوں کے جسم لرزنے لگتے ہیں اور تلواریں ان کے ہاتھوں سے چھوٹ جاتی ہیں۔'' شاپارا آج انتہائی ریاکارانہ لہجے میں بول رہا تھا۔ ''ہم جیسے کمزور لوگ بھلا سردار کی حفاظت کس طرح کر سکتے ہیں؟''

''تو ٹھیک کہتا ہے شاپارا۔'' ایک محافظ نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی اور کئی بار تیزی سے اپنی گردن کو جنبش دی۔

''سردار کے گھر پر تو دیوتاؤں کا سایہ ہے۔'' شاپارا نے الفاظ کی ایک اور ضرب لگائی...... ''دیویوں کی ٹولیاں اس کی حفاظت کر رہی ہیں۔''

دوسرا محافظ بھی پگھل گیا۔

''چند لمحوں کی بات ہے۔'' شاپارا نے ہدف سامنے آتے ہی آخری تیر پھینکا...... ''چار قدم پر میرا جھونپڑا ہے' دو گھونٹ پی کر چلے آؤ' پھر ساری رات سکون سے گزرے گی۔''

نرسنگا کے محافظ سوچ میں ڈوب گئے' مگر عورت کے رقص اور شراب کے پیالوں کی حرص نے انہیں اپنے فرائض سے غافل کر دیا' پھر وہ دونوں تیز قدموں سے شاپارا کے جھونپڑے کی طرف چلے گئے جہاں شراب سے بھری ہوئی پیتل کی ایک صراحی ان کا انتظار کر

شاپارا نے صراحی میں پہلے ہی ایک تیز نشہ آور سفوف شامل کر دیا تھا۔ نرسنگا کے دونوں محافظ رقاصہ کے جسم کے پیچ وخم میں الجھ کر کئی لبریز پیالے پی گئے...... اور پھر جب انہیں اپنی ذمہ داری کا احساس ہوا تو وقت گزر چکا تھا' وہ دونوں لڑکھڑاتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھے اور چند قدم چلنے کے بعد ہی لہرا کر زمین پر گر گئے۔

شاپارا نے اپنے آدمیوں کو حکم دیتے ہوئے کہا۔

''سردار کے ان بدمست محافظوں کو بے دست و پا کر کے گھنے درختوں کے کسی کنج میں ڈال دو' جب تک انہیں ہوش آئے گا' ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکے ہوں گے۔''

❁❁❁

شاپارا اپنے راستے کی تمام رکاوٹیں دور کرنے کے بعد سردار نرسنگا کی خواب گاہ کی طرف بڑھا۔ راستے میں ایک جگہ اس نے رک کر کھیما سے سرگوشی کی۔

''جادوگر یا تو سو چکے ہوں گے یا گردنیں جھکائے ہوئے کوئی منتر پڑھ رہے ہوں گے۔ ان سے چھٹکارا پانا کوئی مشکل کام نہیں...... مگر سوال اس مسلمان لڑکے کا ہے؟''

''وہ دیوانہ اپنے ہوش میں کب ہے؟'' کھیما نے ہنستے ہوئے کہا...... ''اس کی بڑھی ہوئی داڑھی اور الجھے ہوئے بال صاف بتا دے رہے ہیں کہ اب وہ کسی کام کا نہیں رہا' بہت دنوں سے اس نے تلوار کو چھوا تک نہیں ہے' پھر وہ ہمارا مقابلہ کس طرح کرے گا؟'' کھیما نے شجاع الدین کامران کے وجود کو یکسر نظر انداز کر دیا تھا۔

''مگر خیال رہے کہ ہمیں اسی لڑکے کے کمرے سے گزر کر سردار نرسنگا کی خواب گاہ تک پہنچنا ہوگا۔'' شاپارا نے اپنے اندیشوں کا اظہار کرتے ہوئے کہا...... ''اگر ہماری راہ کا یہ پتھر ہٹ جائے تو سورج کی پہلی کرن نمودار ہونے سے قبل جنگل کے اس انقلاب کو کوئی نہیں روک سکتا۔''

''مجھے لگتا ہے شاپارا کہ تو اندر سے بہت خوفزدہ ہے۔'' کھیما نے طنز آمیز لہجے میں کہا...... ''شاید تو ابھی تک سردار کی بلند اقبالی کے سحر سے آزاد نہیں ہو سکا ہے...... بڑے بڑے وزنی پتھروں کو ہم نے اپنی ٹھوکروں سے ہٹا دیا اور اب تو ایک ایسے شخص سے خائف نظر آ رہا ہے جس کی حیثیت سنگ ریزے سے زیادہ نہیں ہے' ایسی کنکریاں تو میرے قدموں کی دھمک سے اڑ جاتی ہیں۔''

''نہیں کھیما! میں کسی سے خوفزدہ نہیں۔'' شاپارا کی آواز میں دبا دبا جوش تھا...... ''اگر خوفزدہ ہوتا تو باغیوں کی صف میں کیوں نظر آتا؟'' میں تو ہوشمندوں کی طرح ایک ایک پہلو کا جائزہ لے رہا ہوں' مجھے یہ بات ہرگز پسند نہیں کہ اندھوں کی طرح منزل کی طرف بڑھوں اور پھر ایک معمولی پتھر سے ٹھوکر کھا کر اوندھے منہ گر پڑوں۔ بے شک وہ دیوانہ لڑکا ایک ٹوٹا ہوا پتھر ہے مگر ہم اسے کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔''

''میرا تو خیال ہے کہ وہ بھی اپنے ہوش میں نہیں ہوگا۔'' دوسرے باغی کھیما نے شجاع الدین کامران کے بارے میں خیال آرائی کرتے ہوئے کہا...... ''میں سمجھتا ہوں شاید نرسنگا نے اسے بھی شراب پر لگا دیا ہے۔''

''اگر دیوتاؤں کی کرپا سے ایسا ہے تو پھر اس جنگل کو دو حصوں میں تقسیم ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ شاپارا نے خلاف معمول ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔

''دو حصوں سے تیرا کیا مفہوم ہے شاپارا' کھیما نے چونک کر پوچھا۔

''ایک حصے کا حکمران سردار کھیما ہوگا اور دوسرے حصے پر تیرے دوست شاپارا کی حکومت ہوگی۔'' اس نے انتہائی سرد لہجے میں کہا۔ اس کے عیار ذہن میں ایک طوفان سا کروٹیں لینے لگا۔ شاپارا نے کھیما کو لالچ دے کر اپنے

منصوبے میں شریک کیا تھا کہ کامیاب ہونے کے بعد پورے جنگل کو برابر کے دو حصوں میں تقسیم کیا جائے گا۔ اس وقت اضطراری طور پر اس کے منہ سے یہ بات نکل گئی تھی' مگر درحقیقت شاپارا اپنے قول میں سچا نہیں تھا' وہ محض اپنی طاقت کو بڑھانے کیلئے کھیما سے اشتراک کی بات کر رہا تھا۔ ورنہ منصوبے کی بنیادی شکل یہی تھی کہ سردار نرسنگا کو ہلاک کرنے کے بعد کسی مناسب موقع پر کھیما کو بھی راستے سے ہٹا دیا جائے گا۔

اقتدار اور سرداری کا خواب بھی بڑا پرفریب ہوتا ہے۔ کھیما بھی اس سحر سے محفوظ نہ رہ سکا۔ وہ بھی کسی شرابی کی طرح لڑکھڑانے لگا۔ کھیما جانتا تھا کہ جنگل کی سرداری شاپارا کے تعاون کے بغیر ممکن نہیں تھی۔ شاپارا ہی دراصل نرسنگا کا نائب تھا۔ سردار کے مرتے ہی اصولی طور پر جنگل کے تمام لٹیرے شاپارا کی قیادت کو تسلیم کر لیتے اور پھر درپردہ کھیما ہی اس اقتدار میں شریک ہو جاتا۔ یہ منافقت کا ایک پیچ در پیچ منصوبہ تھا جس میں دو طاقتور مہرے مصلحت اور ریاکاری کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہوئے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کر رہے تھے۔

پھر شاپارا اور کھیما اپنے آٹھ مسلح ساتھیوں کے ہمراہ سردار نرسنگا کی زمین دوز پناہ گاہ تک پہنچ گئے۔ محافظوں کو پہلے ہی شراب پلا کر بے دست و پا کیا جا چکا تھا۔ اس لئے باغیوں کو اندر داخل ہونے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔

نرسنگا کی پناہ گاہ کا پہلا' دوسرا اور تیسرا حصہ خالی تھا۔ یہاں کے تمام محافظ پہرے دار قزاقی کی ایک بڑی واردات میں شریک ہونے کے لیے باہر چلے گئے نتیجتاً شاپارا اور کھیما کے ساتھی دبے پاؤں کسی رکاوٹ کے بغیر آگے بڑھتے رہے۔ چوتھے اور پانچویں حصے میں جادوگروں کی جماعت مقیم تھی۔ جو نرسنگا کے اقتدار کی ترقی اور جان و مال کی حفاظت کیلئے ہمہ وقت منتروں کا جاپ کرتی رہتی تھی۔

شاپارا اور کھیما اسی زمین دوز پناہ گاہ کے چوتھے دروازے میں داخل ہوئے تو چار جادوگر آنکھیں بند کئے ہوئے مخصوص جاپ کر رہے تھے اور پورا کمرہ لوبان کے دھوئیں سے بھرا ہوا تھا۔ باغیوں کی تلواروں نے بیک وقت کئی جادوگروں کی شہ رگوں کو چھو لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ اپنے خون میں نہا کر کمرے کے فرش پر تڑپنے لگے۔ جن کا تعلق براہ راست اپنے دیوتاؤں سے تھا اور جو اپنے گیان کی طاقت کے سہارے نرسنگا کو تمام بلاؤں اور حادثوں سے محفوظ رکھتے تھے۔ دم توڑتے ہوئے جادوگروں کی ہلکی ہلکی چیخیں کمرے میں گونج رہی تھیں جنہیں پانچویں حصے میں مقیم دوسرے جادوگروں نے سنا تھا۔ ابھی وہ تین گیانی صورتحال کو سمجھ نہیں پائے تھے کہ شاپارا اور کھیما اپنے خوفناک چہروں اور خون میں ڈوبی ہوئی تلواروں کے ساتھ نمودار ہوئے۔ بقیہ جادوگر جو اپنے ساتھیوں کی ہلکی ہلکی چیخوں کے سبب پہلے ہی ہوشیار ہو گئے تھے' شاپارا اور کھیما کو دیکھ کر بدحواس ہو گئے۔

''اپنی تلواریں زمین پر پھینک دو ورنہ تم پر دیوتاؤں کا عذاب نازل ہوگا'' تینوں ساحر تیز آواز میں چیخنے لگے۔

''جب تک ہمارے منتروں کی گونج باقی ہے اس وقت تک سردار نرسنگا کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔''

شاپارا بجلی کی سی تیزی کے ساتھ یہ کہتا ہوا جھپٹا۔ ''بدنصیبو! تمہیں کیا خبر کہ تمہارے چاروں ساتھی موت کی نیند سو چکے ہیں' انہیں بھی اپنے منتروں پر بڑا ناز تھا۔ اس سے پہلے وہ بھی یہی کہہ رہے تھے کہ ہم پر دیوتاؤں کا غضب نازل ہوگا' اگر ہم نے انہیں خود کمزور شاخوں کی طرح توڑ کر پھینک دیا۔ اور اب تم بھی اپنی آوازوں کو سینوں میں گھونٹ لو ورنہ میں تمہارے ساتھ اس گیان کا بھی خون پی جاؤں گا کہ گیان کے سہارے تم نرسنگا کو دھوکہ دیتے رہے ہو۔''

وہ اپنا دفاع کرنے کیلئے پیچھے ہٹ رہے تھے۔ ان کی یہی کوشش تھی کہ وہ کسی طرح شجاع الدین کامران کے کمرے کے اندر داخل ہو کر اپنی جا[illegible] نہیں دیا۔ ایک ساحر کمرے کے

وسط میں پہنچنے لگا اور دو جادوگر زخمی ہونے کے بعد کامران کے کمرے کے دروازے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ ان میں سے ایک کے زخم اتنے کاری نہیں تھے کہ توانائی ساتھ چھوڑ دیتی اور وہ حرکت کرنے کے قابل نہ رہتے۔ اسی لئے وہ یہاں تک پہنچے‘ مگر شاپارا کے ساتھیوں نے انہیں اندر جانے نہیں دیا‘ یہاں تک کہ دونوں دروازے کے بیچ ہی دم توڑ گئے۔

❋❋❋

شجاع الدین کامران حسب معمول جاگ رہا تھا‘ اسے نیند کب آتی تھی‘ وہ تو کئی ماہ سے بے خوابی کا شکار ہو کر ان کی چیخیں سن کر اٹھ کھڑا ہوا‘ دروازے تک آ کر اس نے ان کا جائزہ لینے سے پہلے اس نے قریب ہی رکھی ہوئی کمان سنبھال لی۔ کامران کے استاد نرسنگا نے اسے پہلا گر یہ سکھایا تھا کہ اگر کسی حادثے کے قدموں کی چاپ سنائی دے تو انسان بے اختیار ہو کر باہر نکلنے سے گریز کرے اور وہ اپنے ہتھیار پر گرفت مضبوط کرے‘ اس طرح انسان کو یہ حوصلہ ہو جاتا ہے کہ مقابلے کے وقت وہ بے دست و پا نہیں ہے۔

تلوار لے کر کامران پلٹا اور جب دروازے کے قریب آیا تو جادوگر خون میں نہائے ہوئے پڑے تھے۔ کامران کو سنبھلنے کا موقع ملا۔ جادوگروں کی زندگی کا اختتام نزدیک تھا‘ مگر وہ کھٹیما اور شاپارا اور اس کے آدمیوں کے درمیان ایک حصار بن گئے تھے۔ یہی چند لمحات شجاع الدین کامران کو سنبھلنے کا موقع فراہم کر گئے۔ وہ تیزی سے الٹے قدم واپس لوٹا۔ اس کا چہرہ باغیوں کی طرف تھا اور پشت نرسنگا کے کمرے کی جانب۔ کامران پیچھے ہٹتے ہٹتے سردار کے کمرے کے وسط میں ٹھہر گیا اور پوری طاقت سے دروازہ کھولا۔

سردار! ہوشیار ہو جا کہ دشمن تیرے دروازے تک پہنچ چکا ہے کہ وقت نے ہمیں بہت کم مہلت دی ہے‘ میں کچھ دیر تک یقیناً روک لوں گا مجھے حملہ آوروں کی تعداد کا صحیح اندازہ نہیں ہے۔“

شاپارا اور اس کے ساتھی ایک ہی وار میں شجاع الدین کامران کو قتل کر دینا چاہتے تھے‘ مگر ابھی اس کا برا وقت نہیں آیا تھا وہ بڑی مردانگی سے حملہ آوروں کا مقابلہ کرتا رہا‘ خود اس نے اپنے دشمنوں کے جسموں کو بھی رنگین بنا ڈالا۔ شاپارا اچانک کسی وحشی کی طرح چیخا۔

کھٹیما! میں اس سے اکیلا ہی نمٹ لوں گا‘ تو اپنے ساتھیوں کو لے کر سردار کی خواب گاہ میں داخل ہو جا اور اس کی زندگی کا چراغ بجھا دے‘ جس نے ہمیں ذلت و رسوائی کے ساتھ اندھیروں میں دھکیل دیا ہے۔“

نمک حرام شاپارا! یہ اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک تو میری لاش کو پامال نہ کر ڈالے.....“ شجاع الدین کامران نے جواباً چیخ کر کہا۔

کامران کے لڑنے کا انداز بڑا ہوشمندانہ تھا‘ وہ اپنا دفاع کر کے کھٹیما اور شاپارا کے ساتھیوں کو نرسنگا کے کمرے میں داخل ہونے سے بھی روک رہا تھا‘ اس کشمکش میں اس کے جسم پر زخم آئے تھے‘ مگر کوئی زخم جان لیوا نہیں تھا‘ پھر بھی اس کی آنکھوں کے شرارے آہستہ آہستہ بجھتے جا رہے تھے۔ وہ نرسنگا کا کمرے سے برآمد ہونے کا انتظار کر رہا تھا لیکن ابھی تک دروازہ کھلا تھا اور نہ سردار باہر آیا تھا۔

شجاع الدین کامران شاپارا اور اس کے ساتھیوں کا مقابلہ کر رہا تھا‘ اس دوران تین باغی زخمی ہو کر کمرے میں گر گئے تھے اور رینگتے ہوئے یہاں سے باہر جانے کی کوشش کر رہے تھے‘ اپنے ساتھیوں کا یہ حشر دیکھ کر شاپارا بھاگ گیا تھا۔

اس نامراد کے ٹکڑے کر دو۔“ شاپارا بڑے غلیظ لہجے میں ان کو گالیاں بک رہا تھا اور بار بار اپنے ساتھیوں کو

للکار رہا تھا۔ "کیا تم نے چوڑیاں پہن لی ہیں کہ اب تک ایک بھی فتح حاصل نہیں کر سکے۔"

شاپارا ہذیانی انداز میں چیخ رہا تھا کہ سردار کے کمرے کا دروازہ کھلا۔ نرسنگا کے ایک ہاتھ میں بے نیام تلوار تھی اور کمر پر فولادی ڈھال۔ وہ سر سے پاؤں تک قہر آلود نظر آ رہا تھا۔

تو تو ہے شاپارا؟" نرسنگا کی گرجدار آواز یہ تھی کہ راستے کا بھکاری جسے میں نے بھوک کی دلدل سے سونے کی روٹیاں اور آزادی کا بستر دیا۔ آج وہی اپنے آقا کے سامنے شمشیر بکف کھڑا ہے۔" یہ کہہ کر سردار نرسنگا آگے بڑھا۔

پہلے کھٹیما اس کے راستے میں مزاحم ہوا' مگر نرسنگا نے نے کھٹیما کی تلوار کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔

باغیوں کی صف میں اس وقت کھلبلی مچ گئی جب انہوں نے امر پالی کو چمکتی ہوئی تلوار کے ساتھ کمرے کے اندر داخل ہوتے دیکھا۔ شاپارا اور کھٹیما کے سارے اندازے غلط ثابت ہوئے تھے۔ امر پالی نے اپنی زندگی میں کبھی شراب کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ اس نے بارہا اپنے شوہر کیلئے مجلس کیف و نشاط کا اہتمام کیا تھا' مگر ایک بار بھی یہ نشہ آور شے زبان سے نہیں چکھی تھی۔ سردار نرسنگا نے اسے بھی تنہائی میں شمشیر زنی کا فن سکھایا تھا۔ جنگلی لٹیرے عام طور پر یہی سمجھتے تھے کہ امر پالی صرف ایک تو بہ شکن حسن رکھنے والی عورت ہے اور اسے دلکش اداؤں اور ہر شربا رقص کے زاویوں کے مظاہرے کے سوا کچھ نہیں آتا۔ یہ لوگوں کی بڑی غلط فہمی تھی اور اسی غلط فہمی کی بنیاد پر باغیوں نے امر پالی کو محض ایک خوبصورت کھلونا سمجھ لیا تھا۔ ورنہ حقیقت یہ تھی کہ نرسنگا کی رفاقت نے امر پالی کو ایک جفاکش اور جنگجو عورت بنا دیا تھا اور آج جب اس کے شوہر پر وقت آ پڑا تو وہ خوف و دہشت میں مبتلا ہو کر اپنے ہاتھ کی چوڑیوں اور گلے کے ہار کو دیکھنے کے بجائے تلوار لے کر باہر نکل آئی۔

باغی ایک اور تباہ کن غلط فہمی کا شکار ہو کر بربادیوں کے راستے پر نکل آئے تھے۔ ان کے خیال کے مطابق نرسنگا شراب کے نشے میں بدمست ہو کر راتیں گزارنے کا عادی تھا' مگر یہ راز کسی کو نہیں معلوم تھا کہ سردار مخصوص جشن کے سوا کبھی رات کو شراب نہیں پیتا تھا۔ اگر کبھی پینے کی خواہش ہوتی تو وہ بہت محدود مقدار استعمال کرتا اور ہمیشہ رات کے وقت ہوش میں رہنے کی کوشش کرتا اور باغیوں کا یہ اندازہ بھی درست نہیں تھا کہ نرسنگا اپنی خواب گاہ میں جانے کے بعد غفلت کی نیند سو جاتا ہے۔ نرسنگا فطرتاً ایک انتہائی ہوشیار انسان تھا۔ قزاقی کے خوفناک پیشے میں ملوث ہونے کے بعد نہ وہ کسی پر اعتبار کرتا تھا اور نہ اپنی طاقت کے بارے میں کسی خوش فہمی کا شکار ہوتا تھا۔ مختصراً نرسنگا ہر وقت بیدار رہنے والا انسان تھا۔ کچھ دیر قبل جب شجاع الدین کامران نے اسے آواز دی تھی' وہ نیم خوابی کی کیفیت سے دوچار تھا۔ ایک ہی آواز پر وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس نے امر پالی کو ہوشیار کرنے اور پھر اپنے ہتھیار جمع کرنے میں بہت تھوڑا وقت خرچ کیا تھا۔ دروازے کے قریب کھڑے ہو کر اس نے چند لمحوں تک صورتحال کو سمجھنے کی کوشش کی تھی اور دیوانہ وار کمرے سے باہر نکل آیا تھا۔

نرسنگا کے آتے ہی جنگ کا نقشہ بدل گیا۔ زخمی کامران کو ذرا سی مہلت ملی تو اس نے شاپارا کا دایاں بازو بیکار کر دیا۔ کھٹیما پہلے ہی بے دست و پا ہو چکا تھا۔ اس نے موت کو سامنے پا کر نرسنگا سے اپنی جان کی امان مانگی' مگر سردار کی بے رحم شمشیر نے پے در پے اس پر کئی وار کئے اور کھٹیما لڑکھڑا کر گر پڑا۔

شاپارا کے ایک ساتھی کو امر پالی نے نیم جاں کر دیا۔ چار باغی فرار ہونے کی فکر میں تھے' مگر نرسنگا نے انہیں بھی مفلوج بنا دیا۔ شاپارا کامران کی تلوار کا ہدف تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کا سر تن سے جدا کر دے لیکن نرسنگا نے چیخ کر کہا۔

"نہیں ٹھاکر! اس حرام کار کو ذبح نہ کرنا۔"

سردار کی تنبیہ سنتے ہی شجاع الدین کامران کی تلوار کا زاویہ بدل گیا اور شاپارا شدید زخمی ہو کر زمین بوس ہو گیا۔
بغاوت ناکام ہو چکی تھی' کامران اور امرپالی نے مل کر تمام باغیوں کو ریشم کی مضبوط رسیوں سے جکڑ دیا۔
سردار نرسنگا بہت احتیاط کے ساتھ کمرے کے دروازے تک آیا جہاں دو ساحروں کی لاشیں پڑی تھیں۔ نرسنگا بہت غور سے ان لوگوں کے مردہ جسموں کو دیکھنے لگا' جو شب و روز اس کے اقتدار کی بقاء کیلئے دعائیں کرتے تھے۔ بڑا جذباتی لمحہ تھا۔ سردار نرسنگا کا تانبے جیسا سرخ چہرہ بجھ کر رہ گیا۔ یکایک ایک ساحر کے جسم کو حرکت ہوئی۔ شاید ابھی اس کے بدن میں زندگی کی کوئی ڈوبتی ہوئی لہر موجود تھی۔
نرسنگا نے چونک کر دیکھا۔ ساحر کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ نرسنگا تیزی سے جھک گیا۔
ساحر بہت نحیف آواز میں کہہ رہا تھا "سردار! تجھے نئی زندگی مبارک ہو۔ ہمارا گیان ہمارے کسی کام نہیں آیا۔ بس آکاش پر یہی لکھا تھا۔ میں دیوتاؤں کے پاس جا رہا ہوں۔ مگر یاد رکھنا کہ ابھی تیرے خلاف بہت طوفان آئیں گے......" ساحر کچھ اور کہنا چاہتا تھا' مگر زبان نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا' جسم کا پنجرہ ٹوٹا اور روح کا پرندہ آزاد ہو گیا۔
سردار نرسنگا اداس چہرے کے ساتھ اٹھا اور دوسرے کمرے میں آیا۔ وہاں ایک جادوگر کی لاش پڑی تھی۔ نرسنگا کے چہرے کا تناؤ کچھ اور بڑھ گیا۔ اسے اپنے خدمت گاروں کی موت پر بہت افسوس تھا' پھر وہ ملحقہ کمرے کی طرف بڑھا۔ وہاں باقی چار ساحروں کے مردہ جسم پڑے تھے۔
"ظالموں نے کسی ایک پجاری کو بھی نہیں چھوڑا۔" نرسنگا نے غضب ناک لہجے میں کہا اور تیز رفتاری کے ساتھ تمام کمروں کو عبور کرتا ہوا پناہ گاہ کے دروازے تک آ گیا۔
غصے کی آگ سے نرسنگا کے دل و دماغ جل رہے تھے' مگر اس نے اپنے ہوش و حواس نہیں کھوئے تھے۔ وہ بہت ہوشیاری کے ساتھ دروازے پر کھڑا چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ جنگل پر موت کا سناٹا طاری تھا۔ ہر شے گہری تاریکی کے لباس میں لپٹی ہوئی تھی۔ نرسنگا کو قزاقی کی طویل زندگی میں پہلی بار ایسی پرہول رات سے سابقہ پڑا تھا۔ سکوت کا وہ عالم تھا کہ جیسے جنگل میں پائی جانے والی ہر چیز کو موت نے نگل لیا ہو۔ کبھی کبھی بہت دور کسی جنگلی جانور کی ابھرنے والی آواز خاموشی کے سینے میں ایک لمحے کیلئے شگاف ڈال دیتی تھی اور پھر فوراً ہی دہشت زدہ کر دینے والا سکوت چھا جاتا تھا۔ البتہ درختوں کی جڑوں اور ڈالیوں میں روپوش جھینگروں کی آوازیں مسلسل سنائی دے رہی تھیں۔ جیسے نرسنگا کے نادیدہ دشمن آپس میں سرگوشیاں کر رہے ہیں۔
نرسنگا کچھ دیر تک بے حس و حرکت کھڑا جنگل کی فضا کا جائزہ لیتا رہا اور پھر دبے قدموں واپس لوٹ آیا۔ اس نے آہستہ سے پناہ گاہ کا پہلا آہنی دروازہ بند کیا اور اپنی خواب گاہ کی طرف بڑھنے لگا۔ اس دوران اس نے سوچا تھا کہ وہ شنکھ نما بگل بجا کر تمام لٹیروں کو جمع کر لے' مگر کچھ دیر غور و فکر کرنے کے بعد نرسنگا نے اس خیال کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ کہیں بگل کی آواز سن کر دوسرے باغی بھی اس طرف متوجہ نہ ہو جائیں۔ دروازے پر مسلح محافظوں کو نہ پا کر اسے شدید حیرت ہوئی تھی۔ اگر وہ زخمی کر دیئے گئے تھے تو ان کی لاشیں یا شکستہ جسم کہیں قریب ہی نظر آتے لیکن جب نرسنگا کو دور تک اپنے محافظوں کا دھندلا سا عکس بھی نظر نہیں آیا تو وہ دبے قدموں خواب گاہ کی جانب لوٹ آیا۔

❋❋❋

نرسنگا نے اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے شجاع الدین کامران کی طرف دیکھا۔ وہ باغیوں کو بے دست و پا کرنے کے بعد دیوار [illegible] کر لی تھیں۔ کامران کا پورا جسم خون

میں نہایا ہوا تھا۔

امرپالی کسی مستعد حملہ آور کی طرح زخمیوں کے قریب کھڑی تھی۔ وہ کبھی کراہتے ہوئے باغیوں کی طرف دیکھتی اور کبھی شجاع الدین کامران کی طرف' جس کے چہرے پر شدید تھکن اور نقاہت کے آثار نمایاں ہو چلے تھے۔ پھر جیسے ہی نرسنگا کمرے میں داخل ہوا امرپالی چیخ کر بولی۔

''سردار! ٹھاکر کا خیال کرو کہ وہ ہمارے اندازے سے بھی زیادہ زخمی ہے۔''

امرپالی کی آواز سن کر کامران نے آنکھیں کھول دیں۔

نرسنگا تیزی سے کامران کی طرف بڑھا اور پھر گھٹنوں کے بل فرش پر بیٹھتا ہوا بولا۔ ''ٹھاکر! تیرا کیا حال ہے؟'' خلاف معمول نرسنگا کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔

''میں ٹھیک ہوں سردار!'' کامران نے اپنی بکھرتی ہوئی طاقت کو سمیٹ کر کہا۔ ''خدا کا شکر ہے کہ میری موجودگی میں آپ پر کوئی آنچ نہیں آئی۔'' کامران کا لہجہ بہت زیادہ جذباتی ہو گیا تھا۔

''ہاں ٹھاکر! تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے کہ میرے جسم پر ایک خراش بھی نہیں آئی ہے۔'' اب نرسنگا کی آنکھوں میں ہلکی ہلکی نمی جھلکنے لگی تھی۔

''سردار! یہ باتوں کا وقت نہیں ہے۔'' امرپالی نے تیز آواز میں کہا۔

نرسنگا سنبھل کر اٹھا اور اپنے کمرے کی طرف بھاگا۔

پھر جب وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک بڑا مرتبان اور چھوٹی چھوٹی لکڑیوں کے ساتھ کپڑے کی کچھ پٹیاں تھیں۔ نرسنگا نے مرتبان کھولا' تیز بو سے پورا کمرہ بھر گیا۔ مرتبان میں جڑی بوٹیوں کا محلول تھا۔ نرسنگا نے لکڑی پر کپڑے کا ایک ٹکڑا لپیٹا اور اسے محلول میں ڈبو کر کامران کے زخموں پر لگانے لگا۔

محلول اس قدر تیز تھا کہ شجاع الدین کامران کے جسم میں آگ سی بھر گئی۔ اس سوزش کو برداشت کرتے کرتے کامران کے جبڑوں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں اور پورا چہرہ پسینے میں نہا گیا تھا۔

''بس ٹھاکر! کچھ دیر کی بات ہے۔'' نرسنگا نے کامران کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''یہ تریاق اعظم ہے لوہے کے زہر کو ایک پل میں زائل کر دے گا۔'' سردار نرسنگا کامران کے زخموں پر جڑی بوٹیوں کا عرق لگا رہا تھا اور بار بار اپنی زبان سے ایک ہی جملہ ادا کر رہا تھا۔ ''ٹھاکر! نرسنگا کیلئے آج تک اتنا خون کسی نے نہیں بہایا۔''

''میرے خون کی فکر نہ کر سردار! ان باغیوں کی طرف دیکھ جن کا کوئی اندازہ نہیں۔'' شجاع الدین کامران نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اب بھی آثار ہیں کچھ دوسرے طوفانوں کے۔''

''نہیں ٹھاکر! اب کوئی طوفان نہیں آئے گا۔'' نرسنگا نے کامران کے زخموں پر پٹیاں باندھتے ہوئے کہا۔ ''بس یہی چند بدنصیب تھے جن کی موت انہیں کھینچ کر یہاں لے آئی ہے۔''

''پھر بھی سردار.....'' کامران مزید کچھ کہنا چاہتا' مگر نرسنگا نے اس کی بات کاٹ دی۔

''خاموش ہو جا ٹھاکر! نہیں تو زخموں کے منہ کھل جائیں گے۔'' حیرت انگیز طور پر نرسنگا کا لہجہ بہت جذباتی اور مشفقانہ تھا۔ ''آج کی رات میرے نزدیک تیرے خون سے زیادہ کوئی چیز قیمتی نہیں۔ یہاں تک کہ نرسنگا کی جان بھی اس وقت بے حقیقت ہے۔''

کامران نے ایک نظر نرسنگا کے چہرے کی طرف دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔ آج یہ وحشی سردار بالکل بدلا ہوا [illegible] نے اپنی زندگی میں اتنا بے خوف

انسان نہیں دیکھا تھا کہ جس کے دروازے پر خونی انقلاب دستک دے رہا ہو اور وہ دروازے کی طرف پیٹھ کئے ہوئے انتہائی بے نیازی کے عالم میں اپنے ایک ساتھی کی تیمارداری کر رہا ہو۔

کامران کے زخموں پر مرہم رکھنے کے بعد نرسنگا اٹھا اور اس نے پلٹ کر رسیوں میں جکڑے ہوئے باغیوں کو دیکھا۔ تین لٹیرے نزع کے عالم میں گرفتار تھے۔ نرسنگا ان کے قریب آیا اور ٹھوکر مارتے ہوئے بولا۔

"اگر تم وفادار ہوتے تو آج کم نسل کتوں کی موت نہ مرتے۔"

شاپارا اور کھیما نے اس سے جان بخشی کی درخواست کی' مگر نرسنگا اپنی پناہ گاہ کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

صبح کے قریب تمام لٹیرے اپنی کامیابی کا جشن مناتے ہوئے واپس لوٹے۔ وہ جلد از جلد جنگل پہنچ کر اپنے سردار کو یہ خوشخبری سنانا چاہتے تھے کہ آج کی رات لوٹا ہوا مال ان کے تصور سے بھی کہیں زیادہ تھا' مگر جب ان لوگوں نے رات کے اندھیرے میں نرسنگا کو دروازے پر تنہا کھڑا پایا تو وہ لٹیرے کانپ کر رہ گئے۔

نرسنگا نے باقی لٹیروں کو وہیں ٹھہرنے کا حکم دیا اور اپنے مخصوص محافظوں کو لے کر اندر آیا۔ پناہ گاہ کے تمام کمروں کے فرش پر انسانی خون جما ہوا تھا اور جب محافظوں نے سردار کی خواب گاہ کے قریب دس باغیوں کو ایک ناقابل یقین حالت میں دیکھا تو ان کے جسموں پر لرزہ طاری ہو گیا۔

نرسنگا نے انہیں مختصراً پورا واقعہ سنایا اور پھر تمام محافظ دوسرے لٹیروں کے ساتھ جنگل میں ادھر ادھر پھیل گئے۔

❋❋❋

سورج طلوع ہوتے ہی سارے قزاق اپنے سردار کی پناہ گاہ کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ دونوں محافظ جو شاپارا کے جھونپڑے میں مدہوش تھے انہیں بھی نرسنگا کے سامنے حاضر کر دیا گیا تھا۔

تمام جنگل ایک انجانے خوف سے لرز رہا تھا۔ آخر نرسنگا نے باغیوں کے خلاف اپنا فیصلہ سنا دیا۔

"میں انہیں اپنے ہاتھوں سے قتل کروں گا۔ یہ براہ راست میرے مجرم ہیں۔"

جیسے ہی نرسنگا کے الفاظ کی بازگشت ختم ہوئی باغیوں کے سر کٹ کٹ کر زمین پر گرنے لگے۔

پھر نرسنگا نے اپنے ماتحتوں کو حکم دیا کہ باغیوں کی لاشیں جنگل کے کسی سنسان گوشے میں ڈال دی جائیں تاکہ بھوکے گدھ اپنے لئے لذیذ غذا حاصل کر سکیں۔ آخر اس جنگل پر ان کا بھی حق ہے۔

وہ محافظ جو شاپارا کے فریب کا شکار ہوئے تھے انہیں بھی بے دردی کے ساتھ قتل کر دیا گیا۔ نرسنگا کو غیر ذمہ دار انسانوں سے شدید نفرت تھی۔

اس کے بعد ساتوں جادوگروں کی ارتھیاں اٹھائی گئیں۔ نرسنگا ان کے جنازوں کے آگے آگے چل رہا تھا۔

پھر جب ان ساحروں کی لاشیں جل گئیں تو نرسنگا نے حکم دیا کہ ان کی راکھ سمیٹ لی جائے اور جنگل کے عین وسط میں سات سمادھیاں (آخری یادگاریں) بنا دی جائیں کہ یہ بہت نیک اور محبت کرنے والے لوگ تھے۔ نرسنگا اپنے خیر خواہوں کا اسی طرح احترام کرتا ہے۔

❋❋❋

ان تمام ہنگاموں سے فارغ ہونے کے بعد ایک بڑے جشن کا اہتمام کیا گیا۔ دس ہاتھ اونچے منچ پر ایک تخت بچھایا گیا' جس پر سردار نرسنگا براجمان ہوا۔ اس کے دائیں جانب شجاع الدین کامران تھا اور بائیں طرف امرپالی کسی ملکہ کے انداز میں بیٹھی تھی۔

جب تمام لوگ جمع ہو گئے تو نرسنگا کھڑا ہوا اور بلند آواز میں اپنے ماتحت لٹیروں سے مخاطب ہو کر بولا۔

''آج تمہارے سردار کو نئی زندگی ملی ہے اور اس زندگی پر سب سے بڑا احسان ٹھاکر کا ہے۔ اگر یہ اپنی جان کو خطرے میں نہ ڈال دیتا تو اس وقت تک لوگ میری موت کا ماتم کر رہے ہوتے۔ یہ کہہ کر نرسنگا خاموش ہو گیا۔

جنگل کی فضا ٹھاکر کی ''جے کار'' کے نعروں سے گونجنے لگی۔

پھر نرسنگا نے شجاع الدین کامران سے کھڑے ہونے کیلئے کہا۔

''یہ میرا بیٹا بھی ہے، بھائی بھی اور دوست بھی۔'' یکا یک نرسنگا رونے لگا...... آج مجھے اس پر اعتبار آ گیا ہے۔''

یہ کہہ کر نرسنگا نے کامران کے کاندھے پر سر رکھ دیا۔ ''ٹھاکر! اب اگر تو چاہے تو، تو مجھے چھوڑ کر اپنی دنیا میں واپس جا سکتا ہے۔ دیوتاؤں کی قسم! اب تجھے کوئی نہیں روک سکتا۔''

***

شجاع الدین کامران سردار نرسنگا کی بات سن کر حیران رہ گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک دن اس کے پیروں کی زنجیریں کٹ جائیں گی اور وہ اس وحشت ناک زندان سے نکل کر اپنی آزاد دنیا میں واپس لوٹ جائے گا۔
چند لمحوں تک کامران اس وحشی درندے کو دیکھتا رہا جو کسی بچے کی طرح اس کے کاندھے پر سر رکھے رو رہا تھا۔
"سردار! میں تیری باتوں کا مفہوم نہیں سمجھا۔" کامران نے الجھتے ہوئے کہا۔
نرسنگا نے سر اٹھایا اور تن کر کھڑا ہو گیا۔ منچ کے قریب کھڑے ہونے والے لٹیرے اپنے سردار کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی دیکھ رہے تھے۔ ہجوم پر ایک گہرا سناٹا طاری تھا۔
نرسنگا نے کامران کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر کہا۔
"اس جنگل کے ہر باسی پر فرض ہے کہ وہ میری طرح ٹھاکر کا بھی احترام کرے۔" نرسنگا نے آنسوؤں کو پی لیا تھا اور اب وہ اپنے اسی مخصوص گرجدار لہجے میں بول رہا تھا۔ "اگر میرے برے دن آ جائیں اور میں اس دنیا میں نہ رہوں تو پھر ٹھاکر ہی تمہارا سردار ہے۔"
ایک بار پھر سارا جنگل نعروں کے شور سے گونج اٹھا۔
پھر جب لٹیروں کی آوازیں فضا میں گم ہو گئیں تو نرسنگا نے اپنے قزاقوں کو واپس جانے کے لئے کہا اور اس کے ساتھ ہی محافظوں کو حکم دیا کہ وہ کل رات کو لوٹا ہوا سارا مال غریب لٹیروں میں برابر سے تقسیم کر دیں۔

❋❋❋

اس کے ساتھ نرسنگا، امرپالی اور شجاع الدین کامران کے ساتھ اپنی خواب گاہ میں لوٹ آیا۔ بغاوت کی ناکامی اور نرسنگا کی نئی زندگی کی بازیابی کے سلسلے میں ہر طرف جشن کا سا سماں تھا مگر خود نرسنگا کی آنکھوں میں گہری اداسی چھائی ہوئی تھی۔
خواب گاہ میں داخل ہوتے ہی نرسنگا اپنی مسند پر اس طرح لیٹ گیا جیسے وہ بہت تھک گیا ہو۔ امرپالی اور کامران بھی اس کے سامنے بیٹھ گئے۔
سردار کی اداسی کو دونوں محسوس کر رہے تھے، مگر کسی کو اس افسردگی کا سبب نہیں معلوم تھا۔
آخر نرسنگا نے خود ہی زبان کھولی۔ "ٹھاکر! کچھ دیر پہلے تو نے مجھ سے کہا تھا کہ تیرے لئے میری باتیں ناقابل فہم ہوتی ہیں؟" نرسنگا کے لہجے سے بھی تھکن کا اظہار ہو رہا تھا۔
"ہاں سردار! میں اب تک نہیں سمجھ سکا کہ آخر تیرے اندر یہ تبدیلی اچانک کیوں پیدا ہوئی ہے؟" شجاع الدین کامران نے رک رک کر کہا۔
"کیسی تبدیلی؟" نرسنگا نے چونک کر کہا۔

''کل تک مجھ پر پابندی تھی کہ میں اس جنگل کی حدود سے باہر نہیں جا سکتا اور آج.....'' کامران نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

نرسنگا کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر آہستہ آہستہ بولنے لگا۔ ''وقت دنیا کی ہر چیز کو بدل ڈالتا ہے ٹھاکر! پتھر بھی موسم کی سختیاں سہتے سہتے ٹوٹ کر بکھر جاتے ہیں' اصلی فولاد کو بھی وقت کا زنگ چاٹ جاتا ہے' روز وشب کی دیمک تناور درختوں کو کھوکھلا کر کے انہیں گر جانے کے لئے مجبور کر دیتی ہے' اسی وقت کی گردش نے نرسنگا کو بھی بدل ڈالا ہے۔''

شجاع الدین کامران بہت غور سے جنگلی سردار کی باتیں سن رہا تھا۔

''نرسنگا کبھی الجھی ہوئی باتیں نہیں کرتا۔ اس کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ تیر کی طرح سیدھا ہوتا ہے۔ میں نے یہ پابندی اس لئے عائد کی تھی کہ مجھے تجھ پر اعتبار نہیں تھا۔ ٹھاکر کرشن راؤ ایک مکار اور دھوکے باز انسان ہے۔ اس نے میرے اعتماد کو بڑے بھونڈے انداز میں لوٹا ہے' مگر پھر بھی میں اس کی کچھ باتوں کا قائل تھا۔ اس نے مجھ سے تیرے بارے میں کہا تھا کہ تو اول و آخر ایک مسلمان ہے۔ اس لئے کسی بھی مقام پر مذہب کا یہ فرق ہم دونوں کے درمیان نفرت کی دیوار بن سکتا ہے۔ میں نے اپنا ہنر اس لئے سکھایا تھا کہ آگے چل کر تجھ سے کام لے سکوں' مگر تو دل کی بازی اس طرح ہارا کہ دنیا کے کسی کام کا نہیں رہا۔ مجھے ایک بار ترس بھی آیا کہ تیرے پیروں کی زنجیریں کھول دوں' مگر کرشن راؤ یہی سمجھاتا رہا کہ تو نے جنگل کی تمام خفیہ پناہ گاہوں سے مکمل واقفیت حاصل کر لی ہے اگر باہر نکلنے کے بعد تجھے حکومت کی طرف سے بھاری رشوت دی گئی تو بہت ممکن ہے کہ تیری نیت میں خرابی آ جائے اور تو بڑے انعام کے لالچ میں میرے تمام ٹھکانوں کی نشاندہی کر دے۔ ٹھاکر کرشن راؤ نے یہ بھی کہا تھا کہ تو ایک غریب خاندان کا لڑکا ہے' اس لئے سونے چاندی کا ڈھیر دیکھ کر آسانی سے بہک جائے گا اور پھر حکومت کے مسلح کارندوں کو لا کر میرے سینے پر کھڑا کر دے گا۔ اس لئے میں نے تجھ پر ہمیشہ کے لئے یہ پابندی عائد کر دی کہ تو اپنی دنیا میں دوبارہ لوٹ کر نہیں جا سکے گا۔'' نرسنگا نے اپنے دل کی ایک ایک بات کہہ ڈالی۔

''پھر یہ پابندی ختم کیوں کی گئی سردار؟'' شجاع الدین کامران کے ہونٹوں پر بجھی بجھی سی مسکراہٹ تھی۔

''اس لئے کہ اب مجھے تجھ پر اعتبار آ گیا ہے۔'' نرسنگا بھی مسکرایا' مگر فوراً ہی سنجیدہ نظر آنے لگا۔

''اس اعتبار کی وجہ؟'' شجاع الدین کامران نے ایک اور سوال کر دیا۔

''اگر تو چاہتا تو کل رات باغیوں کے ساتھ مل کر مجھے نقصان پہنچا سکتا تھا۔'' یہ کہتے کہتے سردار نرسنگا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ''میں ایک قزاق ہوں ٹھاکر! اس پیشے میں قدم رکھتے ہی ہمیں سب سے پہلے موت کا سبق دیا جاتا ہے' ہم لوگ زندگی کی ہر علامت کو جھٹلا دیتے ہیں اور سانس کے رشتے کو سب سے زیادہ بے اعتبار سمجھتے ہیں۔ موت ہی ہماری رفیق ہوتی ہے اور موت ہی ہماری شریک حیات...... ہم موت کو اپنا دوست بناتے ہیں اور موت ہی سے شادی کرتے ہیں۔ اس لئے یہاں اس سوال کی کوئی اہمیت نہیں کہ باغیوں کے ساتھ مل کر تو مجھے ہلاک کر ڈالتا۔ میری موت اپنے وقت پر آئے گی' مگر تو مجھے مارنے کی ایک کوشش ناکام کر سکتا تھا۔ بس میرے نزدیک یہی نکتہ اہم ہے کہ تو غداروں اور نمک حراموں کی صف میں شامل نہیں ہوا۔ یہ تیرے کردار کی بلندی ہے۔'' جوش جذبات سے نرسنگا کا چہرہ تمتمانے لگا تھا۔

''سردار! کیا میں نے تجھ سے پہلے نہیں کہا تھا کہ میں احسان فراموشوں اور بزدلوں کی اولاد نہیں ہوں۔'' یکایک شجاع الدین کامران کی آواز بھی تیز ہو گئی تھی۔

''ہاں! تو نے کہا تھا۔'' نرسنگا نے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی۔ ''مگر کل رات سے پہلے تیرے پاس اس

دعوے کا کوئی ثبوت نہیں تھا۔ اب تجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں کہ تیری مردانگی اور احسان شناسی پر خود سردار نرسنگا گواہ ہے' تو نے جس بے غرضی کے ساتھ میرے لئے خون بہایا ہے اسے میں زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔ ہم قزاق ایسے مناظر کو یاد نہیں رکھتے کہ خون بہانا ہمارے کاروبار کا ایک معمولی اصول ہے ......مگر تیرے خون کو بہتے دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے خود نرسنگا کے بدن سے لہو کی دھاریں بہہ رہی ہیں۔ پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ جان کسے کہتے ہیں اور تمام خون برابر نہیں ہوتے۔ ٹھاکر! تیرا خون بہت مہنگا ہے' نرسنگا اپنی ساری دولت دے کر بھی اس خون کی قیمت ادا نہیں کر سکتا۔ ہاں شاید اس وقت حساب برابر ہو جائے کہ میں بھی تیرے لئے اپنے جسم سے اتنا ہی خون نچوڑ دوں۔"

شجاع الدین کامران نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خاموشی سے ایک سنگدل قزاق کی باتیں سن رہا تھا۔

کامران کو خاموش پا کر نرسنگا نے تیز لہجے میں کہا۔ "ٹھاکر! تیری اداسیوں پر میرا دل بہت کڑھتا ہے' تجھ جیسے جوانمرد نے اپنے دل کو یہ کیسا روگ لگا لیا؟ ایک عورت کی خاطر ساری دنیا کو ٹھوکر مار دی۔"

کامران نے چونک کر نرسنگا کی طرف دیکھا۔ اچانک سردار کا لہجہ بدل گیا تھا۔ "وہ باب تو کبھی کا بند ہو چکا ہے۔" کامران نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ "سردار! کیا تجھے بھی میرے زخموں پر نشتر زنی کر کے لذت حاصل ہوتی ہے؟" کامران کی آواز سے شدید کرب کا اظہار ہو رہا تھا۔

"نہیں ٹھاکر! تو غلط سوچ رہا ہے۔" نرسنگا ایک لمحے کے لئے سراسیمگی کا شکار ہو گیا۔

"پھر اس راکھ کو کس لئے کرید رہا ہے؟" کامران کے چہرے پر خفگی کے آثار نمایاں ہو چلے تھے۔

"میں اس راکھ کے نیچے دبی ہوئی چنگاریوں کو ہمیشہ کے لئے بجھا دینا چاہتا ہوں۔" نرسنگا کے لہجے کی تمکنت لوٹ آئی تھی۔

"اگر تمام کنارے ٹوٹ جائیں اور سمندر کا سارا پانی بھی ابل پڑے تو ان چنگاریوں کو نہیں بجھا سکتا۔" یہ کہتے کہتے شجاع الدین کامران کا پورا وجود لرز اٹھا تھا۔

"اگر تو مجھے اجازت دیدے تو میں ایک پل میں تجھے یہ تماشا بھی دکھا دوں۔" نرسنگا نے پرغرور لہجے میں کہا۔

"کیسی اجازت؟" کامران حیرت زدہ رہ گیا۔

"اگر تو زبان سے نہیں کہتا تو اپنے سر ہی کو جنبش دیدے' پھر دیکھ کر یہاں کیسا ہنگامہ برپا ہوتا ہے؟" نرسنگا کے خون کی گردش تیز ہو گئی تھی۔ "کل سورج ڈوبنے سے پہلے یا تو قائم خان اور یاسمین خانم موجود ہوں گے یا پھر تیرے سردار نرسنگا کا وجود مٹ جائے گا' دیوتاؤں کی قسم! دونوں میں سے کوئی ایک چیز باقی رہے گی یا تو نرسنگا کا کٹا ہوا سر یا قائم خان کی جھکی ہوئی گردن۔"

"سردار! تو انسانی جذبوں کو بھی طاقت کے ترازو میں تولنے کا عادی ہو گیا ہے۔" کامران کے لہجے میں گہرا طنز پوشیدہ تھا۔ "کیا تو سمجھتا ہے کہ اس طرح بازی کا رخ بدل جائے گا؟ نہیں سردار! ہرگز نہیں' جیت میرے مقدر ہی میں نہیں تھی۔ میں تو اس طرح ہارا ہوں کہ شاید ہی کسی نے ایسی ہار دیکھی ہوگی۔ خدا کے لئے تو بھی اس واقعے کو فراموش کر دے......جو ٹوٹ گیا سو ٹوٹ گیا' شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں۔" یکایک شجاع الدین کامران کی آواز میں رقت شامل ہو گئی اور اس کا چہرہ دھواں دھواں سا نظر آنے لگا تھا۔

کامران کی بگڑتی ہوئی حالت دیکھ کر نرسنگا سنبھل گیا۔ "ٹھاکر! میں تیرا دل دکھانا نہیں چاہتا' میں جانتا ہوں کہ طاقت سے کسی کا دل نہیں جیتا جا [illegible] ہے کہ میں ایک طاقتور انسان ہوں۔"

نرسنگا نے امر پالی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کا اور میرا سنگ خوشی اور غم دونوں سے مشروط ہے' اندھیروں اور اجالوں کی شرکت ہے۔''

''پھر تو نے میرے جذبات کو کیوں رسوا کیا سردار؟'' کامران درد کی شدت سے چیخ اٹھا۔

''میں تجھے ندیوں کی طرح پرشور دیکھنا چاہتا ہوں ٹھاکر!'' نرسنگا نے جذبات سے وارفتہ ہو کر کہا۔ ''میری خواہش ہے کہ تجھے جنگلی پھولوں کی طرح کسی گلچیں کا خوف نہ ہو' تو سدا مسکراتا اور گاتا رہے۔'' نرسنگا کی زبان سے ادا ہونے والا ایک ایک لفظ حقیقت کے رنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔

''میری مسکراہٹوں کی فکر چھوڑ دے سردار کہ وہ ان ہونٹوں کے لئے پیدا ہی نہیں ہوئی تھیں۔'' کامران کے لئے گزشتہ واقعات کا ذکر نا قابل برداشت تھا۔

''کیوں نہ کروں؟'' اچانک سردار نرسنگا برہم نظر آنے لگا۔ ''جب تو میرے لئے خون بہا سکتا ہے تو کیا میں پتھر بن جاؤں؟ اور پھر جدھر سے گزروں تو اس مٹی کا ایک ایک ذرہ چیخ چیخ کر کہے کہ نرسنگا کیسا احسان فراموش ہے؟''

''میں تو تجھ پر یہ الزام عائد نہیں کرتا۔'' کامران نے اس طرح کہا کہ نرسنگا جیسا سخت مزاج انسان بھی لرز کر رہ گیا۔

''تیری خاموشی ہی تو مجھے مارے ڈالتی ہے۔'' نرسنگا نے ایک آہ سرد کھینچتے ہوئے کہا۔ ''میں نے تیرے زخموں کو اس لئے نہیں چھیڑا تھا کہ ان سے خون رسنے لگے' میں تو چاہتا تھا کہ کسی طرح تیرا قرض اتار دوں۔''

''میرا قرض اس طرح نہیں اترے گا سردار!'' کامران نے اونچی آواز میں کہا۔

''پھر تو ہی بتا دے کہ میں اپنے کاندھوں کو کس طرح ہلکا کروں؟'' سردار نرسنگا پرامید نظروں سے دیکھنے لگا۔ اس نے کامران کے بدلے ہوئے لہجے کو محسوس کر لیا تھا۔

''بس تو مجھے یہاں سے جانے دے سردار!'' کامران نے بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''جانے کی اجازت تو میں دے چکا...... مگر اس سے پہلے میں تجھے آخری بار کچھ سمجھانا چاہتا ہوں۔'' نرسنگا مایوس نظر آنے لگا۔ توقعات کا جو گھروندا تیار ہوا تھا اسے کامران کے انکار کی تیز ہواؤں نے ڈھا دیا۔

''میں کچھ سمجھنا نہیں چاہتا۔'' کامران نے اپنے دل و دماغ پر کڑے پہرے بٹھا دیئے تھے۔

''میں جانتا تھا کہ تو یہی جواب دے گا۔'' نرسنگا اضطراری کیفیت سے دوچار ہو کر اپنے دونوں ہاتھوں کو ملنے لگا۔ ''بہادروں کی ایک پہچان یہ بھی ہوتی ہے کہ کسی کی کمزوری سے فائدہ نہیں اٹھاتے' بے شک! آج وہ لڑکی بہت کمزور ہے' تیرے ہاتھ تو شاید اسے نہ چھو سکیں مگر نرسنگا کے ہاتھ بہت دراز ہیں' اگر تو چاہتا تو سردار کی طاقت کا سود حاصل کر سکتا تھا۔''

کامران نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''دراصل بات یہ ہے ٹھاکر کہ میں تجھے کھونا نہیں چاہتا۔'' آخر نرسنگا نے اپنے دل کی بات کہہ ڈالی۔ ''اب جیسے جیسے دن گزرتے جا رہے ہیں' میں خود غرض ہوتا جا رہا ہوں۔ شاپارا کی بغاوت نے مجھے ہلا کر رکھ دیا ہے۔ ٹھاکرا آج جس شخص کی لاوارث لاش جنگل میں پڑی ہوئی ہے اور مردہ خور جانور جس کا گوشت نوچ رہے ہوں گے وہ ایک یتیم لڑکا تھا' میں نے اپنے بچے کی طرح اس کی پرورش کی تھی۔ پھر وہی بچہ اپنے باپ کے سینے کی طرف خنجر لے کر لپکا۔ یہ کیسی غداری تھی ٹھاکرا میں اسے کوئی نام نہیں دے سکتا۔''

شجاع الدین کامران اپنے زخموں کی سوزش کو بھول گیا تھا اور نرسنگا کی باتیں بہت غور سے سن رہا تھا۔

''میں بہت تنہا ہوں ٹھاکر! چٹانوں جیسی سختی رکھنے والا نرسنگا اچانک موم ہو کر پگھلنے لگا تھا۔ ''امرپالی کے سوا کوئی سچا ساتھی نہیں' میں جانتا ہوں کہ آج اگر ایک شاپارا کو قتل کر دیا گیا ہے تو کل کوئی دوسرا شاپارا اٹھ کھڑا ہو گا' یہ سب طاقت کے پجاری ہیں' فتح کے جشن میں شریک ہونے والے اور ناکامی کے اندھیروں میں ساتھ چھوڑ کر بھاگ جانے والے۔'' نرسنگا کی خوں رنگ آنکھوں میں پانی سا تیرتا ہوا دکھائی دینے لگا تھا۔ ''ٹھاکر! میں ایک بے اولاد انسان ہوں' اپنے وجود کی دوسری نشانی پانے کے لئے میں نے برسوں دیوی دیوتاؤں کے قدموں میں سر جھکایا ہے' مگر کسی نے میری خالی جھولی کو نہیں بھرا۔ یہی وہ محرومی تھی جس سے گھبرا کر میں نے شاپارا کو اپنے بیٹے اور نائب کا لقب دیا تھا' مگر وہ اس وقت میرا ساتھ چھوڑ گیا جب میری آنکھیں ایک سہانے خواب کے طلسم میں کھوئی ہوئی تھیں۔ میں کیا کروں ٹھاکر! اپنے دل سے مجبور ہوں تو نے میری خاطر خون بہایا تو گناہ گار آنکھیں پھر وہی خواب دیکھنے لگیں' بھگوان کے لئے کچھ دن ٹھہر جا! سردار نرسنگا کی عمر زیادہ طویل نہیں ہو گی۔ موت کا قزاق کسی بھی روز چپکے سے پشت میں خنجر گھونپ دے گا یا پھر یم راج (موت کا دیوتا) سامنے آ کر سینے میں بھالا اتار دے گا۔ پھر تو میری ارتھی اٹھانا اور اپنے ہاتھوں سے اس پاپی جسم کو آگ میں پھونک کر سردار نرسنگا کی راکھ ہوا میں اڑا دینا' میری اشانت (بے قرار) آتما کو چین آ جائے گا اور میں سمجھ لوں گا کہ میرے بیٹے نے میرا انتم سنسکار کر دیا۔ میں اس دنیا سے بے نشان جانا نہیں چاہتا۔ اگرچہ میرا اور تیرا دھرم الگ الگ ہے لیکن مردانگی کے مذہب میں دونوں ہم عقیدہ ہیں۔ اسی رشتے سے تو کچھ دن کے لئے میرا وارث بن جا۔'' نرسنگا مسلسل اپنے آنسو پینے کی کوشش کر رہا تھا' مگر اس کی آواز بھیگتی جا رہی تھی۔

شجاع الدین کامران ایک قزاق کی اس عجیب و غریب آرزو پر حیران رہ گیا۔

''یہ کوئی حکم نہیں ٹھاکر!'' شدت جذبات سے نرسنگا کی آواز کانپنے لگی۔ ''اس شکستہ انسان کی درخواست ہے جسے باپ کہہ کر کوئی پکارنے والا نہیں۔''

''کامران شدید جذباتی کشمکش کا شکار ہو گیا تھا۔ آخر وہ جھنجلا کر بولا۔ ''سردار! تو اپنا راستہ بدل کیوں نہیں دیتا؟ کب تک مجبور انسانوں کی زندگیوں سے کھیلتا رہے گا' ابھی تیرے پاس وقت ہے' انسانیت کے کوچے کی طرف نکل جا اور نیکیوں کے حصار میں پناہ ڈھونڈنے کی کوشش کر' ہمارے یہاں ہر گناہ گار کی توبہ قبول ہو جاتی ہے۔''

''ٹھاکر! بچوں جیسی باتیں نہ کر۔'' یکایک نرسنگا کے لہجے میں وہی سرکشی لوٹ آئی تھی۔ ''میری توبہ کا وقت گزر چکا' کیا تو سمجھتا ہے کہ تیرا قانون مجھے معاف کر دے گا۔'' نرسنگا نے ایک سوال کیا اور خود ہی جواب دینے لگا۔ ''ہرگز نہیں! مہذب انسانوں کے بنائے ہوئے قانون میں مجھ جیسے سفاک شخص کی معافی کے لئے کوئی گنجائش نہیں' جب میں بے شمار لوگوں کی جانوں کے ساتھ کھیلتا رہا ہوں تو پھر قانون کو بھی حق ہے کہ وہ میری زندگی کے ساتھ خوفناک ترین کھیل کھیلے' اسی کا نام انصاف ہے۔ میں کسی کو دوش نہیں دیتا مگر تیرا یہ خیال غلط ہے کہ میں بیڑیاں پہن کر سر جھکا کر انسانوں کی بھیڑ میں چلنا پسند کروں گا...... دیوتاؤں کی قسم! وہ وقت کبھی نہیں آئے گا۔ اگر میری بدبختی کے سبب ایسا ہو بھی گیا تو قانون کے ہاتھ مجھے چھو نہیں سکتے۔ میں خود ہی اپنی شہ رگ کاٹ ڈالوں گا۔''

کامران مایوس ہو گیا۔ پتھر میں جونک لگنے کا انتظار کرنا محض دیوانگی تھی۔ ''میں بھی اصولی طور پر تیرا قرض دار ہوں' اس لئے چاہتا ہوں کہ تو سیدھے راستے پر لوٹ آئے۔ تیری راہ گزر تو محرومیوں کے غبار سے اٹی ہوئی ہے' اس کھیل میں بڑے بڑے زور آوروں کو ذلت و ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ہے' اگر سنبھل سکتا ہے تو سنبھل جا۔'' کامران نے تاثیر انگیز لہجے میں کہا۔

''میں تیری محبت کا قدر شناس ہوں ٹھاکر! مگر ایسا مشورہ نہ دے کہ جسے قبول کرنے کے بعد سردار نرسنگا کی ذات کی نفی ہو جائے۔''

''تو اپنی ذات کی پرستش جاری رکھ' مگر مجھے یہاں سے چلا جانے دے۔'' شجاع الدین کامران نے شدید اکتاہٹ کے لہجے میں کہا۔ ''میں تیرے کسی کام کا نہیں سردار!''

نرسنگا جانتا تھا کہ کامران کسی قیمت پر یہاں نہیں ٹھہرے گا۔ پھر بھی وہ اسے روکنے کی کوشش کرتا رہا۔

''اب مجھے تیری بے غرضی پر شک ہونے لگا ہے۔'' آخر کامران کی قوت برداشت جواب دے گئی۔

یہ ایک کاری ضرب تھی۔ نرسنگا اس چوٹ سے بدحواس ہو گیا۔ ''کیا میں خودغرض ہوں ٹھاکر!''

اگر یہ خودغرضی نہیں تو اور کیا ہے کہ تو ایک ایسے شخص کو اپنے کاروبار میں شریک کرنا چاہتا ہے جو کسی مچھر کو بھی قتل نہیں کر سکتا۔'' کامران نے جھنجھلا کر کہا۔

''نہیں ٹھاکر! میں خودغرض نہیں ہوں۔'' نرسنگا اچانک دل گرفتہ نظر آنے لگا۔ ''میں نے تجھ سے پہلے ہی کہا تھا کہ یہ ایک درخواست ہے۔ کوئی جابرانہ حکم نہیں۔ تو اپنی دنیا میں واپس چلا جا مگر جانے سے پہلے میری ایک بات ضرور مان لے۔''

کامران خاموش رہا مگر اس کا پورا وجود ایک سوال بن کر رہ گیا۔

''ٹھاکر کرشن راؤ کہتا تھا کہ تو ایک مفلس خاندان کا فرد ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تیرے جسم سے غربت کے چیتھڑے ہٹ جائیں اور تو میری آنکھوں کے سامنے زرنگار لباس پہن لے۔''

''آخر تو کہنا کیا چاہتا ہے سردار؟'' کامران نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

''میرے سونے چاندی کے اس ڈھیر میں سے جتنا چاہے اٹھا لے۔'' نرسنگا نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ''میں نہیں چاہتا کہ یہ بے رحم دنیا تیری ظاہری حالت پر انگلیاں اٹھائے۔''

''کامران نے بڑی بے رحمی سے نرسنگا کی اس پیشکش کو ٹھکرا دیا۔ ''تیری دولت کے انبار کا ایک ایک سکہ انسانی خون میں ڈوبا ہوا ہے سردار! میں ایسی غذا استعمال نہیں کر سکتا۔''

آج پہلی بار نرسنگا نے اپنی شکست کا مشاہدہ کیا تھا۔ وہ بہت دیر تک اداس بیٹھا رہا۔ پھر بڑے غم زدہ لہجے میں کہنے لگا۔ ''جانے والوں کو کوئی نہیں روک سکتا ٹھاکر! مگر میں خوش ہوں کہ تو اپنی دنیا میں واپس جا رہا ہے۔'' یہ کہہ کر نرسنگا نے کروٹ لے لی۔ وہ اپنے آنسوؤں کو شجاع الدین کامران سے چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ''شاید دیوتاؤں کی یہی مرضی ہے کہ نرسنگا بے نشان ہی مر جائے۔ خیر! اس سے کیا ہوتا ہے تو خوش رہ ٹھاکر! تیرے زخم ٹھیک ہو جائیں پھر تجھے یہاں سے رخصت کر دوں گا۔''

✽✽✽

کامران اس وقت حیران رہ گیا جب اس نے ٹھاکر کرشن راؤ کو نرسنگا کی پناہ گاہ میں داخل ہوتے دیکھا۔ یہ بڑی انہونی بات تھی۔ نرسنگا اور کرشن راؤ کے تعلقات بظاہر ختم ہو چکے تھے' مگر آج اس کی آمد نے کامران کو چونک جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ مسلح محافظوں کی نگرانی میں کرشن راؤ اندر چلا گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ایک محافظ نے باہر آ کر کہا۔

''ٹھاکر! سردار آپ کو بلا رہے ہیں۔''

پر گہری پریشانیوں کی جھلک صاف نظر آرہی تھی۔ کامران بھی چپ چاپ کرشن راؤ کے برابر بیٹھ گیا۔
نرسنگا نے فوراً اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔ ''یہاں بیٹھ ٹھاکر! تیری جگہ میرے دائیں ہاتھ ہے۔''
کامران اٹھا اور نرسنگا کی خواہش کے مطابق اس کے نزدیک بیٹھ گیا۔
چند لمحوں تک سردار کی خواب گاہ پر ایک پراسرار سکوت طاری رہا پھر نرسنگا کی تیز آواز نے اس سکوت کا جگر چیر دیا۔ ''کرشن تو حیران ہو رہا ہوگا کہ میں نے اتنے دن بعد تجھے بلایا ہے۔''
''ہاں سردار! میں شدید حیرت میں مبتلا ہوں کہ کرشن راؤ کی آواز سے ہلکی ہلکی لرزش نمایاں تھی۔''
''یہ ملاقات اس لئے نہیں ہے کہ میں تجھ سے دوستی کی تجدید چاہتا ہوں۔'' نرسنگا کے لہجے میں بڑی رعونت تھی۔
''پھر۔'' کرشن راؤ نے اپنا بھرم قائم رکھنے کے لئے آواز میں سختی پیدا کرتے ہوئے کہا۔
''آج میں ٹھاکر شجاع الدین پر سے تمام پابندیاں ختم کر رہا ہوں۔'' نرسنگا نے اپنے فیصلے کا اعلان اس طرح کیا جیسے پرجا کے سامنے کسی راجہ کا فرمان پڑھ کر سنایا جا رہا ہو۔
''تو اپنے فیصلوں میں آزاد ہے سردار تجھے یہاں روکنے والا کون ہے؟'' کرشن راؤ نے اپنی روایتی منافقت سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''مگر تیرے اس فیصلے سے میرا کیا تعلق ہے؟''
''بہت گہرا تعلق ہے کرشن راؤ!'' آج نرسنگا نے اسے ٹھاکر کے لقب سے مخاطب کرنے کی رسم بھی بدل ڈالی تھی۔ میں جانتا ہوں کہ یہاں سے نکلنے کے بعد تو اس لڑکے کی زندگی حرام کر سکتا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ سلطان کے دربار میں تیرے اثر و رسوخ بہت زیادہ ہیں۔ یہ کہہ کر ایک لمحے کے لئے نرسنگا خاموش ہو گیا اور کرشن راؤ کو آتش بار نظروں سے دیکھنے لگا۔
پھر اس نے اپنا دایاں ہاتھ کسی شیر کے پنجے کی طرح بلند کیا۔ ''سلطان کے درباریوں سے تیرے کیسے بھی مراسم سہی لیکن اتنا یاد رکھنا کہ کرشن راؤ کہ اگر تو نے ٹھاکر کے خلاف کوئی سازش کی تو میں تجھے جینے نہیں دوں گا۔ تیرا بڑھاپا دہلی کے باسیوں کے لئے ایک تماشا بن کر رہ جائے گا۔''
کرشن راؤ اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتا تھا' مگر نرسنگا نے اسے زبان کھولنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ ''اور یہ بھی سن لے کہ اگر تو نے اس جنگل کا کوئی راز فاش کیا تو میں تجھے کتے کی طرح مار کر کسی شاہراہ پر ڈال دوں گا۔''
''احساس رسوائی سے کرشن راؤ کا پورا بدن پسینے میں ڈوب گیا تھا۔ پھر وہ لرزتے ہوئے قدموں اور مسخ چہرے کے ساتھ محافظوں کی نگرانی میں واپس چلا گیا۔
''میں نے تیرے راستے کا یہ نوکیلا پتھر ہٹا دیا ٹھاکر!'' کرشن راؤ کے جانے کے بعد نرسنگا نے کامران سے کہا۔
''میں تیرا شکر گزار ہوں سردار!'' کامران کی اداس آنکھوں میں کچھ عجیب سی پرچھائیاں لرز کر رہ گئیں۔
نرسنگا نے کوئی جواب دینے کے بجائے امرپالی کو آواز دی۔
امرپالی سردار کی خواب گاہ میں داخل ہوئی تو وہ اداسی کا مجسمہ نظر آرہی تھی۔
''ٹھاکر جا رہا ہے اسے رخصت کر دو۔'' انتہائی کوشش کے بعد بھی نرسنگا اپنے لہجے کی شکستگی کو چھپا نہیں سکا تھا۔
کامران نے امرپالی کی طرف دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں پیتل کی ایک تھالی تھی جس کے اندر لوبان جل رہا تھا۔
امرپالی کامران کے نزدیک آکر کھڑی ہو گئی۔
''ٹھاکر تو ایک مسلمان ہے شاید [illegible] مالی رونے لگی۔

کامران گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ "تم مجھے اپنے انداز میں رخصت کرو۔ دنیا کی ہر وہ رسم پیاری ہے جس سے محبت کی خوشبو آتی ہو۔ آج یہ دھواں برا نہیں لگ رہا ہے۔"

امر پالی نے کانپتے ہاتھوں سے پیتل کی تھالی کو سات چکر دے کر کامران کی آرتی اتاری پھر ایک انگلی پر تھوڑا سا سیندور لے کر کامران کے ماتھے پر لگا دیا۔

"واقعی میرا بیٹا ٹھاکر لگتا ہے......" امر پالی نے ہنسنے کی کوشش کی اور اس کے ساتھ ہی دو موٹے موٹے آنسو اس کے رخساروں سے بہہ کر گردن تک چلے گئے۔

"دیوتا تجھے دشمنوں کی بری نظر سے محفوظ رکھیں۔" امر پالی نے اس طرح دعائیں دیں کہ کامران کی آنکھیں بھی چھلک اٹھیں۔

"پھر سردار نرسنگا کامران کو لے کر اپنی پناہ گاہ سے باہر نکل آیا۔ اب اس کے قدم جنگل کے سرحدی علاقے کی طرف اٹھ رہے تھے۔ مسلح محافظوں کا دستہ ان دونوں کو درمیان میں لئے ہوئے اس طرح آگے بڑھ رہا تھا جیسے کسی حاکم کی سواری جا رہی ہو۔

"اب تو کہاں جائے گا ٹھاکر!؟" راستے میں نرسنگا نے کامران سے پوچھا۔

پہلے اس ماں کے پاس جاؤں گا جس کی آنکھیں میرے انتظار میں پتھرا گئی ہوں گی۔" کامران کا لہجہ بجھا بجھا تھا۔ "پھر سکون دل کی خاطر کسی درویش کی بارگاہ میں چلا جاؤں گا۔ سنا ہے کہ دولت بس فقیروں ہی کے آستانے سے ملتی ہے۔ سوچا تو یہ تھا کہ شاہی فوج میں شامل ہو کر ملک کی سرحدوں پر لڑتے لڑتے مارا جاؤں گا۔ مگر تقدیر پر کسی کا زور نہیں چلتا سردار! سپاہی کا بیٹا تھا چور بن کر رہ گیا۔" ماضی کو یاد کر کے کامران کے اندر تلخیوں کا الاؤ بھڑک اٹھا تھا۔

جب تک تیری ماں زندہ ہیں ٹھاکر ان ہی کے چرنوں کی دھول بن کر رہ جا......" نرسنگا نے بڑے حسرت زدہ لہجے میں کہا۔ "مجھے تو اپنی ماں کا چہرہ یاد نہیں کہ میرے بچپن ہی میں وہ دنیا سے چلی گئی تھی، مگر کہنے والے بھی کہتے ہیں کہ اس کے چرنوں کی دھول کا ایک ذرہ شانتی کے دھن کا ایسا بھنڈا (ذخیرہ) ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔"

"ہاں سردار! میں سنبھلنے کی پوری کوشش کروں گا۔" کامران نے بھی بے دلی سے کہا۔

اس دوران نرسنگا کامران کو مختلف نصیحتیں کرتا رہا۔ یہاں تک کہ جنگل کا راستہ تمام ہو گیا۔

نرسنگا کچھ دیر تک کامران کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے والہانہ انداز میں اپنے دونوں بازو پھیلا دیئے۔ کامران آگے بڑھا اور نرسنگا کے گلے لگ گیا۔ بڑا جذباتی منظر تھا۔ مسلح محافظ بھی اداس نظر آ رہے تھے۔

نرسنگا بہت دیر تک کامران کو سینے سے لگائے رہا۔ پھر اس نے رائے زادہ کے ماتھے کو بوسہ دیا۔

کامران بھی اپنی زندگی میں پہلی بار اس جذباتی مرحلے سے گزرا تھا۔ نتیجتاً اس کی آنکھیں بھی اشکبار ہو گئیں۔

"سردار مجھے سکون سے چلا جانے دے۔ میں پہلے ہی تیری محبتوں کا قرض دار ہوں۔ اب ایک مفلس کو اور کتنا زیر بار کرے گا۔"

"ٹھاکر! ہماری رفاقتوں کا یہ چند روزہ سفر ختم ہوا۔" یکایک نرسنگا کی آواز میں وہی بھیڑیوں جیسی غراہٹ لوٹ آئی تھی۔ "کسی نے کس کو کیا دیا شاید اس کے حساب کی ضرورت نہیں پھر بھی اگر تجھ پر کوئی آڑا وقت آ جائے تو ایک بار مجھے ضرور آواز دینا۔ تو اپنے کاندھوں کو ہلکا کر کے یہاں سے جا رہا ہے مگر میں اب بھی تیرا مقروض ہوں۔"

شجاع الدین کامران سردار نرسنگا کے اس مطالبے کو بھی ٹھکرا دینا چاہتا تھا، مگر وہ کوشش کے باوجود ایسا نہ کر سکا۔ نرسنگا کے عجیب و غریب کردار نے اس کے دل و دماغ پر گہرا اثر ڈالا تھا۔ آخر اس نے دبی زبان سے اقرار کر لیا۔

"اگر زندگی میں پھر کوئی مشکل مقام آیا اور میرے بزدل دشمنوں نے اپنی پست حرکتیں نہ چھوڑیں تو میں تجھے ضرور پکاروں گا کہ تجھے دیکھ کر مجھے کئی بھولی ہوئی کہانیاں یاد آ جاتی ہیں۔"

"زندہ باد ٹھاکر!" نرسنگا نے پرشور نعرہ بلند کیا۔ "آج ہمارے اعتبار کی داستان مکمل ہوگئی۔ اب میں سکون سے اپنی زندگی کے باقی دن گزار سکوں گا۔"

اس کے بعد تمام مسلح محافظوں نے اپنی تلواروں کا رخ زمین کی طرف کر دیا اور اپنے سر ادب سے جھکا دیئے۔ یہ جنگلی لٹیروں کی ایک مخصوص رسم تھی۔ وہ اپنے کسی معزز شخص کو رخصت کرتے ہوئے اسی قسم کا مظاہرہ کرتے تھے۔

"میرے آدمی وقفے وقفے سے خبر گیری کے لئے تیرے پاس آتے رہیں گے۔" نرسنگا نے اپنی محبت کا آخری مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں سردار! یہ بڑا خوفناک عمل ہوگا۔" کامران گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے دشمنوں کو تیرے گھر کا پتہ مل جائے۔ اگر کبھی ایسی کوئی ضرورت پیش آئی تو میں خود تیرے پاس چلا آؤں گا۔"

"جیسی تیری مرضی ٹھاکر! میں تجھے ہر حال میں خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔" نرسنگا نے کسی پس و پیش کے بغیر کامران کی بات مان لی۔ "مگر ٹھاکر! تجھے تیرے پیاروں کی قسم! مجھ سے کوئی بات چھپانے کی کوشش نہ کرنا۔"

کامران نے ایک بار پھر اقرار میں اپنے سر کو جنبش دی اور تھکے قدموں سے شہر کی طرف بڑھنے لگا۔

نرسنگا اس وقت تک اپنی سرحد پر خاموش کھڑا رہا جب تک کامران اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوگیا۔

❋❋❋

بڑے مندر تک نرسنگا کے دو محافظ کامران کے ساتھ ساتھ رہے۔ مندر پہنچ کر کامران کو بے اختیار شکنتلا یاد آ گئی۔ وہ آخری بار دیوداسی سے ملنا چاہتا تھا' مگر کرشن راؤ اور پجاری رام سروپ کے خوف سے کامران نے اپنی شدید خواہش کو کچل ڈالا۔ اس کا یہ اقدام کرشن راؤ کو شکنتلا کی طرف سے بدگمان کر سکتا تھا۔ پھر وہ خود تو چلا جاتا مگر دیوداسی پجاریوں کے تشدد کا مستقل نشانہ بن جاتی۔ اسی خوف نے کامران کو اپنے ارادوں سے باز رکھا۔ جب وہ مندر پہنچا تو کرشن راؤ پجاری رام سروپ کے کمرے میں موجود تھا۔ بوڑھے راجپوت نے بڑے ریاکارانہ انداز میں کامران کو خوش آمدید کہا مگر وہ ہر شے سے بے نیاز ہو چکا تھا۔

"ٹھاکر! یہ آؤ بھگت رہنے دے۔ آج میں تیری دنیا سے بہت دور جا رہا ہوں۔ میں نے یہاں آ کر جو کچھ دیکھا اسے بیان کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ پھر بھی میرا تجھے آخری مشورہ ہے کہ ان مظلوم قیدیوں کو آزاد کر دے ان کی نارسا آہیں ایک نہ ایک دن آسمان تک ضرور پہنچیں گی۔"

کرشن راؤ اس سے مزید کچھ منافقانہ باتیں کرنا چاہتا تھا' مگر کامران نے کان بند کر لئے اور پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر اپنے راستے پر چلا گیا۔

پھر جب وہ شہری حدود میں داخل ہوا تو ہر طرف گہری تاریکی پھیل چکی تھی۔ آج کامران کے احساسات کچھ عجیب سے تھے۔ وہ خوش بھی تھا اور اداس بھی۔ خوشی اس بات کی تھی کہ بدترین قید سے چھوٹا تھا۔ اس طویل عرصے میں بڑے بڑے آزمائشی مرحلے آئے تھے' مگر وہ انسانی خون کے دریا سے اپنے لباس کو آلودہ کئے بغیر گزر آیا تھا۔ کامران کی خوشی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس نے انتہائی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے قائم خان سے اس کے گناہوں کا اقرار کرا لیا تھا۔ یہ کامران کی بڑی کامیابی تھی اور اسی کامیابی کے سہارے وہ دوبارہ اپنے گھر تک پہنچا تھا۔

کی گود میں اپنا سر رکھ دیا۔ سعدیہ خانم کچھ دیر تک تو سکتے کی حالت کا شکار رہی' مگر جب اسے بیٹے کی موجودگی کا یقین آ گیا تو جذبات کی گھٹائیں اس قدر ٹوٹ کر برسیں کہ کامران کا چہرہ ایک غمزدہ ماں کے آنسوؤں میں ڈوب گیا۔

"کیا تو پھر مجھے چھوڑ کر جانے کے لئے آیا ہے؟" سعدیہ خانم نے اس لہجے میں بیٹے سے شکایت کی کہ کامران لرز کر رہ گیا۔

"نہیں مام! اب میں آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔" کامران نے اپنے آنسوؤں سے ماں کی آتش فراق کو بجھانے کی کوشش کی۔ "میں تو اپنے بزرگوں کی روح کو ندامت کے عذاب سے بچانے گیا تھا۔ اب ساری دنیا اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گی کہ رائے نعیم الدین ذیشان کا وارث مجرم نہیں تھا۔ اس نے قائم خان اور قاضی عماد الدین کے گناہوں کی سزا کاٹی ہے۔"

پھر جب سعدیہ خانم نے اس دستاویز کے چوری ہو جانے' قاضی عماد کے قتل اور سلطان ناصر الدین محمود کے نئے احکام کا ذکر کیا تو کامران سناٹے میں آ گیا۔ سعدیہ خانم نے قصداً اپنے بھائی کے ظالمانہ تشدد کی تفصیلات بیان نہیں کیں کہ اس طرح کامران مشتعل ہو جاتا۔

"اب کیا ہو گا مادر گرامی؟" کامران کی زبان لڑکھڑانے لگی تھی۔

"تجھے سلطان نے دربار میں طلب کیا ہے۔ وہ تیرے ساتھ ہونے والی تمام زیادتیوں کا ازالہ کر دیں گے۔" سعدیہ خانم نے ایک لمحے میں کئی دلکش خواب دیکھ ڈالے تھے۔ "کل صبح میں خود تجھے لے کر سلطان کے پاس جاؤں گی کہ یہ ان کا حکم ہے۔"

کامران گہری سوچ میں ڈوب گیا' مگر خیالات کا یہ سلسلہ اس وقت ٹوٹ گیا جب اچانک سعدیہ خانم کے دروازے پر دستک سنائی دی۔ یہ امیر طغرل کے سپاہی تھے جو کئی ماہ سے سعدیہ خانم کے کھنڈر کے گرد پہرہ دے رہے تھے۔ آج خلاف معمول ایک شخص کو یہاں آتے دیکھا تو وہ مکان کے دروازے پر پہنچ کر کامران کا نام لے کر اسے پکارنے لگے۔

کامران تیزی سے باہر آیا۔

"کیا تیرا نام شجاع الدین کامران ہے؟" ایک سپاہی نے تحقیر آمیز لہجے میں پوچھا۔

"ہاں میں ہی شجاع الدین ہوں۔" کامران شدید حیرت کے عالم میں سپاہیوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"حکومت کو بہت دن سے تیری تلاش تھی۔" دوسرے سپاہی نے چیخ کر کہا اور کامران کے دونوں بازو پکڑ لئے۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور سپاہی آگے بڑھا اور کامران کو زنجیریں پہنانے لگا۔

پرشور گفتگو سن کر سعدیہ خانم بھی دروازے تک آ گئی تھی۔ اس نے کواڑوں کی اوٹ سے یہ تکلیف دہ منظر دیکھا تو گھبرا کر باہر نکل آئی۔ "آخر میرے بیٹے نے کیا جرم کیا ہے؟" سعدیہ خانم دل کے زور سے چیخی۔

"آواز نیچی رکھ۔" ایک سپاہی نے اسے جھڑکتے ہوئے کہا۔ "اپنے بیٹے کا جرم عدالت سے دریافت کرنا ہمارے لئے یہی حکم تھا کہ ہم اسے زنجیریں پہنا کر زندان میں ڈال دیں۔"

"اور سلطان کے حکم کا کیا ہو گا؟" بے کسی کی اذیت حد سے بڑھی تو سعدیہ خانم رونے لگی۔

سپاہی بہرے ہو گئے تھے وہ کامران کو کھینچتے ہوئے لے گئے اور رات کے سناٹے میں سعدیہ خانم کی چیخیں گونجتی رہ گئیں۔

شجاع الدین کامران کی گرفتاری کسی حادثے کا نتیجہ نہیں' قائم خان نے امیر طغرل کی مدد سے ایک جامع منصوبہ بنایا تھا۔ بالآخر چھ سات ماہ کے طویل انتظار کے بعد شجاع الدین کامران بہت آسانی کے ساتھ زیر دام آ گیا' اسے بے دردی کے عالم میں صیاد نے اس وقت پکڑ لیا جب وہ اپنے تھکے ہوئے بازوؤں کو سمیٹ کر کچھ گھڑیوں کیلئے آرام کرنا چاہتا تھا۔

قائم خان نے جس وقت امیر طغرل کے سامنے اپنے مسائل بیان کئے تھے' اسی روز سے غیاث الدین بلبن کا یہ غلام شجاع الدین کامران کے درپے آزار ہو گیا تھا۔ ایک طرف امیر طغرل کے سپاہی قائم خان کی حویلی کے گرد پہرہ دے رہے تھے تاکہ اجنبی حملہ آوروں کی اچانک یورش سے محفوظ رہا جا سکے...... اور دوسری طرف کامران کی تلاش بھی جاری تھی۔ قائم خان اور امیر طغرل دونوں حیران تھے کہ بے سہارا نوجوان یکا یک کہاں روپوش ہو گیا؟ حکومت کے چاق و چوبند مخبروں نے دہلی کا ایسا کوئی گوشہ نہیں چھوڑا تھا جہاں ان کے قدم نہ پہنچے ہوں...... مگر کامیابی ان سے کوسوں دور تھی۔ کامران اس طرح غائب ہو گیا تھا جیسے زمین اسے کھا گئی ہو' پھر ایک دن تھک ہار کر قائم خان اور امیر طغرل نے فیصلہ کیا کہ سعدیہ خان کے مکان کی مستقل نگرانی کی جائے' اس طرح آنے والے ہر شخص پر کڑی نظر رکھی جائے۔

قائم خان کیلئے وہ وقت بڑا پریشان کن ثابت ہوا تھا۔ جب کئی ماہ تک کوئی ایک متنفس بھی سعدیہ خانم سے ملنے نہیں آیا۔ امیر! اب مجھے یقین ہو چلا ہے کہ وہ ناہنجار لوٹ کر نہیں آئے گا۔'' ایک روز قائم خان نے بڑے تھکے ہوئے لہجے میں امیر کے روبرو اپنی مایوسی کا اظہار کیا تھا۔

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا قائم خان!'' امیر طغرل نے اس کیف و نشاط کے دوران بے نیازانہ کہا......
''ہمارے آدمیوں کا قحط نہیں ہے' اگر پہرے داروں کی ایک تعداد مسلسل انتظار سے اکتا جائے گی تو ہم تازہ دم مخبروں کو بھی متعین کر دیں گے۔ وہ بدنصیب کبھی تو لوٹ کر آئے گا۔ امیر طغرل کے لہجے میں بڑی رعونت تھی...... ''اور اگر نہیں آیا تو پھر اس پر یہ گلیاں ہمیشہ کیلئے حرام ہو جائیں گی۔ تجھے تیرا مقصد حاصل ہو جائے گا۔''

''نہیں امیر! یہ بات نہیں۔'' قائم خان نے سرگوشی میں کہا۔ ''میں اذیت و کرب کی جس منزل سے گزر رہا ہوں تمہیں اندازہ نہیں' میں اس مستقل عذاب سے فوری رہائی چاہتا ہوں۔ کامران کی مسلسل روپوشی کسی اور ہی خطرے کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔''

''کیسا خطرہ؟'' امیر طغرل نے ایک اور لبریز جام ہونٹوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

''مجرم پیشہ افراد کا یہ بھی ایک طریقہ ہے کہ وہ کچھ دن کیلئے حالات کو پرسکون بنا دیتے ہیں' پھر اپنے شکار کو کبوتر سمجھ کر عقاب کی طرح جھپٹ پڑتے ہیں۔''

اس کی آنکھوں میں ہلکے ہلکے خوف کا عکس نمایاں تھا...... ''اور وہ ہماری گھات میں ہے اور کسی مناسب موقع کا انتظار کر رہا ہے۔''

قائم خان تجھے مراق ہو گیا ہے۔'' امیر طغرل نے استہزائیہ لہجے میں کہا...... ''لگتا ہے کہ شاید تیرے جسم پر بھی شجاع الدین کامران نے قبضہ کر لیا ہے۔''

امیر! تم میری مجبوریوں کو نہیں سمجھو گے۔'' قائم خان کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا اور اس کی آواز لرزنے لگی تھی۔ ''بیٹی کا معاملہ ہے' ایک غیرت مند اور اعلیٰ خاندان کا مسئلہ ہے۔''

انتہائی سرمستی کے باوجود امیر طغرل سنجیدہ نظر آنے لگے۔'' قائم خان! کیسی دل آزار باتیں کر رہا ہے؟ تیرا غم میرا غم ہے' وہ آوارہ و ناکارہ لڑکا یاسمین خانم کی جھلک بھی نہیں دیکھ سکے گا۔'' طغرل نے اپنے دوست کو تسلی دیتے ہوئے کہا...... مگر اس کے ساتھ ہی اس اوباش امیر کے خیالوں میں خوبصورت لڑکی کا فرضی پیکر ابھرنے لگا۔ طغرل کے سامنے یاسمین خان کا ذکر اتنی بار ہوا تھا کہ وہ نادیدہ لڑکی اس کے ذہن میں نقش ہو کر رہ گئی تھی۔ آج پہلی بار امیر طغرل میں یہ ناپاک سی خواہش پوری شدت کے ساتھ ابھری تھی۔ اپنے دوست کی اس لڑکی کے نقش و نگار کا جائزہ لے کہ اس نے ایک نوجوان کو ہلاکت کے کوچے تک پہنچا دیا ہے۔

خانم کے تصور نے امیر طغرل کو ایک نئے سرور سے آشنا کر دیا' پھر وہ اس کیف کو دو آتشہ بنانے کیلئے نے بنا سے کھیلنے لگا۔

جب امیر طغرل جی بھر کے شراب پی چکا تو اس نے مخمور نظروں سے قائم خان کی طرف دیکھا...... ''تیرے سارے اندیشے بے بنیاد ہیں' اگر کامران زندہ ہے تو میرے جاسوس اسے تحت الثریٰ سے بھی نکال لائیں گے...... اور اگر وہ مر چکا ہے تو یہ ہرگز نہ سمجھ لینا کہ میرے آدمی اسے معاف کر دیں گے' میرے جاں نثار تو وہ ہیں جو کامران کی قبر کھود ڈالیں گے اور اس کی منتشر ہڈیاں لاکر میرے سامنے ڈھیر کر دیں گے۔ بس کچھ ہی دنوں کی بات ہے' عنقریب تو اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشخبری سن لے گا' پھر تجھے اندازہ ہوگا کہ امیر طغرل کس طرح یاریاں نبھاتا ہے؟''

''امیر! میں خوب جانتا ہوں کہ تو کس رعب و دبدبے کا انسان ہے اور تیرے قول و قسم کا کیا معیار ہے؟'' قائم خان نے خوشامد کا تیز ترین ہتھیار استعمال کرتے ہوئے کہا۔

''جب تجھے ہماری طاقت پر یقین ہے تو پھر تیرے دل پر وسوسوں اور اندیشوں کی بارش کیوں ہو رہی ہے؟'' امیر طغرل نے موج شراب کی طرح لہراتے ہوئے کہا اور اپنے ہاتھ سے ایک ساغر لبریز کر کے قائم خان کی طرف بڑھا دیا...... ''اسے پی لے اور ان لومڑیوں کے خوف سے نجات حاصل کرے جو ایک شیر کی موجودگی میں تیری حویلی کو دور سے سجدہ کر کے واپس چلی جائیں گی۔''

قائم خان نے حیلہ بازی سے امیر طغرل کے غصے کو بڑھکا دیا تھا' مگر وہ پھر بھی اپنے آپ کو مظلوم ثابت کرنے کیلئے صورت سے بہت زیادہ اداس نظر آ رہا تھا۔

''اگر موجودہ انتظامات بھی ناکافی ہیں تو میں کوئی دوسری ترکیب استعمال کروں گا۔'' امیر طغرل نے قائم خان کو تسلیاں دیتے ہوئے کہا...... ''میرے ہاتھ دراز ہیں' اگر تیرا بھانجا مملکت ہند کی حدود سے باہر نکل جائے تو شاید مجھے اپنی کوتاہ دستی کا احساس ہونے لگے ورنہ شجاع الدین کامران کو میری گرفت سے کوئی نہیں بچا سکتا۔''

''امیر! میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ ایسے آڑے وقت میں......'' قائم خان نے دنیاداری کا مظاہرہ کرنے کیلئے اپنے ہونٹوں کو نئے انداز سے جنبش دی' مگر امیر طغرل درمیان میں ہی بول اٹھا۔

''قائم خان! تکلفات سے پرہیز کر کہ اس قسم کے مظاہرے دوستی کے مقدس رشتے کو تباہ کر دیتے ہیں۔'' امیر طغرل کا لہجہ کیف و سرور میں ڈوبا ہوا تھا۔

''بے شک امیر! آپ نے سچ کہا۔'' قائم خان کی منافقت آج اپنے عروج پر تھی...... ''اب میں ایک لمحے کیلئے بھی اس معاملے کے بارے میں نہیں سوچوں گا۔ میرا امیر زندہ ہے تو میں کیوں سوچ سوچ کر مروں۔''

''زندہ باد قائم خان!'' امیر طغرل نے سرمستی کے عالم میں اس طرح تالیاں بجاتے ہوئے کہا جیسے کوئی حکمران خدمت گاروں کو طلب کرنے کیلئے اپنے ہاتھوں کو جنبش دیتا ہے...... ''آج تو نے غیریت کا پردہ چاک کر دیا' دوستی......''

ابھی امیر طغرل کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ اس کے دو سپاہی قائم خان کے عشرت کدے میں داخل ہوئے اور غلامانہ انداز میں سر جھکاتے ہوئے بولے۔

''امیر کا اقبال بلند ہو کہ شجاع الدین کامران اپنے انجام کو پہنچ گیا۔''

یہ چند الفاظ اتنے غیر متوقع تھے کہ امیر طغرل اور قائم خان بیک وقت دو مختلف کیفیتوں سے دوچار ہو گئے۔ کامران کی گرفتاری کی خبر سن کر امیر طغرل چیخنے لگا۔

''یہ سب وزیر اعظم الغ خان (غیاث الدین بلبن) کی غلامی کا صدقہ ہے کہ میں جدھر جاتا ہوں فتوحات میرے قدموں سے لپٹ کر چلتی ہیں۔'' امیر طغرل کا چہرہ جوش جذبات سے سرخ ہو گیا...... ''قائم خان! تو دیکھ رہا ہے کہ ہم جس کام کا ارادہ کرتے ہیں وہ ہماری مرضی کے مطابق انجام پا جاتا ہے' ہم نے تجھ سے کہا تھا نا کہ بس چند دنوں کی بات ہے مگر ابھی تو چند لمحے بھی نہیں گزرے تھے کہ تیرے یتیم بھانجے کے سر عافیت کے تمام سائے اٹھ گئے' اب اگر تو کہے تو اس کا قصہ ہمیشہ کیلئے پاک کر دیا جائے گا۔''

قائم خان سکتے کی حالت میں بیٹھا تھا۔ وہ امیر طغرل کی زبان سے ادا ہونے والے ایک ایک لفظ کو بغور سن رہا تھا' مگر اس تصور میں شجاع الدین کامران کے مختلف عکس لرزاں تھے۔ قائم خان کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ سینکڑوں سادھوؤں کی پشت پناہی کے بعد بھی شجاع الدین کامران کو اتنی آسانی کے ساتھ گرفتار کیا جا سکتا ہے۔

''یہ کوئی خواب نہیں ہے قائم خان!'' امیر طغرل نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا...... ''غور سے دیکھ کہ یہ تیرے خوابوں کی تعبیر ہے۔''

''میں نیند کی حالت میں نہیں ہوں۔'' قائم خان نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا...... میں تو امیر کی اقبال مندیوں کا عروج دیکھ کر سہم گیا ہوں۔'' قائم خان نے پھر وہی سیاست کی زبان اختیار کر لی تھی۔

''تجھے ہمارے عروج کا اندازہ اس وقت ہوگا جب ہماری ایک جنبش لب پر تیرے بھانجے کا سر تن سے جدا کر دیا جائے گا۔''

اچانک ایسا محسوس ہونے لگا جیسے امیر طغرل کے جسم میں کسی جابر و متکبر کی روح حلول کر گئی ہے...... ''اقتدار اسے کہتے ہیں کہ ہمی عدالت ہیں اور ہمی منصف' جب چاہا کسی کی زندگی چھین لی اور جب چاہا اسے بھیک کی سانسیں بخش دیں۔''

''نہیں امیر! میں اس نادان لڑکے کی موت نہیں چاہتا۔'' قائم خان راجپوت نے گھبرا کر کہا...... ''آخر وہ میرا خون ہے...... اور میں اس خون کو اپنے ہاتھوں سے بہانا نہیں چاہتا' اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ میری عزت و آبرو کے درپے ہے' مگر میں اپنی سطح سے نیچے [illegible] کرشیش محل

سنگ باری نہ کر سکے۔

''تو اس لڑکے سے بھی زیادہ نادان ہے قائم خان!'' امیر طغرل نے ایک اور قہقہہ لگایا...... ''تجھے سیاست کے آداب نہیں آتے...... اور آئین بھی کس طرح کہ تو نے کبھی اقتدار نہیں دیکھا۔'' امیر طغرل نے براہ راست قائم خان پر ضرب لگائی۔

قائم خان نے گھبرا کر سر جھکا لیا' وہ امیر طغرل سے آنکھیں چار نہیں کر سکتا تھا۔

''اگر تو حکمرانوں کے طبقے سے ہوتا تو سیاست کے پہلے اصول کو سمجھ لیتا کہ اگر مخالف کے ماتھے پر ایک بار شکن پڑ جائے تو اس لکیر کو کسی پس و پیش کے بغیر کھرچ دینا چاہیے۔'' امیر طغرل قائم خان کو سیاست کا قانون سمجھا رہا تھا...... ''دنیا میں اس سے زیادہ احمقانہ فعل کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا کہ دشمن کی پیشانی کی لکیریں دماغ سے اتر کر اس کے دل کو بھی زہر آلود کر دیں' پھر نفرتوں اور سازشوں کے حقیر سے بیج میں کونپلیں پھوٹ آئیں اور یہی بے ضرر کونپلیں بڑھتے بڑھتے ایک تناور درخت بن جائیں' تو نے بھی یہ حماقت کی ہے قائم خان' میرا مشورہ یہی ہے کہ اس درخت کو نہ صرف کاٹ دے بلکہ اس کی جڑیں بھی اکھاڑ کر پھینک دے' اگر زمین میں ایک ریشہ بھی باقی رہ گیا تو پھر کسی سوراخ سے کوئی شاخ نکل آئے گی۔''

قائم خان بھی اپنے بھانجے کو مردہ حالت میں دیکھنا چاہتا تھا' مگر ایک نامعلوم سا خوف مسلسل اسے پریشان رکھتا تھا۔ قائم خان کو ان سادھو قزاقوں کے تصور سے وحشت ہوتی تھی جو ایک رات اس کی حویلی میں داخل ہوئے تھے۔ قائم خان کو یہ اندیشہ لاحق تھا کہ اگر اس نے شجاع الدین کامران کو قتل کرا دیا تو پھر اس کی زندگی بھی غیر محفوظ ہو سکتی تھی۔ بس یہی خوف اسے بار بار منافقانہ ہمدردی کے مظاہرے پر اکساتا تھا۔

''نہیں امیر! اس درخت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی ضرورت نہیں۔'' قائم خان نے درخواست گزاری کے انداز میں کہا...... ''جب اس درخت کو زنداں کے اندھیروں میں روشنی اور ہوا میسر نہیں آئے گی تو ایک دن یہ خود بخود سوکھ جائے گا۔ اس طرح ہمارے ہاتھ بھی صاف رہیں گے اور سیاست کے تقاضے بھی پورے ہو جائیں گے۔''

''جس طرح تیری مرضی قائم خان! ہم تو ہر حال میں تیرے دوست ہیں۔'' امیر طغرل نے ایک جام لبریز کرتے ہوئے کہا۔ اسے شراب کے پیالے میں ایک خوبصورت لڑکی کا عکس نظر آ رہا تھا۔ دفعتاً غیاث الدین بلبن کے غلام نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور وہ تصور میں یاسمین خانم کا پیکر تراشنے لگا۔

وہ رات بھی یاسمین خانم اور اس کی ماں کیلئے ایک یادگار رات تھی۔

آخر خدا نے ہماری سن لی اور وہ ناہنجار اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ یاسمین خانم کی ماں اپنی بیٹی سے بڑے اثر انگیز لہجے میں کہہ رہی تھی ''اگر وہ ناہنجار پکڑا نہ جاتا تو......''

یاسمین خان نے اپنی ماں کی بات کاٹ دی...... ''اس سے کیا فرق پڑتا ہے مادر گرامی؟'' یاسمین کا لہجہ بہت تند و تیز تھا...... وہ مجھ پر کبھی قادر نہیں ہو سکتا۔''

یاسمین بیٹی! بدنامیوں کے بڑے عجیب عجیب افسانے جنم لے سکتے تھے۔'' ماں نے بیٹی کے غصے کو سرد کرنے کیلئے کہا۔

''کیسے افسانے؟ یاسمین خانم بھڑک اٹھی...... اگر وہ اس حویلی سے نکل کر اپنی زبان پر ایک بار بھی میرا نام لے آتا تو اس کے ہونٹ جل کر رہ جاتے' کون اس مفلس و ناکارہ کی بات پر اعتبار کرتا؟''

خانم کی ماں بیٹی کے دل میں بھڑکتی ہوئی اس آگ کو بجھانے کی کوشش کر رہی تھی جس کے شعلوں نے یاسمین خانم کے چہرے کو گلنار بنا دیا تھا۔

مجھے آپ سے بھی شکایت ہے اور بابا سے بھی۔'' اس کے لہجے کی سرکشی کچھ اور نمایاں ہو گئی تھی۔

ہوشیار اور زمانہ ساز ماں حیرت سے بیٹی کا منہ دیکھنے لگی۔

''آپ نے اور بابا جان نے مجھے اتنے سستے داموں میں خرید کرنے کا فیصلہ آخر کیوں کیا تھا؟'' اندر کی آگ سے یاسمین خانم کے لب جلنے لگے...... ''میں اس راز کو سمجھنے سے قاصر ہوں کہ کامران کے ساتھ میرا رشتہ کیوں طے کیا گیا۔'' نفرتوں بھرے لہجے میں یاسمین نے ماں سے سوال کیا۔

بیٹی اس وقت رائے نعیم الدین ذیشان کے حالات اچھے تھے اور وہ حکومت کا معتوب بھی نہیں تھا۔'' یاسمین خانم نے ڈرتے ڈرتے اپنی صفائی پیش کی۔

''اگر اس کے باپ کو سلطان کا معتوب نہ سمجھا جائے تو کیا پھر بھی وہ اس قابل تھا کہ میرے برابر کھڑا ہو سکے؟'' یاسمین کا غصہ جنگل کی آگ کی طرح بھڑکتا ہی جا رہا تھا...... اس کے اور میرے خاندان میں ایسی کون سی قدر مشترک ہے جس نے دونوں گھرانوں کے بیچ نیا رشتہ جوڑنے کی کوشش کی' مجھے سمجھائیں مادر گرامی! مجھے سمجھائیں۔''

''بیٹی!'' ماں کی زبان لڑکھڑانے لگی...... ''تیرے دادا نے اپنی لڑکی سعدیہ خانم کو اس خاندان میں بیاہ دیا بس یہی مروت تیرے رشتے کے وقت بھی آڑے آئی تھی۔''

دادا کا نام سن کر یاسمین کے ماتھے پر کئی بل پڑ گئے...... میں اپنے اس بزرگ کو کیا کہوں کہ وہ دنیا سے جا چکا۔ اگر وہ یہاں ہوتے تو ان کے پاس بھی میرے اس سوال کا کوئی جواب نہ ہوتا کہ ایک معزز درباری امیر کی بیٹی کو ایک سپاہی کے ستم کدے میں کیوں جھونکا جا رہا تھا۔ کامران کا باپ چند تنکوں (سکوں) کے عوض اپنی تلوار کا ہنر بیچنے والا ایک بے توقیر سپاہی تھا...... اور میرا باپ دربار سلطانی کا ایک محترم سردار ہے جس کے آگے رائے نعیم الدین جیسے سینکڑوں سپاہیوں کے سر جھکے رہتے ہیں۔''

یاسمین خانم آج اسی لہجے میں بات کر رہی تھی جس کی تربیت اسے بچپن میں دی گئی تھی۔ کامران کے یتیم ہونے اور اس رشتے کو توڑنے کے بعد یاسمین کی ماں اور باپ دونوں نے بیٹی کو یہی بتایا تھا کہ اس کے دادا کی ضد کے سبب یہ رشتہ طے ہوا تھا ورنہ خاندانی اعتبار سے وہ اس کی ہم سری کا دعویٰ نہیں کر سکتا تھا۔ آج احساس برتری کا وہی زہر قطرہ قطرہ بن کر یاسمین خان کے ہونٹوں سے ٹپک رہا تھا۔

ابھی ماں اور بیٹی کے درمیان یہ گفتگو جاری تھی کہ قائم خان امیر طغرل کو رخصت کر کے زنان خانے میں داخل ہوا' اس وقت وہ بہت زیادہ خوش نظر آ رہا تھا' مگر بیٹی کو حالت غم میں دیکھ کر چونک اٹھا۔

''یاسمین! تم نے یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟'' قائم خان بے قرار ہو کر آگے بڑھا' مگر یکایک اسے یاسمین سے چند قدم کے فاصلے پر رک جانا پڑا۔ قائم خان کے منہ سے شراب کی بو آ رہی تھی اور اسی وجہ سے وہ بیٹی کے قریب نہ جا سکا۔

یاسمین خانم نے اسی غضب ناک لہجے میں وہی سوالات دوبارہ اٹھائے جن کا جواب وہ کچھ دیر پہلے ماں سے طلب کر رہی تھی۔

''ہاں بیٹی! تیرا باپ تیرے دادا کے سامنے مجبور تھا' مگر اب اس کے راستے میں کوئی دیوار نہیں۔'' قائم خان نے بھی اپنی بیوی کے لہجے میں عذر تراشا لیکن

یہ کفارہ اس طرح ادا کیا ہے کہ اس نامراد پر آرام و آسائش کی زندگی کا دروازہ بند کردیا ہے' بس ایک سانسوں کا دروازہ کھلا ہے وہ بھی کسی دن بند ہوجائے گا۔"

"بابا جان! زندان کے اندھیرے میرے دکھوں کی تلافی نہیں کرسکتے۔" شدت غضب میں یاسمین خانم رونے لگی...... "آپ نہیں جانتے کہ میرے دل میں کتنے زخم ہیں اور ان میں کیسی سوزش ہو رہی ہے۔ کامران کو پابند سلاسل کرنے سے مجھے قرار نہیں آئے گا۔ میں ان آنکھوں کو بجھا دینا چاہتی ہوں جو برسوں مجھے ایک شرمناک زاویے سے دیکھتی رہیں' اس دماغ میں آہنی میخیں ٹھونک دی جائیں جہاں میری ذات کے حوالے سے حیا سوز مناظر محفوظ ہیں...... اور اس زبان کو گل کر جانا چاہئے جس نے میرے لئے نازیبا کلمات ادا کئے' اگر کامران کی قسمت کا فیصلہ اس طرح ہو تو میں مطمئن ہوجاؤں گی کہ وقت کی عدالت سچی تھی...... اور اس نے میرے ساتھ انصاف کردیا۔" یاسمین خانم کی ہیجانی کیفیت انتہا کو پہنچ چکی تھی۔

قائم خان چند لمحوں کیلئے پریشان سا ہوگیا' مگر پھر فوراً ہی اس کے ہونٹوں پر ایک آسودہ سی مسکراہٹ ابھر آئی۔

"بیٹی! مجھے تیرے غموں کا خوب اندازہ ہے' مگر اس کے ساتھ ہی آج میں بہت خوش ہوں کہ تو نے قائم خان کی تربیت کا حق ادا کردیا' میرے خون کو اتنا ہی گرم ہونا چاہئے تھا' غیرت مند بیٹیاں ایسی ہی ہوتی ہیں' آج مجھے اپنے خون پر اعتبار آگیا' وہ بدنصیب لڑکا میری دسترس سے دور نہیں' میں تیری زبان سے نکلے ہوئے ایک ایک لفظ کو بھرپور مفہوم دے سکتا ہوں مگر ہوشمندی کے تقاضے کچھ اور ہیں ورنہ تو چشم زدن میں کامران کی ہلاکت چاہتی ہے' مگر میں تیری بے آبروئی کا انتقام کسی اور انداز سے لوں گا' وہ لمحہ لمحہ مرے گا' یہ بڑی دردناک موت ہوگی بنت قائم خان! اگر تو اسے سمجھنے کی کوشش کرے۔" یہ کہہ کر وہ اپنی خواب گاہ میں چلا گیا۔

❊❊❊

وہ رات سعدیہ خانم پر بہت بھاری تھی' گردش وقت کی بے رحم موجوں نے ایک بار پھر اس کے ساتھ بڑا اذیت ناک مذاق کیا تھا...... ساحل پہ لائے اور سفینے ڈبو دیئے...... وہ مجبور و بے کس عورت بہت دیر تک اپنی تاریک گلی میں آسمان کی طرف منہ کئے خاموش کھڑی رہی' اس کے ہونٹ پتھرا گئے تھے' مگر آنکھیں اشک برسا رہی تھیں۔

"اے خدا! اے خدا!" سعدیہ خانم کے لبوں سے ایک سرد آہ نکلی اور پھر وہ رات کے اندھیرے میں قاضی عماد کے مکان کی طرف بڑھنے لگی۔

یہ ڈیڑھ کوس کا فاصلہ سعدیہ خانم نے اس طرح طے کیا تھا جیسے وہ صدیوں سے سفر کر رہی ہو۔

پھر جب اس نے قاضی عماد کے مکان پر دستک دی تو اسے زیادہ دیر تک دروازہ کھلنے کا انتظار نہ کرنا پڑا۔ اس کی طرح ایک اور بیوہ بھی آخر شب میں جاگ رہی تھی۔

قاضی عماد کی بیوہ نے سعدیہ خانم کو اس والہانہ انداز میں گلے لگایا کہ چند لمحوں کیلئے بے لوث محبت کی دلیل روشن ہوکر مجسم ہوگئی۔

پھر جب سعدیہ خانم کے ہونٹ کانپے تو قاضی عماد کی بیوہ کا پورا جسم پتھر کا ہوگیا۔

"تم نے کہا تھا کہ سلطان کی عنایات خسروانہ سے میرے بیٹے کے ایک ایک غم کا ازالہ ہوجائے گا۔" ضبط کرتے کرتے سعدیہ خانم کے دل کا خون ہونٹوں سے ٹپکنے لگا تھا...... "یہ کیسی تلافی ہے اور کیسا انصاف ہے؟"

سعدیہ خانم کی نظریں ایک غمگسار عورت کے چہرے پر مرکوز تھیں...... اور قاضی عماد کی بیوہ کا چہرہ شدت غم سے سفید پڑ گیا تھا۔

''مجھے بتاؤ کہ تم نے مجھے جھوٹی تسلیاں دی تھیں یا سلطان نے مجھ بے سہارا عورت کا مذاق اڑایا تھا۔'' سعدیہ خانم کی آواز میں اس قدر تلخیاں گھل گئی تھیں کہ قاضی عماد کی بیوہ کو چونک جانا پڑا...... ''مجھے بتاؤ کہ تم جھوٹی ہو یا تمہارا سلطان جھوٹا ہے؟''

''میری غمزدہ بہن!'' قاضی عماد کی بیوہ کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی...... ''مجھ گنہگار عورت کے قول کی کوئی حیثیت نہیں' مگر میرا سلطان سچ بولتا ہے۔'' قاضی عماد کی بیوہ نے سلطان ناصرالدین محمود کی وکالت کی۔

''پھر میرے بیٹے کو دوبارہ زنجیریں کیوں پہنادی گئیں؟'' سعدیہ خانم کے آنسو بہنے لگے۔

''صبح ہونے دو ان زنجیروں کی عمر زیادہ طویل نہیں' میں خود دربار میں حاضر ہو کر سلطان کے انصاف کو پکاروں گی۔''

✲✲✲

مگر وہ صبح کبھی نہیں آئی۔ الغ خان (غیاث الدین بلبن) کا چہیتا غلام ہونے کے سبب طغرل ایک بااثر امیر تھا۔ اس نے دونوں مظلوم عورتوں کو محل کے دروازے سے آگے بڑھنے نہیں دیا۔ دربار سلطانی تو بہت دور تھا۔

پھر شجاع الدین کامران کو ایک طویل مدت کیلئے قید خانے میں ڈال دیا گیا۔

اس کا جرم ثابت ہو چکا تھا' نئے قاضی غیور احمد نے بہت سے گواہوں کی شہادت کا سہارا لے کر شجاع الدین کامران کو مجرم قرار دے دیا۔

کامران کا جرم یہ تھا کہ وہ ایک سزا یافتہ چور ہے جس کی بداعمالی کے باعث محلے کے دوسرے نوجوان بھی گمراہی کا شکار ہو رہے ہیں۔ کامران کے محلے میں رہنے والے نوجوانوں نے علی الاعلان کہا کہ وہ انہیں چوری' قماربازی اور شراب نوشی پر اکساتا ہے۔

کامران چیختا رہا' مگر قاضی غیور احمد نے کہا کہ شہادتیں بہت زیادہ ہیں اس لئے اسے حوالہ زندان کر دیا جائے تاکہ گناہوں کے یہ خوفناک جراثیم شرفاء کے محلے میں زیادہ دور تک نہ پھیل سکیں۔

قاضی غیور احمد نے اپنے فیصلے میں یہ بھی لکھا کہ نوجوان مجرم کو اصلاح کا ایک موقع فراہم کیا جا رہا ہے کہ شاید طویل المدت قید و بند سے گھبرا کر اپنی عادتیں بدل ڈالے۔

جواباً شجاع الدین کامران نے صرف اتنا کہا۔

''محترم قاضی! اگر آپ کا قانون مجھے ایک ہزار سال تک بھی زندان کی چاردیواری میں رکھے تو میری عادتیں تبدیل نہیں ہوں گی' میں جیسا آج ہوں کل بھی ویسا ہی رہوں گا۔''

قاضی غیور احمد نے سخت لہجے میں سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ مجرم کو عدالت سے باہر لے جائیں۔

''میں چلا جاؤں گا مگر اتنا سن لیجئے کہ آپ یکسر بدل گئے ہیں۔'' کامران کے لہجے میں بڑا ٹھہراؤ تھا...... ''آپ نے کرسی انصاف پر بیٹھنے سے پہلے...... خدا اور سلطان دونوں سے عہد کیا تھا کہ پوری دیانتداری کے ساتھ اپنا فریضہ انجام دیں گے' مگر یہ کیسی دیانتداری ہے کہ میرے گواہوں پر عدالت کے دروازے بند کر دیئے گئے اور مخالفین کی شہادتوں کو کسی ولی یا قطب کا قول سمجھ کر تسلیم کر لیا گیا' اگر یہی انصاف ہے تو پھر ظلم کسے کہتے ہیں اور ناانصافی کیا ہے؟ اے منصف و عادل بزرگ! کم سے کم میری بیوہ ماں کو تو اندر آنے کی اجازت دے دی ہوتی کہ وہ میرے خلاف عائد کی جانے والی فرد جرم سن لیتی اور پھر اسے قرار آجاتا کہ اس کے بطن سے کیسا گنہگار بیٹا پیدا ہوا ہے؟''

قاضی غیور احمد کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا' عدالت پر گہرا سکوت طاری رہا اور شجاع الدین کامران کے پیروں

کی زنجیریں بہت دیر تک گونج پیدا کرتی رہیں۔
جنگل میں کوئی رات ایسی نہیں گزری جب سردار نرسنگا اور امرپالی نے کامران کو یاد نہ کیا ہو۔
ایک دن امرپالی نے بڑے جذباتی لہجے میں اپنے شوہر سے کہا۔
''سردار! ٹھاکر کو گئے ہوئے بہت دن ہو گئے ہیں مگر وہ ایک بار بھی ہم سے ملنے نہیں آیا' پتا نہیں کس حال میں ہے؟''
نرسنگا کامران کا ذکر سن کر اداس ہو گیا...... ''مجھے بھی بہت یاد آتا ہے ٹھاکر' مگر کیا کروں؟ وہ مجھے مجبور کر گیا ہے کہ میرا کوئی آدمی اس کے گھر تک پہنچنے کی کوشش نہ کرے۔''
امرپالی نے ضد کرتے ہوئے کہا...... ''ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کی خبر گیری کریں۔''
آخر ایک دن مجبور ہو کر نرسنگا نے اپنے دو بوڑھے قزاقوں کو گداگروں کے لباس میں شجاع الدین کامران کے گھر کی طرف بھیجا۔ قزاق بہت دیر تک دروازے پر کھڑے صدائیں دیتے رہے' مگر کوئی بھی متنفس باہر نہیں آیا' یہاں تک کہ محلے داروں نے تنگ آ کر کہا۔
''یہاں سے تمہیں کیا بھیک ملے گی' مکان کا مالک خود چوری کے جرم میں سزا کاٹ رہا ہے۔''
جب بوڑھے قزاقوں نے اپنے سردار کو یہ واقعہ سنایا تو وہ غصے سے پاگل ہو گیا۔ اس نے فوراً اپنے آدمیوں کے ذریعے کرشن راؤ کو جنگل میں طلب کیا۔
''ٹھاکر! کہیں یہ تیری شرارت تو نہیں۔''
کرشن راؤ نے قسمیں کھا کر نرسنگا کو یقین دلایا کہ اس نے ٹھاکر کے خلاف کوئی سازش نہیں کی۔
پھر کرشن راؤ نے بہت زیادہ بڑھا چڑھا کر کامران کو چوری کا واقعہ سنایا۔
نرسنگا نے کرشن راؤ کو جھڑک دیا اور چیخ کر کہا ''جب تک میں خود تحقیق نہ کر لوں اس وقت تک تجھے میرے پاس رہنا پڑے گا۔''
پھر کئی دن کی دوڑ دھوپ اور مقامی لوگوں سے پوچھ کے بعد نرسنگا کے مخبروں نے بتایا کہ واقعتاً کامران ایک پیشہ ور چور تھا۔
نرسنگا نے کرشن راؤ کو چھوڑ دیا' مگر وہ بار بار یہی کہتا رہا کہ ''ساری دنیا جھوٹ بولتی ہے' ٹھاکر چوری نہیں کر سکتا۔''
پھر تنہائی میں امرپالی کو مخاطب کر کے نرسنگا نے کہا۔
''ٹھاکر نے میرا احسان گوارا نہیں کیا اور مجھے شکست دے کر قید خانے کے اندھیروں میں چلا گیا' میں اس کی مدد کو ضرور پہنچوں؟ اگر کھلے میدان میں مقابلہ ہوتا تو نرسنگا ٹھاکر کو چھڑانے کیلئے اپنی جان کی بازی بھی لگا دیتا۔''
نرسنگا پاگل ہو رہا تھا لیکن امرپالی نے یہ کہہ کر اسے ترغیب دی۔
''چند دنوں کی قید ہے' جب ٹھاکر اندھیروں سے باہر آئے گا تو پھر صحیح صورتحال واضح ہو گی کہ اس کے ساتھ یہ حادثہ کیسے پیش آیا ہے۔''
نرسنگا سنبھل گیا' مگر ایک ہی بات کہتا رہا۔
''وقت کس کے روکے رکا ہے امرپالی' مگر نرسنگا پر ایک پل بھاری گزرے گا۔''

✻✻✻

اور قائم خان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ نئے منصوبوں کی تشکیل میں گزر رہا تھا۔ کئی ماہ تک وہ کامران کے نام پر ساتھیوں کا انتظار کرتا رہا کہ شاید کسی رات سادھو نما قزاق اس کی حویلی کا رخ کریں...... مگر امیر طغرل کے سپاہیوں کا پہرہ بہت سخت تھا' پھر جب کئی ماہ تک مکمل خاموشی رہی تو قائم خان کو یقین آگیا کہ اسے کئی برسوں کیلئے کامران کی فتنہ گردی سے نجات حاصل ہو چکی ہے' اب وہ کسی نئی فتح کا خواب دیکھ رہا تھا۔

اس دوران امیر طغرل اور قائم خان کے رشتوں میں بظاہر بہت گہرائی آ گئی تھی' لیکن دونوں سیاسی کھلاڑی تھے۔ اپنے اپنے مفادات کی خاطر چالیں چل رہے تھے۔ یہاں تک کہ طغرل نے قائم خان کے ایک کمزور پہلو سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس پر غلبہ حاصل کرلیا۔ کامران کے سلسلے میں قائم خان مجرم تھا اور امیر طغرل اس کے جرم کا رازدار۔

قائم خان اپنے جرم کی پردہ پوشی کیلئے بڑے پرتکلف انداز میں کیف و نشاط کی محفلیں آراستہ کرتا رہا اور امیر طغرل مہمان خصوصی کی مسند پر بیٹھ کر اپنے آپ کو فرمانروائے ہند سمجھتا رہا۔ قائم خان امیر طغرل کے کاندھوں پر کھڑے ہو کر اپنا قد مزید بڑھانا چاہتا تھا اور امیر طغرل کی ہولناک نظریں اس دیوار میں شگاف ڈال دینا چاہتی تھیں جس کے پیچھے یاسمین خانم محوِ خرام تھی۔

امیر طغرل نے شاہی تقریبات کے دوران کئی بار یاسمین خانم کو دیکھنے کی کوشش کی تھی' مگر قائم خان کے گھرانے کی خواتین بہت سخت پردہ کرتی تھیں۔ ایک تو راجپوتوں کا روایتی پردہ اور دوسرے اسلامی معاشرت کے آداب۔ ان دونوں رسموں نے مل کر یاسمین خانم کے چہرے پر ایک دبیز نقاب ڈال دی تھی...... پھر بھی امیر طغرل نے درباری کنیزوں کے ذریعے اتنا ضرور معلوم کرلیا تھا کہ یاسمین خانم ہوشربا حسن رکھنے والی ایک سیمیں بدن دوشیزہ ہے۔

امیر طغرل جیسے اوباش انسان کیلئے کنیزوں کی فراہم کردہ اطلاعات بڑی جان لیوا تھیں۔ آخر ایک دن وہ اپنے حواس میں نہ رہ سکا۔ اس نے شدید بے صبری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے ایک ساتھی امیر سے کہا۔

''قائم خان کو سمجھاؤ کہ اس کی بیٹی یاسمین خانم کیلئے امیر طغرل سے بہتر کوئی دوسرا رشتہ موجود نہیں ہے۔

❋❋❋

سلطان ناصر الدین محمود کا ایک درباری امیر زرتاش اپنے دوست طغرل کی شادی کا پیغام لے کر قائم خان کے پاس پہنچا تھا۔

قائم خان نے بغور امیر زرتاش کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر شدید حیرت کے آثار نمایاں تھے۔ پھر یہ حیرت غصے میں بھی بدل سکتی تھی' مگر قائم خان تلخ ترین باتوں کو برداشت کرنے کا عادی ہو چکا تھا۔ پھر بھی اس نے عجیب سے لہجے میں زرتاش سے پوچھا۔

''امیر! تمہارا کیا خیال ہے اس رشتے کے بارے میں؟'' قائم خان نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا تھا اور اس کی آنکھوں میں استہزا کے کئی رنگ جھلکنے لگے تھے۔

''میں کیا کہہ سکتا ہوں؟ طغرل میرا دوست ہے۔'' امیر زرتاش کی زبان میں ہلکی سی لڑکھڑاہٹ تھی' مگر وہ فوراً ہی سنبھل گیا۔ ''دوستی کا رشتہ بڑا عجیب رشتہ ہوتا ہے۔ اگر میں طغرل کی سفارش میں اپنے ہونٹوں کو جنبش دوں گا تو لوگ کہیں گے کہ امیر زرتاش اپنے دوست کی وکالت کر رہا ہے۔ دراصل یہ بڑا نازک مرحلہ ہوتا ہے۔ قائم خان! تمہیں اپنی بیٹی یاسمین خانم کے مستقبل کا فیصلہ کرتے وقت غیر جانبدار ہو کر سوچنا چاہئے۔ طغرل تمہارا بھی دوست ہے۔'' امیر زرتاش نے بڑی ہوشیاری سے قائم خان کے سوال کو اسی کی طرف لوٹا دیا تھا۔

''تم بھی میرے دوست ہو' امیر زرتاش!'' قائم خان کے عیار ذہن نے ایک اور کروٹ لی۔ اگرچہ زرتاش سے صرف اس کی شناسائی تھی' لیکن قائم خان نے اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے دربار سلطانی کے ایک اور طاقتور امیر کو اپنے حلقے میں سمیٹنے کی کوشش کی۔

''بے شک! میں بھی تمہارا دوست ہوں۔'' امیر زرتاش نے تکلف سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''مگر یاسمین خانم صرف تمہاری بیٹی ہے۔'' زرتاش نے ایک بار پھر اپنا دامن چھڑانے کے لئے ایک معقول عذر تراش لیا۔

''نہیں! وہ تمہاری بھی بیٹی ہے۔'' قائم خان نے رسمی الفاظ کا ایک اور جال بچھا دیا۔ اس رشتے سے تم بھی میری رہنمائی کرنے کا حق رکھتے ہو۔''

''نہیں قائم خان! میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' امیر زرتاش نے بڑی بیبا کی کے ساتھ انکار کر دیا۔ ''اور جہاں تک امیر طغرل کی شخصیت کا تعلق ہے تو وہ دربار سلطانی میں بڑی رسائی رکھتا ہے۔ اگر تم اسے دوست کی وکالت نہ سمجھو تو میں برملا اس حقیقت کا اظہار کر سکتا ہوں کہ امیر طغرل سے وہی لوگ خاندانی رشتہ قائم کر سکتے ہیں جو پیدائشی طور پر خوش نصیب ہوتے ہیں۔ طغرل ہر ایک کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ دہلی اور ہندوستان کے دوسرے شہروں میں بڑے بڑے نامور خاندان بستے ہیں' مگر طغرل ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔'' امیر زرتاش نے جس طرح اپنے دوست طغرل کی وکالت کی تھی' قائم خان سیاست کا یہ انداز دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔

پھر اس نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر نئی کروٹ لی۔ ''میں امیر طغرل کے اثر ورسوخ اور خاندانی وجاہت سے انکار نہیں کرتا۔'' قائم خان نے بڑی ذہانت کے ساتھ ایک ہی جملے میں جھوٹ اور سچ دونوں شامل کر دیئے تھے۔ جھوٹ یہ تھا کہ طغرل خاندانی وجاہت سے یکسر محروم تھا۔ اہل دنیا کے نزدیک شہنشاہیت کا اعزاز حاصل کرنے کے بعد غلام غلام ہی رہتا ہے اور سچ یہ تھا کہ امیر طغرل الغ خان (غیاث الدین بلبن) کی غلامی کے سبب دربار سلطانی میں ایک خاص مقام رکھتا تھا۔

پھر تم اس رشتے کو قبول کرنے میں ہچکچا کیوں رہے ہو؟'' امیر زرتاش نے پوچھا۔ ''آخر وہ کیا چیز ہے جو تمہاری زبان کو حرف اقرار سے دور رکھنا چاہتی ہے۔''

''اقرار ایک مشکل کام ہے امیر!'' قائم خان نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تم ایک باپ کی ذمہ داریوں سے خوب واقف ہو۔''

''صاف صاف کہو قائم خان! میرا وقت کیوں برباد کر رہے ہو؟'' امیر زرتاش جھنجلا گیا۔

قائم خان نے صورت حال کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے اپنے دل کی بات کہہ ڈالی۔ ''میرے اور امیر طغرل کے درمیان دوستی کا رشتہ ہے' اس لئے مجھے یہ بات بڑی عجیب سی لگ رہی ہے کہ میں یاسمین خانم کے لئے اپنی عمر کے ایک آدمی کا رشتہ قبول کرلوں۔ خاندان کے لوگ مجھے کیا کہیں گے؟ اور میں یہ بھی نہیں جانتا کہ اس سلسلے میں یاسمین کے جذبات و احساسات کیا ہوں گے؟'' قائم خان نے بہت مضبوط دلائل پیش کر کے امیر زرتاش کے کھینچے ہوئے حصار سے نکلنے کی کوشش کی تھی۔

''تیری سوچ بڑی عجیب ہے قائم خان!'' اچانک امیر زرتاش کی آواز تیز ہوگئی۔ کیا تیرے خاندان میں ایسی جاہلانہ رسم موجود ہے کہ لڑکیوں سے شادی کے بارے میں ان کی مرضی معلوم کی جائے؟''

''امیر! میں بنیادی طور پر راجپوت نسل سے تعلق رکھتا ہوں۔'' قائم خان نے بھی پرجوش لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''ہماری کوئی عورت زبان لے کر پیدا نہیں ہوتی' اس کے ہونٹوں اور دانتوں کے درمیان گوشت کا یہ ٹکڑا محض اس لئے ہوتا ہے کہ وہ مرد کی ہر خواہش کے احترام میں اپنی آواز بلند کرے۔''

''پھر تم اپنی بیٹی کے جذبات و احساسات کو درمیان میں کیوں لے آئے؟'' امیر زرتاش نے اسی لہجے میں دوسرا سوال کیا۔

''اس لئے کہ اب میں مسلمان ہوں اور راجپوتوں کی کافرانہ رسموں کو بہت پیچھے چھوڑ آیا ہوں۔'' قائم خان کی آواز بدستور بلند تھی۔ ''میں نے کچھ علماء کی زبانی سنا ہے کہ اسلام شادی کے سلسلے میں عورت کے حقوق کی مکمل حفاظت کرتا ہے اور اس کی مرضی کو نظرانداز کر کے اپنا کوئی جابرانہ فیصلہ اس پر مسلط نہیں کر سکتا۔''

امیر زرتاش نے پہلی بار تلخ لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم جانتے ہیں کہ اسلام میں عورت کے کیا حقوق ہیں؟ لیکن صدیوں سے ہمارے خاندانوں میں یہی ایک رسم جاری ہے کہ شادی کے متعلق کسی عورت سے کوئی سوال نہیں کیا جاتا بلکہ یہ انتہائی بے شرمی کی بات سمجھی جاتی ہے کہ ایک نا کتخدا لڑکی اپنے ازدواجی رشتے کے سلسلے میں لب کشائی کرے۔ اس کے علاوہ یہ تم نے طغرل کی عمر کے بارے میں کیا کہا ہے؟'' امیر زرتاش نے پوچھا۔

''ہاں امیر یہ بات مجھے بہت زیادہ پریشان کر رہی ہے کہ ایک ہم عمر دوست راتوں رات داماد کیسے بن سکتا ہے؟'' قائم خان نے اپنے گریز کو جائز ثابت کرنے کے لئے ایک اور دلیل پیش کی۔ ''امیر طغرل یاسمین سے بہت زیادہ بڑے ہیں۔''

امیر زرتاش سنبھل کر بیٹھ گیا۔ ''تو پھر کیا تمہیں اس رشتے سے انکار ہے؟''

''انکار نہیں' میں ایک خاص پہلو پر غور کر رہا ہوں۔'' قائم خان نے بھی فوراً اپنا لہجہ بدل ڈالا۔ ''اسی وجہ سے میں نے کچھ دیر پہلے تم سے کہا تھا کہ مجھے مشورہ دو میں نے ابھی تک صرف ان حقائق کا اظہار کیا ہے جو ہمارے سامنے موجود ہیں' ہمیں بہرحال ان کا حل تلاش کرنا ہے۔''

امیر زرتاش کے چہرے پر اچانک نمایاں ہو جانے والے تناؤ میں کچھ کمی آ گئی تھی۔ ''کیا تمہارے نزدیک یہ کوئی عجوبہ ہوگا کہ ایک دوست یکایک فرزندی کے حلقے میں شامل ہو گیا۔ ایسے واقعات سے تو ہمارا معاشرہ بھرا ہوا ہے اور جہاں تک امیر طغرل کی عمر کا تعلق ہے تو مرد کبھی بوڑھا نہیں ہوتا اور پھر ایسا مرد کہ جسے دنیا کی ہر ممکن آسائش حاصل ہے۔ وہ امیر طغرل جو پانی کی جگہ آب حیات پیتا ہے اور جس کے دسترخوان پر ہمیشہ جنت کی غذائیں بکھری رہتی ہیں۔'' امیر زرتاش نے دربار شاہی کے تعلق سے انتہائی متکبرانہ انداز میں طغرل کے جاہ وحشم کی نمائش کی۔

قائم خان نے آخری فیصلے تک پہنچنے کے لئے کچھ مہلت طلب کی اور امیر زرتاش یہ کہتا ہوا قصر شاہی کی طرف چلا گیا۔

''قائم خان! بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا۔ امیر طغرل دوستوں کا بے مثال دوست ہے اور دشمنوں کا بدترین دشمن۔''

یہ درپردہ ایک دھمکی تھی جسے قائم خان نے پوری شدت سے محسوس کیا۔

❋❋❋

امیر زرتاش کی کامیاب وکالت پر طغرل بہت زیادہ آسودہ نظر آ رہا تھا۔ اب تک اس نے بے شمار شادیاں کی تھیں اور انہیں ازدواجی رشتے کی قید سے آزاد کر چکا تھا۔ طغرل نے کبھی اپنے ذہن میں بچوں کی تعداد کو محفوظ نہیں رکھا۔ اگر اس کی کوئی طلاق شدہ بیوی صاحب اولاد ہوتی تو امیر طغرل صرف اپنے بچوں کے نام پر کچھ ماہانہ وظیفہ جاری کر دیتا......اور جہاں تک بچوں کی محبت کا سوال ہے تو امیر طغرل نے کسی اولاد کو اپنے قریب نہیں رکھا۔ وہ انسانی رشتوں کے اعتبار سے بڑا محروم شخص تھا۔ طغرل کو نہ کسی بچے نے باپ کہہ کر پکارا اور نہ کبھی اس کے ہونٹوں پر ''فرزند'' کا لفظ ابھرا۔

وہ سر سے پاؤں تک حرص و ہوس کا ایک جیتا جاگتا مجسمہ تھا۔ رقص و موسیقی اس کا مذہب تھی اور خوبصورت عورتوں سے شادی کر کے انہیں اپنے حرم سے رخصت کر دینا اس کا وطیرہ تھا۔ طغرل کی کچھ بیویوں نے ازدواجی قید سے آزاد ہونے کے بعد اس کی غلامی اختیار کر لی تھی اور وہ زندہ رہنے کیلئے گھر گھر جا کر دلکش نقش و نگار رکھنے والی لڑکیوں کو تلاش کرتی تھیں اور پھر اپنے سابق شوہر کو خبر دیتی تھیں کہ حسن کہاں کہاں اور کس کس شکل میں موجود ہے۔

طغرل کے اشارے پر ہوس کے کارندے ان غریب گھرانوں میں پہنچ جاتے اور ٹاٹ کے پردوں کے پیچھے رہ کر محلوں کے خواب دیکھنے والی معصوم لڑکیاں جائز طور پر امیر طغرل کے حرم میں داخل ہو جاتیں اور انہیں گمان تک نہ ہوتا کہ چند روز بعد قصر شاہی کی وسعتوں سے نکل کر وہ اپنے گھروں کی تنگ چار دیواری میں دوبارہ لوٹ آئیں گی۔

امیر طغرل برسوں سے یہ شرمناک کھیل کھیل رہا تھا۔ اب تک کسی بڑے خاندان کی بیٹی اس کے عشرت کدے میں داخل نہیں ہوئی تھی۔ دوسرے امراء کے سامنے طغرل اپنی اس خواہش کا اظہار بھی نہیں کر سکتا تھا کہ بااثر لوگ کوئی رشتہ قائم کرنے کے بجائے اس کے منہ پر تحقیر و ذلت کی سیاہی مل دیتے۔ الغ خان کا غلام ہونا کم حیثیت لوگوں کی نظر میں کوئی بڑا اعزاز ہو سکتا تھا' مگر آزاد خاندانوں کے امراء طغرل کو ذرا بھی اہمیت نہیں دیتے تھے اور اسی احساس کمتری

سے مجبور ہو کر اس نے قائم خان کی بیٹی یاسمین خانم کیلئے اپنے رشتے کا پیغام دیا تھا۔ طغرل کی یہ دیرینہ خواہش تھی کہ وہ کسی نامور اور معزز خاندان میں شامل ہو کر غلامی کے داغ کو دھو ڈالے۔ اگرچہ قائم خان کا شمار دہلی کے بہت زیادہ محترم گھرانوں میں نہیں ہوتا تھا' مگر پھر بھی وہ ایک آزاد خاندان کا فرد تھا اور نسلی اعتبار سے اسے ہندوستان میں بسنے والی دوسری قوموں پر برتری حاصل تھی۔

امیر طغرل نے پہلے تو کبھی یاسمین خانم کے بارے میں سوچا بھی نہ تھا' مگر جب قائم خان اپنے سرکش بھانجے شجاع الدین کامران سے نجات حاصل کرنے کیلئے اس کے قریب آیا تو امیر طغرل کے دل و دماغ میں چھپے ہوئے شیطان نے کروٹ لی اور اس نے اپنے کاروبار ہوس کو نئے انداز سے آراستہ کرنے کیلئے ایک نیا منصوبہ تیار کر لیا۔ اب کی بار بیس سالہ یاسمین خانم کا حصول اس کے منصوبے کا سب سے نمایاں پہلو تھا۔ امیر طغرل جانتا تھا کہ قائم خان اس رشتے کو آسانی سے قبول نہیں کرے گا' مگر وہ اس حقیقت سے بھی باخبر تھا کہ شجاع الدین کامران کی ناحق گرفتاری اور قید میں براہ راست ملوث ہونے کے بعد قائم خان انکار بھی نہیں کر سکے گا۔ آخر اپنے دوست کی ان ہی مجبوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے طغرل نے امیر زرتاش کو قائم خان کے پاس بھیجا......اور جب زرتاش نے واپسی میں طغرل کو نیم کامیابی کی خبر سنائی تو اس کے چہرے پر ہوس اور ریاکاری کے کئی رنگ ابھر آئے۔

''زرتاش! کہیں قائم خان انکار تو نہیں کر دے گا؟'' طغرل نے اچانک اپنے خدشات کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''میں اسے اچھی طرح سمجھا چکا ہوں کہ ان ہواؤں کے خلاف چلنے والوں کا کیا انجام ہوتا ہے' جن پر ہمارا مکمل قبضہ ہے۔'' امیر زرتاش نے طغرل سے نیا جام طلب کرتے ہوئے کہا۔ ''میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ قائم خان انکار کر دے گا۔'' زرتاش نے اس طرح بے نیازانہ کہا جیسے قائم خان اس کا ذاتی غلام ہو۔

''پھر اس نے چند دنوں کی مہلت کیوں مانگی ہے؟'' طغرل نے فکر انگیز لہجے میں کہا۔ ''مجھے محسوس ہوتا ہے کہ وہ انکار کر دے گا۔ اگر اس نے ایسا کیا زرتاش تو......'' یکا یک طغرل غصے سے مغلوب نظر آنے لگا۔

''تیری سوچ بہت احمقانہ ہے طغرل!'' امیر زرتاش نے شراب سے لبریز ساغر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کوئی خوشی سے اترے یا بے دلی سے' ہمارا اقتدار بڑے بڑے سرکشوں کو اس شیشے میں اتار لیتا ہے اور قائم خان تو ایک حریص انسان ہے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں خوف کے ہلکے ہلکے سائے دیکھے ہیں۔ وہ میرے سامنے ایک بے نیاز اور غیرت مند انسان بننے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر ہوس کے حصار میں رہ کر زندگی کے خواب دیکھنے والے بہادر نہیں ہوتے۔ مخالف ہوا کا ایک ہی جھونکا انہیں ان کے محور سے ہٹا کر بزدلی کی دلدل میں گرا دیتا ہے اور پھر وہ اپنے آپ کو بچانے کیلئے مخاطب کا ہر مطالبہ تسلیم کر لیتے ہیں۔

✽✽✽

قائم خان نے بھی ایسا ہی کیا۔ امیر زرتاش کے جاتے ہی قائم خان نے اپنی بیوی سے بڑے رازدارانہ لہجے میں کہا۔

''ہمارے خوابوں کی تعبیر تو نظر آئی ہے' مگر زیادہ دلکش اور واضح نہیں۔'' قائم خان نے یاسمین خانم کی ماں کو امیر زرتاش کی آمد کے بارے میں ساری تفصیلات بتا دیں اور سوالیہ نظروں سے بیوی کی طرف دیکھنے لگا۔

یاسمین خانم کی ماں زرتاج خانم کچھ دیر تک شوہر کے سامنے تصویر حیرت بنی بیٹھی رہی اور پھر انتہائی غضب ناک لہجے میں بولی۔

''وہ غلام زادہ آج اس قابل ہو گیا کہ ہماری بیٹی کا ہاتھ مانگنے لگا۔''

''آہستہ بولو!'' قائم خان نے بیوی کو تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ غلام زادہ ضرور ہے' مگر مجھے اس کا مستقبل شاہوں کی طرح روشن نظر آتا ہے۔'' قائم خان نے امیر طغرل کی حمایت کی۔

''یہ آپ کہہ رہے ہیں؟'' زرتاج خانم کی آواز دھیمی تھی' مگر ماتھے پر کئی شکنیں نمایاں تھیں۔

''ہاں! یہ میرے الفاظ ہیں۔'' قائم خان نے پراعتماد لہجے میں کہا۔

''وہ کس طرح؟'' زرتاج خانم کی آواز سرد پڑنے لگی۔

''طغرل کسی عام درباری کا غلام نہیں۔'' قائم خان نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ الغ خان کا غلام ہے' ہندوستان کے وزیراعظم کا غلام اور الغ خان وہ شخص ہے کہ جس کی جنبش چشم پر سلطان ناصر الدین محمود کا پورا اقتدار رقص کر رہا ہے۔''

زرتاج خانم کے چہرے پر ابھرنے والے غصے کے تمام آثار ایک ایک کر کے مٹ گئے' مگر اس کی آنکھوں میں بیک وقت کئی سوال انگڑائیاں لینے لگے تھے۔

''ہمیں اس سے کیا فائدہ پہنچے گا کہ طغرل الغ خان کا غلام ہے؟'' اب زرتاج خانم کے سوچنے کا انداز بدل چکا تھا۔

''جب کسی آقا کو مالی فائدے پہنچتے ہیں تو اس کے غلام بھی فیضیاب ہوتے ہیں۔'' قائم خان نے سیدھی سادی منطق پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''دولت کی بارش ہوتی ہے تو گھر کے جانور بھی آسائشوں کے پانی میں نہا جاتے ہیں اور پھر طغرل تو انسان ہے الغ خان کا چہیتا غلام ہے' اس کی انگوٹھی کا ایک ہیرا بھی ہماری تمام جائیداد سے زیادہ قیمتی ہے۔ ظاہری مال و اسباب میں ہمارا اس کا کوئی مقابلہ نہیں' دربار سلطانی میں بھی وہ ہم سے زیادہ بااثر ہے بس اس کے لباس پر غلامی کا ایک داغ ہے جو عام انسانوں کو نظر نہیں آتا۔ اپنے خاندان میں صرف میں اس راز سے باخبر ہوں طغرل کسی آزاد خاندان کا فرد نہیں۔ لوگ تو اسے نسل شاہی کا ایک معزز رکن سمجھتے ہیں۔ اگر تم غلامی کی بات کرتی ہو تو پھر شمس الدین التمش بھی غلام تھا اور اسی کے غلام بیٹے ناصر الدین محمود کے دربار میں اپنے نسب ناموں پر غرور کرنے والے سجدہ ریز نظر آتے ہیں۔''

شوہر کی طویل تقریر سن کر زرتاج خانم موم کی طرح پگھلنے لگی۔ اب امیر طغرل اسے ایک بہت بڑا انسان نظر آنے لگا۔

''پھر آپ نے اقرار کیوں نہیں کر لیا؟'' زرتاج خانم نے شوہر سے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔

''تم احمق ہو اور سیاست کے اصولوں سے ناواقف۔'' قائم خان نے جھنجھلا کر کہا۔ ''ان معاملات میں ایک اچھوت بھی اتنی جلد فیصلہ نہیں کرتا۔ اپنی بیٹی کی اہمیت ظاہر کرنے کے لئے مجھے یہ عذر پیش کرنا ہی تھا۔ فوری اقرار میری خاندانی حیثیت کو کم کر دیتا اور امیر طغرل سمجھ لیتا کہ جیسے میں برسوں سے اس کے پیغام کا انتظار کر رہا تھا۔''

زرتاج خانم شرمساری نظر آنے لگی۔

''اور سچ تو یہ ہے کہ زرتاج کہ میں کچھ اور ہی سوچ رہا ہوں۔'' اچانک قائم خان کھڑا ہو گیا اور اپنے کمرے کی دیوار پر آویزاں اس تصویر کو دیکھنے لگا جس میں ایک خونخوار شیر ایک معصوم ہرن پر جھپٹ رہا تھا۔

قائم خان اس تصویر کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ زرتاج خانم بس اپنی جگہ سے اٹھی اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی شوہر کے قریب پہنچ گئی۔ قائم خان بہت غور سے حملہ آور شیر کو دیکھ رہا تھا۔

زرتاج خانم نے محبت کا مظاہرہ کرتے ہوئے شوہر کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔
قائم خان نے پلٹ کر بیوی کی طرف دیکھا اور پھر تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''اس ہرن کو دیکھ رہی ہو جو اپنی عمر کے اعتبار سے بچہ نظر آ رہا ہے۔''
''آخر آپ کیا کہنا چاہتے ہیں ٹھاکر!'' زرتاج خانم کبھی کبھی اپنے شوہر کو ماضی کے خاندانی لقب سے یاد کرتی تھی۔
''میرے ذہن میں ابھی تک امیر طغرل کی عمر کھٹک رہی ہے۔ وہ سن و سال میں میرے برابر ہے اور یاسمین خانم اس کی بیٹی......'' قائم خان نے بات نامکمل چھوڑ دی۔
''یہ تو کوئی فکر انگیز مسئلہ ہی نہیں۔'' زرتاج خانم نے سامنے آتے ہوئے کہا۔ ''ہمارے خاندانوں میں بھی عمر کا یہی تناسب ہوتا تھا۔ مرد بچپن ساٹھ سال اور لڑکی اٹھارہ بیس سال کی۔ آج معاشرے کا رواج ہی یہی ہے۔ ہم کوئی انوکھا کام تو نہیں کر رہے ہیں۔''
قائم خان نے زرتاج کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اب اس کی نظریں شیر کی تصویر پر مرکوز تھیں۔ جس کی سرخ زبان باہر تھی اور خونی پنجے لپک رہے تھے۔
''مجھے اس حملہ آور شیر میں امیر طغرل کا عکس نظر آ رہا ہے۔'' قائم خان نے بڑے عجیب سے لہجے میں کہا۔
''میں امیر طغرل کا راز دار ہوں۔'' قائم خان ٹھہر ٹھہر کر کہنے لگا۔ ''اس کی قانونی بیویوں کا کوئی شمار نہیں۔''
زرتاج خانم کا سرخ و سفید چہرہ ایک لمحے میں مسخ ہو گیا۔
''میں کثرت ازدواج کو عیب نہیں سمجھتا۔ یہ تو مردوں کی شان ہے مگر امیر طغرل کسی بیوی کو زیادہ دن تک اپنے قریب نہیں رہنے دیتا۔ نہ جانے اس کی کتنی بیویاں اپنی اپنی گردنوں میں طلاق کا طوق ڈالے ہوئے ذلت و گمنامی کی زندگی بسر کر رہی ہیں۔ اس صورت میں میری بیٹی کے تحفظ کی ضمانت کون دے گا؟ بس ایک یہی بنیادی وجہ ہے کہ میں امیر زرتاش سے فوری اقرار نہیں کر سکا۔''
زرتاج خانم کا چہرہ کچھ اور سیاہ ہو گیا۔ ''تو پھر شائستہ الفاظ میں انکار کر دیجئے۔'' زرتاج کی آواز لرز رہی تھی۔
''یہی تو مشکل ہے کہ میں انکار بھی نہیں کر سکتا۔'' قائم خان نے چیختے ہوئے کہا۔ وہ شدید ذہنی کشمکش کا شکار نظر آ رہا تھا۔ ''ایسا لگتا ہے کہ مجھے امیر طغرل کی دوستی کا بہت زیادہ سود ادا کرنا پڑے گا۔ شاید میں اپنا سب کچھ ہار جاؤں۔''
''یہ آپ کیسی مایوس کن باتیں کر رہے ہیں۔'' زرتاج خانم نے شوہر کو حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔
''میں اس لئے انکار نہیں کر سکتا کہ امیر زرتاش انتہائی تحقیر آمیز لہجے میں دھمکی دے کر گیا ہے۔'' قائم خان کا لہجہ بہت شکستہ نظر آ رہا تھا۔
''تو کیا آپ اس کے الفاظ سے مرعوب ہو گئے؟'' زرتاج خانم نے اونچی آواز میں کہا۔
''ہاں زرتاج! میں ایک بہت کمزور انسان ہوں۔'' قائم خان کی شکستگی بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ ''ایک مجھی پر کیا منحصر ہے' تمام مقامی لوگوں کے دست و پا کٹ چکے ہیں اور زبانیں مفلوج ہو گئی ہیں۔ طاقت کے ذخائر غیر مقامی لوگوں کے قبضے میں ہیں اور طاقت ہی یہاں کا قانون ہے۔''
''اگر امیر طغرل تشدد کے استعمال کی دھمکی دیتا ہے تو آپ دربار سلطانی سے انصاف مانگ سکتے ہیں۔'' زرتاج خانم نے سادہ دل عورتوں کی طرح شوہر کو سمجھانے کی کوشش کی۔

''وہ شخص سلطان سے کیا انصاف مانگے گا جو خود آج تک ناانصافیوں کی ڈگر پر چلتا رہا ہے۔'' قائم خان نے بیوی کے سامنے اپنی بدعنوانیوں کا اعتراف کرتے ہوئے کہا۔ ''شجاع الدین کامران مجرم نہیں تھا' مگر میں نے امیر طغرل کی مدد سے اسے ایک طویل مدت کیلئے زندان کے اندھیروں میں پہنچا دیا۔ امیر طغرل میرے اس جرم سے واقف ہے اور شاید اسی کمزوری کا سہارا لے کر اس نے مجھے دھمکی دی ہے۔''

''پھر......؟'' زرتاج خانم کا پورا وجود ایک اذیت ناک سوال بن کر رہ گیا۔

''میں امیر طغرل کا مطالبہ ماننے کیلئے تیار ہوں' اگر مجھے کوئی یہ ضمانت دے دے کہ میری بیٹی کا مستقبل محفوظ رہے گا۔'' قائم خان نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

زرتاج خانم کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

''پہلے تم یاسمین کی مرضی تو معلوم کرو پھر اس مسئلے پر بھی کوئی حل نکل آئے گا۔'' یہ کہہ کر قائم خان نے شراب کی صراحی اپنے سامنے رکھی اور زرتاج خانم خاموشی سے ساغر بھر بھر کے شوہر کو پیش کرتی رہی۔

جب قائم خان کے چیختے ہوئے اعصاب پرسکون ہو گئے تو اس کے ہونٹوں کی گمشدہ مسکراہٹ بھی لوٹ آئی۔ اب تم جاؤ زرتاج۔ دنیا میں ایسا کوئی سوال نہیں جس کا جواب قائم خان کے ذہن کی گرفت سے محفوظ رہ سکے۔''

زرتاج خانم سیکڑوں اندیشوں کے ہجوم میں گھری ہوئی یاسمین کے کمرے کی طرف چلی گئی۔

❊❊❊

پھر جب زرتاج خانم نے یاسمین کی چند راز دار سہیلیوں کے ذریعے اس تک امیر طغرل کا پیغام پہنچایا تو وہ کچھ دیر کیلئے گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

پھر اس نے اپنی سہیلیوں سے پوچھا۔ ''اس معاملے میں میرے ماں باپ کی سوچ کیا ہے؟''

''وہ اس رشتے سے مطمئن ہیں مگر اقرار سے پہلے وہ تمہاری مرضی کو اولیت دیتے ہیں۔'' سہیلیوں نے صاف صاف کہہ دیا۔

''پھر مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں۔'' یاسمین خانم کے لہجے میں بہت زیادہ اعتماد تھا۔ ''مجھے تو ہر حال میں قلعے کی فصیل تک پہنچنا ہے' اب چاہے کمزور کاندھوں کی سیڑھیاں ہوں یا توانا بازوؤں کی۔''

تمام سہیلیاں یاسمین خانم کے اس جواب پر حیران رہ گئیں۔ قائم خان اور زرتاج خانم کی تربیت رنگ لا رہی تھی۔ بیٹی کا جواب سن کر ماں باپ کے چہرے آسودگی کے گہرے رنگ سے روشن ہو گئے۔

''اب میں مطمئن ہوں زرتاج!'' قائم خان کے لہجے میں مسرتوں کا جوش تھا۔ ''یاسمین کے تیور بتا رہے ہیں کہ وہ صرف حکمرانی کیلئے پیدا ہوئی ہے۔'' دنیا پرست باپ بڑے خود غرضانہ انداز میں سوچ رہا تھا۔

''مگر طغرل کی وہ بے وفا عادتیں؟'' بیٹی کے اقرار کے باوجود زرتاج خانم پریشان نظر آ رہی تھی۔

''اس کا حل بھی میں نے تلاش کر لیا ہے۔''

❊❊❊

دوسرے دن دہلی کا مشہور نجومی پنڈت بدری ناتھ قائم خان کی نشست گاہ میں اپنی پوتھیاں (کتابیں اور کاغذات) کھولے بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں قلم تھا اور وہ کاغذ پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچنے کے ساتھ مختلف ستاروں کے مخصوص نشانات بھی بنا رہا تھا۔ یہ وہی پنڈت بدری ناتھ تھا جس نے برسوں پہلے یہ پیش گوئی کی تھی کہ اگر سعدیہ خانم اور اس کا بیٹا شجاع الدین کامران اس حویلی میں مقیم رہے تو سارے گھرانے پر ناقابل بیان آفتیں نازل ہوں

گی' بعد کے حالات نے نجومی کے الفاظ کو سچ ثابت کر دیا اور قائم خان ستاروں کی گردش کا زیادہ قائل نظر آنے لگا۔ اگرچہ قائم خان اور اس کے اہالیان خاندان نے اسلام قبول کر لیا تھا' لیکن ابھی تک وہ ماضی کی رسموں سے مکمل طور پر پیچھا نہیں چھڑا سکے تھے۔ قائم خان کوئی بھی اہم فیصلہ کرتے وقت پنڈت بدری ناتھ سے پوچھتا تھا۔

''ستارے کیا کہتے ہیں؟''

پھر بدری ناتھ زائچہ بنانے کے بعد جو کچھ ہدایات دیتا' قائم خان ان پر اس طرح عمل کرتا جیسے اس کیلئے آسمان سے کوئی پیغام اترا ہو۔ آج بھی وہ بدری ناتھ کو مخاطب کر کے کہہ رہا تھا۔

''پنڈت! ستاروں سے پوچھ کر مجھے بتا دے کہ یہ رشتہ کیسا رہے گا؟''

''ٹھاکر! مجھے صحیح نتائج حاصل کرنے کیلئے امیر طغرل کی جنم کنڈلی درکار ہوگی۔'' بدری ناتھ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''میں تجھے اس کی تاریخ پیدائش نہیں بتا سکتا۔ کوئی اور راستہ اختیار کر کہ تو ستاروں کا راز دار ہے۔'' قائم خان نے پنڈت بدری ناتھ کے فن کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

بدری ناتھ اپنی کھینچی ہوئی لکیروں میں کھو کر رہ گیا۔

پھر کچھ دیر بعد بوڑھے پنڈت نے سر اٹھایا تو اس کے چہرے پر اطمینان کی گہری جھلک تھی۔ کانپتے ہوئے ہونٹ مسکرا رہے تھے اور دھندلی آنکھوں میں خوشی موجزن تھی۔

''ستارے کیا کہتے ہیں پنڈت؟'' قائم خان نے اس طرح گھبرا کر کہا جیسے کوئی بھکاری فاقوں سے تنگ آ کر روٹی کیلئے ہاتھ پھیلا دے۔

''تو بڑا بھاگوان ہے ٹھاکر!'' بدری ناتھ نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''تیری کنیا کے سہاگ (خوش قسمتی) سے پورے پریوار پر دھن کی ورشا بھی ہوگی اور راج دربار میں تجھے اونچا استھان پراپت (حاصل) ہوگا۔''

پیش گوئی کے الفاظ نے قائم خان پر نشہ سا طاری کر دیا۔ ''کچھ اور بتا پنڈت! تیرے چار لفظوں سے میری تسکین نہیں ہوگی۔''

''تیری سپتری (لڑکی) یاسمین خانم کی جنم کنڈلی بتاتی ہے کہ وہ راج سنگھاسن پر بیٹھنے اور اپنے شیش (سر) پر مکٹ (تاج) سجانے کیلئے پیدا ہوئی ہے۔ اگر ایسا نہیں ہوا ٹھاکر تو میں اپنی تمام پوتھیوں کو آگ لگا دوں گا۔''

''مجھے تیری ودیا پر پورا بھروسہ ہے پنڈت!'' قائم خان نے جذباتی ہو کر کہا۔ ''مجھے بس اتنا بتا دے کہ میری بیٹی کے ساتھ امیر طغرل کا یوگ کیسا رہے گا؟''

''تیری بیٹی کا منگل (مریخ) بھی بلوان (طاقتور) ہے' شنی (زحل) بھی' چندرما بھی اور سوریہ (سورج) بھی۔ اس پر کوئی قابو نہیں پا سکتا۔ وہ ہر حال میں وجیتا (فاتح) رہے گی۔ طغرل کتنا بھی طاقتور ہو مگر اسے یاسمین کا داس بننا پڑے گا۔''

قائم خان کی خوشی ناقابل بیان تھی۔ ''اور کچھ پنڈت! اپنے گیان کے بھنڈار (ذخیرے) سے کوئی اور بھوش وانی (پیش گوئی)۔ طغرل بھی ترقی کرے گا یا نہیں؟'' قائم خان اپنے ہونے والے داماد کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔

''اسے بھی کوئی اونچا پد (عہدہ) پراپت ہوگا۔ کنتو اس کے جیون میں ایک کٹھن موڑ بھی آنے والا ہے۔'' پنڈت بدری ناتھ نے محتاط لہجے میں کہا۔

''اور اس بدنصیب کامران کا کیا [illegible] گیا تھا۔

''ٹھاکر! اس بھاگے کا نام کیوں لیتا ہے؟'' پنڈت بدری ناتھ نے اپنے کاغذات کے دفتر کو لپیٹتے ہوئے کہا۔
''اس کے دن پورے ہو چکے ہیں۔ وہ بہت جلد اس سنسار سے چلا جائے گا۔''
یاسمین خانم کی آئندہ فتوحات اور شجاع الدین کامران کے مرنے کی پیش گوئی سن کر قائم خان نے پنڈت بدری ناتھ کو انعام واکرام سے نوازا اور جب بوڑھا نجومی رخصت ہو گیا تو حویلی کے درودیوار سے مسرتوں سے نغموں سے گونجنے لگے۔

❋❋❋

امیر زرتاش دوبارہ قائم خان سے بات کرنے آیا تو امیر طغرل اور یاسمین خانم کا رشتہ طے ہو چکا تھا۔ پھر بھی قائم خان نے زرتاش کے سامنے ایک شرط رکھتے ہوئے کہا۔
''یہ ہمارا خاندانی رواج ہے کہ پانچ سال تک منگنی کا سلسلہ رہتا ہے' پھر شادی کی رسم ادا کی جاتی ہے۔''
''یہ بہت طویل عرصہ ہے قائم خان!'' امیر زرتاش نے اعتراض کرتے ہوئے کہا۔
''میں اپنی خاندانی رسموں سے مجبور ہوں۔ امیر طغرل کو میری یہ شرط ماننی ہی پڑے گی۔'' قائم خان نے پرزور لہجے میں کہا۔ ''نسبت طے ہو چکی اور مرد اپنی زبان سے کبھی نہیں پھرتے۔''
امیر زرتاش چلا گیا اور پانچ سال تک یاسمین خانم کا انتظار کرنے کے ساتھ ساتھ طغرل نے کیف ونشاط کی نئی محفلیں سجالیں۔
بعد میں قائم خان نے اپنی بیوی کو اس شرط کی تفصیلات بتاتے ہوئے کہا۔
''میں پانچ سال تک سیاست کے نشیب وفراز کا جائزہ لوں گا اگر امیر طغرل کی ترقیوں کا سفر جاری رہا تو مجھے یاسمین کے ساتھ اس کی شادی پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا اور اگر کسی وجہ سے وہ حکومت کا معتوب قرار پا گیا تو اس سے پیچھا چھڑانے کے لئے میرے پاس کافی وقت ہوگا اور اگر اس دوران وہ کسی جنگی محاذ پر مارا گیا تو میری بیٹی کا سرخ جوڑا بیوگی کے سفید کفن میں تبدیل ہونے سے محفوظ رہے گا۔
آج صحیح طور پر زرتاج خانم کو اندازہ ہوا تھا کہ اس کے شوہر کی نظر کتنی دور تک دیکھنے کی عادی ہے۔

❋❋❋

اس عرصے میں ہندوستان کے اقتدار پر الغ خان (غیاث الدین بلبن) کے اقتدار کی گرفت زیادہ مضبوط ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی امیر طغرل کے عہدے میں بھی اضافہ ہوا اور اب وہ درباری امراء کی صف میں مزید نمایاں نظر آنے لگا۔ قائم خان بہت خوش تھا کہ پنڈت بدری ناتھ کی پیش گوئیاں زمین پر ظاہر ہونے لگی تھیں۔
سردار نرسنگا اور امر پالی کامران کے قید سے چھوٹنے کا انتظار کر رہے تھے۔
اور کامران گرم ہواؤں کے تھپیڑے کھاتے کھاتے کسی درخت کی طرح سوکھتا جا رہا تھا۔ وہ صبح سے شام تک سعدیہ خانم کی راہ دیکھتا رہتا' مگر آنے والا کس طرح آتا کہ پیروں میں جبر کی زنجیریں تھیں اور راستہ تشدد کے کانٹوں سے بھرا ہوا۔
سعدیہ خانم نے سلطان ناصر الدین محمود تک پہنچنے کی بہت کوشش کی' مگر امیر طغرل کا آہنی حصار ایک غمزدہ عورت کی ہڈیوں سے زیادہ مضبوط تھا۔ کچھ دن تک سر ٹکراتی رہی پھر لہولہان ہو کر اپنے کھنڈر کی طرف لوٹ گئی۔ اس بھری دنیا میں صرف قاضی عماد کی بیوہ سعدیہ خانم کی غمگسار تھی مگر ایک دن اس بیوہ نے بھی کفن پہن لیا۔
[illegible] ساتھ انصاف ضرور ہوگا مجھے اور میرے

شوہر کو معاف کر دینا کہ ہم دونوں تمہارے مجرم ہیں۔"

قاضی عماد کی بیوہ کے مرتے ہی سعدیہ خانم ایک بار پھر تنہا رہ گئی۔ اب کوئی جھوٹی تسلیاں دینے والا بھی باقی نہیں رہا تھا۔

❊❊❊

گردش روز و شب جاری رہی یہاں تک کہ پانچ سال گزر گئے۔ امیر طغرل انتظار کی مدت ختم ہو جانے پر بہت خوش تھا کہ اچانک سلطان ناصر الدین محمود کا انتقال ہو گیا۔ اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ سلطان فطری موت مرا ہے لیکن بعض لوگ سرگوشیوں میں یہ بھی کہہ رہے تھے کہ الغ خان نے ناصر الدین محمود کو زہر دے کر اپنے راستے کا سب سے بھاری پتھر ہٹا دیا ہے۔

❊❊❊

سلطان ناصرالدین محمود کا جنازہ اٹھا تو دہلی میں ایک کہرام سا برپا ہوگیا۔ آج دنیا سے وہ شخص رخصت ہوگیا تھا جس نے شہنشاہ ہوتے ہوئے بھی درویشانہ زندگی بسر کی تھی۔ اس کے خزانے سیم و زر سے لبریز تھے اور ہر طرف نوادرات کا ایک ڈھیر لگا ہوا تھا' پھر بھی اس نے کسی نعمت کو ہاتھ نہیں لگایا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ دولت کے یہ ذخائر عوام کی ملکیت ہیں۔ میں انہیں چھونے کا حق نہیں رکھتا۔ میری حیثیت تو ایک خدمت گار اور نگہبان کی سی ہے۔ یہ محض زبانی دعویٰ نہیں تھا کوئی لاف زنی نہیں تھی۔ ناصرالدین محمود نے آخری سانس تک اپنے الفاظ کی آبرو رکھی۔ تمام عمر قرآن شریف لکھ کر اور ٹوپیاں سی کر زندگی کے دن پورے کئے اور اہل وفا کی رسم نبھائی۔

ناصرالدین محمود ایک طویل عرصے تک بستر علالت پر دراز رہا۔ عام لوگوں کا تاثر یہی ہے کہ سلطان کی موت فطری حالت میں واقع ہوئی' مگر بعض رازدار حلقوں نے سرگوشیوں میں یہ بھی کہا۔

''ناصرالدین محمود کو زہر دے کر ہلاک کیا گیا ہے۔''

اور زہر دینے والا الغ خان کے سوا کون ہوسکتا تھا۔

''سرگوشیوں میں یہ بھی کہا گیا کہ زہر سے فوری طور پر موت واقع ہوجاتی ہے۔''

سیاست کے شاطروں نے جواب میں کہا۔ ''وہ ایک مخصوص زہر تھا جو انسان کو بہت آہستہ آہستہ موت کے قریب لے جاتا ہے۔ اقتدار کے حیلہ گر یہ زہر اس وقت استعمال کرتے ہیں جب وہ اپنے سر کو الزام تراشی کے پتھروں سے بچانا چاہتے ہیں۔ الغ خان نے بھی سازش کی یہی پیچیدہ راہ اختیار کی ہے۔''

الغرض سرگوشیاں جاری رہیں اور سلطان ناصرالدین محمود کو قبر میں اتار دیا گیا۔

شاہی قبرستان میں ہر طرف ان آیات الٰہی کی گونج سنائی دیتی رہی۔

''ہم نے تمہیں خاک سے پیدا کیا' ایک دن تمہارے جسموں کو خاک میں ملادیں گے اور پھر اسی خاک سے تمہیں دوبارہ اٹھائیں گے۔''

ناصرالدین محمود کے جنازے میں شریک ہونے والے آیات قرآنی کا مفہوم سمجھ رہے تھے کہ ایک دن انہیں بھی اسی خاک کے نیچے چلا جانا ہے' مگر دنیا کی دلکشی انہیں سب کچھ بھول جانے پر مجبور کر رہی تھی۔ وہ قبرستان میں کھڑے دنیا کی بے وفائی اور انسانی زندگی کی ناپائیداری کا ذکر کر رہے تھے' مگر انہیں آنے والے سلطان کا انتظار تھا کہ اب اسی کی خوشنودی انہیں ان کے عہدوں پر برقرار رکھ سکتی ہے۔

اور وہ آنے والا الغ خان کے سوا کون ہوسکتا تھا۔ ناصرالدین محمود کی زندگی ہی میں الغ خان نے تمام طاقتور سیاسی مہروں کو بے دست و پا بنا دیا تھا۔ یہاں تک کہ اس کی چالوں کے آگے شاہ بھی زچ ہوچکا تھا' پھر جب اقتدار کا قلعہ مسمار ہوگیا اور شاہ سیاست کے زندان سے نکل کر موت کی وادیوں میں گم ہوگیا تو پھر الغ خان کو روکنے والا کون

تھا؟

اس نے اپنے ہاتھوں سے تاج زرنگار اٹھایا اور سر پر سجا لیا۔
اب وہ الغ خان کے بجائے سلطان غیاث الدین بلبن تھا۔

❋❋❋

بلبن کے حامی بہت خوش تھے کہ ان کا دوست یا آقا کسی خونریزی کے بغیر ہندوستان کا مطلق العنان فرمانروا بن گیا تھا۔ جوش و مسرت سے رقص کرنے والے اس ہجوم میں سب سے زیادہ نمایاں چہرہ قائم خان کا تھا۔

پھر جب تاجپوشی کے جشن کا ہنگامہ سرد ہونے لگا تو قائم خان نے ایک دن تنہائی میں زرتاج خانم سے کہا۔
''پنڈت بدری ناتھ کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی۔''

زرتاج خانم سوالیہ نظروں سے قائم خان کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ فوری طور پر شوہر کی بات کا مفہوم سمجھنے سے قاصر تھی۔

''الغ خان غلامی کے درجے سے سلطانی کے مرتبے تک پہنچ گیا۔'' قائم خان نے انتہائی پرجوش لہجے میں کہا۔

''اس واقعہ کا پنڈت بدری ناتھ کی پیش گوئی سے کیا تعلق ہے؟'' زرتاج خانم نے کہا۔ ''یہ تو سب لوگوں کو اندازہ تھا کہ الغ خان مستقبل کا سلطان ہے۔''

''الغ خان کی سلطانی پر تو سب لوگ متفق تھے' مگر میں اس واقعہ کو دوسرے زاویے سے دیکھ رہا ہوں۔ قائم خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں یہ دیکھ رہا ہوں زرتاج خانم کہ جب ایک غلام الغ خان ہندوستان کا حکمران بن سکتا ہے تو پھر امیر طغرل کی تقدیر بھی جاگ سکتی ہے۔''

زرتاج خانم شوہر کی بات سن کر چونک اٹھی اور اس کے چہرے پر کئی رنگ ابھرا ابھر کر ڈوبنے لگے۔

''میں بہت دن سے اس عجیب و غریب حقیقت پر غور کر رہا ہوں زرتاج' قائم خان نے کسی فلسفی کے لہجے میں کہا۔'' ہندوستان کی قسمت ایک طویل عرصے سے غلاموں کے زیر اثر ہے۔ اگر وقت اسی رفتار سے آگے بڑھتا رہا تو پھر امیر طغرل کو روکنے والا کوئی نہیں۔ تخت شاہی اس کا انتظار کر رہا ہے۔''

زرتاج خانم گہری سوچ میں ڈوب گئی' پھر سرگوشیوں میں شوہر سے کہنے لگی۔'' سنا ہے کہ الغ خان نے سلطان ناصرالدین محمود سے نجات حاصل کرنے کیلئے اسے زہر دے دیا تھا؟''

قائم خان نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ وہ اچانک شدید اضطرابی کیفیت سے دوچار ہو گیا تھا۔ ''آہستہ بولو زرتاج غیاث الدین بلبن بہت سخت مزاج انسان ہے۔''

''اس سے زیادہ آہستہ کیا ہو سکتا ہے کہ تمہیں اتنے قریب ہوتے ہوئے بھی میری بات سننے میں دشواری پیش آ رہی ہے''۔ زرتاج خانم کے ہونٹوں کا زاویہ بدل گیا تھا اور اس کی آواز پہلے سے زیادہ گھٹ کر رہ گئی تھی۔

''ہاں کچھ سیاسی حلقے اسی قسم کے اندیشوں کا اظہار کر رہے ہیں۔'' قائم خان کی سرگوشیاں کچھ اور مدھم ہو گئی تھیں' ایسا لگتا تھا جیسے نقب زنی کے وقت دو چور آپس میں گفتگو کر رہے ہوں۔'' اگر واقعتاً سلطان ناصرالدین محمود کے ساتھ ایسا ہی کوئی حادثہ پیش آیا ہے تو پھر تاریخ اپنے آپ کو دہرا بھی سکتی ہے۔''

''آخر آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟ زرتاج خانم کی حیرت اس قدر بڑھی کہ وہ چند لمحوں کیلئے ساکت ہو کر رہ گئی۔''

سلطان غیاث الدین بلبن کو بھی اس کا کوئی وفادار یا معتمد اسی طرح زہر دے سکتا ہے قائم خان نے کسی کا نام تو نہیں لیا مگر اس کی نظروں کے سامنے امیر طغرل کا چہرہ ابھر آیا۔ قائم خان اپنے ہونے والے داماد کو یکایک مستقبل

کے سلطان کے پیکر میں دیکھنے لگا تھا۔ اس کی حریص نگاہوں نے خیالات کے پردے پر ایک ثانیے کیلئے وہ عبرتناک منظر بھی دیکھ لیا تھا کہ سلطان غیاث الدین بلبن بستر پر دراز ہے اور امیر طغرل اپنے آقا کو زہر دے رہا ہے۔
قائم خان اپنے کشف تصورات میں کھو کر رہ گیا۔ ناگہاں اس نے غیاث الدین بلبن کو مرتے دیکھا اور پھر فوراً ہی دوسرا منظر ابھر آیا۔ امیر طغرل کے سر پر سنہری تاج تھا اور درباری امراء اس کے سامنے سر جھکائے کھڑے تھے۔ امیر طغرل کے قریب اس کی بیٹی یاسمین خانم جلوہ افروز تھی اور فضائیں "ملکہ عالیہ" کے شور سے گونج رہی تھیں۔
"یاسمین خانم کا یہی مقدر ہے کہ لوگ اسے ملکہ عالیہ کہہ کر پکاریں۔" یکایک قائم خان کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔
"آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ ملکہ عالیہ یاسمین خانم؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔" زرتاج پریشان سی نظر آرہی تھی۔
"ابھی کسی کو میری باتوں کا ابلاغ نہیں ہوسکتا' مگر اتنا سمجھ لو کہ تمہاری بیٹی کو عنقریب بہت بڑا مرتبہ حاصل ہونے والا ہے۔ ایسا مرتبہ جسے دیکھ کر کم ظرف لوگ حسد سے جل اٹھیں گے۔ خدا یاسمین کو نظر بد سے محفوظ رکھے۔"
زرتاج خانم جوش مسرت سے سرشار نظر آنے لگی۔ وہ اپنے شوہر کے خیالات سے تو بے خبر تھی مگر پنڈت بدری ناتھ کی پیش گوئی کے درست ہونے میں کوئی شک باقی نہیں رہا تھا۔ یقیناً اس کی بیٹی حکمرانی کیلئے پیدا ہوئی ہے۔
زرتاج خانم نے عجیب سی بے خودی کے عالم میں سوچا" یاسمین ہندوستان کی ملکہ نہ سہی مگر ایک طاقتور امیر کی بیوی ضرور کہلائے گی۔ طغرل ہندوستان کا فرمانروا نہ بن سکا تو کم سے کم وزیراعظم کے منصب تک ضرور پہنچ جائے گا۔
پھر زرتاج خانم اور قائم خان مستقبل کے مسحور کن خوابوں میں کھو گئے۔

✲✲✲

ابھی غیاث الدین بلبن کا جشن تاجپوشی جاری تھا کہ ایک دن اس نے اپنے درباریوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔
"لوگو! میرے الفاظ کو بہت غور سے سنو کہ میں بار بار بولنے کا عادی نہیں ہوں۔" غیاث الدین بلبن کا لہجہ بہت سخت تھا۔ "میرا فرمان کسی کمزور بادشاہ کا فرمان نہیں۔ میں خود بھی طاقتور ہوں اور میرے احکام بھی' جو سیدھے راستے پر چلے گا وہ مجھے بھی اپنا ہم سفر پائے گا۔ اگر کسی نے حکومت کی راہ میں کانٹے بچھائے تو میں اس کی زندگی کے گلستان کو خس و خاشاک کی مانند جلا کر راکھ کردوں گا۔ مرحوم سلطان ناصرالدین محمود ایک درویش اور رحم دل حکمران تھے۔ ان کی نرم خوئی نے بہت سے لوگوں کی عادتیں بگاڑ دی ہیں۔ میں انہیں کچھ دن کی مہلت دیتا ہوں کہ وہ اپنی اصلاح کرلیں۔ اگر میں اسی وقت ان کی گرفت کرکے دردناک سزائیں دوں تو کہنے والے کہیں گے کہ بلبن نے انصاف نہیں کیا۔ اس لئے میں بگڑے ہوئے لوگوں کو سنبھلنے کا ایک موقع دیتا ہوں۔ پھر میرا قانون کسی مجرم سے کوئی رعایت نہیں برتے گا۔ میری حکومت کی بنیاد عدل و انصاف اور معاشرتی سکون پر رکھی گئی ہے' جو لوگ اس عمارت کی تعمیر میں حصہ لیں گے۔ میں انہیں خوش آمدید کہوں گا اور جو فتنہ گر غلط نیت کے ساتھ اس کی ایک اینٹ کو بھی چھونے کی کوشش کریں گے میں ان کے عالیشان محلات کو اس طرح نیست و نابود کردوں گا کہ وہاں محرومیوں اور بدنصیبیوں کی خاک کے سوا کچھ نہیں بچے گا۔" یہ کہہ کر سلطان غیاث الدین بلبن کچھ دیر کیلئے خاموش ہوگیا۔
پورے دربار پر کسی گورستان کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔
ایک مختصر سے سکوت کے بعد غیاث الدین بلبن کی آواز دوبارہ گونجنے لگی۔
"شاہی نقیب گلی گلی' کوچے کوچے اعلان کردیں کہ انتشار کا دور ختم ہوچکا ہے۔ اب سکون کا وہ موسم تمہارے

گھروں تک آ پہنچا ہے جس کا تم برسوں سے انتظار کر رہے تھے۔ ہر شخص اس موسم سے لطف اندوز ہو کہ اس کا پیدائشی حق ہے۔ پھر بھی اگر کوئی بدبخت اس دلکش موسم کے خلاف سازش کے منصوبے بنا رہا ہے تو وہ سن لے کہ بلبن کے آہنی ہاتھ بہت دراز ہیں۔ خدا کی قسم میں فساد برپا کرنے والوں کی لاشیں چوراہوں پر لٹکا دوں گا۔

اس کے بعد غیاث الدین بلبن نے ایک اور اعلان کرتے ہوئے کہا۔

میں اس موقع پر ان لوگوں کی باقی سزائیں معاف کرتا ہوں جن سے چھوٹے چھوٹے جرائم سرزد ہوئے ہیں اور ان کیلئے توقع رکھتا ہوں کہ وہ اخلاقیات کے دائرے میں زندگی بسر کریں گے۔ مجھے محنتی اور جفاکش لوگ پسند ہیں۔ وہ میرے پاس آئیں میں ان کی بے دریغ مدد کروں گا۔

❊❊❊

غیاث الدین بلبن کے اس اعلان سے مجرمانہ ذہنیت رکھنے والوں کی دنیا تاریک ہوگئی اور وہ قانون کی گرفت سے بچنے کیلئے نئے سوراخ تلاش کرنے لگے۔

قائم خان کو بھی اس اعلان سے بہت زیادہ صدمہ ہوا تھا۔ غیاث الدین بلبن کی دی ہوئی رعایت کے بعد شجاع الدین کامران کو نامعلوم مدت کی قید سے رہائی ملی تھی۔

اسی روز قائم خان امیر طغرل کے یہاں پہنچا۔ پہلے اس نے طغرل کو بلبن کی تخت نشینی پر مبارکباد دی اور پھر فکر انگیز لہجے میں کہنے لگا۔

''امیر سلطان کی بخشش و عطا کے نئے اعلان نے اس کے پیروں کی زنجیریں بھی کاٹ دیں۔'' قائم خان کا اشارہ شجاع الدین کامران کی طرف تھا۔

اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟'' امیر طغرل نے لڑکھڑاتے ہوئے لہجے میں کہا۔ وہ اس وقت شراب پی رہا تھا۔'' سارا کھیل ہماری جنبش لب کا ہے۔ اسے دوبارہ زنجیریں پڑ جائیں گی۔ جب سلطان ناصر الدین محمود کے دور حکومت میں ہمیں روکنے والا کوئی نہیں تھا تو اب کس میں اتنی جرأت کہ وہ ہمارے ارادوں کے سامنے دیوار کھڑی کر سکے۔'' امیر طغرل کا لہجہ غرور کی انتہا کو چھو رہا تھا۔ ہمارے آقا کی بلند اقبالی کا زمانہ ہے قائم خان اس نسبت پر ہمیں بھی ہندوستان کا حکمران سمجھو۔ امیر طغرل کافی بدل گیا تھا۔

قائم خان نے اقرار کے انداز میں اپنی گردن جھکا دی۔'' امیر میں تو تمہاری طاقت کا بہت پہلے سے گرویدہ ہوں۔''

''پھر زمین پر رینگنے والے کیڑوں سے ڈرتے کیوں ہو۔ امیر طغرل کی مدہوشی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اگر تم کہو تو کامران کے خون سے مقتل کو سجا دیں گے۔''

''نہیں امیر میں یہ نہیں چاہتا۔'' قائم خان نے گھبراتے ہوئے لہجے میں کہا' یکایک اس کی نظروں کے سامنے سے قزاقوں کے بے شمار چہرے ابھر آئے تھے۔ وہ ہر وقت نامعلوم قزاقوں کے متوقع حملے سے ڈرتا رہتا تھا۔ اگرچہ اس کی پانچ سالہ قید کے دوران ایک دن بھی کوئی نہیں آیا تھا' لیکن قائم خان بدستور دہشت زدہ تھا۔ دہشت اسے مجبور کرتی تھی کہ وہ شجاع الدین کامران کے خلاف انتہائی جارحانہ اقدام کرنے سے گریزاں ہے۔ قائم خان کو شجاع الدین کامران کے ساتھی قزاقوں کا خطرہ لاحق نہ ہوتا تو وہ اب تک امیر طغرل کے ذریعے اپنے حقیقی بھانجے کو قتل کرا چکا ہوتا۔

''پھر اسے معاف کر دو قائم خان۔'' امیر طغرل نے فراخدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔'' وہ بدنصیب ہمارا کیا

بگاڑ سکتا ہے۔ بیٹی کا مسئلہ تھا حل ہو چکا۔ اب تم اس کی تیاریاں کرو۔"
قائم خان مزید کچھ نہ کہہ سکا۔ اب اس کے اور امیر طغرل درمیان ایک انتہائی نازک رشتہ موجود تھا۔ قائم خان نے اس رشتے کی نزاکت کو بروقت محسوس کیا کہ ایک لڑکے سے اتنا خوف زدہ ہونا اور بار بار امیر طغرل کو مدد کیلئے پکارنا اس کے خاندانی مرتبے کو کم کردے گا۔ یہ سوچ کر قائم خان خاموش ہو گیا تھا۔

❊❊❊

سعدیہ خانم بہت نحیف و نزار ہو چکی تھی۔ بیٹے کی جدائی کے دس سال جس ذلت و رسوائی کے ساتھ برباد ہوئے سعدیہ خانم کو اس کا بہت قلق تھا اور دن رات کی اسی سوچ نے ایک غمزدہ ماں کو وقت سے پہلے ہی بوڑھا کر دیا تھا۔
ایک دن شجاع الدین کامران گھر پہنچا تو وہ دوبارہ جی اٹھی۔ بیٹے میں تو اس خیال ہی سے مایوس ہو چکی تھی کہ اپنی نظروں سے تجھے آزادانہ حیثیت سے اتنے قریب دیکھ سکوں۔ وہ کامران کو گلے لگائے ہوئے زارو قطار رو رہی تھی۔

شجاع الدین کامران نے کوئی جواب نہیں دیا۔
کیوں نہیں بیٹے؟" سعدیہ خانم اس دوران محسوس کر رہی تھی کہ شجاع الدین کامران جذبات سے بالکل عاری نظر آ رہا ہے بس ایک لکڑی یا پتھر کا انسان ہے جو اس کی آغوش میں سمٹ گیا ہے۔
میں کیا کہوں ماں؟ آخر کامران نے اپنے ہونٹوں کو جنبش دی۔ "میری یہاں کون سنتا ہے؟" کامران کا لہجہ تلخ تھا۔ میں جنہیں معاف کرتا ہوں وہی مجھے دھمکیاں دیتے ہیں۔ جن کی گردنیں میری تلوار کی زد پر تھیں جنہیں میں نے زندگی بخشی، وہی میرے لئے زنداں کے دروازے کھولتے رہتے ہیں یا پھر مقتل سجائے رہتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ ابھی میری کچھ سانسیں باقی ہیں جنہیں کئی طاقتور انسان مٹانے کی کوشش کر رہے ہیں، مگر ابھی آسمانوں پر میری موت واقع نہیں ہوئی ورنہ اب تک آپ کا یہ بیٹا کئی بار قتل ہو چکا ہوتا۔"
"وہ تجھے نہیں مار سکتے کامران کہ تیرا محافظ تو کوئی اور نہیں خدا ہے۔" سعدیہ خانم نے برگشتہ اور ناراض بیٹے کے مشتعل جذبات کو سرد کرنے کی کوشش کی۔
"میں جانتا ہوں ماں خوب جانتا ہوں۔" شجاع الدین کامران نے کہا۔ اگر اس ذات کی نگہبانی پر میرا ایمان نہ ہوتا تو میں موت کی پرہول وادیوں سے اتنی آسانی کے ساتھ کس طرح واپس آ جاتا۔ مگر میں اس زندگی کا کیا کروں مادر گرامی جو اس سے بھی بدتر ہے۔"
"نہیں بیٹے ایسا نہیں سوچتے، زندگی بہر حال موت سے بہتر ہے۔ ابھی تجھے بہت کچھ کرنا ہے۔ سعدیہ خانم کامران نے جذبات کو اعتدال میں لانا چاہتی تھی۔ جب تو نے کچھ نہیں کیا تو پھر اتنا شرمسار کیوں ہے؟ موت تو انہیں بھی آنی ہے جو مسلسل گناہ کر رہے ہیں۔"
وہ کیوں موت طلب کریں گے کہ ان کی زندگی کا مقصد گناہ ہے۔ "شجاع الدین کامران بھڑک اٹھا۔" وہ اپنے گھروں میں آباد ہیں اور انہوں نے تمام سادہ دل لوگوں کو دوزخ میں جھونک دیا ہے۔ میں نے چوری کا داغ مٹانے کی کوشش کی تو ان لوگوں نے میرے دامن پر اتنے داغ لگا دیئے کہ دریائے جمنا کا پانی بھی انہیں صاف نہیں کر سکتا۔ اپنی ایک سزا کے خلاف احتجاج کرنے گیا تھا تو بیک وقت سزائیں نازل ہو گئیں۔ پڑوسیوں اور بچپن کے دوستوں نے میرے جرائم پر شہادت پیش کی۔ اب کس رشتے کا اعتبار کروں؟ قائم خان نے تو میرے لئے عمر قید کا اہتمام کیا تھا، مگر سلطان غیاث الدین بلبن نے عنایتوں کا دروازہ کھول دیا کہ شاید یہ مجرم اپنی اصلاح کر لیں۔" اذیت و کرب

کو برداشت کر کے شجاع الدین کامران کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔
''مادر گرامی یہ کسی بے گناہ انسان کی رہائی نہیں یہ تو بلبن کی دی ہوئی بھیک ہے۔'' سوز دروں سے کامران کا سینہ جل رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں نادیدہ آگ کے شعلوں کا عکس نظر آرہا تھا۔ ''قید خانے سے باہر آیا ہوں تو شناساؤں کا زاویہ نظر کچھ اور بدل گیا ہے۔ ان کی آنکھوں میں میرے لئے بڑی حقارت ہے۔ اب ان کی انگلیاں جس انداز سے اٹھی ہیں' میں انہیں برداشت نہیں کر سکتا۔''
''تجھے برداشت کرنا ہوگا کامران۔'' سعدیہ خانم نے بیٹے سے التجا کی۔
''نہیں ماں اسے برداشت نہیں کہتے۔'' شجاع الدین کامران اچانک سرکش نظر آنے لگا تھا۔ یہ بے حسی اور بے غیرتی کی ایک شکل ہے' جسے کم ہمت لوگوں نے برداشت کا نام دے دیا ہے۔''
''تو پھر تیرے کیا ارادے ہیں؟'' سعدیہ خانم کے چہرے پر موت کی سی زردی چھانے لگی تھی۔ ''کیا قائم خان سے دوبارہ انتقام لے گا؟ کیا اپنے خلاف گواہیاں دینے والوں کی زبانیں کاٹ دے گا؟ آخر تو یہ کیوں چاہتا ہے کہ تیری ماں مسلسل گردش وقت کے صلیب پر لٹکی رہے یا زمانے کی سفاک تلواریں آہستہ آہستہ اس کے ناتواں جسم کو کاٹتی رہیں۔ میری طرف دیکھ بیٹے ماں کے بدن میں خون کے چند قطرے باقی رہ گئے۔ ستمگروں کی یہ جماعت بہت پیاسی ہے۔ ایک لاغر عورت اپنے پانی جیسے لہو سے کس کس کی پیاس بجھائے گی۔ مجھ پر رحم کر کامران کہ تیری ماں بہت مظلوم ہے۔''
''میں کسی کی زبان نہیں کاٹوں گا کہ میرے نزدیک وہ انسان کی زبان نہیں ہے اور قائم خان سے انتقام بھی نہیں لوں گا کہ ایک بار اسے معاف کر چکا ہوں۔'' کامران نے اسی ناراض لہجے میں کہا۔
''پھر تو کیا کرے گا؟'' سعدیہ خانم کی ذہنی کشمکش ناقابل بیان تھی۔
''سلطان غیاث الدین بلبن نے میری اسیری کی زندگی کا خاتمہ کیا ہے' اس لئے میں سلطان کا شکریہ ادا کرنے جاؤں گا اور اس سے درخواست کروں گا کہ مجھے فوج میں شامل کر کے ملک کی سرحدوں پر بھیج دے۔ وحشی مغلوں کی یورشیں بڑھتی ہی جارہی ہیں۔ میں تاتاریوں کا مقابلہ کروں گا۔ ان خونیں معرکوں میں یا تو میری داغدار زندگی ٹھکانے لگ جائے گی یا پھر میں اپنے ناکردہ گناہوں کا کفارہ ادا کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔''
''اور ماں کو تنہا چھوڑ جائے گا؟'' سعدیہ خانم نے بڑے کرب ناک لہجے میں فریاد کی۔
''ماں آپ تنہا کیوں ہوں گی؟'' شجاع الدین کامران نے انتہائی نرم لہجے میں کہا۔ یہ ایک ماں کیلئے شدید جذباتی لمحہ تھا۔ کامران اس قدر محبت کرنے والی ماں کو زیادہ رلانا نہیں چاہتا تھا۔ ''آپ ایک سپاہی کی بیوی تھیں اور آپ کو بہت پہلے سے اس بات کا علم تھا کہ سپاہیوں کا کیا انجام ہوتا ہے۔ بے شک آپ کا بیٹا اب تک سپاہی نہ بن سکا' مگر بزرگوں کی نسبت سے وہ بھی اول و آخر ایک سپاہی ہے اور سپاہی اسی لئے پیدا ہوتے ہیں کہ ایک دن سب کچھ چھوڑ کر محاذ جنگ پر چلے جائیں۔ موت پر صرف خدا کا اختیار ہے۔ وہ جب چاہتا ہے تو شہنشاہوں کا ریشمی بستر بھی زہریلے کانٹوں کا جنگل بن جاتا ہے۔ طبیبوں اور مسیحاؤں کی ایک فوج اپنے ہاتھوں میں نایاب دواؤں کا ذخیرہ لئے کھڑی رہتی ہے اور جانے والا اس طرح چلا جاتا ہے کہ جیسے کوئی بھکاری دنیا سے گزر گیا۔ چیختا ہوا' گڑگڑاتا ہوا اور اپنے غم گساروں سے چند سانسوں کا سوال کرتا ہوا۔''
سعدیہ خانم خاموش ہوگئی۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔

سلطان غیاث الدین بلبن نے ٹھاکر کرشن راؤ کی نیندیں حرام کر دی تھیں۔ سلطان ناصرالدین محمود کے بائیس سالہ دورِ حکومت میں اس نے مسلمانوں کے اقتدار کے خلاف چھوٹی بے شمار سازشیں کی تھیں۔ جنگلی لٹیروں کے ساتھ مل کر وہ ایک بڑی سازش کا منصوبہ ترتیب دے رہا تھا کہ اچانک نرسنگا سے اس کے دوستانہ تعلقات ختم ہو گئے۔ اگرچہ کرشن راؤ کی زندگی آرام و آسائش کے ساتھ گزر رہی تھی لیکن ہمہ وقت نرسنگا کا خوف اس کے اعصاب پر مسلط رہتا تھا۔

پھر جب سلطان غیاث الدین بلبن نے سازش کرنے والوں کو بھیانک عذاب کی خبر دی تو ٹھاکر کرشن راؤ کو اپنی لاش دہلی کے کسی پرہجوم چوراہے پر لٹکتی ہوئی نظر آنے لگی۔ ٹھاکر مسلسل کئی راتوں تک نہیں سو سکا۔ بس شراب پی کر اپنے معتمد خاص پجاری رام سروپ سے مشورے کرتا رہا۔ پجاری پر بھی خوفِ مرگ طاری تھا۔ دونوں کی نظروں کے سامنے ان کے اپنے سیاہ اعمال ناچ رہے تھے۔

آخر کئی دن تک سرگوشیاں کرنے کے بعد ٹھاکر کرشن راؤ نے پجاری رام سروپ سے کہا۔

"پجاری میرا مشورہ یہی ہے کہ کچھ دن کیلئے اپنا خدا بدل ڈالو"

رام سروپ وحشت زدہ نظر آنے لگا۔ "آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں ٹھاکر؟"

"میں زمانے کی زبان بول رہا ہوں رام سروپ' وہ زبان جس کے پیچ و خم کو میرے سوا کوئی نہیں سمجھ سکتا۔" یہ کہتے کہتے ٹھاکر کے ماتھے پر کئی بل پڑ گئے تھے۔

پجاری رام سروپ آنکھیں پھاڑے کرشن راؤ کو دیکھ رہا تھا۔

"یہ تبدیلی عارضی ہوگی۔" کرشن راؤ نے اپنے منصوبے کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے پنڈت بدری ناتھ نے بتایا ہے کہ غیاث الدین بلبن زیادہ سے زیادہ دو سال تک زندہ رہے گا۔ اس کی موت مغلوں سے جنگ کرتے ہوئے واقع ہوگی' پھر بلبن کے مرتے ہی ہندوستان میں ہر طرف انتشار پھیل جائے گا۔"

پنڈت بدری ناتھ کی پیش گوئی سن کر پجاری رام سروپ کی جان میں جان آئی۔

"اگر ہم صرف دو سال کیلئے اپنا خدا بدل ڈالیں تو اس سے ہمارے عقائد میں کوئی خلل واقع نہیں ہوگا۔ ٹھاکر کرشن انتہائی منافقانہ لہجے میں گفتگو کر رہا تھا۔ ہم ہندو دھرم کی بقا اور خدمت کیلئے مسلمان ہو رہے ہیں۔ ہمارے دماغوں میں دیوتاؤں کے مجسمے نصب ہوں گے۔ کانوں میں مندر کی گھنٹیوں' کیرتنوں اور بھجنوں کی آوازیں گونجتی رہیں گی اور دلوں میں نفرتوں کا وہی جذبہ زندہ رہے گا کہ ہمیں اپنی دھرتی کو حملہ آوروں سے خالی کرانا ہے۔

"اور اگر پنڈت بدری ناتھ کی پیش گوئی درست ثابت نہیں ہوئی؟" پجاری رام سروپ نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"نہیں رام سروپ پنڈت بدری ناتھ ہندوستان کا سب سے بڑا گیانی ہے۔ ٹھاکر کرشن راؤ نے پرجوش لہجے میں کہا۔ "میں اس کی زبان سے ادا ہونے والے ایک ایک حرف پر ایمان رکھتا ہوں۔ سلطان ناصرالدین محمود کے بارے میں بھی پنڈت نے یہی کہا تھا کہ اس کا دورِ حکومت بدنظمی اور انتشار سے بھر جائے گا اور بدری ناتھ نے یہ کہا تھا کہ سلطان بیس بائیس سال تک زندہ رہے گا۔"

پجاری رام سروپ نے تسلیم و رضا کا اظہار کرتے ہوئے اپنی گردن جھکا دی۔

"اور اگر غیاث الدین بلبن زیادہ دن تک رہا تو اس سے کیا فرق پڑے گا؟ ٹھاکر کرشن راؤ کی ریاکاری اپنے عروج کو پہنچ گئی تھی۔ ہم مسجدوں میں جائیں گے' اذانیں دیں گے' نمازیں پڑھیں گے' مگر ہمارے سینوں میں صنم خانے آباد رہیں گے۔ یہی دھرم کی سیوا ہے اور اسی کا نام بھگتی ہے۔"

"بجا کہتے ہیں ٹھاکر آپ کی ذہانت نے ہمیں بڑی الجھنوں سے بچا لیا۔" پجاری رام سروپ کی گردن کچھ اور جھک گئی تھی۔

"اگر ہم نے ایسا نہیں کیا رام سروپ تو بلبن کی تیغ جفا ہمارے کاندھوں کو سروں کے بوجھ سے ہلکا کردے گی اور ہمارے بے لباس جسم شاہراہوں پر گھسیٹے جا رہے ہوں گے۔ نرسنگا سے قریبی تعلق رکھنے کے باعث ہم سلطان کے شدید قہر و غضب کا نشانہ بن سکتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ بلبن کو اپنی وفاداریوں کا یقین دلانے کیلئے ہم عارضی طور پر بتوں سے تمام رشتے توڑ ڈالیں۔ اسی میں ہماری نجات ہے۔"

اس کے بعد ٹھاکر کرشن راؤ نے پجاری رام سروپ کو ہدایت دی کہ وہ بڑے مندر کے تمام بھکتوں اور دیوداسیوں کو قبول اسلام کیلئے پوری رازداری کے ساتھ آمادہ کرے۔

❋❋❋

اس دوران شجاع الدین کامران نے اعلیٰ فوجی افسروں تک رسائی حاصل کی اور اپنا درد بیان کیا۔

"میں چاہتا ہوں کہ اسلام کے دشمنوں سے جہاد کرتے کرتے اپنی جان دے ڈالوں۔"

فوجی افسر کامران کے اس جذبے سے بہت متاثر ہوئے' مگر جب ملکی قوانین کے مطابق تحقیق کی گئی تو شجاع الدین کامران ایک سزا یافتہ مجرم ثابت ہوا اور ایسے کسی انسان کیلئے بلبن کی فوج میں کوئی جگہ نہیں تھی۔

کامران ایک بار پھر وحشتوں کا شکار ہو گیا۔ منفی سوچ نے ایک بار پھر اسے اکسایا کہ وہ سردار نرسنگا کے پاس واپس چلا جائے اور ان لوگوں کا جینا حرام کردے جو سادہ دل انسانوں کو شرافت کے حصار میں داخل نہیں ہونے دیتے۔ کئی دن تک کامران اپنے باغیانہ خیالات سے الجھتا رہا' یاسمین کی یادیں ہر وقت اس کا تعاقب کرتی رہتی تھیں اور ان ہی یادوں کی یلغار سے بچنے کیلئے وہ اپنے آپ کو جنگ میں مصروف رکھنا چاہتا تھا۔ پھر جب اس محاذ پر بھی اسے ناکامی ہو گئی تو اس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ دہلی چھوڑ کر چلا جائے گا اور بزرگان دین کے مزارات پر حاضری دے کر اپنے سکون قلب کیلئے دعائیں کرے گا۔ کچھ لوگوں نے کامران کو بتایا تھا کہ درویشوں کے حلقے میں سکون کی دولت تقسیم ہوتی ہے۔

اسی خیال کے پیش نظر شجاع الدین کامران نے حضرت خواجہ غریب نوازؒ کے خلیفہ اکبر حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مزار پر حاضری دی۔ وہاں پہنچ کر اس کے منتشر ذہن اور مضطرب دل کو قرار سا آ گیا۔ کامران حضرت قطبؒ کے مزار کے سجادہ نشین سے بھی ملا۔ اس مرد بزرگ نے ایک پریشان حال نوجوان کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"اگر تم اجمیر جا کر سلطان الہند خواجہ معین الدین چشتیؒ کے دربار میں حاضری دو اور اپنے خدا سے سکون طلب کرو تو مجھے یقین ہے کہ تم خالی ہاتھ نہیں لوٹو گے۔"

کامران نے طے کرلیا کہ وہ اپنی باقی زندگی اسی طرح گزار دے گا۔

"یہ تو زندگی سے فرار ہے بیٹے۔" سعدیہ خانم نے کامران کے خیالات سن کر کہا۔ پھر تیری بوڑھی ماں کا کیا ہوگا؟ کیا تجھے اپنی جنت میں رہ کر سکون حاصل نہیں ہو سکتا۔ ماں کی خدمت بھی تو بڑی عبادت ہے۔ کیا تو نہیں جانتا کہ اس عبادت کو ترک کرنے والا خدا کے نزدیک کس قدر ناپسندیدہ ٹھہرتا ہے؟"

"جانتا ہوں مادر گرامی خوب جانتا ہوں۔" کامران نے مؤدب لہجے میں کہا۔

"پھر تو درویشوں کے حلقے میں کیوں جانا چاہتا ہے۔ سعدیہ خانم نے کامران سے سوال کیا۔ "تیری ماں بھی تو درویش ہے۔ اس کے قدموں سے لپٹ کر رہ جا' پھر تجھے سکون کی ساری دولت مل جائے گی جو دنیا کے کسی خزانے میں

موجود نہیں۔'' اس پر شجاع الدین کامران سناٹے میں آ گیا۔

''تجھے کسی نے یہ نہیں بتایا کہ ماں کی رضا حاصل کئے بغیر۔ خواجہ غریب نوازؒ اور قطب الدین بختیار کاکیؒ بھی تیری حاضری کو قبول نہیں کریں گے۔'' سعدیہ خانم نے روتے ہوئے کہا۔ ''افسوس تو یہ راز نہیں جانتا کہ حضرت خواجہؒ اور حضرت قطبؒ ماں باپ کی تھکا دینے والی خدمت اور بے مثال فرمانبرداری کے بعد اس مقام تک پہنچے ہیں۔ پھر تو کس درویش کے پاس جا رہا ہے؟ اگر میں تجھ سے خوش نہیں ہوں تو وہ بھی تجھے ٹھکرا دیں گے۔

''میں ہمیشہ کیلئے نہیں جا رہا ہوں مام۔'' کامران کی آواز لرزنے لگی تھی۔ سعدیہ خانم کی گفتگو نے اس کے جذبات میں دنیا کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیا تھا۔ ''بس ایک طوفان آ جائے' پھر میں واپس آ جاؤں گا۔ مجھے بس اتنی اجازت دے دیجئے کہ اپنے آپ کو سمیٹ سکوں۔ مادر گرامی میں بہت بکھر گیا ہوں۔''

❊❊❊

اور پھر اس طوفان کے گزر جانے کا وقت بھی آ گیا۔

امیر طغرل اور یاسمین خانم کی شادی کا اعلان کر دیا گیا تھا۔

جب شادی کے دعوت نامے تحریر کئے جا رہے تھے تو قائم خان نے کاتب کو حکم دیتے ہوئے کہا۔

''ایک دعوت نامے پر سعدیہ خانم اور شجاع الدین کامران کا نام بھی لکھ دو۔''

''یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟'' زرتاج خانم نے چونک کر کہا۔

''میں شادی کے اس جشن میں بہت زیادہ ہنگامہ خیزی چاہتا ہوں۔'' قائم خان کے چہرے پر غرور و تکبر کے عجیب عجیب رنگ ابھر آئے تھے۔ اور یہ ہنگامہ خیزی اسی وقت ممکن ہے جب وہ دونوں ماں بیٹے بھکاریوں کا لباس پہنے' سب سے پچھلی قطار میں کھڑے اپنی ناپاک حسرتوں کا خون ٹپکتا ہوا دیکھ رہے ہوں۔ کم سے کم انہیں اندازہ تو ہو جائے کہ قائم خان کی بیٹی کا رشتہ مانگنے والے کتنے حقیر ہیں؟''

❊❊❊

یاسمین خانم کی شادی کا دعوت نامہ دیکھ کر شجاع الدین کامران کے ہوش وحواس گم ہو گئے۔ اسے یہ تو یقین تھا کہ ایک دن یاسمین رشتہ ازدواج میں منسلک ہو کر ظاہری طور پر بھی اس سے جدا ہو جائے گی۔ مگر قائم خان کا طرزِ عمل بہت زیادہ غیر متوقع بھی تھا اور جارحانہ بھی۔ کامران نے سوچا بھی نہ تھا کہ اس کا سفاک ماموں اچانک اس طرح بدل جائے گا۔

''وہ ہمیں نئے نئے انداز سے ذلیل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔'' شادی کا دعوت نامہ دیکھ کر سعدیہ خانم نے انتہائی کرب ناک لہجے میں کہا۔ ''شاید ابھی بھائی صاحب کے حیوانی جذبوں کی تسکین نہیں ہوئی ہے۔ وہ ہمیں بڑے لوگوں کے ہجوم میں بلا کر دنیا کو یہ تماشا دکھانا چاہتے ہیں کہ ان کی بیٹی کتنی بڑی شخصیت سے وابستہ ہو رہی ہے۔''

''یہ تو ساری دنیا کو معلوم ہے کہ امیر طغرل سلطان غیاث الدین بلبن کا غلام ہے اور اس کے اقتدار میں مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔'' شجاع الدین کامران نے اپنے خوابوں کے محل پر آخری ضرب اس طرح برداشت کرنے کی کوشش کی کہ اس کے منہ سے کوئی چیخ نہ نکلے۔ مگر وہ ایک جذباتی انسان تھا' چیخ تو نہیں سکا لیکن پھر بھی اس کی آواز میں ہلکی سی لرزش موجود تھی۔ ''آخر اس تماشے سے ہمارا کیا تعلق ہے' وہ بھری محفل میں ہمیں کس طرح ذلیل کرے گا؟ کیا وہ امرا اور وزراء کے سامنے ہمارے نام لے کر ہمیں رسوائی کا طوق پہنائے گا؟'' شجاع الدین کامران نے بڑی سادگی سے کہا۔

''تو بہت نادان ہے میرے بیٹے!'' سعدیہ خانم کی آنکھوں میں نمی سی جھلکنے لگی۔ ''قائم خان اہلِ محفل سے تعارف کرانے کے بعد ہمارے چہروں پر سیاہی نہیں ملے گا۔ وہ تو صرف ہماری بے کسی اور نامرادی کا مشاہدہ کرنا چاہتا ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ ہم اپنے بوسیدہ لباسوں کے ساتھ تقریب میں جائیں اور پھر ہمارا شمار دہلی کے محتاج لوگوں میں ہو یا گداگروں میں' بڑے گھرانوں کی ایک مخصوص رسم یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ شادی کے مواقع پر غریب' بے سہارا اور چھوٹے لوگوں میں صدقہ وخیرات تقسیم کرتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ قائم خان ہمیں بھی اسی قطار میں کھڑا کرے اور اپنے ملازموں کو خاندانی رسم کی ادائیگی کا حکم دے۔''

سعدیہ خانم ابھی کچھ اور کہنا چاہتی تھی کہ شجاع الدین کامران مشتعل ہو کر بول اٹھا۔ ''کیا آپ سمجھتی ہیں کہ ہم اپنی اس توہین کو خاموشی سے برداشت کرلیں گے۔ خدا کی قسم اس کی پوری محفل ایک ایسے ہنگامے کی نذر ہو جائے گی جسے قائم خان اپنی آخری سانس تک نہیں بھول سکے گا۔''

''نہیں بیٹے ہم کسی کی خوشی سے حسد نہیں رکھتے۔'' سعدیہ خانم نے کامران کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو محض ایک قیاس ہے' بھائی صاحب! آج تک ہمارے ساتھ جس اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے آئے ہیں' اسے دیکھ کر یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے سب سے مسرت انگیز لمحات میں ہمیں بھی یاد رکھیں گے اور خوشی کے اس یادگار موقع پر وہ اپنی

نوازشیں اور مہربانیاں نئے انداز سے تقسیم کریں گے۔" سعدیہ خانم کی زبان سے ادا ہونے والا ایک ایک لفظ اس کے ماضی کا مرثیہ تھا' مگر سننے والا یہی سمجھتا کہ وہ اپنی بھتیجی کی شادی کے موقع پر کیف ونشاط میں ڈوبا ہوا کوئی جانفزا نغمہ گا رہی ہے۔

"ہم ان کی کسی عنایت خسروانہ کو قبول نہیں کریں گے۔" شجاع الدین کامران نے شرربار لہجے میں کہا۔ "نہ ہم اچھوت ہیں' نہ بھکاری' ان سے بہتر نسب نامہ رکھتے ہیں۔ زمانے کی گردش نے ہمارے خاندانی پس منظر کو مسخ کر دیا' مگر پھر بھی ہمارا حوالہ قائم خان کے حوالے سے بڑا حوالہ ہے۔" اس قدر شکستگی کے بعد بھی کچھ دیر کے لئے شجاع الدین کامران کا نسلی غرور لوٹ آیا تھا۔

بیٹے کی سادگی دیکھ کر سعدیہ خانم کی آنکھوں کی نمی کا عکس کچھ اور گہرا ہو گیا۔ "یاسمین کی شادی میں بلا کر بھائی صاحب ہمیں یقین دلانا چاہتے ہیں کہ ہمارے اور ان کے درمیان بہت بڑا معاشرتی فرق ہے۔ ایک صاحب اختیار امیر اور ایک یتیم بچہ کی مانگ میں کوئی نسبت نہیں ہوتی۔ شاید قائم خان نے یہی سوچا ہے کہ میری آنکھوں میں جو دو چار آنسو بچ گئے ہیں' وہ ان کی عظیم الشان حویلی کے صحن میں بہہ جائیں۔ جتنی چیخیں اور کراہیں سینے میں گھٹ کر رہ گئی ہیں وہ ہونٹوں کی قید سے آزاد ہو جائیں۔ مگر میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ بیٹے جو دروازے ہمارے لئے بند ہو گئے' سو بند ہو گئے اور جدھر پیٹھ کر لی' ادھر مڑ کر کیا دیکھنا؟ اگر سعدیہ خانم کی موت کا وقت قریب آ جائے اور کوئی یہ کہے کہ قائم خان کے یہاں زندگی تقسیم ہو رہی ہے تو میں ایسی زندگی کو بھی ٹھوکر مار دوں گی۔ بھائی صاحب نے مجھ غم زدہ سے بڑا اذیت ناک مذاق کیا ہے۔ خدا انہیں ہدایت دے کہ اقتدار اور خوشی بہت ناپائیدار چیزیں ہیں۔ خدا اس بچی کی بھی حفاظت کرے جسے ماں باپ کی تربیت نے گمراہ کر دیا ہے۔ قائم خان یہ کیسی تجارت کر رہا ہے۔ میں اپنے اللہ کی پناہ مانگتی ہوں۔"

اب سعدیہ خانم کے آنسو پلکوں کے حصار سے نکل کر رخساروں پر بہنے لگے تھے۔

"مگر میں وہاں جاؤں گا مادر گرامی!" شجاع الدین کامران کے چہرے پر نفرت وغضب کی پرچھائیاں لرز رہی تھیں۔ میں اتنا کمزور انسان نہیں ہوں کہ قائم خان کی ایک بزدلانہ ضرب سے ٹوٹ کر بکھر جاؤں۔"

"کامران تجھے کیا ہو گیا ہے؟" سعدیہ خانم نے ناراض لہجے میں کہا۔ "تو نے جس لڑکی کی خاطر اپنی زندگی سے کیا ہوا عہد توڑ دیا' روز وشب بدل ڈالے' حسرت وارمان کے کئی مقبرے تعمیر کر لئے' اسی لڑکی کے گھر جا رہا ہے۔ جس کے در ودیوار نے تجھے زخم' رسوائی اور نفرت وآزار کے سوا کچھ نہیں دیا۔"

"ہاں مام میں اسے آخری بار دیکھنا چاہتا ہوں۔" شجاع الدین کامران کے ذہن میں یادوں کی آندھیاں چلنے لگیں' مگر اس کی زبان نہیں لڑکھڑائی۔ "میں اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہوں کہ یاسمین اس رشتے سے کتنی خوش ہے یا پھر وہ اپنے دنیا پرست باپ کے ہاتھوں کس قدر مجبور کر دی گئی ہے؟"

سعدیہ خانم کانپ کر رہ گئی۔ ایک بار پھر اس کے سامنے زنجیریں لہرانے لگی تھیں۔ وہ زنجیریں جو کئی سال سے کسی منتقم مزاج سانپ کی طرح اس کے بیٹے کے تعاقب میں تھیں۔

"خدا کے لئے کامران اپنی بدنصیب ماں پر رحم کر۔" سعدیہ خانم کا لہجہ گداگرانہ تھا۔ "تو پھر وہاں جائے گا اور کوئی نیا ہنگامہ کھڑا کر دے گا۔"

ماں نے اپنے خدشات کا اظہار کیا۔

"ہنگامہ تو اسی دن ختم ہو گیا [illegible] سے اپنی تلوار ہٹالی تھی۔" شجاع الدین

کامران نے بے نیازانہ کہا۔ "اب یاسمین کے رشتے سے میرے اور قائم خان کے درمیان ہنگاموں کی کوئی فصل نہیں پھوٹے گی۔ جذبات کی فضا میں آگ برس رہی ہے اور دل کی زمین کئی سالوں سے قحط آب کا شکار ہے۔ میں تو صرف تماشا دیکھنے جاؤں گا۔ قائم خان کی پستیوں کا تماشا اور اپنی محرومیوں کا تماشا' بس ایک بار مجھے وہاں جانے کی اجازت دے دیجئے' میں آپ کی محترم ذات کو درمیان میں لا کر قسم کھاتا ہوں کہ اس تقریب میں میرا وجود عدم برابر ہوگا۔ کسی پتھر کی طرح بے حس و حرکت اور کسی تالاب کے پانی کی طرح خاموش۔"

سعدیہ خانم بیٹے کی خواہش کے آگے مجبور ہوگئی اور اس نے کامران کو قائم خان کے یہاں جانے کی مشروط اجازت دے دی۔

❋❋❋

یاسمین خانم کی شادی بڑی ہنگامہ خیز تھی۔ قائم خان نے ایک ایک گوشے اور ایک ایک روش کو آراستہ کیا تھا۔ حریص باپ نے اس امید میں اپنی جمع شدہ ساری دولت خرچ کر ڈالی تھی کہ عنقریب اصل رقم بہت بڑے سود کے ساتھ اس کے خزانے میں واپس لوٹ آئے گی۔

تقریب میں دہلی کی تمام قابل ذکر شخصیات شریک ہوئی تھیں۔ اس کا سبب امیر طغرل کے سیاسی اثرات نہیں بلکہ سلطان غیاث الدین بلبن کی شمولیت تھی۔ بلبن امیر طغرل کی وجہ سے مجبور تھا اور فرمانروائے ہند کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے تمام طاقتور امراء اپنے اپنے نفس سے مجبور تھے۔ پھر ان ہی مجبوریوں نے مل کر قائم خان کی تقریب کو یادگار بنا دیا تھا۔

شجاع الدین کامران حویلی تک تو پہنچ گیا' مگر اندر داخل نہ ہوسکا۔ سلطان غیاث الدین بلبن کی موجودگی کے باعث حفاظتی انتظامات بہت سخت تھے۔ قائم خان خود دروازے پر کھڑا امیروں اور وزیروں کا استقبال کر رہا تھا۔ اس نے کئی بار شجاع الدین کامران کو بہت دور سے دیکھا جو آگے بڑھنے کیلئے محافظوں سے اجازت طلب کر رہا تھا اور محافظ اسے سمجھا رہے تھے کہ امراء کے علاوہ حویلی کے اندر کوئی دوسرا شخص نہیں جا سکتا۔ کچھ دیر بعد کامران نے محسوس کیا کہ اس کے گرد اور بھی بہت سے لوگ جمع ہو گئے ہیں جو اپنے حلیے کے اعتبار سے مفلس و نادار نظر آ رہے تھے۔ پھر اس نے اپنی قطار میں کھڑے ہوئے بدحال انسانوں کا شور سنا۔ وہ چیخ چیخ کر صاحب خانہ کو شادی کی مبارکباد دے رہے تھے اور بار بار قائم خان کی بلند اقبالی کے لئے دعائیں کر رہے تھے۔

شور سن کر وقفے وقفے سے قائم خان کے ملازمین آتے تھے اور چاندی کے سکے لٹا کر چلے جاتے تھے۔ آسودگی کی چند سانسوں کے لئے ترسی ہوئی یہ مخلوق تنکوں (سکوں) پر جھپٹ پڑتی اور زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی کشمکش میں ایک دلچسپ تماشا بن کر رہ جاتی۔ قائم خان اور دوسرے امراء کچھ فاصلے سے اس منظر کو دیکھتے اور ایک خاص لذت محسوس کرتے۔ اہل ثروت کی شادیوں کی رونق بڑھانے کے لئے یہ مخصوص کھیل کھیلا جاتا تھا۔ قائم خان بھی محتاجوں کی جماعت سے یہی کھیل کھیل رہا تھا۔ اس کے خدمت گار چاندی کے سکے لٹا رہے تھے اور دریدہ لباس آدم زادان سکوں کو پانے کے لئے اپنے ہی ہم جنسوں کے کپڑے پھاڑ رہے تھے۔

اس دوران کچھ سکے شجاع الدین کامران کے پیروں میں بھی آ کر گرے۔ اس نے بڑی عجیب نظروں سے قائم خان کے خدمت گاروں کو دیکھا۔ پھر وہ اچانک لڑکھڑا گیا اور زمین پر گرتے گرتے بچا۔ کامران کے قریب کھڑے ہوئے کچھ لوگ ان سکوں کو اٹھانے کے لئے تیزی سے جھپٹے تھے اور اسی تصادم میں کامران نے اپنا توازن کھو دیا تھا۔ پھر وہ بڑی مشکل سے سنبھلا۔ اب اسے ہر طرف اپنی ماں سعدیہ خانم کے الفاظ کی گونج سنائی دے رہی تھی۔

"قائم خان نئے زاویے سے ہمیں آزار پہنچانا چاہتا ہے۔"

شجاع الدین کامران نے محتاجوں اور بھکاریوں کی قطار سے نکل کر قائم خان کی حویلی کے جگمگاتے ہوئے در و بام کو دیکھا اور آہستہ قدموں سے واپس لوٹ گیا۔ اس ہنگامے میں یاسمین خانم کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لینا تو درکنار وہ حویلی کے دروازے تک بھی نہیں پہنچ سکتا تھا۔ کامران کے ذہن میں نفرتوں کا غبار اٹھا اور پھر اسی دھند میں وہ اپنے گھر چلا آیا۔ سعدیہ خانم سیکڑوں اندیشوں کے ہجوم میں گھری ہوئی بڑی بے چینی کے ساتھ بیٹے کا انتظار کر رہی تھی۔ کامران کو صحیح و سلامت واپس آتا دیکھ کر اس کے بجھے ہوئے چہرے پر دھندلی سی روشنی پھیل گئی۔

"اے خدا تیرا شکر ہے کہ تو نے میرے اس سرکش بیٹے کو مزید آفتوں سے محفوظ رکھا۔" سعدیہ خانم زیر لب دعا کر رہی تھی۔ پھر جب شجاع الدین کامران اس کے قریب آیا تو وہ تلخ لہجے میں کہنے لگی۔

"تو نے یاسمین خانم کو دیکھ لیا؟ وہ کیسی نظر آ رہی تھی؟"

"بہت خوش تھی کسی ملکہ کی طرح۔" شجاع الدین کامران نے بے دلی سے جواب دیا۔ وہ یاسمین کے ذکر سے گریزاں نظر آ رہا تھا۔

"اب دوبارہ تو اس کے گھر نہیں جائے گا؟"

سعدیہ خانم نے اپنے غصے کو ضبط کرتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔"

شجاع الدین کامران نے مختصر سا جواب دیا اور گھر سے باہر جانے لگا۔

"بیٹے وہ طوفان گزر چکا اب کسی نئے طوفان کو اپنے شکستہ گھر سے گزرنے کی دعوت نہ دینا۔" سعدیہ خانم نے بیٹے کو سمجھانے کی کوشش کی۔ "اپنی بے ترتیب زندگی میں نظم و ضبط پیدا کر ورنہ آنے والا ایک ایک لمحہ طوفان بن جائے گا۔"

شجاع الدین کامران نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خاموشی سے باہر نکلا اور دریائے جمنا کی طرف چلا گیا۔

❊❊❊

انتہائی کوشش کے باوجود کامران اپنی اس خواہش پر قابو نہ پا سکا کہ وہ یاسمین خانم کو لباس عروسی میں دیکھے اور اس سے پوچھے کہ ایک امیر کی بیوی بننے کے بعد اس کے محسوسات کیا ہیں؟ کامران یہ بھی چاہتا تھا کہ وہ یاسمین کے شوہر امیر طغرل سے ملے اور اس کی شخصیت کا جائزہ لے۔ پھر اندازہ کرے کہ محبت کی بساط پر اسے شکست دینے والا کتنا طاقتور ہے؟ کئی دن تک شجاع الدین کامران کے ذہن میں منتشر خیالات کی آندھیاں چلتی رہیں۔ پھر آندھیوں کا زور اتنا بڑھا کہ اس کے قدم زمین سے اکھڑ گئے اور وہ امیر طغرل کے مکان کی طرف اس طرح بڑھ گیا جیسے کوئی تنکا اڑا جا رہا ہو۔

امیر طغرل کے قصر زرنگار پر محافظوں اور پہرے داروں کا ہجوم تھا۔ کامران کچھ دیر تک مبہوت کھڑا اس محل کو دیکھتا رہا جس کے برجوں کی اونچائی ناپتے ناپتے انسانی نگاہ تھک جاتی تھی۔ محل کے سامنے ایک افلاس زدہ نوجوان کو دیکھ کر امیر طغرل کا ایک محافظ آگے بڑھا اور اس نے کامران سے انتہائی سخت لہجے میں پوچھا۔

"تو کون ہے اور یہاں کیوں آیا ہے؟"

"میں یاسمین خانم سے ملنا چاہتا ہوں۔ میرا نام شجاع الدین ہے اور میں رشتے میں ان کا بھائی ہوں۔"

کامران کے لہجے میں بڑا اعتماد تھا

امیر طغرل کے محافظ نے گہری نظروں سے اس نوجوان کو دیکھا جس کے غربت زدہ حلیے نے اس رشتے کو مشکوک بنا دیا تھا۔ پھر چند لمحوں بعد محافظ خاموشی کے ساتھ اندر چلا گیا اور اس نے اپنے آقا امیر طغرل کو اطلاع کر دی۔

اتفاق سے اس وقت قائم خان بھی وہاں موجود تھا۔ جیسے ہی محافظ نے کامران کی آمد کی خبر دی وہ بدحواس ہو کر چیخ اٹھا۔

"آنے والے کو دھکے دے کر نکال دو۔ اس آوارہ لڑکے سے ہمارا کوئی رشتہ نہیں ہے۔"

محافظ نے قائم خان کا وحشت زدہ حکم سن لیا تھا مگر وہ اپنے آقا کے جواب کا منتظر تھا اور امیر طغرل اپنے خسر قائم خان کے چہرے کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔

بڑی عجیب سی فضا تھی۔ قائم خان کی گھبراہٹ میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور امیر طغرل کی چھوٹی مگر تیز آنکھیں اس تحریر کو پڑھنے کی کوشش میں مصروف تھیں جسے اس کے خسر نے کوئی عنوان دینے سے انکار کر دیا تھا۔

پھر ایک طویل وقفہ سکوت کے بعد امیر طغرل کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔

"اس نوجوان کو اندر لے آؤ' وہ لاکھ آوارہ سہی مگر ہم اپنی بیگم کے بھائی سے مل کر بہرحال خوشی محسوس کریں گے۔" امیر طغرل کی آواز کچھ تو فطری طور پر کرخت تھی اور کچھ اس نے جان بوجھ کر اپنے لہجے کو سخت بنا لیا تھا۔

جیسے ہی محافظ کمرے سے باہر نکلا' قائم خان جھنجلا کر اپنے داماد سے کہنے لگا۔ "طغرل تم بزرگوں کے سامنے نافرمانی کے مرتکب ہو رہے ہو جس شخص سے میرا کوئی رشتہ نہیں تمہیں اس سے تعلق کی کیا ضرورت ہے؟" قائم خان کی آواز اعتدال سے زیادہ بلند تھی۔

امیر طغرل کے چہرے پر ناگواری کا رنگ ابھر آیا۔ "میں اپنی ضرورتوں کو دوسرے لوگوں سے زیادہ بہتر سمجھتا ہوں۔" امیر کے لہجے میں بظاہر ٹھہراؤ تھا' مگر اس میں ایک تضحیک کی کیفیت بھی پوشیدہ تھی۔ قائم خان کو پہلی بار احساس ہوا تھا کہ اقتدار اور دولت کے بھاری قدم نازک رشتوں کے گلابوں کو بھی روند ڈالتے ہیں۔

قائم خان نے جھجکتے ہوئے اپنے داماد کی طرف دیکھا۔ وہ داماد جو بڑے مشغلوں میں کبھی اس کا ہم پیالہ و ہم نوالہ بھی رہ چکا تھا۔ امیر طغرل کی آنکھوں میں غرور و تکبر کا ایک ایسا رنگ نمایاں تھا جو کسی دوسرے رنگ کی موجودگی کو برداشت نہیں کرتا۔ یہاں تک کہ قائم خان کو اپنا اٹھا ہوا سر جھکانا پڑا۔

پھر کچھ دیر بعد ہی محافظ کے ساتھ کامران اندر داخل ہوا۔ امیر طغرل بے نیازی کے عالم میں کرسی پر بیٹھا ہوا اس نوجوان کو دیکھتا رہا جس کا لباس اس کی انتہائی غربت کو ظاہر کر رہا تھا۔ کامران کو بھی اس قصر زرنگار میں اپنی کم حیثیت کا احساس تھا' مگر اس نے امیر طغرل کی امارت کو اپنے افلاس پر حاوی نہیں ہونے دیا۔ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ آگے بڑھا' باآواز بلند سلام کیا اور امیر طغرل سے مصافحے کے لئے اپنا ہاتھ دراز کر دیا۔

امیر طغرل ایک متکبر انسان تھا۔ اس نے کامران کو اپنی شخصیت سے مغلوب کرنے کی کوشش کی اور سر کے اشارے سے سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کے لئے کہا۔ کامران کا ہاتھ ابھی تک آگے بڑھا ہوا تھا۔

"میں آپ کا مہمان ہوں' بھکاری نہیں۔" کامران نے امیر طغرل کی غیر اخلاقی روش پر اعتراض کرتے ہوئے کہا۔

امیر طغرل کے ماتھے پر کئی شکنیں ابھریں اور پھر اس نے بھی ایک رعونت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ اپنا ہاتھ

اندازہ کرلیا تھا کہ آنے والا اپنا ایک خاص مزاج رکھتا ہے۔ ایسا مزاج جس پر دولت و اقتدار کی قوتیں اثر انداز نہیں ہوتیں۔

کامران خاموشی کے ساتھ کرسی پر بیٹھ گیا اور پھر جیسے ہی اس نے اپنے دائیں جانب دیکھا' ایک شعلہ سا دل و دماغ میں بھڑک اٹھا۔ اس کا ماموں قائم خان بھی کچھ فاصلے پر اسی کمرے میں موجود تھا۔ کامران جب اندر داخل ہوا تھا تو اپنے باپ کی عمر کے ایک کم صورت شخص کو یاسمین خانم کے شوہر کے روپ میں دیکھ کر پریشان سا ہو گیا تھا اور اسی ذہنی انتشار کے سبب وہ اپنے گردوپیش کا بھی جائزہ نہیں لے سکا تھا۔ اگر وہ منتشر نہ ہوتا تو قائم خان بھی اسے سامنے بیٹھا ہوا نظر آ جاتا۔ اب وہ بدکرداریوں کا مجسمہ روبرو آیا تو باپ کے قتل سے لے کر اپنی دس سالہ قید کے سارے مناظر بیک وقت آنکھوں میں گردش کرنے لگے۔ کچھ دیر تک پلکیں جھپکائے بغیر وہ اپنے بے رحم ماموں کو دیکھتا رہا۔ کئی بار اس کے سینے میں دبے ہوئے منتقم لفظوں نے زبان پر آنا چاہا' مگر کامران نے یاسمین کے عزت و وقار کی خاطر اپنی تمام نفرتوں کا گلا گھونٹ دیا۔ ضبط کی یہ منزل بڑی جان لیوا تھی۔ کامران اس منزل سے گزر تو گیا مگر اس طرح کہ اس کا پورا جسم پسینے میں نہا گیا تھا۔ امیر طغرل نہایت اطمینان سے کامران اور اپنے خسر کے چہروں کا جائزہ لے رہا تھا۔ پھر جب کامران بظاہر کسی حد تک پرسکون نظر آنے لگا تو امیر طغرل اس سے مخاطب ہوا۔

''تم بیگم صاحبہ کے عزیز ہو؟'' امیر طغرل نے کامران سے پوچھا۔ ''تمہارا ان سے کیا رشتہ ہے؟'' امیر طغرل کا لہجہ بہت سرد تھا۔

''وہ میری حقیقی ماموں زاد بہن ہے۔'' کامران نے انتہائی سادگی سے جواب دیا۔ وہ امیر طغرل کی عیاریوں سے بے خبر تھا۔

''تم ہماری شادی میں موجود نہیں تھے۔'' یہ کہہ کر امیر طغرل نے قائم خان کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر وحشت کے گہرے سائے لرزنے لگے تھے۔

''میں آیا تھا مگر میرے ماموں کے وفادار محافظوں نے مجھے دروازے تک پہنچنے نہیں دیا۔'' کامران کا ایک ایک لفظ شدید طنز میں ڈوبا ہوا تھا۔ ''حویلی کے نگہبانوں نے شاید بھکاری سمجھ کر مجھے نظر انداز کر دیا۔''

امیر طغرل کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں سکڑ کر کچھ اور محدود ہو گئی تھیں۔ کچھ لمحوں تک وہ اپنے سر اور پاؤں دونوں کو مسلسل حرکت دیتا رہا۔ پھر یکایک اس نے اپنی ایک ملازمہ کو آواز دی۔ دوسرے ہی لمحے ایک جواں سال کنیز لرزتی کانپتی امیر کے کمرے میں داخل ہوئی اور دست بستہ سر جھکا کر کھڑی ہوئی۔

''بیگم صاحبہ کو اطلاع دو کہ ان کا بھائی کامران ملنے کے لئے آیا ہے۔'' امیر طغرل کی آواز میں وہی کم ظرف انسانوں کا سا تکبر تھا۔ کچھ دیر بعد یاسمین خانم کمرے میں داخل ہوئی تو کامران اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ قیمتی جواہرات سے مرصع لباس میں کسی اور ہی دنیا کی مخلوق معلوم ہو رہی تھی۔ کامران کا خیال تھا بڑھاپے کی سرحدوں پر کھڑے ہوئے انسان سے مستقل وابستگی کے عذاب نے یاسمین خانم کو بجھا کر رکھ دیا ہو گا۔ مگر حقیقتاً ایسا نہیں تھا۔ یاسمین کے چہرے کی شادابی ناقابل بیان تھی۔ اس کے قدم کسی حکمراں عورت کے انداز میں اٹھ رہے تھے۔ کامران گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یاسمین خانم جیسی لڑکی امیر طغرل جیسے بدنما انسان سے شادی کر کے اس قدر مطمئن ہو جائے گی۔

اچانک کامران کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اس نے اپنے جذبات پر قابو پانے کی بہت کوشش کی' مگر ناکام رہا۔ وہ کبھی یاسمین خانم کی طرف دیکھتا اور کبھی امیر طغرل کی جانب۔ کامران یاسمین سے کہنا چاہتا تھا کہ اگر مجھ سے

نفرت تھی تو کم سے کم ایسے شخص کا انتخاب کیا ہوتا جسے دیکھ کر دنیا والے بے ساختہ پکار اٹھتے کہ قائم خان کی بیٹی کے لئے اس سے بہتر شریک زندگی ممکن نہیں تھا۔ مگر امیر طغرل کا مکروہ چہرہ تو کوئی اور ہی داستان سنا رہا تھا۔ شجاع الدین کامران نے اپنے دل سے مجبور ہو کر احتجاج کرنا چاہا' لیکن یاسمین کی رسوائی کے خوف نے اس کی زبان کاٹ دی۔

''شادی کے دن تمہارے خدمت گاروں کی فرض شناسی نے مجھے تم تک پہنچنے نہیں دیا۔ اس لئے مبارکباد کی رسم ادا کرنے میں بہت تاخیر ہو گئی۔''

کامران پوری احتیاط کے ساتھ بول رہا تھا' لیکن اسے اندازہ نہیں تھا کہ ہونٹوں سے دل کا خون ٹپک رہا ہے۔

''پھر بھی تمہیں اس شاندار زندگی کا آغاز مبارک ہو۔ میری کوئی حیثیت......''

ابھی کامران کی بات مکمل ہونے نہیں پائی تھی کہ یاسمین خانم نے بڑے جارحانہ لہجے میں مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں اندر آنے کی اجازت کس نے دی؟''

یاسمین اس حقیقت کو بھی فراموش کر بیٹھی تھی کہ شجاع الدین کامران عمر میں اس سے دو تین سال بڑا ہے۔ آج ادب اور احترام کی مصنوعی حدود بھی ختم ہو گئی تھیں۔

کامران کے دل و دماغ پر قیامت سی گزر گئی۔ ابھی وہ سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا کہ امیر طغرل کی آواز ابھری۔

''یہ میری اجازت سے یہاں تک پہنچا ہے۔''

یاسمین خانم نے مڑ کر شوہر کی طرف دیکھا اور تیز لہجے میں بولی۔ ''میں صرف آپ کے حکم سے مجبور ہو کر چلی آئی تھی ورنہ ننگ خاندان سے میرا کوئی رشتہ نہیں۔''

یاسمین خانم کے الفاظ نے پوری فضا میں زہر گھول دیا۔ شجاع الدین کامران کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آرہا تھا۔ مگر جب یاسمین خانم کمرے سے نکل کر چلی گئی تو پھر اسے ہر لفظ کی صداقت پر اعتبار آگیا۔ کامران بہت دیر تک اس دروازے کو دیکھتا رہا جس سے گزر کر یاسمین اپنے محل کی وسعتوں میں گم ہو گئی تھی۔ جانے والے اس طرح گئے تھے کہ انہوں نے ایک بار بھی مڑ کر نہیں دیکھا اور عزیزوں نے اس طرح رشتے توڑ دیئے کہ غیروں کے سامنے بھی بھرم نہیں رکھا۔

یاسمین خانم کی آمد و رخصت کچھ اس قدر عجیب تھی کہ شجاع الدین کامران اپنے گرد و پیش سے بے خبر ہو چکا تھا اور اس نے اس خوفناک حقیقت کو بھی فراموش کر دیا تھا کہ امیر طغرل کی کینہ توز نظریں اس کے چہرے پر لکھی ہوئی جذباتی تحریر کو پڑھنے میں مصروف ہیں۔

پھر شجاع الدین کامران سنبھل گیا' مگر بہت دیر ہو چکی تھی۔ اس نے طغرل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''امیر میں آپ کو شادی کی مبارکباد دینے آیا تھا' مگر جب میرے عزیزوں نے مجھے پہچاننے سے انکار کر دیا تو پھر کہاں کی رسم اور مبارکباد کیسی؟ میں بہت شرمندہ ہوں کہ میری وجہ سے آپ کو بہت زحمت اٹھانی پڑی۔'' یہ کہہ کر شجاع الدین کامران واپس جانے لگا' مگر چند قدم آگے بڑھنے کے بعد دوبارہ پلٹ پڑا اور اپنے ماموں سے مخاطب ہوا۔

''قائم خان مجھے افسوس ہے کہ میں تمہاری محبتوں کا قرض ادا نہ کرسکا۔''

کامران کے لہجے میں نشتروں سے زیادہ کاٹ تھی۔ ''یہ مت سمجھنا کہ حالات نے مجھے معذور بنا دیا تھا۔ وہ تو میں اپنے اصولوں سے مجبور تھا ورنہ تمہارا قرض کبھی کا ادا ہو چکا ہوتا۔''

کامران نے چند الفاظ میں ماضی کا پورا افسانہ بیان کر دیا تھا۔ پھر وہ تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔

❊❊❊

شجاع الدین کامران کے جاتے ہی امیر طغرل نے قائم خان کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بیک وقت کئی سوالات لرز رہے تھے۔

قائم خان بدحواس نظر آ رہا تھا۔ ''تم کچھ کہنا چاہتے ہو امیر؟'' اس کی آواز میں ہلکا سا ارتعاش تھا۔

''ہاں میں نے تمہارے بھانجے کی آنکھوں میں ایک نیا رنگ دیکھا ہے۔'' امیر طغرل کے لہجے میں غیر معمولی ٹھہراؤ تھا۔ اگر میں شادی سے پہلے اس رنگ کی ہلکی سی جھلک بھی دیکھ لیتا تو آج یہ کہانی بہت مختلف ہوتی۔ قائم خان! کاش تم نے اس طرف اشارہ کر دیا ہوتا۔''

قائم خان صورت حال کو اچھی طرح سمجھ چکا تھا۔ اس نے لمحوں میں ایک جرأت مندانہ فیصلہ کیا اور بہت تیز آواز میں بولنے لگا۔

''امیر! تم نے اپنے کانوں سے سن لیا کہ وہ میرے ساتھ کس قسم کا سلوک کرنا چاہتا ہے؟''

طغرل خاموش رہا۔

''بچپن میں یاسمین خانم سے اس کی نسبت طے کر دی گئی تھی، مگر وہ برے راستوں پر چلا گیا۔'' قائم خان بڑی بیباکی کے ساتھ اپنے خاندانی حالات سنا رہا تھا جس سے امیر طغرل کے شکوک وشبہات دور ہو سکتے تھے۔ ''میں نے اس نازک رشتے کو برقرار رکھنے کے لئے بہت سمجھایا لیکن غلط صحبتیں اسے مسلسل بگاڑتی چلی گئیں۔ یہاں تک کہ وہ چوری کے الزام میں پکڑا گیا اور دو سال کی سزا کاٹی۔ میں اپنے خاندان کی یہ رسوائی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ مجبوراً میں نے اپنی بیٹی کی نسبت بھی توڑ دی اور اس سے تعلقات بھی منقطع کر لئے۔ بس یہی ایک باپ کا جرم ہے۔ وہ مجھ سے انتقام لینا چاہتا ہے مگر میں چشم پوشی سے کام لے رہا ہوں۔ مجھے اپنی بیوہ بہن کا خیال ہے ورنہ ......'' شدت غضب میں قائم خان کی بات ادھوری رہ گئی اور وہ اپنی نشست پر پہلو بدلنے لگا۔

امیر طغرل قائم خان کی باتیں بہت غور سے سن رہا تھا۔

''میں اپنی بے آبروئی کے خوف سے چپ رہتا ہوں مگر وہ میری خاموشی سے غلط فائدہ اٹھا رہا ہے۔'' قائم خان اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لئے اس قسم کے حربے پہلے بھی استعمال کر چکا تھا' مگر آج اس کا انداز بہت زیادہ جذباتی تھا۔ ''اس کے گناہوں کی لہریں یہاں تک پہنچ گئی ہیں کہ وہ اپنی معصوم بہن کی پرسکون زندگی کو بھی غرق رسوائی کر دینا چاہتا ہے۔ کسی کو خبر نہیں کہ میں جبر کے کس گرداب میں الجھا ہوا ہوں۔ ایک لڑکی کا باپ ہونا کیسی قیامت ہے؟ یہ کوئی نہیں جانتا۔'' قوت برداشت کا مظاہرہ کرتے کرتے اچانک قائم خان کی آنکھوں میں آنسو جھلکنے لگے۔

''اب کسی صفائی کی ضرورت نہیں قائم خان۔ میں نے اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ لیا ہے۔ واقعی وہ لڑکا بہت بڑا مجرم ہے۔ اطمینان رکھو تمہیں بہت جلد اس کرب سے نجات مل جائے گی۔''

❊❊❊

اسی رات امیر طغرل نے خلوت خاص میں اپنی خوبصورت و ناز آفریں بیوی یاسمین خانم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''بیگم ہم نے شجاع الدین کامران کی آنکھوں میں تمہارے لئے ایک عجیب سا رنگ دیکھا ہے۔'' امیر طغرل کے الفاظ حسد کی آگ سے جل رہے تھے۔

''پھر آپ نے ان آنکھوں کے بارے میں کیا سوچا ہے؟'' یاسمین نے ایک مخصوص ادائے دلبری کے ساتھ

کہا۔

"میں ان آنکھوں کا وجود برداشت نہیں کرسکتا جن میں تمہارے لئے کسی خواب کسی آرزو کا دھندلا سا بھی عکس نظر آئے۔" یہ کہہ کر امیر طغرل ایک ہی سانس میں شراب کا بھرا ہوا پیالہ پی گیا۔

"مگر مجھے تو ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ آپ مسلسل کئی سال سے ان آنکھوں کو برداشت کررہے ہیں۔"

یاسمین خانم کے طرز کلام میں قاتلوں جیسی جارحیت تھی۔

"پہلے میں نے ان آنکھوں کو دیکھا نہیں تھا۔" شراب کے نشے سے سرشار ہونے کے باوجود امیر طغرل کا لہجہ غضب ناک تھا۔ اب وہ آنکھیں اپنے حلقوں میں محفوظ نہیں رہیں گی۔ انہیں بہت جلد بجھا دیا جائے گا۔ اگر مجھے شادی سے پہلے خبر ہوجاتی تو وہ آنکھیں کبھی کی بجھ چکی ہوتیں اور ایک مجرم کے خواب بہت پہلے بکھر چکے ہوتے۔" امیر طغرل کی سفاک فطرت اس کے چہرے پر رقص کرنے لگی تھی اور یاسمین خانم کی گمراہ کردینے والی آنکھیں جاگتے میں شاندار مستقبل کے خواب دیکھ رہی تھیں۔

❊❊❊

پھر کچھ دن بعد ہی شجاع الدین کامران کو نقلی سکے ڈھالنے کے جرم میں گرفتار کرلیا گیا اور جب اس مظلوم نوجوان کا مقدمہ شاہی عدالت میں پیش کیا گیا تو غیاث الدین بلبن نے اپنی تند مزاجی سے مجبور ہو کر کامران کو پھانسی کی سزا سنادی۔ شاید پرسکون حالات میں بلبن کسی قدر نرمی سے کام لے کر موت کی سزا کو طویل قید میں بدل سکتا تھا۔ مگر ملکی انتشار پر قابو پانے کے لئے ضروری تھا کہ وہ اس قسم کے مجرموں کو عبرتناک سزائیں دے اور بات کچھ یوں بھی تھی کہ بلبن کے نزدیک مصنوعی سکے ڈھالنے کا جرم ایک قومی جرم تھا اور اس جرم کی سزا کسی بھی صورت میں موت سے کم نہیں ہوسکتی تھی۔ امیر طغرل نے اتنی ہوشیاری کے ساتھ منصوبہ بندی کی تھی کہ شجاع الدین کامران کی نجات کے تمام راستے بند ہوچکے تھے۔ اس نے اپنے جاسوسوں کے ذریعے یہ بھی معلوم کرلیا تھا کہ شجاع الدین کا باپ حکومت وقت کا غدار تھا اور اس کی ماں سعدیہ خانم کئی سال تک کرشن راؤ کی مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالتی رہی تھی۔ کرشن راؤ کی ملازمت کا سہارا لے کر امیر طغرل نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ سعدیہ خانم ابھی تک اپنے آبائی مذہب پر قائم ہے اور اس کا مجرم بیٹا اسلامی سلطنت کے خلاف کی جانے والی سازشوں میں ہندوؤں کا شریک ہے۔

پھر جب غیاث الدین بلبن کے سامنے کامران کی دس بارہ سالہ قید کی تفصیلات پیش کی گئیں تو وہ غصے سے بھڑک اٹھا اور اس نے جھوٹے گواہوں کی ان شہادتوں پر اعتبار کرلیا کہ شجاع الدین کامران حکومت کے خلاف کی جانے والی سرگرمیوں میں ملوث ہوسکتا ہے۔

امیر طغرل نے مقدمے کو مضبوط بنانے کے لئے ان مجرموں کی پوری جماعت کو عدالت عالیہ میں حاضر کردیا تھا جو خفیہ طور پر کئی سال سے نقلی سکے ڈھالنے کا کاروبار کررہے تھے۔ جب یہ مجرم بلبن کے سامنے پیش ہوئے تو ان سب نے بیک زبان اقرار کرلیا کہ وہ شجاع الدین کامران کے ملازم ہیں اور اسی کے حکم پر زیرزمین ٹکسال میں کام کرتے ہیں۔ امیر طغرل نے ان مجرموں کو یقین دلایا تھا کہ اس جرم کی معاونت کے سلسلے میں انہیں زیادہ سے زیادہ چند سال قید سزا ملے گی اور پھر یہ سزا بھی معاف کردی جائے گی۔ امیر طغرل کی اس ضمانت کے بعد مجرموں کا وہ گروہ کامران کے خلاف پورے زور و شور کے ساتھ گواہیاں دے رہا تھا۔ پھر جب ساری شہادتیں پیش ہوچکی تو سلطان غیاث الدین بلبن نے انتہائی قہرناک لہجے میں کامران کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''میں ان حکمرانوں میں سے نہیں ہوں جو انصاف کے تقاضے پورے کئے بغیر انسانوں سے ان کی زندگی چھین لیتے ہیں۔ تجھے بھی اس عدالت میں لب کشائی کی اجازت ہے۔ اگر تو اپنی بے گناہی پر کوئی گواہ لا سکتا ہے تو جلدی کر ......ورنہ مجرموں کے لئے بلبن کا قانون بہت بے رحم ہے۔''

کامران کو اپنی موت کا یقین ہو چلا تھا۔ اس لئے وہ زندگی کی بھیک مانگنے کے بجائے پوری توانائی اور جرأت کے ساتھ کہنے لگا۔ ''آج میں اپنی آنکھوں سے سلطان کی بے رحمی کا مشاہدہ کر رہا ہوں۔ مجھے موت کی سزا پہلے ہی سنائی جا چکی اب کیا انصاف اور کیا اس کے تقاضے؟''

عدالت پر سناٹا چھا گیا۔ اہل دربار نے آج تک اس قدر بیباک نوجوان نہیں دیکھا تھا۔

سلطان غیاث الدین بلبن شرمسار سا نظر آنے لگا۔

''تجھے اس وقت تک کے لئے مہلت دی جاتی ہے جب تک میں جنگی لٹیروں کا خاتمہ نہ کر دوں۔'' اب غیاث الدین بلبن کی آواز میں وہ جلال باقی نہیں رہا تھا جس سے درباریوں کے دل لرز جاتے تھے۔

شجاع الدین کامران کی جرأت گفتار کام آ گئی اور فرشتہ اجل کا بڑھتا ہوا ہاتھ اچانک ٹھہر گیا۔

❋❋❋

سلطان غیاث الدین بلبن کے اس فیصلے سے قائم خان بہت زیادہ پریشان نظر آ رہا تھا۔
''امیر! اب کیا ہوگا؟'' قائم خان کے لہجے سے اس قدر شکستگی ظاہر ہو رہی تھی جیسے اس کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی چھن گئی ہو۔ ''کہیں سلطان کی بخشی ہوئی یہ مہلت کامران کی رہائی کا سبب نہ بن جائے۔''
امیر طغرل مسکرایا۔ ''تم سلطان کے مزاج کو نہیں جانتے۔ جب وہ ایک بار کسی مجرم کو پکڑ لیتے ہیں تو اس وقت تک نہیں چھوڑتے جب تک اس کے ساتھ پورا پورا انصاف نہ ہو جائے۔''
''سلطان تو اسے پھانسی کی سزا دے چکے۔'' قائم خان نے گھبرا کر کہا۔ ''پھر مجرم کی طرف سے یہ صفائیاں اور یہ وضاحتیں کیسی؟''
''شاید اس کا موقع نہ آتا' مگر وہ لڑکا بہت سخت جان ہے۔'' امیر طغرل کے چہرے پر نفرتوں کا گہرا رنگ ابھر آیا تھا۔ ''اس نے بڑی بے جگری کے ساتھ موت کی آنکھوں میں آنکھ ڈال دیں اور وادی فنا کی طرف جاتے ہوئے اچانک سلطان کے انصاف پر اپنے شک کا اظہار کیا۔ یہ فرمانروائے ہند کی کھلی ہوئی توہین تھی۔ مجبوراً سلطان کو اپنا فیصلہ معطل کرنا پڑا۔''
''یہ فیصلہ بدل بھی سکتا ہے؟'' قائم خان نے بڑے افسردہ لہجے میں اپنا اندیشہ ظاہر کیا۔
''ہرگز نہیں!'' امیر طغرل نے فاتحانہ انداز میں کہا۔ ''میں نے آج تک اپنی زندگی کی بساط پر ایسی کوئی بازی نہیں کھیلی جس میں مجھے شکست کا خطرہ لاحق ہو۔ اگر اتفاق سے کبھی میرا حریف آگے بڑھ جاتا ہے تو میں اسے پیچھے رکھنے کیلئے اپنا خصوصی اختیار استعمال کرتا ہوں۔ مجھے ناکامی سے نفرت ہے۔ جو چاہتا ہوں حاصل کر لیتا ہوں۔'' یہ کہہ کر امیر طغرل نے قائم خان کی طرف بہت غور سے دیکھا جیسے وہ نظروں کی زبان سے کہنا چاہتا ہو کہ اس نے یاسمین خانم کو پسند کیا اور پھر اسے حاصل کر لیا۔ قائم خان امیر طغرل کے اس مبہم اشارے کو نہ سمجھ سکا۔
''اب میری خواہش یہ ہے کہ شجاع الدین کامران کی سانسوں کا شمار ختم ہو جائے۔ ویسے بھی اس کی زندگی ایک بوجھ بن گئی ہے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ زمین کا یہ بوجھ جلد از جلد ہلکا ہو جائے۔''
اچانک قائم خان کے ذہن میں ایک پریشان کن خیال نے سر ابھارا۔ ''اور اگر شجاع الدین کامران امیر کے قدموں پر سر رکھ کر اپنی زندگی کی بھیک مانگے تو سلطان غیاث الدین بلبن کی عدالت کا کیا فیصلہ ہوگا؟''
امیر طغرل چونک اٹھا۔ ''قائم خان! یہ تو میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ تیرا ذہن بڑا عجیب ہے۔ کیسے کیسے پہلو اور کیسے کیسے زاویے تراشتا ہے۔''
قائم خان سراسیمگی کا شکار نظر آنے لگا۔ وہ امیر طغرل کی اس بات کا مفہوم سمجھنے سے قاصر رہا تھا۔
''مجھے یقین نہیں کہ وہ سر پھرا نوجوان میرے قدموں پر جھک جائے۔'' امیر طغرل نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''اور اگر ایسا ہو گیا تو یقیناً سلطان کا فیصلہ بھی بدل جائے گا۔''

''آخر تم کیا کہنا چاہتے ہو امیر!'' قائم خان گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔

''بس یہی کہ اس مقدمے میں گواہ بھی میں خود ہوں اور مدعی بھی۔ عدالت بھی میں خود ہوں اور منصف بھی۔''

امیر طغرل کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ ابھر آئی تھی۔ ''اگر اس لڑکے نے میرے پیروں کو بوسہ دے دیا تو قائم خان تو پھر سارے الزامات واپس لے لئے جائیں گے اور اسے بخش دیا جائے گا۔'' یہ کہہ کر امیر طغرل خاموش ہو گیا۔

قائم خان انتہائی سراسیمگی کے عالم میں کھڑا اپنے داماد کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔

امیر طغرل نے قائم خان کی بدحواسی کا مفہوم سمجھ لیا اور پھر بڑے مطمئن لہجے میں مسکراتا ہوا بولا۔ ''بیٹھ جاؤ قائم خان! یہ محض ایک خواہش ہے جس کی تکمیل ممکن نظر نہیں آتی۔ پھر بھی میں تمہارے بھانجے کامران کے سامنے رہائی کی یہ شرط رکھوں گا۔ اگر وہ ہوش مند ہے تو امیر طغرل کی قدم بوسی کر کے ایک کامیاب زندگی بسر کرے گا۔ ورنہ ایسے نادان کا مشکل ہے سلامت رہنا۔''

قائم خان شدید پریشانی کے عالم میں اٹھ کر چلا گیا۔ امیر طغرل اب ایک عجیب اذیت ناک کھیل کھیل رہا تھا۔

❊❊❊

مقدمے کی کارروائی کے التواء کے بعد سعدیہ خانم شجاع الدین کامران سے ملی۔ سلطان غیاث الدین بلبن نے اسے اجازت دے دی تھی کہ وہ دن میں ایک بار اپنے بیٹے سے ملاقات کر سکتی ہے اور اس کی بے گناہی ثابت کرنے کیلئے جس قدر شہادتیں حاصل کر سکتی ہے انہیں وقت مقررہ تک جمع کر لے۔

کامران کو دیکھتے ہی سعدیہ خانم رونے لگی۔ ''بیٹے! یہ تیرے کن ناکردہ گناہوں کی سزا ہے؟ کاش! کوئی اس بدنصیب ماں کو بتا دے کہ عذابوں کا یہ سلسلہ کب ختم ہو گا؟''

شجاع الدین کامران کچھ دیر تک ماں کے بہتے ہوئے آنسوؤں کو دیکھتا رہا' پھر وہ بھی گلوگیر لہجے میں کہنے لگا۔

''مام! ساری بلائیں تمام ہو چکی ہیں' بس ایک مرگ ناگہانی اور رہ گئی ہے۔''

''بیٹے! میرا خیال ہے کہ اگر میں یاسمین کے شوہر امیر طغرل سے تیری جاں بخشی کیلئے درخواست کروں تو شاید سلطان اپنا فیصلہ بدل ڈالے۔'' سعدیہ خانم جیسی آہنی اعصاب رکھنے والی عورت کے لہجے پر کسی بھکاری کے لہجے کا گمان ہو رہا تھا۔

ماں کی محبت کا یہ زاویہ دیکھ کر کامران چونک اٹھا...... ''مام! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ وہ لوگ تو برسوں سے اس بات کا انتظار کر رہے ہیں کہ میرا اٹھا ہوا سر ان کے قدموں پر جھک جائے اور وہ رائے نعیم الدین ذیشان کے بیٹے کو زندگی کی چند سانسیں بخش دیں۔ وہ زندگی جو میرے لئے دنیا کی سب سے بڑی تہمت بن کر رہ گئی ہے۔''

''بیٹے! اس طوفان کو کسی طرح گزر جانے دے۔'' ماں نے درد بھرے لہجے میں التجا کی۔ ''اگر انہیں شہر دہلی میں میری موجودگی گوارا نہیں تو میں تجھے لے کر کہیں اور چلی جاؤں گی۔''

یکایک شجاع الدین کامران ہنسنے لگا' مگر اس کی بے اختیار ہنسی میں بڑی تلخیاں اور نفرتیں پوشیدہ تھیں۔ ''مادر گرامی! مجھے بڑا تعجب ہے کہ آپ جیسی صحیح العقیدہ خاتون بھی امیر طغرل کو میری زندگی کا مالک سمجھنے لگیں۔''

سعدیہ خانم بیٹے کے اس طرز کلام پر حیران رہ گئی۔

''امیر طغرل تو پھر غلام ہے۔ [illegible] کا اختیار رکھتا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے میری

سانسوں کے شمار میں کسی قدر اضافہ کر دے۔ کیا آپ نے اسے خدا کا درجہ دے دیا ہے؟''

سعدیہ خانم لرز کر رہ گئی۔ ''نہیں بیٹے! میری زبان سے ادا ہونے والے لفظوں کا یہ مفہوم نہیں تھا۔ وہ تو ایک ظاہری تدبیر ہے' شاید خدا مجھ غمزدہ کی فریاد سن لے۔''

''ماں! وہ آپ کی ہر چیخ سن رہا ہے...... اور ان چیخوں سے بھی باخبر ہے جو ابھی آپ کے ہونٹوں تک نہیں پہنچی ہیں۔''

موت کو اپنے قریب پا کر بھی شجاع الدین کامران بے مثال صبر و ضبط کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

''پھر میں کیا کروں میرے بچے!'' سعدیہ خانم نے مضطرب ہو کر لوہے کی سلاخوں پر اپنا سر رکھ دیا۔

''آپ کے بیٹے کی دنیا تو جہنم بن چکی' مگر مجھے اس دوزخ سے بچا لیجئے جس کی آگ ہمیشہ روشن رہے گی۔'' کامران نے بے قرار ہو کر دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

تو کیا کہنا چاہتا ہے کامران؟'' سعدیہ خانم کے جسم کی لرزش کچھ اور بڑھ گئی تھی۔

''اگر آپ امیر طغرل سے میری زندگی کی بھیک مانگنے گئیں تو میں دوبارہ آپ کا روشن چہرہ نہیں دیکھوں گا۔'' کامران نے رک رک کر کہا۔ ''اس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی...... اور جو مسلمان مرتے وقت اپنی ماں کا چہرہ نہ دیکھ سکے اسے مکمل ہلاکت و بربادی سے کون بچا سکتا ہے؟ اس لئے آپ کا یہ نافرمان بیٹا آپ سے درخواست گزار ہے کہ اسے آخرت کے عذاب سے بچا لیجئے۔''

سعدیہ خانم کامران کی شرط سن کر بے حال ہو گئی۔ وہ بہت دیر تک سر جھکائے روتی رہی' پھر بیٹے سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''نہیں کامران! تو جہنم میں نہیں جائے گا۔ تیری ماں تجھ سے راضی ہے۔''

❋❋❋

اس کے بعد امیر طغرل نے اپنے ایک معتمد خدمت گار کو شجاع الدین کامران کے پاس بھیجا اور سزائے موت سے بچنے کیلئے اپنی شرط پیش کر دی۔

کامران بڑے تحمل سے اس کی باتیں سنتا رہا' پھر آنے والے شخص سے باوقار لہجے میں مخاطب ہوا۔

''امیر طغرل کے یہاں تیری کیا حیثیت ہے؟''

''میں ان کا پرانا خدمت گار ہوں۔'' آنے والے نے طغرل کی غلامی پر فخر کرتے ہوئے کہا۔

''میں ایک غلام سے بات کرنا نہیں چاہتا۔ یہ میری توہین ہے۔'' اچانک کامران کے لہجے سے آگ برسنے لگی تھی۔ ''اپنے آقا طغرل سے کہو کہ وہ خود مجھ سے آ کر بات کرے۔''

خدمت گار چلا گیا اور اس نے شجاع الدین کامران کی گستاخیوں کو اس قدر بڑھا چڑھا کر بیان کیا کہ امیر طغرل اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ پھر رات کا اندھیرا پھیلتے ہی طغرل کے نمک خواروں نے اپنے امیر کو زندان کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔

داروغہ زندان نے بڑے والہانہ انداز میں طغرل کا استقبال کرتے ہوئے کہا۔ ''امیر! آپ نے بے وقت یہاں آنے کی زحمت کیوں کی؟''

امیر طغرل نے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا۔ وہ کامران کو داروغہ زندان کے ذریعے بلا کر تنہائی میں بات کرنا چاہتا تھا' مگر کچھ سوچ کر خود ہی اس طرف بڑھ گیا' جہاں کامران اپنی زندگی کی آخری گھڑیاں گزار رہا تھا۔

امیر طغرل کی چال میں بڑی تمکنت تھی اور چہرے پر غرور و تکبر کے گہرے رنگ نمایاں تھے' مگر کم روشنی کے

باعث کوئی آنکھ ان رنگوں کو پوری وضاحت کے ساتھ سمجھ نہیں سکتی تھی۔

سلطان غیاث الدین بلبن کا غلام اسی کج رفتاری کے ساتھ شجاع الدین کامران کے قریب آکر ٹھہر گیا۔ دونوں کے درمیان مشکل سے تین گز کا فاصلہ تھا۔ کامران نے امیر طغرل کو آتے دیکھ لیا تھا' اس لئے قصداً اس نے اپنا منہ دوسری طرف کرلیا تھا۔

''میں امیر طغرل ہوں۔'' یکایک ایک بھاری اور کریہہ آواز گونجی...... ''مجبوراً مجھے یہاں آنا پڑا۔''

''ہر انسان اپنی ضرورت سے مجبور ہے۔'' کامران نے بے نیازانہ کہا اور مڑ کر نہیں دیکھا۔ ''اگر فرمانروائے ہند بھی یہاں آتا تو میں اس کا ممنون احسان نہ ہوتا۔''

امیر طغرل کامران کے لہجے کی اس جارحیت سے تڑپ کر رہ گیا۔

''وہ کسی خدمت گار کی نہیں خود امیر طغرل کی توہین تھی۔'' بلبن کا غلام اپنے اعصاب پر قابو نہ رکھ سکا۔

''کچھ بھی ہو' میں غلاموں سے بات کرنے کا عادی نہیں۔'' کامران نے اسی انداز میں جواب دیا۔

راجپوت زادے نے براہ راست امیر طغرل کے نسب نامے پر ضرب لگائی تھی' مگر وہ اس طنز کو سمجھ نہیں سکا۔

''میں خود تجھ سے گفتگو کرنے آیا ہوں۔'' امیر طغرل کے لہجے کی آگ بھڑکتی جا رہی تھی۔

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا طغرل! تو بھی اول و آخر غلام ہے۔'' کامران کی گردن کج ہو گئی' وہ آہستہ آہستہ مڑا۔ ''مجھ سے تو صرف وہی شخص بات کرسکتا ہے جس کی اعلیٰ نسبی پر ساری دنیا گواہی دے۔ بہتر یہی ہے کہ واپس لوٹ جا اور شرفاء کو اتنا نہ چھیڑ کہ وہ اپنے خاندانی لب و لہجے سے بغاوت کردیں۔''

''اگر تو میرے قدموں پر اپنا سر رکھ دے تو میں تیری دردناک موت کو خوشحال زندگی میں تبدیل کرسکتا ہوں۔''

امیر طغرل کے دل و دماغ جل رہے تھے' لیکن وہ ہر قیمت پر کامران کو سرنگوں دیکھنا چاہتا تھا۔ اس لئے مرنے والے کو زندگی کا لالچ دے رہا تھا۔

''یہ قدرت تو تیرے سلطان کو بھی حاصل نہیں۔ پھر تجھ جیسا بھکاری مجھے کیا دے گا؟'' شجاع الدین کامران کا لہجہ پہلے سے زیادہ زہرناک ہوگیا تھا۔

''میں نے تیری آنکھوں میں اپنی شریک حیات کیلئے ایک ایسا غلیظ رنگ دیکھا ہے جسے تیرے خون ہی سے مٹایا جاسکتا ہے۔'' امیر طغرل کی خباثت بے نقاب ہوچکی تھی۔

شجاع الدین کامران چند لمحوں کیلئے سکتے میں آگیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ امیر طغرل یکایک اس قدر پستی میں گر جائے گا۔

کامران کو خاموش پاکر طغرل نے دوبارہ کہا۔ ''اگر تو یاسمین خان کے آگے سجدہ ریز ہوجائے اور پھر میرے سامنے اپنے دیدہ دامن کو پھیلا دے تو عذابوں کا یہ طویل سلسلہ ختم ہوجائے گا۔ اس کے بعد تیرے لئے کیف ونشاط میں ڈوبی ہوئی زندگی کے بیشمار دروازے کھل جائیں گے۔ امیر طغرل اس پر قادر ہے کہ وہ جس طرح چاہے اپنی رعایا کے ساتھ سلوک کرے۔''

اس دوران شجاع الدین کامران اپنے بکھرتے ہوئے اعصاب پر قابو پا چکا تھا۔ ''تیری آنکھیں غلیظ مٹی سے بنی ہیں طغرل! اس لئے تجھے میری آنکھوں میں بھی اپنا ہی عکس نظر آتا ہے۔ ایوان شاہی کے ناپاک کیڑے! تو نے اپنے نفس کی تسکین کیلئے پہلے ایک کم عمر دوشیزہ کی زندگی تباہ کی' بے غیرت باپ سے اس کی مجبور بیٹی کا سودا کیا اور جب اس طرح بھی تجھے سکون نہیں ملا تو مجھے زنجیریں پہنا دیں۔'' شجاع الدین کامران امیر طغرل کی عیار سیاست کے ایک

ایک حربے سے واقف ہو چکا تھا اور اس نے زندان کی دیواروں پر لکھی ہوئی تحریروں کو پڑھ لیا تھا۔ کامران کی خواہش یہی تھی کہ وہ چپ چاپ دنیا سے گزر جائے' مگر امیر طغرل کی اس رکیک حرکت نے اس کے خون میں آگ لگا دی تھی۔ "جب حیلہ گری کے تمام ہتھیار کند ہو گئے تو اپنی پاکیزہ بیوی کو ڈھال بنا لیا۔ سلطان غیاث الدین بلبن کے بے حیا غلام! کیا یہی تیری مردانگی ہے کہ شرفاء کی آنکھوں میں اپنی ہوس و خود غرضی کا عکس تلاش کرتا رہتا ہے۔ تجھ جیسے مردہ ضمیر کو کیا معلوم کہ یاسمین خانم کیلئے میری آنکھوں میں کیسا رنگ موجود ہے؟" شجاع الدین کامران اس قدر مشتعل ہو چکا تھا کہ اس نے کسی رعایت اور مصلحت سے کام نہیں لیا۔

امیر طغرل کا چہرہ مسخ ہو گیا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ موت کے دروازے پر کھڑا ہوا یہ مفلس و نادار نوجوان اپنی زندگی کو اس بے رحمی کے ساتھ ٹھکرا دے گا۔ امیر طغرل نے ایک لمحے کیلئے سوچا کہ وہ خاموشی کے ساتھ واپس چلا جائے اور اپنے انتقام کی آگ کو سازشوں کی ہوا سے مزید بھڑکا دے' مگر کامران کا انداز گفتگو اتنا زہریلا تھا کہ اس کے اثر سے امیر طغرل کا سینہ جلنے لگا۔

پھر اس کی زبان بھی بے لگام ہو گئی۔ طغرل نے کامران کی ماں کے حوالے سے انتہائی ناشائستہ کلمات کہے اور اس کے مرحوم باپ رائے نعیم الدین ذیشان کو غداری و نمک حرامی کی تہمتوں سے آلودہ کر دیا۔

امیر طغرل کا خیال تھا کہ اس کی گرم گفتاری کے اثر سے شجاع الدین کامران پاگل ہو جائے گا اور آہنی سلاخوں سے اپنا سر ٹکرانے لگے گا۔ مگر بلبن کا غلام اس وقت حیران رہ گیا جب اس نے راجپوت زادے کو مسکراتے دیکھا۔

"طغرل! تو اس شخص سے گالیوں میں مقابلہ کر رہا ہے جس کی موت چند قدموں کے فاصلے پر کھڑی ہے۔" کامران کا لہجہ نہایت پرسکون تھا' مگر الفاظ سے شدید حقارت جھلک رہی تھی۔ "مجھے تو آج یا کل مصلوب ہو جانا ہے مگر میں دنیا سے جاتے جاتے تجھے ایسی گالیاں دے سکتا ہوں جو تاریخ کے اوراق پر نقش ہو کر رہ جائیں گی۔ یہ تو قید خانے کا ایک ویران گوشہ ہے۔ یہاں میری آواز اسیروں کے سوا کوئی نہیں سنے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کام کیلئے نئے محاذ کا انتخاب مناسب رہے گا۔ اس لئے بہتر ہے کہ وقت کا انتظار کر۔ عنقریب تجھ سے دربار سلطانی میں ملاقات ہو گی۔ پھر دیکھنا کہ لفظوں کے زخموں میں کیسی سوزش ہوتی ہے اور تقریر کی آگ سے دل و دماغ کس طرح جلتے ہیں؟" یہ کہہ کر شجاع الدین کامران مڑا اور کمرے کے اس حصے میں چلا گیا جو زیادہ تاریک تھا۔

امیر طغرل بھی واپس جا رہا تھا' مگر اس طرح کہ اس کا سر اور کاندھے جھکے ہوئے تھے۔ جیسے اس کا دور غلامی لوٹ آیا ہو اور کسی نادیدہ ہاتھ نے اسے دوبارہ بھاری زنجیریں پہنا دی ہوں۔

❊❊❊

وہ رات امیر طغرل پر بہت بھاری تھی۔ اس نے یاسمین خانم کے ساتھ قائم خان کو بھی اپنے کمرے میں طلب کر لیا تھا' پھر وہ شراب پی کر شجاع الدین کامران کو غائبانہ گالیاں دینے لگا۔

"اب اس بے نسب کو دنیا کی کوئی طاقت میرے قہر و غضب سے محفوظ نہیں رکھ سکتی۔"

یاسمین خان کے گلنار چہرے پر خوشی کی نئی شفق ابھر آئی تھی۔ اس کے یاقوتی لب خاموش تھے' مگر آنکھوں میں ایک نئی فتح' ایک نئی مسرت کا سیلاب موجزن تھا۔

"امیر! میں تو پہلے ہی اس کے بارے میں سب کچھ بتا چکا ہوں۔" قائم خان نے بڑی ہوشیاری سے طغرل کے غصے کو بھڑکانے کی کوشش کی۔ "آپ نے تو اس بے حیا کے ساتھ چند لمحے گزارے ہیں! میری طرف دیکھو کہ تیس سال سے رشتوں کے اس ناسور کو برداشت کر رہا ہوں۔"

"تیری بات اور ہے قائم خان!" امیر طغرل بہت زیادہ برانگیختہ ہوگیا۔ "تو ایک عام انسان ہے، گالیاں برداشت کرسکتا ہے مگر وہ شخص کس طرح برداشت کرے جو قضا و قدر کا مالک ہے۔" غصے کی زیادتی اور کثرت شراب نے اسے حواس باختہ بنا دیا تھا۔ امیر طغرل کا ذہنی توازن اس قدر بگڑ گیا تھا کہ وہ بار بار خدائی دعوے کر رہا تھا۔

قائم خان امیر طغرل کی اس کیفیت سے ایک عجیب سی لذت حاصل کرتا رہا۔ طغرل کی دیوانگی ہی قائم خان کے آزار کا علاج تھی۔ بلبن کے غلام کا عشرت کدہ کچھ دیر تک غلیظ کلمات سے گونجتا رہا۔ یہاں تک کہ امیر طغرل فرش پر اوندھا ہوگیا۔

یاسمین خانم شوہر کو اسی حالت میں چھوڑ کر چلی گئی اور قائم خان داماد کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ کر نئی دنیا کے خواب دیکھنے لگا۔

❊❊❊

جشن تاجپوشی کے تمام ہنگامے سرد ہو چکے تھے اور اب سلطان غیاث الدین بلبن کی ساری توجہ میواتی لٹیروں کی فسادانگیز سرگرمیوں پر مرکوز ہوگئی تھی۔ رعایا پر حکومت کا رعب و جلال قائم رکھنے کیلئے ضروری تھا کہ سلطان لٹیروں کو سخت سزائیں دے کر دہلی کے مضافات میں امن و امان بحال کرے۔

ایک دن غیاث الدین بلبن نے اپنے وزیروں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "میری حکومت کے ترجیحی کاموں میں سرفہرست جنگلی لٹیروں کا خاتمہ ہے۔ میں اسے پسند نہیں کرتا کہ مٹھی بھر قزاقوں کی وجہ سے دہلی کا سارا حسن داغدار ہوجائے۔"

"سلطان معظم! لٹیروں کا شمار انگلیوں پر نہیں کیا جاسکتا۔" ایک وزیر نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "سابقہ حکومت کی غفلت و کوتاہی نے مجرموں کو طویل عرصے تک پرورش کیا ہے جس کے نتیجے میں ان کی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی ہے۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟" غیاث الدین بلبن نے انتہائی برہم لہجے میں کہا۔ "اگر آدھا ہندوستان بھی قزاقی کا پیشہ اختیار کرلے تو میں اپنے ارادوں سے باز نہیں آؤں گا۔ اس ملک کے فتنہ گروں کو اپنا کاروبار حیات بدلنا ہی پڑے گا۔ ورنہ طویل و عریض زمین ان پر قبر سے بھی زیادہ تنگ ہوجائے گی۔

غیاث الدین بلبن کے اس اعلان کی گونج بہت دور تک سنائی دی۔

ٹھاکر کرشن راؤ پہلے ہی کسی محفوظ ترین پناہ گاہ کی تلاش میں تھا۔ بلبن کے اس جارحانہ اقدام کی خبر سن کر اس نے پجاری رام سروپ کو اپنے گھر بلایا اور سرگوشی میں کہنے لگا۔

"میں نے بلبن کے چہرے کو بہت غور سے دیکھا ہے۔" ٹھاکر کرشن راؤ کی آواز لرز رہی تھی۔ "یہ ناصر الدین محمود کی طرح نرم دل نہیں ہے کہ مجرموں اور گنہگاروں کو معاف کردے۔"

پجاری رام سروپ بھی شدت خوف سے کانپ رہا تھا۔ "پھر کیا کریں مہاراج؟"

"ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اپنا خدا بدل ڈالو۔" کرشن راؤ نے کہا۔ "سلطان جنگلی لٹیروں پر یلغار کرنے والا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اس بار انہیں بدترین شکست سے دوچار ہونا پڑے گا...... پھر کوئی بھی قیدی لٹیرا ہمارے خفیہ کردار کو بلبن کے سامنے بے نقاب کرسکتا ہے۔ اگر ایسا ہوگیا پجاری تو ہم سب بڑی ذلت کی موت مارے جائیں گے۔"

رام سروپ رونے لگا۔ "اب تیرے سوا کون مرا کرشن کنہیا۔"

"وعقل کے دشمن! کرشن کو نہیں خدا کو یاد کر۔" ٹھاکر نے پجاری کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

پھر اسی رات کرشن راؤ نے اپنے ہم نوا پجاریوں کو آنے والے انقلاب کی خبر دے دی۔ تمام پجاری چیخ چیخ کر

کہنے لگے۔

''ہم آپ کے ساتھ ہیں ٹھاکر! ہمیں مرنے سے بچا لو۔''

پھر اسی رات تمام دیوداسیوں اور قیدی لڑکیوں کو چاندی کے چند سکے دے کر مندر سے رخصت کر دیا گیا۔ کرشن راؤ کی یہ بارش کرم محض اس لئے تھی کہ ستم رسیدہ لڑکیاں مندر سے باہر نکل کر ٹھاکر کے مظالم کی لرزہ خیز کہانیاں سرعام بیان نہ کریں۔ کرشن راؤ نے مظلوم عورتوں کی ایک مختصر سی فوج کو برہمنیت کے زندان سے رہائی دیتے ہوئے کہا۔

''اگر تم عزت کی زندگی بسر کرنا چاہو تو حلقہ اسلام میں داخل ہو جاؤ۔'' کرشن راؤ کے منافقانہ لہجے سے گہرے تاثر کا اظہار ہو رہا تھا۔ ''میں بھی مسجد کی طرف جا رہا ہوں اور تم بھی ایک خدا کی پجاری بن جاؤ...... افسوس! بڑھاپے میں مجھ پر یہ راز فاش ہوا کہ مندروں میں رہ کر اور ہزاروں دیوتاؤں کے آگے سر جھکا کر انسان کو نروان (نجات کا درجہ) حاصل نہیں ہو سکتا۔''

تمام مجبور لڑکیوں نے کرشن راؤ کا شکریہ ادا کیا اور مندر سے نکل کر اس دنیا میں چلی گئیں جس کا ہر گوشہ ان کیلئے اجنبی تھا۔ دیوداسی شکنتلا نے جاتے وقت کرشن راؤ کو عجیب نظروں سے دیکھا تھا' مگر زبان سے کچھ نہیں بولی تھی۔

❋❋❋

دوسرے دن ٹھاکر کرشن راؤ اپنے چند مخصوص ساتھیوں کے ہمراہ ''قصر سفید'' تک پہنچا اور سلطان غیاث الدین بلبن کی بارگاہ میں حاضری کی اجازت چاہی۔ بلبن کو بتایا گیا کہ کرشن راؤ دہلی کا ایک با اثر انسان ہے اور وہ سلطان کی شخصیت سے متاثر ہو کر حلقہ اسلام میں داخل ہونا چاہتا ہے۔ سلطان کچھ دیر تک سوچتا رہا اور پھر کرشن راؤ کو دربار میں طلب کر لیا گیا۔ پجاری رام سروپ اور کچھ دوسرے سن رسیدہ برہمن بھی اس کے ہمراہ تھے۔

بلبن زبردست قوت حافظہ رکھتا تھا' اس نے کرشن راؤ کو دیکھتے ہی پہچان لیا۔

''ٹھاکر! کیا تو وہی کرشن راؤ ہے جو ایک بار میری وزارت عظمیٰ کے دور میں ناصرالدین محمود کے روبرو حاضر ہوا تھا اور تو نے سلطان مرحوم کی حمایت کا اعلان کیا تھا؟'' بلبن نے ماضی قریب کا حوالہ دیتے ہوئے کہا۔

''ہاں سلطان عالی مقام! میں وہی کرشن راؤ ہوں۔'' ٹھاکر نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا۔

''کیا ہر فرمانروا کے دربار میں حاضر ہونا اور اسے اپنی حمایت کا یقین دلانا تیرا پیشہ ہے؟'' بلبن کے چہرے پر شگفتگی کے آثار تھے' مگر الفاظ میں شدید طنز پوشیدہ تھا۔

''نہیں میرے شاہ! کرشن راؤ نے فوراً اپنا لہجہ بدل ڈالا۔ ''وہ زبان کی حمایت تھی اور یہ دل کی حمایت ہے۔''

''کیا تو نے سلطان مرحوم کے سامنے جھوٹ بولا تھا؟'' بلبن کی آواز تلخ ہو گئی تھی۔ ''زبان اور دل کی حمایت سے تیرا کیا مطلب ہے؟''

کرشن راؤ غیاث الدین بلبن کے بگڑے ہوئے تیوروں کو سمجھ چکا تھا۔ اس لئے اس نے بھی اپنی عیاریوں کی زنبیل سے ایک طاقتور دلیل برآمد کی۔ ''میرے عظیم فرمانروا کا اقبال بلند ہو' زبان کا مطلب یہ تھا کہ میں نے سلطان ناصرالدین محمود کی حمایت کا اعلان کیا تھا اور دل کا مطلب یہ ہے کہ میں سلطان غیاث الدین بلبن کے ہاتھوں اپنے مذہبی عقائد فروخت کر رہا ہوں۔''

تمام درباری حیرت سے کرشن راؤ کا منہ دیکھنے لگے۔ خود غیاث الدین بلبن بھی کچھ دیر کیلئے سناٹے میں آ گیا تھا۔

پھر اچانک والی ہندوستان نے کرشن راؤ پر منطق کی ایک اور کاری ضرب لگائی۔ ''اگر تجھے اسلام قبول کرنا تھا تو ناصرالدین محمود کے دور میں تیری خاموشی کیا مفہوم رکھتی ہے؟ اس وقت تو نے اپنے عقائد نیلام کیوں نہیں کئے۔''

کرشن راؤ حالات کے ان متوقع نشیب و فراز سے باخبر تھا اور ہر سوال کا جواب پہلے سے سوچ کر آیا تھا۔

''ناصرالدین محمود کے یہاں انصاف نہیں تھا سلطان!'' کرشن راؤ نے خوشامدانہ لہجے میں کہا..... ''آپ ایک عادل حکمران ہیں اور آپ کی یہی خوبی مجھے بتوں کے درمیان سے اٹھا کر مسجد کے دروازے تک لے جانا چاہتی ہے۔'' اتنا کہہ کر ٹھا کر کرشن راؤ نے پورے زور و شور کے ساتھ بلبن کی شان میں قصیدہ پڑھنا شروع کر دیا۔

''سلطان! آپ تو وہ ہیں کہ جس نے اسلامی عدل و انصاف کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے محبوب غلام ہیبت خان کو ایک عام آدمی کے قتل میں ملوث ہونے کے بعد مقتول کی بیوی کے حوالے کر دیا تھا کہ وہ چاہے تو ہیبت خان کو معاف کر دے اور اگر چاہے تو اس کی جان لے لے۔'' کرشن راؤ نے ایک ایسے واقعہ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا جو تاریخ ہند کی پیشانی پر نقش ہو کر رہ گیا ہے۔

''اور آپ تو وہ ہیں کہ آپ نے ایک معمولی فراش کے قتل کا فیصلہ اس طرح کیا کہ بدایوں کے حاکم ملک نعیق کی لاش چوراہے پر لٹکا دی۔ اگرچہ ملک نعیق درباری امراء میں شامل تھا لیکن آپ نے اس مظلوم بیوہ کو مایوس نہیں کیا جو سلطان کے حضور فریاد لے کر آئی تھی۔'' کرشن راؤ نے بلبن کے انصاف کا دوسرا تاریخی حوالہ پیش کیا اور فرمانروائے ہند کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

بلبن کچھ دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ کہنے لگا۔ ''سلطان مرحوم بھی بہت زیادہ منصف مزاج تھے مگر اپنی کریمانہ فطرت سے مجبور ہو کر اکثر مجرموں کو معاف کر دیا کرتے تھے۔'' بلبن نے اپنے پیش رو حکمران سلطان ناصرالدین محمود کی بلند کرداری کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ انداز فکر کسی اور کیلئے درست ہو سکتا ہے لیکن میں اسے جائز نہیں سمجھتا۔'' اچانک بلبن کا لہجہ سخت ہو گیا تھا..... ''اگر حکومت اور ملک کے دشمن کسی چیونٹی کے سوراخ میں بھی داخل ہو جائیں گے تو میری نظریں انہیں ڈھونڈ نکالیں گی۔ میرے انصاف کے دروازے سب کیلئے کھلے ہوئے ہیں۔ وہ مسلمان ہو یا کسی اور مذہب کا ماننے والا۔ میری عدالت میں سب برابر ہیں۔''

اس کے بعد سلطان غیاث الدین بلبن نے براہ راست کرشن راؤ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا..... ''میں نے تیری پوری جماعت کے قبول اسلام کو دل سے تسلیم کر لیا' مگر یہ ایک نازک معاملہ ہے۔ تجھے بھرے مجمع میں اعلان کرنا ہوگا کہ کسی ہندو پر جبر نہیں کیا گیا۔ جو شخص بھی مندر کی چار دیواری سے نکل کر مسجد کے دروازے تک آیا ہے اس میں خود اس کی اپنی مرضی شامل ہے..... اور تجھے اپنے ہم مذہبوں کو یہ بھی بتانا ہوگا کہ تیری شہ رگ پر کسی مسلمان کی تلوار کا دباؤ نہیں تھا۔''

کرشن راؤ اور اس کے ساتھی پجاریوں نے اپنی گردنیں خم کر دیں۔

اور پھر اسی روز ایک میدان میں ہزاروں انسانوں کے درمیان کرشن راؤ نے علی الاعلان کہا۔

''میں اور میرے سینکڑوں ساتھی اپنی خوشی سے اسلام قبول کر رہے ہیں کہ یہ ایک سچا مذہب ہے۔''

***

دیوداسی شکنتلا مندر سے نکل کر کئی دن تک دہلی کی گلیوں میں بھٹکتی رہی۔ شجاع الدین کامران نے ایک بار اسے اپنے مکان کا پتہ سمجھانے کی کوشش کی تھی' مگر وقت کے ہنگاموں نے شکنتلا کے ذہن کو الجھا کر رکھ دیا تھا۔ اس لئے وہ گلیوں کے پیچ و خم کو یاد نہ رکھ سکی' پھر بڑی مشکل سے ٹھوکریں کھاتی ہوئی اس کھنڈر تک پہنچی جسے کامران اپنے ''برباد

آشیانے" کے نام سے پکارتا تھا۔

سعدیہ خانم ایک اجنبی لڑکی کو دیکھ کر پریشان سی نظر آنے لگی...... "تو کون ہے بیٹی؟" سعدیہ خانم نے جھجکتے ہوئے کہا' مگر اپنے لہجے کی شائستگی کو برقرار رکھا۔

"شاید میں آپ سے اپنا تعارف نہ کرا سکوں مگر شجاع الدین کامران مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔" یہ کہہ کر شکنتلا سعدیہ خان کے قریب ہی فرش پر بیٹھ گئی اور شکستہ درو دیوار کو بڑی حسرت سے دیکھنے لگی۔

سعدیہ خانم نے گہری نظروں سے شکنتلا کی اضطراری حرکات کا جائزہ لیا۔

دیوداسی ان بوڑھی آنکھوں کا مفہوم سمجھ چکی تھی۔ اس لئے سعدیہ خانم کے سوال سے پہلے ہی بول اٹھی۔ "میں غائبانہ طور پر اس گھر کے ایک ایک گوشے سے واقف ہوں۔ ٹھاکر نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔"

"کون ٹھاکر؟" سعدیہ خانم نے گھبرا کر پوچھا۔ ٹھاکر کا لفظ سن کر اس کا خیال کرشن راؤ کی طرف چلا گیا تھا۔

"میں رائے نعیم الدین ذیشان کے بیٹے شجاع الدین کامران کو ٹھاکر کہہ کر مخاطب کرتی تھی۔" شکنتلا نے مطمئن لہجے میں جواب دیا...... "آپ کا نام سعدیہ خانم ہے اور آپ کے بھائی قائم خان کی وجہ سے ٹھاکر نے بہت اذیتیں برداشت کی ہیں۔

سعدیہ خانم شکنتلا کی باتیں سن کر سناٹے میں آ گئی۔ ایک اجنبی لڑکی کسی رازدار کی طرح بول رہی تھی۔

پھر دیوداسی شکنتلا نے سعدیہ خانم کو تمام واقعات سنا دیئے اور انتہائی مضطرب لہجے میں کہنے لگی...... "میں ٹھاکر سے ملنا چاہتی ہوں۔ وہ اس وقت کہاں ہیں؟"

کامران کے ذکر پر سعدیہ خانم رونے لگی...... "اب ٹھاکر کہاں رہا بیٹی؟ بس ایک لاش ہے جس کی تدفین کچھ دنوں کیلئے ملتوی ہو گئی ہے۔"

سعدیہ خانم نے اپنا اور بیٹے کا فسانہ درد سنایا تو شکنتلا کا دامن بھیگ گیا...... اور کھنڈر نما مکان پر کسی ماتم کدے کا گمان ہونے لگا۔

سعدیہ خانم نے بہت کوشش کی کہ وہ کسی طرح شکنتلا کو کامران تک پہنچا دے' مگر داروغہ زندان نے کسی دوسرے شخص کو ملزم سے ملنے کی اجازت نہیں دی۔

اور جب کامران کو معلوم ہوا کہ شکنتلا اس کے گھر تک آ پہنچی ہے تو وہ کچھ دیر کیلئے زندان کی دیواریں گر جانے کی دعائیں کرنے لگا...... مگر یہ ایک مجبور قیدی کا خواب تھا۔ پھر جب خواب کا طلسم زائل ہوا تو کامران نے سعدیہ خانم سے التجا کرتے ہوئے کہا۔

"ماں! اس لڑکی کا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ میرے مرنے کے بعد اسے اپنے بیٹے کامران کی طرح عزیز رکھنا۔ یہی میری آخری خواہش ہے۔"

❋❋❋

وہ دن ہندوستان کی تاریخ میں بڑا ہنگامہ خیز تھا۔ جب سلطان غیاث الدین بلبن نے ایک لشکر جرار کے ساتھ پورے جنگل کا محاصرہ کر لیا تھا۔ لٹیرے کچھ دیر تک سلطانی فوج کے ساتھ مقابلہ کرتے رہے اور پھر شکست کھا کر ادھر ادھر بھاگنے لگے' مگر آج ان کیلئے کوئی راہ فرار نہیں تھی۔ بلبن کا محاصرہ اس قدر تنگ ہو چکا تھا کہ لٹیرے خود بخود ہلاکت و بربادی کے کھلے ہوئے جبڑوں میں کود رہے تھے اور موت مسلسل آوازیں دے رہی تھی۔

"ہے کوئی اور...... ہے کوئی اور......"

سردار نرسنگا امر پالی کے ساتھ اپنی پناہ گاہ کے دروازے پر اداس کھڑا تھا۔ کچھ جاں نثار نرسنگا کے قریب آئے تو اس نے چیخ کر کہا۔

''آج تم لوگوں پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ خفیہ راستوں سے نکل کر بھاگ جاؤ۔ زندہ بچ گئے تو پھر آملیں گے۔''

''سردار! ہم کہاں جائیں؟'' کئی لٹیروں نے بیک زبان کہا...... ''ایک ایک خفیہ راستے پر سلطان کے پچاس پچاس سپاہی کھڑے ہیں۔''

''ان راستوں کی سلطان کو کیسے خبر ہوئی؟ نرسنگا کسی شیر کی طرح دھاڑا۔

''کیا بتائیں سردار؟ ہم میں سے کسی نے غداری کی ہے۔''

❋❋❋

لٹیروں نے سر جھکا دیئے۔

وہ بے خبر قزاق نرسنگا کو کیا بتاتے کہ ٹھاکر کرشن راؤ نے حکومت کی نظروں میں معزز بننے کیلئے لٹیروں کے ایک ایک خفیہ راستے کی نشاندہی کر دی تھی۔

یکایک جنگل کے ایک گوشے میں آگ کے شعلے بھڑک اٹھے۔ سلطان غیاث الدین بلبن نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا تھا کہ وہ جنگل میں آگ لگا دیں۔ اس طرح یا تو لٹیرے جل کر راکھ ہو جائیں گے یا پھر وہ آگ کے حصار سے نکلنے کی کوشش کریں گے اور بے نیام شمشیروں کی خوراک بن جائیں گے۔

جنگل میں ہر طرف ایک حشر برپا تھا اسی دارو گیر کے ہنگامے میں نرسنگا نے اپنی محبوب بیوی کی طرف دیکھا۔

''امر پالی! میں نہیں چاہتا کہ میرے مرنے کے بعد تیرا خوبصورت جسم کسی امیر کے عشرت کدے کی زینت بن جائے۔'' نرسنگا کے لہجے میں ناقابل بیان کرب تھا۔ اب وقت آگیا ہے کہ تو مجھ سے کیا ہوا عہد نبھا دے اور اپنے دیوتا پر قربان ہو جا۔'' یہ کہہ کر نرسنگا نے خنجر کھینچا اور امر پالی کی طرف بڑھا دیا۔

❋❋❋

امر پالی نے چمکتے ہوئے خنجر کو بڑی حیرت سے دیکھا۔ "یہ کیا ہے سردار؟"
"تیری وفا کا امتحان" نرسنگا نے تیز لہجے میں کہا۔ "وقت بہت کم ہے امر پالی میری نظروں کے سامنے اس خنجر سے اپنی شہ رگ کاٹ لے اور اس دیوتا پر قربان ہو جا جسے تو ساری عمر پوجتی رہی ہے۔"
امر پالی نے ایک نظر اپنے محبوب کی طرف دیکھا اور خنجر لے لیا۔
"میں نہیں چاہتا کہ میرے بعد سلطان کے فوجی تجھے گرفتار کر لیں اور پھر کسی درباری امیر کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے تیرے جسم کا نذرانہ پیش کر دیں۔" نرسنگا کی زبان سے آگ برس رہی تھی' مگر آنکھوں میں غبار سا تھا جیسے گہرے بادل امڈ امڈ کر آ رہے ہوں۔
"ہم نے ایک ساتھ جینے اور مرنے کا وعدہ کیا تھا سردار!" امر پالی نے پر اعتماد لہجے میں کہا۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ یا افسردگی کا ہلکا سا عکس بھی نہیں تھا۔
"نرسنگا کی مملکت تباہ ہو چکی' اس لئے سردار نرسنگا بھی مر گیا......" قزاقوں کا سربراہ اپنی زندگی میں پہلی بار تھکا تھکا سا نظر آ رہا تھا۔ "نرسنگا کی رعایا تو ماری جا چکی' اس کا تاج پیروں سے روندا جانے والا ہے۔"
"پھر امر پالی بھی مر چکی۔" جنگل کی ملکہ نے اونچی آواز میں کہا اور تیزی سے اپنی خواب گاہ کی طرف بڑھی۔ نرسنگا اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔
امر پالی نے خواب گاہ میں داخل ہو کر اپنا سب سے خوبصورت لباس پہنا' تمام زیورات اور ہیرے جسم پر سجائے' پھر ایک ادائے دلبری کے ساتھ نرسنگا کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ دیکھنے والا حیران تھا کہ ان خونی لحات میں بھی امر پالی کس قدر پر سکون نظر آ رہی تھی۔
"میں کیسی لگتی ہوں سردار؟" امر پالی نے اس طرح کہا جیسے کوئی دوشیزہ نیا نیا اقرار محبت کرنے کے بعد اپنے محبوب سے اپنی ذات کے بارے میں سوال کرتی ہے۔
نرسنگا کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے دل میں بیک وقت کئی شگاف پڑنے والے ہیں۔ وہ آہنی اعصاب کا انسان تھا۔ فوراً ہی سنبھل گیا اور ایک افسردہ مسکراہٹ کے ساتھ کہنے لگا۔
"میری امر پالی تو آکاش کی اپسرا سے بھی زیادہ حسین لگ رہی ہے۔" انتہائی کوشش کے باوجود نرسنگا اپنے لہجے کی لرزش کو چھپانے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔
امر پالی نے آخری بار اس شخص کی طرف دیکھا جو ساری دنیا کی نظروں میں ایک بے رحم قزاق تھا' مگر خود اس کیلئے دیوتا کا درجہ رکھتا تھا۔
پھر یکا یک امر پالی کا ہاتھ بلند ہوا اور اس نے نرسنگا کا تیز خنجر اپنی شہ رگ پر پھیر دیا۔ خون کی ایک دھار نکلی اور

خواب گاہ کے فرش کو رنگین کرنے لگی۔ نرسنگا نے پاگلوں کی طرح امر پالی کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا اور پھر سارا خون اس کے سینے پر گر کر پیرہن میں جذب ہونے لگا۔

امر پالی لڑکھڑانے لگی' نرسنگا نے اسے سہارا دینے کی کوشش کی لیکن امر پالی زمین کی طرف جھکتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ اس نے نرسنگا کے قدموں پر سر رکھ دیا۔

''آکاش کے دیوتا دیکھ رہے ہیں کہ میں دھرتی کے دیوتا پر قربان ہوگئی......'' امر پالی کی آواز ڈوبتی جا رہی تھی۔ ''سردار! اپنے ہاتھوں سے میری چتا کو آگ لگانا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ سلطان کی لگائی ہوئی آگ کے شعلے میرے جسم کو جلا کر راکھ کر ڈالیں۔'' یکایک امر پالی کی آواز بند ہوگئی۔ وہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی مگر اس کے ہونٹ کانپ کر رہ جاتے تھے۔

نرسنگا بے قرار ہو کر نیچے جھک گیا۔ اس نے امر پالی کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ نرسنگا کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ امر پالی کے چہرے پر اذیت و کرب کے سائے لرزنے لگے۔

''تو نے دوستی کا حق ادا کر دیا امر پالی۔'' نرسنگا کے آنسو بہہ بہہ کر امر پالی کے رخساروں پر گر رہے تھے۔ ''تو برے وقت کی بہترین رفیق تھی۔ تیرے بغیر یہ دنیا ایک ویرانہ ہے۔ میں بہت جلد تجھ سے آملوں گا۔ اب میرے پیروں میں خوف کی کوئی زنجیر نہیں۔ میں تیرا شکر گزار ہوں کہ تو نے مجھے ہزاروں اندیشوں سے آزاد کر دیا۔ اب مرتے وقت مجھے یہ اذیت ناک خیال پریشان نہیں کرے گا کہ سلطان کے سپاہی اس جسم پر قابو پا جائیں گے جسے نرسنگا کے سوا کسی نے نہیں چھوا تھا۔''

امر پالی کے بے جان سے ہونٹوں پر ایک دم توڑتی ہوئی مسکراہٹ ابھری اور پھر ان آنکھوں کے چراغ بجھ گئے جن کی روشنی میں نرسنگا نے اپنی تاریک زندگی کا طویل سفر طے کیا تھا۔

قزاقوں کا سردار کچھ دیر تک امر پالی کی لاش کو دیکھتا رہا۔ پھر اپنے آنسوؤں کو دامن سے خشک کیا اور امر پالی کی لاش کو اٹھا کر پناہ گاہ کے دروازے تک آیا جہاں پچاس ساٹھ جاں نثار اس کا انتظار کر رہے تھے۔

امر پالی کی خون میں نہائی ہوئی لاش دیکھ کر لٹیروں کے منہ سے چیخیں نکل گئیں۔ ''یہ کیا ہوگیا سردار؟''

''کچھ نہیں!'' نرسنگا نے سخت لہجے میں کہا۔

''جنگل کی ملکہ اپنے دیوتا پر قربان ہوگئی۔''

دہشت سے لٹیروں کے چہرے سیاہ پڑ گئے۔

''اپنی مہارانی کی آخری رسم ادا کرنے کیلئے چتا تیار کرو۔ وقت بہت کم ہے۔'' نرسنگا نے حکم دیتے ہوئے کہا اور اس آگ کی طرف دیکھا جو بہت تیزی سے پھیلتی جا رہی تھی۔

لٹیرے منتشر ہوگئے اور کچھ دیر بعد نرسنگا نے اپنے ہاتھوں سے امر پالی کی چتا کو آگ لگا دی۔

نرسنگا کو محسوس ہوا جیسے اس کا پورا وجود جل اٹھا ہے۔ وہ کسی چٹان کی طرح چتا کے قریب کھڑا تھا اور بار بار آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

پھر جب ایک عورت کا دلفریب سراپا راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہوگیا تو نرسنگا نے اپنی پناہ گاہ کو آگ لگا دی۔ ساتھی لٹیرے اسے روکتے رہے مگر وہ ہر بار کہتا رہا۔

''جب اپنے دل و جان ہی جل گئے تو پھر ان بے وفا چیزوں کو کس کیلئے چھوڑوں؟ مکان کی زینت مکینوں کے

اس کے بعد نرسنگا اپنے پچاس ساٹھ جاں نثاروں کے ساتھ ایک خفیہ راستے کی طرف بڑھنے لگا۔ سلطان غیاث الدین بلبن کے سپاہی وہاں بھی موجود تھے۔ کرشن راؤ نے نرسنگا کے ایک ایک خفیہ ٹھکانے کی مکمل نشاندہی کردی تھی۔ نرسنگا اور اس کے ساتھی بڑی بے جگری سے لڑے۔ وہ اپنے سردار کو درمیان میں لے کر سلطان کے سپاہیوں سے جنگ کر رہے تھے۔ بلبن کے فوجی شاید پسپا ہو جاتے مگر تازہ کمک پہنچ جانے کے سبب ان کی طاقت میں مزید اضافہ ہو گیا' پھر ایسا گھمسان کارن پڑا کہ کسی کو کسی کی خبر نہیں رہی۔

سلطان غیاث الدین بلبن کی مہم کامیابی سے ہمکنار ہو چکی تھی۔ اس معرکے میں ایک لاکھ سے زیادہ لٹیرے مارے گئے۔ کوئی ایک قزاق بھی زندہ نہیں رہا۔ پورا جنگل راکھ ہو چکا تھا۔

مضافاتی علاقوں کے باشندوں نے بلبن کو بیشمار دعائیں دیں۔ خوف و ہراس کے عالم میں کئی سال گزارنے کے بعد مجبور انسانوں نے آج سکون اور چین کی پہلی سانس لی تھی۔

بلبن نے جنگل کا صفایا کرنے کے بعد وہ ساری زمین زراعت پیشہ لوگوں میں تقسیم کردی۔

❋❋❋

لٹیروں کی ہلاکت اور جنگل کی بربادی کی سب سے زیادہ خوشی کرشن راؤ کو ہوئی تھی' مگر پھر بھی ایک انجانا سا خوف اسے پریشان کر رہا تھا۔ کرشن راؤ نے بڑی رازداری کے ساتھ رام سروپ سے کہا۔

''پجاری! کہیں وہ درندہ بچ تو نہیں گیا؟'' کرشن راؤ کا اشارہ سردار نرسنگا کی طرف تھا۔ ''مجھے یقین نہیں آتا کہ سلطان کے سپاہیوں نے اس راکشس کو قتل کر ڈالا۔''

''تمام سرکاری ذرائع یہی کہہ رہے ہیں کہ اس مقابلے میں نرسنگا بھی مارا گیا۔'' جوش مسرت سے رام سروپ کی آواز کانپ رہی تھی۔

''کیا کسی سپاہی نے نرسنگا کی لاش دیکھی؟'' کرشن راؤ کے چہرے پر اب بھی خوف و دہشت کی ہلکی ہلکی پرچھائیاں لرز رہی تھیں۔

''نرسنگا کی موت پر سلطان کا کوئی سپاہی کس طرح شہادت دے سکتا ہے کہ ہم لوگوں کے سوا اس کا صورت آشنا کون تھا؟''

ٹھاکر کرشن راؤ اچانک اداس نظر آنے لگا...... ''پجاری! مجھے ایسا لگتا ہے کہ نرسنگا زندہ ہے اور چھپ کر میرا تعاقب کر رہا ہے۔''

''ٹھاکر! یہ محض آپ کا واہمہ ہے۔'' رام سروپ نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا...... ''تمام دہلی میں یہ خبر مشہور ہے کہ ایک لٹیرا بھی سلطان کے قہر و غضب سے محفوظ نہیں رہا۔ جنگل میں مردہ جسموں کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ ان ہی میں نرسنگا بھی کسی جنگلی جانور کی طرح بے حس و حرکت پڑا ہوگا۔''

پجاری رام سروپ کی باتوں سے ٹھاکر کرشن راؤ بہل گیا اور پنڈت بدری ناتھ کی اس پیش گوئی کے ظاہر ہونے کا انتظار کرنے لگا جس کے مطابق سلطان غیاث الدین بلبن کو دو سال کے اندر مغلوں کے ایک حملے میں مارا جانا تھا۔

❋❋❋

تمام لٹیروں کو قتل کرنے اور مجرموں کی ایک ایک پناہ گاہ کو مسمار کرنے کے بعد سلطان غیاث الدین بلبن شجاع الدین کامران کی طرف متوجہ ہوا جس پر غیر قانونی ٹکسال قائم کرنے اور مصنوعی سکے ڈھالنے کا الزام تھا۔

''ہم نے تجھے یہ مہلت صرف ... اہم کر سکے اور تیری گستاخ کلامی

سے آنے والا مورخ یہ تاثر نہ لے کہ سلطان غیاث الدین بلبن کی قائم کردہ عدالت ایک تماشا گاہ تھی اور اس کا انصاف محض ایک افسانہ......'' بلبن نے شجاع الدین کامران کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''سلطان! میں آپ کی مملکت کا وہ بدنصیب انسان ہوں جو اپنے حق میں ایک بھی شہادت نہیں رکھتا۔'' شجاع الدین کامران کے لہجے میں ٹھہراؤ بھی تھا اور بے نیازی بھی...... ''اگر آپ کا قانون میری شہادت کو قبول کرے تو میں خود اپنا گواہ ہوں یا پھر میری غمزدہ ماں جس نے شوہر کے قتل ہونے سے لے کر آج تک آپ کی اس جنت ارضی میں سکون کا ایک سانس بھی نہیں لیا۔'' یہ کہہ کر شجاع الدین کامران نے سعدیہ خانم کی طرف دیکھا جو ایک گوشے میں دیوداسی شکنتلا کے ساتھ اداس کھڑی تھی۔ کامران کو شکنتلا کی موجودگی پر کوئی تعجب نہیں ہوا کہ سعدیہ خانم اسے پہلے ہی ایک ملاقات میں دیوداسی کی رہائی اور ٹھاکر کرشن راؤ کے مسلمان ہونے کی اطلاع دے چکی تھی۔

ہزاروں جراحتوں اور بیشمار زخموں نے سعدیہ خانم کو بدحواس بنا دیا تھا' پھر جیسے ہی بے یارو مددگار بیٹے نے اس کی طرف دیکھا وہ دربار شاہی کے آداب کو فراموش کر کے بے اختیار چیخنے لگی۔

''بیٹے! زندگی نے آج تجھے وہ چند لمحے بخش دیئے ہیں جو ایک مفلس و نادار انسان کیلئے خواب و خیال بن کر رہ گئے تھے۔ خدا کے واسطے ان لمحوں کو اپنی گرفت میں لے لے۔ اگر یہ ساعتیں بچھڑ گئیں تو پھر ان کے دوبارہ ملنے کا امکان تک باقی نہیں رہے گا۔''

سعدیہ خانم کی فریاد جاری تھی کہ عدالت کے اہلکار نے آگے بڑھ کر اسے خاموش کرنے کی کوشش کی۔

''حضور شاہ کے سامنے اونچی آواز میں بولنا گستاخی ہے۔''

''میں کوئی درباری نہیں ہوں۔''

سعدیہ خانم نے اہلکار کی تنبیہ کو جھٹلاتے ہوئے کہا۔

''عدالت کے روبرو انصاف طلب کرنے والے اسی لہجے میں بولتے ہیں جس انداز میں ان کے دلوں پر قیامت نازل ہوتی ہے۔''

سعدیہ خانم کی یہ بیباکی دیکھ کر سلطان غیاث الدین بلبن کی پیشانی شکن آلود ہو گئی' مگر وہ زبان سے کچھ نہیں بولا۔ پھر بھی دیکھنے والے دیکھ رہے تھے کہ بلبن کی آنکھوں میں ناپسندیدگی کا رنگ نمایاں ہو گیا ہے......اور واقعہ بھی یہی تھا کہ سعدیہ خانم کے جرأت مندانہ لہجے نے بلبن کے دل و دماغ کو مکدر کر دیا تھا۔ عام درباری شجاع الدین کامران کی زندگی سے مایوس نظر آ رہے تھے' مگر حالات کا یہ موڑ قائم خان اور امیر طغرل کے اطمینان میں مزید اضافہ کر رہا تھا۔

عدالت کے اہلکار کی تنبیہ کو نظر انداز کر کے سعدیہ خانم نے شجاع الدین کامران کی جانب دیکھا اور پھر اس جلتے ہوئے لہجے میں کہنے لگی۔

''بیٹے! شہنشاہ سے سب کچھ کہہ دے۔ اس دنیا کی ایک ایک نوازش کو سلطان کے سامنے بیان کر دے۔ میں تجھے اجازت دیتی ہوں کہ آج کھوکھلے رشتوں کے سارے بتوں کو ریزہ ریزہ کر دے۔ تمام پارساؤں کے ایک ایک گناہ کو بے نقاب کر دے کہ شہنشاہ بھی ان چہروں کی سیاہیاں اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔''

بڑے آزمائشی لمحات تھے۔ کامران نے ممتا کے سمندر کو سر دربار موجزن ہوتے دیکھا۔ چند ساعتوں کیلئے اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ جذبات کی تیز موجوں میں غرق ہو جائے گا......مگر کامران دل کے رستے ہوئے خون کو روح کی گہرائیوں میں اتارتا رہا۔ اس نے کسی زخم کو سینے پر نمایاں نہیں ہونے دیا۔ وہ اپنی غمزدہ ماں کو کس طرح سمجھاتا کہ

اس کی بارہ سالہ قید کے پس منظر میں امیر طغرل اور قائم خان کے ستمگر ہاتھ متحرک تھے...... قائم خان' یاسمین خانم کا باپ تھا...... اور امیر طغرل شوہر۔ وہ جانتا تھا کہ پہلے تو عدالت امیر طغرل اور قائم خان کی سازش کو تسلیم نہیں کرے گی...... اور اگر تسلیم کر بھی لیا تو اس سازش کی وجہ بھی دریافت کرے گی اور پھر وہ بھری عدالت میں سلطان کو یہ کس طرح بتائے گا کہ اس کے ساتھ کی جانے والی ناانصافیوں کا سبب قائم خان کی بیٹی یاسمین خانم ہے...... یہ کیسی رسوائی ہوگی؟ محبت کی رسوائی...... انسان کو انسان بنانے والے جذبوں کی رسوائی...... اور سب سے بڑھ کر یاسمین خانم کی رسوائی جو اس کا ماضی بھی تھی اور حال بھی...... اس نے حریم دل میں جس محبوب ذات کو اپنے آپ سے بھی چھپایا تھا وہ لوگوں کے ہجوم میں اس کا نام کس طرح زبان پر لائے گا؟

آج یہی خوف رسوائی دامن کش تھا۔ وہ اپنی مہربان و شفیق ماں کو کس طرح بتاتا کہ اس کی مجبوریاں کیا ہیں؟

شجاع الدین کامران موت و زیست کے دوراہے پر کھڑا' اس شعر کی تصویر بن کر رہ گیا تھا۔ ؎

نہ تم میرے نہ دل میرا' نہ جان ناتواں میری
تصور میں بھی آسکتی نہیں مجبوریاں میری

اور پھر یہی ہوا۔ مجبوریوں نے اس کے ہونٹوں کو پتھرا کر رکھ دیا۔ غیاث الدین بلبن کے سامنے وہ اپنے لبوں کو بس اسی قدر جنبش دے سکا۔

''سکے ڈھالنے کا جرم تو بہت بڑا الزام ہے سلطان! میں تو ان لوگوں میں سے کسی شخص کو جانتا بھی نہیں۔ یہ لوگ کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں...... اور میں نے ان کا کیا بگاڑا ہے جو وہ میرے خلاف اتنی دیدہ دلیری سے شہادتیں دے رہے ہیں؟'' کیا یہ سب کے سب مسلمان ہیں؟'' شجاع الدین کامران نے عدالت سے بڑا عجیب سوال کیا تھا۔

غیاث الدین بلبن پہلے ہی برہم تھا۔ ایک ملزم کی بیباکی پر کچھ اور برہم ہوگیا...... ہاں! یہ سب مسلمان ہیں جو تیرے ورغلانے پر اس قدر سنگین جرم کے مرتکب ہوئے ہیں۔'' سلطان کی بارعب آواز ابھری اور اہل دربار لرز کر رہ گئے۔

کامران چند لمحوں تک کچھ سوچتا رہا' پھر اسی بے نیازانہ لہجے میں کہنے لگا...... ''اگر یہ مسلمان ہیں تو قرآن مقدس پر ہاتھ رکھ کر کہہ دیں کہ ان لوگوں نے مجھے جرم کرتے دیکھا ہے یا یہ خود میرے شریک جرم رہے ہیں۔''

موت کے دہانے پر کھڑے ہوئے نوجوان کی جرأت مسلسل نے بلبن کو مزید غضبناک بنا دیا تھا...... مگر عدالتی تقاضوں نے اسے مجبور کردیا کہ وہ قرآن کریم منگائے اور تمام مجرموں سے حلف لے۔

وہ منظر بڑا روح فرسا تھا' جب سارے مجرم ایک ایک کر کے جھوٹی قسم کھانے کیلئے آمادہ ہوگئے۔

پہلے مجرم کے حلف نامے پر کامران نے آنکھیں بند کرلیں اور شدت خوف سے اس کا پورا جسم لرزنے لگا۔

پھر دوسرا مجرم آیا اور اس نے بلند آواز میں سر دربار کہنا شروع کیا۔

''میں قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کر کہتا ہوں کہ مجھے کامران نے دولت کا لالچ دے کر اس جرم کیلئے اکسایا۔ وہ غیر قانونی ٹکسال کا مالک ہے اور مختلف لوگوں سے سکے ڈھالنے کا کام لیتا رہتا ہے۔ پھر جب میں اس حقیقت سے آگاہ ہوا کہ میرا یہ فعل سلطان کے نزدیک بہت بڑا گناہ ہے تو میں نے خود ہی حکومت کے کارندوں کو اس مقام کا پتا بتایا جہاں رات کے اندھیرے میں یہ ملک دشمن سرگرمیاں جاری رہتی ہیں۔'' بولنے والا اتنے اثر انگیز لہجے میں بول رہا تھا جیسے وہ کوئی عظیم محب وطن ہو اور اس نے ملک کو بچانے کیلئے خود اپنے ہاتھوں سے بیڑیاں پہن لی ہوں۔

پھر جب تیسرا مجرم حلف اٹھا...

''بس شہنشاہ! رہنے دیجئے! اب مجھے کسی ایسی شہادت کی ضرورت نہیں۔''

بیچنے والوں نے اپنا ایمان بہت کم قیمت میں فروخت کر دیا تھا...... اور ایمان کی اسی تجارت نے کامران کی سزائے موت پر بھی مہر تصدیق ثبت کر دی تھی۔

اور پھر سلطان غیاث الدین بلبن نے کسی تامل کے بغیر شجاع الدین کامران کو دوبارہ پھانسی کی سزا سنا دی تھی۔

اب کہنے کو کچھ باقی نہیں رہا تھا' مگر ایک بے قرار ماں کے دل کا درد پگھل پگھل کر ہونٹوں سے ٹپک رہا تھا اور وہ چیخ چیخ کر بلبن کے انصاف کو آواز دے رہی تھی۔

''شہنشاہ! میں نے تیرے انصاف کے بہت چرچے سنے تھے مگر آج مجھے یقین آ گیا کہ وہ سارے واقعات جھوٹے تھے......'' اپنے جواں سال بیٹے کو موت کے غار کی طرف جاتے دیکھ کر سعدیہ خانم نے اپنے ہوش و حواس کھو دیئے تھے اور وہ تاجدار ہند سے اس لہجے میں مخاطب تھی جسے بلبن جیسا سخت گیر حکمران برداشت کر ہی نہیں سکتا تھا۔

''انصاف ہو چکا۔'' غیاث الدین بلبن کی قہر آلود آواز اس طرح ابھری کہ اہل دربار کے جسموں کی لرزش کے سبب ان کی نشستوں کے زاویے بھی بدل گئے۔

''ہمارے انصاف کی کوئی روایت جھوٹی نہیں۔''

''سلطان! میں اپنے پیدا کرنے والے کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میرے بچے کے ساتھ انصاف نہیں ہوا......'' سعدیہ خانم دیوانہ وار چیخ رہی تھی...... میرا یتیم بچہ بارہ سال تک اسیر زنداں رہ کر مقتل تک پہنچ گیا۔ صرف اس شخص کی سازشوں کے سبب جو تیرے دربار کا ایک معزز رکن ہے۔'' بالآخر سعدیہ خانم نے اس بات کی طرف اشارہ کر ہی دیا جس کا بوجھ اپنے سینے پر لئے ہوئے کامران اس دنیا سے گزر جانا چاہتا تھا۔

یہ لمحے شجاع الدین کامران پر بہت گراں تھے۔ زندگی سے مکمل طور پر مایوس ہو جانے کے بعد وہ خود بھی دربار شاہی میں ہنگامہ برپا کر سکتا تھا مگر یاسمین خانم کی رسوائی کے خوف نے اسے تہمتوں کا یہ آخری زہر بھی چپ چاپ پینے پر مجبور کر دیا تھا اور اس نے ایک ایک قطرہ اپنے جسم میں اتار بھی لیا تھا...... لیکن جب مامتا کی آگ کے شعلے بھڑکے تو کامران کو یہ خطرہ لاحق ہو گیا کہ اس کی زندگی کا یہ شبنمیں اور حریری راز بھی ان شعلوں کی لپیٹ میں آ جائے گا۔

کامران کو یقین تھا کہ سلطان غیاث الدین بلبن پلٹ کر سعدیہ خانم سے پردے کے پیچھے رہنے والے اس شخص کا نام ضرور پوچھے گا' مگر ہندوستان کا یہ حکمران آہنی دل و دماغ رکھتا تھا۔ ایک بار ذہن جس نتیجے پر پہنچ جاتا' پھر کسی شخص میں اتنی صلاحیت نہیں تھی کہ اس کے فیصلے کو تبدیل کرا سکتا۔ بلبن کی زبان پتھر کی زبان تھی۔ ایک مرتبہ جو الفاظ ادا ہو گئے' پھر ان میں کسی قسم کی لچک ممکن نہیں تھی۔

غیاث الدین بلبن اپنی فطرت سے مجبور تھا اور سلطان کی اسی مجبوری نے سعدیہ خانم کے شور و فغاں کو ایک پاگل عورت کے ہذیان سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔

''بلبن کے حضور نہ کوئی سفارش کام آتی ہے اور نہ اس کا نظام عدل کسی سازش سے متاثر ہوتا ہے۔'' سلطان نے اپنے رعب و جلال کا بھرم رکھنے کیلئے سعدیہ خانم کے ایک ایک آنسو اور ایک ایک چیخ کو اس طرح جھٹلا دیا تھا جیسے اسے پکارنے والا کوئی انسان نہ ہو۔

جب سعدیہ خانم کو ہر دروازہ بند ہوتا ہوا نظر آیا تو اس نے والی ہند کے رحم کو صدا دی۔

''شہنشاہ! میں اپنی بدنصیبیوں کا ذکر کر کے تیری خوش بختیوں کے کیف آور خواب میں کوئی خلل ڈالنا نہیں چاہتی۔ میں بہت محروم عورت ہوں [illegible] کی یلغار کو تنہا برداشت کیا اور اپنے

آسودہ حال ماں باپ کی طرف بھی مڑ کر نہیں دیکھا' مگر آج تیرے سامنے دامن پھیلاتی ہوں۔ تجھے تیری اولاد اور اس عظیم الشان سلطنت کا واسطہ! مجھے میرے بیٹے کی زندگی کی بھیک دے دے۔"

دربار شاہی میں سعدیہ خانم کی آخری چیخ کی گونج ابھی باقی تھی کہ شجاع الدین کامران کی پرشور آواز بھی اس چیخ میں شامل ہو گئی۔

"ماں! خدا کیلئے میرے آباؤ اجداد کی روح کو شرمندہ نہ کیجئے۔" شجاع الدین کامران کی آواز سے پورا دربار گونج رہا تھا۔ اگر ہمارے خاندان میں کسی فرمانروا سے زندگی کی بھیک مانگنے کی رسم جائز ہوتی تو سب سے پہلے میرے والد رائے نعیم الدین ذیشان' اسی تخت پر بیٹھنے والے سلطان معزالدین بہرام شاہ کے سامنے اپنا دامن پھیلاتے...... مگر آپ خوب جانتی ہیں کہ میرے باپ کس شان بے نیازی کے ساتھ دنیا سے رخصت ہوئے ہیں۔ سلطان معزالدین بہرام شاہ کی یہ حسرت اس کے دل ہی میں رہ گئی کہ کسی طرح ایک راجپوت کی گردن میں ہلکا سا خم نمایاں ہو جائے...... میری عظیم ماں! کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ جس طرح آپ کے شوہر خون سے نہائے ہوئے قبر تک پہنچے' اسی طرح سلطان بہرام شاہ کا لباس بھی اس کے خون سے سرخ تھا...... مگر پھر بھی دونوں کی موت میں بڑا فرق تھا۔ سلطان بہرام شاہ انقلابیوں سے اپنی زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا اور اس ذلت پر بھی رضامند تھا کہ اسے آخری سانس تک زنجیریں پہنا کر زندان کی تاریکیوں میں رکھا جائے۔ وہ زندگی کیلئے گداگری کر رہا تھا' مگر وقت نے اسے ایک لمحے کی بھی بھیک نہیں دی...... اور وہی دیا جس کا وہ مستحق تھا۔ آپ بھی ایک غلام سے بھیک مانگ رہی ہیں۔ شجاع الدین کامران نے شدت جذبات میں گستاخی کی ان حدوں کو چھو لیا تھا جو ایک مطلق العنان حکمران کے مذہب میں گناہ عظیم کا درجہ رکھتی ہیں۔

"بے مثال محبتوں کی امین' میری ماں! ایک غلام سے وہ شے نہ مانگئے جو اس کی قدرت و استطاعت سے باہر ہو۔ غلام آخر غلام ہے...... اور آقا آقا ہے۔ اس فرق کو محسوس کیجئے اور ان مسلمانوں کے راستے پر چلی جایئے جن کا مسلک صبر تھا اور جو اس بات پر یقین کامل رکھتے تھے کہ ان کا رب کبھی کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں کرتا۔" یہ کہہ کر شجاع الدین کامران خاموش ہو گیا۔

اہل دربار پر سکوت مرگ طاری تھا۔ ان کی نظروں کے سامنے بلبن کے دربار میں بڑے بڑے خوفناک عزائم رکھنے والے مجرم پیش ہوئے تھے' مگر بلبن کے جلال شاہی نے انہیں گریہ و زاری اور رحم طلبی پر مجبور کر دیا تھا۔ تمام وزراء اور امراء پوری شدت کے ساتھ محسوس کر رہے تھے کہ یہ تیس بتیس سالہ نوجوان ان سب سے مختلف تھا۔ اس نے رحم کی بھیک بھی نہیں مانگی اور مقتل کی طرف جاتے جاتے سلطان کی خاندانی حیثیت کو بھی سر دربار بے نقاب کر گیا۔

شجاع الدین کامران کے لہجے کی حرارت کا یہ عالم تھا کہ سلطان غیاث الدین بلبن کے چہرے سے دھواں اٹھ رہا تھا اور اس کا پورا جسم پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ خود بلبن نے بھی اپنی وزارت اور سلطانی کے دور میں اس قدر بیباک مجرم نہیں دیکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ کامران کی طعنہ زنی کے بعد کچھ دیر کیلئے بلبن کو سکتہ سا ہو گیا تھا۔

پھر اس سکوت کو سعدیہ خانم کی لرزتی ہوئی آواز نے توڑ دیا۔

"سلطان! اس کی باتوں کا خیال نہ کر کہ میرے بچے نے دنیا میں آنے کے بعد نفرت و ظلم کے سوا کچھ نہیں دیکھا ہے' تو اپنے عدل و انصاف کی طرف دیکھ' اپنی اعلیٰ ظرفی کی روایت برقرار رکھ اور اسے معاف کر دے۔"

سلطان غیاث الدین بلبن کے چہرے پر چھایا ہوا قہر کا غبار بڑھتا ہی جا رہا تھا' ایک ادنیٰ مجرم کی زبان سے غلامی کا طعنہ' بڑی غلیظ گالی تھی...... اور بلبن سے یہ دشنام طرازی برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ وہ بظاہر ساکت بیٹھا تھا'

مگر اس کی کشادہ پیشانی شکنوں سے بھر گئی تھی اور چہرے پر غیظ و غضب کے سوا کوئی دوسرا رنگ باقی نہیں رہا تھا۔

سعدیہ خانم نے بلبن کی خاموشی کو ایک قیمتی مہلت سمجھ کر دوبارہ کہنا شروع کیا۔

''سلطان! تیری ذات دیار ہند میں اسلام کی نگہبان ہے۔ تجھے تیرے ذمہ دار جاسوسوں نے یہ نہیں بتایا کہ کامران کا دادا رائے سعید الدین کفر و باطل کے ایک بڑے معرکے میں شہید ہوا تھا...... اور مرنے والے نے جس بے رحمی کے ساتھ اپنے آباؤ اجداد کے بت خانے کو ڈھایا تھا آج اسی سرفروشی کے حوالے سے تو میرے بیٹے کی جان بخشوا دے۔ بزرگ قربانیوں کی فصل اسی لئے بوتے ہیں کہ اولاد اسے کاٹے۔''

سعدیہ خانم کا یہ کہنا غضب ہو گیا تھا۔ غیاث الدین بلبن کے سینے میں نفرت و قہر کا جو آتش فشاں بہت دیر سے دہک رہا تھا' یکایک پھٹ پڑا۔

''اور جو فصل اولاد بوئے گی' کیا اسے تیرے بزرگوں کی گلی ہوئی ہڈیاں کاٹیں گی؟'' بلبن انتہائی طیش کے عالم میں بول رہا تھا۔ ''اگر میں منصف و عادل نہ ہوتا تو آج تجھے بھی بیٹے کے ساتھ آغوش لحد میں سونا پڑتا...... اور یہ تیری سزا برحق ہوتی کہ تو نے اپنے بطن سے ایک مجرم بیٹا پیدا کیا اور پھر اسے جرم و گناہ کی تربیت دی۔ تو میرے سامنے اپنے اس خسر کی سرفروشی کے افسانے سنا رہی ہے جو پیدائشی بت پرست تھا...... اور جس نے ترکوں کی شمشیر بے نیام سے ٹپکتا ہوا لہو دیکھ کر موت کے خوف سے اسلام قبول کر لیا تھا۔ تو اپنے ایمان کی بات کرتی ہے کہ جس کی گہرائیوں میں ابھی تک کفر و شرک کروٹیں لے رہے ہیں۔ میں اس راز سے باخبر ہوں کہ تم لوگوں کے جذبے غیر معتبر ہیں اور تم ابھی تک عالم جبر میں زیست بسر کر رہے ہو۔ اگر تمہارے سروں سے جبر کا سائبان کھینچ لیا جائے تو پھر تم اپنی فطرت کی طرف لوٹ جاؤ گے۔'' یہ کہہ کر غیاث الدین بلبن مسند انصاف سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''سلطان! میں تجھ سے اپنے ایمان کی تصدیق نہیں چاہتی۔ یہ معاملہ بندے اور خدا کے درمیان ہے...... اور وہی دلوں کا حال بہتر جاننے والا ہے۔ تجھے میری کسی چیخ اور کسی آنسو نے متاثر نہیں۔ پھر بھی میں تجھے آخری بار خبردار کرتی ہوں کہ ایک بے گناہ کے خون سے اپنے دامن کو آلودہ نہ کر...... اور اس وقت سے ڈر جب تیرا ایک ایک عمل تیرے سامنے پیش کر دیا جائے گا۔ کامران کی سزائے موت کو عمر بھر کی قید میں تبدیل کرے۔ میں اسی احساس کے سہارے باقی دن گزار لوں گی کہ میرا بیٹا ابھی زندہ ہے۔ شہنشاہ! تو رحم پر قادر ہے' اس لئے رحم کر...... تو ہوش و حواس میں ہے اس لئے مظلوموں کی آہ سے ڈر۔''

سعدیہ خانم نے ہر زاویے سے بلبن کے سامنے کاسہ گدائی بڑھایا تھا' مگر فرمانروائے ہند کے ہاتھوں میں کامران کیلئے سزائے موت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ بالآخر وہ یہ کہتا ہوا دربار سے چلا گیا۔

''اس پاگل عورت کو باہر نکال دو...... اور اس سے کہو کہ وہ میرے حق میں جس قدر بددعائیں کر سکتی ہے کرے۔ پھر اسے اپنی مظلومیت اور میری سنگدلی کا اندازہ ہو جائے گا۔

❋❋❋

شجاع الدین کامران کی زندگی اور موت میں دو دنوں اور دو راتوں کا وقفہ حائل تھا۔

پہلا دن عدالتی کارروائیوں اور غیاث الدین بلبن کے فیصلہ دینے میں گزر گیا۔

پہلی رات آئی تو امیر طغرل کے یہاں جشن کا سا سماں تھا۔ سلطان غیاث الدین بلبن کا یہ کینہ پرور غلام اپنے خسر قائم خان سے کہہ رہا تھا۔

''بدنصیب کامران نے میری رحمدلانہ پیشکش کو ٹھکرا دیا اور میں نے اس کی دنیا خراب کر دی۔''

"میں امیر کے مزاج سے واقف ہوں۔ دوستوں کے دوست اور دشمنوں کے دشمن۔" قائم خان کے لہجے سے ایک عجیب سی سرشاری جھلک رہی تھی...... "امیر! میں برسوں بعد آج پہلی بار سکون کی نیند سو سکوں گا۔"

"ہمارے دورِ حکومت میں تمام دوستوں کو فراغت کے دن اور چین کی راتیں مبارک ہوں۔" امیر طغرل نے جام سرخ ہونٹوں سے لگاتے ہوئے کہا...... "اور دشمنوں کو خبر دو کہ عنقریب ان پر ہندوستان کی زمین تنگ ہونے والی ہے۔" امیر طغرل سلطان غیاث الدین بلبن کے لہجے میں بول رہا تھا...... قائم خان! اب تم جاؤ! ہم نے تمہارے راستے کا زہریلا کانٹا دور کر دیا۔ اگر بھولے سے اس پر کبھی پاؤں پڑ جاتا تو تمہاری موت واقع ہو جاتی۔"

"امیر! سچ کہتے ہیں۔" قائم خان نے بھرپور منافقت کا مظاہرہ کیا اور امیر طغرل کے محل سے نکل کر اپنی حویلی کی طرف چلا گیا۔

پھر یاسمین خانم طغرل کے عشرت کدے میں داخل ہوئی۔ اس وقت تک وہ نشے میں غرق ہو چکا تھا۔

"ہم نے ان آنکھوں کو بجھا دیا جن میں تمہاری چاہتوں کا عکس موجود تھا۔ امیر طغرل کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔

"یہ امیر کی غیرت کا تقاضا تھا۔" یاسمین خانم کے چہرے پر ایک پراسراری آسودگی تھی اور آنکھوں میں نامعلوم سی چمک۔

❋❋❋

اسی رات نعیم الدین ذیشان کے کھنڈر میں سعدیہ خانم خاموش بیٹھی تھی اور دیوداسی شکنتلا مسلسل رو رہی تھی۔

"جانے والے بہت بے درد ہوتے ہیں۔ ان کیلئے اپنے آنسوؤں کو کیوں برباد کرتی ہے؟" آخر سعدیہ خانم کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔ "تیری گریہ وزاری سے وقت کا فیصلہ نہیں بدل جائے گا۔"

"میں آپ کے صبر و ضبط پر ماتم کرتی ہوں کہ اس طرح تو پتھر بھی خاموش نہیں رہتے۔" دیوداسی شکنتلا کے لب جلنے لگے۔

"اور اس مردِ شجاع کی جوانمرگی کا ماتم کرتی ہوں جو گناہوں کی دلدل سے نکل آیا' مگر پارساؤں کی بستی میں قانون کے ہاتھوں نے اسے ڈبو دیا۔"

سعدیہ خانم نے بہت کوشش کی کہ شکنتلا بدبختیوں کے اس حصار سے دور چلی جائے' مگر وہ کامران کی ماں کے قدموں سے لپٹ گئی۔ "اب آپ کو چھوڑ کر کہاں جاؤں گی۔ ٹھاکر کیا کہیں گے؟"

"ٹھاکر تو خود بے وفا ہے۔" سعدیہ خانم کا لہجہ بظاہر بہت تلخ تھا' ہر لفظ سے اس کے دل کا خون رس رہا تھا۔

❋❋❋

دوسرا دن بھی حسب معمول طلوع ہوا اور پھر رفتہ رفتہ شام تک پہنچ گیا۔ رات کے اندھیرے میں حکومت کے کارندوں نے سعدیہ خانم کو خبر دیتے ہوئے کہا۔

"تجھے آخری بار اپنے بیٹے سے ملنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ صبح سورج نکلنے سے پہلے اس کی زندگی کا چراغ گل ہو جائے گا۔"

قانون کی ایک رسم تھی جسے بے دلی کے ساتھ نبھایا گیا۔

سعدیہ خانم شکنتلا کو لے کر کامران کے پاس پہنچی جو بہت دیر سے کسی کا انتظار کر رہا تھا۔

ماں کے ساتھ شکنتلا کو دیکھ کر کامران لرز گیا۔ "دیوداسی تجھے یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔" کامران کے لہجے میں بڑی شکستگی تھی۔

''کیوں؟''

شکنتلا تڑپ کر رہ گئی اور پھر خود ہی کہنے لگی۔ ''ہاں! ٹھاکر! غلطی ہو گئی۔ آخر میرا تم سے کیا رشتہ ہے؟''

''نہیں دیوداسی! تو مجھے اب تک نہیں سمجھی۔'' کامران نے بے قرار ہو کر آہنی سلاخوں پر اپنا سر رکھ دیا۔ ''تجھے دیکھ کر میرے دل میں جینے کی خواہش جاگ اٹھتی ہے......اور میں زندہ رہنا نہیں چاہتا۔''

سعدیہ خانم حیرت سے ان دونوں کی باتیں سن رہی تھی۔

دیوداسی شکنتلا آہستہ آہستہ آگے بڑھی اور کامران کے قریب پہنچ کر کہنے لگی۔ ''ٹھاکر! میں اس لئے آئی ہوں کہ دنیا میں رسم اعتبار باقی رہ جائے۔''

''کامران چونک اٹھا اور گھبرا کر شکنتلا کی طرف دیکھنے لگا۔

''میں تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں ٹھاکر۔'' شکنتلا کی آواز بلند ہوئی اور زندان کی نیم تاریک فضا کانپ کر رہ گئی۔

❊❊❊

دیوداسی شکنتلا کی زبان سے شادی کی بات سن کر شجاع الدین کامران حیرت زدہ رہ گیا۔
''زندان' مقتل اور شادی؟'' کامران کی نظریں دیوداسی کے چہرے پر مرکوز تھیں اور وہ خود کلامی کے انداز میں باتیں کر رہا تھا۔
کامران پر بہت دیر تک یہ عجیب سی کیفیت طاری رہی۔ پھر اس نے سعدیہ خانم کو پکارا جو تھوڑے فاصلے پر زندان کی دیوار کا سہارا لئے ہوئے کھڑی تھی۔
بیٹے کی آواز سن کر سعدیہ خانم آہستہ آہستہ آگے بڑھی اور کامران کے قریب پہنچ کر ٹھہر گئی۔
''ماں! آپ اس لڑکی کو سمجھائیں۔'' کامران نے شکنتلا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ اس مرد سے شادی کرنا چاہتی ہے جسے چند گھنٹوں بعد پھانسی ہو جائے گی۔''
سعدیہ خانم نے حیرت سے شکنتلا کی طرف دیکھا اور بیٹے سے مخاطب ہو کر کہنے لگی۔
''جب تجھے سمجھاتے سمجھاتے عمر گزر گئی اور تو نے ہی میری کسی بات کا کوئی اثر قبول نہیں کیا تو پھر......'' سعدیہ خانم رونے لگی اور شدت جذبات کے سبب سلسلہ کلام ٹوٹ گیا۔
اگرچہ سعدیہ خانم کی بات نامکمل رہ گئی تھی لیکن شجاع الدین کامران خوب جانتا تھا کہ اس کی ماں نے چند الفاظ میں اپنی محرومیوں کی پوری داستان سنا دی ہے۔ کامران لرز کر رہ گیا۔ آج پہلی بار اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ اس مقدس ہستی کا مجرم ہے جس نے اس کی زندگی کو پرسکون رکھنے کیلئے بڑے آزار برداشت کئے تھے۔
''ہاں مادر گرامی! میں آپ کا مجرم ہوں۔'' سعدیہ خانم کو اس حال میں دیکھ کر شجاع الدین کامران کی آنکھیں بھی بھیگ چلی تھیں۔ ''اور شاید اسی جرم کی سزا مجھے موت کی شکل میں دی گئی ہے۔''
''نہیں میرے بیٹے!'' سعدیہ خانم نے اپنے دونوں ہاتھ آہنی سلاخوں کی طرف بڑھا دیئے اور کامران کے جسم کو اس طرح چھونے کی کوشش کی جیسے کوئی ماں اپنے روتے ہوئے بچے کو خاموش کرانے کیلئے اسے تھپکتی ہے۔ ''تو میرا مجرم نہیں ہے کامران! میں نے کبھی تیری اس سرکشی کو نافرمانی سے تعبیر نہیں کیا۔''
''مادر گرامی! اس دنیا میں تو میں اپنے انجام کو پہنچ چکا۔'' شدت جذبات سے کامران کی آواز لرز رہی تھی۔ ''خدا کیلئے مجھے اس دنیا کے عذاب سے بچا لیجئے۔'' کامران نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ سعدیہ خانم کے سر پر رکھ دیئے۔
''کہہ دیجئے کہ آپ مجھ سے ناراض نہیں ہیں۔'' یکایک کامران بچوں کی طرح رونے لگا تھا۔
''ہاں! میں تجھ سے ناراض نہیں ہوں۔'' سعدیہ خانم اس طرح تڑپنے لگی جیسے اس کے دل میں درد کی تیز لہر اٹھی ہو۔ ''میرا خدا علیم و خبیر ہے' وہ خوب جانتا ہے کہ میں تجھ سے ناراض نہیں ہوں۔''
''اور یہ بھی کہہ دیجئے کہ آپ نے میری ہر لغزش' ہر کوتاہی اور نافرمانی کو معاف کر دیا۔'' کامران زندگی میں پہلی

بار اپنی ماں کے سامنے گریہ وزاری کر رہا تھا۔

''ہاں! میں نے تیری ہر ایک ضد اور ہر ایک سرکشی کو معاف کر دیا۔ خدا بھی تجھے معاف کر دے۔'' سعدیہ خانم کی آواز پر شور فغاں کا گمان ہونے لگا تھا اور نیم تاریک زنداں کسی ماتم کدے میں تبدیل ہو گیا تھا۔

''آپ بہت عظیم ہیں میری ماں! دنیا والوں کے اندازوں سے زیادہ مہربان اور عظیم۔'' کامران آہستہ آہستہ جھکنے لگا' یہاں تک کہ وہ قید خانے کے فرش پر بیٹھ گیا اور ماں کے قدموں کو چھونے لگا۔

''میں ان پیروں پر اپنے ہونٹ رکھنا چاہتا ہوں مادر گرامی!'' کامران کی حالت غیر ہوتی جا رہی تھی وہ ہچکیوں سے رونے لگا۔ ''میرا پورا جسم اس آگ میں جل جائے گا جسے زمین پر رہنے والوں نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا ہے۔ مگر شاید آپ کے قدموں سے مس ہونے والے ہونٹ آتش جہنم سے بچ جائیں۔'' کامران پر عجیب سی کیفیت طاری تھی۔

''نہیں بیٹے! یہ عمل ایک مسلمان کیلئے جائز نہیں ہے۔'' سعدیہ خانم کی آواز ڈوبتی جا رہی تھی لیکن پھر بھی وہ کامران کو دم آخر حوصلہ دینے کی کوشش کر رہی تھی۔''

''میں اس طرح اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔'' کامران کا لہجہ بہت زیادہ شکستہ ہو چکا تھا۔ ''کسی طرح مرنے سے پہلے میرے دل کو یہ اطمینان حاصل ہو جائے کہ میں اپنی ماں کی دل آزاریوں کا مجرم نہیں ہوں۔''

''تجھے میری بات پر یقین نہیں آتا۔'' غمزدہ ماں ایک لمحے کیلئے بیٹے سے خفا نظر آنے لگی' مگر یہ ایسی خفگی تھی جس میں بیشمار چاہتیں اور ناقابل بیان محبتیں پوشیدہ تھیں۔

کامران کا بے قرار دل ٹھہر سا گیا' وہ بہت ہمت کر کے آہستہ آہستہ زمین سے اٹھا اور سعدیہ خانم سے بڑے حسرت زدہ لہجے میں کہنے لگا۔

''مام! اب میں جینا چاہتا ہوں مگر دنیا نے مجھ سے زندہ رہنے کا حق چھین لیا۔ پہلے اندازہ نہیں تھا کہ آپ سے بچھڑنے کا اس قدر قلق ہوگا۔'' کامران کے ہونٹوں سے اس کے جذبوں کا خون ٹپک رہا تھا۔ ''میں تو سمجھتا تھا کہ اس صدمہ فراق کو آسانی سے برداشت کر لوں گا' مگر آخری سفر کے تصور نے مجھے تھکا کر رکھ دیا ہے۔ جسم تو ہمیشہ سے زخمی تھا مگر اب روح بھی جراحتوں سے بھر گئی ہے۔ سوچتا تھا کہ باقی زندگی آپ کی خدمت گزاری میں بسر کر دوں گا لیکن جب ذمہ داریوں کا احساس ہوا تو وقت نے مجھ سے میری سانسیں چھین لیں' یہ کیسی مجبوری ہے میری ماں! یہ کیسی بے چارگی ہے۔'' کامران نے ایک بار پھر آہنی سلاخوں پر سر رکھ دیا۔

شکنتلا کو اپنے ساتھ لے جائیں مام کہ یہ ہوش میں نہیں ہے۔'' کامران نے اسی طرح سر جھکاتے ہوئے کہا جیسے وہ آخری وقت میں دیوداسی کی شکل دیکھنا نہیں چاہتا ہو۔

''میں پورے ہوش میں ہوں ٹھاکر!'' شکنتلا نے سسکتے ہوئے کہا۔

''یہ کیسا ہوش ہے کہ تو مجھ سے اس وقت شادی کا مطالبہ کر رہی ہے جب میں کفن پہننے والا ہوں۔'' کامران نے سر اٹھایا اس کی آنکھیں اب بھی اشک برسا رہی تھیں۔

''یہ مطالبہ نہیں ٹھاکر! محض ایک التجا ہے' بہت حقیر التجا۔'' دیوداسی آہنی سلاخوں کے قریب آ گئی۔

''کیا یہ التجا اس لئے ہے کہ میں تیرے نزدیک ایک قابل رحم انسان ہوں۔'' اچانک شجاع الدین کامران کا لہجہ بدل گیا۔ اب خوف و دہشت کے بجائے اس کے چہرے سے غصہ جھلکنے لگا تھا۔

دیوداسی شکنتلا خاموش رہی۔ وہ فوری طور پر اس قدر نازک سوال کا جواب نہیں دے سکتی تھی۔

''کیا تیرے سینے میں ہمدردی کا یہ جذبہ محض اس لئے ابھرا ہے کہ صبح ہوتے ہی مجھے قتل کر دیا جائے گا؟''
کامران نے انتہائی تند لہجے میں کہا۔

''نہیں ٹھاکر!'' دیوداسی شکنتلا چیخ اٹھی۔ ''یہ ہمدردی نہیں' میری ایک ناآسودہ خواہش ہے۔ برسوں پرانا ایک خواب ہے جس کی تعبیر پر وقت کی گہری تاریکیاں چھائی ہوئی ہیں۔''

کامران شکنتلا کی باتوں کا مفہوم نہیں سمجھ سکا۔ اس نے بدستور تلخ لہجے میں کہا۔ ''کچھ دیر بعد قبر میں سو جانے والا شخص تیرے خواب کی تعبیر نہیں بن سکتا دیوداسی! یہ کسی ناآسودہ جذبے کی تسکین نہیں' کھلی ہوئی خودکشی ہے۔''

''میں اس خودکشی پر رضامند ہوں ٹھاکر! شکنتلا نے اپنی وکالت کرتے ہوئے کہا۔

''ہمارے مذہب میں خودکشی گناہ عظیم ہے۔'' کامران نے جرح کی۔

''یہ وہ خودکشی نہیں ٹھاکر جسے مذہب اسلام گناہ قرار دیتا ہے۔'' شکنتلا نے ایک اور دلیل پیش کرتے ہوئے کہا۔

کامران حیرت سے دیوداسی کی طرف دیکھنے لگا' پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''دیوداسی! ابھی تیری زندگی بہت طویل ہے' ایسے ہم سفر کا انتخاب نہ کر جو تجھے اچانک راستے میں چھوڑ کر چلا جائے۔'' کامران ایک ضدی لڑکی کو سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ''تو نے مندر کے حبس میں ایک طویل عرصہ گزارا ہے' اس لئے تجھے دنیا کے موسم کی خوشگواریوں کا اندازہ نہیں۔ میری قربت کے اندھیروں سے نکل کر دیکھ کہ دنیا میں کتنی روشنی ہے؟ ٹھاکر کرشن راؤ کے قیدخانے کی گھٹن کو فراموش کر دے' پھر تجھے اندازہ ہوگا کہ یہ دنیا کس قدر دلکش ہے اور اس کی آزاد فضاؤں میں کیسی کیسی لذت انگیز خوشبوئیں بسی ہوئی ہیں۔ کسی بھی ایسے شخص سے اپنے آپ کو وابستہ کر لے جس کی سانسوں پر موت اور غربت کا پہرہ نہ ہو۔''

''ٹھاکر! میں تیرے سوا اس دنیا میں کسی کو نہیں پہچانتی۔'' شکنتلا نے بے قرار ہو کر شجاع الدین کامران کے دونوں ہاتھوں کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ ''میں نے اس دنیا میں بس ایک ہی موسم دیکھا ہے' تیری غیرت' وفاداری اور مردانگی کا موسم۔''

شجاع الدین کامران نے گھبرا کر اپنے ہاتھ کھینچ لئے۔ ''تیری نادانیاں میرے پیروں کی زنجیر بن کر رہ گئی ہیں۔'' کامران یکایک چیخنے لگا۔ ''میں مرتے وقت کس کس کا ماتم کروں گا؟ اس بوڑھی ماں کا یا اس لڑکی کا جس نے ایک لاوارث اور مفلس بچہ سمجھ کر مجھ سے ہمدردی کے چند الفاظ کہے' پھر سب کچھ بھول گئی۔''

''ٹھاکر! میں نے اپنے ماتم کیلئے تو نہیں کہا۔'' کامران کی ہذیانی کیفیت دیکھ کر شکنتلا سہم سی گئی تھی۔

''اب تیرے کہنے سے کیا ہوتا ہے؟'' کامران شدید ذہنی اذیت کا شکار تھا۔ ''تو نے اپنی یادوں کا زہر میرے پورے بدن میں اتار دیا۔ اب کہتی ہے کہ میں تجھے بھول جاؤں' یہ کیسی سنگدلی ہے کہ میں مقتل کی طرف جاتے ہوئے مڑ مڑ کر تم لوگوں کے چہرے دیکھتا رہوں' مگر کوئی چہرہ' کوئی یاد میرے کام نہ آسکے۔''

''کاش! ایسا ہو ٹھاکر کہ میں تجھ پر قربان ہو جاؤں اور سلطان کا قانون میرے جسم کی بھینٹ قبول کر لے۔''
دیوداسی کے الفاظ میں اتنی صداقت اور گہرائی تھی کہ زنداں کی فضا لرز کر رہ گئی۔

''شکنتلا! ہر شخص اپنی قبر میں سوتا ہے۔'' کامران دیوداسی کے آگے مجبور سا ہوتا جا رہا تھا۔ ''جو قبر میرے لئے کھودی گئی ہے' اس میں کوئی دوسری لاش دفن نہیں ہو سکتی۔''

''ٹھاکر! پھر کیوں میرے جذبوں پر طعنہ زنی کرتا ہے؟'' دیوداسی کے لہجے میں دل کا درد شامل تھا۔ ''بلبن کا قانون اجازت تو دے پھر تجھے اندازہ ہوگا کہ کچھ لوگ دوسروں کی قبر میں کس طرح چپ چاپ سو جاتے ہیں۔''

شجاع الدین کامران کے پاس شکنتلا کے اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا' پھر بھی اس نے ایک خوفناک لفظ کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔ "پہلے تو قانون تیرے اس مطالبے کو تسلیم نہیں کرے گا اور اگر اس نے کچھ دیر کیلئے اپنا مزاج بدل بھی ڈالا تو تجھے اس شادی سے کیا فائدہ حاصل ہوگا نہ کوئی نغمہ مسرت' نہ کوئی شور نشاط' نہ کوئی جشن' نہ کوئی ہنگامہ...... بس عمر بھر کیلئے بیوگی کی ایک تہمت' ساری زندگی کیلئے بے چارگی کا ایک الزام...... پھر ایسے لمحوں کا تعاقب کیوں کرتی ہے جو بہت تیزی سے حالات کے دوزخ کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ تجھے اس زمین کی جنت درکار ہے اور اس جنت پر تیرا پورا حق ہے۔"

"ٹھاکر! مجھے کیوں رسوا کرتا ہے؟" شکنتلا کے الفاظ جلنے لگے تھے۔ "تو خوب جانتا ہے کہ میں تیری دوزخ کو چھوڑ کر دنیا والوں کی جنت قبول نہیں کروں گی' کسی درباری امیر کی بیوی بننے کے بجائے میرے لئے یہ اعزاز کافی ہے کہ لوگ مجھے تیری بیوہ کہہ کر پکاریں۔"

کامران کے دل کی دھڑکنیں بے ربط ہوگئیں۔ آج پہلی بار اسے احساس ہوا تھا کہ زندگی اتنی بے غرض بھی ہوتی ہے' بھڑکتے شعلوں میں جل کر راکھ ہوجانا بھی زندگی کی ایک ادا ہے...... اور لحہ لحہ تمام عمر سلگتے رہنا بھی زندگی کا ایک انداز ہے...... مگر دونوں میں کتنا فرق ہے؟ یہ راز شجاع الدین کامران پر اس وقت فاش ہوا تھا جب موت اپنا خونی دہن کھولے ہوئے اس کے قریب منڈلا رہی تھی۔

کامران نے بہت کوشش کی کہ شکنتلا کسی طرح اس خوفناک ارادے سے باز آجائے مگر دیوداسی ایک ضدی بچے کی طرح مچل گئی...... "تو میرا دل توڑ کر بھی جاسکتا ہے ٹھاکر' مگر یاد رکھنا کہ تجھ پر میرا یہ قرض ہمیشہ باقی رہے گا۔"

سعدیہ خانم نے بھی شکنتلا کی بہت منت وسماجت کی......؟ "ایک بیوہ کی حالت تیری نظر میں ہے بیٹی! پھر تو یہ لباس کیوں پہن رہی ہے ابھی تو سرخ جوڑے کے دن ہیں۔ اپنی زندگی کو ایسا روگ نہ لگا کہ پھر کوئی مسیحا بھی تیرا علاج کرتے ہوئے ڈرے۔ یہ زمین عورت کیلئے قبر سے بھی زیادہ تنگ ہے۔"

"میں کسی مسیحا کی منتظر نہیں۔" شکنتلا نے سعدیہ خانم کی بات سننے سے بھی انکار کردیا۔

یہاں تک کہ ملاقات کا وقت ختم ہوگیا۔ سپاہیوں نے دونوں عورتوں کو قید خانے سے باہر جانے کیلئے کہا۔

"نماز فجر کے بعد تیرے بیٹے کو پھانسی ہوجائے گی پھر اس کی لاش اٹھا کر لے جانا۔" سپاہی سعدیہ خانم سے مخاطب تھا۔

غمزدہ ماں کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا پھیلنے لگا' پھر سعدیہ خانم کے قدم غیر متوازن ہوئے تو شکنتلا اسے سہارا دے کر زندان کی حدود سے باہر لے گئی۔

"اب گھر چلیں ماں!" شکنتلا نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

"گھر بھی چلی جاؤں گی مگر آج کی رات یہی راہ گزر میرا گھر ہے کہ اس راستے سے شجاع الدین کامران گزرے گا۔" سعدیہ خانم کانپتے جسم کے ساتھ قید خانے سے کچھ دور زمین پر بیٹھ گئی۔ "بس آخری بار اسے اور دیکھ لوں۔ پھر تو وہ گہری نیند سوجائے گا جیسے بچپن میں دودھ پی کر سوجاتا تھا۔"

شکنتلا کو محسوس ہوا جیسے اس کے دل کو کسی تیز نشتر سے کاٹا جارہا ہوں۔ دیوداسی نے گھبرا کر آسمان کی طرف دیکھا اور اسے یوں لگا جیسے پورا آسمان سرخ ہوگیا ہے اور ہر ستارے سے خون کی ایک دھار پھوٹ کر زمین کی طرف آرہی ہے۔

✻✻✻

نصف شب کے بعد خود قاضی عدالت زندان میں داخل ہوا اور اس نے قانونی رسم کے مطابق شجاع الدین کامران کی آخری خواہش دریافت کی۔

''کیا میری آخری خواہش کی تکمیل آپ کے اختیار میں ہے؟''

قاضی عدالت شجاع الدین کامران کے لہجے کی بیباکی سے واقف تھا' اس لیے تلخ آواز میں بولا۔ ''تجھے نئی زندگی بخشنے کے علاوہ سب کچھ میرے اختیار میں ہے۔ اگر سلطان چاہیں تو سزائے موت بھی معاف ہوسکتی ہے۔''

قاضی نے غائبانہ طور پر غیاث الدین بلبن کی شان میں ایک مختصر سا قصیدہ پڑھا۔

''میری آخری خواہش زندگی کی بھیک نہیں۔'' کامران نے بے نیازانہ کہا۔

''پھر وقت برباد نہ کر۔'' قاضی کا لہجہ جارحانہ تھا' وہ سلطان کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے مرنے والے سے دل شکن انداز میں گفتگو کر رہا تھا۔

''میں چاہتا ہوں کہ مرنے سے پہلے میری شادی کی رسم ادا ہو جائے۔'' کامران نے بلند آواز میں کہا۔

قاضی مجرم کی اس خواہش پر چونک اٹھا۔ ''یہ کس طرح ممکن ہے؟ آج تک میں نے مقتل کی طرف جانے والے کسی انسان کو ایسی خواہش کا اسیر نہیں دیکھا۔''

''درست ہے قاضی محترم' مگر آپ نے آج تک کسی بے گناہ کو بھی اسی طرح قتل ہوتے نہیں دیکھا ہوگا۔'' کامران نے اسی لہجے میں جواب دیا۔

قاضی بھی کامران کی اس سخت کلامی کا جواب دینا چاہتا تھا مگر داروغہ زندان نے درمیان میں مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

''آپ ایسے شخص سے کہاں الجھتے ہیں جس کا ذہنی توازن بگڑ گیا ہے۔ موت کا خوف بڑے بڑے بہادروں سے ان کے حواس چھین لیتا ہے۔ اگر اس کی دماغی حالت ٹھیک ہوتی تو یہ موت کے منہ میں شادی کا خواب کیوں دیکھتا؟''

صورتحال بگڑ گئی تھی کامران نے شکنتلا کی خاطر خوشامدانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ میری مجبوری ہے قاضی صاحب! وقت ٹالنے کی کوئی تدبیر نہیں۔''

پھر جب شجاع الدین کامران نے قاضی غیور احمد سے پورا واقعہ بیان کیا تو وہ سوچ میں پڑ گئے۔

''سلطان اس وقت آرام کر رہے ہیں' ان سے اجازت کس طرح حاصل کی جا سکے گی؟''

''ابھی کچھ دیر پہلے میری آخری خواہش کے سلسلے میں آپ نے خود کو ایک بااختیار شخص کہا تھا۔'' کامران نے دلیل پیش کی۔

جب قاضی غیور احمد سے کوئی جواب نہ بن پڑا تو کہنے لگے۔ ''شادی کیلئے گواہ کہاں سے آئیں گے؟ وکیل کون ہوگا؟''

''داروغہ زندان کو وکیل بنا دیجئے اور دو قیدیوں کو بطور گواہ پیش کر دیجئے۔'' شجاع الدین کامران نے بے ساختہ کہا۔ ''مقتل کی طرف جانے والے کی شادی تو اسی انداز میں ہوسکتی ہے۔''

قاضی غیور احمد کو اس عجیب و غریب مجرم سے ہمدردی سی ہونے لگی تھی' مگر وہ غیاث الدین بلبن کے تصور سے لرز گئے کہ اول و آخر کامران فرمانروائے ہند کا معتوب تھا۔ اگر سلطان نے ان سے جواب طلبی کی تو وہ کس طرح شاہ کے قہر سے محفوظ رہ سکیں گے؟ یہ خیال بڑ

''میں اس ملک کے قانون میں ترمیم کا کوئی اختیار نہیں رکھتا۔'' قاضی صاحب کامران سے مخاطب تھے۔''اگر کوئی ایک بھی ایسی مثال موجود ہوتی تو میں تیری خواہش ضرور پوری کر دیتا۔''

کامران جانتا تھا کہ اس درخواست کا یہی انجام ہوگا' مگر اس نے شکنتلا کیلئے آخری وقت میں اپنے آپ کو ایک بھکاری بنا کر پیش کر دیا تھا۔

''اگر یہ ممکن نہیں تو چند لمحوں کیلئے میری ماں اور اس لڑکی کو بلا دیجئے جس سے میں شادی کرنا چاہتا ہوں'' کامران نے کہا۔''اور اگر یہ بھی آپ کی دسترس میں نہیں تو پھر میں اپنی آخری خواہش سے دستبردار ہوتا ہوں۔''

''تیرا گھر کہاں ہے؟'' قاضی غیور احمد نے کامران سے پوچھا۔

''وہ لوگ ابھی گھر کس طرح جا سکتے ہیں؟'' کامران کا لہجہ اداس تھا۔''ابھی تو میں زندہ ہوں' ابھی تو مقتل سے میری لاش اٹھانے اور مجھے دفن کرنے کی رسمیں باقی ہیں۔ آپ انہیں اپنے سپاہیوں سے تلاش کرائیں یہیں کہیں راستے میں دو عورتیں خاک بسر نظر آئیں گی۔''

کامران کی باتیں سن کر قاضی غیور احمد بھی ایک نامعلوم سی افسردگی کا احساس کر رہے تھے۔

❋❋❋

کچھ دیر بعد سپاہی سعدیہ خانم اور شکنتلا کو واپس لے کر آ گئے۔

قاضی غیور احمد نے خواتین کو قریب آتے ہوئے دیکھا تو دور ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔

''میں نے تیری خاطر قانون کے سامنے ہاتھ پھیلایا تھا دیوداسی! مگر اس کے دامن میں میرے لئے کسی قسم کی رعایت موجود نہیں۔'' شجاع الدین کامران نے اداس لہجے میں شکنتلا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''کیا کہا قانون نے؟'' شکنتلا رونے لگی تھی۔

''اس کی تفصیلات مجھ سے مت پوچھو۔'' کامران نے اس تکلیف دہ گفتگو سے گریز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''تم بس اتنا یاد رکھنا کہ جب مجھ سے میری آخری خواہش دریافت کی گئی تو میرے ہونٹوں پر تمہارا نام تھا۔ میں نے قانون کے محافظوں سے شادی کی التجا کی' مگر ان کا دعویٰ ہے کہ آج تک موت کی سزا پانے والے کسی شخص نے ایسی دیوانگی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ وہ لوگ یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ نہ کوئی وکیل ہے اور نہ گواہ' پھر یہ شادی کس طرح ہوگی؟ میں نے ان کے سامنے تجویز پیش کی تھی کہ داروغہ زندان کو وکیل اور دو قیدیوں کو گواہ بنا دیں...... مگر قاضی صاحب اپنی مجبوریوں سے ڈر گئے۔'' کامران کی آواز ان آنسوؤں کے اثر سے بھیگتی جا رہی تھی جو پلکوں تک آ کر ٹھہر گئے تھے۔

''پھر کیا ہوگا ٹھاکر؟'' شکنتلا نے اس عورت کے لہجے میں کہا' جس کی زندگی کا آخری سرمایہ بھی لٹ چکا ہو۔

''شادی تو ہو چکی۔'' اچانک کامران نے پرجوش لہجے میں کہا۔''میں نے قانون کے سامنے اپنی آخری خواہش ظاہر کر دی تھی' اب وکیل اور گواہ میسر نہیں آ سکے تو مجبوری ہے۔ میرا ذہن' میرا دل تجھے اپنی شریک حیات تسلیم کرتا ہے۔ اگر میں حالات پر قادر ہوتا تو شادی کی رسمیں بہت زور و شور سے ادا کی جاتیں' لیکن جذبوں کو کسی نمائش کی ضرورت نہیں۔''

شکنتلا نے کامران کے ہاتھوں پر سر رکھ دیا اور اس کے گرم آنسو رخساروں سے گزر کر کامران کی انگلیوں کو بھگونے لگے۔

یہ بڑی عجیب آگ تھی کامران چاہتا تھا کہ وہ اس آگ میں یوں ہی جلتا رہے اور پھر اس کے ساتھ پورا زندان جل کر خاکستر ہو جائے۔

وقت ٹھہر سا گیا تھا' اچانک قاضی غیور احمد نے وقت کو دوبارہ حرکت دے دی۔

''اب خواتین باہر جائیں کہ میں قانون کی گنجائش سے زیادہ رعایت دے چکا ہوں۔'' قید خانے کے سناٹے میں قاضی غیور احمد کی بھاری آواز دور تک گونجتی چلی گئی۔

شکنتلا اس طرح چونک اٹھی جیسے اس نے کوئی بھیانک خواب دیکھا ہو۔

شجاع الدین کامران کو بھی قاضی عدالت کی آواز سن کر ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے دماغ اور کانوں میں کسی نے آہنی میخ ٹھونک دی ہو۔

''ٹھاکر! تم نے دنیا کی ٹھکرائی ہوئی' ایک بے سہارا عورت سمجھ کر مجھ پر رحم تو نہیں کھایا ہے؟'' آخری وقت میں شکنتلا نے بڑا نازک سوال کر دیا تھا۔

شجاع الدین کامران مضطرب ہو گیا اور اس نے اپنے ہاتھ دیوداسی کے سر پر رکھ دیئے۔

''نہیں شکنتلا مجھے تجھ پر فخر ہے۔ مرتے وقت صرف دو لمحوں کی یادیں میرا سرمایہ ہوں گی' ایک وہ لمحہ جو میں نے اپنی ماں کی آغوش میں بسر کیا...... اور دوسری وہ ساعت جو تیری قربت میں ابھی ابھی گزری ہے۔''

''ٹھاکر! اب تو اہل وفا پر شک نہیں کرے گا؟'' شکنتلا نے بڑے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

''شجاع الدین کامران خاموش رہا' وہ شکنتلا سے کہنا چاہتا تھا۔

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے
مگر اس کے ہونٹ کانپ کر رہ گئے۔

''مجھے میرے سوال کا جواب دے ٹھاکر!'' شکنتلا کی بھیگی ہوئی آواز چیخ میں بدل گئی۔

''میں کچھ نہیں جانتا بس تیری یادوں کی خوشبو اپنے کفن میں بسا کر سو جاؤں گا۔''

کامران آہنی سلاخوں سے ہٹ کر دوسری طرف چلا گیا اور شکنتلا سعدیہ خانم کو سہارا دے کر زندان کے دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔

❊❊❊

رات کا سفر ختم ہوتے ہی شجاع الدین کامران کو پھانسی دے دی گئی' سورج طلوع ہوا اور انسان غروب ہو گیا۔

عجیب بے کسی کی موت تھی کہ شجاع الدین کامران کی لاش اٹھانے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ سعدیہ خانم اور شکنتلا نے دروازے دروازے جا کر مسلسل فریادیں کیں تو کچھ اہل درد آگے بڑھے اور کامران کو قبر میں اتار دیا۔ پھر چند لمحوں کے اجنبی غمگسار ایک عورت کو اس حالت میں چھوڑ کر چلے گئے کہ وہ قبر سے لپٹی ہوئی مسلسل رو رہی تھی۔ یہ سعدیہ خانم تھی' شجاع الدین کامران کی ماں......

اور دوسری جواں سال عورت تھی شکنتلا جو شکستہ دل ماں کو تسلیاں دے رہی تھی' مگر خود بھی ذہن سے لے کر دل تک اور دل سے لے کر روح تک مکمل زخمی تھی۔ اس کا بھی دل چاہتا تھا کہ وہ کچھ دیر کیلئے قبرستان کو ماتم کدہ بنا دے' مگر سعدیہ خانم سے مجبور تھی کہ اس طرح ایک ماں کا غم کچھ اور سوا ہو جائے گا۔

شکنتلا کو اپنی مجبوریوں کا احساس اس وقت ہوا جب شام کے قریب کچھ سن رسیدہ اور بزرگ لوگ ان دونوں عورتوں کے پاس آئے اور کہنے لگے۔

''تم ہمارے گھر چلو اور چند لقمے غذا کے کھا لو۔''

سعدیہ خانم نے بہت دیر بعد ان لوگوں کو تلخ لہجے میں جواب دیا۔ ''ہمیں بھیک کے کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔''

ایک بزرگ نے انتہائی مشفقانہ لہجے میں فرمایا۔ ''خاتون! یہ بھیک نہیں' اسلام کی ایک معروف رسم ہے کہ مسلمان کھلے دل کے ساتھ اپنے بھائی کے غم میں شریک ہوں' ہم دوپہر سے اب تک دیکھ رہے ہیں کہ نوجوان کی تدفین کے بعد تمہارا کوئی مرد رشتے دار نہیں آیا۔''

''اس دنیا میں میرا کوئی عزیز دار نہیں ہے۔'' سعدیہ خانم نے جواب دیا اور شجاع الدین کامران کی قبر سے دوبارہ لپٹ کر رونے لگی۔

''جب تم لوگوں کا کوئی رشتہ دار نہیں ہے تو پھر تمہاری غمگساری ہمارے لئے فرض کا درجہ رکھتی ہے۔'' دوسرے بزرگ نے کہا۔ ''جب تم کھانا نہیں کھاؤ گی تو ہم پر بھی غذا کا ایک ایک لقمہ حرام ہو جائے گا۔''

''جب بیٹا بھوکا ہو تو ماں ان لذیذ غذاؤں کو کس طرح استعمال کر سکتی ہے؟'' سعدیہ خانم نے اسی حالت میں جواب دیا۔

ایک غمزدہ ماں کی دردانگیز باتیں سن کر آنے والے بزرگوں کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔

پھر بہت منت وسماجت کے بعد سعدیہ خانم اجنبی غم خواروں کے گھر جانے کیلئے آمادہ ہوئی۔ یہ لوگ قبرستان کے قریب ہی رہتے تھے' سعدیہ خانم نے گھر میں داخل ہوتے ہی کہا۔

''میں صرف اس لئے چلی آئی ہوں کہ تم لوگ گنہگار ہونے سے بچ جاؤ' مگر آئندہ اس طرح میری دل آزاری نہ کرنا۔''

وہ لوگ بڑی حیرت سے سعدیہ خانم کو دیکھ رہے تھے۔

دونوں سوگوار عورتوں نے بمشکل روٹی کے چند نوالے حلق سے اتارے اور پھر سعدیہ خانم یہ کہتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔

''حکومت کے خوف سے لوگ اپنے فرائض تک بھول گئے' مگر آپ نے اپنی ذمہ داریوں کا احساس کیا۔'' سعدیہ خانم صاحب خانہ سے مخاطب تھی۔ ''خدا آپ کو جزائے خیر دے۔'' یہ کہہ کر سعدیہ خانم تیز قدموں سے باہر نکل گئی۔

کچھ دیر بعد ایک غمزدہ ماں اسی انداز میں بیٹے کی قبر سے لپٹی ہوئی تھی اور کامران کے بچپن کی ایک ایک ادا کو یاد کر کے رو رہی تھی' کبھی وہ اپنے مقتول شوہر رائے نعیم الدین ذیشان کو پکار کر کہتی۔

''بیٹا بھی باپ کی طرح خون میں نہا گیا...... اور رائے سعیدالدین کی نسل ہمیشہ کیلئے ختم ہو گئی۔ اب زمین پر اس خاندان کا کوئی وارث نہیں آئے گا۔''

کامران کی موت اور سعدیہ خانم کی ان جانگداز باتوں نے شکنتلا کے دل کے بھی ٹکڑے کر دیئے تھے' مگر وہ اپنے آپ کو مسلسل سمیٹنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے خیال میں اگر سعدیہ خانم اسی طرح بیٹے کی قبر سے لپٹی گریہ وزاری کرتی رہی تو پھر کوئی دوسرا خوفناک حادثہ بھی رونما ہو سکتا ہے۔ اسی قسم کے اندیشوں نے شکنتلا کو مجبور کیا کہ وہ سعدیہ خانم سے گھر چلنے کیلئے درخواست کرے۔ اگر مرنے والے کا آخری نشان آنکھوں سے اوجھل ہو جائے تو صدمے کے اثرات میں بھی بتدریج کمی ہو جاتی ہے۔ یہی سوچ کر شکنتلا نے سعدیہ خانم سے کہا۔

''ماں! چاروں طرف اندھیرا پھیل گیا ہے' اب گھر چلیں۔'' شکنتلا کی آواز کانپ رہی تھی۔

سعدیہ خانم نے کوئی جواب نہیں دیا۔

شکنتلا کے بار بار کہنے پر اس نے سر اٹھایا اور پھر عجیب سے لہجے میں بولی۔ ''تو کس گھر کی بات کر رہی ہے بیٹی؟ دشت ہو یا مکاں' میرے لئے تو پہلے بھی یہ دونوں برابر تھے' اب دنیا والوں نے ایک نیا گھر بنا دیا ہے۔ یہ گھر میرے گھر کی طرح ویران نہیں۔ اس میں بہت سے مکین رہتے ہیں' یہاں بڑی آبادی ہے اور پھر کامران بھی تو سو رہا ہے۔ پتا نہیں کب جاگ جائے؟ مجھے قریب نہ پا کر وہ بہت پریشان ہوگا۔''

شکنتلا سعدیہ خانم کی ذہنی حالت دیکھ کر رونے لگی...... مگر سعدیہ خانم پورے ہوش و حواس میں تھی...... ''ہاں بیٹی! تو چلی جا! اندھیرا بہت ہو گیا ہے۔ ایک جوان عورت کا قبرستان میں رات بسر کرنا مناسب نہیں۔''

''اور آپ؟ میں تو برسوں سے ایک قبر کی مانند ہوں۔'' سعدیہ خانم کی آواز میں بڑی تھکن تھی۔ ''اب اگر ایک قبر دوسری قبروں کے ساتھ مل جائے تو حیرت نہیں ہونی چاہئے۔''

''شکنتلا کرب ناک حیرت کے ساتھ اس عورت کو دیکھنے لگی جس کی پوری زندگی سخت آزمائشوں میں گزری تھی۔

''مگر تو اس تاریک رات میں تنہا گھر تک کیسے جائے گی؟'' اچانک سعدیہ خانم نے شکنتلا سے کہا۔ ''تجھے تو یہاں کے راستے بھی معلوم نہیں۔'' یہ کہتے کہتے سعدیہ خانم کھڑی ہو گئی...... ''آ! میں تجھے گھر چھوڑ آؤں۔''

شکنتلا چپ چاپ سعدیہ خانم کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔

''کامران! اسی لئے تجھے سمجھایا کرتا تھا کہ ویرانے سے نکل کر آبادی میں چلی جا۔'' یکایک سعدیہ خانم نے شکنتلا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''اب میں تیری تنہائی کا ماتم کروں یا اپنی تنہائی کا مرثیہ پڑھوں؟ بیٹی! تو ہی بتا کہ ایک تنہا عورت کیا کیا کرے؟ تو نے یہاں آ کر میرا ایک کام اور بڑھا دیا کہ ہر وقت تیری طرف سے لرزتی ہوں۔''

''آپ میری طرف سے فکرمند نہ ہوں۔'' شکنتلا نے گھبرا کر کہا۔ ''میرا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔''

''ہاں! میں جانتی ہوں کہ تو نے بڑے حادثات دیکھے ہیں' لیکن آخر میں تیری ماں ہوں' اولاد کتنی بھی محفوظ سائبان کے نیچے ہو مگر ماں تو ڈرتی ہی رہتی ہے۔''

پھر سعدیہ خانم شکنتلا کو اپنے کھنڈر میں چھوڑ کر قبرستان کی طرف واپس آنے لگی۔

شکنتلا نے اسے روکنا چاہا' مگر سعدیہ خانم یہ کہتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ ''مجھے جانا ہی ہوگا کامران وہاں اکیلا ہے۔''

❊❊❊

اس رات یاسمین خانم' امیر طغرل اور قائم خان بہت خوش تھے کہ ان کی داستان حیات سے رنج و الم کا ایک بوسیدہ ورق پھاڑ کر الگ کر دیا گیا تھا' اب سارے فسانے میں مسرتوں اور ہولناکیوں کے سوا کوئی تیسرا باب شامل نہیں تھا۔

قائم خان اس لئے خوش تھا کہ اس کی زندگی پر لرزتے ہوئے خوف و دہشت کے سائے ہمیشہ کیلئے زائل ہو گئے تھے۔

امیر طغرل اس لئے خوش تھا کہ اس کے اقتدار کو بے وقعت سمجھنے والا ایک مفلس نوجوان اپنے عبرتناک انجام تک پہنچ گیا تھا۔

اور یاسمین خانم اس لئے خوش تھی کہ حسن مغرور کی تمنا کرنے والے ایک لاوارث لڑکے کو قبر نے اپنی آغوش میں چھپا کر اسے اس کی گستاخیوں کی سزا دے دی تھی۔

ان تینوں کی خوشی کا ایک ہی زاویہ تھا اور وہ تینوں اپنی اپنی ذات کی پرستش کر رہے تھے۔

❋❋❋

پھر کئی دن بعد قصر سفید کے دربانوں نے کوئی نصف شب کے قریب ایک سائے کو قلعے کی فصیل کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا۔

تمام محافظ اور نگہبان ایک لمحے میں بہت زیادہ مستعد نظر آنے لگے۔ فرض شناس سپاہیوں کو وہ لرزتا ہوا سایہ کوئی تخریب کار دشمن دکھائی دے رہا تھا۔ محافظوں کا ایک دستہ کسی تاخیر کے بغیر اس سائے کی طرف بڑھا' مگر اس دوران وہ سایہ فصیل کے نیچے پہنچ چکا تھا۔

قلعے کے پہرے داروں نے قریب جا کر سنا وہ سایہ آسمان کی طرف منہ اٹھائے فریاد کر رہا تھا۔

''اے عربوں کے خدا...... اے ترکوں کے خدا...... اے ایرانیوں کے خدا...... مجھ بت پرست کے ساتھ بھی انصاف کر!''

آگے بڑھتے ہوئے سپاہی رک گئے' وہ ایک بوڑھی عورت کی ہچکیاں سن رہے تھے' جب سلطان کے کارندوں سے عورت کی گریہ وزاری برداشت نہ ہو سکی تو ایک فوجی آگے بڑھ کر کہنے لگا۔

''تجھے انصاف چاہئے؟''

''ہاں! بوڑھی عورت نے چونک کر سپاہیوں کی طرف دیکھا۔

''یہ قلعے کی فصیل ہے۔'' سپاہی نے جواباً کہا۔ ''اگر تجھے انصاف درکار ہے تو سلطان غیاث الدین بلبن کے قصر سفید میں حاضر ہو کر رحم کی بھیک مانگ! یہ دیوار تجھے کیا دے گی؟''

''میں اپنے خدا سے انصاف مانگ رہی ہوں' مجھے تمہارے سلطان سے کچھ نہیں چاہئے۔'' بوڑھی عورت کا لہجہ سخت تھا۔

سپاہی اس کے پاگل پن پر ہنستے ہوئے چلے گئے۔

دوسرے دن بھی وہی بوڑھی عورت آدھی رات کے قریب نمودار ہوئی اور اسی طرح قلعے کی فصیل کے نیچے پہنچ کر اپنے خدا سے انصاف مانگنے لگی۔

پھر جب قلعے کے محافظوں نے اس پراسرار عورت کے بارے میں تحقیق کی تو انہیں معلوم ہوا کہ عورت کا نام سعدیہ خانم ہے اور اس کے جوان بیٹے کو سکہ سازی کے جرم میں موت کی سزا دی جا چکی ہے جوان بیٹے کی موت کے غم نے اسے پاگل کر دیا ہے۔ وہ یا تو دن بھر بیٹے کی قبر سے لپٹی روتی رہتی ہے یا پھر نصف شب کے سناٹے میں ''قصر سفید'' کی دیوار کے نیچے آ کر انصاف کیلئے اپنے خدا کو پکارتی رہتی ہے۔

سعدیہ خانم کی یہ المناک داستان سن کر کسی کسی سپاہی کے چہرے پر جذبات کا غبار پھیل گیا' مگر بیشتر فوجی ایک عورت کی اس حرکت کو دیوانگی سے تعبیر کرنے لگے۔

''انصاف تو ہو چکا اب وہ خدا سے کیا مانگ رہی ہے؟''

❋❋❋

جب قلعے کے محافظ سپاہی روزانہ آدھی رات کے سناٹے میں سعدیہ خانم کی گریہ وزاری سنتے سنتے پریشان ہو گئے تو ایک سپاہی نے سلطان غیاث الدین بلبن کی خدمت میں حاضر ہو کر سارا واقعہ بیان کر دیا۔

''آخر وہ عورت کن الفاظ میں انصاف طلب کرتی ہے؟'' بلبن نے سپاہی سے پوچھا۔

''اے عربوں کے خدا...... اے ترکوں کے خدا...... اے ایرانیوں کے خدا...... مجھ بت پرست کے ساتھ بھی انصاف کر۔''

سپاہی کی زبان سے یہ الفاظ سن کر غیاث الدین بلبن کے ہونٹوں پر گہری مسکراہٹ ابھر آئی۔

''بیٹے کی موت کے سبب وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھی ہے۔'' سلطان نے یکایک سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا...... ''اگر اسے ہوش ہوتا تو وہ خدا کی ذات کو اس طرح تقسیم نہیں کرتی' پھر بھی اس کے تحت الشعور میں یہ بات نقش ہو گئی ہے کہ سلطان غیاث الدین بلبن ترک نسل سے تعلق رکھتا ہے اور وہ اسی حوالے سے فرمانروائے ہند کو بددعائیں دے رہی ہے۔''

''سلطان معظم! وہ اس قدر دردناک لہجے میں فریاد کرتی ہے کہ سننے والوں کی سماعت پر اس کی چیخیں گراں گزرتی ہیں۔'' سپاہی نے لرزتے ہوئے لہجے میں کہا...... ''اگر آپ حکم دیں تو اس بڑھیا کو قلعے کی فصیل کے نیچے آنے سے روک دیں۔''

''ہرگز نہیں!'' سلطان غیاث الدین بلبن غضبناک نظر آنے لگا...... ''خبردار! ایسا نہ کرنا! کیا تم لوگ اپنے سلطان کو بدنام کرنا چاہتے ہو؟ وہ کیسی عجیب رسوائی ہوگی' جب کہنے والے کہیں گے کہ بلبن نے ایک کمزور عورت سے اس کی چیخیں بھی چھین لیں۔''

''یہ کوئی اچھی علامت نہیں ہے سلطان معظم!'' ایک درباری وزیر نے دست بستہ عرض کیا۔

''اچھی اور بری علامت سے تیری کیا مراد ہے؟'' بلبن کی آواز کچھ اور بلند ہو گئی تھی...... ''کیا تم ترکوں کو بھی ہندوستان کی توہم پرستی نے کھا لیا؟ نیک اور بدشگون تو اسی زمین کی پیداوار ہیں اور یہاں کے بت پرست ہی اس عقیدے پر عمل کرتے ہیں۔''

وزیر خاموش ہو گیا' مگر اس کے چہرے پر ایک غبار سا نظر آ رہا تھا۔

''وہ جو کچھ کرنا چاہتی ہے' اسے کرنے دو۔'' بلبن نے انتہائی قہرناک لہجے میں سپاہی کو حکم دیتے ہوئے کہا...... ''وہ ترکوں کے خدا سے انصاف مانگ رہی ہے' عنقریب اس پر یہ راز فاش ہو جائے گا کہ ترکوں کا خدا کیسا منصف و عادل ہے؟''

✲✲✲

سعدیہ خانم کا شور فغاں جاری رہا اور دہلی کے لوگ اپنے اپنے ہنگاموں میں گم ہو گئے۔ دیوداسی شکنتلا نے کئی بار سعدیہ خانم سے التجا کی کہ وہ اب گھر لوٹ چلیں' مگر سعدیہ خانم نے صاف صاف کہہ دیا۔

''بیٹی! اب یہی قبرستان میرا گھر ہے' مجھ سے بار بار ضد نہ کیا کر کہ تیری بات کو ٹھکراتے ہوئے مجھے بڑی اذیت ہوتی ہے۔''

پھر شکنتلا نے مکمل خاموشی اختیار کر لی' اس دوران کچھ اہل خیر سعدیہ خانم کی طرف متوجہ ہو گئے تھے اور ایک عورت کی حالت زار دیکھ کر ان لوگوں نے کہا تھا کہ وہ اس کی کفالت کر سکتے ہیں۔

سعدیہ خانم چاہتی تھی کہ وہ ان ہمدردوں کو سخت جواب دے کر رخصت کر دے' مگر پھر کچھ سوچ کر بہت آہستہ لہجے میں کہنے لگی۔

''میرا کفیل تو صرف اللہ ہے' آپ لوگوں کی یہ مہربانیاں میری دل آزاری کا سبب بنتی جا رہی ہیں' ابھی میری بیٹی زندہ ہے' وہ محنت و مزدوری کر کے مجھے دو روٹیاں کھلا دیتی ہے' خدا کیلئے مجھے تنہا چھوڑ دیجئے۔''

شکنتلا پہلے بلبن کے محلات کے تعمیری کاموں میں حصہ لے کر اتنی اجرت حاصل کر لیتی تھی جس سے سعدیہ خانم اور اس کے اپنے پیٹ کی آگ بجھ سکے' مگر جب بلبن نے شجاع الدین کامران کو پھانسی دے دی تو شکنتلا نے فرمانروائے ہند کی مزدوری چھوڑ کر دوسرے امراء کی وقتی ملازمت اختیار کر لی۔

اس دوران ٹھاکر کرشن راؤ کو خبر ملی تو ایک بار پھر اس کے کھوکھلے سینے میں ہوس پرستی کے جذبات موجزن ہو گئے' ایک دن وہ خود شکنتلا کے پاس گیا اور اس نے شدید اپنائیت کے لہجے میں کہا۔

''دیوداسی! اپنے ان نرم و نازک ہاتھوں کو پتھروں سے کیوں زخمی کرتی ہے؟ ابھی ٹھاکر کرشن راؤ مرا تو نہیں ہے' ہمارے مذہب ضرور بدل گئے ہیں' مگر ماضی کی یادیں ابھی تک زندہ ہیں' میرے گھر چلی آ! پھر تو کچھ دیر کیلئے دیوداسی بن جا اور میں ٹھاکر کا روپ دھار لوں' تیری جوانی آرام سے گزر جائے گی۔''

''تجھے معلوم ہونا چاہئے ٹھاکر کہ میں بھی مسلمان ہوں۔'' شکنتلا کی آنکھوں میں نفرت کے شعلے بھڑک اٹھے تھے...... ''اور میں اس وقت مسلمان ہوئی تھی جب میرے پیروں میں تیرے جبر کی زنجیریں پڑی تھیں...... اور میرا جسم تیرے تشدد کا نشانہ بنا تھا۔''

ٹھاکر کرشن راؤ بڑی حیرت سے دیوداسی کی باتیں سن رہا تھا۔

''میں نہیں جانتی کہ تیرا اسلام کیا ہے' مگر پھر بھی اپنے بڑھاپے پر رحم کھا' تجھے جو چھوٹ ملی ہے اس سے فائدہ اٹھا اور اپنے گناہوں سے توبہ کر لے' جب تیری رسی کھینچی جائے گی وہ بڑا خوفناک دن ہوگا ٹھاکر! اس دن سے ڈر اور اپنا ناپاک چہرہ میری نظروں کے سامنے سے گم کر دے۔''

کرشن راؤ کچھ دیر تک اس کی مجبوریوں پر ہنستا رہا اور پھر یہ کہتا ہوا چلا گیا۔

''جب تیرے ہاتھ شل ہو جائیں اور بدن تھک کر چور ہو جائے تو میرے پاس چلی آنا' میرے دروازے تیرے لئے ہمیشہ کھلے رہیں گے۔''

یاسمین خانم آج کل بہت پریشان نظر آ رہی تھی۔ امیر طغرل کی نظروں کا زاویہ بدل گیا تھا' اب اس کی نگاہوں کا مرکز ایک شوخ و شریر رقاصہ مالنی تھی جسے اس کے کچھ بے ضمیر مصاحب پورب کے علاقے سے لے کر آئے تھے۔ مالنی کا رنگ ہلکا سانولا تھا مگر نقوش بہت تیکھے تھے۔ یہ چند خوشامدی امیر طغرل سے اپنے کاموں کیلئے بلبن کے حضور میں سفارش کرانا چاہتے تھے۔ وہ لوگ جانتے تھے کہ امیر طغرل کی سب سے بڑی کمزوری عورت تھی۔ وہ عورت جو

خوبصورت ہو اور رقص و موسیقی کے فن میں ماہر بھی۔ طغرل کے مصاحب اپنے امیر کے مزاج سے آشنا تھے' اس لئے الٰہ آباد کی طرف سے ایک ایسی رقاصہ کو لے کر آئے تھے جس نے ہندوؤں کے مذہبی ناٹکوں اور دیگر تفریحی منڈیوں میں دھوم مچا رکھی تھی۔

امیر طغرل رقاصہ مالنی کو دیکھ کر بہت خوش ہوا اور پھر اس کی راتیں ''پورب کی نرتکی'' پر قربان ہونے لگیں۔ اب مالنی کے پازیب کی جھنکار تھی اور امیر طغرل کی سرمستیاں۔

یاسمین خانم نے کچھ دیر تک شوہر کی اس بے اعتنائی کو برداشت کیا' پھر اس وقت شوہر کا راستہ روک کر کہنے لگی' جب امیر طغرل اپنے عشرت کدے کی طرف جا رہا تھا۔

''آخر اس بدصورت فاحشہ میں ایسا کون سا جادو ہے جس نے آپ کو اپنی شریک حیات سے بے نیاز کر دیا ہے۔'' یاسمین خانم کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا اور اس کی آواز معمول سے بہت زیادہ تیز تھی۔

''تم خوب جانتی ہو یاسمین خانم کہ امیر طغرل ایک کتاب کو بار بار نہیں پڑھ سکتا۔'' امیر طغرل شراب کے نشے میں لڑکھڑا رہا تھا۔ ''پورب کی وہ رقاصہ ایک اچھوتی اور نئی کتاب ہے' بس کچھ دن اور اس کا مطالعہ کروں گا پھر وہ بھی میرے کتب خانے سے باہر کسی تاریک گلی میں پڑی ہوگی اور بہت سے آنے جانے والے جاہل گنوار اس کے اوراق کو پامال کر رہے ہوں گے۔''

یاسمین خانم لرز کر رہ گئی؟ ''امیر! میں نے آپ کے کردار کا یہ گھناؤنا رخ پہلی بار اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔''

جوش جذبات میں یاسمین خانم کی زبان لڑکھڑا گئی...... ''کیا میں نے یہ دن دیکھنے کیلئے اس شخص سے شادی کی تھی جو عمر میں میرے باپ سے بھی بڑا ہے؟'' یاسمین خانم بے قابو ہوتی جا رہی تھی...... ''کیا میرا مقدر یہ ہے کہ بازاروں میں ناچنے والی طوائفیں میرے گھر پر حکومت کریں اور میں کسی ناپسندیدہ کنیز کی طرح کسی گوشے میں منہ چھپائے پڑی رہوں۔''

''شادی سے پہلے میرے کردار کا کوئی پہلو تیرے باپ کی نظروں سے پوشیدہ نہیں تھا۔'' امیر طغرل برہم نظر آنے لگا...... ''قائم خان راجپوت ایک تاجر ہے اور میں اس ملک کا سب سے بڑا خریدار...... اس نے دربار سلطانی میں اپنا اثر و رسوخ بڑھانے کیلئے تیرے جسم کو ڈھال بنایا تھا' تو میری پسند نہیں' ضرورت تھی...... اور میں ضرورت کی بیشمار چیزیں خریدتا رہتا ہوں' بازار میں فروخت ہونے والی چیزوں کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے خریداروں سے بدکلامی کریں' ایسی گستاخ اور بے ادب اشیاء کا انجام یہ ہوتا ہے کہ وہ نیلام گاہ کے باہر پھینک دی جاتی ہیں اور راستہ چلنے والے گداگر انہیں اٹھا کر لے جاتے ہیں۔'' یہ کہہ کر امیر طغرل رقاصہ مالنی کے پاس چلا گیا۔

یاسمین خانم پر قیامت سی ٹوٹ پڑی تھی۔ وہ اسی وقت رات کے اندھیرے میں اپنے باپ قائم خان کے گھر پہنچی اور رو رو کر اپنی داستان الم سنانے لگی۔

قائم خان کے چہرے پر اذیت و کرب کے سائے ابھر ابھر کر ڈوبنے لگے۔ زرتاج خانم خاموش تھی' مگر اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

''بیٹی! مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ امیر طغرل اس حد تک گر جائے گا۔'' قائم خان نے فکر آمیز لہجے میں کہا...... ''بے راہ روی تو امیروں کا مزاج ہوتی ہے مگر طغرل تو انتہائی پستیوں میں اتر گیا ہے' افسوس! میں اندھا ہو چکا تھا۔''

قائم خان بھی اپنی کم نظری کا ماتم کرتے کرتے بیٹی کے سامنے آنسو بہانے لگا...... حالانکہ وہ طغرل کی بدکرداریوں کے ایک ایک زاویے سے واقف تھا اور خود اس نے بھی اس اوباش امیر کے ساتھ بیشمار راتیں رقص و سرور کی محفلوں میں

بسر کی تھیں۔

"صبر کر بیٹی! ابھی تیرا باپ زندہ ہے۔" قائم خان نے اپنی لغزشوں کی پردہ پوشی کرنے کیلئے یاسمین خانم کو تسلی دیتے ہوئے کہا..... "امیر اس وقت نشے میں ہوگا' میرا خیال ہے کہ شراب کا اثر زائل ہوتے ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہو جائے گا اور پھر تم دونوں کے درمیان حائل ہو جانے والی یہ عارضی خلیج بھی دور ہو جائے گی۔" اپنی عیار فطرت کے مطابق قائم خان بڑی غیر حقیقی باتیں کر رہا تھا۔

"مگر میں کسی عورت کی برتری تسلیم نہیں کر سکتی۔" یاسمین خانم کا غصہ ایک بار پھر اپنے عروج کو پہنچ گیا تھا..... وہ تو بالا خانوں کی عورتیں ہیں' میں تو ملکہ ہند کو بھی یہ رعایت دینے کیلئے تیار نہیں ہوں۔" ایسی خوفناک فضا میں بھی یاسمین خانم کے اندر کی عورت پوری طرح جاگ رہی تھی۔

"نہیں بیٹی! یہ جوش و جذبات کے مظاہرے کا وقت نہیں۔" قائم خان کی فریب کار عقل نے ایک اور کروٹ بدلی..... "تجھے بہر حال سیاست سے کام لینا ہوگا' پہلے اپنے دامن کو زرو جواہر سے بھر لے' پھر امیر طغرل کے بارے میں سوچا جائے گا' میں اسے اس بدعہدی کی بڑی عبرتناک سزا دوں گا۔"

یاسمین خانم سنبھل گئی' اب اس کی آنکھوں میں کچھ عجیب سی پراسرار پرچھائیاں لرز رہی تھیں۔

***

ٹھاکر کرشن راؤ نے ایک دن بڑی رازداری کے ساتھ پنڈت بدری ناتھ کو اپنے گھر دعوت پر بلایا۔ ہندوؤں کی رسم کے مطابق کھانے میں ترکاریاں اور پھل شامل تھے' کھانے کے بعد کرشن راؤ نے بدری ناتھ سے سرگوشیوں میں پوچھا۔

"پنڈت! سلطان کے بارے میں ستارے کیا کہہ رہے ہیں؟"

"یہی کہ ایک سال کا اور مہمان ہے۔" بدری ناتھ نے مسکراتے ہوئے کہا..... "تو تو میرے گیان کی سچائیوں سے واقف ہے ٹھاکر کہ دیوتا مجھے کبھی غلط خبر نہیں دیتے۔"

کرشن راؤ نے عقیدت سے سر جھکا دیا..... "پنڈت! تیری بھوش وانی (پیش گوئی) کے سہارے تو اس پاپی جیون کا ایک ایک پل گن گن کر کاٹ رہا ہوں۔"

"گھبرا نہیں ٹھاکر! بس کچھ دن اور! اس کے بعد مسلمانوں کی حکومت انتشار کی نذر ہو کر ہمیشہ کیلئے فنا ہو جائے گی اور پھر وہی سمراٹ اشوک کا زمانہ لوٹ آئے گا..... اور ہر طرف رام راج کی جے جے کار ہوگی۔" یہ کہہ کر پنڈت بدری ناتھ گھر جانے کیلئے اٹھا..... "ہرے کرشن! ہرے راما!"

ٹھاکر کرشن راؤ نے بھی زیر لب یہی الفاظ دہرائے..... "ہرے کرشن ہرے راما....." اور پھر وہ پنڈت بدری ناتھ کو رخصت کرنے کیلئے حویلی کے دروازے تک آیا۔

پنڈت نے دونوں ہاتھ جوڑ کر سلام کیا اور ٹھاکر کو دیوتاؤں کے زیر سایہ رہنے کی دعائیں دینے لگا۔ یکا یک بدری ناتھ کے پاؤں کانپنے لگے اور اس نے اپنا ایک ہاتھ سینے پر رکھ لیا۔

"کیا ہوا پنڈت؟" کرشن راؤ نے پوچھا' مگر بدری ناتھ لہرا کر زمین پر گر چکا تھا اور بار بار اپنے دل کو مسل رہا تھا۔

"کچھ تو بتا پنڈت! تجھے کیا ہو رہا ہے؟" کرشن راؤ بدحواس ہو کر بدری ناتھ پر جھک گیا۔

"ہے ایشورا! ہے پربھو! ہری اوم! ہری اوم!" بدری ناتھ بڑے کرب کے عالم میں چیخ رہا تھا۔

جب کرشن راؤ نے اس سے بار بار پوچھا تو پنڈت بمشکل یہ چند الفاظ ادا کر سکا..... ''ٹھاکر! میرے دل میں ناقابل بیان درد ہے' ایسا لگتا ہے کہ یہ ٹکڑے ہو کر بکھر جانے والا ہے۔''

''نہیں بدری ناتھ تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔'' کرشن راؤ گھبرا گھبرا کر اسے تسلیاں دے رہا تھا۔

''ٹھاکر! میں جا رہا ہوں! ہری اوم! ہری اوم!' یہ کہہ کر بدری ناتھ دو تین بار کسی ذبح ہونے والے جانور کی طرح تڑپا اور پھر اس کا تنومند جسم ساکت ہو گیا۔

ٹھاکر کرشن راؤ کو اپنی نبض ڈوبتی سی محسوس ہونے لگی' سلطان غیاث الدین بلبن کے زوال اور موت کی پیش گوئی کرنے والا خود دنیا سے بہت دور جا چکا تھا۔

❊❊❊

وقت تیزی سے اپنا سفر طے کرتا رہا۔

نصف شب کے سناٹوں میں سعدیہ خانم انصاف مانگتی رہی۔

شکنتلا آدھے دن مزدوری کرتی اور باقی وقت اس ماں کی خدمت میں گزارتی جو اپنے جواں مرگ بیٹے کی قبر کے پاس بیٹھے بیٹھے یا تو مٹی کے ڈھیر کو دیکھتی رہتی یا پھر اس کی ویران آنکھیں نیلگوں آسمان کے کسی گوشے پر جم کر رہ جاتیں۔

امیر طغرل نے یاسمین خانم کو یکسر نظر انداز کر دیا تھا اور وہ رقاصہ مالنی کے جسم کے پیچ و خم میں کھو کر رہ گیا تھا۔

یاسمین خانم قائم خان کی ہدایت کے مطابق امیر طغرل کی دولت کو آہستہ آہستہ اپنے باپ کی حویلی میں منتقل کر رہی تھی۔

اور ٹھاکر کرشن راؤ اپنے چیلوں کے ساتھ بہت زور و شور سے اسلام کے نعرے لگا رہا تھا۔

اسی دوران ایک روز کرشن راؤ کے خدمت گاروں نے اسے اطلاع دیتے ہوئے کہا۔

''ٹھاکر! کوئی پریشان حال سادھو آپ سے ملنا چاہتا ہے۔''

سادھو کے نام پر کرشن راؤ چونک اٹھا اور پھر اسے اپنا ماضی یاد آ گیا جو حال کی سیاست کے پردوں میں لپٹا ہوا تھا۔

''اسے فوراً بلاؤ۔'' ٹھاکر بہت بے قرار نظر آ رہا تھا۔

اور جب وہ سادھو کرشن راؤ کے کمرے میں داخل ہوا تو ٹھاکر کا چہرہ دیکھ کر جھجک گیا۔

''آؤ مہاراج! رک کیوں گئے؟'' کرشن راؤ نے سادھو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''شاید میں غلط جگہ آ گیا' مجھ سے تو لوگوں نے کہا تھا کہ یہ ٹھاکر کرشن راؤ کی حویلی ہے۔'' سادھو بہت تھکی ہوئی آواز میں بول رہا تھا' جیسے وہ کئی وقت کا بھوکا ہو اور شدید نقاہت کے باعث اسے بولنے میں دشواری پیش آ رہی ہو۔

''میں وہی کرشن راؤ ہوں۔'' ٹھاکر نے پرجوش لہجے میں کہا۔

''مگر یہ تو کسی ہندو کا گھر معلوم نہیں ہوتا۔'' سادھو نے لوہے کے وزنی ترشول کو زمین پر پٹکتے ہوئے کہا..... ''یہ سب کچھ کیا ہے؟'' ایک بڑے کتبے کی طرف اشارہ کیا' جس پر ''اللہ'' تحریر تھا۔

''ہاں! میں مسلمان ہو گیا ہوں۔'' کرشن راؤ نے گھبرا کر کہا..... ''مگر آپ اندر تو آئیں مہاراج!'' کرشن راؤ کو سادھو کے حلیے نے بہت زیادہ متاثر کیا تھا۔

سادھو ایک دراز قامت انسان تھا' جس کی لمبی داڑھی ... اور سر کے دراز گھنے بالوں نے شانوں

کو پوری طرح ڈھانپ لیا تھا۔ سادھو کے چہرے کا رنگ سیاہ تھا اور آنکھیں اس قدر سرخ تھیں کہ ان سے خون ٹپکتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ اس کا لباس قریب المرگ مریض کے چہرے کی طرح زرد تھا' ہاتھوں میں لوہے کے بھاری کڑے تھے اور وہ نظریں جھکا کر گفتگو کر رہا تھا۔

سادھو نے کرشن راؤ کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور وہ یہ کہتا ہوا جانے کیلئے مڑا۔

''وہاں کیا ٹھہرنا جہاں لوگوں نے اپنا دھرم بیچ دیا ہو۔''

''ٹھہریں مہاراج!'' کرشن راؤ کھڑا ہوا اور تیزی سے سادھو کی طرف بڑھا...... ''آپ کیسے گیانی ہیں کہ انسان کے سہل کی حالت کو نہیں پہچانتے۔''

سادھو رک گیا اور ناگوار لہجے میں کہنے لگا...... ''ہم نے بنارس کے پنڈتوں کی زبانی سنا تھا کہ دہلی میں کرشن راؤ نام کا ایک ٹھاکر ہندو دھرم کا سب سے بڑا رکشک ہے' بس یہی تڑپ ہمیں یہاں کھینچ لائی تھی' تو نے ہمارے پیروں کی طرف نہیں دیکھا ٹھاکر کہ پیدل چلتے چلتے چھالے پڑ گئے ہیں' تیرے کارن کیسے کیسے کشٹ اٹھائے ہیں' مگر جب یہ معلوم ہوا کہ تو نے اپنے پرکھوں کا دھرم مسلمانوں کے یہاں گروی رکھ دیا ہے تو دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا' اب کوئی کس پر وشواس کرے' سارا سنسار ہی جھوٹا لگتا ہے۔'' سادھو کی آواز میں بڑا کرب تھا۔

''مہاراج! کرشن راؤ نے آگے بڑھ کر سادھو کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے اپنے کمرے کی طرف کھینچتے ہوئے بولا......

''آپ بس ایک رات میری کٹیا میں وشرام کر لیں' پھر آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ میں نے یہ روپ کیوں دھارا ہے؟''

سادھو کچھ دیر تک گردن جھکائے کھڑا رہا' جیسے اس کے دل و دماغ میں شدید کشمکش جاری ہے' پھر وہ تھکے تھکے قدموں سے کرشن راؤ کے کمرے میں داخل ہو گیا۔

سادھو نے ٹھاکر کو بتایا کہ بنارس کے تمام پجاریوں کی نظریں کرشن راؤ پر لگی ہوئی ہیں اور وہ اس کے تعاون کا انتظار کر رہے ہیں۔

''کیسا تعاون؟'' کرشن راؤ اپنی تعریف سن کر بدحواس ہو گیا تھا۔

''رام راج کی شکست کے بعد برہمنوں اور تعلیم یافتہ طبقے کی معاشی حالت بہت زیادہ بگڑ گئی ہے۔'' سادھو نے اثر انگیز لہجے میں اپنی قوم کی حالت زار کا ذکر کرتے ہوئے کہا...... ''اگر مالدار ہندوؤں نے مندروں اور آشرموں کی دل کھول کر مدد نہیں کی تو پھر دھارمک شکشا ختم ہو جائے گی اور ہندو آہستہ آہستہ اپنی موت آپ مر جائے گا' مفلس و نادار طالبعلموں کو زندہ رکھنے کیلئے اچھی غذا اور اچھے لباس کی ضرورت ہے' اگر یہ اسی طرح فاقے کرتے رہے تو ایک دن ان کے ذہنوں کے سوتے خشک ہو جائیں گے اور گیان کی دنیا میں بڑا خوفناک قحط پڑ جائے گا' انہیں بچانے کیلئے سونا چاندی چاہئے ٹھاکر! مگر میں یہ باتیں تجھ سے کیوں کر رہا ہوں؟'' اچانک سادھو اداس نظر آنے لگا۔

''مہاراج! پورے ہندوستان میں آپ کی باتیں صرف کرشن راؤ ہی سمجھ سکتا ہے۔'' ٹھاکر نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا...... ''میں نے دیوتاؤں سے کیا ہوا عہد نہیں توڑا ہے' میں آج بھی وہی ہوں ٹھاکر کرشن راؤ دیوتاؤں کے قدموں کی خاک' بھگوان کا ایک حقیر سا پجاری۔''

اس کے بعد کرشن راؤ نے اپنی تبدیلی مذہب کا واقعہ تفصیل کے ساتھ اجنبی سادھو کو سنا دیا اور اپنے منافقانہ منصوبے کی وضاحت کرتے ہوئے یہ بھی کہہ دیا کہ وہ پنڈت بدری ناتھ کی پیش گوئی کے مطابق سلطان غیاث الدین بلبن کے مرنے کا انتظار کر رہا ہے۔

سادھو نے بہت غور سے کرشن راؤ کی باتیں سنیں اور پھر غضبناک لہجے میں بولا...... ''سلطان مرے گا نہیں اسے

گیان کے ہتھیار سے مارا جائے گا۔"

"کون مارے گا مہاراج؟" کرشن راؤ کی سانسیں رکنے لگیں۔

"میری تانترک ودیا (جادوئی تعلیم) اسے ہلاک کرے گی۔" سادھو نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا...... "میں اسی لئے آیا ہوں کہ دہلی کے ایک گوشے میں بیٹھ کر دن رات تپسیا کروں اور پھر ایک دن یم راج کی طرح بلبن کی سانسیں چھین کر بنارس کی طرف لوٹ جاؤں۔

ٹھاکر کرشن راؤ نے جوش جذبات میں سادھو کو سجدہ کرلیا' بہت دن بعد اسے ایک ہم نوا ملا تھا جو اس کی خواہش کے مطابق سلطان غیاث الدین بلبن کو اپنے علم کی طاقت سے ہلاک کرسکتا تھا۔

کرشن راؤ نے حویلی کے ایک الگ تھلگ کمرے میں سادھو کے ٹھہرنے کا انتظام کردیا' دیکھتے ہی دیکھتے سادھو کی آرام گاہ دنیا کی ہر آسائش سے بھر گئی تھی۔

ٹھاکر نے شراب کی پیشکش کی تو سادھو قہر کا مجسمہ نظر آنے لگا...... "ہم بھگوان کے سچے بھگت ہیں اور اس سنسار کے ہر موہ کو تیاگ چکے ہیں۔ شیشے کی طرح صاف ہماری آتما اس میل کو برداشت نہیں کرسکتی۔"

ٹھاکر کرشن راؤ نے سادھو کی روحانی عظمتوں کے آگے مکمل طور پر سر جھکا دیا' اب وہ ہندو دھرم کے ایک بے غرض پجاری کے قدموں سے لپٹا ہوا تھا۔

سادھو تین تین دن بھوکا رہ کر غیاث الدین بلبن کی ہلاکت کیلئے جاپ کرتا رہا۔ ٹھاکر کرشن راؤ سادھو سے بہت زیادہ متاثر نظر آرہا تھا۔ ایک دن سادھو نے اسے اپنے کمرے میں طلب کرتے ہوئے کہا...... "میرے اس منتر اور جاپ کی خبر کسی دوسرے آدمی کو نہیں ہونی چاہئے۔ بھگوان ان لوگوں کو پسند نہیں کرتے جو آسمانوں کے راز زمین والوں پر فاش کردیتے ہیں۔"

"ایسا ہی ہوگا مہاراج؟" کرشن راؤ نے سر جھکا کر کہا۔

سادھو نے ہاتھ کے اشارے سے ٹھاکر کو جانے کیلئے کہا اور زیر لب کچھ پڑھنے لگا۔

کوئی پندرہ دن بعد سادھو نے دوبارہ کرشن راؤ کو اپنے کمرے میں طلب کرتے ہوئے کہا...... "کل میرے جاپ کا آخری دن ہے' اس عرصے میں میرے شریر پر جو کچھ گزری ہے میں اسے بیان نہیں کرسکتا ٹھاکر!" سادھو بہت تھکے ہوئے لہجے میں بول رہا تھا۔

"میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں مہاراج!" کرشن نے آگے بڑھ کر سادھو کے پاؤں پکڑ لئے۔

"کل میری اس جان لیوا ریاضت کا آخری دن ہے۔" سادھو نے نظریں جھکائے فرش پر کچھ لکیریں کھینچتے ہوئے کہا۔

"وہ میری زندگی کا یادگار دن ہوگا۔" جوش جذبات میں کرشن راؤ کے بوڑھے چہرے پر ایک تناؤ سا پیدا ہوگیا تھا۔

"کل تو اپنی آنکھوں سے سلطان کی موت کا منظر دیکھے گا۔" سادھو کی نظریں بدستور فرش پر جمی ہوئی تھیں۔

"وہ کس طرح؟" کرشن راؤ کسی بچے کی مانند مچل گیا۔

"میرے گیان کی اپار شکتیاں (غیر محدود طاقتیں) تجھے اسی کمرے میں غیاث الدین بلبن کی موت کا منظر دکھا سکتی ہیں۔" سادھو کے لہجے میں ایک جلالی رنگ شامل تھا۔

"میں اپنی ساری دولت آپ پر نچھاور کروں گا مہاراج!" کرشن راؤ کی آواز لرزنے لگی تھی...... "کاش! دیوتا

ہم سے راضی ہو جائیں۔"

"دیوتا ہم سے خفا کب ہوئے تھے ٹھاکر؟" سادھو نے مسکراتے ہوئے کہا...... "مگر ایک بات سن لے کہ کل ہم دونوں کے سوا اس حویلی میں کسی تیسرے فرد کو موجود نہیں ہونا چاہئے' رام کی لیلا دیکھنے کیلئے تنہائی ضروری ہے۔"

"میں آج ہی اس حویلی کے مکینوں کو کسی دوسرے مقام پر منتقل کر دوں گا۔" کرشن راؤ نے گھبرا کر کہا...... "بس ایک دن کی تو بات ہے۔"

"ہاں ٹھاکر! ایک ہی دن کی بات ہے۔" سادھو نے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی اور کچھ ایسے کلمات کی گردان کرنے لگا جس کا مفہوم کرشن راؤ کی عقل سے بالاتر تھا۔

❁❁❁

دوسرے دن کرشن راؤ نے ساری حویلی خالی کر دی' اس کی بیٹی' مفلوج داماد اور تمام خدمت گار کسی دوسری جگہ منتقل ہو گئے اور پھر ٹھاکر ایک خاص جذبے سے سرشار ہو کر سادھو کے کمرے میں پہنچا۔

"مہاراج! اب مجھے سلطان غیاث الدین بلبن کی ہلاکت کا منظر دکھا دو۔" کرشن راؤ نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

سادھو نے آنکھیں کھولیں اور ایک اچٹتی ہوئی نظر کرشن راؤ پر ڈالی...... "ابھی میرا آخری عمل باقی ہے۔" یہ کہہ کر سادھو اٹھا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔

پھر اس نے حویلی کے ایک ایک کمرے اور ایک ایک گوشے کا جائزہ لیا' وہاں کسی متنفس کا عکس تک نہیں تھا۔ سادھو ہر قدم پر رک کر پھونک مارتا اور آگے بڑھ جاتا۔

"یہ عمل میں اس لئے کر رہا ہوں ٹھاکر کہ تیری حویلی تمام برے اثرات سے محفوظ ہو جائے۔" سادھو نے کرشن راؤ کو سمجھاتے ہوئے کہا...... "سلطان کو ایک کمرے میں بیٹھ کر ہلاک کرنا اتنا آسان نہیں ہے۔"

کرشن راؤ جوش عقیدت میں بار بار اپنے سر کو جنبش دیتا رہا' جیسے وہ سادھو کا انتہائی فرمانبردار خادم ہو۔

پھر سادھو ٹھاکر کو لے کر اپنے کمرے میں واپس آیا اور دروازہ بند کر دیا۔

کرشن راؤ بڑی حیرت سے سادھو کے عمل کو دیکھ رہا تھا۔

سادھو نے اپنے کاندھوں پر پڑا ہوا رومال اتار کر زمین پر بچھا دیا' پھر اس نے اپنی تہ بند کے نیچے سے ایک چمکدار خنجر نکالا۔

کرشن راؤ خاموش تھا' مگر اس کے چہرے پر خوف و دہشت کی ہلکی ہلکی پرچھائیاں لرز رہی تھیں۔

سادھو نے نظریں نیچی کئے ہوئے خنجر کی دھار پر اپنا ہاتھ پھیرا اور بڑے مطمئن لہجے میں کہنے لگا۔

"یہ وہ خنجر ہے جس سے ہندو دھرم کے سب سے بڑے دشمن کو قتل کیا جائے گا۔"

کرشن راؤ ایک ناقابل یقین تماشا دیکھنے کیلئے بے چین نظر آ رہا تھا...... "یہ کیسی انہونی بات ہو گی مہاراج؟"

"انہونی نہیں ٹھاکر!" یکایک سادھو کی آواز تیز ہو گئی۔ "یہ ہونی ہے اور ہو کر رہے گی۔"

سادھو کے لہجے میں بڑی گرج تھی' کرشن راؤ کانپ کر رہ گیا' لیکن فوراً ہی اس کے ہونٹوں پر ایک گہری مسکراہٹ نمایاں ہو گئی' وہ غیاث الدین بلبن کی موت کے تصور سے خوش نظر آنے لگا...... "جلدی کریں مہاراج! مجھ پر تو ایک ایک سانس بھاری ہے۔"

"ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے ٹھاکر!" سادھو کی آواز کچھ اور بلند ہو گئی تھی۔

کرشن راؤ خاموشی سے سادھو کے سیاہ چہرے کو دیکھتا رہا۔ سادھو کی نظریں اب بھی فرش پر جمی ہوئی تھیں۔
پھر آہستہ آہستہ سادھو نے اپنی گردن اٹھائی اور کرشن راؤ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔
''میری طرف دیکھ ٹھاکر!'' سادھو نے سخت لہجے میں کرشن راؤ کو مخاطب کیا...... ''تجھے ان آنکھوں میں کیا نظر آرہا ہے؟''
کرشن راؤ سادھو کی اس بات کا مفہوم سمجھنے سے قاصر رہا۔
''غور سے دیکھ ٹھاکر! تجھے میری آنکھوں میں ہندو دھرم کے سب سے بڑے دشمن کا چہرہ نظر آئے گا۔'' پہلی بار سادھو کے خشک ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ کا عکس ابھرا تھا۔
کرشن راؤ آگے کی طرف جھکا' وہ سادھو کی اس بات کو بھی بلبن کی ہلاکت کے عمل کا ایک حصہ سمجھ رہا تھا۔ ٹھاکر نے ان آنکھوں میں جھانکا جہاں خوں رنگ لہروں کے درمیان خود اس کا اپنا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔
''یہاں تو کچھ بھی نہیں مہاراج! مجھے اپنا ہی عکس نظر آرہا ہے۔'' کرشن راؤ نے حیران ہو کر کہا۔
''اور یہ ہندو دھرم کے سب سے بڑے دشمن کا عکس ہے۔'' سادھو خنجر لے کر کھڑا ہو گیا...... ''اس دور کے سب سے بڑے بہروپئے' منافق اور دیوتاؤں کے غدار کا عکس۔''
کرشن راؤ پاگلوں کی طرح سادھو کی طرف دیکھنے لگا' اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا...... ''آپ کیا کہہ رہے ہیں مہاراج؟''
''ٹھاکر! میں بنارس کے جنگلوں میں تپسیا کرنے والا سادھو نہیں' تیرا پرانا شناسا سردار نرسنگا ہوں۔''
یہ انکشاف کیا تھا' ایک برق تھی جس نے کرشن راؤ کے خرمن ہوش کو جلا ڈالا' وہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔
دیوتاؤں نے مجھے اس دن کیلئے زندہ چھوڑ دیا تھا کہ تجھے تیرے انجام تک پہنچا سکوں۔'' خنجر پر نرسنگا کے ہاتھوں کی گرفت مضبوط ہو گئی تھی...... ''ایسا انجام کہ جسے یاد کر کے آنے والی نسلیں صدیوں تک کانپتی رہیں۔''
کرشن راؤ بھکاریوں کی طرح گڑگڑانے لگا اور اس نے جھک کر نرسنگا کے قدموں پر سر رکھنا چاہا' مگر سردار کی ایک بھرپور ٹھوکر نے اسے الٹ دیا' وہ اوندھے منہ گرا' چوٹ شدید تھی لیکن موت کے خوف نے کرشن راؤ کو فوراً ہی دوبارہ اٹھنے پر مجبور کر دیا۔
''مجھے معاف کر دے سردار! کرشن راؤ نے نرسنگا کے قدموں سے دور زمین پر سر رکھ دیا۔'' تجھے امر پالی کا واسطہ!''
امر پالی کا نام سن کر نرسنگا لرز گیا...... دل کو کئی کہانیاں یاد سی آ کے رہ گئیں۔
نرسنگا کی خاموشی کو ٹھاکر نے اپنے حق میں نیک فال سمجھا اور سر اٹھا کر سردار کے چہرے کا جائزہ لینے لگا۔ نرسنگا پتھر کے کسی ستون کی طرح ساکن ہو گیا تھا۔
کرشن راؤ کو اپنی زندگی کی امید ہو چلی تھی' وہ آہستہ آہستہ زمین سے اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔
نرسنگا نے آگے بڑھ کر ٹھاکر کے منہ پر ایک اور ٹھوکر ماری۔
''امر پالی اب کہاں رہی پاپی؟'' شدت جذبات سے نرسنگا کی آواز کانپنے لگی تھی...... ''اسے بھی تیرے پاپوں نے کھا لیا' اگر تو سلطان کو میرے خفیہ ٹھکانوں کا پتا نہ بتاتا تو میری جان میرے تن سے الگ نہ ہوتی' میں کب سے اپنی لاش کو اٹھائے ہوئے در در بھٹک رہا ہوں...... مگر دیوتاؤں نے ترس کھا کر آج مجھے نئی زندگی بخش دی۔''
یہ کہہ کر سردار نرسنگا کرشن راؤ پر کسی باز کی طرح جھپٹا اور اسے اپنے طاقتور گھٹنے کے نیچے دبا کر ذبح کر دیا۔ کرشن

راؤ کا بوڑھا جسم چند لمحوں تک تڑپا اور پھر ساکت ہو گیا۔

نرسنگا کچھ فاصلے پر کھڑا موت کا مختصر رقص دیکھتا رہا' پھر اس نے ٹھاکر کی گردن کاٹ کر اسے پانی سے دھویا اور اپنے بڑے رومال میں باندھ کر کرشن راؤ کی حویلی سے نکل گیا۔

❀❀❀❀

غیاث الدین بلبن کے امراء بنارس کے اس سادھو کو دربار میں داخل ہوتے دیکھ رہے تھے جو طویل فاصلہ طے کر کے سلطان کو نذر پیش کرنے آیا تھا۔ یہ سردار نرسنگا تھا' جو بے نیازی کے انداز میں چلتا ہوا تخت کے نیچے جا کر ٹھہر گیا۔ نہ اس کی گردن میں کوئی خم تھا اور نہ چہرے پر جلال شاہی سے متاثر ہونے کی کوئی ہلکی سی علامت' تمام امراء حیران تھے اور سادھو کی بے ادبی دیکھ کر ان کے ماتھے لکیروں سے بھر گئے تھے۔ خود سلطان غیاث الدین بلبن کی آنکھوں میں بھی ناپسندیدگی کا رنگ جھلک رہا تھا' مگر فرمانروائے ہند نے اپنی رواداری کے سبب ایک غیر مذہب کے نمائندے کی اس حرکت کو نظر انداز کر دیا۔ بلبن کی یہ چشم پوشی کچھ یوں بھی تھی کہ وہ درویشوں اور سادھو سنتوں کی بے نیازی کے بہت سے قصے سن چکا تھا اور اس قسم کے کچھ مظاہرے اس نے اپنی آنکھوں سے بھی دیکھے تھے۔

''سلطان! میں دربار کے آداب سے واقف نہیں' مگر پھر بھی تیرے لئے ایک خاص تحفہ لایا ہوں۔'' سردار نرسنگا نے بڑے بے باک لہجے میں کہا۔

دربار پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔

بلبن نے سر کی جنبش سے اپنی آمادگی کا اظہار کیا۔

نرسنگا نے چند قدم آگے بڑھ کر اپنا رومال تخت کے کنارے پر رکھا اور اسے اس طرح کھول دیا کہ ٹھاکر کرشن راؤ کا کٹا ہوا سر صاف نظر آنے لگا۔ یہ عمل اس قدر غیر متوقع تھا کہ امراء کے ساتھ غیاث الدین بلبن بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''اے گستاخ شخص! تو کون ہے اور یہ کیا تماشا ہے؟'' بلبن کی بارعب آواز سے پورا دربار لرز اٹھا۔

محافظ سپاہیوں کی تلواریں بے نیام ہو گئیں اور وہ ایک خاص زاویہ بناتے ہوئے نرسنگا کی طرف بڑھنے لگے' پھر جب نرسنگا کے گرد شمشیر بردار سپاہیوں کا دائرہ کھنچ گیا تو جنگلی سردار نے سلطان کے محافظوں سے مخاطب ہو کر کہا۔

''ان لوہے کے ٹکڑوں کو نیام کے اندر کر لو کہ میں ایک تنہا اور بے دست و پا انسان ہوں۔'' سردار نرسنگا کے لہجے میں پہاڑوں جیسا ٹھہراؤ تھا...... ''میں سلطان کو نذر پیش کر چکا' اب مجھے ہندوستان کے حکمران کی بخشش و عطا کا انتظار ہے۔'' یہ کہہ کر نرسنگا دوبارہ مڑا اور غیاث الدین بلبن سے کہنے لگا۔

''سلطان! میں بنارس کا سادھو نہیں' جنگلی لٹیروں کا سردار نرسنگا ہوں۔''

اس انکشاف نے دربار میں ہلچل سی مچا دی۔

بلبن نے قہر آلود نظروں سے نرسنگا کی طرف دیکھا اور اپنی زرنگار کرسی پر بیٹھ گیا۔

''اور یہ پاپی جس کا کٹا ہوا سر تیرے قدموں میں پڑا ہے' ٹھاکر کرشن راؤ ہے' مجھے لوگوں نے بتایا ہے کہ اس منافق نے اپنے باپ دادا کا مذہب بدل ڈالا تھا۔'' نرسنگا نے ٹھاکر کے سر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا...... ''دیوتا اپنے غدار کو معاف کر سکتے ہیں مگر نرسنگا کے مذہب میں ایسے لوگوں کیلئے کوئی معافی نہیں' جب میرے بچنے کی کوئی امید نہیں رہی تھی' اس وقت میں نے مسلمانوں کے خدا سے دعا مانگی تھی کہ وہ مجھے چند دنوں کی مہلت دے دے' پھر اس نے میری دعا سن لی اور میں نے اپنے [illegible] جس کی مثالیں رہتی دنیا تک پیش

کی جائیں گی' سلطان! میں تیرے خدا کا شکر گزار ہوں کہ اس نے ایک لٹیرے کی آبرو رکھ لی۔"

سلطان غیاث الدین بلبن نرسنگا کو اپنے سامنے پا کر اس قدر غضبناک ہو گیا تھا کہ اس کے چہرے سے شرارے پھوٹ رہے تھے۔ فرمانروائے ہند نے کسی تامل کے بغیر حکم صادر کر دیا کہ جنگلی لٹیروں کے سردار کو قتل کر کے اس کی لاش لوگوں کی عبرت کیلئے چوراہے پر لٹکا دی جائے۔

اپنی موت کا فیصلہ سن کر نرسنگا مسکرایا اور بلبن کو مخاطب کر کے کہنے لگا...... "سلطان! اب مجھے اپنی زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں' جنگل سے فرار ہو جانے کے بعد اس داغ داغ سینے میں بس دو ارمان رہ گئے تھے' ایک یہ کہ ٹھاکر کرشن راؤ کو اس کی غداریوں کی سزا دے دوں اور اس کے بعد چند لمحوں کیلئے شجاع الدین کامران کو دیکھ لوں' مگر بنارس سے دہلی آنے کے بعد معلوم ہوا کہ تو نے اس نوجوان کو بھی دار پر کھینچ دیا' یہ خبر سن کر میرے سینے میں ایک اور شگاف پڑ گیا۔ ہائے! تو نے کیسے سچے مسلمان کو مار ڈالا...... وہ مسلمان جسے دیکھ کر مجھ جیسے بت پرست قزاق کو بھی خدا یاد آ جاتا تھا۔ سلطان! یہ کیسا انصاف ہے کہ تیرا دربار منافقوں سے بھرا ہوا ہے اور سچ بولنے والے اپنے خون میں نہا نہا کر زمین کی خوراک بنتے جا رہے ہیں۔"

اس سے پہلے کہ سلطان غیاث الدین بلبن اپنے قہر و غضب کا مظاہرہ کرتا...... "سردار نرسنگا سپاہیوں سے مخاطب ہوا...... "مجھے مقتل کی طرف لے چلو۔"

پھر جاتے جاتے وہ اچانک پلٹا...... "سلطان! غداروں کو کبھی معاف نہ کرنا' اگر چند لمحوں کی تاخیر بھی ہو گئی تو مجھ سے زیادہ برا حشر ہو گا' ایک لٹیرے کی طرف سے ایک حکمران کو یہی نذر ہے اور یہی خراج ہے۔"

غیاث الدین بلبن شدید غصے کے باوجود حیرت سے نرسنگا کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

پھر جب بدنام زمانہ لٹیرے کو قتل کرنے کیلئے اس کے دست و پا باندھے گئے تو جلادوں نے سنا' نرسنگا آسمان کی طرف منہ کر کے بار بار کہہ رہا تھا۔

"اے شجاع الدین کامران کے خدا! میں تجھے نہیں جانتا مگر تو سچا ہے' آج میں اپنے دیوتاؤں سے انکار کرتا ہوں' تو مجھے معاف کر دے۔"

ٹھاکر کرشن راؤ کے قتل اور نرسنگا کی موت سے دہلی کے باشندوں پر دہشت سی طاری ہو گئی تھی...... مگر غیاث الدین بلبن کے اطمینان میں اضافہ ہو گیا تھا کہ اس نے شجاع الدین کامران کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا تھا۔ نرسنگا کے حوالے سے یہ بات ثابت ہو گئی تھی کہ سعدیہ خانم کے بیٹے کا تعلق ملک دشمن گروہ سے تھا۔

اور سعدیہ خانم اسی طرح نصف شب کے سناٹے میں قلعے کی فصیل کے نیچے گریہ وزاری کر رہی تھی۔

"اے عربوں کے خدا...... اے ترکوں کے خدا...... اے ایرانیوں کے خدا...... مجھ بت پرست کے ساتھ بھی انصاف کر۔"

✱✱✱

نرسنگا کی موت سے قائم خان کو ناقابل بیان خوشی کا احساس ہوا تھا۔

ایک دن اس نے امیر طغرل کے سامنے اپنی دلی کیفیت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''امیر! میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ نرسنگا جیسا خوفناک انسان مارا گیا۔''

''یہ عبرتناک موت تو اس کا مقدر تھی۔'' امیر طغرل کا لہجہ کبر و غرور میں ڈوبا ہوا تھا۔ ''سلطان اور ان کے وفاداروں کی قابل مندی کے سامنے ایک لٹیرے کی حیثیت ہی کیا۔ اگر نرسنگا کسی ملک کا حکمران بھی ہوتا تو ایسی ہی شکست اس کی قسمت میں تحریر کی جاتی۔ آج اس زمین پر ہمارے فیصلوں کو جھٹلانے والا کوئی نہیں۔'' اقتدار کے نشے میں امیر طغرل کی آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں اور چہرے سے ایسی درشتی جھلک رہی تھی جیسے وہ ہندوستان میں غیاث الدین بلبن کے سوا کسی کو انسان ہی نہ سمجھتا ہو۔

''میرے کہنے کا مقصد کچھ اور ہے امیر!'' قائم خان کا لہجہ بجھا بجھا تھا۔ ''اب یہ راز کھلا کہ میری حویلی پر حملہ آور ہونے والے وہ سینکڑوں سادھو کون تھے؟ یقیناً ان کا تعلق نرسنگا کے گروہ سے تھا اور شجاع الدین کامران نے ان ہی قزاقوں کے درمیان تربیت پائی تھی۔ بہرحال خدا نے اس مصیبت کو میرے سر سے ٹال دیا' میں امیر کا بے حد شکر گزار ہوں۔''

طغرل نے اپنی گردن کو کج کرتے ہوئے قائم خان کی طرف دیکھا' اس کی آنکھوں میں ایک سوال نمایاں تھا۔

''میرا مطلب ہے کہ اگر امیر بروقت مداخلت نہ کرتے تو شجاع الدین کامران قید سے رہا ہو کر جنگلوں کی طرف نکل جاتا اور پھر اس بھیڑیے سے مل کر اپنی ساری روداد سنا دیتا۔ نرسنگا نے کرشن راؤ کی طرف سے اپنے دل میں گرہ باندھ لی تھی اور پھر یہ گرہ اس وقت کھلی جب ٹھاکر کرشن راؤ کا سر اس کے شانوں سے جدا ہو گیا۔ میں اس لئے اپنے امیر کا شکر ادا کر رہا ہوں کہ سخت انتظامات اور بروقت کارروائی کے سبب شجاع الدین کامران کو اتنا موقع ہی نہیں مل سکا کہ وہ نرسنگا کے سامنے میرا نام لیتا اور پھر جنگلی لٹیروں کا سردار میرے ساتھ بھی وہی سلوک کرنے کی کوشش کرتا جس کا مظاہرہ اس نے سلطان کے دربار میں کیا۔'' ٹھاکر کرشن راؤ کی موت کا منظر یاد کر کے قائم خان لرز گیا تھا اور خوف و دہشت کے باعث اس کے ماتھے سے پسینہ پھوٹ رہا تھا۔

امیر طغرل نے اپنے سسر کی باتیں سن کر ایک بلند قہقہہ لگایا...... ''قائم خان! میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تو اس قدر بزدل ثابت ہوگا۔ جو واقعہ ابھی رونما نہیں ہوا اس کے تصور سے لرز جانا شرمناک کم ہمتی کی دلیل ہے۔ نرسنگا کیا اور اس کی حقیقت کیا؟ کرشن راؤ ایک ڈری سہمی بھیڑ کی مانند تھا' اچانک ایک بھیڑیا دبے پاؤں اس کے ٹھکانے پر آیا اور بھیڑ کو اٹھا کر لے گیا۔ اس قسم کے جانور ایسے ہی ٹھکانوں کی طرف رخ کرتے ہیں۔ آخر اس نے مجھ جیسے شیر کے غار کی جانب آنکھ اٹھا کر کیوں نہیں دیکھا۔ جو شخص ایک سادھو کے بھیس میں کئی سال سے آزادانہ گھوم رہا ہو اور جس کی

نظروں میں کرشن راؤ کی ایک ایک حرکت محفوظ ہو اور جو ایک طویل منصوبہ بندی کے بعد ٹھا کر کو اپنی مرضی کے مطابق قتل کرتا ہو یقیناً وہ اس راز سے بھی باخبر ہو گا کہ امیر طغرل نے اپنی طاقت کے ذریعے شجاع الدین کامران کو منزل دار تک پہنچایا ہے' پھر اس نے امیر طغرل کے عظیم الشان محل کی طرف آنکھ اٹھا کر کیوں نہیں دیکھا؟ میری عقل کہتی ہے کہ نرسنگا نے ایسا کیا ہو گا' مگر وہی بات کہ جب ایک بھیڑیا کسی شیر کی طرف دیکھتا ہے تو اس کی پلکیں جھپک جاتی ہیں یا آنکھوں کی روشنی زائل ہو جاتی ہے۔'' امیر طغرل اقتدار کے نشے میں ڈوب چکا تھا اور ہر وقت ہر محفل میں غرور و تکبر کا مظاہرہ کرتا رہتا تھا۔

قائم خان کچھ دیر سر جھکائے بیٹھا رہا اور پھر چپ چاپ اٹھ کر چلا گیا۔

نرسنگا کی موت سے جہاں قائم خان کو ایک نامعلوم خوف و دہشت سے نجات مل گئی تھی' وہاں امیر طغرل کو بہت بڑا سیاسی فائدہ بھی حاصل ہوا تھا۔ یہ محض قسمت کی بات تھی۔ طغرل نے شجاع الدین کامران کو کسی ثبوت کے بغیر ملک دشمن سرگرمیوں میں ملوث کرنے کی کوشش کی تھی تاکہ سلطان غیاث الدین بلبن کی عدالت میں اسے بدترین سزا دی جائے۔ طغرل اپنے اس منصوبے میں کامیاب بھی ہو گیا مگر جب نرسنگا نے شجاع الدین کامران سے اپنے تعلق کا ذکر کیا تو بلبن نے شاہی فیصلے کو برحق سمجھا اور اس کے ساتھ ہی اپنے غلام کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

''طغرل! میں تجھ سے بہت خوش ہوں۔''

آقا کی زبان سے یہ تعریفی کلمات سن کر غلام یہاں تک جھکا کہ اس کا سر بلبن کے پیروں کو چھونے لگا۔

''تو ہر وقت جاگتا رہتا ہے۔'' بلبن نے اپنی خوشی کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''میں ان ہی لوگوں کو پسند کرتا ہوں جن کی آنکھیں کھلی رہتی ہیں تو نے میری مملکت کے دشمنوں کو بے نقاب کیا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے انجام کو پہنچ گئے۔ ہمارے نزدیک تو بڑے انعام کا مستحق ہے۔''

یہ کہہ کر سلطان غیاث الدین بلبن نے طغرل پر اپنے انعام و اکرام کی بارش کر دی۔

شاہی حکم کے مطابق طغرل کو لکھنوتی (بنگال) کا حاکم بنا دیا گیا۔

طغرل نے اپنے آقا کو ایک اور سجدہ کیا' کل تک وہ محض بلبن کے غلام کی حیثیت رکھتا تھا۔ اگرچہ اس کی گردن سے طوق غلامی نہیں اترا تھا' لیکن آج وہ حاکموں کی صف میں شامل ہو کر سلطنت کا ایک مضبوط ستون بن گیا تھا۔

اسی رات امیر طغرل کی حویلی میں ایک جشن خاص منایا گیا' شہر کے تمام امیروں اور مقتدر لوگوں نے طغرل کو بیشمار تحائف پیش کیے۔ قائم خان نے بھی اسے قیمتی ہیروں سے مرصع ہار پہنایا تھا۔ قائم خان کو اپنے خوابوں کی تعبیر سامنے نظر آنے لگی تھی۔

امیر طغرل کی اوباشیوں کے باوجود یاسمین خانم بھی بہت خوش نظر آ رہی تھی' اس نے تصورات کی دنیا میں اپنے آپ کو تخت زرنگار پر بیٹھے دیکھا' پھر اس کے کانوں نے ملکہ عالیہ کی پرشور آوازیں سنیں' یہ حکومت ارض بنگال تک محدود سہی' مگر اس خواب کا ایک حصہ ضرور تھی جسے یاسمین خان کی آنکھیں بیداری کے عالم میں بھی دیکھتی رہتی تھیں۔

نصف شب کے بعد جب کیف و نشاط کے ہنگامے ختم ہوئے اور امیر طغرل تنہا رہ گیا تو یاسمین خانم ایک مخصوص ادائے دلبری کے ساتھ عشرت کدے میں داخل ہوئی اور اپنے شوہر کو اس عظیم الشان کامیابی پر دوبارہ مبارکباد پیش کی۔

طغرل شراب کے نشے سے سرشار تھا۔ اس نے یاسمین خانم کو محبت آمیز نظروں سے دیکھا اور جواباً اپنی شریک حیات کو مبارکباد دینے لگا۔

یاسمین خانم کی گمشدہ مسرتیں لوٹ آئیں۔ اس کا خیال تھا کہ امیر طغرل دوبارہ اس کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہو گیا ہے' مگر یہ صرف شراب کا اثر تھا۔

صبح خمار اترا تو امیر طغرل یاسمین خانم کے وجود سے بے نیاز نظر آنے لگا۔

چند روز بعد لکھنوتی (بنگال) کے سفر کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ یاسمین خان کا خیال تھا کہ امیر طغرل اسے بھی اپنے ہمراہ لے جانے کیلئے اصرار کرے گا۔ پہلے وہ انکار کر دے گی' مگر جب طغرل اس سے التجا کرے گا تو وہ ناز و ادا کے مظاہرے کے بعد اپنی آمادگی ظاہر کر دے گی۔ یاسمین کے خیالوں کا یہ طلسم اس وقت ٹوٹ گیا جب طغرل کی روانگی کا دن آ گیا اور اس نے اپنی بیوی سے شریک سفر ہونے کی کوئی خواہش ظاہر نہیں کی۔

مجبوراً یاسمین خانم کو خوشامدانہ لہجے میں کہنا پڑا۔ ''امیر! آپ نے یہ نہیں سوچا کہ میں یہاں تنہا رہ کر کیا کروں گی؟''

''مجھے تمہاری تنہائی کا بہت خیال ہے' مگر بنگال کی آب و ہوا تمہیں راس نہیں آئے گی۔'' طغرل نے فریب و عیاری سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''میں نہیں چاہتا کہ وہاں کی رطوبات سے بھری ہوئی ہوائیں تمہارے زلف و رخسار کو میلا کر دیں۔'' طغرل بڑے عجیب انداز میں یاسمین خانم سے جھوٹ بول رہا تھا۔ ''ویسے بھی لکھنوتی کی سیاسی فضا میرے لئے ناقابل فہم ہے' جب حالات پر مکمل قابو پالوں گا تو پھر تمہاری قربت کا احساس کر سکوں گا۔ ابھی تو یوں سمجھ لو کہ میں محاذ جنگ پر جا رہا ہوں۔''

پھر امیر طغرل رقاصہ مالنی کو اپنے ہمراہ لے کر بنگال چلا گیا۔ یاسمین خانم کو یک بیک اپنا مستقبل تاریک نظر آنے لگا تھا' پھر بھی قائم خان اور زرتاج خانم اسے تسلیاں دے رہے تھے۔

❋❋❋

طغرل فطرتاً بہادر بھی تھا اور چالاک بھی۔ پہلے اس نے مقامی صورتحال کا جائزہ لیا اور پھر انعام و اکرام کے ذریعے بااثر لوگوں کو اپنا ہمنوا بنا لیا۔ سیاسی فضا ہموار کرنے کے بعد طغرل نے جاج نگر پر حملہ کر دیا' یہاں کے راجہ کو شکست فاش ہوئی اور بیشمار مال غنیمت طغرل کے ہاتھ آیا۔

سلطان غیاث الدین بلبن اس خبر سے بہت خوش ہوا اور جاج نگر سے حاصل کی ہوئی دولت میں سے اپنے حصے کا انتظار کرنے لگا۔ دن گزرتے گئے' مگر طغرل نے اس سلسلے میں کوئی عملی مظاہرہ نہیں کیا۔ غیاث الدین بلبن اپنے غلام کی اس خاموشی پر حیران تھا' وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ طغرل کے ذہن میں اقتدار اعلیٰ کے خلاف سازش کا کوئی منصوبہ پرورش پا رہا ہے۔

بلبن کے دونوں بیٹے بغرا خان اور شہزادہ سلطان محمد مغلوں سے معرکہ آرائی میں الجھے ہوئے تھے اور سلطان بہت زیادہ بوڑھا ہو چکا تھا۔ اسی دوران بلبن پر شدید بیماری کا حملہ ہوا۔ فرمانروائے ہند کی جان تو بچ گئی مگر بلبن ایک مہینے تک بستر سے نہیں اٹھ سکا۔ دربار شاہی سے اس طرح مسلسل غائب رہنے کے سبب حکومت کے بدخواہوں نے یہ افواہ اڑا دی کہ سلطان غیاث الدین بلبن کا انتقال ہو گیا ہے اور درباری امراء کسی خاص مصلحت کے تحت اس راز کو چھپا رہے ہیں۔

ایک بار جب کسی شخص کی زبان لڑکھڑائی تو پھر لوگ غلط فہمیوں کا شکار ہوتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ امیر طغرل کے کانوں تک بھی یہ خبر پہنچی کہ اس کا آقا دنیا سے رخصت ہو چکا ہے۔ حق نمک تو یہ تھا کہ طغرل سارے کاموں کو چھوڑ کر اپنے آقا زادوں سے تعزیت کرنے اور ان کی دلجوئی کی خاطر بلا تاخیر لکھنوتی سے دہلی پہنچتا' مگر وہ خلوص و

وفاداری کے ہر جذبے سے بے نیاز ہو کر اپنی فوج میں نئے سپاہی بھرتی کرنے لگا۔
جاج نگر کی فتح نے طغرل کے خزانے کو منہ تک بھر دیا تھا' وہ اس دولت کو نئی فوج کی تشکیل پر خرچ کرنے لگا' پھر اس نے چند ماہ کے مختصر سے عرصے میں ایک بڑا لشکر تیار کر لیا۔
سلطان غیاث الدین بلبن بیماری کی حالت میں بھی طغرل کے متعلق پوچھ رہا تھا۔
''کیا اس نے مال غنیمت میں سے مرکز کا حصہ بھیجا؟'' وزراء نفی میں جواب دیتے۔
بلبن دوسرا سوال کرتا۔ ''کیا اس نے کسی قاصد کے ذریعے کوئی پیغام ارسال کیا؟''
وزراء خاموشی سے سر جھکا لیتے۔
''اور وہ اپنے شاہ کی عیادت کیلئے بھی نہیں آیا۔'' بلبن کے لہجے سے شدید مایوسی کا اظہار ہوتا تھا۔
وزراء اس سوال کا کیا جواب دیتے؟
پھر بلبن خود ہی کہنے لگتا۔ ''یہ اقتدار بڑی ہلاکت خیز شے ہے۔ تمام رشتوں کو قتل کر دیتا ہے' کسی کو کسی کی خبر ہی نہیں رہتی۔''

***

آخر وہ دن بھی آ گیا جب سلطان غیاث الدین بلبن کو دوسری زندگی حاصل ہوئی۔ دہلی کے باشندے بڑی گرمجوشی کے ساتھ اپنے سلطان کا جشن صحت منا رہے تھے کہ بلبن کے جاسوسوں نے اپنے فرمانروا کو بڑی ہولناک خبر سنائی۔
شاہی مخبروں نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ''امیر طغرل نے لکھنوتی پر آزاد حکومت قائم کر لی ہے' اب اس کا مرکز سے کوئی تعلق نہیں رہا' وہ امور مملکت میں مکمل طور پر بااختیار ہو چکا ہے۔ اس نے اپنا نام بھی بدل ڈالا ہے اور اب وہ ''سلطان مغیث الدین'' کہلاتا ہے۔''
سلطان غیاث الدین بلبن نے بڑے کرب کے ساتھ یہ ناپسندیدہ خبر سنی۔ ایک صوبے کا اچانک مرکز سے اس طرح کٹ جانا کوئی اچھی علامت نہیں تھی' مگر بلبن نے بھی حوصلہ مندی اور جرأت کے ساتھ اس صورتحال کا سامنا کیا۔ سلطان کی جگہ کوئی دوسرا حکمران ہوتا تو جلد بازی میں عجیب عجیب احکام صادر کرتا' لیکن بلبن خاموشی سے مزید خبروں کا انتظار کرنے لگا۔
پھر ایک دن سلطان نے بڑی ناگوار خبر سنی۔
''امیر طغرل کے سر پر سرخ رنگ کا چتر (چھتری نما ایک مختصر سا شامیانہ) سایہ فگن رہتا ہے۔'' یہ وہ اعزاز تھا جو صرف ولی عہد سلطنت کو حاصل ہوتا تھا یا پھر بادشاہ اپنے کسی معتمد وزیر کے کسی عظیم کارنامے سے متاثر ہو کر ''چتر سرخ'' سایہ فگن کرنے کی اجازت دے دیتا تھا۔ سلطان کی اجازت کے بغیر حکومت کا یہ مخصوص نشان استعمال کرنا اس بات کا کھلا ہوا اعلان تھا کہ اس علاقے کا حاکم خود مختار ہو چکا ہے اور وہ مرکز کے کسی حکم کا پابند نہیں۔
بلبن کو یقین آ گیا کہ امیر طغرل نے بھی نمک حرامی کی انتہا کر دی ہے اور اپنی گردن سے آقا کا طوق غلامی اتار پھینکا ہے۔
وزراء نے سلطان کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے بڑے تندوتیز لہجے میں کہا۔
''طغرل کی حیثیت آپ کے پاؤں کے جوتے سے زیادہ نہیں تھی' مگر وہ اپنی حدود سے نکل گیا' اگر فوری طور پر اس بغاوت کا تدارک نہیں کیا گیا تو ملکی سالمیت خطرے میں پڑ جائے گی۔ جن حاکموں کے دلوں میں ٹیڑھ ہے اور

دماغوں میں حکمرانی کا سودا سمایا ہوا ہے' وہ طغرل کے اس فعل کو حجت بنا لیں گے اور پھر ملک کے گوشے گوشے میں بغاوتیں پھوٹ پڑیں گی۔"

سلطان غیاث الدین بلبن نے انتہائی درشت لہجے میں اپنے وزراء کو ڈانٹ دیا۔

"شاید اس نمک حرام نے میری طویل بیماری سے یہ سمجھ لیا تھا کہ جنگل کا شیر مر چکا ہے۔" بلبن کے چہرے پر نفرت وغضب کی آگ روشن تھی۔ "اس ملک کا رہنے والا ایک ایک باشندہ اچھی طرح سمجھ لے کہ ابھی ترکوں کا یہ شیر اتنا بوڑھا نہیں ہوا ہے کہ مکار لومڑیاں' فریب کار گیدڑ اور حیلہ باز ریچھ اس کے گرد رقص کرتے رہیں اور جنگل کا شہنشاہ انہیں ان کی گستاخیوں کی سزا نہ دے سکے۔" بلبن نے یہ بات پورے زور وشور سے اس لئے کہی تھی کہ اگر کسی طالع آزما کے دل میں اقتدار کی کوئی خواہش کروٹیں لے رہی ہو تو اپنے شاہ کے ماتھے پر قہر کی لکیریں دیکھ کر وہ گنہگار آرزو دم توڑ دے۔

پھر بلبن نے اپنی مکمل صحت یابی کا فرمان لکھنوتی بھیجا۔ امیر طغرل نے فرمان شاہی کو پڑھا اور ایک طرف پھینک دیا۔

"اب کاغذ کے اس ٹکڑے پر پھیلی ہوئی روشنائی کی کوئی اہمیت نہیں۔ ہماری رگوں میں دوڑتا ہوا خون اس سیاہی سے زیادہ قیمت رکھتا ہے۔ دہلی کے دربار میں بیٹھ کر سلطان کے چند خوشامدی جسے بغاوت کا نام دے رہے تھے' وہ ایک روشن انقلاب ہے۔ امیر طغرل باغی نہیں' اس خطے کا حکمران ہے۔ یہ میرا پیدائشی حق تھا جسے میں نے بزور شمشیر حاصل کر لیا۔"

طغرل کے بے ضمیر' کاسہ لیس اور عاقبت نااندیش درباری اسے مسلسل ورغلا رہے تھے کہ وہ اس سنہری موقع کو ضائع نہ کرے' فتح مندی اور کامرانی کے یہ لمحے تو کسی کسی شخص کی زندگی میں کبھی کبھی آتے ہیں۔

امیر طغرل خوشامد اور چاپلوسی کے یہ مہلک ترانے سن کر سو گیا۔

سلطان غیاث الدین بلبن کو قوی امید تھی کہ فرمان شاہی دیکھ کر طغرل اپنی اس مذموم حرکت پر نادم ہو جائے گا' مگر جب اس نے سنا کہ وہ نمک حرام غلام مزید سرکشی پر آمادہ ہو گیا ہے تو بلبن کی قوت برداشت جواب دے گئی۔

بتانے والوں نے سلطان کو یہ بھی بتایا کہ امیر طغرل نے اپنے نام کا خطبہ اور سکہ بھی جاری کر دیا ہے۔

"ایسے نافرمانوں کے مقدمے کا فیصلہ قلم سے نہیں شمشیر سے ہوتا ہے۔" بلبن کی بارعب آواز گونجی اور اہل دربار نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ دیوار پر کیا لکھا ہے؟

***

چند روز بعد ہی سلطان غیاث الدین بلبن نے ملک ایلتگین کو لکھنوتی کا صوبیدار مقرر کیا۔ یہ شخص ایک تجربہ کار سپاہی تھا اور عرف عام میں امین خان کے نام سے مشہور تھا۔

بلبن نے امین خان کیلئے ایک زبردست لشکر کا انتظام کیا اور اپنے نامور امراء ملک تاج الدین اور جمال الدین قندھاری کو بھی اس کے ہمراہ کر دیا۔

بلبن نے اپنی فوج کو دہلی سے رخصت کرتے وقت ایک مختصر سی تقریر کی۔

"امین خان! تو ایک باغی کا سر کاٹنے کیلئے جا رہا ہے' میں یہ نہیں کہتا کہ تیرے حملے سے لکھنوتی کی سیاسی تاریخ بدل جائے گی' مگر تجھے یہ حکم ضرور دیتا ہوں کہ آخری سانس تک نمک حرام طغرل کا مقابلہ کرنا۔ اگر خدانخواستہ تیری فوجوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑے تو میدان جنگ میں پشت نہ دکھانا' مجھے یہ سن کر خوشی ہوگی کہ تو اپنے سلطان کے حکم

کی تعمیل میں لڑتا ہوا مارا گیا اور اتنے زخم تیرے سینے پر آئے۔"
بڑی پر جوش تقریر تھی۔ امین خان صوبیدار ملک تاج الدین اور جمال الدین قندھاری کے ساتھ ایک ایک سپاہی کے جسم میں آگ کا دریا موجزن ہو گیا اور چہرہ گرمئ جذبات سے انگاروں کی طرح دہکنے لگا۔

✽✽✽

امین خان نے "سرجو" ندی کو عبور کر کے لکھنوتی کا رخ کیا۔ امیر طغرل کو اس کی خبر ہوئی تو وہ بھی ایک لشکر جرار لے کر آگے بڑھا' امین خان کے سپاہی تعداد میں زیادہ تھے۔ اس لئے سلطان کی فوجوں کو اپنی فتح کا یقین ہو چلا تھا۔
طغرل نے میدان جنگ میں پہنچنے سے پہلے ایک اور چال چلی' اس کے کارندوں نے امین خان کے لشکر کے قریب پہنچ کر زور و شور سے اعلان کیا۔
"تم لوگوں کیلئے ہمارے آقا کا پیغام ہے کہ لوہے کی تلواروں سے زیادہ قیمتی سونے کی تلواریں ہوتی ہیں' ہوش مند وہ ہے جو فولاد کے ٹکڑوں کو زمین پر پھینک کر سونے اور چاندی کے سکے اٹھا لے۔"
یہ بڑی خوفناک ترغیب تھی' امین خان کی فوج میں ہلچل سی مچ گئی۔ امیر طغرل کے کارندے مسلسل چیخ چیخ کر اعلان کرتے رہے۔
"آؤ سونے کے ذخیروں کی طرف...... آؤ چاندی کے انبار کی طرف......"
یہ اعلان بڑا گمراہ کن تھا' امین خان کی فوج کا ایک بڑا حصہ سیم و زر کے لالچ میں امیر طغرل کے لشکر سے جا ملا۔ بظاہر شاہی افواج کی کمر ٹوٹ گئی تھی' مگر امین خان نے پھر بھی کچھ دیر تک مقابلہ کیا۔ امیر طغرل کے سپاہیوں کی تعداد بھی زیادہ تھی اور حوصلے بھی بلند تھے' اس نے مکمل منصوبہ بندی کے ساتھ اپنی فوجوں کو آگے بڑھایا۔ امین خان کے جو سپاہی وقت کی نیلام گاہ میں فروخت ہونے سے بچ گئے تھے' وہ امیر طغرل کی یلغار کا سامنا نہ کر سکے' ایک مختصر سے وقت میں امین خان کو شکست ہوئی اور وہ میدان جنگ سے فرار ہو گیا۔

✽✽✽

جب سلطانی افواج کے پسپا ہونے کی خبر دہلی پہنچی تو اہل دربار نے دیکھا کہ شدت غم سے غیاث الدین بلبن کا سرخ و سفید چہرہ کچھ دیر کیلئے سیاہ ہو گیا ہے اور وہ ایک نہایت شکستہ انسان نظر آ رہا ہے۔
پھر اہل دربار نے دوسرا منظر دیکھا' افسردہ رنجیدہ نظر آنے والا بلبن اتنی دیر میں سنبھل چکا تھا۔ امراء اور وزراء نے اس کی وہی بارعب آواز سنی' جس سے لوگوں کے دل ہل جاتے تھے' بلبن انتہائی قہرناک لہجے میں کہہ رہا تھا۔
"امین خان کو زندگی کی قید سے آزاد کر دو' میں سمجھ لوں گا کہ جہاں میرے دوسرے سپاہی فروخت ہو گئے وہاں امین خان نے بھی اپنے آپ کو بیچ دیا۔"
حکم سلطانی کے بعد شکست خوردہ امین خان کو قتل کر دیا گیا اور بلبن کے اشارے پر ملک ترتی ایک لشکر جرار لے کر امیر طغرل کی بغاوت کو کچلنے کیلئے آگے بڑھا۔
امیر طغرل کی قسمت کا ستارہ عروج پر تھا' بلبن کی احتیاطی تدابیر' جنگی اسلحے کی فراوانی اور ملک ترتی کی تمام تر منصوبہ بندیوں کے باوجود بساط الٹ گئی۔ امیر طغرل نے امین خان کی طرح ملک ترتی کو بھی شکست دی اور اس بار بھی لوٹ کے مال کا بہت بڑا ذخیرہ اس کے ہاتھ آیا۔ میدان جنگ میں امیر طغرل کی یہ دوسری مسلسل فتح تھی۔
جب ملک ترتی میدان جنگ سے فرار ہو رہا تھا' اس وقت امیر طغرل نصرت و کامرانی کے نشے سے سرشار ہو کر دیوانوں کی طرح چیخ رہا تھا۔

''اب مجھے کوئی شکست نہیں دے سکتا' اس ملک کے طول و عرض پر حکمرانی میرا مقدر ہے۔''

❊❊❊

دہلی کے دیوار و در پر سکوت مرگ طاری تھا اور دربار شاہی پر کسی مقبرے کا گمان ہو رہا تھا' اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ ملک ترتی کی شکست کا صدمہ دوبارہ بلبن کو بستر علالت پر لیٹ جانے کیلئے مجبور کر دے گا' مگر جب سلطان دربار میں داخل ہوا تو اس کی چال میں وہی تمکنت تھی اور چہرے پر وہی اطمینان جھلک رہا تھا۔

پھر جب بلبن درباریوں سے مخاطب ہوا تو انہیں اپنی سماعتوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ بلبن نے اہل دربار سے پرجلال لہجے میں کہا۔

''تم تو اس طرح سوگوار بیٹھے ہو جیسے تمہارے سامنے سلطان غیاث الدین کی لاش پڑی ہے۔ آخر ایک معمولی سی شکست پر یہ نوحہ خوانی کس لئے؟ مردان شجاع کی زندگی میں ایسے نازک لمحات بھی آجاتے ہیں' مگر یہ لمحے ہم سے ہمارے حوصلے چھیننے کی طاقت نہیں رکھتے۔ اب کی بار میں خود شاہی لشکروں کی قیادت کروں گا اور وہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھوں گا کہ ایک غلام اپنے آقا کے سامنے کس طرح نمودار ہوتا ہے؟ سر جھکائے ہوئے یا گردن کو کج کئے ہوئے؟''

بعض مقرب وزراء نے بلبن کو سمجھانے کی کوشش کی کہ ابھی سلطان کے جسم پر طویل بیماری کے مضر اثرات کا ہلکا سا عکس موجود ہے۔ اس صورت میں یہ تھکا دینے والا سفر شاہ کی صحت کیلئے کسی بڑے خطرے کی علامت بھی بن سکتا ہے' شاہی طبیبوں کا بھی یہی مشورہ تھا' مگر بلبن نے اپنے تمام نمک خواروں کی ہر التجا کو سختی سے مسترد کر دیا۔

''تم لوگ مطمئن رہو' میں اپنے خدا کے بھروسے پر یہ بات کہہ رہا ہوں کہ مجھے اس وقت تک موت نہیں آئے گی جب تک وہ غدار اور بدنسل طغرل اپنے عبرتناک انجام کو نہیں پہنچ جائے گا۔''

اس کے بعد غیاث الدین بلبن عجیب آمرانہ شان کے ساتھ طغرل کا مقابلہ کرنے کیلئے ''قصر سفید'' سے باہر نکلا۔

گرد و پیش کے علاقوں میں جہاں جہاں یہ خبر پہنچتی کہ سلطان حکومت کے ایک وزیر کو اس کے گناہوں کی سزا دینے کیلئے لکھنوتی کی طرف جا رہا ہے' وہاں مقامی لوگ خوف سے لرز کر رہ جاتے۔ برق رفتار گھوڑوں کے سم چمک رہے تھے اور ان سے پیدا ہونے والی آوازیں لوگوں پر ناقابل بیان دہشت طاری کر رہی تھیں' ہر شخص اپنی جگہ سہما ہوا تھا اور بار بار ماضی کے واقعات پر غور کر رہا تھا کہ کہیں امیر طغرل سے اس کا تو کوئی تعلق نہیں رہا۔ پھر یہی تعلق اس کی ہلاکت کا سبب بن جائے اور بلبن کا قہر و غضب اسی تعلق کو بنیاد بنا کر گھر کے گھر جلا ڈالے...... اور ایک شخص کی خاطر اس کی نسل تک کو مٹا ڈالے۔ بلبن کی نفرت کا یہی انداز تھا کہ اس کی برق ستم مجرم شاخ کے ساتھ پورے گلستاں کو پھونک ڈالتی تھی۔

راستوں سے غبار اٹھ رہا تھا اور غیاث الدین بلبن کا لشکر تیز رفتاری سے اپنے ہدف کی جانب بڑھ رہا تھا۔

سلطان نے اپنے سپہ سالاروں کو حکم دیا کہ وہ دریائے گنگا میں کشتیاں ڈال دیں' پھر خود شکار کے بہانے ''سمانہ'' اور ''سنارگاؤں'' کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے میں اس نے دیگر انتظامات کئے' مختلف امراء کو ان کی ذمہ داریاں سونپیں اور پھر پوری شان و شوکت کے ساتھ گنگا کے راستے لکھنوتی کی طرف بڑھا۔

❊❊❊

وہ برسات کا موسم تھا۔ شدید بارشوں کے سبب دریائے گنگا میں کہیں کہیں طغیانی آئی ہوئی تھی اور خشکی کے راستے ناپید ہو چکے تھے' جگہ جگہ پانی بھرا تھا یا ہلکی ہلکی کیچڑ تھی' جس کے باعث فوجوں کو آگے بڑھنے میں دشواری

پیش آرہی تھی۔ سپہ سالاروں نے سوالیہ نظروں سے اپنے سلطان کی طرف دیکھا' امور سپہ گری کے ماہرین کی نظروں میں یہ موسم جنگ کیلئے انتہائی ناسازگار تھا۔

بلبن نے اپنے جاں نثاروں کے چہروں پر لکھی ہوئی پریشانیوں کو فوراً پڑھ لیا۔

''تم اس معمولی سی طغیانی کی طرف دیکھ رہے ہو جس نے ایک حقیری ندی کے سینے میں تلاطم برپا کر رکھا ہے۔ افسوس! تم نے اپنے سلطان کے سینے کی جانب نگاہ نہیں کی جہاں نفرت و انتقام کا ایسا سیلاب آیا ہے کہ جس نے بلبن کے دل کی چٹانوں میں ہزاروں شگاف ڈال دیئے ہیں۔ مجھے بتاؤ کہ میں آسمانی بارش کی اس پھوار کو دیکھوں یا اپنے دل سے ابلتے ہوئے خون کے سمندر پر نظر ڈالوں؟'' بلبن کے لہجے میں قہر کی آمیزش کے ساتھ کچھ ایسا کرب بھی شامل تھا کہ تمام سپہ سالار لرز کر رہ گئے اور احساس ندامت سے ان کی گردنیں جھک گئیں۔

''اگرچہ گنگا کا پانی اس پر قادر نہیں ہے کہ وہ ہمیں اپنی مرضی کے مطابق بہا کر لے جائے' لیکن ہم پھر بھی اپنے جسم اس کے حوالے کر دیں گے۔ دریا کے پاس چند ڈوبتی ابھرتی موجوں کے سوا اور کیا ہے' مگر ہم ایک سلسلہ موج بلاخیز رکھتے ہیں۔ گنگا کو ہمیں راستہ دینا ہی ہوگا۔''

بوڑھے سلطان کے حوصلوں کو دیکھ کر جوانیاں شرما رہی تھیں اور غیاث الدین بلبن شجاعت و مردانگی کی طویل داستان میں ایک نئے باب کا اضافہ کر رہا تھا۔

پھر ہندوستان کا یہ جانباز فرمانروا اپنے لشکر جرار کو لے کر ناہموار راہوں پر آگے بڑھا۔

اسی دوران امیر طغرل کے جاسوسوں نے خبر دی کہ اب کی بادشاہی افواج کی قیادت سلطان خود کر رہا ہے۔ طغرل سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ بوڑھا اور بیمار بلبن ایسے ناسازگار موسم میں ''قصر سفید'' سے نکل کر لکھنوتی تک آپہنچے گا۔

''میں تمہاری ان اطلاعات کا کیا مفہوم اخذ کروں' جب تم نے کہا تھا کہ سلطان کو شدید بیماری نے تھکا ڈالا ہے اور اب وہ کسی محاذ جنگ پر معرکہ آرائی کے قابل نہیں رہا ہے۔'' طغرل نے انتہائی برہم لہجے میں اپنے جاسوسوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''خداوند عالم!'' جاسوسوں نے لرزتے جسموں کے ساتھ دست بستہ عرض کیا۔ ''ہمیں خود بھی حیرت ہے کہ وہ بوڑھا شیر اپنی کچھار سے باہر کس طرح نکل آیا؟'' امیر طغرل کے مصاحب اسے ''خداوند عالم'' کے لقب سے پکارتے تھے اور وہ اس لفظ کی گونج سے اس قدر سرشار ہو جاتا تھا کہ خیالوں میں اپنے آپ کو پوری دنیا کا مالک سمجھنے لگتا تھا۔

مگر اس بار ''خداوند عالم'' کی تکرار نے امیر طغرل کے اعصاب پر کوئی خوشگوار اثر نہیں چھوڑا۔ ''اسے شیر مت کہو''...... طغرل کا لہجہ کچھ اور قہرناک ہو گیا تھا۔ ''ہماری جاں نثاریوں اور سرفروشیوں نے اسے شہنشاہ بنایا تھا' آج جب ہم نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا ہے تو اہل دنیا اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ وہ تندرست و توانا شیر ہے یا شکست کے زخموں سے چور لنگڑاتا ہوا ایک ناتواں اور حقیر چیتا؟

امیر طغرل اپنے جاسوسوں اور مشیروں کو ڈانٹ کر یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ غیاث الدین بلبن کی آمد سے اس کے اقتدار پر کوئی ضرب نہیں پڑے گی...... مگر اندر سے وہ بری طرح سہما ہوا تھا۔ طغرل کو ماضی کے وہ مناظر یاد آرہے تھے کہ جب اس کی گردن میں بلبن کا طوق غلامی موجود تھا اور وہ آقا کی خوشنودی کیلئے ایک ایک قدم پر سجدہ ریز نظر آتا تھا۔ اسی احساس غلامی نے طغرل کو ناقابل بیان خوف میں مبتلا کر دیا تھا۔

طغرل نے اپنے تاریک ماضی کو جھٹلا کر آقا کے وجود کی نفی کرنا چاہی' لیکن وہ بلبن کی شخصیت کے طلسم سے

آزاد نہیں ہو سکا۔ اگر طغرل کو ذرا بھی یقین ہو جاتا کہ ملک ترقی اور امیر خان کی طرح بلبن بھی شکست سے دوچار ہو گا تو وہ بے لباس ہو کر اپنے آقا کے مقابلے پر اتر آتا...... لیکن طغرل اچھی طرح جانتا تھا کہ بلبن کس شان کا سپاہی ہے اور وقت نے کیسی کیسی عظیم الشان فتوحات کے تمغے اس کے جسم پر سجائے ہیں؟ اسی خیال نے طغرل کو مجبور کیا کہ وہ معرکہ آرائی سے گریز اختیار کرے۔

پھر طغرل کے فوجیوں نے یہ عجیب و غریب حکم سنا۔

''تمام سپاہی اپنا سامان سفر باندھیں اور لکھنوتی سے جاج نگر کی طرف کوچ کریں۔''

کہاں سلطان سے مقابلے کیلئے پرجوش تقریریں اور بلند و بانگ دعوے...... اور کہاں یہ فرار؟ سپاہیوں کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا' مگر وہ طغرل کے حکم کے بندے تھے۔ چاروناچار جاج نگر کی طرف بڑھنے لگے۔

کچھ معتمد سپہ سالاروں نے اپنے فرمانروا طغرل سے اس حکمت عملی کی وجہ دریافت کی تو وہ انتہائی رازدارانہ لہجے میں کہنے لگا۔

''میں اپنے پسندیدہ محاذ پر بلبن کا مقابلہ کروں گا۔'' طغرل نے شاطرانہ لہجے میں کہا۔ ''میں لکھنوتی کی حدود سے نکل کر اسے حیران کر دینا چاہتا ہوں۔''

اس کے ساتھ ہی طغرل اپنا تمام خزانہ ساتھ لے کر جاج نگر کی طرف روانہ ہو گیا۔

بلبن کو اپنے منصوبے میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ شدید بارشوں اور ناہموار راستوں نے کئی مقامات پر سلطانی افواج کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ ایسے مواقع پر بلبن جھنجلاہٹ کا شکار ہو کر اپنے سپہ سالاروں سے کہنے لگتا۔

''شاید قدرت بھی طغرل کی مدد کر رہی ہے' اگر اسی طرح تاخیر ہوتی رہی تو وہ نمک حرام کسی محفوظ مقام پر بآسانی منتقل ہو سکتا ہے۔ مگر وہ میری شمشیر کی زد سے کب تک بچے گا؟ یہ شمشیر اسی لئے ڈھالی گئی ہے کہ غداروں کا خون پیتی رہے اور اس کی آب و تاب ہمیشہ برقرار رہے۔''

بلبن کے سپہ سالار جواب دینے کا حوصلہ نہیں رکھتے تھے' مگر انہیں اپنے تجربات کی روشنی میں یہ اندازہ ضرور تھا کہ سلطان نے طغرل کی سرکوبی کیلئے غلط وقت کا انتخاب کیا ہے...... اور یہ موسم کی ناسازگاری ہی کا نتیجہ تھا کہ بلبن کو لکھنوتی پہنچنے میں دیر ہو گئی اور طغرل اپنے خزانے کے ساتھ جاج نگر کی طرف نکل گیا۔

❊❊❊

دراصل طغرل کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ جاج نگر پر قبضہ کر کے کچھ دنوں وہاں قیام کرے گا اور جب سلطان غیاث الدین بلبن موسم کی سختیوں سے بیزار ہو کر دہلی واپس چلا جائے گا تو وہ دوبارہ لکھنوتی پر لشکر کشی کر کے اس علاقے کو اپنا مطیع و فرمانبردار بنائے گا۔

بلبن کو طغرل کے اس فرار پر شدید مایوسی ہوئی' مگر وہ فوراً ہی ناامیدیوں کے گرداب سے نکل آیا۔ سلطان نے اپنے دو معتمد سالاروں حسام الدین اور باربیگ برلاس کو لکھنوتی کا نگران مقرر کیا اور خود طغرل کے تعاقب میں جاج نگر کی طرف بڑھا۔

جب بلبن سنار گاؤں کی سرحد پر پہنچا تو وہاں کے راجہ نے سلطان کی خدمت میں حاضر ہو کر فرمانروائے ہند کو اپنی نمک خواری کا یقین دلاتے ہوئے کہا۔

''اگر طغرل کو جنگ میں شکست ہوئی اور اس نے دریا کے راستے فرار ہونے کی کوشش کی تو وہ حکومت کے غدار

بلبن راجہ کی بات سن کر بہت خوش ہوا۔ اس طرح طغرل کے گرد سلطانی افواج کا دائرہ مزید تنگ ہو جاتا اور اس کے بھاگنے کے امکانات بڑی حد تک ختم ہو جاتے۔

سنار گاؤں کا بندوبست کر کے بلبن نے تین چار منزلیں طے کیں' اچانک اسے یہ حیران کن خبر ملی کہ طغرل کہیں روپوش ہو گیا ہے۔ بلبن اسی مقام پر ٹھہر گیا اور اس نے اپنے سپہ سالار بار بیگ برلاس کو طلب کر کے نیا حکم دیا۔

''اس مکار چوہے کو تلاش کرو جو کسی سوراخ میں چھپ گیا ہے۔''

بار بیگ برلاس سات ہزار سپاہی لے کر آگے بڑھا' اس نے دس دس بارہ بارہ کوس تک ایک ایک چپہ چھان مارا' مگر طغرل یا اس کے لشکر کا کہیں نام ونشان نہیں تھا۔

برلاس بہت زیادہ پریشان نظر آ رہا تھا' مگر اس کا سفر جاری رہا۔

ایک دن کول کا حاکم ملک محمد تیر انداز اور اس کا بھائی ملک مقدر چالیس پچاس سپاہیوں کے ساتھ لشکر کے آگے آگے جا رہے تھے۔ طغرل کی تلاش کے سلسلے میں سلطان کا ہر سپاہی مضطرب بھی تھا اور پر جوش بھی۔ ملک محمد اور ملک مقدر اسی جذبے کے تحت لشکر سے بہت دور نکل گئے تھے اچانک انہیں راستے میں چند بنئے نظر آئے۔ ملک محمد کو اجنبیوں پر شک گزرا اور اس نے اپنے سپاہیوں کے ذریعے بنیوں کو گھیرے میں لے کر گرفتار کر لیا۔

''ہمیں کس جرم میں پکڑا گیا ہے؟'' ایک بنئے نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم تو اناج اور دالوں کے تاجر ہیں۔''

ملک محمد نے غور سے بنیوں کے چہروں کا جائزہ لیا' وہ بہت مطمئن نظر آ رہے تھے۔

''ہم تم سے کچھ نہیں چاہتے۔'' ملک محمد نے بنیوں کو متاثر کرنے کیلئے تند و تیز لہجے میں کہا۔ ''تمہارے جان و مال محفوظ رہیں گے' مگر اس شرط پر کہ تم ہمیں طغرل کا پتا بتا دو۔''

''ہمارا طغرل سے کیا تعلق ہے؟ وہ لکھنوتی کا حکمران اور ہم غریب سوداگر۔'' دوسرے بنئے نے بے پروائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

ملک محمد کے ہونٹوں سے آگ برسنے لگی۔ ''میں آخری بار کہہ رہا ہوں کہ اگر تم لوگوں نے جھوٹ بولنا نہیں چھوڑا تو اپنے گھروں کو زندہ نہیں پہنچ سکو گے' اسی ویرانے میں تمہاری چتائیں جلا دی جائیں گی۔''

تمام بنیوں نے بیک زبان کہا کہ طغرل سے ان کی کوئی شناسائی نہیں' وہ تو قرب و جوار کے علاقے میں غلہ فروخت کر کے آ رہے ہیں۔

ملک محمد کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ براہ راست تشدد پر اتر آئے اور اناج کے سوداگروں کو زبان کھولنے کیلئے مجبور کر دے۔

''اسے زندگی کی قید سے آزاد کر دو۔'' ملک محمد نے ایک بنئے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

دوسرے ہی لمحے غلے کا تاجر اپنے خون میں نہا گیا اور اس کی گردن کٹ کر دور جا گری۔

تمام بنیوں نے آگے بڑھ کر ملک محمد کے پیروں پر اپنے سر رکھ دیئے۔ ''تمہیں جس قدر مال و متاع درکار ہے خوشی سے لے لو' مگر ہمیں اپنے گھروں کو جانے دو۔''

''اب کی بار میں انکار نہیں سنوں گا' مجھے طغرل کا سراغ چاہیئے۔'' ملک محمد کے لہجے میں اتنی سفاکی تھی کہ بنئے اپنی زندگی سے مایوس ہو گئے۔

''تمہارے اور طغرل کے درمیان ایک کوس کا فاصلہ ہے' ہم اسی کو غلہ دے کر آرہے ہیں' اگر تم نے آج ہی طغرل کا پیچھا کیا تو اس تک پہنچ جاؤ گے ورنہ وہ جاج نگر چلا جائے گا۔''

ملک محمد نے لمحوں میں فیصلہ کیا اور تمام بنیوں کو اپنے دو سپاہیوں کے ساتھ پیغام دے کر ملک برلاس کے پاس بھیج دیا۔

''اگر آپ نے تاخیر سے کام لیا تو اس غدار کے بھاگ جانے کا قوی امکان ہے۔''

سپاہیوں کے جاتے ہی ملک محمد ایک اونچے ٹیلے پر چڑھ گیا اور اطراف کا جائزہ لینے لگا۔ بہت دور اسے ایک خیمہ نظر آیا' ملک محمد نے سوچا کہ اگر سپہ سالار برلاس بروقت کوئی فیصلہ نہ کر سکا تو جاج نگر کے جنگلات طغرل کو پناہ دے دیں گے اور پھر اسے تلاش کرنا تقریباً ناممکن ہو جائے گا۔ اس خیال کے آتے ہی ملک محمد نے برلاس کے حکم کا انتظار نہیں کیا اور تیز رفتاری سے اس طرف بڑھا' جہاں طغرل کا خیمہ تھا۔

❋❋❋

ملک محمد بہت احتیاط کے ساتھ اپنے سپاہیوں کو لے کر آگے بڑھ رہا تھا۔ جب فاصلہ کچھ کم ہوا تو ملک محمد نے دیکھا کہ طغرل کا خیمہ لشکر سے الگ تھلگ ایک چھوٹی سی ندی کے کنارے بنایا گیا ہے۔

''تلواروں پر اپنی گرفت مضبوط رکھو۔'' ملک محمد نے سپاہیوں کو حکم دیتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں اس قدر مستعد حالت میں رہنا ہے کہ میری ایک آواز پر تمام شمشیریں بے نیام ہو جائیں۔''

تقریباً پچاس سپاہیوں نے بہت غور سے اپنے سالار کی طرف دیکھا' وہ دوسری ہدایات کا انتظار کر رہے تھے۔

''اپنے چہروں پر مصنوعی مسکراہٹ اور بے نیازی کا رنگ نمایاں کر لو۔'' ملک محمد نے کہا..... ''تمہیں دیکھ کر یہ گمان نہ گزرے کہ تمہارا تعلق طغرل کی دشمن فوج سے ہے۔''

سپاہیوں نے ایک بار پھر حیرت سے اپنے امیر لشکر کی طرف دیکھا۔

''تمہاری حرکات و سکنات سے یہی ظاہر ہونا چاہئے کہ تم بھی طغرل کی فوج کا ایک حصہ ہو۔'' ملک محمد نے اپنی جنگی حکمت عملی بیان کی اور سپاہیوں کو لے کر آگے بڑھا۔

ملک محمد نے دیکھا کہ طغرل کے سپاہی دور دور پھیلے ہوئے ہیں' انہوں نے اپنے ہتھیار کھول دیئے ہیں اور گھوڑے ادھر ادھر گھاس چرتے پھر رہے ہیں۔

''یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ طغرل تعاقب کے ہر خطرے سے مکمل طور پر بے نیاز ہو چکا ہے۔'' ملک محمد نے اپنے بھائی ملک مقدر سے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ''نمک حرام کو یہ اندازہ ہی نہیں کہ سلطانی لشکر اسے پانے کیلئے کتنا بے قرار ہے۔''

''مگر ہمارے یہ چند سپاہی اس پر کس طرح قابو پائیں گے؟'' ملک مقدر کا لہجہ فکر انگیز تھا۔

''تم اپنے دماغ کو پریشان نہ کرو۔'' ملک محمد نے بھائی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''میرے ذہن میں ایک خاص منصوبہ ہے' بس خدا ہماری دستگیری کرے۔ یہ مٹھی بھر سپاہی طغرل کی نام نہاد حکومت کا تختہ الٹنے کیلئے کافی ہیں۔''

ملک مقدر خاموش رہا' ابھی تک وہ اپنے بھائی کے منصوبے کو سمجھنے میں ناکام رہا تھا۔

ملک محمد نے قصداً وہ راستہ اختیار کیا جہاں طغرل کے سپاہیوں کی بہت تھوڑی تعداد موجود تھی۔ اس طرح کسی بڑے تصادم کے امکانات بہت کم تھے اور ملک محمد کا منصوبہ کامیابی سے ہمکنار ہو سکتا تھا۔

ملک محمد کچھ اور آگے بڑھا' اس نے اپنے سپاہیوں کو معمولی فاصلہ رکھتے ہوئے منتشر ہو جانے کا حکم دیا تھا۔

طغرل کے فوجیوں نے آنے والوں کو چونک کر دیکھا' مگر ملک محمد کے سپاہی بڑے اطمینان سے ٹہلنے کے انداز میں آگے بڑھ رہے تھے۔ ایک مشکل مرحلہ آسانی کے ساتھ طے ہو گیا۔

اب ملک محمد ان دشمن سپاہیوں کے قریب پہنچ گیا تھا جو طغرل کی حفاظت پر مامور کئے گئے تھے۔

طغرل کے سر پر بدبختی سایہ فگن تھی۔ اس کے محافظ سپاہی سلطان کے فوجیوں کو نہ پہچان سکے۔

اچانک ملک محمد کے حکم پر اس کے جاں نثار سپاہیوں نے تلواریں بے نیام کر لیں اور طغرل کے نگہبان دستے پر جھپٹ پڑے' یہ سب کچھ اس برق رفتاری کے ساتھ ہوا تھا کہ طغرل کے سپاہی خود اپنی حفاظت بھی نہ کر سکے۔ ملک محمد کے تجربہ کار فوجی شمشیرزنی کا ہنر دکھاتے ہوئے اس طرح حملے کر رہے تھے کہ طغرل کے سپاہی اپنے دفاع کی صلاحیت کھو چکے تھے اور بے موت مارے جا رہے تھے۔

یکایک ملک محمد نے ایک اور حربہ استعمال کیا۔ اس نے پوری طاقت سے چیختے ہوئے یہ نعرہ بلند کیا۔

''ہندوستان کی حکومت صرف سلطان غیاث الدین بلبن کا حصہ ہے۔''

ابھی اس نعرے کی گونج ختم ہونے بھی نہیں پائی تھی کہ ملک محمد نے اپنے سپاہیوں کو اشارہ کیا کہ وہ بھی اس کی آواز میں آواز ملائیں۔

پھر دفعتاً جنگل کا وہ سنسان علاقہ پرجوش نعروں سے گونجنے لگا۔

''ہند کی سلطنت صرف سلطان بلبن کا حصہ ہے۔''

تقریباً پچاس فوجیوں کی بلند آوازوں نے ویرانی اور سناٹے کا جگر چاک کر ڈالا۔

جب طغرل نے یہ شور سنا تو وہ سمجھا کہ بلبن خود اس کے سر پر آ پہنچا ہے' اس خیال نے طغرل کو بدحواس کر دیا اور وہ شدید گھبراہٹ کے عالم میں خیمے کے عقبی حصے سے باہر نکلا اور ایک گھوڑے پر بیٹھ کر فرار ہو گیا۔

❋❋❋

طغرل کا آخری وقت آ چکا تھا' اس لئے دماغ الٹ گیا اور فرار کی ہر تدبیر ناکام ہو گئی۔

اگر طغرل اپنے لشکر کی طرف چلا جاتا تو ملک محمد کے چند سپاہی اس کا تعاقب کرنے سے عاجز رہتے اور پھر بچاؤ کی کوئی صورت نکل آتی' مگر طغرل کی نمک حرامیوں کے وبال نے اسے وحشت زدہ کر دیا تھا اور یہی بدحواسی اس کیلئے موت کا پیغام بن گئی۔

طغرل اپنے لشکر کی طرف جانے کے بجائے اس چھوٹی سی ندی کی طرف بڑھا جو قریب ہی بہہ رہی تھی۔ طغرل چاہتا تھا کہ وہ جلد از جلد ندی پار کر کے جاج نگر پہنچ جائے۔ شاید وہ اپنے اس منصوبے میں کامیاب ہو جاتا' مگر ملک محمد کا بھائی ملک مقدر اپنی جان پر کھیل کر اس کے تعاقب میں روانہ ہو گیا۔

ملک محمد نے اچانک ایک اور چال چلی' اس نے چیخ چیخ کر کہنا شروع کیا۔

''تم نے جس نمک حرام کے ساتھ مل کر سلطان غیاث الدین بلبن سے غداری کی تھی وہ تمہیں تنہا چھوڑ کر بھاگ گیا ہے۔ اب اپنے آقا کو پکارو کہ وہ تمہیں شاہی قہر و غضب سے بچانے کیلئے واپس لوٹ کر آ جائے...... مگر یاد رکھو کہ وہ ادھر کا رخ بھی نہیں کرے گا۔ طغرل خودغرض بھی تھا اور بزدل بھی۔ اب تمہاری نجات کا کوئی تیسرا راستہ نہیں۔ ہتھیار پھینک کر دوبارہ سلطان کی غلامی کا طوق پہن لو یا پھر تم بھی اپنے نمک حرام آقا کی طرح فرار ہو جاؤ۔''

ملک محمد اور اس کے سپاہیوں کی تیز آوازیں دور دور تک گونج رہی تھیں۔ طغرل کے فرار کی خبر سن کر اس کے لشکر میں سخت ابتری پھیل گئی۔ کچھ فوجیوں نے سوچا کہ وہ مرکز کی طرف لوٹ جائیں اور سلطان کے سامنے گناہوں کا اعتراف کر کے رحم کی بھیک مانگیں...... مگر دوسرے سپاہیوں نے انہیں اس ارادے سے باز رکھتے ہوئے کہا۔

''جدھر بھی راہ ملے ادھر بھاگ چلو' سلطان مجرموں کو کبھی معاف نہیں کرتا۔''

پھر ملک محمد نے دیکھا کہ طغرل کے فوجی مقابلہ کرنے کے بجائے انتہائی افراتفری کے عالم میں فرار ہو رہے

ہیں۔

دوسری طرف ملک مقدر طغرل کا تعاقب کر رہا تھا۔ اس دوران کئی بار فاصلہ کم ہوا' مگر طغرل ملک مقدر کی زد پر نہیں آیا۔ یہ طغرل کی بدنصیبی تھی کہ وہ تنہا بھاگ رہا تھا' مگر مقدر نے آخری کوشش کے طور پر اپنے گھوڑے کو ایڑ دی' گھوڑا بھی اپنے مالک کی مرضی کو سمجھ چکا تھا' اس کے جسم میں بجلیاں سی بھر گئیں۔ یہاں تک کہ ایک جانور نے آقا سے وفاداری کا حق ادا کر دیا۔ ملک مقدر کا گھوڑا اس وقت طغرل کے قریب پہنچا جب وہ غدار سلطنت ندی کو عبور کرنے والا تھا۔

ملک مقدر نے اس لمحے کو غنیمت سمجھا اور گھوڑے کی پشت پر بیٹھے بیٹھے ایک زہریلا تیر طغرل کی طرف چھوڑا' ایسے ہوائی نشانے اکثر ناکامی سے دوچار ہوتے ہیں' مگر ملک مقدر کی قسمت اپنے عروج پر تھی اور طغرل بدترین گردش کا شکار تھا' وہ تیر جو برق رفتار گھوڑے کی پشت سے چھوڑا گیا تھا' طغرل کی گردن میں پیوست ہو گیا۔

طغرل نے سنبھلنے کی کوشش کی' مگر گھوڑے کی لگام اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور وہ اس طرح نیچے گرا کہ اس کا آدھا جسم ندی کے کنارے پر تھا اور آدھا پانی کے اندر۔

ملک مقدر جوش جذبات میں گھوڑے سے کود پڑا اور اس نے طغرل کو کھینچ کر پانی سے باہر نکالا' وہ درد کی شدت سے چیخ رہا تھا۔

''تم آ گئے میرے جاں نثار؟ باقی فوج کہاں ہے؟'' طغرل کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

ملک مقدر نے اس کی گردن سے تیر کھینچ لیا۔ خون کا ایک فوارہ سا ابلا اور ملک مقدر کا پیرہن رنگین ہو گیا۔

طغرل کی ایک اور دلدوز چیخ بلند ہوئی۔

''میرے اجنبی نمک خوار! میں تمہیں نہیں پہچانتا۔'' طغرل نے دھندلی آنکھوں سے ملک مقدر کی طرف دیکھا۔ ''ہمیں گھوڑے کی پشت پر ڈال کر جاج نگر لے چلو۔''

ملک مقدر نے اپنی تلوار کھینچی اور طغرل پر جھک گیا۔ ''میں تیرا کوئی بدکار مصاحب یا نمک خوار نہیں۔ ملک مقدر کا لہجہ قہر آلود تھا۔ ''میں سلطان غیاث الدین بلبن کا ایک ادنیٰ غلام ہوں ملک مقدر؟''

طغرل کے چہرے پر موت کی زردی چھا گئی' پھر بھی اس نے اٹھنے کی کوشش کی' مگر ناکام رہا۔ اپنی مجبوری پر طغرل کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ ''اے شخص! میں تجھے اپنا سارا خزانہ دے سکتا ہوں' مجھ پر رحم کر اور دریا کے پار جاج نگر لے چل! میں تیرے دامن کو سیم و زر سے بھر دوں گا۔ تجھے سلطان کیا دے گا؟ چاندی کے چند سکے اور کوئی معمولی سا منصب۔'' جریان خون کے سبب طغرل کی نقاہت بڑھتی جا رہی تھی' لیکن وہ اپنی تمام تر قوت سمیٹ کر ملک مقدر کو حرص و ہوس کے جال میں الجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''تجھے کیا خبر کہ رسم اعتبار کیا ہے اور اہل وفا کا اس دنیا میں کیا مقام؟'' ملک مقدر کے ہونٹ جل رہے تھے۔ تیری ہوس اقتدار نے بڑی زہریلی فصل بوئی ہے طغرل! اگر یہ بیج پھوٹنے لگے تو ایک حشر برپا ہو جائے گا۔ بنگال سے دہلی تک اہل وفا منہ چھپائے پھر رہے ہیں۔ ہر شخص کی آنکھوں میں شک کے سائے لرز رہے ہیں۔ برسوں پرانے رشتے بے اعتباری کی زد پر ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ کس کے دل میں کیا ہے؟ تیری نمک حرامیوں کے سبب راستوں سے وہ غبار اٹھا ہے کہ دل کے شیشے دھندلا کر رہ گئے ہیں۔ کسی کو کچھ نظر نہیں آتا۔ مجھے نہ منصب کی طلب ہے اور نہ کلاہ کی ہوس۔ میں تجھے قتل کر کے سلطان کو وہ اعتبار لوٹانا چاہتا ہوں جس کی مرکز کو ضرورت ہے۔ میرا کیا ہے' میں زندہ رہوں نہ رہوں...... مگر میرے بھائی تو [illegible] آنکھ اٹھا کر دیکھ سکیں۔''

اس کے ساتھ ہی ملک مقدر کا ہاتھ فضا میں بلند ہوا اور طغرل کا سر تن سے جدا ہو گیا۔

ملک مقدر کچھ دیر تک اس جسم کو تڑپتے دیکھتا رہا' جو کثرت شراب نوشی سے کھوکھلا ہو چکا تھا۔ بڑا عبرتناک منظر تھا۔ صدیوں پر محیط فتوحات کے خواب دیکھنے والے حریص انسان کو ایک مختصر سے لمحے نے شکست دے دی تھی۔

اچانک ملک مقدر کے ذہن میں ایک پریشان کن خیال نے سر ابھارا۔

''یہ طغرل کا علاقہ ہے؟ کہیں اس کے خدمت گار اپنے آقا کو ڈھونڈتے ہوئے یہاں تک نہ آ جائیں۔''

اسی خیال کے پیش نظر ملک مقدر نے طغرل کے سر کو ندی کے کنارے دفن کر دیا اور لاش کو کھینچتا ہوا اس جگہ تک لے گیا جہاں ندی کا بہاؤ بہت زیادہ تیز تھا۔ چند ساعتوں کا کھیل تھا۔ ملک مقدر نے طغرل کے بے جان جسم کو بہتے ہوئے پانی کے حوالے کر دیا' پھر جب ایک غدار سلطنت کا غلیظ وجود اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تو ملک مقدر اپنے کپڑے دھونے لگا۔ وہ اپنے لباس سے طغرل کے خون کا ایک ایک داغ صاف کر دینا چاہتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہی ملک مقدر کو چاروں طرف انسانی آوازوں کا شور سنائی دینے لگا' مگر وہ اطمینان سے ندی کے کنارے بیٹھا ہوا کپڑے دھوتا رہا۔

طغرل کے خدمت گار اپنے آقا کو پکار رہے تھے۔

''آپ کہاں ہیں؟''

خدمت گاروں پر بدحواسی طاری تھی۔ ان لوگوں نے ایک نظر ملک مقدر کی طرف دیکھا' مگر جب انہیں کوئی جواب نہیں ملا تو وہ ندی پار کر کے جاج نگر کی جانب چلے گئے۔

❊❊❊

طغرل کے خدمت گاروں کے جاتے ہی ملک مقدر نے چین کی سانس لی' وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس جگہ پہنچا جہاں طغرل کا سر دفن تھا۔ ملک مقدر کے دل کی عجیب حالت تھی۔ حکومت کے ایک غدار کو اس کے انجام تک پہنچا کر وہ ناقابل بیان خوشی محسوس کر رہا تھا۔

یکایک گھوڑوں کی ٹاپوں کے شور سے جنگل کی فضا گونجنے لگی' ملک مقدر نے گھبرا کر دیکھا۔ ہر طرف سوار ہی سوار نظر آ رہے تھے۔ ایک لمحے کیلئے اسے خیال آیا کہ کہیں طغرل کا بھٹکا ہوا لشکر جاج نگر کی طرف نہ بڑھ رہا ہو۔ یہ ایک مشکل صورتحال تھی' ملک مقدر کسی حادثے کا بھی شکار ہو سکتا تھا' مگر وہ یہ سوچ کر مطمئن ہو گیا کہ اس کا کام ختم ہو چکا ہے۔

فاصلے ذرا کم ہوئے تو ملک مقدر خوشی سے رقص کرنے لگا' وہ ملک برلاس کا لشکر تھا جو تیزی سے اسی طرف آ رہا تھا۔ ملک مقدر دیوانہ وار بھاگتا ہوا برلاس تک پہنچا اور جوش اضطراب میں اس کے گھوڑے کی لگام پکڑ لی۔

''سردار! میں نے اس نمک حرام کو پا لیا۔''

ملک برلاس کو چند لمحوں کیلئے ملک مقدر کی ذہنی حالت پر شک سا ہونے لگا' وہ گھوڑے سے نیچے اتر آیا۔

''کہاں ہے وہ سلطان معظم کا غدار؟'' ملک برلاس نے ملک مقدر سے پوچھا۔

''وہ ندی کے کنارے!'' جذبوں کی شدت نے ملک مقدر پر بدحواسی طاری کر دی تھی۔ ''میں نے اسے زمین میں دفن کر دیا ہے۔''

ملک برلاس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا' پھر بھی وہ ملک مقدر کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔

سالار کے قریب کھڑے ہوئے تمام سپاہیوں کے ہونٹوں پر مہر سکوت تھی اور حیران نظروں سے ملک مقدر کو

زمین کھودتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔
وہ منظر بڑا لرزہ خیز تھا جب تھوڑی دیر بعد زمین سے ایک خاک آلود انسانی سر برآمد ہوا۔
''یہ ہے وہ شاہ کا نافرمان' غدار و بے وفا طغرل!'' ملک مقدر نے اس کاسہ سر کی طرف اشارہ کیا جو عبرت کی عجیب تصویر تھا۔
اگرچہ وہ ایک غدار کی موت تھی' لیکن فتح کا جشن منانے والے بھی انسانی زندگی کی بے ثباتی پر چند لمحے کیلئے سناٹے میں آ گئے۔
ایک انسانی سر جسے کچھ دیر پہلے ریشم کی نرمی بھی گراں گزرتی تھی' یکا یک سنگریزوں اور خاک کے ذروں سے بھر گیا تھا۔ جس پر چتر شاہی سایہ فگن تھا' اب وہی تیز دھوپ میں جل رہا تھا۔ جسے نادر و نایاب خوشبوئیں معطر رکھتی تھیں' اب وہی کیچڑ میں لتھڑا ہوا تھا اور قریب کھڑے ہوئے لوگ ایک ناگوار سی بو کا احساس کر رہے تھے۔
کہاں وہ جبروت کہ ہزاروں زبانیں ''خداوند عالم'' کہتے ہوئے نہ تھکتی تھیں...... اور کہاں یہ بے چارگی؟ نہ کوئی جنازہ اٹھانے والا' نہ کسی کا کاندھا اور نہ کوئی نوحہ خواں۔

***

ملک باربیگ برلاس نے ملک مقدر کی بہت تعریف کی۔
''تم نے سلطان کے باقی نمک خواروں کی آبرو بچالی ورنہ ہم سر جھکا کر اپنی زندگی کی باقی سانسیں پوری کرتے۔''
اس کے بعد ملک برلاس' ملک محمد اور ملک مقدر اپنی فوج کے ہمراہ سلطان غیاث الدین بلبن کی خدمت میں حاضر ہوئے۔
پورا علاقہ مبارکبادوں کے شور سے گونج رہا تھا' پھر جب بلبن کے حضور طغرل کا کٹا ہوا سر پیش کیا گیا تو وہ جوش جذبات سے بے قرار ہو گیا۔
''میں جانتا تھا کہ نمک حراموں کا بوجھ زیادہ دن تک نہیں اٹھایا جا سکتا۔'' بلبن کا لہجہ غضبناک بھی تھا اور تحقیر آمیز بھی۔ ''میں تیری شکست کی خبر سننے کا منتظر تھا اور میری آنکھیں تجھے پابہ زنجیر دیکھنے کیلئے بے چین تھیں' مگر یہ سوچا بھی نہ تھا کہ تو ایک پاگل کتے کی موت مارا جائے گا۔'' یہ کہتے کہتے سلطان بلبن اپنی نشست پر کھڑا ہو گیا۔ ملک برلاس نے طغرل کا سر فرمانروائے ہند کے قدموں میں رکھ دیا تھا۔ ''میرا خیال تھا کہ گلی کوچوں سے انسانی خون کا سیلاب گزرے گا' ہزاروں گھر ویران ہو جائیں گے' کئی دن تک فضاؤں میں موت کے ساز کی جھنکار سنائی دے گی...... مگر یہ تو بہت مختصر تماشا تھا' ایسا تماشا جسے دیکھ کر بلبن کی بلند اقبالیاں شرماتی ہیں۔ تجھے تو میرے ایک ادنیٰ جاں نثار نے مار ڈالا...... اور پھر تیرے جسم کے ساتھ ایسا خوفناک کھیل کھیلا کہ خدا کی پناہ! میں تمام عمر اپنے اس اقدام پر شرمسار رہوں گا کہ مجھے تیرے مقابلے کیلئے دہلی کی حدود سے نکلنا پڑا۔ ایک بدنسب اور خاک بسر انسان کو ایک شہنشاہ عالی مقام سے کیا نسبت تھی؟'' یکا یک غیاث الدین بلبن کے چہرے پر شدید کرب کے آثار نظر آنے لگے' پھر وہ ملک باربیگ برلاس سے مخاطب ہو کر بولا۔
''برلاس! تیرا یہ عمل قابل ستائش ہے کہ تو نے مجھے مزید ندامت سے بچا لیا' اگر یہ ذلیل انسان ایک لمحے کیلئے بھی میدان میں اپنے شاہ کے مقابل آ جاتا تو وقت کی تاریخ ہمیشہ غیاث الدین بلبن پر طعنہ زن رہتی کہ آخری عمر میں سلطان کے جاہ و جلال کی آگ ٹھنڈی ہو گئی تھی اور طغرل جیسے غلام بھی اس کے روبرو ہونے کی گستاخیاں کرنے لگے

تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ سلطنت کے بدخواہ سلطان کے قدموں کی دھمک سن کر فرار ہو گئے اور پھر انہوں نے بلبن کے جبروت سے دہشت زدہ ہو کر اس طرح اپنی گردنیں پیش کر دیں جیسے مذبح خانے کے جانور قطار در قطار سر جھکائے کھڑے رہتے ہیں اور کسی مزاحمت کے بغیر انہیں ایک ایک کر کے ذبح کر دیا جاتا ہے۔"

ملک بار بیگ برلاس دونوں ہاتھ باندھے ہوئے چند قدم آگے بڑھا اور پھر اس نے آہستہ آہستہ واقعہ بیان کر دیا۔

جیسے ہی برلاس خاموش ہوا' غیاث الدین بلبن کی بارعب آواز گونجی۔ سلطان ملک محمد اور ملک مقدر سے مخاطب تھا۔

"تم نے جو کچھ کیا وہ سراسر آداب جنگ کے خلاف تھا۔" بلبن سخت حالت طیش میں نظر آ رہا تھا۔ "کیا طویل تجربے نے تمہیں اتنا نہیں سکھایا کہ دشمن سے کس طرح نبرد آزما ہوا جاتا ہے؟ تمہارے چالیس پچاس سپاہی اتنی بڑی مہم کس طرح سر کر سکتے تھے؟"

ملک محمد اور ملک مقدر رعب شاہی سے کانپنے لگے۔

"اگر میری بلند اقبالی شامل حال نہ ہوتی تو پھر تمہاری اس لغزش کی تلافی ممکن نہیں تھی۔" بلبن کا لہجہ انتہائی غضبناک ہو گیا تھا۔ "تمہاری اس حرکت نے تو طغرل کو وقت سے پہلے ہوشیار کر دیا تھا' وہ آسانی کے ساتھ فرار اختیار کر سکتا تھا' مگر سلطان کا جلال اس کے پیروں کی زنجیر بن گیا۔"

ملک محمد اور ملک مقدر کے جسموں کی لرزش میں اضافہ ہو گیا۔ دونوں بھائی اس تاریخی کارنامے سے گرانقدر انعام کی توقع کر رہے تھے مگر جب بلبن نے ان کی حماقتوں کا ذکر کیا تو وہ شدت خوف سے کانپنے لگے۔ اب جزا کے بجائے انہیں شاہی سزا کا انتظار تھا۔

پھر بھی ڈرتے ڈرتے ملک محمد نے زبان کھولی۔ "شاہ والا! ہم کیا اور ہماری حکمت عملی کیا؟ ہم لوگ تو سر سے پاؤں تک غلطیوں اور لغزشوں کے پیکر ہیں' مگر اپنے دلوں کو کیا کریں کہ جب وہ غدار سلطنت سامنے آیا تو جذبات قابو میں نہ رہ سکے۔"

کچھ اسی انداز میں ملک مقدر نے بھی اپنی صفائی پیش کی۔

بلبن کے غصے کا آتش فشاں جلد ہی بجھ گیا اور اس کا چہرہ پرسکون نظر آنے لگا۔

"تمہاری حماقتوں کے مقابلے میں تمہاری جاں نثاریوں کا وزن زیادہ ہے۔" سلطان نے ملک محمد اور ملک مقدر کی کوتاہیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

اور پھر سلطان کی نوازشات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

ملک بار بیگ برلاس اور ملک محمد کو بیش بہا انعامات سے سرفراز کیا گیا۔

آخر میں ملک مقدر کی باری آئی' بلبن نے اسے "طغرل کش" کا لقب دیا اور ساتھ ہی یہ حکم بھی جاری کر دیا کہ سرکاری دستاویزات میں ملک مقدر کے نام کے ساتھ "طغرل کش" ضرور لکھا جائے۔

اور طغرل کیلئے لازم قرار دے دیا کہ جب بھی اس کا ذکر ہو تو "نمک حرام" کہہ کر پکارا جائے۔

❊❊❊

ایک غدار سلطنت سے نجات حاصل کرنے کے بعد غیاث الدین لکھنوتی (بنگال) پہنچا۔

لکھنوتی پہنچتے ہی بلبن نے ایک جابرانہ حکم صادر کیا۔

"بازاری شاہراہوں کے دونوں طرف پھانسیاں لٹکا دی جائیں۔"
امراء نے حیرت و اضطراب کے ساتھ اپنے فرمانروا کا یہ حکم سنا اور پھر لکھنوتی کا خاص بازار ایک مقتل نظر آنے لگا۔ خریدار اس طرف آتے ہوئے ڈرتے تھے' مگر ایک اور شاہی حکم کے مطابق انہیں مجبور کیا گیا کہ لوگ بازار کا رخ کریں اور اپنے گھروں میں گوشہ نشیں ہو کر نہ بیٹھیں۔
لکھنوتی کے تمام باشندے بازار میں جمع ہو کر ان صلیبوں کو دیکھنے لگے جو سرراہ نصب کی گئی تھیں۔ عوام نہیں جانتے تھے کہ ان صلیبوں پر کن بدنصیبوں کو کھینچا جائے گا؟ بس حکومت کے مقربین اس خوفناک راز سے آشنا تھے کہ طغرل کے نام لیواؤں کی سانسیں ختم ہو چکی ہیں اور ان ہی کو سزا کے اس دردناک مرحلے سے ایک ایک کر کے گزارا جائے گا۔
مرنے والے فریادیں کرتے رہے' مگر آج ان کی سننے والا کوئی نہیں تھا۔
طغرل کے ساتھیوں' ہمدردوں' دوستوں اور عزیزوں کو پکڑ پکڑ کر مقتل کی جانب لایا جا رہا تھا۔ وہ مقتل جسے سرراہ گزر آباد کیا گیا تھا۔
قتل کئے جانے والوں نے اپنی سانسیں غصب ہونے سے پہلے شاہ کے انصاف کو پکارا۔
شاہ کی طرف سے جواب دیا گیا۔
"آج تم ہمیں کس لئے پکارتے ہو' مہلت زیست تو ختم ہو چکی' تم نے ہمیں اس وقت آواز کیوں نہیں دی جب وہ ذلیل نسب طغرل تمہارے درمیان شاہی خزانے کو بے دریغ لٹا رہا تھا اور تم اس کی نمک حرامیوں کو مسلسل سجدے کر رہے تھے۔ ایسے احسان فراموش اور غدار لمحات میں تم نے یہ کیوں نہیں کہا کہ اقتدار صرف غیاث الدین بلبن کا حق ہے۔"
صلیبوں کی طرف جانے والوں نے فریاد کی لے تیز کر دی۔
"ہم بہت مجبور تھے شہنشاہ! ہماری زبانوں پر جبر کے پہرے تھے۔"
شاہ کی طرف سے جواب آیا۔
"ان پہروں کو ہٹا دیا ہوتا اور اپنے شاہ سے رسم وفا نبھاتے ہوئے قتل ہو گئے ہوتے' پھر جب ہمارے بابرکت قدم اس طرف آتے تو ہم تمہارے ویران گھروں کو دوبارہ آباد کر کے قصر زرنگاہ میں بدل دیتے اور تمہاری نسلوں کو اتنا دے دیتے کہ انہیں کسی دوسرے کے آگے دامن پھیلانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔"
"کہاں تک جواب دیتے؟" آخر فریاد کرنے والوں کی زبانیں پتھرا گئیں اور انہیں دار پر کھینچ دیا گیا۔
بلبن کا یہ قہر صرف سیاسی مجرموں پر نازل نہیں ہو رہا تھا' اس کی زد میں طغرل کے دوست اور شناسا بھی تھے۔
چند عزیز و اقارب جنہیں طغرل اپنے ہمراہ لکھنوتی لے گیا تھا وہ بھی اس جابرانہ حکم کا شکار ہوئے' یہاں تک کہ مرنے والوں کے بیوی بچے بھی قتل کر دیئے گئے۔
مرنے والوں کی اس جماعت نے گریہ وزاری کرتے ہوئے کہا۔
"سلطان! اس کے سوا ہمارا کوئی گناہ نہیں کہ ہم مجرموں کا ایک حوالہ ہیں۔"
سلطان کی طرف سے عجیب سا جواب دیا گیا۔
"بروں کا حوالہ اچھوں کو بھی لے ڈوبتا ہے...... اور اچھوں کی نسبت بروں کو بھی نیک نام بنا دیتی ہے۔"
اس جواز کے بعد ان عورتوں اور بچوں کو بھی قتل کر دیا گیا جو طغرل کے حامیوں سے تعلق رکھتے تھے۔

کہنے والوں نے سرگوشیوں میں کہا۔
''غیاث الدین بلبن دہلی کا پہلا حکمران ہے جس نے سیاست کی جنگ میں بے گناہ عورتوں اور معصوم بچوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگے۔''
کہنے والوں کو جو کچھ کہنا تھا وہ کہتے رہے......اور غیاث الدین بلبن کسی کی نکتہ چینی سے متاثر ہوئے بغیر فیصلے کرتا رہا۔
آخر میں بلبن کے سامنے ایک نام نہاد قلندر کو پیش کیا گیا۔
بلبن نے اس شخص کو غور سے دیکھا جو زرد رنگ کا لباس پہنے ہوئے تھا' اس کے گلے میں سینکڑوں قسم کے پتھروں سے بنی ہوئی ایک مالا لٹک رہی تھی اور ہاتھوں میں سونے کے ٹھوس کڑے تھے۔
قلندر کا عجیب و غریب حلیہ دیکھ کر غیاث الدین بلبن نے انتہائی نفرت آمیز لہجے میں اس سے پوچھا۔ ''تو کون ہے؟''
قلندر نے حسب عادت ایک زوردار نعرہ بلند کرنا چاہا' مگر بلبن کے خوف سے اس کی آواز گلے میں گھٹ کر رہ گئی۔
پھر اس سے سختی کے ساتھ باز پرس کی گئی اور تین من سونا برآمد کر لیا گیا۔
قومی دولت کا اتنا بڑا نقصان دیکھ کر بلبن کا خون کھول اٹھا۔ ''اے بدنصیب بہروپئے! یہ کیا ہے؟ سونے کا اتنا بڑا ذخیرہ رکھنے کے باوجود قلندری کا دعویٰ کرتا ہے؟ قلندر ایسے ہوتے ہیں؟''
قلندر کے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔
آخر بلبن کے حکم پر قلندر کو بھی قتل کر دیا گیا اور دوسرے مقتولین کے ساتھ اس کی لاش بھی پھانسی پر لٹکا دی گئی۔
طغرل کے جو سپاہی باقی بچ گئے تھے ان کے بارے میں حکم دیا گیا۔ ''انہیں دہلی لے جاؤ تاکہ وہاں کے باشندے بھی غداروں کی موت کا تماشا دیکھ سکیں۔
طغرل کے ایک ایک حامی کو دردناک سزا دینے کے بعد سلطان غیاث الدین بلبن نے لکھنوتی کی حکومت اپنے چھوٹے بیٹے بغرا خان کے سپرد کی اور دہلی روانہ ہو گیا۔

❋❋❋

دہلی کی گلیوں میں جشن فتح کے ہنگامے جاری تھے۔ ہر امیر و غریب نے اپنی حیثیت کے مطابق گھر گھر میں چراغاں کیا تھا۔
قائم خان بہت اداس تھا کہ اس کی بیٹی یاسمین خانم عین عالم شباب میں بیوہ ہو گئی تھی اور مستقبل کے تمام روشن منصوبوں پر مایوسیوں کا گہرا دھواں چھا گیا تھا۔
زرتاج خانم نے بہت افسردہ لہجے میں بیٹی سے تعزیت کرتے ہوئے کہا۔
''یہ سب مقدرات کا کھیل ہے یاسمین! تجھے بہرحال صبر و ہمت سے کام لینا چاہئے کہ زمین پر رہنے والے آسمان کے فیصلوں کے خلاف احتجاج کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔''
''مجھے طغرل کی موت کا کوئی غم نہیں ہے۔'' یاسمین خانم بہت زیادہ مشتعل نظر آ رہی تھی۔ ''ایسے بھیڑیئے کا یہی حشر ہونا چاہئے تھا وہ جس بے حسی کے ساتھ مجھے تنہا چھوڑ کر گیا تھا' میں اس جانگداز منظر کو کس طرح فراموش کر سکتی ہوں' بدچلن عورتوں کے ہجوم میں اپنی پاک [illegible] سے بھی زیادہ لرزہ خیز سزا کا مستحق تھا۔''

یاسمین خانم اپنے دل کا غبار دھو رہی تھی۔ "اب اسے قبر کی تنہائی میں احساس ہو گیا ہو گا کہ حرص و ہوس کا کیا انجام ہوتا ہے؟"

"میں تیرے درد کو سمجھتا ہوں بیٹی!" قائم خان نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ "مگر تجھے رسم دنیا کے مطابق سیاہ لباس پہن لینا چاہئے کہ آخر وہ تیرا شوہر تھا۔ اہل شہر اچھی طرح جانتے ہیں کہ سلطان کی موجودگی میں طغرل سے تیرا نکاح ہوا تھا۔ اگر تو اسی طرح شوہر کے غم سے بے نیاز رہی تو یہ لوگ تجھے کیا کہیں گے؟ بس کچھ دن کیلئے ماتمی قبا پہن لے اور چہرے پر رنج والم کی نقاب ڈال لے کہ دنیا والوں کے درمیان رہ کر یہ نمائش بھی ضروری ہوتی ہے۔"

یاسمین خانم نے انتہائی جبر کے عالم میں ماتمی لباس پہن لیا۔

قائم خان کا خیال تھا کہ دہلی کے بیشمار لوگ اس سے طغرل کی موت پر تعزیت کریں گے' مگر جب اس سلسلے میں کسی ایک شخص کے ہونٹوں کو جنبش تک نہ ہوئی تو وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ کل تک جو لوگ اسے جھک جھک کر سلام کرتے تھے' آج ان کی آنکھوں میں شناسائی کا ہلکا سا عکس بھی نہیں تھا۔

قائم خان اس صورتحال سے قطعاً بے خبر تھا کہ لکھنوتی میں طغرل کے حامیوں اور رشتے داروں کو کیسے خوفناک مراحل سے گزرنا پڑا ہے؟ وہ اپنے داماد کو محض حکومت کا ایک باغی سمجھ رہا تھا اور اس کے خیال میں ایک باغی کے انجام کے ساتھ ہی تعلقات کا یہ باب بھی ہمیشہ کیلئے بند ہو گیا تھا۔

پھر جب تین ماہ بعد سلطان غیاث الدین بلبن دہلی پہنچا تو عام رعایا نے کئی منزل پہلے اپنے گھروں سے نکل کر فرمانروائے ہند کا استقبال کیا۔

بلبن اپنے عوام کے اس پر جوش مظاہرے سے بہت خوش تھا' اس نے راستے میں کئی مقام پر رک کر ہاتھ کے اشارے سے ان لوگوں کے نعروں کا جواب دیا جو اپنے شہنشاہ کی درازی عمر کی دعائیں مانگ رہے تھے اور ملک دشمنوں کے حق میں بدترین الفاظ استعمال کر رہے تھے۔

غیاث الدین بلبن سب سے پہلے ملک فخر الدین کوتوال سے ملا۔

یہ وہی شخص تھا جسے بلبن نے اپنی عدم موجودگی میں سرکاری امور کا نگران بنایا تھا۔

بلبن نے اس طویل غیر حاضری کے زمانے میں پیدا ہونے والے سیاسی مسائل کا جائزہ لیا اور پھر وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ملک فخر الدین کوتوال نے آزمائش کے اس مرحلے میں بڑی جانفشانی "وفاداری اور ہوشمندی کا ثبوت دیا تھا۔

بلبن نے بھرے دربار میں ملک فخر الدین کی طرف ستائشی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ایک وہ نمک حرام طغرل تھا کہ اس نے ہماری آنکھوں سے اوجھل ہوتے ہی سرکشی اختیار کر لی...... اور ایک ملک فخر الدین کوتوال ہے کہ اس نے شاہ کی غیر موجودگی میں اپنی نیندیں حرام کر لیں اور حکومت کے مسائل پر اس طرح توجہ دی کہ ایفائے عہد کی ایک روشن مثال قائم کر دی۔"

اس مختصر سی تقریر کے بعد سلطان غیاث الدین بلبن نے ملک فخر الدین کوتوال کو شاہانہ نوازشات سے سرفراز کیا۔

پھر بلبن اس قدر جذباتی ہو گیا کہ اس نے اپنی مخصوص قبا اتار کر ملک فخر الدین کو پہنا دی۔

پورے دربار پر سناٹا چھایا ہوا تھا' اہل دربار نے آج تک اپنے سلطان کی یہ والہانہ ادا نہیں دیکھی تھی' بڑے بڑے امراء ملک فخر الدین کی قسمت پر رشک کر رہے تھے اور کچھ تنگ نظر وزراء کے سینوں میں آتش حسد بھی بھڑک

اٹھی تھی۔

یکا یک غیاث الدین بلبن نے انتہائی پرجوش لہجے میں نیا اعلان کیا۔

''آج سے ملک فخر الدین کوئی درباری امیر نہیں' ہمارا ذاتی دوست ہے اور ہم اس کی دوستی پر فخر کرتے ہیں۔''

اس اعلان سے اکثر درباریوں کے چہرے اتر گئے اور ملک فخر الدین کوتوال نے آگے بڑھ کر اپنے سلطان کی قدم بوسی کا شرف حاصل کیا۔

اس مرحلے سے گزر کر غیاث الدین بلبن درویشوں کے آستانے پر خود حاضر ہوا اور ان کی خدمت میں نذرانے پیش کئے' صوفیاء اور علماء کی جماعت نے اسلام کی سربلندی اور بلبن کی اصلاحی کوششوں کے حق میں دعائے خیر کی۔

❋❋❋

پھر بلبن عام مجرموں کی طرف متوجہ ہوا' دیوانی عدالت میں جس قدر بھی مقدمات پیش کئے گئے' وہ سب کے سب واپس لے لئے گئے۔ اس قسم کے تمام مجرموں کو یہ کہہ کر آزاد کر دیا گیا کہ سلطان خوشی کے اس موقع پر انہیں اصلاح حال کیلئے ایک مہلت فراہم کرنا چاہتے ہیں۔

اس کے ساتھ ہی غیاث الدین بلبن نے وہ ساری رقم معاف کر دی جو رعایا پر واجب الادا تھی۔

دہلی کے گلی کوچوں میں جشن فتح کی ہنگامہ خیزیاں جاری تھیں کہ اچانک بیشمار لوگوں کے دلوں کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو گئیں۔

مسرتوں کے اس شور میں غیاث الدین بلبن کے ایک اور اعلان کی گونج سنائی دی۔

وہ بڑا لرزہ خیز اعلان تھا۔

بلبن نے حکم دیا تھا کہ دہلی کے بازار میں صلیبیں نصب کر دی جائیں اور لکھنوتی سے جس قدر مجرم ساتھ لائے گئے ہیں ان سب کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔

طغرل کے تمام عزیزوں اور دوستوں کو زنجیریں پہنا دی گئیں۔ یاسمین' زرتاج خانم اور طغرل کی تمام رشتے دار خواتین کو ان کے گھروں میں محصور کر دیا گیا' گرفتار ہونے والے مجرموں میں قائم خان بھی شامل تھا۔

❋❋❋

پوری دہلی میں ایک کہرام سا برپا تھا۔ لکھنوتی سے لائے جانے والے تمام مجرم سپاہی اہل شہر کے رشتے دار اور عزیز تھے۔ اگر وہ سب کے سب سلطان غیاث الدین بلبن کے حکم کے مطابق سر بازار نصب شدہ صلیبوں پر لٹکا دیئے جاتے تو دہلی کا ایک ایک گھر ماتم کدہ بن جاتا۔

طغرل کے حامی غدار سپاہیوں کی موت اور زندگی کے درمیان صرف ایک رات کا وقفہ حائل تھا۔ صبح سورج نکلتے ہی پیش آنے والے اس جانگداز سانحے کے اثرات ابھی سے ظاہر ہونا شروع ہو گئے تھے اور گلی گلی سے آہ و زاری کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ بلبن کے بڑے بڑے مصاحب اور مقرب امراء دم بخود تھے ہر چہرے پر خوف و دہشت کا عکس اور ہر آنکھ میں وحشت کا رنگ نمایاں تھا۔ مجرم سپاہیوں کے عزیزوں نے ہر وزیر اور امیر کے دروازے پر فریاد کی، مگر انہیں ایک ہی جواب ملا کہ وہ سلطان کے حضور لب کشائی کی جرأت نہیں رکھتے۔

اہل شہر اپنے ان عزیزوں کی زندگی سے مایوس ہو چکے تھے، جنہوں نے نمک حرام طغرل کی حمایت کرتے ہوئے سلطان غیاث الدین بلبن سے کھلی ہوئی بغاوت کی تھی۔ دہلی کے باشندوں کو پورا یقین ہو چکا تھا کہ سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی سینکڑوں انسان تختہ دار پر کھینچ دیئے جائیں گے اور بلبن کے سیاسی انتقام کی وہ روایت برقرار رہے گی جس کے کئی مظاہرے اہل ہند اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔

پھر جب شور و فغاں حد سے بڑھا تو دہلی کا ایک برگزیدہ شخص زیادہ مضطرب نظر آنے لگا، حالانکہ مجرموں کی طویل قطار میں اس کا کوئی اپنا رشتے دار یا دوست شامل نہیں تھا۔ وہ درد دل انسان قاضی نورالدین تھے جنہیں قاضی غیور احمد کے مر جانے کے بعد منصب قضا پر فائز کیا گیا تھا۔ قاضی نورالدین ایک انتہائی پرہیزگار اور سیاسی دباؤ سے آزاد رہنے والے شخص تھے۔ انہوں نے بعض ایسے فیصلے بھی کئے تھے جنہیں امرائے وقت کی پیشانیاں شکن آلود ہو جاتی تھیں۔ قاضی نورالدین نے کبھی کسی امیر کی سفارش کو قابل اعتنا نہیں کیا، مگر کسی مقرب درباری نے زبانی تنبیہہ کے ذریعے انہیں مجبور کرنے کی کوشش کی تو قاضی نورالدین برملا کہہ دیتے تھے۔

"ممکن ہے کہ تم لوگ اپنے سیاسی اثرات استعمال کر کے میری موت کا فیصلہ سنا دو، مگر میں اپنا فیصلہ تبدیل نہیں کر سکتا۔"

آج بھی قاضی نورالدین اپنے پڑوسیوں اور ہم وطنوں کی فریاد سن کر بہت زیادہ افسردہ و ملول نظر آ رہے تھے۔ آخر جب بے قراری حد سے گزری تو قاضی نورالدین اپنی شریک حیات سے کہنے لگے۔

"کیا یہاں مصلحت نے سب کی طاقت گفتار چھین لی ہے اور کیا سب نے خود ساختہ مجبوریوں کی زنجیریں پہن لی ہیں؟ لوگ بولتے کیوں نہیں؟ یہ کیسا سکوت مجلس ہے اور لوگ اپنی زبان کی نعمت کا حق ادا کیوں نہیں کرتے؟ یہ کیسی ناشکر گزاری ہے؟"

قاضی نورالدین کی بیوی اپنے شوہر کے اس انداز فکر پر لرز کر رہ گئیں۔
"کیا آپ سلطان کے مزاج سے واقف نہیں؟"
"میں سلطان کی ایک ایک ادا کو خوب پہچانتا ہوں' مگر مجھ سے لوگوں کی یہ جگر شگاف چیخیں نہیں سنی جاتیں۔"
قاضی نورالدین نے شدید کرب ناک لہجے میں کہا۔ "کیا تمہاری سماعت تک یہ شور وفغاں نہیں پہنچ رہا ہے؟" بڑا عجیب سوال تھا۔
"میں بھی بہت دیر سے یہ چیخیں سن رہی ہوں۔" بیوی نے جھنجلا کر کہا۔ "مگر میں یہ بھی جانتی ہوں کہ ان چیخوں کا تاثر قبول کرنا کوئی ہوشمندی کی بات نہیں۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ حکومت کے غدار اسی انداز کی موت سے ہمکنار ہوتے ہیں اور ان کی لاشوں پر ماتم بھی کیا جاتا ہے' مگر آپ کے چہرے پر یہ موت کی سی زردی کیوں چھائی ہوئی ہے؟ آخر ان سے آپ کا کیا رشتہ ہے؟"
"افسوس! صد ہزار بار افسوس!" قاضی نورالدین نے اس طرح سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا کہ جیسے انہیں اپنے دل میں ناقابل بیان درد محسوس ہو رہا ہے۔ "میری شریک حیات یہ بھی نہیں جانتی کہ ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان سے کیا رشتہ ہے؟"
"دہلی میں اور بھی بیشمار مسلمان بستے ہیں۔ پھر انہیں اس رشتے کا احساس کیوں نہیں ہوتا؟ قاضی نورالدین کی بیوی نے انتہائی تند و تیز لہجے میں کہا۔ وہ ایک فرمانبردار اور غمگسار خاتون تھیں' جو اس سنگین صورتحال سے اپنے شوہر کو دور رکھنا چاہتی تھیں اور اس لئے جارحانہ انداز میں گفتگو کر رہی تھیں ورنہ عام حالات میں ان کی آواز اتنی بلند اور تلخ نہیں ہوتی تھی۔
"میں کسی اور کی بات نہیں کرتا' مگر اہل شہر سے میرا ناقابل تنسیخ رشتہ ہے۔" قاضی نورالدین نے نہایت پراعتماد لہجے میں ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "ان کے آنسو میرے اپنے آنسو ہیں اور ان کی چیخیں میری اپنی چیخیں ہیں' چاہے میرے سر سے قیامت ہی کیوں نہ گزر جائے' مگر میں سلطان کے روبرو اپنی دلی کیفیت ضرور بیان کروں گا۔"
قاضی نورالدین کی یہ حالت دیکھ کر ان کی بیوی کا چہرہ دھواں ہو گیا۔ "یہاں اور بھی تو بڑے بڑے صاحبان اقتدار ہیں' وہ سلطان کے حضور احتجاج کیوں نہیں کرتے؟ کیا آپ نہیں جانتے کہ سلطان اپنے فیصلوں میں کسی کی مداخلت برداشت نہیں کرتے؟" قاضی نورالدین کی شریک حیات اپنے شوہر کے یہ تیور دیکھ کر ایک ایسے خطرے کا احساس کر رہی تھیں جو خود ان کے گھر کو بھی کسی ماتم کدے میں تبدیل کر سکتا تھا۔
"میں نہیں جانتا کہ امرائے سلطنت نے کس لئے اپنے ہونٹوں پر مہر سکوت سجائی ہے' مگر میں ایک بار سلطان سے ضرور عرض کروں گا کہ کبھی کبھی رحم و کرم کا مظاہرہ بھی مجرموں کی نفسیات بدل ڈالتا ہے اور انسانی شورشیں کسی ہتھیار کے استعمال کے بغیر ہی دم توڑ دیتی ہیں۔"
یہ کہہ کر قاضی نورالدین اٹھ کھڑے ہوئے۔ بیوی کے بہتے ہوئے آنسوؤں نے انہیں روکنے کی بہت کوشش کی' مگر وہ اس وقت ہر جذبے اور ہر تاثر سے بے نیاز ہو چکے تھے۔ انہیں بس ایک ہی فکر تھی کہ کسی طرح سلطان غیاث الدین بلبن کی بارگاہ جلال میں حاضر ہو کر اہل شہر کی گریہ وزاری کا حال بیان کر دیں۔
اور پھر قاضی نورالدین اس شاہ کے حضور میں چلے گئے' جس کے جلال و جبروت سے بڑے بڑے مردان شجاع سہمے ہوئے رہتے تھے۔ سلطان غیاث الدین بلبن قاضی نورالدین کی بے وقت آمد پر حیران رہ گیا۔

فضا پر عجیب سا سکوت طاری تھا' قاضی نورالدین بلبن کے سامنے دست بستہ کھڑے رہے' پھر جب خاموشی کے یہ لمحات غیر فطری طور پر طویل ہو گئے تو بلبن نے ناگوار لہجے میں کہا۔

''قاضی نورالدین! تم بولتے کیوں نہیں؟ آخر کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''میں شاہ سے ان مجرموں کیلئے رحم کی درخواست کرنے آیا ہوں جو عدالت عالیہ سے موت کی سزا پا چکے ہیں۔

''قاضی نورالدین کا لہجہ مدھم ضرور تھا' مگر آواز سے کسی قسم کی وحشت یا لرزش نمایاں نہیں تھی۔

''قاضی! کیا تم نہیں جانتے کہ یہ ہمارا ذاتی فیصلہ ہے اور ہم نے کسی شخص کو یہ اختیار نہیں دیا کہ وہ ہمارے فیصلے کے خلاف لب کشائی کر سکے۔'' یہ کہتے کہتے سلطان کے ماتھے پر کئی بل پڑ گئے تھے۔ ''ہم نہیں سمجھتے کہ تمہارے ذہن میں یہ خیال کیوں پیدا ہوا؟ کیا تم نے اپنے اطراف پر نظر نہیں کی؟ ذرا غور سے دیکھو کہ زمین اور آسمان بھی نہیں بدلے اور ہمارے مزاج میں بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے' پھر تم نے ایسا کیوں سوچا؟ دارالحکومت کے تمام حلقوں میں تمہارے غیر جانبدارانہ فیصلوں کی بڑی شہرت ہے اور خود ہم تمہیں بہت زیادہ قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں' پھر تم نے غداروں کی حمایت کیوں کی؟ ہمیں اس وقت تمہاری باتیں سن کر بہت قلق ہوا۔

سلطان غیاث الدین بلبن کے چہرے پر ہلکے ہلکے غصے کے آثار نمایاں ہو چلے تھے۔ قاضی نورالدین تم نے ہمیں بہت مایوس کیا۔''

''فرمانروائے ہند کی ضد اور سرکشی اپنی جگہ قائم تھی' بلبن نے قاضی نورالدین کی دردمندانہ گفتگو کا کوئی تاثر قبول نہیں کیا تھا۔ ایسی نازک ساعتوں میں قاضی صاحب سر جھکا کر واپس جا سکتے تھے' مگر وہ بدستور اپنے قدموں پر کھڑے رہے۔

''سلطان والا حشم! میں غداروں کا حامی نہیں' حکومت کا ایک ادنیٰ خیر خواہ ہوں۔ بغاوت کے مجرموں کو معاف کر دینے سے سلطانی کی عظیم الشان سلطنت کے نظم و ضبط میں کوئی خلل واقع نہیں ہوگا۔'' قاضی نورالدین آہستہ آہستہ بول رہے تھے۔ ''سلطان جلال کا مظاہرہ ہو چکا' اب ضروری ہے کہ ہندوستان کا طاقتور حکمران عوام کے سامنے اپنی شان جمالی میں ظاہر ہو' مجھ عاجز و حقیر کی رائے میں قہر کے ساتھ رحم کا مظاہرہ بھی لازم ہے۔ اس طرح سیاست میں توازن برقرار رہتا ہے اور عوام کے دل مسخر ہو جاتے ہیں۔ اپنے محکوموں کو یہ سوچنے کا موقع عنایت کیجئے کہ سلطان غیاث الدین بلبن صرف ان کا آقا ہی نہیں بلکہ ایک غمگسار دوست بھی ہے۔'' قاضی نورالدین نہایت پرسوز لہجے میں اس مطلق العنان شخص کو سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے جو اپنے فیصلوں کے خلاف ایک حرف بھی سننے کا عادی نہیں تھا۔

''یہ کم عقل لوگ تھے جنہیں طغرل نے کچھ دیر کیلئے ورغلا دیا تھا' آپ انہیں ایک بار معاف کر کے تو دیکھیں ان کے سر دوبارہ سلطان کے حضور خم ہو جائیں گے۔''

قاضی نورالدین کو ہرگز یہ توقع نہیں تھی کہ غیاث الدین بلبن کی ذہنی رو بدل جائے گی' مگر وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ سلطان کے چہرے پر چھایا ہوا رنگ غضب آہستہ آہستہ معدوم ہونے لگا۔ یہ بڑی خوشگوار تبدیلی تھی۔ قاضی نورالدین کو محسوس ہوا جیسے پتھر پگھلنے لگا ہو اور بارگاہ سلطانی سے مجرموں کے بجائے خود انہیں نئی زندگی مل رہی ہو۔

''ہمارے لئے اپنا فیصلہ بدل دینا بہت مشکل ہے قاضی...... بلبن کے لہجے سے اس کی ذہنی کشمکش اور آشکار ہونے لگی تھی' اس وقت نہ وہ قہر کی حالت میں تھا اور نہ اس کے چہرے پر رحم کی کوئی علامت نظر آ رہی تھی۔ ''اگر ہم مجرموں کی موت کے احکام واپس لے لیں گے تو ہمارا یہ عمل آداب سیاست کے منافی ہوگا۔ خدا ہی جانتا ہے کہ کم ظرف ہمارے بدلے ہوئے الفاظ کو کیا کیا مفہوم پہنائیں گے؟''

"ہرگز نہیں شاہ ذی وقار! قاضی نورالدین کا لہجہ کچھ اور عاجزانہ ہو گیا تھا۔" لوگ صرف آپ کے انداز کرم کو یاد رکھیں گے۔"

"ہم بے داغ کردار کے سبب تمہارا احترام کرتے ہیں قاضی نورالدین! مگر حکومت کے غداروں پر ہمارے رحم کی بارش بڑی انہونی بات ہو گی۔" سلطان غیاث الدین بلبن کا ذہن ابھی تک تذبذب اور کشمکش کے درمیان سفر کر رہا تھا۔

مجھ ناچیز کے بارے میں سلطان معظم کی زبان سے ادا ہونے والے یہ چند کلمات میری زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ ہیں۔ سینکڑوں انسانوں کو موت کے خونی دہن سے بچانے کیلئے قاضی نورالدین نے اپنی گردن کا خم کچھ اور نمایاں کر لیا تھا' آج میں اعتراف کرتا ہوں کہ سلطان عالی مقام نے مجھ ناکارہ اور بے صلاحیت انسان کو یہاں تک سرفراز کیا کہ اس کا دامن عنایات شاہی سے بھر گیا' مگر انسان بڑا حریص ہے' کسی بھی صورت میں اس کے ذوق ہوس کی تسکین نہیں ہوتی۔"

سلطان غیاث الدین بلبن نے دفعتاً چونک کر قاضی نورالدین کی طرف دیکھا۔" اپنا مدعا واضح الفاظ میں بیان کرو۔"

"اگر شاہ والا سمجھتے ہیں کہ میں نے اس عظیم الشان سلطنت کی کوئی حقیری خدمت انجام دی ہے تو اس کے صلے میں ان گنہگاروں کو بخش دیا جائے جن کی زندگی کی ساعتیں رات گزرتے ہی ختم ہو جائیں گی۔ آج میرا منصب میرا علم زہد و تقویٰ سب کچھ آپ کی نذر ہے۔ میں اس کے سوا کچھ نہیں چاہتا کہ دہلی کے ایک ایک گھر میں آپ کے رحم و کرم کے چرچے ہوں اور ہندوستان کی فضائیں اس شور سے گونج اٹھیں کہ ان کا سلطان کیسا شفیق اور کیسا مہربان ہے؟ قاضی نورالدین نے مخلوق خدا کو شدید صدمات سے بچانے کیلئے خوشامد و عاجزی کی انتہا کر دی تھی اور پھر ان کا یہ ایثار تاریخ ہند کے اوراق میں ہمیشہ کیلئے محفوظ ہو کر رہ گیا۔

یہ قاضی نورالدین کے الفاظ کی اثر انگیزی ہی تھی کہ سلطان غیاث الدین بلبن نے اپنا فیصلہ بدل ڈالا۔

"ہمارا دل تو نہیں چاہتا تھا قاضی' مگر ہم نے تمہاری خاطر اپنے الفاظ واپس لے لئے۔" بلبن کے لہجے میں قاضی نورالدین کیلئے عقیدت کا ایک خاص رنگ نمایاں تھا۔

"شاہ نے یہ احسان براہ راست میری ذات پر کیا ہے۔" "قاضی نورالدین کا سر احتراماً مزید جھک گیا۔ میں اس احسان مندی کے صلے میں تمام عمر اپنے فرمانروا کیلئے دعائے خیر کرتا رہوں گا' دونوں جہاں میں بھلا ہو میرے سلطان کا...... اور سدا رہے نام اللہ کا۔" یہ کہہ کر قاضی نورالدین "قصر سفید" سے باہر نکل آئے۔

اور پھر دہلی کی گلیوں میں فرمان شاہی گونجنے لگا۔

سلطان کے بے پایاں کرم نے لکھنوتی کے مجرموں کے گناہ معاف کر دیئے ہیں اور انہیں اپنے رحم کے زیر سایہ اماں بخش دی ہے۔"

اور پھر اہل شہر نے دیکھا کہ دہلی کے بازار خاص میں نصب شدہ صلیبیں اتاری جا رہی ہیں۔

اور پھر دہلی کا ایک ایک کوچہ مسرت انگیز شور سے گونج اٹھا۔ مجرموں کے عزیز و احباب قصر سفید کے پیچھے جمع ہو کر بلبن کی بلند اقبالی کیلئے دعائیہ کلمات کے ساتھ نعرہ زنی کرنے لگے۔

قائم خان نے بھی شور سنا اور چین کی ایک طویل سانس لی...... مگر اس کے سکون و اطمینان کے یہ لمحات بہت عارضی تھے' ابھی قائم کے سر سے سیلاب بلا نہیں گزرا تھا۔

اور پھر ایسا ہی ہوا۔ باغی مجرموں کی جاں بخشی کے دوسرے دن قائم خان کو زندان کی چار دیواری سے نکال کر دربار شاہی میں بلبن کے حضور لے جایا گیا۔ والئی ہند کے چہرے پر قہر و جلال کی ناقابل فراموش کیفیت نے تمام درباریوں کے توانا جسموں کو پتھر کے مجسموں میں ڈھال دیا تھا۔ سلطان کے مقرب ترین مصاحب اور وزراء بھی اس طرح سانس لے رہے تھے جیسے کوئی شخص عالم نزع میں گرفتار ہو۔ بظاہر اس وقت دربار شاہی زندوں کا قبرستان نظر آرہا تھا۔

دربار شاہی کا یہ رنگ دیکھ کر قائم خان اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ وہ تیز ہواؤں کی زد میں آجانے والی کسی کمزور شاخ کی طرح کانپ رہا تھا۔ اس نے دربار میں داخل ہوتے ہی فرش پر اپنا سر رکھ دیا۔ قائم خان کے جسم کی اضطراری جنبش سے زنجیریں بج اٹھیں اور دربار کا گہرا سکوت مجروح ہو گیا۔ دست بستہ کھڑے ہوئے درباری زنجیروں کی اس صدا پر مڑ کر پیچھے یا اپنے دائیں اور بائیں جانب دیکھنا چاہتے تھے' مگر وہ جلال شاہی کے زیر اثر اپنی گردنوں کے زاویے تبدیل نہ کر سکے۔

قائم خان کو اندازہ ہو چکا تھا کہ سلطان غیاث الدین بلبن کے قہر کا یہ طوفان کسی ہولناک تباہی کے بغیر خاموشی سے نہیں گزرے گا۔ آج اس کی تند و تیز موجوں میں بہت کچھ غرق ہو جانا تھا۔ اسی خوف کے پیش نظر وہ ایک لمحے کی تاخیر کئے بغیر سجدے میں چلا گیا تھا۔

بلبن پر قائم خان کی اس عاجزانہ ادا کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

''میں خدا نہیں ہوں کہ تیرا سجدہ قبول کر کے تجھ پر اپنی رحمت نازل کر دوں۔'' بلبن کی آواز سے دیوار و در کانپ رہے تھے۔ ''تیرا کوئی اعتراف تیرے جرم کی سیاہ لکیروں کو مٹا نہیں سکتا کہ تو اول و آخر اس منافق ریاکار اور لعنت زدہ طغرل کا قریب ترین عزیز ہے۔''

قائم خان فوراً ہی لرزتے ہوئے جسم کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ ''سلطان ذی وقار! میں تو خود اس نمک حرام کی فریب کاریوں کا شکار ہو چکا ہوں۔'' قائم خان کی زبان سے الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہو رہے تھے۔ ''شاہ والا! میں ایک ایسا بدنصیب باپ ہوں جس کی بیٹی طغرل کی وجہ سے تماشا بن کر رہ گئی ہے۔''

''یہ تیرے اپنے اعمال کی سزا ہے۔'' سلطان غیاث الدین بلبن کا لہجہ کچھ اور قہرناک ہو گیا تھا۔ انسان اپنی بوئی ہوئی فصل کے سوا کچھ اور نہیں کاٹتا۔''

''میں تو نمک حرام طغرل کو جانتا تک نہیں تھا۔'' قائم خان نے کھلے ہوئے جھوٹ کا سہارا لیا۔ ''مگر جب مجھ پر یہ راز فاش ہوا کہ وہ شہنشاہ عالم کا غلام ہے تو میں نے اپنی بیٹی کیلئے اس کا بھیجا ہوا رشتہ قبول کر لیا۔ دراصل آپ کی غلامی کا حوالہ بھی میرے لئے شہنشاہیت کا درجہ رکھتا تھا' میں تو اس تعلق پر محض اس لئے ناز کرتا تھا کہ کسی طرح آپ کے حلقہ غلامی میں شامل ہو جاؤں' بس یہی نسبت میرے لئے بڑی نسبت تھی اور یہی اعزاز میرے لئے بڑا اعزاز تھا کہ میں شاہ کے غلاموں کا غلام ہوں۔'' قائم خان نے خوشامد کا بدترین مظاہرہ کیا تھا' مگر بالآخر یہی ذلت آمیز قصیدہ خوانی اس کے کام آگئی۔

بلبن کے قہر کے شعلے آہستہ آہستہ سرد پڑنے لگے۔ قائم خان نے اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی آخری کوشش کی۔

''سلطان معظم! یہ گنہگار بڑی سے بڑی سزا کیلئے تیار ہے' مگر اس کی نمک خواری پر شک نہ کیا جائے۔'' قائم خان کسی بھوکے گداگر کی طرح گڑگڑانے لگا۔ ''نمک حرام طغرل پر سو بار لعنت کہ وہ اس دنیا میں بھی رسوا ہوا اور

آخرت میں بھی اس کیلئے کربناک عذاب کے سوا کچھ نہیں۔‘‘ یہ کہہ کر قائم خان دوبارہ سجدے میں چلا گیا اور پھر فوراً ہی زنجیروں کے بوجھ سے لڑکھڑاتا ہوا اٹھا۔ ’’میں سلطان غیاث الدین بلبن کے قہر وغضب سے ہزار بار پناہ مانگتا ہوں کہ اگر آقائے نعمت کسی سے خفا ہو جائیں تو اس طویل وعریض زمین پر اس کیلئے کوئی ٹھکانا نہیں۔‘‘

اہل دربار نے حیرت سے سلطان کی طرف دیکھا۔ بلبن کے ہونٹوں پر تحقیر آمیز تبسم ابھر آیا تھا۔

’’اس زبان دراز منافق کی زنجیریں کھول دو۔‘‘

چند خدمت گار تیزی سے آگے بڑھے اور قائم خان کے جسم کو گراں بار زنجیروں سے آزاد کر دیا گیا۔

قائم خان کی اس چرب زبانی سے اس کی زندگی تو محفوظ ہوگئی تھی مگر ابھی احتساب کا عمل باقی تھا۔

’’نمک حرام طغرل کے محل کو مسمار کر کے تمام قیمتی سامان اور زر و جواہر غریبوں میں تقسیم کر دیئے جائیں۔‘‘ سلطان غیاث الدین بلبن نے وزیر سلطنت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

قائم خان کی جان میں جان آئی اور وہ اپنے آپ کو مکمل طور پر شاہ کے قہر سے محفوظ سمجھنے لگا۔ قائم خان کا خیال تھا کہ سلطان نے غدار طغرل سے اس کے قریبی رشتے کو یکسر فراموش کر دیا ہے...... مگر اس وقت اس زمانہ ساز شخص کی سانسیں رکنے لگیں جب غیاث الدین بلبن کا نیا حکم صادر ہوا۔

’’قائم خان کی حویلی کو اس طرح مسمار کیا جائے کہ اس کی بنیادیں تک باقی نہ رہیں، ہمیں معلوم ہے کہ اس حیلہ ساز شخص نے نمک حرام طغرل کے حوالے سے بیشمار مراعات حاصل کی ہیں، ہمارے مخبروں نے ہمیں یہ اطلاع بھی دی ہے کہ اس کی معمولی سی حویلی پر کسی محل کا گمان ہونے لگا ہے۔ آخر راتوں رات یہ دولت کہاں سے آئی؟ خدا کی پناہ یہ کیسی خیانت ہے کہ رعایا کے خزانے ان ناشکر گزاروں کی تجوریوں میں سمٹ گئے جو ہمارے اعتبار کے قاتل تھے۔‘‘

قائم خان سر دربار چیخ چیخ کر فریاد کرنے لگا۔ ’’میں سلطان کے رحم کو پکارتا ہوں۔‘‘

’’یہ ہمارا کرم ہی ہے کہ ہم نے تیری اور تیرے گھر والوں کی جانیں بخش دیں۔‘‘ سلطان غیاث الدین بلبن نے نہایت غضب ناک لہجے میں کہا اور منہ پھیر لیا۔

یہ ایک واضح اشارہ تھا کہ سلطان غیاث الدین بلبن کا حکم ناقابل تنسیخ ہے اور قائم خان کی رحم کی درخواست مسترد کی جا چکی ہے۔

✻✻✻

وقت کے دراز ہاتھوں نے قائم خان کی بچھائی ہوئی بساط الٹ دی اور تمام مہرے اس طرح بکھر گئے کہ اب ان میں کوئی توازن باقی نہیں رہا تھا۔ ایک مہرے کی دوسرے مہرے سے نہ کوئی آشنائی تھی اور نہ کوئی رسمی رابطہ۔ سارے کے سارے مہرے نفسی نفسی پکار رہے تھے اور اس فکر میں تھے کہ ان کی گردنیں دست قاتل کی پہنچ سے دور رہیں۔ تابناک مستقبل کی آرزو میں قائم خان کا ’’حال‘‘ بھی برباد ہو گیا۔ اب صرف ماضی کی کچھ یادیں تھیں جو قائم خان کے دل و دماغ کو کسی زنگ آلود آرے کی طرح چیر رہی تھیں۔

جیسے ہی تیشے کی آواز ابھری اور حویلی کی پہلی اینٹ گری، زر تاج خانم یہ صدمہ برداشت نہ کر سکی، اس کے دماغ کی رگیں پھٹ گئیں اور وہ کچھ دیر بے ہوش رہ کر دنیا سے رخصت ہو گئی۔

یاسمین خانم طغرل کے محل میں مقیم تھی، جسے وہ ابھی تک اپنی جاگیر سمجھ رہی تھی...... مگر تیشہ زنوں نے بہت جلد اس کے سر سے یہ سائبان کھینچ لیا۔

’’میں ایک بیوہ ہوں! اس حالت میں کہاں جاؤں؟‘‘ یاسمین خانم نے محل کو مسمار کرنے والے مزدوروں سے چیخ

کر کہا۔

"ہم اس سلسلے میں کیا کر سکتے ہیں محترم خاتون؟" کئی مزدوروں نے بیک زبان کہا...... "ہم تو محض غلام ہیں' شاہ کے حکم کے غلام۔"

یاسمین خانم مسلسل چیختی رہی اور طغرل کے محل کے منقش در و دیوار' محرابیں' طاق اور گنبد زمین بوس ہوتے رہے۔

یاسمین خانم کی فریاد کی لے کچھ اور تیز ہو گئی۔

آخر حکومت کے ایک کارندے نے ایک بیوہ عورت پر رحم کھا کر وزیر سلطنت سے رابطہ قائم کیا۔

وزیر سلطنت بھی آمرانہ نظام کے ہاتھوں ایک کھلونا تھا۔ یاسمین خانم کی ناشنیدہ چیخوں نے اسے بھی متاثر کیا تھا' مگر وہ ذاتی طور پر ایک بیوہ کے غم میں شریک ہونے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔ عتاب شاہی کے خوف سے لوگوں کے سینے ان کی آرزوؤں کے مقبرے بن گئے تھے اور ان مقبروں میں ہمیشہ ایک ہی صدا گونجتی رہتی تھی۔

"ہم سب شاہ کی مرضی کی تکمیل کیلئے پیدا ہوئے ہیں اور شاہ کی مرضی کے سوا اس دنیا میں کسی دوسری شے کا وجود نہیں۔"

پھر بھی خوف و دہشت کی اس فضا میں وزیر سلطنت سلطان غیاث الدین بلبن کی خدمت میں حاضر ہوا اور بیوہ یاسمین خانم کی بے چارگی کے بارے میں عرض کرنے لگا۔

بلبن نے نہایت جبر و اکراہ کے ساتھ وزیر سلطنت کی درخواست سنی اور انتہائی تلخ لہجے میں کہنے لگا۔

"ہماری مملکت میں اور بھی بیشمار بیوائیں زیست بسر کر رہی ہیں۔ آخر انہیں بھی تو کوئی نہ کوئی پناہ گاہ حاصل ہے۔ یاسمین خانم اپنے باپ کے یہاں بھی قیام کر سکتی ہے' پھر یہ بے چارگی کی نمائش کیوں؟"

وزیر سلطنت چند لمحوں تک خاموش کھڑا رہا' پھر لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔

"شاہ والا! قائم خان کی حویلی بھی مسمار کی جا چکی ہے' اس عورت کیلئے اب اپنے باپ کے یہاں بھی سر چھپانے کو کوئی جگہ نہیں ہے۔"

سلطان غیاث الدین بلبن کچھ دیر کیلئے گہری سوچ میں ڈوب گیا' پھر شاہ کے ہونٹوں کو اس طرح جنبش ہوئی کہ اس کے چہرے پر ناپسندیدگی کا رنگ صاف نمایاں تھا۔

"اگر اس عورت سے باپ اور شوہر کا گھر چھوٹ گیا تو وہ اپنے کسی عزیز کے یہاں پناہ لے سکتی ہے۔"

"شاہ والا! اسے آپ کی مرضی کے بغیر کون پناہ دے سکتا ہے؟" وزیر سلطنت کی آواز میں بدستور لرزش موجود تھی۔

"اگر واقعتاً ہماری مملکت میں اس عورت کا کوئی ٹھکانہ نہیں تو نمک حرام طغرل کے محل کا ایک مختصر سا کمرہ اس طرح چھوڑ دیا جائے کہ اس میں آرائش و آسائش کا ہلکا سا نشان تک باقی نہ رہے۔" سلطان غیاث الدین بلبن نے وزیر سلطنت کو حکم دیتے ہوئے کہا...... "مزید یہ کہ اس عورت کو شاہی لنگر خانے سے دو وقت کی غذا فراہم کی جائے...... مگر وہی غذا جو ہماری عام رعایا استعمال کرتی ہے۔"

وزیر سلطنت نے شاہ کے حضور رخصتی سلام پیش کیا اور الٹے پاؤں آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔

اچانک سلطان غیاث الدین بلبن کی بارعب آواز دوبارہ ابھری۔ وزیر سلطنت سہم کر ٹھہر گیا۔

"اور اس عورت سے یہ بھی کہہ دینا کہ جلد از جلد اپنے رہنے کیلئے کوئی دوسرا انتظام کر لے۔" یکایک بلبن کے چہرے پر وہی رنگ قہر نمایاں ہو گیا...... "ہم نمک حرام کی کسی نشانی کو برداشت نہیں کر سکتے' اگر

ہمیں مذہب وشریعت کا لحاظ نہ ہوتا تو ہم اس ذلیل النسب طغرل کی قبر تک کا نشان مٹا دیتے' بس یہ ہمارے کرم کی انتہا ہے کہ ہم ایک بیوہ عورت کی خاطر اپنے دل اور جذبات سے شدید انتقام لے رہے ہیں۔"

وزیر سلطنت واپس چلا گیا۔

سلطان غیاث الدین بلبن کے نئے حکم کے مطابق یاسمین خانم کو چند روز کیلئے چار گز کا سائبان مل گیا...... اور طغرل کی ایک ایک یادگار' ایک ایک نشانی کو بے دردی سے مٹایا جاتا رہا۔

❋❋❋

جب قائم خان نے بیٹی کو ماں کے مرنے کی اطلاع دی تو وہ شدت غم سے کچھ دیر تک چیختی رہی اور پھر یکایک قہقہے لگانے لگی۔

"میری غمزدہ بیٹی! تیرا یہ غم ایسا جانگداز ہے کہ بدنصیب باپ تیری محرومیوں پر ماتم بھی نہیں کر سکتا۔" قائم خان زاروقطار رو رہا تھا۔ "تیرے ساتھ جو ناانصافی ہوئی ہے اسے بس خدا دیکھ رہا ہے' زمین کی کسی عدالت میں تیرے ساتھ انصاف نہیں ہو سکتا۔" قائم خان بار بار کھلے آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ "تیرا فیصلہ آسمانوں پر ہوگا! صبر کر میری بیٹی!"

یاسمین خانم نے وحشت زدہ نظروں سے باپ کی طرف دیکھا اور بے اختیار ہنسنے لگی۔

"بیٹی! تو اپنی ماں کو آخری بار دیکھ لے' کچھ دیر بعد اس کے جسم کو قبر میں اتار دیا جائے گا۔" شدت الم سے قائم خان کو بولنے میں بہت دشواری پیش آ رہی تھی۔

"میری کوئی ماں نہیں ہے۔" یاسمین خانم نے شدید غصے کے عالم میں کہا...... "کوئی قبر میں اتارا جائے یا کسی کو واصل کر دیا جائے مجھے کسی کی پروا نہیں۔" یہ کہتے یاسمین خانم ایک بار پھر ہنس پڑی۔

قائم خان لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ واپس چلا' محلے کی چند بوڑھی خواتین نے زرتاج خانم کو غسل دے کر میت تیار کر دی تھی' بس بیٹی کی آمد کا انتظار تھا۔ قائم خان نے واپس آ کر اہل محلہ کو بتایا کہ رنج والم کی زیادتی نے یاسمین خان کو بے حال کر دیا ہے' اس لئے وہ ماں کے جنازے میں شریک نہیں ہو سکے گی۔

مجبوراً زرتاج کو سپرد خاک کر دیا گیا۔

قائم خان کچھ دیر تک بیوی کی قبر پر بیٹھا آنسو بہاتا رہا' اچانک اسے یاسمین خانم کی وحشتوں کا خیال آیا تو وہ بمشکل اٹھا اور اس طرح طغرل کے مسمار شدہ محل کی طرف بڑھنے لگا جیسے وہ اپنے جسم کو کسی بھاری بوجھ کی طرح گھسیٹ رہا ہو۔

"بیٹی تمہاری ماں کو قبر میں اتار دیا گیا ہے۔" قائم خان اس طرح بول رہا تھا جیسے کوئی لاغر ونحیف مریض گفتگو کر رہا ہو۔

یاسمین خانم نے چونک کر باپ کی طرف دیکھا اور ہذیانی انداز میں چیخنے لگی۔

"یہ کیسا عذاب ہے جو رکنے کا نام ہی نہیں لیتا' میرے خواب کہاں گئے؟ میں کیسی ملکہ ہند ہوں کہ ایک خدمت گار بھی میرے نزدیک نہیں...... اور یہ کون بے ادب ہیں جو میرے خوابوں کے محل پر تیشہ زنی کر رہے ہیں۔" یاسمین خانم باپ کے سینے سے لپٹ کر رونے لگی۔ "بابا جان! میرے خواب کہاں گئے؟ یہ کس کے دست جفا کار نے مجھ سے میری ایک ایک خوشی چھین لی؟ وہ کون ہے؟ کوئی تو مجھے بتائے کہ میرے خواب کہاں گئے؟"

خوبصورت ماضی کی یادیں اس قدر دل شکن تھیں کہ یاسمین خانم باپ کے بازوؤں میں بے ہوش ہوگئی۔

اور جب یاسمین خانم کو دوبارہ ہوش آیا تو وہ ذہنی توازن کھو چکی تھی۔

''میں ملکہ ہند ہوں۔'' یاسمین خانم نے چیخ کر کہا کہ ''میرا تاج کہاں ہے اور یہ نامراد درباری کہاں مر گئے۔ یہ کہتے کہتے یاسمین خانم اپنے کمرے سے نکل کر اس کھنڈر کی طرف بھاگ کھڑی ہوئی جہاں قدم قدم پر پتھروں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔

قائم خان بے قرار ہو کر اپنی بیٹی کو روکنے کیلئے بڑھا' مگر چند قدم کا فاصلہ طے کرتے ہی وہ لڑکھڑا کر زمین پر گر پڑا۔ قائم خان نے دوبارہ اٹھنے کی کوشش کی لیکن اس مرتبہ وہ اپنے جسم کو جنبش تک نہ دے سکا' اس کا پورا بدن شدید فالج کی لپیٹ میں آچکا تھا۔ بس ایک سر محفوظ رہ گیا تھا۔ قائم خان اپنے جسم کو حرکت دیئے بغیر دیکھ سکتا تھا اور صورتحال کو سمجھ بھی سکتا تھا اور اپنے دل کی بات روانی کے ساتھ بیان بھی کر سکتا تھا...... مگر اٹھ کر کسی دوسری جگہ جا نہیں سکتا تھا۔

وہ زمین پر پڑے پڑے لوگوں کو مدد کیلئے پکارتا رہا' لیکن طغرل کے کھنڈر میں اس کی فریاد سننے والا کوئی نہیں تھا۔

اور پھر تاریک رات سر پر آگئی۔ قائم خان کھلے آسمان کے نیچے بے حس و حرکت اور بے یار و مددگار پڑا تھا۔

اور پھر رات کے پچھلے پہر قلعے کے پہریداروں نے ایک لرزتے ہوئے سائے کو فصیل کی جانب بڑھتے ہوئے دیکھا...... اور کچھ دیر بعد ہی روح پگھلا دینے والی آواز فضا میں ابھرنے لگی جسے قلعے کے محافظ گزشتہ سترہ اٹھارہ سال سے بلاناغہ سن رہے تھے۔

''اے عربوں کے خدا...... اے ترکوں کے خدا...... اے ایرانیوں کے خدا! مجھ بت پرست کے ساتھ بھی انصاف کر۔''

❋❋❋

گردش روز و شب نے بہت کچھ بدل ڈالا تھا۔ نرسنگا نے ٹھاکر کرشن راؤ کا سر کاٹ کر اسے اس کے عبرتناک انجام تک پہنچایا اور پھر خود نرسنگا بھی تختہ دار پر لٹک گیا۔ ملک مقدر نے امیر طغرل کی بے کفن لاش کو دریا میں بہا دیا' زرتاج خانم لاوارثوں کی طرح دفن کردی گئی' یاسمین خانم ذہنی توازن کھو بیٹھی اور قائم خان اس طرح مفلوج ہو کر رہ گیا کہ راستہ چلنے والے ترس کھا کر اس کے منہ میں غذا کے کچھ نوالے اور پانی کے چند قطرے ڈال دیا کرتے' ان سترہ اٹھارہ سالوں میں چشم فلک نے بڑے بڑے انقلابات دیکھے تھے' مگر سعدیہ خانم کا انداز فغاں ابھی تک نہیں بدلا تھا بلکہ روز بروز اس کی فریاد کی لے تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ وہ طوفانی بارش ہو یا خون کو منجمد کر دینے والی سرد ہوائیں' موسم کی کوئی یورش بھی سعدیہ خانم کو قصر سفید تک آنے سے نہیں روک سکتی تھی۔ اگرچہ صدمات کی یلغار نے اسے بہت زیادہ بوڑھا بنا دیا تھا' لیکن وہ آج بھی پہلے دن کی طرح قلعے کی فصیل کے نیچے آخر شب کے سناٹوں میں مصروف فغاں رہتی تھی۔

محل کے محافظ ایک طویل عرصے سے پاگل عورت کی چیخیں سن رہے تھے' بالآخر ایک دن قصر شاہی کے ایک نگہبان نے سلطان غیاث الدین بلبن کو سعدیہ خانم کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا۔

''حضور والا! اب اس مجنون عورت کی چیخیں ہم سے برداشت نہیں ہوتیں۔''

بلبن بہت غور سے محافظ کی بیان کردہ تفصیلات سنتا رہا' اس سے پہلے بھی قصر سفید کے کسی نگہبان نے غیاث الدین بلبن کو سعدیہ خانم کی وحشیانہ حرکتوں کے متعلق بتایا تھا' مگر سیاسی ہنگامہ آرائیوں کے سبب والی ہند کے ذہن سے یہ غیر معمولی واقعہ فراموش ہو گیا تھا' پھر جب بلبن کو معلوم ہوا کہ یہ وہی عورت ہے جس کے بیٹے کو حکم شاہی کے مطابق سزائے موت دی گئی تھی اور مرنے والا وہی بے ادب مجرم تھا جس نے ہندوستان کے حکمران کو سر دربار غلام کہہ کر پکارا تھا' تو بلبن کے ہونٹوں پر ایک بے نیازانہ مسکراہٹ ابھر آئی۔

''بیٹے کی موت کے صدمے نے اسے بدحواس کر دیا ہے۔'' سلطان غیاث الدین بلبن کی پرغرور آواز گونجنے لگی۔ ''وہ عربوں اور ترکوں کے خدا سے انصاف نہیں مانگتی' میرے مرنے کی دعائیں کرتی ہے۔''

''پھر اس پاگل عورت کیلئے کیا حکم ہے؟''

محافظ نے ادب سے سرخم کرتے ہوئے کہا۔

''جہاں ہمارے تخت و تاج کے سائے میں لاکھوں ہوش مند پناہ لئے ہوئے ہیں وہاں ایک دیوانی عورت کو بھی قصر سفید کی دیوار کے نیچے پڑا رہنے دو۔''

❁❁❁

اس کے کچھ دن بعد ہی غیاث الدین بلبن کا بڑا لڑکا شہزادہ محمد سلطان باپ سے ملاقات کرنے کیلئے ملتان سے دہلی آیا۔

بلبن نے نہایت والہانہ انداز میں اپنے لائق اور سعادت مند بیٹے کو سینے سے لگایا اور پھر شہزادے کی روشن پیشانی پر بے مثال محبت سے لبریز ایک طویل بوسہ دیا۔

''شاہ والا کا اقبال بلند ہو اور تاجدار ہند کے تمام بدخواہ طغرل کی طرح پیوند خاک ہو جائیں۔'' شہزادہ محمد سلطان نے لکھنوتی کی بغاوت کو کامیابی کے ساتھ فرو کرنے پر غیاث الدین بلبن کو مبارکباد پیش کی۔

بلبن نے جوش محبت میں ایک بار پھر شہزادہ کو گلے سے لگا لیا۔

اور جب دونوں باپ بیٹے خلوت میں ملے تو شہزادہ سلطان محمد نے بلبن کی خدمت میں انتہائی قیمتی تحائف اور کچھ نوادرات پیش کئے۔

بلبن اپنے بڑے بیٹے کے ادب و تعظیم سے بہت زیادہ متاثر ہوا۔ وہ پہلے ہی شہزادہ محمد سلطان سے حد درجہ محبت کرتا تھا' مگر جب اس کا چھوٹا بیٹا بغرا خان نالائق ثابت ہوا تو اس محبت میں فطری طور پر مزید اضافہ ہو گیا' اب بلبن کی سیاسی وراثت کے باقی رہنے کا انحصار صرف شہزادہ محمد سلطان کی ذات پر تھا' اسی وجہ سے بلبن اکثر اپنے امراء کو مخاطب کر کے کہتا تھا۔

''بے شک! اقتدار ایک فانی شے ہے' مگر میرا اقبال مند بیٹا شہزادہ سلطان محمد میرے جاہ و جلال کے پرچم کو سرنگوں نہیں ہونے دے گا۔ یہی میرا حقیقی وارث ہے اور یہی میرے خاندان کو سربلند کرنے والا۔''

شفیق و مہربان باپ کی زبان سے اپنے لئے تعریفی کلمات سن کر شہزادہ سلطان محمد سر سے لے کر پاؤں تک عجز و انکسار کا پیکر بن جاتا تھا اور اس کی یہی ادا بلبن کو بہت زیادہ محبوب تھی۔

شہزادہ سلطان محمد جو ''خان شہید'' کے نام سے زیادہ مشہور ہے' ایک بلند کردار انسان تھا۔ اس کی محفل میں ہمیشہ اہل کمال کا اجتماع رہتا تھا' یہاں تک کہ حضرت امیر خسروؒ اور حضرت خواجہ حسنؒ جیسے بزرگوں کی صحبت اسے حاصل تھی۔ شہزادہ سلطان محمد حضرت شیخ سعدیؒ سے بھی بے پناہ عقیدت رکھتا تھا۔ یہ اسی عقیدت کا نتیجہ تھا کہ حضرت شیخ سعدیؒ نے کئی بار شہزادے کو اپنی غزلیں ارسال کیں اور وہ محبت نامے تحریر کئے جو سلطان محمد کیلئے سرمایہ افتخار تھے۔

شہزادہ بزرگان دین اور علمائے وقت کی بہت قدر کرتا تھا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب شہزادہ سلطان محمد ملتان میں قیام پذیر تھا' اسی زمانے میں شیخ عثمان ترمذی اتفاق سے ملتان تشریف لائے' حضرت شیخ اپنے دور کے بہت بڑے عالم اور عارف کامل تھے۔ شہزادہ سلطان محمد نے شیخ عثمان ترمذیؒ کی بہت خاطر و مدارات کی اور انتہائی ادب و احترام کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کی خدمت میں قیمتی نذریں پیش کیں۔ اس کے بعد شہزادے نے بڑی عاجزی کے ساتھ عرض کرتے ہوئے کہا۔

''اگر حضرت شیخ یہاں قیام کرنا پسند فرمائیں تو حکومت کے خرچ سے ایک خانقاہ تعمیر کرا دی جائے۔''

شہزادہ سلطان محمد نے بہت اصرار کیا لیکن شیخ عثمان ترمذیؒ مستقل طور پر ملتان میں رہنے کیلئے آمادہ نہیں ہوئے اور واپس چلے گئے۔ روانگی سے پہلے شیخ عثمان ترمذیؒ اور حضرت بہاؤ الدین زکریاؒ ملتانی کے صاحبزادے شیخ صدرالدین عارف کے ساتھ شہزادہ سلطان محمد کی محفل میں تشریف رکھتے تھے۔ اس مجلس میں ایک خوش الحان شخص عربی کے اشعار پڑھ رہا تھا' یکایک ایک شعر سن کر ان بزرگوں پر جذب طاری ہو گیا اور اسی وجد کی کیفیت میں شیخ

عثمان ترمذیؒ اور شیخ صدرالدین عارف اپنی نشستوں سے اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ اہل مجلس کو بزرگوں کی اتباع کرنی پڑی۔ یہاں تک کہ شہزادہ سلطان محمد بھی دونوں ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوگیا' پھر جب تک وہ بزرگ پرسکون نہ ہوگئے اس وقت تک شہزادہ سلطان محمد پر شدید اضطراب طاری رہا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے۔

شہزادے کی تہذیب اور شائستگی کا یہ حال تھا کہ ایسی مجلسوں میں کبھی اپنا زانو بلند نہیں کرتا تھا۔ ان تمام خوبیوں کے باوجود اس میں ایک خرابی تھی کہ وہ کبھی کبھی شراب پی لیا کرتا تھا۔ لیکن یہ بڑی عجیب بات تھی کہ انتہائی نشے کی حالت میں بھی کوئی غیر مہذب کلمہ اس کی زبان پر نہیں آتا تھا۔ شہزادے کی وجاہت کا یہ عالم تھا کہ اس کے چہرے پر ہمیشہ جلال شاہی روشن ہوتا' یہاں تک کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ ہوجاتیں اور وہ لوگ بے ساختہ پکار اٹھتے۔

''خدا شہزادہ سلطان محمد کی عمر دراز کرے کہ اس کے دم سے ہندوستان میں اسلامی سلطنت کا مستقبل تابناک نظر آتا ہے۔''

یہی وہ صفات تھیں جن کے باعث سلطان غیاث الدین بلبن اپنے اس بیٹے سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ اس بار شہزادہ سلطان محمد نے مسلسل تین ماہ تک دہلی میں قیام کیا اور اس دوران بلبن نے شہزادے کو تھوڑی دیر کیلئے بھی اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔

اسی زمانے میں مغلوں کی ہنگامہ آرائیوں کی خبریں دہلی پہنچنے لگیں' مجبوراً ایک محبت کرنے والے باپ نے اپنے محبوب بیٹے کو محاذ جنگ کی طرف رخصت کرنے کا ارادہ کیا' پھر جب شہزادہ سلطان محمد ملتان جانے کی تیاریاں کرنے لگا تو بلبن نے اسے تنہائی میں بلا کر کہا۔

''فرزند! میری عمر کا ایک بڑا حصہ حکومت کے کاموں میں بسر ہوا ہے۔ تو نہیں جانتا کہ ان آنکھوں نے کیسے کیسے نشیب و فراز دیکھے ہیں؟ میرے چہرے کی ایک ایک لکیر میں حادثات و تجربات کی ہزاروں داستانیں پوشیدہ ہیں۔ آج میں چاہتا ہوں کہ تجھ پر مملکت کے سارے اسرار و رموز آشکار کردوں تاکہ تیرے پاؤں راستے کے کانٹوں سے محفوظ رہیں اور کوئی بھاری پتھر تیری راہ کی رکاوٹ نہ بنے۔ فرزند! میری باتیں بہت غور سے سن! یہ کہہ کر سلطان غیاث الدین بلبن نے اپنی نصیحتوں کا آغاز کیا۔

''تم اپنی ذاتی عظمت اور حکومت کی شان کو پوری توجہ کے ساتھ برقرار رکھنا...... اپنی نفسیانی خواہشوں کی تکمیل کیلئے اقتدار کی قوتوں کو کبھی کام میں نہ لانا...... شاہی خزانے دراصل عطیہ خداوندی ہیں انہیں ہمیشہ مخلوق خدا کی بھلائی کیلئے صرف کرنا...... اسلام کے دشمنوں کو کبھی سر ابھارنے کی مہلت نہ دینا تاکہ وہ ہمیشہ ذلیل و خوار رہیں...... ملک کے حالات اور اپنے مقرر کردہ حاکموں کے اعمال سے پوری طرح باخبر رہنا...... وہ انجمن ہو یا خلوت کدہ' جلال شاہی کا ہمیشہ لحاظ رکھنا...... پاک طینت اور بلند ہمت لوگوں کو انعام و اکرام سے نوازنا...... لالچی اور بے رحم انسانوں سے کبھی کسی بھلائی کی توقع نہ رکھنا...... اگر کسی دشمن کو سیاست کے دام میں گرفتار کرنا ہو تو نرمی اور عاقبت اندیشی کو پیش نظر رکھنا...... شرفاء کو اذیت ناک سزا دینے میں جلد بازی سے ہرگز کام نہ لینا کہ ایسے لوگوں کی بے عزتی کا زخم آسانی سے نہیں بھرتا اور پھر اس کی تلافی مشکل ہوجاتی ہے۔''

جیسے ہی سلطان کی نصیحتوں کا سلسلہ ختم ہوا' ایک پریشان کن خبر اس کا انتظار کر رہی تھی۔ بلبن کے جاسوسوں نے اطلاع دی کہ مغل لٹیروں نے سرحدی مقامات پر قتل و غارت کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ یہ خبر سنتے ہی شہزادہ سلطان محمد ملتان کی طرف روانہ ہوگیا۔

مغل لٹیروں کو شہزادے کی عسکری قوت کا اندازہ نہیں تھا' اس لئے وہ سوچے سمجھے بغیر شاہی لشکر سے الجھ پڑے

اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے موت کی خوراک بن گئے۔ باقی جو بچے وہ بمشکل تمام فرار ہونے میں کامیاب ہو سکے۔
جب یہ خبر چنگیزی سردار تیمور خان تک پہنچی تو وہ غصے سے پاگل ہو گیا' تیمور خان اس وقت قندھار' ہرات' بلخ' بدخشاں اور غزنی کا حاکم تھا۔ اس نے سر دربار اپنی تلوار بے نیام کی اور قسم کھا کر کہا۔
''اس وقت تک مجھ پر دنیا کی ہر نعمت و آسائش حرام ہے جب تک میں مسلمانوں سے اپنے ہم قوموں کے خون کا بدلہ نہیں لے لیتا۔''

اس کے بعد چنگیزی سردار تیمور خان تیس ہزار مغلوں کا لشکر لے کر لاہور اور دیپالپور کے درمیانی علاقے کی طرف بڑھا' اس مقام پر مغلوں سے مزاحمت کرنے والا کوئی نہ تھا۔ نتیجتاً سردار تیمور خان نے بڑے سفاکانہ انداز میں کئی دن تو لوٹ مار کا کاروبار جاری رکھا۔ بستیوں کی بستیاں ویران کر دی گئیں اور گھر کے گھر جلا دیئے گئے۔ اس وحشیانہ یورش میں کہیں کہیں مقامی باشندوں کے خون سے زمین بھی سرخ ہو گئی۔ سردار تیمور خان نے اس قتل و غارت گری کو اپنی آئندہ فتوحات کیلئے نیک فال سمجھا اور کامرانی کے نشے میں جھومتا ہوا ملتان کی طرف بڑھا۔
اس دوران شہزادہ سلطان محمد کو مغلوں کے ظلم و تشدد کی خبریں برابر موصول ہو رہی تھیں اور اس کے جاں نثار سپاہی بیرونی لٹیروں سے نبرد آزما ہونے کیلئے سخت بیقرار نظر آ رہے تھے' تمام فوجی بار بار اپنے امیر کے چہرے کی طرف دیکھتے تھے کہ کب اس کے ہونٹوں کو جنبش ہو اور وہ اپنے دشمن سے انتقام لینے کیلئے عقابوں کی طرح جھپٹ پڑیں...... مگر شہزادہ سلطان محمد نے انتہائی ضبط و تحمل سے کام لیا اور اپنے جانبازوں کو صبر کی تلقین کرتا رہا۔
''ابھی مغلوں کو کچھ اور علاقے پامال کرنے دو' ہم ان سے اپنے پسندیدہ محاذ پر الجھیں گے تاکہ حملہ آوروں کیلئے شکست اور فرار کے سوا کوئی تیسرا راستہ باقی نہ رہے۔''
تمام سپاہیوں نے اپنے امیر کا حکم سن کر گردنیں خم کر دیں' مگر ان کے اعصاب میں بڑا تناؤ تھا اور چہرے جوش جذبات سے سلگ رہے تھے۔
پھر جب چنگیزی سردار تیمور خان کا لشکر ملتان کی حدود میں داخل ہو گیا تو شہزادہ سلطان محمد نے اپنی صفوں کی درستگی کا آغاز کر دیا' لشکر کا ایک چوتھائی حصہ رات بھر پہرہ دیتا رہا اور باقی سپاہی آرام کرتے رہے۔ خود شہزادہ سلطان محمد نے بھی شب بیداری کی حالت میں وہ وقت گزارا' پھر صبح صادق سے کچھ دیر پہلے اس نے اپنے ایک ایک لشکری کو ہوشیار کر دیا' اس کے بعد شہزادے نے نماز فجر ادا کی اور اپنے فوجیوں سے مختصر خطاب کرتے ہوئے کہا۔

''تم میں سے ہر شخص کو یہ بات جان لینا چاہئے کہ مغل اپنے مزاج کے اعتبار سے وحشی اور درندے ہیں اس لئے اس معرکے میں تم لوگ بھی اپنے وحشیانہ جذبوں کے ساتھ جنگ کرو گے۔ تہذیب و شائستگی محفلوں کی رونق ہوتی ہے...... اور وحشت و دیوانگی میدان کارزار کی زینت بڑھاتی ہے۔ تم بھی اپنے خدا کی نصرت و تائید کے بھروسے پر آگے بڑھو اور مغلوں کی درندگی کا اس طرح جواب دو کہ ان کے سروں سے وحشت و جنون کے آثار تک مٹ جائیں۔''

اس مختصر سی تقریر کے بعد شہزادہ سلطان محمد نے اپنے لشکر کو آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ سورج نکلنے سے پہلے شاہی فوجیں حرکت میں آ گئیں' شہزادے کا جنگی منصوبہ یہ تھا کہ وہ دریا کے کنارے دوپہر کے وقت حملہ آور مغلوں کا مقابلہ کرے۔

❋❋❋

جب سردار تیمور خان نے دریا کے دوسرے کنارے پر مسلمان لشکر کو متحرک دیکھا تو اس کے سینے میں آتش انتقام بھڑک اٹھی اور وہ نتائج کی پروا کیے بغیر اپنی فوج کے ساتھ دریا عبور کر گیا۔

شہزادہ سلطان محمد اسی لمحے کا منتظر تھا جب تیمور خان کی فوجیں میدانی علاقے میں داخل ہو گئیں تو شہزادے نے اپنے لشکر کو یلغار کا حکم دیا۔ اپنے امیر کے اشارے پر جاں فروشی کی رسم ادا کرنے کیلئے مسلمان سپاہی مغل قزاقوں کے ہجوم پر ٹوٹ پڑے۔

شہزادہ سلطان محمد کی جنگی حکمت عملی کا یہ حصہ بہت اہم تھا کہ شاہی سپاہیوں کا ایک مخصوص دستہ مغل سرداروں کے پیچھے لگا دیا گیا تھا' ان سپاہیوں کی ایک ہی ذمہ داری تھی کہ اپنی جان پر کھیل کر مغل سرداروں کو قتل کر دیں۔ بالآخر شہزادے کا یہ منصوبہ کامیابی سے ہمکنار ہوا اور کئی نامور مغل سردار تہہ تیغ کر دیئے گئے۔ یہ ایک نفسیاتی دباؤ تھا جس کے زیر اثر مغل سپاہیوں کی ہمتیں جواب دینے لگیں' یہاں تک کہ ظہر کی نماز سے پہلے ہی تیمور خان کے فوجی میدان جنگ چھوڑ کر فرار ہونے لگے۔

یہ ایک بڑی فتح تھی جو شہزادہ سلطان محمد کو بہت آسانی سے حاصل ہو گئی تھی...... مگر جنگ کے اس نازک موڑ پر شاہی لشکر کے سپاہیوں نے بڑی عاقبت نااندیشی سے کام لیا اور جوش جہاد میں تیمور خان کے مفرور سپاہیوں کا تعاقب کرنے لگے' اس جذباتی مظاہرے میں مسلمان فوجیوں نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ سردار تیمور خان کے لشکر نے میدان جنگ سے بھاگتے وقت کون کون سے زاویے اختیار کئے تھے۔ پھر اس اندھے تعاقب نے اتنی شدت اختیار کی کہ شہزادے کے گرد محافظ سپاہیوں کا ایک مختصر سا دستہ باقی رہ گیا۔

شہزادہ سلطان محمد بھی اپنی اس فتح سے بہت زیادہ مسرور و مطمئن نظر آ رہا تھا۔ جب میدان خالی نظر آنے لگا اور مغل لٹیروں کی پرچھائیاں تک غائب ہو گئیں تو شہزادے نے دریا کے کنارے وضو کیا اور اپنے پانچ ساتھیوں کے ہمراہ نماز ظہر میں مشغول ہو گیا۔

یہی وہ سیاہ ترین لمحہ تھا جس نے تاریخ کا ایک روشن باب بجھا دیا' میدان جنگ سے فرار ہونے میں مغل سپاہیوں کا ایک دستہ بائیں جانب کٹ کر ادھر کہیں روپوش ہو گیا تھا جو شہزادہ سلطان محمد کے پڑاؤ کے قریب تھا' پھر جیسے ہی مغل وحشیوں نے شہزادہ سلطان محمد اور دوسرے مسلمان سپاہیوں کو عبادت میں مصروف دیکھا تو وہ مغل کمین گاہ سے باہر نکلے اور شہزادے کے ان چند آدمیوں پر ٹوٹ پڑے جو نماز سے فارغ ہو کر ابھی سنبھلنے بھی نہیں پائے تھے۔

مغلوں کا یہ حملہ اس قدر غیر متوقع تھا کہ چند لمحوں کیلئے شہزادہ سلطان محمد اور اس کے سپاہی بدحواس ہو گئے' مگر قوت ایمانی اور فطری شجاعت نے انہیں اسلام کو استقامت بخشی اور وہ قلت تعداد کے باوجود اپنے دشمن سے الجھ پڑے' فولاد سے فولاد ٹکرایا اور فضا میں چنگاریاں سی بکھر گئیں' کچھ دیر بعد ہی مغل لٹیرے سخت پریشان نظر آنے لگے' مسلمانوں کا یہ مختصر سا لشکر سیلاب کے ایک ریلے کی مانند آگے بڑھا اور سینکڑوں مغلوں کو دریائے فنا کی جانب بہا کر لے گیا۔ شہزادہ سلطان محمد کی بلند حوصلگی نے ایک بار پھر مغلوں کو شکست سے قریب تر کر دیا تھا۔ میدان جنگ سے ان کے قدم اکھڑنے لگے تھے' لیکن اچانک ایک مغل سپاہی کا زہر میں بجھا ہوا تیر کمان سے چھوٹا اور شہزادہ سلطان محمد کی گردن میں پیوست ہو گیا۔ بظاہر ہاری ہوئی جنگ دفعتاً ایک بڑی فتح میں تبدیل ہو چکی تھی۔

سلطان غیاث الدین بلبن کا محبوب بیٹا شہزادہ سلطان محمد (خان شہید) فرش خاک پر تڑپ رہا تھا۔ تمام جاں نثار شہزادے کی زندگی بچانے کیلئے اس کے گرد سمٹ آئے' مگر بلبن کے جانشین کی سانسیں شمار کی جا چکی تھیں۔ حضرت امیر خسرو دیوانہ وار روتے ہوئے ش [illegible] کے خون آلود جسم کو اپنی آغوش میں لے

کر تسکین آمیز کلمات ادا کرنے کیلئے بیٹھے۔ یہ ایک عارضی سانحہ ہوا اور اس سے شہزادے کی زندگی کو کوئی ضرر نہیں پہنچے گا..... مگر شہزادے کی آنکھیں دھندلی ہوئی جا رہی تھیں اور سماعتوں کے دروازے بند ہو چکے تھے۔

حضرت امیر خسروؒ نے وحشت زدہ ہو کر سلطان محمد کی طرف دیکھا' پھر انہیں محسوس ہوا کہ شہزادے کے ہونٹ آہستہ آہستہ لرز رہے ہیں۔ امیر خسروؒ خان شہید کے کچھ اور قریب ہو گئے' اس وقت انہوں نے شہزادہ سلطان محمد کی نہایت مدھم آواز سنی' خان شہید رک رک کر کہہ رہا تھا۔

''اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد مصطفیٰؐ اس کے رسول ہیں۔

امیر خسروؒ کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا اور انہوں نے مضطرب ہو کر اپنے ہونٹ شہزادے کی پیشانی پر رکھ دیئے۔

''یہاں جو کچھ بھی ہے وہ اپنے اللہ کی طرف لوٹ کر جانے والا ہے۔''

اس آیت الٰہی کی تلاوت کے بعد خان شہید کا جسم ساکت ہو گیا۔

شہزادے کی موت کے بعد مغلوں کے حوصلے بلند ہو گئے اور وہ باقی ماندہ مسلمان سپاہیوں پر بڑھ چڑھ کر حملے کرنے لگے' یہاں تک کہ مغلوں نے شکست خوردہ مسلمانوں کے گھوڑوں اور دوسرے سامان پر قبضہ کر لیا۔ شہزادہ سلطان محمد کے جو سپاہی زندہ بچ گئے تھے مغل انہیں گرفتار کر کے اپنے ہمراہ لے گئے' گرفتار ہونے والوں میں حضرت امیر خسروؒ بھی شامل تھے۔

شہزادہ سلطان محمد 183ھ میں ذی الحجہ کی آخری تاریخ کو شہید ہوا' وہ جمعہ کا دن تھا۔ حضرت امیر خسروؒ نے خان شہید کا ایسا دردناک مرثیہ لکھا ہے جسے پڑھ کر دوستوں کے سینے فگار ہو جاتے ہیں اور دشمن بھی شدت جذبات میں اپنے گریبان چاک کر ڈالتے ہیں۔

''جب شہزادہ خان شہید' سردار تیمور خان سے معرکہ آرائی کیلئے میدان جنگ کی طرف جا رہا تھا تو حضرت امیر خسروؒ نے اپنے ایک شعر میں اسے ایک طرح سے آواز دی تھی۔

''میرے محبوب مت جا! میں تیرے قدموں کی خاک اپنی آنکھوں سے لگاؤں..... کیونکہ میں تیرے حاسدوں کی نظر بد سے بہت پریشان ہوں۔ آسمان نے تجھ جیسا روشن چہرہ نہیں دیکھا ہے' اس لئے میں اپنے شوق دید کے سبب اس طرح مضطرب رہتا ہوں جیسے آگ میں جو کا دانہ۔''

حضرت امیر خسروؒ کو جس حادثے کا اندیشہ تھا بالآخر وہ ظاہر ہو کر رہا۔ بدخواہوں کی نظر نے شہزادہ سلطان محمد کو کھا لیا' امیر خسروؒ کے بقول..... ''یہ کوئی آفت تھی یا زمین پر قیامت نازل ہو رہی تھی۔''

✻✻✻

ابھی سلطان غیاث الدین بلبن کو یہ خبر نہیں تھی کہ سرزمین ملتان پر کیا قیامت نازل ہو چکی ہے؟ پھر جب ایک طویل خط کے ذریعے اس حادثہ عظیم کی اطلاع دہلی پہنچی تو امرائے سلطنت لرز کر رہ گئے' کسی مقرب ترین وزیر میں بھی یہ ہمت نہیں تھی کہ وہ بلبن کو شہزادہ سلطان محمد کی شہادت کی خبر سنا سکے۔ تمام امرائے سلطنت کئی دن تک اس اذیت ناک الجھن میں گرفتار رہے کہ وہ ایک باپ کو اس کے محبوب بیٹے کی موت کی خبر کس طرح دیں؟

بالآخر بہت غور و فکر کے بعد اس شاہی خدمت گار کو آمادہ کیا گیا جو غیاث الدین بلبن کو جوتے پہنانے کی خدمت انجام دیتا تھا' ملازم سے کہا گیا کہ یہ خط سلطان کے جوتے میں رکھ دے۔ شاہی خدمت گار نے ایسا ہی کیا۔

[illegible] ڈالا اور اسے کوئی چیز چبھتی ہوئی محسوس

ہوئی' بلبن نے گھبرا کر پاؤں کھینچ لیا اور شدید جھنجلاہٹ کے عالم میں خدمت گار کی طرف دیکھا۔ شاہی خدمت گار نے گھبرا کر سر جھکا لیا' خوف و دہشت سے اس کا پورا جسم کانپ رہا تھا' پھر جس سلطان کی نظر دوبارہ جوتے پر پڑی تو وہ چونک اٹھا۔ جوتے میں رکھا ہوا کاغذ صاف نظر آ رہا تھا' یہ بہت غیر معمولی بات تھی۔ بلبن فوراً ہی جھکا اور تیزی سے کاغذ کھول کر پڑھنے لگا۔ خط کی ابتدائی سطریں پڑھنے تک سلطان کا ضبط وتحمل برقرار رہا' پھر جہاں سے شہزادہ سلطان محمد پر دشمن کے حملے کا ذکر شروع ہوا' اس کے چہرے کا رنگ اڑنے لگا' پھر جب لکھنے والے نے یہ لکھا کہ خاندان بلبن کا روشن چراغ بجھ گیا...... اور ترکوں کا یہ آفتاب آغوش قبر میں پہنچ کر غروب ہو گیا تو سلطان کے ہاتھ لرزنے لگے اور شاہی کارندوں کا بھیجا ہوا خط انگلیوں کی گرفت سے نکل کر فرش پر گر پڑا' اس کے ساتھ ہی بلبن کی ایک تیز چیخ بلند ہوئی اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

✲✲✲

بلبن کی حالت لحظہ بہ لحظہ بگڑتی جا رہی تھی' محبوب اور جوان بیٹے کی موت کا داغ لو دے رہا تھا اور جس کے اثر سے بلبن کا پورا سینہ جل اٹھا تھا۔ تمام شاہی طبیبوں نے بلبن کو اپنے نرغے میں لے لیا تھا اور سلطان کے سکون قلب کیلئے بہترین دوائیاں آزمائی جا رہی تھیں' دواؤں کے استعمال اور سخت نگہداشت کے بعد کوئی عشاء کے وقت بلبن کو قدرے سکون ہوا' مگر اس کے چہرے پر اب بھی موت کی سی زردی چھائی ہوئی تھی' طبیب مسلسل مشورے دے رہے تھے کہ سلطان اپنے ذہن پر کسی قسم کا دباؤ نہ ڈالیں۔ اس طرح مرض کے بڑھ جانے کا اندیشہ تھا۔

''اپنے اس محبوب کے بارے میں کیسے نہ سوچوں جو کئی سال تک یہاں سر رکھ کے سوتا رہا ہے۔'' بلبن نحیف آواز میں بول رہا تھا اور کانپتے ہاتھوں سے اپنے سینے کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

سارے وزیر امیر مختلف انداز میں سلطان کو تسلیاں دے رہے تھے' مگر وہ اپنے خیالات انداز میں سلطان کو تسلیاں دے رہے تھے' مگر وہ اپنے خیالات میں گم تھا' پھر اچانک بلبن کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی' اس نے ان محافظوں کو اپنے حضور میں طلب کیا جو رات کے وقت محلے کے دروازے اور فصیل پر پہرہ دیتے تھے۔

جب وہ محافظ سلطان کے روبرو حاضر ہوئے تو بلبن نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا وہ پاگل عورت کل رات بھی آئی تھی؟''

محافظوں نے سر جھکا کر اثبات میں اقرار کیا۔

''وہ کیا کہہ رہی تھی؟ اس کی زبان سے ادا ہونے والا ایک ایک حرف مجھے سناؤ۔'' بلبن نے شدید نقاہت کے باوجود اپنے لہجے میں سختی پیدا کرتے ہوئے کہا۔

''وہ پاگل عورت برسوں سے یہی مخصوص الفاظ دہراتی ہے۔''

ایک محافظ نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''اے عربوں کے خدا...... اے ترکوں کے خدا...... اے ایرانیوں کے خدا! مجھ بت پرست کے ساتھ بھی انصاف کر۔'' جیسے ہی محافظ خاموش ہوا بلبن کی لرزتی ہوئی آواز ابھری۔

''وہ عورت کس وقت آتی ہے اور کب تک چیختی رہتی ہے؟'' سلطان نے محافظ سے دوسرا سوال کیا۔

''وہ رات کے پچھلے پہر دو تین بجے کے قریب آتی ہے اور پھر جیسے ہی فضاؤں میں اذان فجر کی گونج سنائی دیتی ہے وہ واپس چلی جاتی ہے۔'' محافظ نے سعدیہ خانم کے معمول کی وضاحت کرتے ہوئے جواب دیا۔

''آج رات میں بھی اس پاگل عورت کو دیکھنا چاہتا ہوں۔''

بلبن نے کہا اور آنکھیں بند کر لیں۔

قلعے کے محافظ چلے گئے تو سلطان کی عیادت و تیمارداری کرنے والے طبیبوں اور امیروں نے دیکھا کہ بلبن کی آنکھیں بدستور بند ہیں اور ان سے آنسوؤں کی آبشار جاری ہے۔

❊❊❊

قافلہ شب کے گزرنے کی رفتار وہی تھی' مگر سلطان غیاث الدین بلبن کو ایک لمحہ ایک صدی کے برابر محسوس ہو رہا تھا۔ وہ اس دوران اپنے خدمت گاروں سے کئی بار دریافت کر چکا تھا کہ کیا وقت ہوا ہے؟ پھر جب خدام جواب دیتے کہ ابھی گیارہ بجے ہیں تو بلبن غضبناک ہو کر کہنے لگتا۔ ''کیا آج کی رات اسی مقام پر ٹھہر جائے گی؟ کیا یہ گزرے گی نہیں؟''

لوگ سلطان کی باتوں کا کیا جواب دیتے؟ بلبن کی وحشت نا قابل بیان تھی۔

پھر جب رات کا ایک بجا تو سلطان قلعے کی فصیل پر جانے کیلئے بے چین نظر آنے لگا۔ محافظوں نے بہت سمجھایا کہ ابھی اس پاگل عورت کے آنے کا وقت نہیں ہوا ہے' اس لئے شاہ والا انتظار کی زحمت گوارا نہ فرمائیں۔

مگر غیاث الدین بلبن نے محافظوں کو ڈانٹ دیا۔ ''ابھی میں اتنا شکستہ نہیں ہوا ہوں کہ قلعے کی فصیل تک بھی نہ جا سکوں۔'' اگرچہ بلبن کا دل رو رہا تھا لیکن اس کے لہجے سے جلال شاہی کی وہی آگ برس رہی تھی۔

محافظ کانپ اٹھے اور ان کی گردنیں خم ہو گئیں۔ غیاث الدین بلبن اسی شاہانہ وقار کے ساتھ آگے بڑھا۔ پیچھے پیچھے امراء اور طبیب ہاتھ باندھے ہوئے چل رہے تھے۔

پھر بلبن مختلف محرابوں' راہداریوں اور برجوں سے گزرتا ہوا قلعے کی فصیل تک پہنچا۔ ایک محافظ نے آگے بڑھ کر دیوار کے اس حصے کی نشاندہی کی جس کے نیچے وہ پاگل عورت روزانہ آخر شب میں گریہ وزاری کرتی تھی۔

حالانکہ ابھی رات کا ایک بجا تھا اور سعدیہ خانم کا دور دور تک پتا نہیں تھا' لیکن جوش اضطراب میں بلبن کئی بار نیچے جھک کر دیکھ چکا تھا۔ درباری امراء اور شاہی طبیبوں نے بہت غور سے اپنے فرمانروا کی حالت کا جائزہ لیا۔ بلبن کا جسم لرز رہا تھا۔ بیٹے پر خان شہید کی موت کا زخم کھانے کے بعد بلبن نے غیر معمولی قوت ارادی کا مظاہرہ کیا تھا ورنہ 80 سال کی عمر میں کوئی دوسرا باپ ہوتا تو بستر سے جنبش بھی نہیں کر سکتا تھا۔

اگر کوئی شخص سلطان کی وحشت بیان کرنے کی کوشش کرتا تو یقیناً اسے الفاظ کی کمی کا احساس ہو جاتا' بلبن کبھی فصیل پر ہاتھ ٹیک کر کھڑا رہتا اور کبھی بے قرار ہو کر ٹہلنے لگتا' تمام امراء اور طبیب یہ سوچ کر پریشان تھے کہ کہیں سلطان ضعف و ناتوانی کے سبب پتھریلے فرش پر گر کر زخمی نہ ہو جائے۔ اس خطرے کے پیش نظر ایک وزیر نے بلبن سے کرسی پر بیٹھ جانے کی درخواست کی۔ پہلے تو سلطان نے انکار کیا' مگر پھر تھکن کے احساس نے اسے کرسی کا سہارا لینے پر مجبور کر دیا' ابھی چند لمحے بھی نہ گزرے ہوں گے کہ بلبن دوبارہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور خدام سے پوچھنے لگا۔

''کیا وقت ہوا ہے؟'' اگرچہ ابھی نصف گھنٹہ ہی گزرا تھا' لیکن بلبن کے اضطراب نے اس مختصر سے وقت کو طول دے کر صدیوں پر محیط کر دیا تھا۔

پھر دو بج گئے۔ سعدیہ خانم کے آنے کا وقت ہو گیا تھا' بلبن کے اضطراب میں کچھ اور شدت آ گئی تھی' اس نے بے چین ہو کر نیچے جھانکا' لیکن وہاں اس پاگل عورت کا سایہ تک نہیں تھا۔

''وہ کب آئے گی؟''

امراء اور طبیبوں کی جماعت گھبرا گئی۔ سلطان کا یہ حد سے بڑھا ہوا اضطراب اس کیلئے خطرناک بھی ہو سکتا تھا۔

''شاہ ذی وقار! ابھی تو اس پاگل عورت کے آنے کا وقت شروع ہوا ہے۔'' ایک محافظ نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

بلبن نے پھر کوئی سوال نہیں کیا۔ وہ خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گیا' مگر دیکھنے والے محسوس کر رہے تھے کہ سلطان شدید پیچ و تاب میں مبتلا ہے۔

وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا' یہاں تک کہ چار بج گئے۔ اس دوران بلبن نے فصیل پر جھک کر نیچے کی جانب دیکھا' مگر وہاں کسی انسان کا عکس تک نہیں تھا۔

''کہیں تمہارا حافظہ تو تمہیں فریب نہیں دے رہا ہے؟''

اچانک بلبن نے پلٹ کر محافظوں سے پوچھا۔

''کیا یہی وہ جگہ ہے جہاں آ کر وہ پاگل عورت فریاد کرتی ہے؟''

محافظوں کی صف میں ایک بار پھر لرزہ پڑ گیا۔

''سلطان معظم! آپ کے غلام تو سالہا سال سے ایک ہی منظر دیکھ رہے ہیں' پھر ان کے ذہنوں سے وہ جگہ کس طرح محو ہو سکتی ہے؟''

''کیا وہ عورت بلاناغہ یہاں آتی ہے؟'' کشمکش انتظار نے بلبن کو بدحواس کر دیا تھا اور وہ اس طرح سوالات کر رہا تھا جیسے اسے اپنے وفادار محافظوں کے بیانات پر شک ہونے لگا ہو۔

''شاہ والا کے حضور جھوٹ بولنے کی جرأت کون کر سکتا ہے؟'' تمام محافظوں نے بیک زبان کہا۔ ''ہم میں سے کسی شخص کو یاد نہیں کہ وہ عورت ایک دن بھی غیر حاضر ہوئی ہو۔''

محافظوں کا جواب سن کر غیاث الدین بلبن اپنے خیالات میں غرق ہو گیا' بہت دیر تک وہ ایک مجسمے کی مانند کھڑا رہا' لیکن صاف نظر آ رہا تھا کہ بلبن کسی گہری سوچ میں گم ہے۔

پھر ایک طویل وقفہ سکوت کے بعد وہ دوبارہ محافظوں سے مخاطب ہوا۔ ''مجھے بتاؤ کہ وہ پاگل عورت کن الفاظ میں فریاد کرتی ہے؟''

ایک محافظ آگے بڑھا اور سر جھکا کر سعدیہ خانم کے الفاظ دہرانے لگا۔

''اے عربوں کے خدا...... اے ترکوں کے خدا...... اے ایرانیوں کے خدا! مجھ بت پرست کے ساتھ بھی انصاف کر۔'' جیسے ہی محافظ خاموش ہوا' قریب کی مسجد سے ''اللہ اکبر'' کی صدا بلند ہوئی۔

خالق کائنات کی کبریائی کا اعلان سن کر تمام لوگوں کی گردنیں خم ہو گئیں۔ پھر جب اذان ختم ہوئی تو فصیل پر موجود ہر شخص نے دیکھا کہ بلبن کی آنکھیں بند تھیں اور وہ لرزتے ہوئے جسم کے ساتھ رو رہا تھا۔

کچھ ساعتیں اسی عالم میں گزر گئیں۔ پھر بلبن نے آنکھیں کھول کر اس مخصوص راستے کی طرف دیکھا' جس کے ذریعے سعدیہ خانم قلعے کی فصیل تک پہنچتی تھی۔ اس وقت فضا پر بے پناہ سکوت طاری تھا۔ سلطان کی خاموشی سے حاضرین کو اپنی سانسیں رکتی سی محسوس ہو رہی تھیں۔ پھر بلبن آہستہ آہستہ مڑا۔ امراء کی دست بستہ قطار کو دیکھا' محافظوں کے جھکے ہوئے سروں پر نگاہ کی اور پھر نہایت شکستہ لہجے میں کہنے لگا۔

''واپس چلو۔ اب وہ نہیں آئے گی۔ انصاف ہو چکا۔''

دوسرے دن بلبن کے حکم پر شاہی کارندوں نے دہلی کا گوشہ گوشہ چھان مارا لیکن سعدیہ خانم کا کہیں پتا نہیں تھا۔

اگر بلبن کے کارندے عام رعایا کے قبرستان میں چلے جاتے تو ان پر بھی یہ راز فاش ہو جاتا کہ جس رات ہندوستان کا فرمانروا قلعے کی فصیل پر کھڑا زحمت کش انتظار تھا' اسی رات سعدیہ خانم شجاع الدین کامران کی قبر پر لیٹے لیٹے زندگی کی قید سے آزاد ہو چکی تھی...... اور دیوداسی شکنتلا اس کی تدفین کے انتظامات کر رہی تھی۔

پھر جب کچھ دردمند انسان سعدیہ خانم کو دفن کر کے اپنے گھروں کو واپس جا رہے تھے تو انہیں ایک عورت کی دردناک چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔

''میں ملکہ ہند ہوں۔ میرے خدمت گار کہاں ہیں اور میرا تاج چھین کر کون لے گیا؟''

یہ پاگل عورت یاسمین خانم تھی۔

❋❋❋

صاحب طرز ادیب
خان آصف کی بہترین تصانیف

- اللہ کے ولی
- اللہ کے سفیر
- دِلوں کے مسیحا
- سفیرانِ حرم
- شمشیر کا قرض
- شعلوں کا کفن
- ٹیپو سلطان
- خاموش وفا
- فاتح اعظم صلاح الدین ایوبی

سرکلر روڈ، چوک اردو بازار لاہور۔ فون: 37668958 ,042-37652546

ISBN
9789696022114